درسِ قرآنِ حکیم

علامہ سید محمد رضی مجتہد

ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ

درسِ قرآنِ حکیم

علامہ سید محمد رضی مجتہد

ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ

طبع اوّل ـــــــــ ۱۹۷۴ء

تعداد ـــــــــ ایک ہزار

ناشر ـــــــــ ادارۂ نشرِ علومِ دینیہؒ کراچی

طابع ـــــــــ انٹرنیشنل پریس میکلوڈ روڈ کراچی

قیمت ـــــــــ پچیس روپیہ

پتہ :- ادارۂ نشرِ علومِ دینیہؒ - سی ۹۶ بلاک ۱۰ فیڈرل بی ایریا کراچی ـــــــــ فون نمبر ۶۸۱۹۶۱

پیش لفظ

"منتدی الثقافۃ الاسلامیہ کراچی" نے جو ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ کے نام سے مشہور ہے، اب تک خطیبِ پاکستان حضرت علامہ سید محمد رضی مجتہد کی چار کتابیں شائع کی ہیں اور اب موصوف کی پانچویں کتاب "درسِ قرآنِ حکیم" کی اشاعت کی جا رہی ہے۔ اس میں علامہ کے ۱۹۵ درس ہیں جن میں اکثریت ان ہی کی ہے جو ریڈیو پاکستان کے قومی پروگرام میں نشر ہو چکے ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت آفسٹ پر ہونے اور موجودہ شدید گرانی کی وجہ سے ہمیں بہت زیادہ اخراجات برداشت کرنا پڑے، مگر اس کے باوجود افادۂ عام کی غرض سے اس کی قیمت بہت کم رکھی گئی جو تقریباً خرچہ کے برابر ہے۔

محترم قارئین اس بات کو یاد رکھیں کہ یہ کتاب پورے قرآنِ حکیم کی تفسیر نہیں ہے بلکہ اس میں صرف وہی درس شامل ہیں جنہیں علامہ موصوف ریڈیو پاکستان کے تفسیری پینل کے رکن کی حیثیت سے ہر سال اپنے "ٹرم" میں قرآنِ حکیم کے مختلف حصوں سے متعلق نشر کرتے رہے ہیں۔ ہم نے صرف یہ کیا ہے کہ ان تمام تقریروں کو قرآنی سورتوں کی ترتیب کے مطابق کر دیا لیکن ابھی قرآنِ حکیم کا بڑا حصہ باقی ہے جس کی تفسیر اس مجموعہ میں نہیں ہے۔

آئندہ ایڈیشن کیلئے علامہ نے وعدہ فرمایا ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ وہ اس کمی کو پورا کر دیں گے۔ اس انمول مجموعہ میں انتہائی گرانقدر اور بلند ترین تحقیقی مضامین درج ہیں جو ریڈیو سے نشر ہونے کے بعد اب تک دنیا کے کروڑوں سننے والوں سے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ کتاب کی تصحیح میں ہم نے پوری کوشش کی ہے پھر بھی اگر کوئی غلطی رہ گئی ہو تو ہم اس پر پہلے ہی سے معذرت خواہ ہیں۔ آخر میں ہم اُن تمام حضرات کے تہ دل سے شکر گزار ہیں جنکی فیاضانہ مالی امداد سے اس عظیم علمی خزانہ کو ہم کتابی شکل میں منظرِ عام پر لا سکے۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے برتر ہمارے ان محسنوں، مدد کرنے اور ہمت بڑھانے والوں کو اس نیک کام میں حصہ لینے کی جزائے خیر عطا فرمائے۔ اسی کے ساتھ ہم ریڈیو پاکستان کا خصوصی شکریہ ادا کرتے ہیں جسکی اجازت سے ہمیں یہ اعزاز نصیب ہوا۔ "مسلم معاشرہ" کے پیش لفظ میں اس کا وعدہ کیا گیا تھا کہ "درسِ قرآنِ حکیم" کے مقدمہ میں علامہ کی شخصیت کے متعلق مزید تبصرہ کیا جائیگا لیکن اس مرتبہ کاغذ کی کمی کی وجہ سے ہمیں یہ سعادت حاصل نہ ہو سکی۔ انشاء اللہ تعالیٰ اسکے دوسرے ایڈیشن یا ادارہ کی دوسری کتابوں میں جو آئندہ شائع ہونے والی ہیں اس وعدہ کو پورا کر دیا جائے گا۔

ادارہ

سی ۹۶ بلاک (۱۰) فیڈرل بی ایریا کراچی
فون: ۶۸۱۹۶۱-۰

فہرست

درس	پارہ	رکوع	سورہ	صفحہ
۵۵	۳	۷	البقرۃ	۱۵۹
۵۶	۳	۹	آل عمران	۱۶۳
۵۷	۳	۹	"	۱۶۶
۵۸	۳	۱۰	"	۱۶۸
۵۹	۳	۱۰	"	۱۷۱
۶۰	۳	۱۰	"	۱۷۳
۶۱	۳	۱۱	"	۱۷۶
۶۲	۳	۱۱	"	۱۷۹
۶۳	۳	۱۱و۱۲	"	۱۸۱
۶۴	۳	۱۲	"	۱۸۴
۶۵	۳	۱۲	"	۱۸۶
۶۶	۳	۱۳	"	۱۸۹
۶۷	۳	۱۳	"	۱۹۱
۶۸	۳	۱۳	"	۱۹۴
۶۹	۳	۱۴	"	۱۹۷
۷۰	۳	۱۴و۱۵	"	۲۰۰
۷۱	۳	۱۵	"	۲۰۳
۷۲	۳	۱۵	"	۲۰۶
۷۳	۴	۱	"	۲۰۹
۷۴	۴	۱و۲	"	۲۱۲
۷۵	۴	۲	"	۲۱۵
۷۶	۴	۳	"	۲۱۹
۷۷	۴	۴	"	۲۲۲
۷۸	۴	۵	"	۲۲۵
۷۹	۴	۵	آل عمران	۲۲۹
۸۰	۴	۶	"	۲۳۲
۸۱	۴	۷	"	۲۳۷
۸۲	۴	۷	"	۲۴۰
۸۳	۴	۸	"	۲۴۴
۸۴	۴	۸	"	۲۴۷
۸۵	۴	۸	"	۲۵۱
۸۶	۴	۱۲	النساء	۲۵۵
۸۷	۴	۱۲	"	۲۵۸
۸۸	۴	۱۳	"	۲۶۱
۸۹	۴	۱۳و۱۴	"	۲۶۴
۹۰	۴	۱۴	"	۲۶۷
۹۱	۴	۱۴	"	۲۷۱
۹۲	۴	۱۴	"	۲۷۴
۹۳	۴و۵	۱۵و۱	"	۲۷۷
۹۴	۵	۱و۲	"	۲۸۱
۹۵	۱۸	۱	المؤمنون	۲۸۶
۹۶	۱۸	۱	"	۲۸۹
۹۷	۱۸	۱	"	۲۹۲
۹۸	۱۸	۱	"	۲۹۴
۹۹	۱۸	۱	"	۲۹۸
۱۰۰	۱۸	۱	"	۳۰۲
۱۰۱	۱۸	۱	"	۳۰۴
۱۰۲	۱۸	۱	"	۳۰۸
۱۰۳	۱۸	۱	المؤمنون	۳۱۰
۱۰۴	۱۸	۱	"	۳۱۲
۱۰۵	۲۴	۸و۹	المؤمن	۳۱۶
۱۰۶	۲۴	۹	"	۳۲۱
۱۰۷	۲۴	۹	"	۳۲۷
۱۰۸	۲۴	۹	"	۳۳۱
۱۰۹	۲۴	۱۰	"	۳۳۵
۱۱۰	۲۴	۱۰	"	۳۴۰
۱۱۱	۲۴	۱۰و۱۱	"	۳۴۴
۱۱۲	۲۴	۱۰و۱۱	"	۳۴۸
۱۱۳	۲۴	۱۰و۱۱	"	۳۵۲
۱۱۴	۲۴	۱۱	"	۳۵۷
۱۱۵	۲۴	۱۲	"	۳۶۲
۱۱۶	۲۴	۱۲و۱۳	"	۳۶۷
۱۱۷	۲۴	۱۳و۱۴	"	۳۷۲
۱۱۸	۲۵	۱۳	الزخرف	۳۷۸
۱۱۹	۲۵	۱۴	دخان	۳۸۱
۱۲۰	۲۵	۱۴	"	۳۸۶
۱۲۱	۲۵	۱۴و۱۵	"	۳۸۹
۱۲۲	۲۵	۱۵	"	۳۹۳
۱۲۳	۲۵	۱۶	"	۳۹۶
۱۲۴	۲۵	۱۷	جاثیہ	۴۰۰
۱۲۵	۲۵	۱۷و۱۸	"	۴۰۴
۱۲۶	۲۵	۱۸	"	۴۰۹

ا

سُورۃُ الفاتحۃ

مکیّۃ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○ اِہۡدِ نَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡہِمۡ ۙ۬ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا الضَّآلِّیۡنَ ○ (ع)

خدا کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بڑا مہربان رحم والا ہے۔ سب تعریف خدا ہی کے لئے سزاوار ہے جو سارے جہان کا پالنے والا بے حد مہربان نہایت رحم والا ہے روزِ جزا کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں ہمیں سیدھی راہ چلا اُن کی راہ جن کو تو نے (اپنی) نعمت عطا فرمائی نہ اُن کا راستہ جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہوئے۔

تشریح و تفسیر۔ سورۂ الحمد اس سورہ کو اس نام سے اس وجہ سے پکارا جاتا ہے کہ اس میں ابتدا حمد ہی سے کی گئی ہے۔ اس کا نام سورۂ فاتحہ بھی ہے کیونکہ اس سے قرآن حکیم کی ابتدا کی گئی ہے۔ اور جب نماز میں اس کی تلاوت کی جاتی ہے تو اسی سورہ سے قرات کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔ نیز اس کی جامعیت اور مخصوص اہمیت کی وجہ سے اس کو اُمّ الکتاب بھی کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کو سبع مثانی، سورۃ الصلوٰۃ اور سورۃ الشفار بھی کہا جاتا ہے۔ مشہور قول کی بنا پر سورۂ حمد کا نزول مکہ میں ہوا تھا اور کچھ مفسروں نے کہا ہے کہ اس کا نزول مدینہ میں ہوا۔ اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ دو مرتبہ نازل ہوا تھا ایک مرتبہ مکہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ میں مگر حضرت ابن عباس رضؓ کے نزدیک اس کا نزول مکہ ہی میں ہوا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ کے متعلق اس باب میں مفسروں نے اختلاف کیا ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں مگر تمام قرار کوفہ اور صحابہ و تابعین کی اکثریت کا یہی قول ہے کہ یہ سورۂ فاتحہ

کی پہلی اور ایک مستقل اور پوری آیت ہے۔ "اللہ" اسم ذات خداوندی ہے۔ یہ غیر خدا کے لئے نہیں بولا جا سکتا۔ اس سے مراد وہ ہستی ہے جس میں کمال ہی کمال ہو اور کسی طرح کا کوئی عیب اور نقص اُس میں نہ پایا جاتا ہو۔ الرحمٰن الرحیم۔ یہ دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں جس سے معنی کی شدت پر زور دینا مقصود ہوا کرتا ہے۔ یعنی اللہ بے انتہا رحمت والا ہے اور اس کی رحمت و کرم دنیا و آخرت اور کائنات کی ہر مخلوق کے لئے عام ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ "رحمان" کے لفظ میں اللہ کی عام شان کرم کی طرف اشارہ ہے جو مومن، کافر سب کو شامل ہے۔ اور "رحیم" سے وہ تجلی رحمت مراد ہے جو صرف اہل ایمان کے لئے مخصوص ہے۔ یہ بڑی قابل غور و توجہ بات ہے کہ قرآن حکیم کی ابتدا اسم ذات الٰہی یعنی لفظ "اللہ" سے کرنے کے بعد سب سے پہلے اللہ کے صفاتی نام جو ذکر کئے گئے ہیں وہ رحمان اور رحیم ہیں اور اس طرح معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی صفت رحمت میں کس قدر اہمیت ہے۔ الحمد للہ رب العلمین۔ "حمد" کے معنی انتہائی کامل تعریف و ثنا کے ہیں جو سوائے خالق عالم کے اور کسی کے لئے نہ جائز ہے اور نہ ممکن ہی ہے۔ کیونکہ "حمد" اپنے مفہوم کے مطابق غیر خدا کے لئے ہو ہی نہیں سکتی۔ "ربّ" مصدر بھی ہے اور معنی ہیں تربیت اور اصلاح کرنا اور اسم بھی یہاں "اسم" مراد ہے۔ مقصود ہے تربیت کرنے والا اور پالنے والا۔ تربیت کہتے ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری بہتر حالت کی طرف نشوونما دیتے رہنا یہاں تک کہ وہ حد کمال تک پہنچ جائے "عالمین" عالم کی جمع ہے۔ جو خود بھی اسم جمع ہے جس کا واحد نہیں آتا۔ عالم سے مراد تمام کائنات ہے اور "عالمین" سے اس کائنات کی ہر قسم اور ہر صنف مقصود ہے۔ "رب العالمین" کے جملہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ تمام موجوداتِ عالم کی ہر صنف کا الگ الگ ایک نظامِ حیات اور ایک ضابطۂ ہستی مقرر ہے جو تدبیر اور پرورش کا محتاج ہے اور اُن سب کا حقیقی پروردگار اور اصلی حاکم مطلق اللہ ہی ہے جس کے وسیع نظام ربوبیت و پروردگاری سے کوئی چیز بھی باہر نہیں نکل سکتی۔ اس سے اس بات کا بھی علم ہو گیا کہ قرآن نے جس خدا کی معبودیت کا اعلان کیا ہے وہ کسی مخصوص عالم، کسی خاص صنفِ خلقت، کسی خاص قوم، قبیلہ، ملک یا خطۂ زمین ہی کا خدا نہیں ہے بلکہ اُس کی ربوبیت اور الوہیت ہمہ گیر ہے، وہ عالمین کی ہر چیز کا خالق اور رب ہے۔ وہ کائنات کی ہستی اور ہر موجود کا پروردگار ہے۔ یعنی اس جہانِ رنگ و بو اور اس عالم روح و نور میں جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب اسی کے زیر اقتدار ہے۔ اس طرح لفظ "اللہ" نے اس کی ذات کی انتہائی عظمت اور کمال کو ظاہر کیا اور "رب العالمین" کے جملہ نے اسے بتایا کہ خدا کے سوا اس کائنات میں جو کچھ بھی ہے

وہ سب اُسی کے زیرِ حکومت، زیرِ پرورش اور تابع مشیت ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا کے دوسرے مذہبی حلقے خدا کی ہستی اور اس کے صفات کے متعلق ان حقیقتوں سے بے خبر تھے انہوں نے خدا کے تصور کو خطوں، قوموں، قبیلوں، جماعتوں اور اس سے بھی آگے خود اس وسیع کائنات کی مخصوص صنفوں میں تقسیم کر دیا تھا غرض کسی کے نزدیک کوئی ایسی ہستی نہ تھی جو تنہا خدائے مطلق اور خدائے کائنات ہو بلکہ خدائی کا عقیدہ موجوداتِ عالم کی مختلف صنفوں میں بٹا ہوا تھا۔ قرآن حکیم نے رب العالمین کہکر دنیا کو آگاہ کر دیا کہ خدائی کا تصور قابل تقسیم نہیں ہے اور خدا صرف وہ ہے جو وحدہ لاشریک ہو اور جس کی پروردگاری کے حدود میں کائنات کی ہر شئے گھری ہوئی ہو۔

"مالک یوم الدین" سے مراد یہ ہے کہ اللہ روزِ جزا کا مختار کل ہے۔ یہ نہیں کہ دنیوی حاکموں اور قاضیوں کی طرح اُس پر کوئی قانون مسلّط ہو بلکہ قانون اس کی خود مشیت ہے جو عدل و انصاف پر مبنی ہے مگر اُسے کامل اختیار ہے جسے چاہے بخشدے اور جسے چاہے سزا دے نہ اُس سے کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہے اور نہ اس پر کسی کی حکومت ہے "الدّین" کے کئی معنی ہیں مگر یہاں جزا مراد ہے یعنی قیامت کا دن روزِ جزا اور روزِ حساب کتاب ہے۔ مالک تو ہر چیز کا وہ آج بھی ہے مگر اس موجودہ زندگی میں عقل پر اکثر غفلت کے پردے پڑے رہتے ہیں اس لئے صرف وہی لوگ اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ اور اس کی عظمت کو سمجھ سکتے ہیں جو ان پردوں کو چاک کر کے جلوۂ حقیقت کو دیکھ سکیں لیکن قیامت کے دن تو یہ سب حقیقتیں بے نقاب ہوں گی اور ہر ایک فرد اقتدارِ خداوندی کا مشاہدہ کرے گا اور اس کی صفت مالکیت و حاکمیت کا اقرار کرے گا۔ "ایاک" کے معنی کسی چیز میں انحصار اور اُسے خاص کر دینے کے آتے ہیں اس لئے "ایاک نعبُدُ" میں اس بات کا اظہار ہے کہ عبادت اور پرستش سوائے خدا کے کسی اور کی نہیں ہو سکتی اور پھر جبکہ "نَعبُدُ" پر "ایاک" کے لفظ کو مقدم کر دیا گیا ہے تو عربی زبان کے قواعد کے مطابق اس تخصیص کی حد نہ رہی۔ اسی طرح "ایاک نستعین" کا بھی مفہوم یہ ہے کہ ہم اس کی ذات کے علاوہ کسی اور سے مدد نہیں طلب کرتے اس مطلب کو بھی اسی شدّت اور اسی تخصیص کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ جب تک خدا کی مشیّت نہ ہو کوئی بھی مدد حاصل نہیں ہو سکتی۔ "اِیاک نعبد" سے قبل تمہیدِ دعا تھی اور غائب خدا کی صفتیں بیان ہو رہی تھیں اور اب دفعتہً اس کی طرف خطاب ہونے لگا کہ ہم بس تیری ہی عبادت کرتے ہیں

اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں جیسے کوئی سامنے موجود ہو اور اس سے التجا ہو رہی ہو۔
حقیقت میں اس طرح مسلمان کے ذہن و فکر کو تربیت دی گئی ہے کہ وہ خدا کی صفتوں میں پہلے تو تفکر اور غور کرے اور جب وہ پورے لگاؤ اور پوری توجہ کے ساتھ اپنے خدا کی بزرگی اور عظمت کا تصور کرے گا تو بہت ہی جلد اُس پر ایسی کیفیت طاری ہو جائے گی کہ گویا وہ مقام خطاب میں آگیا اور گویا وہ رب العالمین کی بارگاہ میں حضوری کا شرف پاگیا تو پھر اس کے بعد اُس کے عمل اور اُس کی عبادت میں وہ محویت اور استغراق پیدا ہوگا جو سلطان السلاطین کے دربار میں صرف حضوری کے وقت ہو سکتا ہے اور جب نفس انسانی کو عظمت خداوندی اور جلالت الٰہی میں استغراق اور محویت کی اس طرح دن اور رات میں کئی کئی بار روزانہ تربیت ملتی رہے گی تو وہ ہمیشہ گناہوں اور برائیوں سے پاک رہے گا اور پھر نیکیوں اور اچھائیوں کا خوگر ہو جائے گا۔
" اھدنا الصراط المستقیم " اے ہمارے پروردگار ہمیں سیدھے راستہ پر چلا (قائم رکھ) صراط مستقیم سے مراد دینِ حق ہے۔ صراط الذین انعمت علیھم " ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہے۔ ایسے لوگوں سے مراد انبیاءؑ و مرسلین اور شہداء و صالحین ہیں جن کا سورۂ نساء آیت نمبر ۶۹ پارہ نمبر ۵ میں تشریح کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ہے۔ " غیر المغضوب علیھم ولا الضآلین " ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہے اور نہ اُن کا راستہ جو گمراہ ہیں۔ مغضوب علیھم سے صرف یہود ہی نہیں بلکہ وہ سب مراد ہیں جنھوں نے تحقیق کر کے حق کو پہچان لیا اور اس کے بعد بھی اُس سے منکر ہو گئے۔ اسی طرح ضآلین سے مراد صرف نصاریٰ ہی نہیں بلکہ وہ سب لوگ مراد ہیں جنھوں نے باوجود قدرت کے تحقیق نہ کی ہو۔

سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ

مَدَنِيَّةٌ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

الٓمّٓ ○ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۙ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

(درس ۲)

الف۔ لام۔ میم یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں یہ پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے وہ لوگ ایسے ہیں جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز کو پابندی سے ادا کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے اُنہیں دیا ہے اس میں سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جو تم پر اور تم سے پہلے نازل کی گئیں اور آخرت پر بھی وہ لوگ یقین رکھتے ہیں یہی لوگ ہدایت پر ہیں جو ان کے پروردگار کی طرف سے ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔

تشریح وتفسیر:

"الٓمّٓ" اور اسی طرح کے حروف بعض دوسرے سُورتوں میں بھی ہیں جنہیں حروف مقطعات کہا جاتا ہے۔ ان کے معنی بیان کرنے میں مفسروں کے بہت سے قول ہیں لیکن اصل یہ ہے کہ ان کے مفہوم کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی جانتے ہیں یا وہ لوگ جانتے ہیں جنہیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کا مطلب بتا دیا ہے، اور کسی خاص مصلحت کی بنا پر اُس سے عام لوگوں کو آگاہ نہیں کیا گیا۔ اس سلسلہ میں اگر کوئی یہ سوال کرے کہ ہم سب قرآن حکیم کے مخاطب ہیں تو ان حروف کو بھی ایسا عام فہم ہونا چاہیے تھا کہ ہماری سمجھ میں آجاتے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ ایک تو مجموعی طور پر سارے قرآن کے ہم مخاطب نہیں ہیں دوسرے اس کے اندر جتنے معانی اور مطلب ہیں کیا وہ سب کے سب ہر شخص کی سمجھ میں آ گئے ہیں یا کتاب اللہ کے علاوہ کائنات کی دوسری وہ چیزیں جنہیں ہم اپنے گردوپیش دیکھتے رہتے ہیں انہیں ہم پوری طرح سمجھ گئے ہیں اور اُن کی حقیقتوں سے ہمیں پوری آگاہی حاصل ہوگئی ہے۔ کبھی

ہرگز نہیں۔ بس اسی طرح ان چیزوں میں جن کا ہمیں علم نہیں ہے یہ حروف مقطعات قرآنیہ بھی ہیں۔

"ذٰلِكَ" عربی زبان میں اشارہ کے لئے آتا ہے "هٰذَا" قریب کے لئے اور یہ دور کے لئے مگر دوری ہمیشہ زمان و مکان کے لحاظ ہی سے نہیں ہوا کرتی بلکہ کبھی منزلت اور مرتبہ کے اعتبار سے بھی ہوا کرتی ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ اس کے ساتھ ہی استعمالِ عرب میں "ذٰلِكَ" "هٰذَا" کے مقام پر بھی بولا جاتا ہے۔

"لَا رَيْبَ فِيهِ" سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب کے مضمون اور مطلب میں کسی قسم کے شک اور شبہ کی گنجائش ممکن نہیں ہے یہ اور بات ہے کہ کسی شخص کی سمجھ میں اصل مضمون نہ آئے اور اُسے شبہ ہونے لگے۔ یہ خود اس کا اپنا قصور فہم ہوگا۔ مگر قرآن میں ذاتی طور پر کسی شک کی گنجائش نہیں ہے۔ جیسے سورج سامنے چمک رہا ہو اور کوئی شخص نابینا ہو اور وہ اُسے نہ دیکھ سکے اس میں قصور سورج کا نہ ہوگا۔

"هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ" یعنی قرآن حکیم پرہیز گاروں کے لئے ہدایت ہے۔ خالق عالم نے انسان کو چار طرح سے ہدایت فرمائی ہے۔ ایک یہ کہ اس نے عقل عطا کی تاکہ ایسی چیزوں کی معرفت حاصل کرسکے جہاں تک ظاہری حواس کی پہنچ نہیں ہوسکتی دوسری ہدایت وہ ہے جو انبیاؑ و مرسلینؑ کے آنے سے اور کتابیں نازل کرنے سے کی گئی ہے۔ تیسری ہدایت وہ خاص توفیق ہے جو صاحبان ایمان کو عطا کی جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى (سورہ محمد) جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔ دوسری جگہ اس طرح ہے "وَيَزِيدُ اللّٰهُ الَّذِينَ اهْتَدَوْا هُدًى" (سورہ مریم) جو لوگ ہدایت پر ہیں اللہ ان کی ہدایت کو اور بڑھاتا ہے۔ اور چوتھی قسم وہ ہے جس سے مراد آخرت میں جنت کی طرف رہنمائی ہے۔ سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ (سورہ محمد) وہ ان کو عنقریب صحیح منزل مقصود تک پہنچا دے گا اور انہیں خوش حال کردے گا اور اُن کو اُس بہشت میں داخل کرے گا جس کا اُنہیں اس نے پہلے سے شناسا کر رکھا ہے یعنی جس جنت کا حال اُن کو پیغمبروں کے ذریعہ سے معلوم ہو چکا ہے اس میں اللہ صاحبان ایمان کو داخل کرے گا اور وہاں پہنچکر ہر جنتی اپنے مقام کو خود بخود پہچان لے گا اور اس کا دل اُسی طرف مُڑ جائے گا ان چار قسموں کی ہدایت کے علاوہ ایک پانچویں ہدایت بھی ہے جو پوری کائنات کے لئے عام ہے اور اُس سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ہر چیز کے لئے اُس کی بقاء اُس کی زندگی اور اُس کی معیشت کی راہیں کھولدی ہیں اور اُس کی فطرت میں یہ بات داخل کردی ہے کہ وہ اپنی بقا اور معیشت کے

اسباب کو پہچانے اور انہیں طلب کرنے کی سعی کرے۔ یہی وہ عام ہدایت ہے جو ہر موجود اور ہر مخلوق کو زندگی اور بقا کی ضروریات کی تحصیل میں رہنمائی کرتی ہے اگر یہ ہدایت نہ ہوتی تو اس پوری کائنات میں کوئی چیز بھی زندہ اور باقی نہ رہ سکتی۔

قرآن حکیم میں اللہ نے فرمایا ہے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى الَّذِي خَلَقَ فَسَوَّىٰ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ (سورۃ الاعلیٰ)

اپنے عالی شان پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اُسے درست کیا اور جس نے اس کے لئے اندازہ مقرر کردیا پھر اس پر راہِ عمل کھول دی۔ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے قَالَ رَبُّنَا الَّذِي أَعْطَىٰ كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدَىٰ" (سورۃ طٰہٰ) موسیٰ نے کہا کہ ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب خلقت عطا کی پھر اسے زندگی اور بقا کی راہ دکھائی۔ یہاں وہی عام ہدایت مراد ہے جو خالق کائنات کی طرف سے ہر مخلوق کو ملی ہے اور زمین کے ذروں اور سمندر کے قطروں سے لے کر آسمان کے ستاروں تک کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس کی فطرت میں یہ ہدایت نہ ہو اور وہ اپنی بقا کے وسیلوں سے آگاہی نہ رکھتی ہو۔ کائنات کی تمام مخلوقات میں سے ہر ایک دوسری چیزوں کو ان وسیلوں تک پہنچنے اور ان کی طلب میں صرف امداد کا کام انجام دیتی ہے اور دے سکتی ہے کبھی زیادہ اور کبھی کم۔ اس سے آگے وہ بالکل بے بس ہے۔ انسان میں قابلیت اور صلاحیت سب سے زیادہ ہے اور اسی کا بلند ترین مظہر وہ ہدایت اور رہنمائی ہے جو انبیاؑ رو مرسلینؑ کے لئے مخصوص ہے کہ وہ مشیت خداوندی کے مطابق انسان کو نیکیوں کی طرف دعوت دیتے ہیں اور حق و صداقت کی طرف اُس کی رہبری کرتے ہیں۔ ہدایت کی اس قسم کے علاوہ اس کی جس قدر قسمیں ہیں وہ سب کی سب خدا کی ذات پاک ہی کے قبضۂ قدرت میں ہیں اس بنا پر قرآن حکیم میں جہاں کہیں ہدایت کا تذکرہ کتاب الٰہی یا انبیاؑ رو مرسلینؑ کے ساتھ آیا ہے وہاں صرف اسی دعوۃ الے الخیر یعنی نیکیوں کی طرف رہنمائی ہی کو مراد لیا گیا ہے۔

"متقین" وہ لوگ ہیں جن میں تقویٰ ہو۔ تقویٰ اسم ہے اس کی اصل وِقَایَۃٌ ہے جس کے معنی ہیں بچانا اور حفاظت کرنا۔ تقویٰ کے اصلی معنی یہ ہیں کہ اپنے آپ کو ہر اس چیز سے بچایا جائے جس سے ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہو۔ شریعت کی اصطلاح میں تقویٰ کہتے ہیں ہر اُس چیز اور ہر اس عمل سے نفس کو بچانے کو جو گناہ کا سبب ہو اور یہ بات ممکن ہی نہیں ہے جبتک کسی کو گناہ سے نفرت اور اللہ کی معرفت نہ ہو اور اُس کے احکام کی عظمت و جلالت کا پورا احساس نہ ہو۔ اس جگہ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

کے جملہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ قرآن حکیم کی دو حیثیتیں ہیں ایک حیثیت تو اس کی وہ ہے جو عام لوگوں کی نظر میں ہے کہ وہ اسے صرف ایک کتاب سمجھتے ہیں جس میں چند واقعات کا ذکر ہے اور کچھ حکم دیئے گئے ہیں اور وہ اس کی گہرائیوں پر اور اس کی حکیمانہ باتوں پر غور نہیں کرتے اور بالکل سطحی اور ظاہری نگاہ سے اسے دیکھتے ہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ وہ لوگ اس سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتے اُسی طرح جیسے کسی بے انتہا خوشبودار پھول کی خوشبو کو وہ شامہ محسوس نہیں کرتا جو مرض کی وجہ سے ناکارہ ہو چکا ہو یا اس کے حسن و جمال کو وہ آنکھ محسوس نہیں کرتی جس کی بصارت ختم ہو چکی ہو۔ اور دوسری حیثیت قرآن حکیم کی وہ ہے جو ان لوگوں کی نظر میں ہے جو فکر و نظر کے خوگر ہیں، ان کا شعور اور ضمیر زندہ ہے۔ جو خدا کی معرفت رکھتے ہیں اور حقیقت کی تلاش اور جستجو کرتے رہتے ہیں اور جو متقی اور پرہیزگار ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے بیشک قرآن حکیم علم و معرفت اور ہدایت و ارشاد کا ایک عظیم وسیلہ ہے اور وہ اپنے درجہ اور صلاحیت کے مطابق اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اس طرح بذاتِ خود قرآن مجید بہر صورت وسیلہ ہدایت ہے لیکن اس سے فائدہ وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو متقی ہوں۔

"اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ" یعنی صاحبان تقویٰ کی صفت یہ ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں۔ غیب سے مراد وہ تمام چیزیں اور حقائق ہیں جو انسانی حواس سے دور ہیں اور معمولی عقل سے ان کا علم حاصل نہیں ہوتا۔ اس لفظ کے مفہوم میں خود اللہ کا وجود، اس کے صفات، جنت و جہنم، ملائکہ، قیامت اور وہ تمام چیزیں شامل ہیں جس کا علم انبیاء کرام علیہم السّلام کے خبر دینے ہی سے حاصل ہو سکا ہے۔

"وَیُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ"۔ اور وہ نماز کو قائم رکھتے ہیں اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ نماز کو پورے خشوع و خضوع، اس کے احکام کی پوری رعایت و حفاظت کے ساتھ اور اوقات کی پابندی کے ساتھ ادا کرتے رہتے ہیں اور تساہلی، غفلت و لاپروائی سے کام نہیں لیتے۔

"وَمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ" اور ہم نے انہیں جو کچھ رزق عطا کیا ہے اُس میں سے وہ خدا کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اس آیت میں عبادت کے تین بنیادی درجات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ ایک وہ عبادت جو ذہن سے تعلق رکھتی ہے یعنی ایمان بالغیب اور دوسری وہ جس کا تعلق بدن اور اعضائے جسم سے ہے یعنی نماز۔ اور تیسری وہ عبادت جس کا تعلق مال سے ہے یعنی اس کا راہ خدا میں خرچ

کرنا۔ اس میں شرعی نظام زندگی کی جتنی بنیادیں ہیں وہ سب آگئیں۔ اس کے بعد پھر کچھ اور تشریح کی جا رہی ہے "وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ" وہ ایسے لوگ ہیں کہ اُن تمام چیزوں پر جو تم پر اور تم سے قبل دوسرے انبیاء پر نازل کی گئیں ایمان رکھتے ہیں۔

"وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ" اور وہ آخرت پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہ ایمان بالغیب کی مزید تشریح ہے اور متقین کی چھٹی صفت ہے جس کو یہاں بیان کیا گیا ہے۔ عالم آخرت سے مراد وہ عالم ہے جو اس دنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد شروع ہوگا۔ جزا اور سزا کے دن پر یقین رکھنا اسلام کے بنیادی اعتقادات میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر اس کا کسی کو یقین نہ ہو تو وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔ "یُوْقِنُوْن" سے مراد یہ نہیں ہے کہ اُن کو آخرت کا محض سطحی طریقہ پر اقرار ہو جیسا کہ اکثر فلسفہ اور سائنس کے مسائل کو آدمی صرف رسمی حیثیت سے تسلیم کر لیتا ہے بلکہ ان کو اس کا ایقان ہو۔ "ایقان" کہتے ہیں اُس مرتبۂ علم کو جس میں ذرا سا بھی شک و شبہ نہ پایا جاتا ہو اس لئے مراد یہ ہے کہ اُن کے ارادہ، ان کی عقل، ان کے حواس اور ان کے سارے جذبات پر یقینِ آخرت چھایا ہوا ہو اور اُنہیں اُس کا ایسا پکّا یقین ہو کہ وہ گویا اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اُسی طرح جیسے وہ اپنی قریب کی چیزوں کا بغیر کسی دلیل و برہان کی مدد کے مشاہدہ کرتے ہیں پھر ظاہر ہے کہ ایسے لوگ جن کا یقین اس درجہ پر ہوگا اُن کا تقویٰ اور پرہیزگاری کس قدر بلند ہوگی!

"اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" جن لوگوں کی یہ صفتیں بیان کی گئی ہیں وہی ربّانی ہدایت سے فیضیاب ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔ مختصر یہ کہ قرآن حکیم سے ہدایت کا فیض اور برکت وہی لوگ حاصل کرتے ہیں جو صاحبان تقویٰ ہوتے ہیں اور ان کی صفتیں یہ ہیں کہ ان کے دل ایمان کی دولت سے سرشار ہوتے ہیں۔ اُن کے تصور میں جستجو اور تلاش حق کی تڑپ ہوتی ہے، ان کا ایمان خدا پر، انبیاءؑ و مرسلین پر اور غیب کی تمام ان باتوں پر ہوتا ہے۔ جو پیغمبروںؑ اور آسمانی کتابوں نے بیان کی ہیں اور وہ نہ صرف خاتم المرسلین کی رسالت پر یقین رکھتے ہیں بلکہ پورے سلسلۂ نبوت اور پورے نظام وحی والہام پر ایمان رکھتے ہیں اور ساتھ ہی خدا کی عطا کی ہوئی روزی جو خود انہیں ملی ہے اُس میں سے وہ اللہ کی راہ میں اس کی مخلوق پر صرف کرتے ہیں اس طرح وہ اِن نعمتوں کی کثرت کے باوجود اپنے فرائض سے بے خبر نہیں ہیں اور وہ اُن ذمہ داریوں کے پورا کرنے کے ساتھ ساتھ جو اللہ کی ذاتِ اقدس کی طرف سے ان پر عائد ہوتی ہیں اپنے اُس فرض کو بھی پورا کرتے ہیں جو اللہ کی مخلوق کی جانب سے ان کے ذمہ پر ثابت ہے۔ "اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ" کہہ کر اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ دنیا اور آخرت کی ہر

کامیابی صرف ان ہی لوگوں کو حاصل ہے " فلاح " کا لفظ بڑے وسیع معنی میں بولا جاتا ہے جو کامیابی کی ہر قسم کو شامل ہے۔ عربی زبان میں اس سے زیادہ جامع لفظ کوئی دوسرا موجود نہیں ہے جس سے دنیا اور آخرت کی خیر و کامیابی کا ہر مفہوم ظاہر ہو جاتا ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ز وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ ع وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِیْنَ ۝ یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ج وَمَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا یَشْعُرُوْنَ ۝ (درس ۳)

پ ۱ سورۃ البقرۃ ۔ رکوع ۱ کی آخری دو اور رکوع ۲ کی ابتدائی دو آیات

بیشک جو لوگ کافر ہو چکے ہیں ان کے حق میں برابر ہے خواہ تم انہیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اللہ نے ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے۔ اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔ اور لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر اور وہ ہرگز مومن نہیں ہیں۔ وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اصل میں وہ دھوکا کسی کو بھی نہیں دیتے بجز اپنی ذات کے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے

تشریح و تفسیر: خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ "خَتْمٌ" مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ اس کے مصدری معنی مہر کی طرح کا نشان لگانے کے آتے ہیں جبکہ اسم کے معنی اس نشان کے ہوتے ہیں جو مہر لگانے سے بن جاتا ہے۔ یہاں کوئی مادی مہر یا نشان مراد نہیں ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ انسان کو فہم و تدبر کی پوری صلاحیت عطا کی گئی ہے اور کائنات کو سمجھنے اور اس میں غور و فکر سے کام لے کر اللہ کی قدرت اور عظمت کا شعور حاصل کرنے کے تمام ضروری وسائل اُسے دیدیئے گئے ہیں مگر جب وہ اپنی عقل سے صحیح طریقہ پر کام نہ لے اور خدا کی روشن نشانیوں سے روگردانی کرے۔ گناہ سرکشی اور باطل نوازی اس کی طبیعت اور مزاج کا جزو بن جائے اس حد تک کہ اُس میں سچائی کی تاثیر اور قبول حق کا کوئی امکان باقی نہ رہے تو پھر وہ کائنات کے فطری نظام کے تحت سلسلۂ غضب الٰہی میں داخل ہو کر عذاب الیم اور ابدی سزا کا مستحق بن جاتا ہے۔ اللہ کی رحمت اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اور نصرتِ خداوندی اس سے الگ ہو جاتی ہے اور قانونِ قدرت کے مطابق جو سزائیں معین و مقدر

ہیں وہ اس کو جلنے لگتی ہیں۔ یہ ساری کائنات تاثیر اور اثر، اسباب اور نتائج کی پابند ہے۔ کوئی آگ میں گرے گا تو جل جائے گا، زہر کھائے گا تو مر جائے گا۔ اور اسی طرح کے دوسرے تمام اسباب کا حال ہے جن کے اثرات اُن کے ساتھ ہی ظہور میں آجاتے ہیں اس قانون اور دستور فطرت کے مطابق جو خالق کائنات نے مقرر کر دیا ہے اور عالم کی تمام مخلوقات اس کی تابع اور پابند ہے۔ بس اسی طرح یہ بھی قانون قدرت ہے کہ جب سرکشی اور عصیان حد سے بڑھ جائے گا انسان کے نفس کی خیر اور نیکی کی ساری صلاحیتیں جل کر فنا ہو جائیں گی تو پھر اس پر کسی تبلیغ اور ہدایت کا اثر نہ ہو سکے گا۔ اس کی ظاہری اور باطنی آنکھیں اندھی ہو جائیں گی اور حق و دیانت کی تیز سے تیز تر شعاعیں بھی اس کو نفع نہ دے سکیں گی۔ قرآنی ارشادات میں عقل و شعور اور ظاہری و باطنی حواس پر مہر لگنے سے یہی مراد ہوتی ہے اور آنکھوں پر پردہ پڑنے سے بھی یہی مقصود ہے۔ اگرچہ یہاں پر اشارہ خاص طور پر مدینہ کے یہودیوں کی طرف ہے جن کا کفر اور انکار حق انتہا کو پہنچ چکا تھا اور جو آخری رسولؐ کی تمام علامتیں پچھلی کتابوں سے معلوم کر چکے تھے مگر پھر بھی صرف اپنے دنیوی مفاد کو بچانے کے لئے انکار اور کفر پر اڑے رہے مگر اس خاص اشارہ کے باوجود ان آیات کا مفہوم عمومی حیثیت بھی رکھتا ہے اور وہ زمان و مکان اور شخصیتوں کا پابند نہیں ہے۔ غرض خدائے علیم و خبیر اپنے پیغمبرؐ کو اس کی خبر دے رہا ہے کہ کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو بظاہر تو زندہ ہیں مگر ان کے دل اور ان کا شعور مر چکا ہے اور وہ کسی حالت میں بھی ایمان نہ لائیں گے اور تبلیغ اسلام کی کوئی کوشش ان پر کارگر نہ ہوگی۔ یہ صرف ایک سچی خبر ہے مگر نہ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کی تبلیغ چھوڑ دی جائے اور نہ اس کا مقصد یہ ہو سکتا ہے کہ خدا کی مرضی اور خوشنودی بھی اسی میں ہے کہ وہ لوگ ایمان نہ لائیں اور کافر ہی رہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی بات کا جاننا اور چیز ہے اور اس کو چاہنا کہ وہ اسی طرح ہو جائے دوسری شئے ہے۔ ایک طبیب جانتا ہے کہ مریض کا آخری وقت ہے اور اب اس پر کوئی دوا اثر نہیں کر سکتی مگر اس کی مرضی یہ نہیں ہوتی کہ وہ مریض مر جائے اور وہ آخر وقت تک اپنی کوشش بھی جاری رکھتا ہے کیونکہ کوشش کرنے کا فرض اپنے مقام پر ثابت ہے اور علم اپنی جگہ پر حق ہے اور یہ دونوں ایک دوسرے پر منحصر نہیں ہیں۔ اسی طرح کی سیکڑوں مثالیں آپ خود تلاش کر سکتے ہیں جو زندگی کے ہر قدم پر آپ کے سامنے آتی رہتی ہیں۔

بس اسی طرح یہ بات بھی سمجھنا چاہئے کہ ایک طرف ظاہری حیثیت سے تبلیغ اور دعوۃ الی الخیر کے فرض کو جاری رکھنے کا نبی کریمؐ کو حکم ہے تاکہ بحیثیت حق اور دیانت کے مبلّغ اعظم ہونے کے اور بحیثیت اس کے کہ آپ بیمار انسانیت کے سب سے بڑے معالج ہیں۔ آپ لوگوں کو ہدایت فرماتے رہیں

اوران کی سرکشی اور کفر کا مداوا کرتے رہیں اور اس طرح منکروں اور دشمنوں کے ساتھ بھی خیر خواہی اور شفقت کا فرض پورا ہوتا رہے اور اس کوشش کا اجر و ثواب آپ کو ملتا رہے مگر علم خدا کی خبر یہی ہے کہ ایسے لوگ اس ہدایت سے متاثر نہ ہوں گے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ یہ پوری کائنات ایک خاص نظم و ضبط پر چل رہی ہے لیکن اس میں سے کچھ مخلوق ایسی ہے جو اپنے فعل پر ارادہ اور اختیار نہیں رکھتی جیسے چاند، سورج، ستارے، ہوائیں، نباتات وغیرہ اور کچھ ایسی ہے جو اپنے فعل پر اختیار رکھتی ہے جیسے انسان۔ اس پوری کائنات کا علم کامل اللہ کو ہے لیکن ہر فعل کے ساتھ اُس کی مرضی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ مرضی اُس کی اس کے خلاف ہو بشرطیکہ وہ مرضی ارادہ کی حد تک نہ ہو ورنہ اس کا پورا ہونا لازمی ہو جائے گا۔ ایک کافر اور مشرک کفر و شرک اپنے اختیار سے کرتا ہے خدا کی مرضی کا اس سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ بلکہ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اُس کی مرضی اس کے خلاف ہے۔ ورنہ اسلام کی تمام تعلیمات اور حشر و نشر کا ہر تصور بیکار اور باطل ہو جائے گا۔ اسی حقیقت کی طرف ان آیات کریمہ میں گہرے اشارے پائے جاتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ ءَاَنْذَرْتَھُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْھُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ۔ اور اس کے بعد کی دوسری آیت۔ ان آیات میں ایک خاص لفظ "قُلُوْبٌ" بھی آیا ہے جو قلب کی جمع ہے۔ یہ عام طور پر گوشت کے اُس ٹکڑے کے لئے بولا جاتا ہے جو ہر زندہ انسان کے سینہ میں دھڑکتا رہتا ہے، مگر قرآن و حدیث کی اصطلاح میں قلب سے مراد گوشت کا ٹکڑا نہیں ہوتا بلکہ وہ نفس اور وہ روح خاص مقصود ہوتی ہے جو حقیقت میں علم و عرفان و حکمت کی جگہ ہے اور وہی الٰہی خطاب کی اصلی مخاطب ہے اور اس طرح اُس گوشت کے دل کے بدلنے سے اُس حقیقی قلب میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

(سورہ ق) میں خدا کا ارشاد ہے "اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَہٗ قَلْبٌ" یعنی قرآن حکیم کے بیان کئے ہوئے عبرتناک واقعات میں بڑی نصیحت ہے اُس شخص کے لئے جس کے پاس دل ہو ظاہر ہے کہ گوشت کا دل تو سب ہی کے پاس ہوتا ہے۔ پھر یہ کیوں فرمایا گیا کہ جس کے پاس دل ہو وہی عبرت و نصیحت حاصل کر سکتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کا نفس اور ضمیر مردہ نہ ہوا ہو۔ یہاں "قلب سے مادّی دل نہیں بلکہ وہ روح و نفس مقصود ہے جس سے معارف و حقائق کے شعور کا تعلق ہوتا ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۢ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ۝ (درس)

(پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۲ کی ابتدائی تین آیات)

اور لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور قیامت کے دن پر، اور وہ ہرگز مومن نہیں ہیں، وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور اصل میں وہ دھوکا کسی کو بھی نہیں دیتے سوائے اپنی ذات کے اور وہ اس کو نہیں سمجھتے۔ ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا اور ان کے لئے دردناک عذاب ہے اس لئے کہ وہ جھوٹ بولا کرتے تھے۔

تشریح و تفسیر: "النَّاس" انسان کی جمع ہے اور ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ جمع نہیں ہے بلکہ اسم جمع ہے۔ "اسم جمع" اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے معنی تو جمع کے ہوں مگر وہ جمع بنانے کے قاعدہ پر نہ بنا ہو۔
"الیوم الآخر" سے مراد روزِ قیامت ہے اور چونکہ وہ اس مادی زندگی کے بعد ہوگا اس لئے اُسے "آخر" کہا گیا ہے۔ "یَوم" کے لفظی معنی "دن" کے ہیں اس سے اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ درحقیقت انسان کی زندگی اُس کی اس موجودہ مادی زندگی کے ختم ہونے یعنی یہاں کی موت پر ختم نہیں ہوجاتی بلکہ اس کا سلسلہ باقی رہے گا اور اصل تو یہ ہے کہ انسان کی ابدی زندگی کا ایک بہت ہی چھوٹا سا حصہ ہے اس دنیا کی یہ مادی زندگی۔ اصلی زندگی تو وہی ہے جو آخرت میں ہوگی۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہاں کی حیات اس لئے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ یہاں کے اعمال ہی پر آخرت کی زندگی کا معیار مقرر ہوگا۔ اسی وجہ سے حدیث میں دنیا کی زندگی کو آخرت کی کھیتی فرمایا گیا ہے۔ جیسا یہاں بویا جائے گا اسی کا پھل وہاں ملے گا۔
"یُخَادِعُوْنَ" اور "یَخْدَعُوْنَ" دونوں کا اصلی مادّہ "خَدْعٌ" ہے۔ البتہ "یُخَادِعُوْنَ" کا مصدر "خِدَاعٌ" اور "مُخَادَعَۃٌ" آتا ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو جو دل میں ہو دوسرے کے سامنے اس کے خلاف ظاہر کرنا اور اس کو دھوکا دینا۔ "یُخَادِعُوْنَ" کے معنی میں تاکید اور زور زیادہ ہے۔ "خدا کو دھوکا دینے" سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے خیالِ ناقص میں سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کو دھوکا دے رہے ہیں ورنہ ظاہر بات ہے کہ خدا کو کون دھوکا دے سکتا ہے۔ یا اس سے مراد خدا والوں کو دھوکا دینا ہے کیونکہ انبیاءؑ و مرسلینؑ اور خاصانِ خدا کے ساتھ کوئی معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے خدا کے ساتھ ہو۔ قرآن حکیم میں جابجا اس طرح کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

"مَرَض" کے معنی ہیں مزاج کا اعتدال کی حد سے نکل جانا اور جس طرح یہ لفظ جسمانی بیماریوں کے لئے بولا جاتا ہے اسی طرح سے نفس و روح کی خرابیوں اور بیماریوں کے لئے بھی بولتے ہیں۔ ان آیاتِ کریمہ میں مرض سے مراد کفر اور شرک، شک اور نفاق ہے۔ "فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا" میں مرض کو زیادہ کر دینے سے مراد یہ ہے کہ خدا نے اپنے رسولؐ اور ایمان والوں کو جو عزت اور بلندی، ترقی اور کامیابی عطا فرمائی اس کو دیکھ کر کافروں اور منافقوں کے دلوں میں حسد اور جلن کی آگ بڑھ گئی اور چونکہ وہ باطنی بصیرت اور عقل کی ہدایت سے محروم تھے اس وجہ سے ان چیزوں کو دیکھ کر بجائے ایمان لانے کے اُن کا بغض اور دشمنی زیادہ ہو گئی۔

"وَمِنَ النَّاس" کے قبل قرآن حکیم نے دو قسم کے انسانوں کا ذکر کیا تھا ایک وہ جو متقی اور پرہیزگار ہیں اور احکامِ الٰہی پر دل سے عمل کرتے ہیں اور دوسرے وہ لوگ جو کھلے ہوئے مشرک اور کافر ہیں اور جن کی طبیعت میں سرکشی اور گمراہی اپنا گھر کر چکی ہے۔ اب ایک ایسے گروہ کا بیان ہے جو زبان سے تو ایمان کا اقرار کرتا ہے مگر اس کے دل اس کی تصدیق نہیں کرتے۔ یہ بھی اصل میں کافر ہی ہوتے ہیں مگر صرف اپنے ذاتی مقاصد کو پورا کرنے کے لئے زبان سے انکارِ حق نہیں کرتے اور اس طرح اپنے اصلی کفر اور الحاد پر زبانی اقرار کا پردہ ڈالے رہتے ہیں ایسے ہی لوگ منافق کہلاتے ہیں۔

یہ منافقوں کا گروہ اسلام میں اُس وقت پیدا ہوا تھا جب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ میں تشریف لائے تھے۔ مکہ میں عام طور پر حالت یہ تھی کہ مسلمان خود اپنے اسلام کو دشمنوں کے خوف سے مخفی رکھنے کی کوشش کرتے تھے مگر مدینہ میں بالکل اس کے برعکس مخالفِ اسلام گروہ اپنے کفر کو چھپاتا تھا تاکہ مسلمان اس دھوکے میں رہیں کہ وہ ان کے اسلامی بھائی ہیں۔ اور یہ لوگ مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کرتے رہیں۔

اس جماعت کی بنیاد باقاعدہ طریقہ پر جنگ بدر کے بعد پڑی تھی جب ان لوگوں نے اسلام کی شان کو بڑھتے ہوئے دیکھا تو حسد کی آگ میں جلنے لگے اور اندر ہی اندر مخالفتوں کے جال بچھانے کی کوشش میں مشغول ہو گئے۔ یوں تو منافقوں کی تعداد بہت تھی مگر ان میں سب سے زیادہ ذی اثر عبداللہ بن اُبی بن سلول تھا۔ اس کا پورا نام عبداللہ بن اُبی بن مالک بن الحارث تھا۔ "سَلُول" اس کی دادی کا نام تھا جس کی طرف نسبت سے یہ "ابن سَلُول" مشہور ہو گیا۔ یہ قبیلہ خَزرَج کا سردار تھا مگر اس کے باوجود قبیلہ اَوس اور دوسرے قبائل بھی اس کا بڑا احترام کرتے تھے۔ یہ احترام اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ بہت جلد ہی اس کی شاہی کا اعلان بھی ہونے والا تھا۔ لیکن ہجرتِ رسولؐ اسلام اور جنگ بدر

کی عدیم المثال فتح کے بعد اس کی بادشاہت کا خواب پھر شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا اور آخر مجبور ہو کر اس نے اپنے اسلام کا اعلان کر دیا مگر در پردہ اسلام کے خلاف کوشش کرتا رہا اور اپنے تمام دوستوں اور حمایت کرنے والوں کو اس سازش پر ابھارتا رہا۔ ابن سلول کے ساتھی منافقین اوس و خزرج کے قبیلوں سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے علاوہ مدینہ کے یہودی قبیلوں کی بھی ایک بڑی جماعت اس منافقت اور سازش میں اپنی پوری ضمیر فروشی اور انسانیت دشمنی کے ساتھ شریک تھی۔ درحقیقت دشمنوں کی یہ قسم جو منافق کہلاتی ہے کھلے ہوئے دشمنوں سے بہت زیادہ خطرناک ہوا کرتی ہے اور عام طور پر تباہیاں قوموں ہی پر نہیں بلکہ افراد پر بھی کھلے ہوئے دشمنوں سے بہت زیادہ ایسے ہی دشمنوں کی وجہ سے آتی رہتی ہیں۔ جو آستین کا سانپ بن کر ہر وقت ساتھ رہتے ہیں اور موقع ملتے ہی اپنے ساتھی کا کام تمام کر دیا کرتے ہیں۔ ایسے چھپے ہوئے دشمنوں کے زہر سے بچنا ہر شخص کے لئے ممکن نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے لئے وہ ابتدائی دور کس قدر نازک تھا جب وہ ہر طرف سے کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اسلام کے ان دشمنوں کے پاس دنیوی اقتدار تھا، دولت تھی، اسلحہ تھا اور ساتھیوں کی کثرت تھی اور کیا کچھ نہ تھا اور دوسری طرف مٹھی بھر مسلمان تھے جو ان تمام مادّی وسائل سے خالی تھے۔ پھر وہ کونسی چیز تھی جس کی طاقت نے اُن نہتے مسلمانوں کو اُبھار کر بلندی دیدی۔ یقیناً وہ طاقت ان کے ایمان کی تھی، آپس کے اتحاد و اتفاق کی تھی، وحدت اور مرکزیت کی تھی وہ قوت اُس یقین محکم کی تھی جو انہیں خدا اور رسولؐ کی ذات پر حاصل تھا۔ اس وحدت اور یگانگت اور تنظیم میں نہ تو رنگ و نسل کی کوئی تفریق تھی، نہ خط اور زبان کا کوئی امتیاز تھا اور نہ امیر و غریب کا کوئی فرق تھا۔ مخلص مسلمانوں کی اس عظیم ایمانی اور اخلاقی طاقت کے سامنے کفر و شرک کا سارا اقتدار خاک میں مل کر رہ گیا اور ساتھ ہی منافقوں کی ہر سازش بے اثر ہو گئی۔ اسلام پہلے کی طرح آج بھی ہم سے اسی یقین، اسی ایمان اسی تنظیم اور اسی بے غرض دوستی، یکجہتی اور آپس کے اتحاد و اتفاق کا طلبگار رہے۔ اور اسی میں ہماری خوش حالی، ترقی اور زندگی ہے۔

(درس ۵) وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا

خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ○ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ○

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۲ کی درمیانی ۶ آیات۔

اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ پھیلاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم اصلاح کر رہے ہیں جان لو کہ بیشک یہی لوگ فساد کرنے والے ہیں لیکن وہ نہیں سمجھتے اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جس طرح اور لوگ ایمان لائے ہیں تم بھی ایمان لاؤ تو کہتے ہیں کہ ہم بھی کیا اُسی طرح ایمان لائیں جس طرح یہ بیوقوف ایمان لائے ہیں سن لو کہ بیوقوف تو خود یہی لوگ ہیں لیکن وہ اس کا علم نہیں رکھتے اور جب وہ ان لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں ہم تو (مسلمانوں سے) مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ہی ان کے ساتھ استہزا کرتا ہے اور وہ انہیں ڈھیل دے رہا ہے (تو) وہ اپنی سرکشی میں بھٹک رہے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلہ گمراہی خرید لی پھر نہ ان کی تجارت ہی نے کچھ نفع دیا اور نہ انہیں ہدایت ملی۔

تشریح وتفسیر: ”فساد“ کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا اپنی مناسب اور معتدل حالت سے نکل جانا اسی مناسبت سے جھگڑے وغیرہ کو بھی فساد کہا جاتا ہے۔ اس آیہ کریمہ میں فساد فی الارض سے مراد کفرو نفاق اور گناہوں کا ارتکاب ہے اور اُس نظام عدل وانصاف کا انکار ہے جو انبیاء کرام نے تعلیم دیا ہے اور درحقیقت اسی نظام عدل یعنی اسلام کو چھوڑ کر دوسری راہیں اختیار کرنے ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ انسانی معاشرہ ابتری بدنظمی اور طبقاتی کشمکش میں مبتلا ہو گیا۔ اگر اسلام کی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا جاتا تو آج یہ خوف ودہشت اور بدامنی کی دنیا امن وامان کی جنت ہوتی۔ غرض صلاح وفساد دونوں باتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اعتدال پر رہنا صلاح ہے اور اس سے ہٹنا فساد ہے خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ ”سُفَہَاءُ“ ”سَفِیہٌ“ کی جمع ہے۔ یہ ”سَفَہٌ“ سے بنا ہے اس کے معنی جہالت، بیوقوفی، بدعقلی اور حماقت کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین ان لوگوں کو جو ایمان لے آتے تھے بیوقوف سمجھتے تھے اور اپنے آپ کو بہت عقلمند اور ہوشیار خیال کرتے تھے حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس تھی اور یہ خود منافقوں ہی کی حماقت تھی کہ وہ ایمان کی عزت سے محروم رہے۔

"شیطان" شَطَن ، سے بنا ہے۔ عام طور پر اس سے مراد ابلیس ہے لیکن اس کے اصلی معنی باغی اور سرکش کے ہیں خواہ وہ جن ہو یا انسان ہو یا کوئی اور۔ یہاں "شیاطین" سے مراد منافقوں کے سردار ہیں اور وہ یہودی بھی مراد ہیں جو منافقوں کو اسلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں سکھایا کرتے تھے "استہزاء" کا اصلی مادہ "ھَزْءٌ" ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی کا مذاق اڑانا "مَدٌّ" کے معنی ہیں کھینچنا ، بڑھانا، مہلت دینا، ڈھیل دینا۔ یہاں آخری معنی مقصود ہیں۔ "طُغیان" حد سے آگے بڑھنے کو کہتے ہیں۔ یہاں کفر و ضلالت اور گمراہی و سرکشی مراد ہے "یَعْمَهُوْنَ" "عَمَهٌ" سے بنایا گیا ہے۔ معنی ہیں حیرانی، سرگردانی اور صحیح راہ سے بھٹک جانا۔ "اشتراء" کے معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز کے بدلہ میں لے لینا۔ اس جگہ مراد یہ ہے کہ ان منافقوں کے اختیار میں یہ بات پوری طرح تھی کہ وہ دل سے ایمان اختیار کر لیتے مگر انھوں نے ایسا نہ کیا بلکہ اس کے بدلہ میں کفر اور گمراہی کو پسند کیا اور ایمان نہ لائے۔ "فَمَا رَبِحَتْ تِجَارَتُهُمْ" سے مقصود یہ ہے کہ ان کی یہ تجارت ان کے لئے قطعی طور پر نفع بخش ثابت نہ ہو سکی بلکہ ان کا اصلی سرمایہ یعنی ان کی عقل ہی برباد ہو کر رہ گئی اور وہ زندگی کی ساری نیکیوں اور بھلائیوں سے محروم ہو گئے۔

ان آیاتِ کریمہ کے پہلے حصہ میں یہ بات صاف طور پر سمجھا دی گئی ہے کہ صلاح اور فساد کا اصلی معیار درحقیقت وہی ہے جو اللہ نے مقرر فرما دیا ہے یعنی وہ نظامِ عدل جس کی تعلیم ہمیں اُس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے دی ہے اور اُسی پر عمل کرنا "صلاح" ہے اور صالحین ایسے ہی لوگ ہیں جو اُس نظامِ خداوندی پر عمل کرتے ہیں جبکہ اُس دستورِ عدل کے خلاف عمل کرنا اور اُس سے بغاوت کرنے کا نام فساد ہے خواہ وہ کسی بھی طریقہ سے ظہور میں آئے اور مفسد وہی لوگ ہیں جو اس قانونِ الٰہی سے بغاوت کا ارتکاب کرتے ہیں۔

پھر "اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ" فرما کر اس بات کو پوری طرح صاف کر دیا گیا کہ اصل میں قانونِ اسلام ہی امنِ عالم کی واحد ضمانت ہے اور جو اس قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی کرنے گا وہی مفسد ہے چاہے وہ اپنے آپ کو کتنا ہی مصلح سمجھتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی پہلے کی طرح "اصلاح و تعمیر" کے نام پر دنیا میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اُس سے انسانی معاشرہ میں سُکھ اور امن و اطمینان کے بجائے آپس کی طبقاتی منافرت، بدحالی، بدامنی اور بدنظمی، ابتری اور افراتفری ہر طرف پھیلتی جا رہی ہے اور اصلاح و تعمیر کے بڑے بڑے دعوے بالکل بے اثر نظر آتے ہیں اور ساری دنیا تباہی کی طرف تیزی سے دوڑتی چلی جا رہی ہے۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ

انسان کے ضمیر پر بد دیانتی کا پوری طرح تسلط ہو چکا ہے اور اُس نے آسمانی قانونِ عدل کا اپنے کردار اور عمل سے مذاق اُڑایا ہے۔ وہ اپنے آپ کو مصلح کہتا ہے لیکن در پردہ اس کے ذہن و فکر پر مفاد پرستی اور خود غرضی چھائی ہوئی ہے۔ قرآن حکیم نے ان نام نہاد مصلحوں کے چہروں سے یہ کہہ کر پردہ اُلٹ دیا ہے کہ یہ لوگ ہرگز مصلح نہیں ہیں بلکہ یہی تو فساد کی جڑ ہیں اور اصلاح و تعمیر کے نعروں سے یہ دنیا کو دھوکا دے رہے ہیں اور اس کا سب سے بڑا سبب صرف یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کے قانون عدل و انصاف سے انحراف کیا ہے۔ اس کے بعد کی آیات میں بھی منافقوں کے کردار پر روشنی ڈالی گئی ہے کہ ان کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ اور ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ اہلِ ایمان کو احمق اور بیوقوف سمجھتے ہیں مگر انہیں اس کی مطلق خبر نہیں کہ وہ خود ہی عقل و فہم کی نعمت سے محروم ہو چکے ہیں جس کا نتیجہ اُن کے سامنے آ چکا ہے، آتا رہتا ہے اور آتا رہے گا۔

اسی سلسلہ میں منافقوں کے اس قول کو دہرایا گیا ہے کہ "ہم ایمان والوں کا مذاق اُڑاتے ہیں" اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ ان کے اس تمسخر کے بدلہ میں اللہ خود ان سے تمسخر فرماتا ہے۔ عربی زبان میں یہ محاورہ بہت عام ہے کہ فعل کی جزا کو بھی اصل فعل ہی کا نام دیدیا جاتا ہے۔ اس لئے ہنسی اور تمسخر کا انتساب اللہ کی ذات کی طرف کرنے سے اس جگہ مراد یہ ہے کہ وہ ان منافقوں کو ایمان والوں کے ساتھ تمسخر کرنے کی سزا دے گا۔ خود قرآن حکیم میں اور پچھلے آسمانی صحیفوں میں اس طرح کی عبارتوں کی مثالیں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

آخر میں منافقوں کی حالت پر مزید روشنی ڈالی گئی ہے کہ انہوں نے گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دی اور حق سے روگردانی کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اب اپنی گمراہی میں چاروں طرف بھٹکتے پھرتے ہیں کہیں کوئی سہارا انہیں ملتا اور کسی طرف کوئی نجات کا راستہ نظر نہیں آتا اور خدا نے انہیں پوری طرح مہلت دیدی ہے تاکہ اُن پر اُس کی حجت تمام ہو جائے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ
اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ۝ صُمٌّ بُكْمٌ
عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ۝ أَوْ كَصَيِّبٍ مِنَ السَّمَاءِ فِيهِ
ظُلُمَاتٌ وَرَعْدٌ وَبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُونَ أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ
مِنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۚ وَاللَّهُ مُحِيطٌ بِالْكَافِرِينَ ۝
يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُمْ

مَشَوْا فِيْهِ ۙ وَ اِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ۝

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۲ کی آخری چار آیات۔

ان کی مثال اُس شخص کی سی ہے جس نے آگ جلائی پھر جب اُس نے اس کے گرد و پیش کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی سلب کر لی اور اُنھیں اندھیروں میں چھوڑ دیا کہ اب وہ کچھ نہیں دیکھتے۔ بہرے ہیں گونگے ہیں، اندھے ہیں تو اب وہ واپس نہ ہوں گے یا جیسے آسمان سے زور کا مینھ برس رہا ہو اُس میں اندھیرے ہیں اور گرج اور بجلی۔ وہ کڑک کے سبب موت کے ڈر سے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیتے ہیں حالانکہ اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ قریب ہے کہ بجلی اُن کی آنکھیں اُچک لے جائے وہ جب ان پر چمکتی ہے تو اُس کی روشنی میں چلنے لگتے ہیں اور جب اُن پر اندھیرا چھا گیا تو کھڑے ہو گئے اور اگر اللہ چاہتا تو ان سے ان کے کان اور آنکھیں سلب کر لیتا بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

تشریح و تفسیر: "اِسْتَوْقَدَ" وَقْدٌ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ہیں آگ روشن ہونا "اِسْتَوْقَدَ نَارًا" کے معنی ہیں آگ جلائی۔ "صُمٌّ" اَصَمّ کی جمع ہے۔ بہرے کو کہتے ہیں۔ بُکْمٌ اَبْکَم کی جمع ہے۔ گونگے کو کہتے ہیں۔ "عُمْیٌ" ۔ اَعْمٰی کی جمع ہے یعنی اندھے۔ "لَا يَرْجِعُوْنَ" یعنی وہ اب اپنے کفر و ضلالت سے حق کی طرف نہیں پلٹیں گے۔ صَیِّب۔ کا اصلی مادہ "صَوْبٌ" ہے اور اس سے مراد بارش ہے۔ "خَطْفٌ" کے معنی اُچک لینا یا جھپٹ لینا ہیں۔ "يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ" کا مطلب یہ ہے کہ بجلی کی چمک سے ان کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور اُنہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ ان آیات میں منافقوں کی حالت بیان کی گئی ہے کہ اُن کی مثال ایسے لوگوں کی سی ہے جو اندھیرے میں آگ جلائیں اور جب خوب روشنی ہو جائے تو دفعتہً وہ روشنی جاتی رہے اور چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے۔ اسی طرح یہاں بھی خدا کی قدرت کی نشانیوں کی روشنی پھیلی ہوئی ہے مگر منافقوں کی باطنی بصارت سلب ہو چکی ہے اس لئے اُس سے اُنہیں کوئی بھی فائدہ حاصل نہ ہو سکا اور نورِ ہدایت کی شعاعوں کو ان کی آنکھیں برداشت نہ کر سکیں کیونکہ انہوں نے ان وسائل کو برباد کر دیا جن سے ان کے شعور میں حق کو پہچاننے اور سچائی کی معرفت حاصل کرنے کی قابلیت پیدا ہو سکتی اور ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ صرف ان ہی کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ خدا نے اپنی رحمتِ کاملہ سے

اُن کو ہرطرح کا موقع عطا فرمایا تھا اوران کے چاروں طرف اپنی آیتوں اور ہدایتوں کا نور پھیلا دیا تھا مگر وہ ان کے لئے بے اثر ہوگیا صرف اس وجہ سے کہ انہوں نے عقل وفہم کی اس صلاحیت سے صحیح طور پر کام نہ لیا جو خدا نے ان کو عطا فرمائی تھی اور وہ اسی طرح بہرے، گونگے اور اندھے ہوگئے جس طرح کائنات کے اس نظام ظاہری میں ہر چیز کا حال ہے اور وہ تاثیر اور قبولِ اثر کے فطری قانون کی پابند ہے۔ اس میں مرضی الٰہی کو مطلق کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب ان منافقوں نے اپنی سماعت یعنی حق بات کو سننے کی حس برباد کردی تو اب یہ ہدایت اور حق کی ہر آواز سننے سے محروم ہوگئے اور جب انہوں نے عقل و شعور سے کام نہ لیا تو اس کا انجام یہی تھا کہ اب یہ حق و دیانت کی راہ دیکھنے کے قابل ہی نہ رہے اور اندھے ہوگئے۔ خدا نے انہیں بولنے کی قوت بھی عطا فرمائی تھی تاکہ وہ اس کو ان باتوں کے ظاہر کرنے میں صرف کرتے جو رضائے الٰہی کے مطابق تھیں مگر انہوں نے اپنی قوت گویائی کو جھوٹ بولنے میں، دوسروں کو دھوکا دینے میں اور ایسے کاموں میں صرف کیا جو غضب خداوندی کا سبب ہیں اس لئے اب وہ حق اور ایمان کی گفتگو کرنے کی قابلیت ہی سے خالی ہوگئے اور جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا کہ یہ سب کچھ محض ان لوگوں کے اپنے اختیاری عمل ہی کا انجام ہے اور خلق اللہ کے تکوینی نظام یعنی اس ضابطۂ تاثیر و قبولِ اثر کا نتیجہ ہے جو خالق کائنات نے مقرر فرما دیا ہے۔ مرضی خدا کو اس نتیجہ کے حصول میں کوئی دخل نہیں ہے۔

سورۂ رعد میں اللہ کے اس ارشاد سے بھی اسی حقیقت کی طرف صاف طور پر اشارہ پایا جاتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِہِمْ بیشک اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جبتک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہیں بدلتی۔ یعنی مسلسل نافرمانیوں اور کفرانِ نعمتِ خداوندی اور آیاتِ الٰہیہ سے روگردانی کی وجہ سے آخر میں قومیں ان اعمال کے بُرے اور تباہ کن انجام کی گرفت میں آجاتی ہیں اور اُن پر قہر الٰہی کا نزول ہونے لگتا ہے، اُسی قانون تکوینی کے مطابق جس کو ابھی بیان کیا گیا۔ "اَوْ کَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ" سے قبل اُن منافقوں کا ذکر تھا جن کے دلوں میں کفر ہی کفر تھا اس لئے اُن کا اندھوں، بہروں اور گونگوں کے ناموں سے ذکر فرمایا گیا۔ اور اب منافقوں کی دوسری قسم کا تذکرہ ہے جو مکمل طور پر تو منکر حق نہیں ہیں مگر شک وشبہہ میں پڑے ہوئے ہیں جب اسلام کا ظاہری اقتدار بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں تو اُس کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور اگر اس میں کمی پاتے ہیں تو شرک کرنے لگتے ہیں اور اسلام کے دشمنوں سے ساز باز کرتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا ہے۔

"یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَھُمْ فِیْٓ اٰذَانِھِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ" وہ موت کے خوف سے اپنی انگلیاں

اپنے کانوں میں رکھ لیتے ہیں تاکہ کچھ سنائی نہ دے اس سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ منافقین قرآن حکیم کے ارشادات سننے سے بچتے ہیں کہ کہیں یہ کلام الٰہی اُن پر اثر نہ کر جائے اور وہ اپنے عیش و عشرت اور رنگ رلیوں سے کہیں محروم نہ ہو جائیں کیونکہ اگر کبھی اُن کا دل متاثر ہو گیا اور انہیں سچے طریقہ پر اسلام لانا پڑا تو وہ پھر اس بدچلنی، آوارگی، عیاشی، سرکشی، مفاد اور موقع پرستی، ظلم و استبداد، دھوکا، فریب اور بے لگام آزادی کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں گے اور انہیں اسلام کے قانونِ عدل و انصاف پر عمل کرنا پڑے گا جو اُن کے نزدیک گویا اُن کی موت ہے۔

"یَکَادُ الْبَرْقُ یَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ" اس ارشاد سے مقصود یہ ہے کہ یہ منافق لوگ جب اسلام کا ظاہری عروج دیکھتے ہیں تو اُن کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں اور پھر اس شان و شوکت کو دیکھ کر طمع دنیا میں اسلام کے کچھ قریب آجاتے ہیں مگر جب اس میں کمی اور مصائب و آلام دیکھتے ہیں تو پیچھے ہٹنے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اسلام میں کوئی اصلیت موجود نہیں ہے۔

آخر میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ عذاب کرنے میں جلدی نہیں کرتا بلکہ ڈھیل دیتا ہے تاکہ کسی وقت تو سرکش انسان حق کے راستہ پر آجائے اور اپنی گمراہی کا احساس کرلے، ورنہ اللہ مجبور نہیں ہے وہ ہر وقت عذاب نازل کرسکتا ہے اور عالم کی کوئی بڑی سے بڑی قوت اُس کے قہر و عذاب کی گرفت سے کسی کو بھی نہیں چھڑا سکتی۔

(درس) یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ○ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۳ کی ابتدائی ۲ آیات۔

اے لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور اُن لوگوں کو جو تم سے پہلے تھے پیدا کیا۔ عجب نہیں کہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔ جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس پانی سے تمہاری روزی کے لئے پھل پیدا کئے۔ پس تم اللہ کے شریک نہ مقرر کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔

تشریح و تفسیر: "فِرَاشًا" کا لفظ جب بطور اسم کے بولا جائے تو اس سے مراد ہر وہ چیز

ہوتی ہے جو بچھائی جائے۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ خدا نے زمین کو سکونت اور رہائش کے لائق بنایا ہے اور اس طرح خلق نہیں فرمایا کہ اُس پر کوئی ٹھہر نہ سکتا ہو۔ اس کی جمع "فُرُش" آتی ہے۔ "سَمَاءٌ" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کے سر کے اوپر بلند ہو۔ یہاں مراد آسمان ہے۔ "بِنَاءٌ" مصدر بھی ہے جس کے معنی ہیں تعمیر کرنا، بنانا اور کبھی اس لفظ کو خود عمارت اور مکان وغیرہ کے لئے بھی بولتے ہیں چاہے وہ کوئی گھر ہو، خیمہ ہو یا گنبد کی طرح کی چھت ہو۔ یہاں یہی مراد ہے کہ خدا نے آسمان کو گنبد کی طرح بنایا۔ "سَمَاءٌ" واحد ہے جس کے معنی ایک آسمان کے ہیں مگر یہاں بطور "اسم جمع" کے بولا گیا ہے اور مراد تمام آسمان ہیں۔ "نِدٌّ" کسی چیز کے ہمسر اور مثل کو کہتے ہیں جو اس کی ذات اور صفات میں شریک ہو۔ اس کی جمع "اَنْدَاد" ہے۔

"یَا اَیُّھَا النَّاسُ" اے انسانو! کا جملہ فرما کر تمام انسانیت کی طرف خطاب کیا گیا ہے۔ اس خطاب میں نہ کسی مُلک کی خصوصیت ہے اور نہ قوم و رنگ و نسل اور زبان کی تفریق ہے۔

پچھلی آیتوں میں تین قسم کے انسانوں کا ذکر کیا گیا تھا۔ ایک سچے مومن دوسرے پکے کافر و مشرک تیسرے منافقین جن کا ظاہر کچھ ہوتا ہے اور باطن کچھ اور ہوا کرتا ہے۔ اس تفصیل کے بعد اب پوری انسانیت کی طرف خطاب کیا گیا ہے اور جس انسان میں بھی سُننے اور سمجھنے کی صلاحیت پائی جاتی ہے وہ اس خطاب الٰہی کا مخاطب ہے۔ اس سے یہ بات صاف ظاہر ہو جاتی ہے کہ قرآن پاک کسی خاص قوم خطّہ، مُلک اور رنگ و نسل کے لئے نازل نہیں ہوا۔ بلکہ یہ پوری انسانیت کے لئے اللہ کا پیغام ہدایت ہے اور یہ پیغام زمان و مکان کی قیدوں سے بالاتر ہے۔ اس خطاب عام کے ساتھ سب سے پہلی بات جو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ کائنات خود بخود نہیں بن گئی بلکہ اس کا کوئی خالق ہے جس نے اپنی قدرت کاملہ سے اس کو پیدا کیا اور وہی اس کا حقیقی رب اور پروردگار ہے۔ اُسی نے زمین کو پیدا کر کے اس کو رہنے اور اُس کے اندر رہائش اختیار کئے جانے کے قابل بنایا۔ اُسی نے بادلوں سے پانی برسایا اور اُس پانی سے طرح طرح کے پھل اور میوے پیدا کئے، جن سے تمام جاندار اپنی اپنی غذائیں حاصل کرتے ہیں اس الٰہی بیان سے عالم کے تکوینی نظام کے متعلق دو اہم ترین بنیادی باتیں معلوم ہو گئیں ایک یہ کہ جب تک کوئی بنانے والا اور پیدا کرنے والا موجود نہ ہو اُس وقت تک نہ کوئی چیز بن سکتی ہے اور نہ پیدا ہو سکتی ہے۔ ہر مخلوق کے لئے اس کا خالق، ہر مصنوع کے لئے اس کا بنانے والا اور ہر اثر کیلئے اس کا موثر ضروری ہے۔ بس اسی طرح مجموعی حیثیت سے یہ پوری کائنات بغیر کسی صاحب قدرت خالق کے پیدا نہیں ہو سکتی تھی اور وہی عظیم خالق اور قادر مطلق پیدا کرنے والا اللہ ہے۔

دوسری بنیادی بات یہ سمجھائی گئی کہ اس کائنات کی پیدائش کے بعد اس کی زندگی، بقا اور ترقی، بڑھنے اور نشوونما پانے کے لئے بھی یہ لازمی تھا کہ اس کا کوئی تربیت کرنے والا اور پرورش، نگہداشت اور خبرگیری کا ذمہ دار موجود ہو کیونکہ اس کے بغیر نہ تو کوئی چیز باقی رہ سکتی تھی اور نہ وہ نشوونما پا سکتی تھی اور نہ ترقی کر سکتی تھی۔ اس بیان سے یہ نتیجہ بھی نکل آیا کہ ان دونوں بنیادی باتوں یعنی پیدایش اور تربیت کے مرکز کا واحد ہونا بھی لازمی ہے ورنہ کائنات کا نظام کسی صورت میں بھی برقرار نہ رہ سکتا۔ خلق کرنے والے کی مرضی کچھ اور ہوتی اور تربیت کرنے والا کچھ اور چاہتا اور اس تصادم کی وجہ سے کائنات کا پورا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ مخلوقات کی بقا اور ترقی و نشوونما صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ خلق کرنے والا اور تربیت دینے والا ایک ہی ہو اور کوئی دوسری ایسی طاقت نہ پائی جاتی ہو جو خالق کی مرضی اور ارادہ میں کسی قسم کا خلل ڈال سکے اور اس کے لئے رکاوٹ بن سکے۔ یہی وہ توحید کا عقیدہ ہے جو انسان کے تمام مسائل زندگی کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور اسی لئے قرآن پاک میں خدا نے ان آیات میں پوری انسانیت کی طرف خطاب کر کے اس حقیقت کو تمام دوسری باتوں سے پیشتر سمجھا دیا ہے کیونکہ اسی مقام سے تمام عقیدوں کی ابتدا ہوتی ہے اور یہیں سے زندگی کا ہر تصور شروع ہوتا ہے۔

اس ارشادِ خداوندی کا خلاصہ یہ ہوا کہ جب انسان اور تمام کائنات کی پیدائش، بقا اور ترقی و تربیت کا پورا اختیار صرف خدائے واحد و یکتا ہی کے قبضۂ قدرت میں ہے اور اس کا پورا علم اُسی کو ہے کہ انسان کے لئے کونسی چیز اچھی، درست و جائز اور مفید ہے اور کیا چیز بُری اور مضر ہے اور کیا حق ہے اور کیا باطل ہے تو پھر یقیناً انسان کے لئے یہ بات لازم اور ضروری ہے کہ وہ خدا ہی کے مقرر کئے ہوئے دین کو اختیار کرے اور اسی کے حکم پر عمل کرے، اُسی کی اطاعت و عبادت کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جس میں اُس کی ناراضی، نافرمانی اور سرکشی اور گناہ کا اندیشہ ہو۔ اسی میں انسان کی نجات ہے۔ یہی اُس کی فلاح کا واحد راستہ ہے اور یہ راستہ وہی ہے جو خدا کے بھیجے ہوئے پیغمبروںؑ نے اُسے تعلیم دیا ہے۔ یہی مذہب حق ہے۔ یہی الٰہی دین ہے اور یہی اسلام ہے۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ص وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِىْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ صلے اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ○ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ط كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا لا قَالُوْا هٰذَا الَّذِىْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ لا وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ط وَلَهُمْ فِيْهَآ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ق وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (درس)

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۳ کی درمیانی ۳ آیات

اور اگر تمہیں اس کلام کے بارہ میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے تو ایسا ہی کوئی ایک سورہ تم بھی لے آؤ اور اپنے مددگاروں کو بھی جو اللہ سے الگ ہیں بلالو اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم ایسا نہ کر سکو گے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کو خوشخبری دیدو کہ بیشک ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ انہیں جب کوئی پھل کھانے کے لئے دیا جائیگا تو وہ بول اٹھیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے ملا تھا اور انہیں دئے ہی جائیں گے ملتے جلتے پھل۔ اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اور وہ لوگ ان بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔

"رَیْب" اُس شک کو کہتے ہیں جس میں تہمت اور جھوٹا الزام لگانے کا جذبہ بھی شامل ہو۔ "سُوْرَۃٌ" کے معنی بلند درجہ اور اونچے درجہ کے ہیں اور "سُوْرُ البلد" کی مناسبت سے اس کے معنی شہرپناہ کے بھی بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن اگر واو کے بجائے اس کے اصلی مادہ میں ہمزہ مانا جائے تو اس کے معنی بقیہ اور بچی ہوئی چیز کے ہوں گے۔ مفسرین نے ان تمام لفظی معنوں کی تشریح کردی ہے مگر جہاں تک قرآن پاک کے سوروں کا تعلق ہے اسلامی اصطلاح میں یہ اس کے اُن حصوں کو کہتے ہیں جو خاص ناموں کے ساتھ مقرر ہیں اور اس اصطلاح میں اس کے اصلی معنی کی تمام مناسبتیں موجود ہیں۔ "وَقُوْد" ایندھن کو کہتے ہیں۔ "حِجَارَۃٌ" حجر کی جمع ہے پتھر کو کہتے ہیں مگر اکثر مفسروں کے

نزدیک اس سے یہاں مراد پتھر کے وہ بُت ہیں جنہیں مشرکین دنیا میں پوجا کرتے ہیں۔
"مُتَشَابِہ" "شِبۡہٌ" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی مثل اور مانند کے ہیں۔ "مُشۡتَبِہ اور مُتَشَابِہ کے معنی ملتے جلتے ہیں یعنی وہ چیزیں جو آپس میں ایک دوسرے سے مشابہت رکھتی ہوں۔ اسی وجہ سے اُن آیتوں کو جن کی لفظی یا معنوی مماثلت اور مشابہت کی وجہ سے ان کا مطلب سمجھنا مشکل ہو "متشابہات" کہا جاتا ہے۔ ان کے مقابلہ میں "مُحۡکَمَات" وہ آیات کہلاتی ہیں جن میں لفظی یا معنوی لحاظ سے کسی طرح کا اشتباہ اور شک نہ ہو۔ بعض مفسروں نے کہا ہے کہ اس مشابہت سے یہاں جنت کے پھلوں کا ملتا جلتا ہونا مراد ہے۔ اور بعضوں کے نزدیک جنت ہی کے میووں کی باہمی مماثلت و مشابہت مقصود ہے۔ لیکن اگر اس سے دنیا کی مشابہت ہی مراد ہو جب بھی یہ طے شدہ بات ہے کہ یہ مشابہت صرف ظاہری شکل و صورت میں ہوگی۔ لذت، ذائقہ، خوشبو اور دوسری صفتوں میں دنیا کے پھلوں کو جنت کے میووں سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔
"زَوۡجٌ" کے کئی معنی ہیں اس کی جمع ازواج ہے۔ جاندار چیزوں میں نر اور مادہ میں سے ہر ایک کو دوسرے کا زوج کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں بھی اس طرح کے استعمال کی مثال موجود ہے۔ سورۃ القیامۃ میں فرمایا گیا ہے: فَجَعَلَ مِنۡهُ الزَّوۡجَيۡنِ الذَّكَرَ وَالۡاُنۡثٰى۔ یعنی خدا نے دو زوج بنائے۔ ایک کو نر دوسرے کو مادہ۔ مگر عام زبان میں مؤنث کے لئے زوجہ کا لفظ بولا جاتا ہے، یہاں "ازواج" سے مراد بیویاں ہیں۔ "خُلُوۡدٌ" کسی حالت پر ہمیشہ باقی رہنے کو کہتے ہیں اس کے ساتھ ہی اس کے لئے کوئی ابتدا ہونا بھی ضروری ہے یعنی کوئی چیز جو پہلے نہ ہو وہ وجود میں آکر کسی حالت پر ہمیشہ باقی رہے۔ اسی وجہ سے اللہ کی ذات پر اس لفظ کا اطلاق نہیں ہوتا کیونکہ اُس کی کوئی ابتدا نہیں اور نہ وہ کسی حالت کے اندر رہے۔ اس کے برخلاف "دوام" کے مفہوم میں مطلق طور پر بقا کا لحاظ ہوتا ہے۔ جس کے حقیقی معنی میں نہ وقت کی قید ہوتی ہے اور نہ حالت کی اور نہ اس کے لئے ابتدا تجویز کی جا سکتی ہے اور نہ انتہا۔ اسی بنا پر خدا کے ناموں میں دائم ہے اور خالد نہیں ہے۔ لیکن کبھی خلود کی جگہ دوام کا لفظ مجازی طور پر بول دیا جاتا ہے لیکن مراد حقیقی معنی دوام کے نہیں ہوتے۔ ان آیات کریمہ سے پیشتر عقیدۂ توحید کی تعلیم دی گئی تھی۔ اب اسلام کی بنیادی باتوں میں سے دوسری انتہائی ضروری بات بیان کی جا رہی ہے۔ یعنی نبوت و رسالت۔ اس سلسلہ میں جو بات سب سے پہلے کہی گئی وہ یہ ہے کہ اگر تم کو اس کلام میں کوئی شک و شبہ ہو جو ہم نے اپنے بندہ پر نازل کیا ہے یعنی قرآن مجید اور تم یہ سمجھتے ہو کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے بلکہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے خود بنا لیا ہے تو پھر تم بھی کوشش کر کے اس کے کسی

ایک سورہ ہی کا مثل بنا لاؤ کیونکہ اگر کوئی ایک آدمی اس طرح کی عبارت تیار کر سکتا ہے تو دوسرا بھی بنا سکتا ہے۔ یہ خطاب الٰہی تمام دنیا کے انسانوں کی طرف ہے جس میں ہر قوم اور ہر قابلیت کے لوگ شامل ہیں اور جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تھا اس میں زمانہ کی بھی کوئی قید نہیں ہے بلکہ قیامت تک آنے والی انسانی نسلوں سے بھی اس میں خطاب کیا گیا ہے۔ اس وقت چودہ سو سال کے قریب ہو رہے ہیں مگر رسول اُمّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونے والی کتاب الٰہی کا مقابل پیش کرنے سے آج تک دنیا عاجز رہی اور یقیناً ہمیشہ عاجز رہے گی۔ قرآن کی اس للکار کو عرب کے تمام شاعروں ادیبوں اور بڑے بڑے اہل زبان سے لے کر اب تک دنیا کے ہر خطہ کی انسانی نسل نے سُنا ہے مگر متمدن سے متمدن تر قوموں کے کتب خانے قرآن کے مثل کسی صحیفہ اور کسی کتاب سے اس وقت تک قطعاً خالی اور عاری ہیں بلکہ وہ اس کے چھوٹے سے چھوٹے جزو کے مقابلہ کی بھی تاب نہ لا سکے۔ آج تک عقل و حکمت اور علوم و فنون کی فضاؤں میں قرآن حکیم کی یہ تحدی اور یہ للکار موجود ہے۔ مگر کسی زبان اور کسی قلم میں اس کی جرأت نہیں کہ وہ اس معجزانہ للکار کا جواب دے سکے۔ پچھلی صدیوں سے لیکر آج کی گھڑی تک لاکھوں ایسے عربی زبان کے ادیب گذر گئے جن پر تاریخ ہمیشہ فخر کرتی رہے گی۔ مگر اُن میں سے ہر ایک قرآن کی معجزانہ عظمت کے سامنے سربسجود ہے۔ ان قادر الکلام ادیبوں میں سے شہنشاہ اکبر کے زمانہ کے مشہور ادیب و مفسر ابوالفضل فیضی بھی تھے جنہوں نے قرآن پاک کی پوری تفسیر ایسے الفاظ سے لکھی ہے جن میں سے کسی لفظ کے کسی حرف پر بھی کوئی نقطہ موجود نہیں۔ یعنی یہ پوری تفسیر صنعت غیر منقوطہ میں ہے۔ اس تفسیر کا نام "سواطع الالہام" ہے۔ انشا پردازی کی اس صنعت میں کوئی معمولی سی عبارت لکھ دینا بھی بڑے بڑے ادیبوں کے لئے آسان کام نہیں ہوتا چہ جائیکہ قرآن مجید کی پوری تفسیر اسی صنعت میں ہو مگر اس ادبی کمال کے باوجود فیضی نے اپنی پوری تفسیر کو قرآن کی ایک سطر کے مقابلہ میں بھی کوئی اہمیت نہ دی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ قرآن کا طریقۂ ادا بشری طاقت سے بالاتر ہے۔ بلاشبہ قرآن اپنے طریقۂ ادا، ترتیب و تعبیر اور حسن خطاب، کلام کی خوبیوں اور فصاحت و بلاغت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا مگر اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن کی یہ مثل طلبی کی للکار کسی خطہ اور کسی قوم اور ملک یا نسل و زبان سے مخصوص نہیں ہے اور اس کا خطاب جس طرح عربوں سے ہے اسی طرح دنیا کی ہر قوم سے ہے اور قیامت تک کے لئے ہے۔ تو یہ بات ہم آسانی سے سمجھ لیتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز صرف اُس کی لفظی شکل و صورت ہی میں محدود نہیں ہے۔ کیونکہ یہ چیز بالکل ظاہر ہے کہ جو قومیں کوئی دوسری زبان بولتی ہیں اُن سے عربی کلام کا مقابل اور مثل عربی ہی میں طلب کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لئے اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قرآن فقط اپنی لفظی فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے معجزہ نہیں ہے بلکہ وہ

اسی معنوی ہمہ گیری اور مفہوم کی وسعت و جامعیت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے جس کی ایک ایک آیت میں اللہ نے علوم و فنون اور انسانی زندگی کے لئے فلاح و نجات اور ترقی کامیابی و خوشحالی کے ایسے اصول اور ضابطے جمع کر دیئے ہیں جن کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی قوم بھی اپنا ایسا کلام نہیں پیش کر سکتی جس میں حیات بشری کے لئے ایسا جامع نظام اور ہمہ گیر دستور ہدایت پیش کیا گیا ہو اور جس میں بصیرت و فلاح کے وہ سرچشمے موجود ہوں جو قرآن حکیم کے ایک ایک جملہ میں پنہاں ہیں۔

(درس) وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَا اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖۤ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ○ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۪ وَيَقْطَعُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۳ کی درمیانی ۳ آیات

اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کئے ان کو خوشخبری دیدو کہ بیشک ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ انہیں جب کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا تو وہ کہیں گے کہ یہ تو وہی ہے جو ہمیں اس سے پیشتر دیا گیا تھا اور ان کو دیئے ہی جائیں گے آپس میں ملتے جلتے ہوئے پھل اور ان کے لئے وہاں پاکیزہ ازواج ہوں گی اور وہ ان بہشتوں میں ہمیشہ رہیں گے۔ بیشک اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ کوئی مثل بیان کرے مچھر کی یا اس سے بھی بڑھ کر (کسی حقیر چیز کی) پس جو لوگ ایمان لا چکے ہیں وہ تو یہی سمجھیں گے کہ یہ مثل بالکل ٹھیک ہے ان کے پروردگار کی جانب سے البتہ جو لوگ کفر اختیار کئے ہوئے ہیں وہ یہی کہتے رہیں گے کہ اللہ کا اس مثل سے کیا مطلب ہے۔ اللہ ایسی مثال سے بہت لوگوں کو گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے اور اکثر لوگوں کو ہدایت کرتا ہے۔ ہاں وہ گمراہی میں چھوڑتا بھی ہے تو صرف ایسے بدکاروں کو جو اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اپنے عہد و پیمان کو اس کے مضبوط ہو جانے کے

بعد توڑ دیتے ہیں اور جن چیزوں کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے انہیں کاٹ دیتے ہیں اور ملک میں فساد کرتے پھرتے ہیں بس یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔

تشریح و تفسیر: گذشتہ درس میں ان آیات کریمہ کے بعض ابتدائی الفاظ کی تشریح کی جاچکی ہے اب باقی چند مشکل لفظوں کی تفصیل بیان کی جاتی ہے۔

"بَعُوضَةً" مچھر کو کہتے ہیں "فوق" مکان و زمان، جسم، عدد اور مرتبہ کے متعلق بولا جاتا ہے۔ اس کے اصلی معنی بڑے، زیادہ یا اوپر کے ہیں مگر اس جگہ اکثر مفسروں نے چھوٹے ہونے میں زیادتی مراد لی ہے اور "مَا فَوْقَهَا" کو "مَا دُوْنَهَا" کے معنی میں لیا ہے یعنی وہ مچھر ہو یا مچھر سے بھی زیادہ چھوٹی کوئی اور مخلوق ہو۔ یہی معنی یہاں زیادہ مناسب ہیں۔ کچھ لوگ اس سے جسمانی بڑائی مراد لیتے ہیں۔ بہر حال مقصود یہ ہے کہ خدا لوگوں کی ہدایت کے لئے چھوٹی سے چھوٹی مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور بڑی سے بڑی بھی تاکہ لوگ فکر و نظر سے کام لے سکیں اور اپنے خالق کی عظمت کا دل سے اقرار کریں۔ "يَسْتَحْيِ" حَيَاءٌ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی غیرت اور شرم کے ہیں۔ یہ ایک حالت اور کیفیت ہے جو انسانی نفس میں پیدا ہوتی ہے یعنی کسی بری بات سے طبیعت میں ناپسندیدگی پیدا ہو کر اس سے پرہیز کرنا اور بچنا مگر چونکہ خدا کی ذات ان حالات اور کیفیتوں سے پاک ہے اس لئے اس سے مراد مثالیں دے کر کسی بات کو ثابت کرنے کا جواز بیان کرنا ہے نہ یہ کہ اللہ کی ذات اقدس اس کیفیت کا محل ہے اور اُس کی کوئی طبیعت ہے اور اس میں شرم و حیا کی حالت پیدا ہوتی ہے۔ "مِيثَاق" کے معنی مضبوط عہد کے ہیں۔ یہ لفظ "وِثَاقٌ" سے بنا ہے جس کے معنی رسی یا زنجیر کے ہیں جس سے کسی چیز کو کس کر باندھا جائے۔ یہاں مراد عہدِ خداوندی کی مضبوطی اور استحکام ہے، آسمانی کتابوں، معجزوں اور آیاتِ الٰہیہ کے ذریعہ سے۔ "عَهْدُ اللهِ" کی تفسیر میں مفسروں کے بہت سے قول ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ جامع قول یہی ہے کہ عہد الٰہی سے یہاں مراد وہ قابلیت اور صلاحیت ہے جو خدا نے انسان کو پیدائشی طور پر عطا کی ہے کہ وہ اپنی عقل سلیم سے کام لیکر اور کائنات میں پوری طرح غور و فکر کر کے اس کی توحید اور اُس کے صفات کی معرفت حاصل کرے اور اس کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر اس کی ذات پر یقین پیدا کرے۔ اس عہد کا توڑنا یہ ہے کہ انسان اپنی عقل کی اس قابلیت سے کام نہ لے اور اس کے تقاضوں کو ٹھکرا دے اور اقرارِ الوہیت و توحید کے لئے عقل سلیم کے اس پیدائشی اور فطری مطالبہ سے بغاوت کرتا رہے۔ اس طرح لفظ "فَاسِقِيْنَ" کے وسیع تر مفہوم میں اس جگہ وہ تمام لوگ داخل ہوں گے جو اپنی خلقت کے ان تقاضوں سے کسی طرح کی بھی سرکشی کریں۔ ظاہر بظاہر یا چھپ کر۔

یعنی وہ منافق ہوں یا کھلے ہوئے کافر اور مشرک ہوں، سب ہی اس لفظ کا مصداق ہوں گے "یُضِلُّ بِهٖ کَثِیْرًا" فرماکر ضلالت وگمراہی میں چھوڑ دینے کی جو نسبت ذاتِ خداوندی کی طرف دی گئی ہے اُس کا مطلب یہی ہے جیسے پچھلے کسی درس میں بیان کیا جا چکا ہے یعنی انسان اللہ کے مقرر کیے ہوئے نظامِ تکوینی کا پابند ہے جس طرح کائنات کی ہر چیز اس کی پابند ہے، انسان کا جیسا عمل ہوگا ویسا ہی اثر اس کے لئے ظاہر ہوگا۔ یہ تمام اثرات اعمال و افعال ہی کا نتیجہ ہوا کرتے ہیں جن کی بنا پر جزا یا سزا کا استحقاق پیدا ہوتا ہے مگر چونکہ اس نظامِ تکوینی کا خالق خود اللہ ہے اس لئے مجازی طور پر اس نسبت کا اُس کی ذات کے لئے ذکر فرمایا گیا ہے۔

"وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ" میں لفظ فساد کا مفہوم بھی بہت وسیع ہے اور اس میں جسمانی اور مادّی، اخلاقی اور روحانی ہر طرح کا فساد شامل ہے۔ اسی طرح اس جملہ میں کہ فاسقین وہ ہیں جو اُن چیزوں کو کاٹ دیتے ہیں جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، تمام حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہیں اور مراد یہ ہے کہ فاسق لوگ خدا کے بھی حق نہیں ادا کرتے اور اس کی مخلوقات کے حقوق بھی پامال کرتے رہتے ہیں اور زمین میں طرح طرح کے ذہنی، فکری، اخلاقی اور جسمانی فساد برپا کرتے رہتے ہیں اس طرح اس فساد سے مراد نظامِ خداوندی سے بغاوت اور اس کے احکام سے سرکشی اور اس کی نافرمانی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسلام ایک ایسے جامع نظامِ زندگی کا نام ہے جو انسان کے لئے اُس کے عظیم پروردگار نے مقرر فرمایا ہے اور اس سے بہتر کوئی دوسرا نظامِ حیات اس کے لئے ممکن ہی نہیں ہو سکتا اس لئے اگر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظامِ زندگی اختیار کیا گیا اور خدا کے مقرر کیے ہوئے اس دین اور اس نظامِ زندگی سے ذرا بھی انحراف اور سرکشی کی گئی تو اس کا نتیجہ انتشار اور بربادی کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ فساد پھیلانے سے یہی سرکشی اور یہی بغاوت مراد ہے۔ ہمارے سامنے انسان کی پچھلی تاریخ بھی ہے اور آج کی دنیا کے حالات بھی ہیں۔ اس کے باوجود کہ ہر ملک اور ہر قوم میں بڑے بڑے مفکر اور دانشور موجود ہیں اور وہ اپنے خیال میں انسانی معاشرہ کی بہتری، ترقی اور خوشحالی، امن وامان اور بہبود و فلاح کی بھرپور کوشش بھی کر رہے ہیں مگر پھر بھی روز بروز فسادات اور بے اطمینانی اور انتشار کی آگ ہر طرف پھیلتی ہی جاتی ہے درحقیقت اس کی وجہ یہی ہے کہ انسان نے اُس نظامِ زندگی پر بالکل ہی عمل نہ کیا یا پوری طرح عمل نہ کیا جو اُس کے پروردگار نے اُس کے لئے معین اور مقرر فرمایا تھا اور یہ جو کچھ بھی ہم کرۂ زمین پر آج بدنظمی اور بدامنی اور بے اطمینانی کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے دیکھ رہے ہیں یہ سب انسان کی بے راہ روی اور نظامِ خداوندی سے سرکشی و نافرمانی ہی کی سزا اور عذاب ہے۔

درس ۷ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ○ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ق ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ط وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○ ع وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ط قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ ج وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ط قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○

پ ۱ سورۃ البقرہ رکوع ۳ کی آخری ۲ اور رکوع ۴ کی ابتدائی ایک آیت

اللہ کا تم کیونکر انکار کرتے ہو حالانکہ تم بے جان تھے تو اُسی نے تمہیں زندہ کیا پھر وہی تم کو موت دے گا پھر وہی تمہیں جلائے گا پھر اُسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔ وہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے پیدا کیا جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب پھر اُس نے آسمان کی طرف توجہ کی اور اُنہیں درست کر کے سات آسمان بنا دیئے اور وہ ہر چیز کا بڑا جاننے والا ہے۔ اور جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں ضرور بنانے والا ہوں (اپنا) ایک نائب زمین میں تو وہ کہنے لگے کیا تو اُس میں ایسے کو بنائے گا جو وہاں فساد پھیلائے اور خون بہائے۔ حالانکہ ہم تیری حمد کی تسبیح کرتے رہتے ہیں اور تیری پاکیزگی بیان کرتے ہیں۔ اُس نے فرمایا بیشک میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

تشریح و تفسیر: عربی زبان میں "كَيْفَ" وہاں بولتے ہیں جہاں کسی چیز کی حالت معلوم کرنا مقصود ہو مگر اللہ نے جہاں کہیں قرآن حکیم میں اپنی ذات سے متعلق اس لفظ کا ذکر فرمایا ہے وہاں مراد دوسروں کو تنبیہ کرنا ہے۔ یہاں بھی یہی مقصود ہے کہ منکرین حق بے انتہا روشن دلیلوں کے باوجود اللہ کی ہستی اور اس کی توحید کا کیوں انکار کرتے ہیں۔

كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ۔ یعنی تم پہلے بے جان تھے پھر اُسی نے تمہیں حیات عطا کی اس کے بعد پھر وہ تم کو موت دیتا ہے اور اس موت کے بعد تمہیں آخرت میں زندہ کرے گا یہاں پہلی موت سے مراد انسانی وجود کا وہ زمانہ ہے جب وہ حیات سے محروم تھا اور اُس کے اجزا کائنات میں پھیلے ہوئے تھے پھر وہ طرح طرح سے اپنے والدین کے جسم کا جزو بنے اور بالآخر نطفہ کی صورت میں ماں کے شکم میں زندگی پا گئے۔ پھر دنیا میں ظاہر ہو کر یہاں کی تھوڑی سی زندگی کے بعد دوبارہ انسان کو موت دی گئی جس کے بعد آخرت میں پھر دائمی زندگی دی جائے گی۔ اسی ترتیب کی طرف

اس فرمانِ خداوندی میں اشارہ کیا گیا ہے۔

"اِسْتَوٰی اِلَی السَّمَآءِ" میں استواء کے معنی یہاں قصد اور توجہ کرنے کے ہیں۔ "سَمَآءٌ" واحد اور جمع دونوں کے لئے بولتے ہیں یعنی ایک آسمان کے لئے بھی اور چند آسمانوں کے لئے بھی۔ یہاں جمع مراد ہے اسی وجہ سے "هُنَّ" جمع مؤنث کی ضمیر اس کی طرف پھیری گئی ہے۔ "سَمَاء" کے اور بھی معنی ہیں مگر جب اسے "ارض" یعنی زمین کے مقابل بولا جاتا ہے تو لفظی اعتبار سے اس کا استعمال بطور مؤنث کے کیا جاتا ہے اور کبھی مذکر بھی بولتے ہیں۔ قرآن مجید میں مؤنث کا استعمال بہت جگہ ہے اور مذکر کی مثال سورۂ مزمل کا یہ فقرہ ہے "اَلسَّمَآءُ مُنْفَطِرٌۢ بِهٖ" مفسروں نے "آسمانوں" سے کچھ مخصوص اور وسیع بلندیاں مراد لی ہیں اور بعض کے نزدیک یہ عالمِ بالا کے خاص اور بہت پھیلے ہوئے بڑے بڑے اجرام یعنی جسم ہیں۔ جہاں تک قرآن حکیم کا تعلق ہے اُسے آسمانوں کے متعلق صرف اسی قدر بیان کرنا تھا کہ وہ بغیر کسی پیدا کرنے والے کے خود بخود نہیں بن گئے۔ اس لئے جو لوگ آسمانوں اور اُن کے اندر کی مخلوق کی پرستش کرتے ہیں وہ قطعاً گمراہ ہیں۔ قرآن حکیم کا مقصد چونکہ بنیادی طور پر انسان کو اُس کے اخلاقی اور روحانی نظامِ حیات کی تعلیم دینا ہے اور اُن ہی قدروں سے بحث کرنا ہے۔ اس لئے وہ زمین و آسمان کی پیدائش پر تفصیلی بحث نہیں کرتا کیونکہ یہ بات اس کے موضوع سے الگ ہے۔ "خليفة" کا لفظ خلافت سے بنا ہے۔ خلیفہ اُسے کہتے ہیں جو کسی کی نیابت کرے، اس کا قائم مقام ہو یا اس کے بعد آئے۔ "خَلِيْفَةُ اللّٰه" سے مراد وہ شخص ہوتا ہے جس کو اللہ اپنے احکام اور اپنی شریعت کی تبلیغ کے لئے مقرر فرمائے۔ یہی لوگ انبیاء اور اوصیاء کہلاتے ہیں۔ اس مقام پر "خلیفہ" سے مراد حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ہے۔ "قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ" فرما کر اس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب خلافتِ آدمؑ کا اعلان ہوا تھا اور اُسے فرشتوں نے سُنا تو درگاہِ خداوندی میں عرض کی تھی۔ بارالٰہا! کیا تو زمین میں اُس کو رکھے گا جو وہاں فساد پھیلائے اور خون بہائے یہاں یہ چیز یاد رکھنا ضروری ہے کہ فرشتوں نے فساد اور خونریزی کا جو کچھ ذکر کیا تھا اُس کا تعلق حضرت آدمؑ سے نہ تھا بلکہ اُن کی اولاد میں صرف ان لوگوں سے تھا جن میں یہ باتیں پائی جاتی ہوں۔ کیونکہ وہ کسی نہ کسی طرح اس حقیقت سے واقف ہو چکے تھے کہ بنی آدمؑ میں فساد پھیلانے والے بھی ہوں گے اس لئے اُنھوں نے بارگاہِ خداوندی میں یہ التجا کی تھی کہ ایسی مخلوق کی پیدائش کی اُس مصلحت اور راز سے ہمیں بھی آگاہ فرمایا جائے جسے ہم نہیں جانتے۔ فرشتوں کی غرض نہ تو اعتراض کرنا اور نہ حسد کرنا تھا اس لئے کہ وہ ان تمام برائیوں سے پاک پیدا کئے گئے ہیں۔ قرآن حکیم میں خدا کا ارشاد ہے: لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ (سورۃ الانبیاء) مراد یہ ہے کہ جس بات کے دریافت کرنے کی اُن کو خدا کی طرف سے

اجازت نہ ہو فرشتے اس میں کوئی گفتگو نہیں کرتے اور وہ اُسی کے حکم پر عمل کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ملائکہ ایک نوری مخلوق ہے جس کی پیدائش صرف عبادت اور اطاعتِ خدا کے لئے ہوئی ہے اس لئے یہ ممکن ہی نہ تھا کہ وہ حکم خداوندی سے سرکشی کا ارتکاب کرتے اور خدا کے کام پر اعتراض کرتے بلکہ ان کی غرض صرف یہ تھی کہ تخلیق انسان کا راز اور مصلحت ظاہر ہو جائے جسے وہ نہیں جانتے تھے۔ اللہ نے فرشتوں کے اس سوال کا یہ جواب دیا کہ میں اس مخلوق کو جن مصلحتوں اور حکمتوں کی وجہ سے پیدا کر رہا ہوں اُن کا علم مجھ ہی کو ہے تم ان باتوں کو نہیں جانتے۔ مقصود یہ تھا کہ تم ضرور عبادت اور اطاعت کرتے رہتے ہو اور آدمؑ کی اولاد میں گنہگار اور فساد کرنے والے بھی ہوں گے لیکن ایک تو سب ایسے نہ ہوں گے بلکہ ان میں بڑے بڑے صالح اور نیک لوگ بھی پیدا ہوں گے۔ اُن میں امین، صدیق، شہید، عابد و زاہد متقی و پرہیزگار اور مجھ سے ڈرنے والے بھی ہوں گے جو حیوانی خواہشوں اور شیطانی وسوسوں کے اندر گھر کر بھی مجھے کبھی نہ بھولیں گے اور اپنی راحتوں اور لذتوں کو میری خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ترک کریں گے اور یہ ایک ایسی صفت ہے جو تم میں نہیں ہے اس لئے کہ تمہاری خلقت میں جذبۂ گناہ نہیں رکھا گیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ طاعت اور عبادت کے اس جذبہ کے علاوہ ایک دوسرا کام خلافت الٰہی کا ہے جو اس نئی مخلوق سے لیا جانے والا ہے اور اس کے لئے جس استعداد لیاقت اور صلاحیت کی ضرورت ہے وہ تم میں موجود نہیں ہے۔ ”اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ“ کا اشارہ ان حقائق کی طرف بھی ہے،

(در رکوع) وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِىْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ○ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ○ وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۴ کی درمیانی ۴ آیات۔

اور اللہ نے آدمؑ کو تمام نام سکھلا دیئے پھر ان چیزوں

کو فرشتوں کے سامنے ظاہر کردیا پھر فرمایا مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ اگر سچے ہو۔ انہوں نے عرض کی تیری ذات پاک ہے ہمیں جو کچھ تو نے علم عطا فرمایا ہے اس کے سوا ہمارے پاس کوئی علم نہیں۔ بیشک توہی ہے بڑے علم والا۔ اللہ نے فرمایا اے آدم ان چیزوں کے نام انہیں بتادو پھر جب انہوں نے فرشتوں کو اُن چیزوں کے نام بتادیئے تو اللہ نے فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں خوب جانتا ہوں اور جو بات تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ سب جانتا ہوں اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ میں گرجاؤ آدم کے سامنے تو وہ سب سجدہ میں گر پڑے ابلیس کے سوا۔ اُس نے نہ مانا اور تکبر کیا اور وہ ہوگیا کافروں میں سے۔

تشریح وتفسیر: "ملائکہ" "ملک" کی جمع ہے۔ "ملک" اصل میں "مألک" تھا۔ یہ "اُلُوکَۃ" سے بنا ہے جس کے معنی پیغام رسانی کے ہیں پھر بول چال میں "مألک" کے بجائے "ملأک" کہا جانے لگا اس کے بعد کثرتِ استعمال کی وجہ سے ہمزہ ترک ہوگیا اور لوگ "ملأک" کے بجائے "ملَک" کہنے لگے۔ یہ تو تھی لفظِ "ملائکہ" کی مختصر سی تشریح اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ ملائکہ یعنی فرشتے نوری مخلوق ہیں وہ بہت لطیف نورانی جسم ہیں جنھیں ہم عادۃً اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ حسب ضرورت جو شکل چاہیں اختیار کریں مگر برائی کی صلاحیت نہیں رکھتے اور احکامِ خداوندی کے تابع رہا کرتے ہیں۔ کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں جن کی کثیر تعداد کو خدا ہی جانتا ہے۔ اُن کا اصلی کام یہ ہے کہ وہ خدا کا پیغام اُس کی مخلوق تک پہنچائیں اور اُس کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں۔ سورہ بقرہ میں ھاروت و ماروت فرشتوں کا ذکر ہے جو مملکت کُلدان کے مشہور شہر بابل میں خدا کی جانب سے بھیجے گئے تھے تاکہ لوگوں کو سحر کی تباہ کاریوں سے بچنے کے طریقے بتادیں۔ اسی طرح جہاں کہیں بھی قرآن پاک یا احادیث میں فرشتوں کے متعلق اس قسم کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے وہاں یہی مراد ہے کہ فرشتوں کو کسی خاص مصلحت کی بنا پر اصلاحی کاموں کے لئے مقرر فرمایا گیا تھا۔ بہرحال یہ مسلّم امر ہے کہ فرشتوں سے گناہ اور بُرائی کی باتیں وجود میں نہیں آسکتیں۔

"اَنْبِئْھُمْ" امر کا صیغہ ہے اس کا مصدر "اِنْبَاءٌ" ہے جس کے معنے خبر دینے کے ہیں اس کا اصلی مادّہ "نَبَأٌ" ہے۔ "نَبَأٌ" خبر کو کہتے ہیں "اَنْبَاءٌ" اس کی جمع ہے۔ "نَبِیٌّ" اور "نَبِیٌّ" اسی سے بنا ہے۔ معنی ہیں خدا کی جانب سے اُس کے بندوں کو اُس کی مشیّت اور اُس کے احکام کی خبر دینے والا انسان "غَیْب" سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہو اور جب یہ لفظ خدا کی ذاتِ اقدس

سے متعلق بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ وہ عالم الغیب ہے تو یہ مخلوق کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ یعنی جو چیزیں مخلوقات سے پوشیدہ ہیں وہ سب خدا کے علم میں ہیں ورنہ ظاہر بات ہے کہ خدا سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہوسکتی۔

"اِبْلِیْس" کا لفظ "اِبْلَاس" سے بنا ہے جس کے معنی مایوس ہوجانے کے ہیں۔ چونکہ شیطان اپنی سرکشی اور عصیان کی وجہ سے خدا کی رحمت و مغفرت سے ناامید اور مایوس ہوچکا ہے اس وجہ سے اس کو اِبْلِیْس کہا جاتا ہے۔

غرض اس سے قبل کی آیتوں سے یہ بات صاف ہوچکی تھی کہ اللہ کی نیابت کا منصب اُسی شخص کو عطا ہوتا ہے جسے وہ اس کام کا اہل سمجھ کر خود مقرر فرماتا ہے۔ پھر فرشتوں کی اس گذارش کے بعد کہ ہم تیری اطاعت و عبادت اور تسبیح و حمد و ثنا کرتے رہتے ہیں اور خدا کے اس جواب سے کہ "جو میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے" یہ بات بھی کُھل گئی کہ اس منصبِ نیابت کے لئے محض خدا کی حمد و ثنا کرنا اور صرف عبادت کرنا کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے لئے کچھ اور صلاحیتوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے جن کے بغیر رسالت و خلافت الٰہیہ کا یہ منصب جلیل حاصل نہیں ہوسکتا۔ یہ وہ صفات اور صلاحیتیں ہیں جنہیں صرف اللہ جانتا ہے یا پھر وہ برگزیدہ اور خاص ہستیاں جانتی ہیں جنہیں اللہ نے اس راز سے آگاہ فرمادیا ہے۔

اب اس کے بعد یہ بیان کیا جارہا ہے کہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السّلام کو تمام اسماء کی تعلیم دیدی تھی۔ "اسم" کا لفظی ترجمہ "نام" ہے لیکن مفہوم کے لحاظ سے "اسم" کا لفظ "نام" کے لفظ سے بہت زیادہ وسعت رکھتا ہے کیونکہ "اسم" اس کو کہا جاتا ہے جس سے کسی چیز کی ذات کو پوری طرح پہچانا جاسکے اور اُس کی مخصوص صفتوں کے ساتھ اُسے معلوم کیا جاسکے اور "نام" میں یہ جامعیت اور وسعت نہیں ہوا کرتی۔ اس مقام پر بہت سے بڑے مفسروں نے "اسماء" کی تعلیم میں ناموں کے ساتھ خود ان چیزوں کو بھی مراد لیا ہے جن کے وہ نام تھے اور لفظِ "اسماء" کے مفہوم میں اُن چیزوں کی تمام خصوصیتوں، ضابطوں، آثار، اصول اور کیفیتوں کو بھی شامل کیا ہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک اس سے اسماءِ خداوندی مقصود ہیں۔ ان تفسیروں میں باہم کوئی تضاد اور مخالفت نہیں ہے کیونکہ "الاسماء" اور "کُلَّھَا" کے لفظوں کی وسعت ان تمام مطالب کی گنجائش رکھتی ہے۔

ان آیات سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اس عظیم منصب کے لئے علمی فضیلت کے ساتھ علمی برتری بھی ضروری ہوتی ہے کیونکہ اللہ نے حضرت آدم علیہ السّلام کی افضلیت ظاہر کرنے میں اُن کی علمی بلندی

کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے اور اس سے ضمنی طور پر یہ حقیقت بھی ظاہر ہو گئی کہ اسلام اور قرآن کے نزدیک علم کا مرتبہ بے انتہا بلند ہے اور کائنات کے پورے معاشرہ میں انسانی برتری کی سب سے بڑی بنیاد یہی صفتِ علم ہے حضرت آدمؑ کی افضلیت کا اعلان فرما کر پھر فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ ان کی طرف رُخ کر کے سجدہ کریں جس کی انہوں نے فوراً تعمیل کی مگر شیطان نے خدا کا یہ حکم نہ مانا اور اس پر عمل کرنے سے صاف انکار کر دیا جس کی وجہ سے وہ بزم ملکوتی سے نکال دیا گیا اور ہمیشہ کے لئے لعنت کا مستحق بن گیا۔

"سجدہ" کے لفظی معنی انکساری اور فروتنی ظاہر کرنے اور کسی کے آگے اُس کی تعظیم کے لئے جھکنے کے ہیں اس لئے یہاں حکم سجود سے مراد صرف تعظیم کے لئے جھکنا ہے۔ کسی چیز پر پیشانی رکھ کر اصطلاحی سجدہ کرنا مراد نہیں ہے۔ اور جن لوگوں نے اس سے سجدہ کے مشہور معنی سمجھے ہیں انہوں نے بھی کہا ہے کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا عبادت کا سجدہ نہ تھا۔ پھر "لِآدَمَ" میں لام جس کے معنی یہاں "پر" "واسطہ اور لئے" کے ہیں، سمت اور رُخ ظاہر کرنے کے لئے لایا گیا ہے یعنی وہ سجدہ اگر سجدۂ عبادت تھا بھی تو حضرت آدمؑ کی سمت میں اللہ کے لئے تھا خود اُن کی ذات کے لئے ہرگز نہ تھا جس طرح آج بھی کعبہ کی طرف رُخ کر کے سجدہ کیا جاتا ہے مگر وہ سجدہ کعبہ کے لئے نہیں بلکہ ربِّ کعبہ یعنی اللہ کے لئے ہوتا ہے اسی طرح اُس موقع پر بھی حقیقی مسجود ذاتِ خداوندی ہی تھی خود حضرت آدمؑ حقیقی مسجود نہ تھے۔

(درس ۱۲) وَقُلْنَا يَآدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ○ فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ص وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ط اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰۤئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ع

پ ۱ سورۃ البقرۃ رکوع ۴ کی آخری ۵ آیاتِ کریمہ

اور ہم نے کہا اے آدم تم اور تمہاری زوجہ بہشت میں رہو سہو اور اُس میں سے جس جگہ چاہو بافراغت کھاؤ مگر اس درخت کے نزدیک نہ جانا ورنہ تم دونوں اُن لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو اپنا نقصان کر بیٹھتے ہیں۔ پس

ان دونوں کو شیطان نے وہاں سے لغزش دی پھر اس نے انہیں اُس آرام کے حال سے نکلوایا جس میں وہ دونوں تھے اور ہم نے کہا تم سب نیچے اُتر جاؤ تم میں بعض لوگ بعضوں کے دشمن ہوں گے اور تمہارے لئے زمین میں ٹھکانا اور ایک وقت مقرر تک نفع اٹھانا ہے۔ پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ لفظ سیکھ لئے پس اللہ نے ان کی توبہ قبول کرلی۔ بیشک وہی ہے بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا رحمت والا۔ ہم نے حکم دیا کہ تم سب اس سے نیچے اُترو پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو شخص میری اُس ہدایت کی پیروی کرے گا تو ایسے لوگوں کے لئے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہی ہوں گے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا وہی دوزخ میں جانے والے ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح و تفسیر: "رَغَدًا" کے معنی خوشحالی اور عیش و آرام کی زندگی کے ہیں۔ "شَجَرَۃٌ" کے لفظی معنی درخت کے ہیں اور مجازاً ہر اُس سلسلہ کو کہتے ہیں جو کسی اصل اور بنیاد سے نکلا ہو اسی لئے نسب نامہ کو بھی شجرہ کہا جاتا ہے اور علم و محبت وغیرہ کے سلسلہ پر بھی اس لفظ کا اطلاق کیا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں کلمۂ توحید کی مثال پاکیزہ درخت سے دی گئی ہے۔ اسی طرح کلمۂ شرک و کفر کو ناپاک درخت فرمایا گیا ہے (ابراہیم ۱۳/۱۴) اور سورۂ نور میں مبارک درخت سے وحی و قرآن کی طرف اشارہ ہے۔

"ظلم" کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو اس کی واقعی جگہ سے ہٹا کر غیر جگہ پر رکھ دینا۔ اس مفہوم میں ہر وہ عمل اور ہر وہ بات داخل ہے جسے اُس کی صحیح جگہ نہ دی جائے۔ اس طرح اگر کوئی شخص اپنے نفع کا کام چھوڑ کر وہ کام کرے جس میں اُس کا نقصان ہو تو یہ بھی اس کا اپنی ذات پر ظلم ہوگا۔ ظلم کی تین صورتیں ہیں ایک وہ ظلم ہے جو انسان اپنے اللہ کی شان کے مقابلہ میں کرتا ہے یعنی کفر و شرک اور نفاق۔ ظلم کی دوسری قسم وہ ہے جو ایک انسان دوسرے انسان پر کرتا ہے اور اس کی تیسری قسم وہ ظلم ہے جو انسان خود اپنے اوپر کرتا ہے۔ اس میں روحانی اور جسمانی ہر قسم کے نقصانات شامل ہیں۔

"اَزَلَّهُمَا" کا مصدر "ازلال" ہے معنی ہیں پھسلانا، ہٹانا اور لغزش دینا۔ "عَنْهَا" میں "ھا" کی مونث ضمیر جنت کی طرف پھرتی ہے یعنی شیطان حضرت آدمؑ و حواؑ کے جنت سے نکلنے کا باعث ہوا۔ مگر بعض مفسرین نے اس ضمیر کو "شَجَرَۃ" کی طرف قرار دیا ہے اور لفظ "عَنْ" کے معنی وجہ اور سبب کے بتائے ہیں۔ اس تفسیر کی بنا پر مراد یہ ہوگی کہ شیطان نے حضرت آدمؑ و حواؑ کو ان کی جگہ سے ہٹوایا جس کا سبب یہی درخت تھا اور اُس نے اُن کے ہٹنے کے لئے اسی کو وسیلہ بنایا تھا۔ "اِهْبِطُوْا" کا مصدر "هُبُوْط" ہے جس کے معنی بلندی سے پستی کی طرف اُترنے کے ہیں۔ اس سے یہ بات بھی ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ جنت زمین پر تھی بلکہ آسمان میں تھی یہاں پر "اِهْبِطُوْا" جمع کا صیغہ لایا گیا ہے جبکہ اس کلام کے حقیقی مخاطب

اُس وقت بظاہر صرف دو ہی تھے یعنی حضرت آدمؑ و حواؑ یہ اس وجہ سے کہ حضرت آدمؑ کے ساتھ اُن کی ذُرّیت سے بھی خطاب تھا۔ "التَّوَّاب" "تَوُبٌ" سے بنا ہے۔ تَوب اور توبہ کے معنی ہیں گناہ کو ندامت کے ساتھ مکمل طور پر ترک کر دینا اور یہ گناہ سے معذرت کرنے کا سب سے بہتر طریقہ ہے۔ کیونکہ اس قسم کی معذرت کرنے کے تین ہی طریقے ہوتے ہیں۔ ایک یہ ہے کہ عذر پیش کرنے والا گناہ سے انکار کر دے اور کہے کہ میں نے گناہ ہی نہیں کیا، دوسری صورت یہ ہے کہ گناہ کا اقرار تو کرے مگر اس کی وجہ بیان کرے کہ میں نے اس سبب سے گناہ کیا۔ اور تیسری شکل یہ ہے کہ گناہ کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی آئندہ اُس کے نہ کرنے کا یقین بھی دلائے اور سچے دل سے عہد کرے کہ پھر ایسا نہ کرے گا۔ اس تیسری صورت کا نام توبہ ہے۔ اور اس کے چار بنیادی اصول ہیں۔ گناہ کو گناہ سمجھ کر ترک کیا جائے۔ گناہ کرنے پر پوری طرح ندامت اور شرمندگی ہو اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا پکّا ارادہ ہو پھر اگر گناہ کی تلافی ممکن ہو تو وہ بھی کی جائے۔

تائب اور توّاب خدا کے لئے بھی بولا جاتا ہے اور بندوں کے لئے بھی مگر جب بندوں کے لئے بولیں گے تو توبہ کرنا مراد ہوگا اور جب خدا کے متعلق ان لفظوں کا استعمال کیا جائے گا تو توبہ کا قبول کرنا مقصود ہوگا۔ چنانچہ زیرِ بحث آیات میں "توّاب" سے مراد خدا کی ذات ہے اور سورۂ بقرہ میں دوسری جگہ "اِنَّ اللهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲۲ بقرہ) میں توّابین سے مراد توبہ کرنے والے لوگ ہیں۔ ترجمہ یہ ہوا کہ اللہ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ غرض توبہ کے لئے بہرحال یہ بات ضروری ہے کہ اعترافِ گناہ اور ندامت کے ساتھ سچے دل سے گناہ نہ کرنے کا پورا عزم بھی ہو اس لئے بار بار گناہ کرتے رہنا اور ساتھ ساتھ توبہ بھی کئے جانا یا یہ سمجھنا کہ مرتے وقت توبہ کرلیں گے تو سب گناہ معاف ہو جائیں گے اور ساری زندگی گناہ کرتے رہیں اس قسم کی توبہ درحقیقت توبہ نہیں بلکہ یہ تو توہینِ توبہ ہے۔ اور صرف توہینِ توبہ ہی نہیں بلکہ اقتدارِ خداوندی اور قانونِ الٰہی کی اہانت اور اس کے ساتھ تمسخر کرنا ہے (العیاذ باللہ من ذلک) مختصر یہ کہ خدا نے ان آیاتِ کریمہ میں اس بات کی طرف صاف طور پر اشارہ فرما دیا ہے کہ شیطان اولادِ آدمؑ کا بدترین دشمن ہے۔ اُس کے فریب سے بچنے کی صرف ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے احکامِ خداوندی کی پیروی۔ پھر یہ بھی بتا دیا کہ اس دنیا کی زندگی بہت تھوڑی اور بالکل ناپائیدار ہے اس لئے اسی کا ہو رہنا اور آخرت کو بھول جانا عقلمندی نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بھی اعلان فرما دیا کہ آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلانے والے جہنم کی آگ کا ایندھن بننے سے کسی طرح بھی بچ نہ سکیں گے

مگر یہ بھی بتا دیا کہ گناہگاروں کے لئے توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر غلطی سے گناہ ہو گیا ہے تو مغفرت سے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں۔ اللہ غفور و رحیم ہے اور بڑا توبہ قبول کرنے والا ہے بشرطیکہ توبہ سچے دل سے کی جائے۔

(درس ۱۱) وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ ۝ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا ھِىَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝

پ ۱ رکوع ۸ کی درمیانی ۴ آیات کریمہ سورۃ البقرۃ

اور تم خوب جان چکے ہو ان لوگوں کو جنہوں نے تم میں سے ہفتہ کے بارہ میں تجاوز کیا تھا تو ہم نے اُن سے کہا کہ ذلیل بندر ہو جاؤ پھر ہم نے اس واقعہ کو ایک عبرت بنا دیا اُس زمانہ کے اور اس کے بعد آنے والے لوگوں کے لئے اور نصیحت ڈرنے والوں کے لئے۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ تمہیں اللہ حکم دیتا ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو وہ لوگ کہنے لگے کیا آپ ہم سے ہنسی کر رہے ہیں موسیٰؑ نے کہا اللہ مجھے اس سے پناہ میں رکھے کہ میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں اُن لوگوں نے کہا (ہماری طرف سے) اللہ سے عرض کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ کیسی ہو موسیٰ نے کہا اللہ فرماتا ہے کہ وہ گائے نہ بوڑھی ہو نہ بچھیا ہو بلکہ دونوں عمروں کے درمیان ہو تو جو تمہیں حکم دیا گیا ہے اس کو بجا لاؤ۔

تشریح و تفسیر: "علم" کسی بات کو تحقیق کے ساتھ جاننے کا نام ہے اور "قد" کا لفظ عربی زبان میں تاکید اور زور دینے کے لئے بولتے ہیں اسی طرح "ل" بھی تاکید کے لئے لاتے ہیں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن حکیم جس واقعہ کو بیان کرنا چاہتا ہے اُسے بنی اسرائیل پوری تحقیق اور پورے یقین کے ساتھ جانتے تھے پھر اُس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جب بنی اسرائیل نے ہفتہ کے بارہ میں اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی "سبت" ہفتہ یعنی سنیچر کا نام ہے۔ یہود کی شریعت میں اس دن کی بڑی عظمت ہے جس طرح عیسائیوں کے یہاں اتوار کو خصوصیت حاصل ہے۔ ہفتہ یہودی شریعت میں عبادت کے لئے مخصوص ہے اور اس میں شکار اور دنیوی کام ممنوع تھے۔ اس حکم میں اس قدر سختی تھی کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا قتل کو قرار دیا گیا تھا۔

"اِعْتَدٰی" ماضی کا صیغہ ہے اس کی جمع کا صیغہ "اِعْتَدَوْا" ہے۔ مصدر "اِعْتِدَاءٌ" ہے اور معنی ہیں حد سے آگے بڑھ جانا "قِرْدٌ" بندر کو کہتے ہیں۔ "قِرَدَةٌ" اس کی جمع ہے۔ "خَسَأ" جھڑکنے اور دھتکارنے کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے "خَاسِئٌ" ذلیل چیز کو کہا جاتا ہے۔ "نَکَالٌ" عبرتناک سزا کے لئے بولتے ہیں اسی بنا پر یہاں "فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا" کا مطلب یہی ہوگا کہ اس واقعہ کو اس وقت کے اور جو اُس کے بعد آنے والے تھے اُن سب لوگوں کے لئے عبرت بنا دیا گیا۔ "هُزْءٌ" کے معنی ہیں کسی سے تمسخر اور دل لگی کرنا۔ اسی سے "استہزا" کا لفظ نکالا گیا ہے۔ "جَهْل" کے تین معنی ہیں: کسی کام کو جس طرح کرنا چاہئے اُس کے خلاف کرنا دوسرے کسی چیز کے متعلق اُس کی صحیح کیفیت و حالت کے خلاف اعتقاد رکھنا تیسرے ذہن کا کسی چیز کے علم سے خالی ہونا۔ غرض حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے فرمایا کہ میں گائے کو ذبح کرنے کا جو حکم دے رہا ہوں وہ مذاق اور ہنسی کی بات نہیں ہے بلکہ یہ خدا کا واقعی حکم ہے۔ میں اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ میرا شمار جاہلوں میں ہو یعنی اُن لوگوں میں جو حق بات سے واقف ہی نہیں ہیں یا حق کے خلاف عمل کرتے ہیں۔ "فَارِضٌ" بڑی عمر کی گائے یا بیل کو کہتے ہیں اور اسی کے مقابلہ میں "بِكْرٌ" سے مراد ایسی نوجوان گائے ہے جس کے یہاں ابھی تک کوئی بچہ نہ پیدا ہوا ہو۔ "عَوَانٌ" کے کئی معنی ہیں۔ یہاں اُدھیڑ عمر والے کے معنی ہیں۔

ہفتہ کے دن سے متعلق حکم خداوندی کی بے احترامی حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں یہود نے کی تھی۔ اُنہوں نے مچھلیوں کا شکار کرنے کے لئے اُنہیں اُس دن ایک علیحدہ پانی میں گرفتار کرلیا تھا اور دوسرے دن یعنی اتوار کو اُنہیں پکڑ لیا کیونکہ مچھلیاں عام طور پر ہفتہ ہی کے دن زیادہ جمع ہوتی تھیں اور پھر غائب ہو جاتی تھیں۔ یہود کی اس چالاکی پر انھیں سخت سزا دی گئی، عذاب میں مبتلا کئے گئے اور اُنھیں بندروں کی صورت پر مسخ کر دیا گیا۔ تین روز اسی حالت میں رہ کر وہ پوری قوم ہلاک ہوگئی۔ یہ واقعہ جس یہودی قوم کا ہے وہ شہر "ایلہ" میں رہتی تھی جو بحر قُلزُم The Red Sea کے کنارہ پر آباد تھا۔ جہاں تک ان لوگوں کے بندر کی صورت پر مسخ ہونے کا تعلق ہے کچھ مفسروں نے کہا ہے کہ یہ مسخ معنوی تھا صوری نہ تھا یعنی اُن میں بندروں کی صفتیں پیدا کر دی گئی تھیں شکل انسانوں ہی کی تھی، علامہ قُرطبی اور ابن جریر وغیرہ نے اس قول کا ذکر کیا ہے لیکن جمہور مفسرین اسی بات پر متفق ہیں کہ ان کی شکلیں بندروں کی سی بنا دی گئی تھیں۔ اُن میں فہم و شعور انسانی موجود تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر روتا تھا مگر کلام نہیں کر سکتا تھا۔ عذاب الٰہی کے تاریخی واقعات میں اس طرح کی مثالیں

کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ جب بھی سرکش انسانوں نے اللہ کے "تشریعی" قانون کی خلاف ورزی کی تو اُس نے بھی پورے عدل وانصاف کے ساتھ اپنے "تکوینی" قانون کو بدل کر اُن پر طرح طرح کے عذاب نازل کیے اور اُنھیں عبرتناک سزائیں دیں۔ یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ کائنات کے "نظامِ تکوینی" کی پابند تو مخلوقات ہے نہ کہ خود خالق کی ذات۔ وہ جب چاہے اپنے بنائے ہوئے اس "تکوینی نظام" کو بدل سکتا ہے۔ البتہ مخلوقات اُسے نہیں بدل سکتی۔ اس بیان سے قرآن حکیم کی یہ غرض نہیں ہے کہ وہ اس ہولناک واقعہ کا صرف ذکر کر دے بلکہ مقصود یہ ہے کہ لوگ اس سے سبق حاصل کریں اور اسے یاد رکھیں اور اپنی بداعمالی سے وہ اسباب نہ پیدا کریں جن کی سزا اس طرح نافرمانوں اور گناہگاروں کو ملتی رہی ہے۔ اس ذکر کے ساتھ ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا ایک واقعہ بھی یاد دلایا گیا ہے۔ بات یہ تھی کہ ایک شخص کو قتل کر دیا گیا تھا مگر اُس کے قاتل کا پتہ نہیں چل رہا تھا اس سلسلہ میں اللہ نے حضرت موسیٰؑ کو حکم دیا کہ ایک خاص قسم کی گائے ذبح کر کے اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اُس مردے کے جسم پر مارا جائے تو وہ جی اُٹھے گا اور اپنے قاتل کا نام بتا دے گا۔ بہرحال وہ گائے ذبح کی گئی جس کا تفصیلی ذکر آئندہ درس میں کیا جائے گا اور بالآخر وہ مردہ زندہ ہو گیا پھر اُس نے بتایا کہ اُس کے وارثوں ہی نے دولت کی لالچ میں اُس کو قتل کیا تھا۔

اُس زمانہ میں مصر کی مشرک قومیں گائے بیل کی بے حد تقدیس اور تعظیم کرتی تھیں۔ یہ تقدیس ویسی ہی تھی جیسی آجکل کی بعض بت پرست قوموں میں پائی جاتی ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل اُن مشرکوں کے ساتھ مِلے جُلے رہتے تھے اس لئے اُن کے ذہن پر بھی گائے بیل کی تقدیس اور عظمت چھائی ہوئی تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت موسیٰؑ نے اُن سے فرمایا کہ تم اس میت کو زندہ کرنے کے لئے گائے کو ذبح کرو تو اُنھوں نے خیال کیا کہ وہ ان لوگوں سے مذاق کر رہے ہیں۔ بھلا گائے بھی ایسی چیز ہے جس کی اس طرح توہین کی جائے۔ اس کا جواب پیغمبر نے یہ دیا کہ یہ اللہ کا واقعی حکم ہے کوئی ہنسی مذاق کی بات نہیں ہے۔ غرض قاتل کی شناخت کے علاوہ اُس مردہ کو زندہ کرنے کا ایک بڑا مقصد یہ بھی تھا کہ اس طرح لوگ دیکھ لیں کہ جب اللہ میں یہ قدرت ہے کہ وہ اس میت کو دوبارہ زندہ کر سکتا ہے تو وہ قیامت میں بھی مردوں کو زندہ کرنے پر قادر ہے اور یہ بھی بتانا تھا کہ جب زندگی اور روح پانے والا اپنے قاتل کو پہچان سکتا ہے تو روح ڈالنے والا اور زندگی عطا کرنے والا اللہ یقیناً اپنے بندوں کے ہر ظاہر اور پوشیدہ عمل سے باخبر ہے اور کوئی بات اُس سے چھپائی نہیں جا سکتی۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَاءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النَّاظِرِينَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَا هِيَ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ ○ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْآنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ○ وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادَّارَأْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللَّهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنتُمْ تَكْتُمُونَ ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذَٰلِكَ يُحْيِي اللَّهُ الْمَوْتَىٰ وَيُرِيكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ○

(درس ۱۴)

پ ۱ رکوع ۸ کی آخری ۳ اور رکوع ۹ کی ابتدائی ۲ آیاتِ کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

وہ کہنے لگے آپ ہماری طرف سے اپنے پروردگار سے درخواست کیجئے کہ وہ بتائے کہ اُس (گائے) کا رنگ کیسا ہے موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے خوب گہرے زرد رنگ کی ہو۔ دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہوتی ہو انہوں نے کہا اپنے پروردگار سے ہماری طرف سے درخواست کیجئے کہ وہ ہمیں بتائے کہ وہ گائے (اور) کیسی ہو اس لئے کہ گائے میں ہمیں اشتباہ ہو گیا ہے اور اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت پائیں گے موسیٰ نے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ گائے محنت کرنے والی نہ ہو جو زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہو۔ بے عیب ہو اُس میں کوئی دھبّا نہ ہو (تو) اُنھوں نے کہا کہ اب آپ ٹھیک پتہ لائے پھر اُنھوں نے اُسے ذبح کیا اور وہ ایسا کرتے معلوم نہیں ہوتے تھے اور جب تم نے ایک شخص کو قتل کر ڈالا تھا پھر تم آپس میں اس معاملہ میں جھگڑنے لگے اور اللہ کو وہ بات ظاہر کرنا تھی جسے تم چھپا رہے تھے تو ہم نے کہا کہ اِس لاش پر اُس (گائے) کا کوئی ٹکڑا مارو۔ یوں ہی اللہ مردوں کو زندہ کرے گا اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم غور کرو۔

تشریح وتفسیر: "بَقَر" اسم جنس ہے جو بیل اور گائے سب کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کا واحد بَقَرَةٌ ہے جس کی جمع بَقَرات آتی ہے مگر بیل کے لئے خاص طور پر "ثَوْر" کا لفظ بولتے ہیں۔ اس کا اصلی مادہ "بَقْرٌ" ہے۔ اور معنی ہیں کسی چیز کو وسیع کرنا اور پھاڑنا۔ گائے بیل کھیتی باڑی کے کام آتے ہیں اور اُن کے ذریعہ سے زمین کو پھاڑا اور کھیتوں کو جوتا جاتا ہے اس لئے یہ لفظ اُن کے لئے استعمال ہونے لگا اسی مناسبت سے "بَاقِر" اُس شخص کو بھی کہتے ہیں جو علوم وفنون کے اسرار اور رموز کے

سینے چاک کرتا ہو اور بڑا عالم اور محقق ہو۔ "صَفْرَاءُ" مؤنث کے لئے بولتے ہیں اور "اَصْفَرُ" مذکر کیلئے
یہ "صُفْرَةٌ" سے بنا ہے جس کے معنے زرد رنگ کے ہیں "فَاقِعٌ" عام طور پر زرد رنگ کی شدّت اور
صفائی کے لئے کہا جاتا ہے۔ "ذَلُوْلٌ" کا اصلی مادّہ "ذِلٌّ" اور "ذُلٌّ" ہے معنی ہیں مطیع اور تابعدار کے
جو محنت کے کاموں سے انکار نہ کرتا ہو۔ "تُثِيْرُ" مؤنث کا صیغہ ہے۔ یہ کسی چیز کے پھیلانے یا کھیت
جوتنے کے لئے بولتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں "حَرْثٌ" کے معنی زمین میں زراعت کیلئے
بیج ڈالنے کے ہیں اور خود کھیتی کے بھی ہیں۔ یہاں کھیتی کے معنی ہیں۔ "مُسَلَّمَةٌ" سے بے عیب مراد
ہے۔ "شِيَةَ" کا اصلی مادّہ "وَشْيٌ" ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز میں اُس کے تمام رنگ کے خلاف
کسی جگہ کوئی اور رنگ لگا دینا۔ اس لئے "شِيَةٌ" داغ دھبّا یا کسی علامت اور نشان کے لئے
بولتے ہیں۔ یہاں مراد یہی ہے کہ اُس گائے کے کھُلتے ہوئے صاف زرد رنگ میں کوئی دھبّا نہ ہو۔
"اِدّٰرَأْتُمْ" اصل میں تَدَارَأْتُمْ تھا۔ یہ "دَرْءٌ" سے بنا ہے جس کے معنی دفع کرنے کے بھی آتے
ہیں اور یہاں یہی مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ قتل کے الزام کو ایک دوسرے پر ڈال رہے
تھے اور ہر شخص اپنی ذات سے اس الزام کو دفع کر رہا تھا۔ ان آیات کریمہ میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہے
اُس کی تفصیل روایتوں میں مختلف صورتوں کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔ علّامہ ابن کثیر نے اسے یوں لکھا ہے
کہ بنی اسرائیل میں ایک بہت ہی مالدار آدمی تھا جس کے کوئی لڑکا نہ تھا۔ صرف ایک لڑکی تھی اور قریبی
رشتہ داروں میں اُس کے بھائی کا ایک لڑکا موجود تھا۔ اُس کے بھتیجے نے جب دیکھا کہ بڈھا مرتا ہی
نہیں تو میراث کی لالچ میں اُس نے چچا کو قتل کر دیا تاکہ اُس کی لڑکی سے نکاح بھی کر لے اور اُس کی میراث بھی
حاصل کرے اور قتل کی تہمت دوسروں پر رکھ کر اُس کی دِیَت بھی اُن سے وصول کرے۔ اُس نے اپنے
چچا کو قتل کر کے اُس کی لاش بنی اسرائیل کی ایک آبادی کے سامنے ڈال دی اور واپس آکر بظاہر اُسے
تلاش کرنے لگا اور شور مچانے لگا کہ میرے چچا کو کسی نے مار ڈالا۔ پھر جہاں لاش پڑی ہوئی تھی وہاں کے
لوگوں پر اُس نے قتل کی تہمت رکھی اور مشہور کر دیا کہ ان لوگوں نے میرے چچا کو مارا ہے اس لئے یہ لوگ
اُس کا تاوان ادا کریں۔ ظاہر ہے کہ وہ لوگ بالکل بے قصور تھے اس لئے اس بدنامی سے بے حد پریشان
ہو گئے اور بالآخر حضرت موسیٰؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان سے تمام حالات بیان کئے آپ نے خدا سے
دعا کی۔ وحی ہوئی کہ گائے کو ذبح کرو اور اُس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اُس شخص کی لاش پر مارو تو وہ جی
اُٹھے گا اور اپنے قاتل کا پتہ بتا دے گا۔ جب آپ نے بنی اسرائیل سے یہ بات کہی تو وہ بہت حیران ہوئے
کہ کہاں قاتل کی تحقیق اور کہاں گائے کے ذبح کرنے کی ہدایت۔ اسی بنا پر اُنھوں نے کہا کہ کیا آپ ہم سے

مذاق کر رہے ہیں حضرت موسیٰؑ نے جواب دیا کہ میں جاہل نہیں ہوں، اپنی ذمہ داری سمجھتا ہوں اور جو کچھ بیان کر رہا ہوں وہ مذاق نہیں بلکہ حکم خداوندی ہے۔ پھر اُن لوگوں نے اُس گائے کی صفتیں دریافت کیں جنہیں تفصیل کے ساتھ آپ نے بتا دیا۔ اس قسم کی گائے تلاش کی گئی تو ایک لڑکے کے پاس ملی جس کو کسی قیمت پر وہ فروخت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا یہاں تک کہ اُس گائے کے برابر سونا دیا گیا تب اُس نے وہ فروخت کی۔

یہ لڑکا اپنے ماں باپ کا انتہائی فرماں بردار تھا۔ ایک مرتبہ ایک سوداگر ایک قیمتی ہیرا لیکر آیا اُس لڑکے نے اُس کی خریداری کا ارادہ ظاہر کیا لیکن نقد رقم اُس کے باپ کے پاس تھی اور وہ سو رہا تھا۔ سوداگر نے کہا کہ اگر اُس کو قیمت فوراً مل جائے تو وہ اصلی قیمت سے بہت کم پر فروخت کر دے گا۔ بالآخر انتہائی شوق کے باوجود لڑکے نے وہ ہیرا چھوڑ دیا اور اپنے باپ کی نیند میں خلل ڈالنے پر تیار نہ ہوا۔ جب اُس کے باپ کی آنکھ کھلی تو اُس نے خوش ہو کر اُس لڑکے کو یہ گائے دی تھی جو نتیجہ میں بے انتہا دولت کا سبب بن گئی اور یہ خریداری کا واقعہ اُس وقت ہوا جبکہ اُس کے باپ کا انتقال ہو چکا تھا، مال و دولت سب ختم ہو چکا تھا اور یہ لڑکا اپنی بیوہ ماں کے ساتھ انتہائی غربت کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس طرح اللہ نے ماں باپ کی اطاعت کا بدلہ اس دنیا میں بھی اُس فرماں بردار لڑکے کو عطا کیا اور اُس کی تکلیف اور مصیبت کو آرام و راحت سے بدل دیا۔ غرض وہ گائے اُس کے برابر سونے کے ساتھ خریدی گئی اور ذبح کی گئی پھر اُس کے گوشت کا ایک ٹکڑا لیکر مردہ کے جسم پر مارا گیا تو وہ بحکم الٰہی زندہ ہو گیا اور اُس نے اپنے قاتل کا نام بتا دیا اور پھر مر گیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ اُسے دوبارہ زندگی بھی ملی۔ یہ شخص جسے قتل کیا گیا تھا اس کا نام "عامیل" تھا۔ اس قصہ کو مختلف صورتوں میں اور مختلف الفاظ کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہودی شریعت کے مطالعہ سے اس کا بھی پتہ چلتا ہے کہ قتل کے موقع پر جب اصلی قاتل کی تحقیق ہو رہی ہو کچھ مخصوص شرطوں کے ساتھ ایک نوجوان گائے کو جس سے کوئی خدمت نہ لی گئی ہو ذبح کیا جاتا تھا، پھر اُس کے مردہ جسم کے سامنے بزرگانِ قوم ایک خاص طریقہ پر اپنے گناہوں سے استغفار بھی کرتے تھے "توراۃ" میں یہ تفصیلات موجود ہیں۔ یہاں یہ بات ہم کو کبھی نہ بھولنا چاہئے کہ قرآن حکیم کی اصلی غرض یہ نہیں ہے کہ وہ تاریخی واقعات کا صرف تذکرہ ہی کرتا رہے بلکہ وہ واقعات کو صرف اس لئے بیان کرتا ہے تاکہ اُن سے انسان کے ضمیر اور کردار کی اصلاح کے لئے انتہائی مثبت نتائج نکالے جائیں اور اُس کے مردہ شعور کو آسانی کے ساتھ جھنجھوڑا جا سکے اور زندہ کیا جا سکے۔ قرآن نے جہاں وعظ و نصیحت کے نظریاتی مؤثر طریقے

اختیار کیے ہیں ساتھ ہی بڑے خوبصورت انداز میں تاریخی واقعات کا ذکر کر کے اُن کے نتائج کی طرف انسانی عقل وحواس کو متوجہ بھی کیا ہے اور اس طریقہ کو بار بار استعمال کیا گیا ہے کیونکہ اس طرح طبیعت بڑی جلدی اور بہت آسانی سے اثر قبول کر لیتی ہے اور اسی بنا پر اس واقعہ کو بیان فرما کر اُس نے اپنی عام روشِ تعلیم کے مطابق نظریۂ معاد اور عقیدۂ حشر ونشر کی طرف اِن لفظوں کے ساتھ توجہ دلائی ہے۔ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ۔ یعنی جس طرح اللہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ اس وقت مردہ کو زندہ کر دے اسی طرح وہ قیامت میں بھی مردوں کو زندگی بخشے گا اور وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لیکر حقائق کو سمجھ سکو۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ (درس ۱۵)

پ ۱ رکوع ۹ کی درمیانی ۳ آیات کریمہ۔

پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ مثل پتھر کے تھے بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت اور یقیناً پتھروں میں تو کچھ ایسے بھی ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں اور اُن میں ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں پھر اُن سے پانی جاری ہو جاتا ہے اور اُن میں ایسے پتھر بھی ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اُس سے غافل نہیں ہے تو کیا تم اِس کی توقع رکھتے ہو کہ وہ لوگ تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے حالانکہ اُن میں کچھ ایسے لوگ گذرے ہیں جو اللہ کا کلام سُنتے تھے اور اُسے اچھی طرح سمجھنے کے بعد بدل ڈالتے تھے اور وہ اسے جانتے تھے اور جب وہ اُن لوگوں سے ملتے ہیں جو ایمان لا چکے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم (بھی) ایمان لے آئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ تنہا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتا دیتے ہو جو

اللہ نے تم پر ظاہر کردی ہیں کہ اس کے سبب سے وہ اللہ کے سامنے تم پر حجت لے آئیں تم اتنا بھی نہیں سمجھتے

تشریح و تفسیر: "قَسَتۡ" "قَسۡوَةٌ اور قَسَاوَةٌ" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی سخت دل ہوتے کے ہیں۔ "حَجَرٌ" پتھر کو کہتے ہیں احجار اور حِجارَةٌ اس کی جمع آتی ہے۔ "تَفَجَّرٌ" کا اصلی مادہ فجر ہے اور یہاں مراد ہے جاری ہونا۔ یَشَّقَّقُ اصل میں یَتَشَقَّقُ تھا۔ استعمال عرب میں فصاحت اسی طرح بولنے میں ہے جیسے قرآن میں ہے۔ "تَطۡمَعُوۡنَ" طمع سے بنایا گیا ہے "طَمَع" کہتے ہیں انسان کی طبیعت کے کسی چیز کی طرف خواہش کے ساتھ رغبت کرنے کو۔ یہاں یہی معنی ہیں اور لالچ اور حرص کے مشہور معنی مراد نہیں ہیں "فَرِیۡق" اُس جماعت کو کہتے ہیں جو دوسروں سے الگ ہو۔ تحریف کے معنی ہیں کسی چیز کو ایک طرف مائل کر دینا اور جب "تحریف کلام" کہا جاتا ہے تو مقصود ہوتا ہے کلام کو اُس کے اصلی مقام سے ہٹا دینا اور پھیر دینا اور جب "تحریفِ کلام" کہا جاتا ہے تو مقصود ہوتا ہے کلام کو اُس کے اصلی مقام سے ہٹا دینا اور پھیر دینا یا بدل دینا۔ ان آیات میں ایک لفظ آیا ہے "عَقَلُوۡهُ" ظاہر ہے کہ یہ "عقل" سے بنا ہے اور "عقل" کا لفظ جب مصدر ہو تو اس کے کئی معنی آتے ہیں جن میں ایک جان لینے اور سمجھ لینے کے بھی ہیں اور یہاں یہی مراد ہیں اور جب اِسے بطور اسم کے بولا جاتا ہے تو اُس وقت بھی کئی معنی مراد لئے جاتے ہیں جیسے سخت گرفت یا خونبہا مگر "عقل" کے مشہور معنی دو ہیں ایک تو وہ قوت جس کے ذریعہ سے انسان اُن باتوں کا علم حاصل کرتا ہے جنھیں وہ ظاہری حواس کے ذریعہ سے حاصل نہیں کر سکتا اور دوسرے خود وہ علم جو اس قوت کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ عقل کے پہلے معنی کی طرف سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث میں اشارہ ہے۔ مَا خَلَقَ اللّٰهُ خَلۡقًا اَکۡرَمَ عَلَیۡهِ مِنَ الۡعَقۡلِ۔ اللہ نے کوئی ایسی مخلوق نہیں پیدا کی جو اُس کے نزدیک عقل سے زیادہ باعزت ہو اور ظاہر ہے کہ خود سرور کائنات ہی کی ذاتِ اقدس اس مقام عقلی کا کامل ترین مظہر تھی۔ پھر آپ نے عقل کے دوسرے معنی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے: مَا کَسَبَ اَحَدٌ شَیۡئًا اَفۡضَلَ مِنۡ عَقۡلٍ یَهۡدِیۡهِ اِلٰی هُدًی اَوۡ یَرُدُّهٗ عَنۡ رَدًی یعنی کسی شخص نے عقل سے بڑھ کر کوئی چیز حاصل نہیں کی جو اُس کی حق اور ہدایت کی طرف رہنمائی کرے یا اُس کو ہلاک ہو جانے سے محفوظ رکھے۔

اس سلسلہ میں امیر المومنین حضرت علیؑ کے ارشاد گرامی میں اس کی اور تشریح ملتی ہے۔ اَلۡعَقۡلُ عَقۡلَانِ مَطۡبُوۡعٌ وَمَسۡمُوۡعٌ وَلَا یَنۡفَعُ مَسۡمُوۡعٌ اِذَا لَمۡ یَکُ مَطۡبُوۡعٌ کَمَا لَا یَنۡفَعُ ضَوۡءُ الشَّمۡسِ وَضَوۡءُ الۡعَیۡنِ مَمۡنُوۡعٌ۔ یعنی عقلیں دو طرح کی ہوا کرتی ہیں ایک عقلِ مطبوع یعنی طبعی اور فطری عقل جو خالق کائنات نے انسان کی خلقت میں بخشی ہے اور دوسری عقلِ مسموع یعنی سمعی عقل جو لوگوں سے باتیں سُنکر حاصل ہوتی ہے

اگر کوئی شخص پیدائشی طور پر عقل سے خالی ہو تو سنکر حاصل کی ہوئی عقل اُسے کوئی فائدہ نہیں دے سکتی جس طرح سورج کی روشنی اُس شخص کے لئے بیکار ہے جو اندھا ہو اور اُس میں اُس نور سے فائدہ اُٹھانے کی قوت اور صلاحیت ہی موجود نہ ہو۔

"لِيُحَاجُّوكُم" حُجَّةٌ سے بنا ہے۔ "حُجَّة" دلیل کو کہتے ہیں۔ "مُحَاجَّة" اِس کا مصدر ہے اور اس کے معنی ہیں باہم جھگڑنا اس طرح کہ ہر ایک دوسرے کو اُس کے مقصد سے باز رکھنے اور روکنے کی کوشش کرے۔ "ثُمَّ قَسَتْ قُلُوبُكُمْ" فرما کر اب یہ بات بیان کی جارہی ہے کہ بنی اسرائیل ایسے معجزے اور قدرت کی نشانیاں دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے اور اُن کے دل پتھر کی طرح بلکہ اُس سے بھی زیادہ سخت ہو گئے کیونکہ پتھروں سے تو کبھی نہریں بھی نکلتی ہیں اور بعض پتھر اس طرح پھٹ جاتے ہیں کہ اُن سے پانی رستا رہتا ہے اور چشمہ کی طرح بہتا نہیں ہے اور کچھ وہ پتھر ہیں جن سے پانی تو نہیں نکلتا مگر وہ خوفِ خدا سے گر پڑتے ہیں لیکن بنی اسرائیل کے دل ایسے نہ رہے کہ اُن پر وعظ و نصیحت کا کوئی بھی اثر ممکن ہوتا اس لئے وہ پتھروں سے بھی سخت تر تھے۔ اس جگہ پتھروں سے پانی بہنے اور نہریں جاری ہونے کا ذکر کر کے یہ بھی کہا گیا ہے کہ اُن پر خوفِ خدا طاری ہوتا ہے اور وہ اُس کی وجہ سے نیچے گر پڑتے ہیں۔ ان باتوں کی تفسیر دو طرح سے کی گئی ہے کسی نے اس سے حقیقی اور واقعی معنی مراد لئے ہیں یعنی خدا اپنی قدرت سے پتھروں سے پانی نکالتا ہے جس طرح سورۂ اعراف اور سورۂ بقرہ میں بتایا گیا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حکم خدا کے مطابق پتھر پر اپنا عصا مارا تو اُس سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے اسی طرح خوف خدا کا اثر بھی پتھروں پر ہوتا ہے اور صرف پتھر ہی نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز اپنے خالق اور حقیقی مالک کو پہچانتی ہے اور اُس سے ڈرتی ہے اور آخر طُور بھی تو پہاڑ ہی تھا اور وہ اُس کے پتھر ہی تھے جو نور و جلالِ خداوندی سے متاثر ہو کر ریزہ ریزہ ہو گئے تھے پھر سورۂ بنی اسرائیل میں عالم کی ہر مخلوق کی تسبیح کا کس قدر جامع انداز میں ذکر موجود ہے "وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ" سارے جہان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ اُس کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اور دوسری تفسیر یہ ہے کہ پتھروں کے خوف و اطاعتِ خداوندی اور اُن کی تسبیح وغیرہ سے مراد اطاعت و تسبیح تکوینی ہے یعنی وہ زبان حال سے اپنی اس اطاعت اور تسبیح کا اظہار کرتے ہیں اور بحیثیت ایک مخلوق ہونے کے اپنے عظیم خالق کی نشاندہی کرتے ہیں اور فکر و شعورِ انسانی کو اس کی طرف دعوت دیتے ہیں کہ وہ قدرت کی ان نشانیوں کو دیکھ کر ان کے ربِ حقیقی کی معرفت حاصل کرے۔ یہ دونوں ہی تفسیریں اپنے اپنے مقام پر درست ہیں۔ اور بیک وقت دونوں ہی

پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد بنی اسرائیل یعنی یہود کی گمراہی اور کفر کی شدت بیان کرتے ہوئے مسلمانوں سے فرمایا گیا ہے کہ تمہیں اُن سے اس کی توقع نہ رکھنا چاہئے کہ وہ ایمان لے آئیں گے اُنھوں نے اپنی آنکھوں سے خدا کی روشن آیتوں اور معجزات کو دیکھا اور انکار کیا اور اپنے کانوں سے خدا کے کلام یعنی توراۃ کو سُنا اور ذرا بھی متاثر نہ ہوئے بلکہ اُنھوں نے خدا کے کلام میں طرح طرح کی تبدیلیاں اور تحریفیں کر دیں اور اُسے کچھ کا کچھ کر ڈالا تو وہ اب کیا ایمان لائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے شعور اور ضمیر میں اُن کی سرکشی اور کفر کی آگ کے شعلے پھیل چکے ہیں اور اب اُن میں قبولِ حق کی کوئی بھی صلاحیت باقی نہیں رہی ہے اس لئے اُن سے امید رکھنا کہ وہ راہِ راست پر آ جائیں گے بیکار ہے۔

اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ ○ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ○ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ ع (ورلس ۱۶)

پ ۱ رکوع ۹ کی آخری ۶ آیاتِ کریمہ۔ سورۃ البقر۔

کیا وہ لوگ (اتنا بھی) نہیں جانتے کہ اللہ اس کو بھی جانتا ہے جسے وہ چھپاتے ہیں اور اُسے بھی جس کا وہ اظہار کرتے ہیں اور اُن میں اَن پڑھ لوگ بھی ہیں جو کتاب (الٰہی) کا کوئی علم نہیں رکھتے سوائے جھوٹی آرزوں کے اور وہ محض خیالی باتوں میں پڑے رہتے ہیں تو بڑی خرابی ہے اُن لوگوں کے لئے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب کو لکھتے ہیں پھر کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے تاکہ اس کے ذریعہ سے تھوڑی سی قیمت حاصل کرلیں پس خرابی ہے اُن کے لئے اُس کے سبب سے جس کو اُنھوں نے اپنے ہاتھوں سے لکھا اور خرابی ہے

اُن کے لئے اُس کے سبب سے جو کچھ وہ کماتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم کو دوزخ کی آگ چھوئے گی بھی نہیں بجز گنتی کے چند دنوں کے۔ اُن لوگوں سے کہو کیا تم نے خدا سے کوئی اقرار لے لیا ہے کہ پھر وہ کسی طرح اپنے اقرار کے خلاف ہرگز نہ کرے گا یا اللہ کے ذمّہ ایسی بات لگاتے ہو جس کو تم نہیں جانتے۔ (ہاں اصل تو یہ ہے کہ) جس نے بدی اختیار کی اور اُس کے گناہ نے اُس کو گھیر لیا تو وہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں اور وہی اُس میں ہمیشہ پڑے رہنے والے ہیں اور جو لوگ ایمان لائیں اور نیک عمل کریں تو وہی لوگ اہل جنّت ہیں اور وہی اُس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔

تشریح و تفسیر: "اُمّی" کا لفظ کئی معنی میں بولا جاتا ہے۔ کبھی اِسے ان پڑھ مراد لیتے ہیں اور کبھی اس سے شہر مکہ کا رہنے والا مقصود ہوتا ہے جس کو عرب "اُمّ القریٰ" کہا کرتے ہیں قرآن حکیم کے سورۂ انعام اور سورۂ شوریٰ میں بھی مکّہ کے لئے "اُمّ القریٰ" کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ کلام عرب میں "اُمّی" کے ایک مشہور معنی خود عرب قوم کے بھی ہیں جو اہل کتاب نہ تھے قرآن حکیم میں اس معنی میں بھی اسے بولا گیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران میں ہے: "وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ" اے رسول تم اہلِ کتاب اور امیّوں سے پوچھو کہ کیا تم اسلام لے آئے ہو؟ یہاں "اُمّیّین" سے مراد عرب قوم ہے جو اہل کتاب میں شامل نہ تھی۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو "نبیؐ اُمّی" اسی معنی سے کہنا زیادہ صحیح ہے کہ آپ کا قومی تعلق اُمّتِ عرب اور اہل مکہ سے تھا اور اسی خصوصی تعلق کی طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں بھی اشارہ فرمایا تھا: "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ط اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (سورۂ بقرہ) ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ نے عرض کی ہمارے پروردگار ان لوگوں میں یعنی میری ذرّیت میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیج دے جو ان کو تیری آیتیں پڑھ کر سُنائے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور اِن کے نفسوں کو پاکیزہ کردے بے شک تو ہی غالب اور صاحب تدبیر ہے۔ یہ دعائے ابراہیمی اہلِ مکہ اور اُس کے گرد و پیش کے اُن لوگوں کے لئے تھی جن کا تعلق حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے واسطہ سے ذرّیت ابراہیمی سے تھا اور اسی وجہ سے حضرت سرورِ کائنات فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا اور حضرت عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی والدہ حضرت آمنہؓ کا خواب ہوں۔ لیکن بیان کردہ آیۂ کریمہ کے اس جملہ یعنی "وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ" میں "اُمّیُّون" سے مراد جاہل اور ان پڑھ یہود ہیں جو اپنے دل سے گڑھی ہوئی آرزوؤں اور دل خوش کن تمناؤں میں مست پڑے رہتے تھے اور توراۃ کی اصلی تعلیم سے بالکل بے خبر تھے۔ یہود کی اس جہالت اور باطل نوازی کا ذکر انجیل میں حضرت مسیحؑ کی زبان سے اور پھر اس سے بھی سخت الفاظ میں

یُوتُوس یعنی اسرائیلی Jews کی زبان سے بار بار آیا ہے۔ "آمَانِیّ" "اُمْنِیَّةٌ" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں آرزو اور تمنا کے۔ اس کا اصلی مادہ "مَنِیٌّ" ہے جبکہ "مَنِیَّةٌ" موت کو کہتے ہیں اور اُس کی جمع "مَنَایَا" آتی ہے اور "اَمَانِیّ" کے یہاں پر دو طرح معنی بیان کئے گئے ہیں ایک تو یہ کہ وہ جاہل یہود اپنی بے حقیقت آرزوؤں کو پرورش کرتے رہتے تھے جو صرف تخیل شیطانی ہوا کرتی تھیں اور دوسرے یہ کہ وہ بے اصل اور جھوٹی روایتوں ہی کو اپنا دین سمجھتے تھے اور اُن ہی میں مست رہتے تھے۔

غرض یہاں ابتدائی آیت میں بے پڑھے لکھے یہود کا ذکر کیا گیا ہے اور اُن کی اعتقادی اور عملی حالت کی تشریح فرمائی گئی ہے پھر "فَوَیْلٌ" کہکر بزرگان و علمائے یہود کا تذکرہ کیا گیا ہے جنھوں نے توراۃ کی عبارتوں میں کثرت کے ساتھ تبدیلیاں کردیں اور اپنی لکھی ہوئی تحریروں کو "کتاب اللہ" کا نام دیدیا اور اس طرح اپنی قوم کے جاہل عوام کو دھوکا دیکر اُن سے خوب دولت کمائی پہلے تو کچھ عرصہ تک یہودی علماء کی یہ حرکت چھپی رہی اور کافی عرصہ تک کسی کو اس کی خبر نہ ہوسکی لیکن اب تو یہ تحریفیں عوام اور خواص ہر ایک کی زبان پر آچکی ہیں اور ہر ایک شخص اس حقیقت سے واقف ہوچکا ہے کہ اب "توراۃ" اپنی اصلی صورت میں باقی نہیں ہے بلکہ اُسے کچھ مخصوص لوگوں کی تصنیف سے زیادہ کوئی درجہ نہیں دیا جاسکتا یہاں تک کہ اب خود یہود بھی کہنے لگے ہیں کہ خدا کے خصوصی الہام سے فیضیاب ہوکر کچھ بزرگانِ دین موسوی نے "توراۃ" کو اپنی تحریروں اور اپنی عبارتوں میں دوبارہ ترتیب دیا ہے اور اب یہ بلا واسطہ نہیں بلکہ بالواسطہ خدا کی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے جبکہ قرآن حکیم ابتدائے تنزیل سے اس وقت تک اپنے لفظی خصوصیات سے بھی ایک لمحہ کے لئے کبھی نہیں ہٹا اور اب تک اپنی اصلی تنزیل لفظی پر باقی اور محفوظ ہے اس لئے دنیا کی کوئی دوسری کتاب اُس کے مقابلہ پر کس طرح کتاب الٰہی کہی جاسکتی ہے اس وقت بائیبل Bible یعنی "توراۃ" کی عام تنقید ایک مستقل فن کی صورت اختیار کرچکی ہے اور انگریزی فرانسیسی، جرمن اور دوسری زبانوں میں ہزاروں مضمون اور کتابیں اس موضوع پر شائع ہوچکی ہیں جن میں ان تبدیلیوں پر بحث کی گئی ہے اور انھیں تسلیم کیا گیا ہے اِن تمام تنقیدوں میں "Text" یعنی متن سے متعلق اور Historical criticism یعنی تاریخی تنقید اور دوسری قسموں کی تنقید شامل ہے۔ قرآن حکیم کا ایک یہ بھی اعجاز ہے کہ جس حقیقت کو آج چودہ سو برس کے بعد دنیا سمجھنے کے قابل ہوسکی ہے اُس کا اعلان اُس نے اپنے نبی اُمّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس سے ابتدا ہی میں کردیا تھا جبکہ اُس کی اصلیت اور حقیقت سے دنیا کے عام لوگ اور خصوصیت کے ساتھ یہود کے عوام اور بہت سے اُن کے پڑھے لکھے لوگ بھی بے خبر تھے۔ جہاں تک کتاب اللہ میں تبدیلی اور تحریف کا تعلق ہے اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کا حق خود رسولِ اکرم کو بھی حاصل نہ تھا چہ جائیکہ کوئی اور شخص

بلکہ کتابِ خداوندی کے علاوہ خود احادیثِ رسولؐ کے متن میں بھی کوئی شخص ذرا سا بھی تغیر و تبدل پیدا
کر کے اُس بدلی ہوئی عبارت کو قول و کلامِ سرورِ کائناتؐ کا نام نہیں دے سکتا۔ البتہ اُس کے مفہوم اور
مطلب کو اپنے الفاظ میں لوگ بیان کر سکتے ہیں لیکن مسلمانوں کے علاوہ دوسری قومیں بہر حال
کتابِ الٰہی کے اس مقام اور جلالت سے بے خبر ہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ قف
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ
قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ط ثُمَّ
تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ○ وَاِذْ اَخَذْنَا
مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ
دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ
تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ
تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ط وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ
اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ط
اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ج فَمَا
جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ط
وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ○

پ ۱ رکوع ۱۰ کی ابتدائی ۳ آیاتِ کریمہ۔ سورۃ البقرۃ

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور قرابت داروں
اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ اچھے سلوک کرنا اور لوگوں سے بھلی بات کہنا اور نماز قائم رکھنا اور زکوٰۃ ادا کرتے
رہنا پھر تم میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا سب کے سب پھر گئے اور تم لوگ تو ہو ہی عہد سے مُنہ موڑنے
والے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا کہ آپس میں خونریزیاں نہ کرنا اور اپنے لوگوں کو اپنے وطن سے نہ
نکالنا پھر تم نے اس کا اقرار بھی کر لیا تھا اور تم اس کی گواہی دیتے ہو پھر تم ہی وہ ہو کہ اپنوں کو قتل کرتے ہو
اور اپنے ہی ایک گروہ کو اُس کے وطن سے نکال دیتے ہو، اُن کے خلاف گناہ اور ظلم کے ساتھ (آپس میں)
ایک دوسرے کی مدد کرتے ہو اور اگر وہ گروہ تمہارے پاس اسیری کی حالت میں پہنچ جاتے ہیں تو تم انھیں فدیہ دے کر

چھڑا بھی لیتے ہو حالانکہ اُن کا نکالنا ہی تم پر حرام تھا تو پھر کیا تم کتاب اللہ کے بعض حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور بعض حصہ کو نہیں مانتے۔ پس تم میں سے جو ایسا کرے اُس کی سزا کیا ہے سوائے دنیوی زندگی میں رسوائی کے اور قیامت کے دن یہ سخت ترین عذاب میں ڈال دیئے جائیں گے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے بے خبر نہیں ہے۔

تشریح و تفسیر: "میثاق" کے معنی مضبوط اور پکے عہد و پیمان کے ہیں۔ "بنی اسرائیل" سے مراد قوم یہود ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ماننے والے۔ اصل میں "بنی اسرائیل" حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو کہتے ہیں "اسرائیل" حضرت یعقوبؑ کا لقب تھا۔ "القُربٰی" بطور مصدر کے بولا جاتا ہے جس کے معنی رشتہ داری میں نزدیکی اور قربت کے ہیں لیکن کہیں اس سے مراد خود اہل قرابت ہوتے ہیں "دِیَار" "دَار" کی جمع ہے جس کے معنی گھر اور رہنے کی جگہ کے ہیں مگر کبھی "دار" اور "دیار" کو زیادہ وسیع معنی میں بولا جاتا ہے جیسے قبیلہ، وطن یا کوئی خاص خطہ زمین وغیرہ۔ "تَظَاهَرُوْنَ" "ظَهْر" سے بنا ہے۔ "ظَهْر" کا لفظ جب مصدر ہو تو مدد کرنے کے معنی میں بولتے ہیں اور جب اسم ہو تو اس سے مراد کسی چیز کی پشت ہوا کرتی ہے۔ "تَظَاهُر" اور "مُظَاهَرَة" کے معنی ایک دوسرے کی مدد اور پشت پناہی کرنے کے ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ یہودی لوگ جب اپنے قومی بھائیوں سے جنگ کرتے تھے یا اُنھیں جلاوطن کرتے تھے تو اُن کے خلاف گروہ بندی کر کے اور پوری طرح منظم ہو کر ہر وہ ظلم کرتے تھے جو اُن کے اِمکان میں تھا اور اس ظلم و جور میں ظالم یہودی گروہ کا ہر فرد آپس میں بھرپور تعاون اور ایک دوسرے کی مدد کرتا تھا اور اپنے ساتھ مشرک قوموں کو بھی اس کام میں شریک کرتا تھا اور اُن سے ہر قسم کی مدد حاصل کرتا تھا۔ "اُسَارٰی" "اَسِیر" کی جمع ہے یعنی قیدی۔ "تُفَادُوْا" کا مصدر "مُفَادَاة" ہے۔ "فِدَاءٌ" اور "مُفَادَاة" کہتے ہیں کسی کو فدیہ اور تاوان لیکر چھوڑ دینے کو یا فدیہ دیکر آزاد کرانے کو۔ یہاں مراد یہ ہے کہ تم پہلے تو اپنے قومی اور دینی بھائیوں پر ظلم و ستم کر کے اُنھیں اُن کے وطن اور گھروں سے نکال دیتے ہو پھر لطف یہ ہے کہ جب وہ دوسروں کے قیدی بن کر تمھارے پاس آتے ہیں تو بدلہ اور فدیہ دے کر تم اُنھیں چھڑا بھی لیتے ہو جبکہ اُن کی ساری مصیبت اور تباہی کے اصلی ذمہ دار تم خود ہی ہو۔ "فِدْیَہ" اُس مال کو کہتے ہیں جو کسی کو مصیبت سے چھڑانے کے لئے صرف کیا جائے اور جو مال کسی حکمِ الٰہی پر عمل کرنے میں کوتاہی کی وجہ سے یا گناہ کے اثر سے بچنے کے لئے، حکمِ شریعت کے مطابق صرف کیا جاتا ہے اُسے بھی "فِدْیَہ" کہتے ہیں۔ اِن آیاتِ کریمہ میں اُن احکام اور اُن باتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جن پر عمل کرنے کا یہود کو حکم دیا گیا تھا۔ پھر ساتھ ہی اُن کی نافرمانی اور عہد شکنی کا بھی بیان ہے۔

ان احکام میں سے پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ اللہ کے سوا کسی دوسرے کی عبادت نہ کریں۔ اس حکم کے اندر ہر وہ چیز شامل ہے جس کا تعلق اللہ کی مرضی اور خوشنودی سے ہو سکتا ہے کیونکہ "عبادت" انتہا درجہ کی اطاعت ظاہر کرنے کا نام ہے جس سے معبود کی انتہائی تعظیم اور تکریم مقصود ہو تو یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص کسی کی تعظیم بھی کرتا ہو اور اُس کے حکم کو بھی نہ مانے بلکہ جب وہ اُس کی تعظیم کرے گا تو ضروری ہے کہ اُس کے ہر حکم پر عمل بھی کرے اور اگر اس نے اُس کے کسی حکم پر بھی سرکشی اور نافرمانی سے کام لیا تو یہ اِس کا ثبوت ہوگا کہ یہ اُس کی تعظیم نہیں کرتا۔ مختصر یہ کہ حقُّ اللہ کا جن جن باتوں سے تعلق ہے وہ سب ہی اس حکم کی وسعت میں شامل ہیں۔ پھر اِس کے بعد حقوقِ عباد کا بیان ہے۔ اور چونکہ اُن میں ماں باپ کا حق سب سے زیادہ ہے اس لئے سب سے پہلے "وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا" فرما کر اِسی حق کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے والدین کے ساتھ ہمیشہ اچھا سلوک کرتے رہو۔ پھر قرابت داروں، یتیموں اور محتاجوں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کی بھی ہدایت کی گئی ہے کہ لوگوں سے جب بات چیت کرو تو بھلائی اور حسن اخلاق کے ساتھ اور اس کا بھی حکم دیا گیا کہ ہمیشہ نماز اور زکوٰۃ کے احکام پر پابندی سے عمل کرتے رہو۔ یہ وہ احکام تھے جو توراۃ اور اُس دور کے پیغمبروں کے ذریعہ سے یہود کو دئے گئے تھے مگر اُنھوں نے ان احکام کو ٹھکرا دیا اور چند آدمیوں کے سوا اُن میں سے کسی نے بھی ان باتوں پر عمل نہ کیا۔ اِس کے بعد اِس کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کو آپس کی خونریزی سے بھی منع کیا گیا تھا اور اِس کا حکم دیا گیا تھا کہ وہ بندگانِ خدا پر ظلم و جور نہ کریں اور اُنھیں اپنے وطنوں سے نہ نکالیں مگر اِس کی بھی اُنھوں نے ہمیشہ خلاف ورزی کی اور مشرک قوموں سے ساز باز کر کے وہ اپنے ہی قومی بھائیوں کو قتل کرتے اور لوٹتے رہے اور اُنھیں جلا وطن بھی کرتے رہے۔

ان آیات میں اگرچہ بظاہر خطاب ہے مدینہ کے یہودی قبیلوں کی طرف جو عہد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تھے مگر مراد پوری قومِ یہود ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہی سے اِس بدکردار اور نافرمان قوم کی یہی حالت رہی ہے کہ یہ ہمیشہ احکامِ خداوندی کو ٹھکراتی رہی، اللہ کے برگزیدہ پیغمبروں کو شہید کرتی رہی اور اُن پر ظلم و ستم کے پہاڑ گراتی رہی، اُن کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھوں کو رنگتی رہی اور مشرکوں سے سازشیں کر کے ایمان داروں کا قتلِ عام کرتی رہی۔ اس قوم نے زبان سے تو ہمیشہ اِس کا دعویٰ کیا کہ یہ توراۃ پر ایمان رکھتی ہے لیکن اپنے کردار اور عمل سے اُس کے ہر حکم کی توہین اور تکذیب کا ارتکاب کرتی رہی۔

(درس ۱) أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيقًا تَقْتُلُونَ ۝ وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِينَ ۝

پ ۱ رکوع ۱۰ کی آخری آیت اور رکوع ۱۱ کی ابتدائی ۳ آیات کریمہ بسورۃ البقرہ

یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے آخرت کے بدلہ دنیا کی زندگی خریدلی تو نہ ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ اُن کی مدد کی جائے گی اور یقیناً ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور اُن کے پیچھے اور بھی پیغمبروں کو پے در پے بھیجتے رہے اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو روشن معجزے دیئے اور ہم نے روحُ القُدُس کے ذریعے اُن کی تائید کی۔ پھر بھلا کیا جب کبھی کوئی پیغمبر ایسے احکام لایا تمہارے پاس جنھیں تمہارے دل پسند نہ کرتے تھے تو تم تکبر کرنے لگے پھر تم نے بعض پیغمبروں کو جھٹلایا اور بعض کو تم قتل کرنے لگے اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہے بلکہ اُن کے کفر کے سبب اللہ نے اُن پر لعنت کی ہے پس وہ بہت ہی تھوڑا ایمان رکھتے ہیں اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے ایک کتاب آگئی اُس کی تصدیق کرنے والی جو اُن کے پاس موجود ہے۔ اور اس سے پہلے یہ لوگ کافروں پر فتح چاہتے تھے پھر جب اِن کے پاس وہ چیز آگئی جسے یہ پہچانتے تھے تو اُس کے منکر ہو گئے۔ پس اللہ کی لعنت ہے کافروں پر۔

تشریح وتفسیر: "قَفَّيْنَا" کا اصلی مادّہ "قَفْوٌ" ہے اور مصدر "تَقْفِيَةٌ" ہے جس کے معنی ہیں کسی کو کسی کے بعد یا اُس کے پیچھے لانا۔ "رُوحُ الْقُدُس" سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ "غُلْفٌ" "اَغْلَفُ" کی جمع ہے "اَغْلَفُ" اُس چیز کو کہتے ہیں جو غلاف کے اندر ہو۔ اِسی مناسبت سے "سَيْفٌ اَغْلَفُ" اُس تلوار کے لئے بولتے ہیں جو نیام کے اندر ہو۔ "يَسْتَفْتِحُونَ" کا مصدر "اِسْتِفْتَاح" ہے اور اصلی مادّہ "فتح" ہے۔ اِستفتاح کے کئی معنی ہیں جن میں سے ایک معنی غلبہ اور

کا میابی یا فیصلہ طلب کرنے کے ہیں جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے: "اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَآءَكُمُ الْفَتْحُ"
یعنی اگر تم فتح اور فیصلہ چاہتے ہو تو وہ تمہارے سامنے آچکا ہے۔ یہ دراصل مکہ کے مشرکوں سے خطاب
تھا کیونکہ جب اُن کا لشکر جنگ بدر کے لئے روانہ ہونے لگا تھا تو اُنھوں نے خانہ کعبہ کا پردہ پکڑ کے دعا
کی تھی کہ ان دونوں لشکروں میں یعنی کافروں اور مسلمانوں میں جو حق کی راہ پر ہو اُسی کو فتح حاصل ہو
اور دوسرے کو شکست اور رسوائی ملے اور بعض مفسروں نے لکھا ہے کہ یہ دعا خاص طور پر سردار
قریش ابو جہل نے کی تھی۔ اسی کی طرف سورۂ انفال کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے یعنی تم یہی تو چاہتے
تھے کہ جو لشکر حق پر ہو اُسی کو فتح حاصل ہو تو جنگ بدر میں مسلمانوں کی فتح تمہارے سامنے آگئی ہے
اس لئے اب تو تم اسلام اور دین حق کی مخالفت سے باز آجاؤ۔ بیان کردہ آیتوں میں "يَسْتَفْتِحُوْنَ"
کے اور بھی معنی بیان کئے گئے ہیں مگر مشہور تفسیر یہاں بھی فتح و نصرت کی طلب ہی کے معنی سے کی گئی
ہے۔ مقصود یہ ہے کہ یہود حضورؐ سرور کائنات کی بعثت سے پہلے خدا سے آپ کی تشریف آوری کی
دعائیں مانگتے رہتے تھے اور چاہتے تھے کہ جلد ہی آپ کا ظہور ہو جائے تاکہ اُن کو آنحضرتؐ کے
طفیل میں مشرکوں پر غلبہ اور فتح حاصل ہو سکے۔

غرض اِس وقت جن آیتوں کو بیان کیا گیا ہے اُن میں سے پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود
اس قدر دنیا داری میں مبتلا ہو گئے تھے کہ اُن کے دماغ میں آخرت کا کوئی تصوّر ہی باقی نہ رہا تھا اور
دین و مذہب کا حاصل دنیا کی مادّی خوش حالی کے سوا اور کسی چیز کو نہیں سمجھتے تھے۔ پھر اُنھیں اس
بھی بڑا غرور تھا کہ وہ پیغمبروں کی اولاد ہیں اس لئے قیامت میں اُنھیں کوئی تکلیف نہ ہوگی اور اگر کوئی
ایسا وقت آبھی گیا تو وہ پیغمبر اُن کی سفارش کر دیں گے اور پھر ان پر کسی قسم کا عذاب نہ ہو سکے گا اسی
اطمینان اور تکبر پر وہ ہر طرح کا ظلم، بدکاری اور فسق و فجور کرتے رہتے تھے۔ قرآن پاک کو اسی
اس غلط عقیدہ کی بار بار رد کرنا پڑی اور یہ بتانا پڑا کہ اللہ کے باغیوں کی سفارش اور اُن کی مدد اللہ
کی مرضی کے خلاف کوئی نبی اور کوئی رسول نہیں کر سکتا۔ اس کے بعد فرمایا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
کے بعد بنی اسرائیل کی اصلاح و ہدایت کے لئے پے در پے انبیاءؑ کرام آتے رہے اور توراۃ کی تعلیم
کی اُن میں تبلیغ کرتے رہے یہاں تک کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آگیا اور اُنھیں ایک مستقل شریعت
اور ایک مستقل کتاب "انجیل" دی گئی جس سے موسوی شریعت کے بعض فروعی احکام منسوخ ہو گئے
پھر یہ بیان کیا گیا کہ یہود کی گمراہی اور سرکشی بے انتہا بڑھ گئی۔ وہ پیغمبروں کے احکام کو ٹھکراتے
رہے، الٰہی کتابوں کی تکذیب کرتے رہے اور انبیاءؑ کو قتل کرتے رہے۔ آخر میں اس کا ذکر ہے کہ

یہودی جب کبھی مشرکین عرب سے جنگ میں شکست کھاتے تھے تو خدا سے دعا مانگتے تھے کہ وہ آنے والے نبیؐ کو جلد مبعوث فرما کر ہمیں مشرکوں اور کافروں پر فتح و نصرت عطا فرمائے۔ مگر جب نبی عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدا نے مبعوث فرمایا تو اس گمراہ قوم نے یہ دیکھ کر کہ آپ بنی اسرائیل میں سے نہ تھے بلکہ نسل حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے تھے آپ کی رسالت سے انکار کر دیا اور یہ سب آپ کے دشمن بن گئے حالانکہ آنے والے رسول کی تمام علامتوں کو یہ لوگ خوب جانتے تھے جو صرف حضور ہی کی ذات اقدس میں پائی جاتی تھیں۔ یہود کی ان تمام گمراہیوں کو بیان کر کے آخر میں اللہ نے انکار حق کی سزائیں اُن پر لعنت فرمائی ہے کیونکہ انھوں نے توراۃ اور انجیل کی تکذیب کی تھی، پیغمبروں کو جھٹلایا تھا اور انھیں شہید کیا تھا پھر حضرت خاتم المرسلین کی نبوت سے انکار کیا تھا جن کی تشریف آوری کی بشارت ہمیشہ اگلی آسمانی کتابیں اور اُس دور کے پیغمبر دیتے رہے مگر یہ دیکھ کر کہ آپ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے ہیں یہود آپ کی رسالت و نبوت کے منکر ہو گئے اور آپ سے بے انتہا عداوت رکھنے لگے۔

(۹) بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰي غَضَبٍ ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاۗءَهٗ ۤ وَھُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۭ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَاۗءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ وَلَقَدْ جَاۗءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ○ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاسْمَعُوْا ۭ قَالُوْا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا ۤ وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۭ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖٓ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

پ ۱ رکوع ۱۱ کی درمیانی ۴ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

بُری ہے وہ چیز جس کے بدلہ میں اُنھوں نے اپنی جانوں کو بیچ ڈالا ہے کہ وہ منکر ہوئے اُس چیز کے جو اللہ نے نازل کی ہے اس ضد پر کہ اللہ (کیوں) نازل کرے اپنے فضل سے اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے۔ پس یہ لوگ مستحق ہو گئے غضب پر غضب کے اور کافروں کے لئے رسوائی کا عذاب ہے اور جب اُن سے کہا جاتا ہے

کہ اُس کلام پر ایمان لاؤ جو اللہ نے نازل کیا ہے تو کہتے ہیں کہ ہم اُس پر تو ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوا ہے اور جو کچھ اُس کے علاوہ ہے اُس کا یہ انکار کرتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے اور اُس کی تصدیق کرنے والا ہے جو اُن کے پاس ہے۔ کہدو کہ پھر تم اللہ کے پیغمبروں کو اس سے قبل کیوں قتل کرتے رہے اگر تم ایمان رکھنے والے تھے۔ اور تمہارے پاس موسیٰ صاف معجزے لیکر آئے تھے اس پر بھی تم نے اُن کے پیچھے گائے کے بچھڑے کو اختیار کرلیا اور تم تو ہو ہی ظلم کرنے والے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور تمہارے اوپر کوہِ طور کو بلند کیا تھا کہ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اُسے مضبوطی کے ساتھ پکڑو اور سنو۔ ان لوگوں نے اُس وقت کہا تھا کہ ہم نے سُن تو لیا مگر ہم نے اِسے مانا نہیں اور اُن کے دلوں میں اُن کے کفر کی وجہ سے وہی بچھڑا رچ گیا تھا۔ کہدو کہ وہ باتیں بری ہیں جن کا حکم تمہارا ایمان تمہیں دیتا ہے اگر تم (واقعی) ایمان والے ہو۔

تشریح و تفسیر: "بِئْسَ" اُن افعال میں سے ہے جسے بُرائی اور مذمت کو ظاہر کرنے کیلئے بولتے ہیں جیسے نِعْمَ تعریف اور اچھائی ظاہر کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ "اِشْتَرَوْا" ماضی جمع کا صیغہ ہے۔ "اِشْتِرَاء" اس کا مصدر ہے۔ یہ لفظ بیچنے اور خریدنے۔ دونوں کے لئے بولتے ہیں اپنے موقع و محل کے لحاظ سے۔ یہاں پر بیچنے کے معنی ہیں اسی طرح "شِرَاءٌ" بھی دونوں معنی میں آتا ہے۔ قرآن حکیم میں دونوں طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے آپ کو خدا کے غضب اور اُس کے عذاب کا مستحق بنالیا اور اُن کے نفوس عذابِ الٰہی کے سپرد ہو گئے۔ اور جس چیز کے بدلہ میں اُنھوں نے ایسا کیا وہ قرآن اور اسلام کا انکار اور کفر ہے۔ یہ انتہائی ذلیل قیمت تھی جس کو اُنھوں نے اپنے خیال میں وصول کرکے اس کے نتیجہ میں اپنے نفسوں کو غضب خداوندی کے سپرد کردیا۔ "بَغْیٌ" کے کئی معنی آتے ہیں مگر یہاں حسد کرنا مراد ہے۔ "غَضَبٍ عَلٰی غَضَبٍ" سے مراد کئی معنی لئے گئے ہیں اور در حقیقت یہ سب ہی باتیں موجود تھیں یعنی خدا کا پہلا غضب اُن پر اس وجہ سے تھا کہ اُنھوں نے بچھڑے کی عبادت کی اور دوسرا غضب اس وجہ سے کہ اُنھوں نے رسالتِ محمدیؐ اور قرآن سے انکار کیا۔ یا پہلے اُنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی رسالت سے اِنکار کیا۔ پھر سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کے منکر ہو گئے۔ یا پہلے اُنھوں نے نبوت محمدیؐ اور نزولِ قرآن سے کفر اختیار کیا پھر دوسری چیز جو غضبِ الٰہی کا باعث ہوئی وہ یہ تھی کہ اُنھوں نے رسولِ کریمؐ سے حسد بھی کیا اور اُن کے دشمن ہو گئے۔ اور ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس تکرار سے مراد صرف تاکید اور مبالغہ ہے اور غضبِ الٰہی کی شدت ظاہر کرنا مقصود ہے۔ "بَیِّنَۃٌ" واضح اور صاف دلیل کو کہتے ہیں۔ بَیِّنَات اس کی جمع ہے۔ "عِجْل" گائے کا بچہ یعنی بچھڑے کو کہتے ہیں اس کی جمع عُجُوْل، عِجَال اور عِجَلَۃ آتی ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں یہود کی ہٹ دھرمی ظلم و ستم اور کفر و بے دینی کی طرف پوری وضاحت کے ساتھ اشارے کئے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ اِس قوم نے اسلام، قرآن اور رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت سے انکار کسی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں کیا بلکہ اِس کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ نبوت اولادِ اسرائیل سے نکل کر اولادِ اسمٰعیل علیہ السلام میں آگئی تھی اور چونکہ یہود منصب نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے اس لئے نسلی اور قومی عصبیت اور حسد کی آگ میں جلنے لگے اور سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس سے دشمنی اور عداوت رکھنے لگے اور اسی عداوت اور حسد کی وجہ سے یہ جانتے ہوئے کہ توراۃ و انجیل کی بشارتوں کے مطابق آنے والے پیغمبر سرورِ دو عالم ہی ہیں آپ کی نبوت اور قرآن کے کتاب اللہ ہونے سے انکار کرنے لگے۔ اسی حسد اور نسلی تعصب کا بعد کی آیت میں بھی ذکر ہے کہ وہ لوگ ایمان و اسلام کی دعوت کے جواب میں یہی کہنے لگتے ہیں کہ ہم تو صرف اُسی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی ہے یعنی توراۃ اور دوسری کسی کتاب کو ہم نہیں مانتے۔ درآنحالیکہ جس کتاب یعنی قرآن حکیم پر ایمان لانے کی اُنھیں دعوت دی گئی تھی وہ بہر حال برحق ہے اور پھر وہ اُس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہے جو اُن پر بھیجی گئی تھی یعنی توراۃ اور اسی طرح دوسرے اسرائیلی صحیفے۔ اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ یہودیوں کا یہ دعویٰ بھی غلط اور بے اصل ہے کہ وہ توراۃ اور بنی اسرائیل کے انبیاؑ پر ایمان رکھتے ہیں اگر یہ درست اور صحیح ہوتا تو کبھی یہودی قوم اپنے انبیاؑ کا قتلِ عام نہ کرتی اور اُنھیں اپنے ظلم و ستم کا نشانہ نہ بناتی مگر اِس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ یہودی تاریخ، مقدس انسانوں اور انبیاؑ و مرسلینؑ کے بیگناہ اور ناحق خون سے رنگین ہے۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ یہودی اس قدر پست، ذلیل اور نافرمان ہوگئے کہ انھوں نے موسوی معجزات اور خدا کی روشن نشانیوں کو پوری طرح دیکھ لینے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر جانے کی وجہ سے اُن کی چند روز کی غیر حاضری میں اُن کا انتظار نہ کیا اور اُن کی نبوت سے انکار کر دیا اور سونے چاندی کے زیورات کو گلا کر اُس سے ایک بچھڑے کی مورت بنائی پھر اُس کی پرستش کرنے لگے اور اپنے وہ سارے قول و قرار اور عہد و پیمان بھول گئے جو ابھی چند روز پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اُنھوں نے کئے تھے۔ آخر میں اِس کا ذکر ہے کہ یہودیوں کی عہد شکنی کی سزا میں اُن کے سروں پر اللہ نے کوہِ طور کو معلق کر دیا تھا اور اُس وقت تو وہ موت کے خوف سے ایمان کا زبانی اظہار کرتے رہے مگر جب وہ پہاڑ ہٹ گیا تو پھر کفر کا اظہار کرنے لگے اور معبودانِ باطل کی پرستش میں لگ گئے غرض یہ حقیقت واضح ہوگئی ہے کہ یہود یعنی اسرائیلی قوم کی تاریخ ظلم و جور، انسانیت دشمنی، قتل و غارت، بدنیتی کفر و الحاد اور اللہ کی نافرمانیوں اور گناہ و معصیت سے بھری پڑی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ○ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ○ وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ○

پ ۱ رکوع ۱۱ کی آخری ۳ آیات اور رکوع ۱۲ کی ابتدائی ۳ آیات۔ سورۃ البقرۃ۔

کہدو کہ اگر خدا کے پاس آخرت کا گھر خاص تمہارے ہی لئے ہے دوسرے لوگوں کو چھوڑ کر تو تم موت کی آرزو کرو اگر تم سچے ہو لیکن وہ کبھی ہرگز اس کی آرزو نہ کریں گے اُن بُرے اعمال کی وجہ سے جنہیں یہ اپنے ہاتھوں سمیٹ چکے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے اور تم اُنھیں زندگی پر سب لوگوں سے بڑھ کر حریص پاؤ گے اور مشرکوں سے بھی بڑھ کر۔ اُن میں سے ہر ایک شخص چاہتا ہے کہ اُس کی عمر ہزار برس کی ہو جائے حالانکہ اگر اُسے اتنی عمر مل بھی جائے تو یہ بات بھی اُس کو عذاب سے نہیں بچا سکتی اور جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ اُسے خوب دیکھ رہا ہے۔ کہدو کہ جو شخص جبریل سے عداوت رکھے تو اُس (فرشتہ) نے یہ کلام تو اللہ کے حکم سے تمہارے دل پر اُتارا ہے جو تصدیق کرنے والا ہے اُن کتابوں کی جو اس کے پہلے نازل ہو چکی ہیں اور یہ ہدایت ہے اور ایمان والوں کے لئے خوشخبری ہے جو شخص اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہو تو بیشک اللہ بھی (ایسے) کافروں کا دشمن ہے اور یقیناً ہم نے تم پر روشن آیتیں اُتاری ہیں اور اُن کا انکار نہیں کرتے مگر وہی لوگ جو نافرمان ہیں۔

تشریح و تفسیر: گذشتہ درس کی ایک آیت میں یہ جملہ آیا تھا "وَاُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ" اِس کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ "اُن کے یعنی یہود کے دلوں میں بچھڑا پلا دیا گیا تھا" اِس سے مراد یہ ہے کہ یہودیوں کے عقائد اور اُن کے دل و دماغ پر بچھڑے کی محبت اور عظمت چھائی ہوئی تھی اور اُس کی معبودیت

اُن کے قلوب میں سماگئی تھی اور رچ گئی تھی۔ "شُرب" جس کے اصلی معنی پینے کے ہیں مجازی طور پر ایسے موقعوں پر گہری عقیدت، محبت یا شدید نفرت اور بیزاری کے لئے بولا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک چیز دوسری چیز کی رگ رگ میں بس گئی اور اس کے ریشہ ریشہ میں پیوست ہوگئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں نفرت مراد نہیں ہے بلکہ بچھڑے کی معبودیت کے باطل عقیدہ کا اور اُس کی محبت کا یہودیوں کے دلوں میں پیوست ہونا ہی مراد ہے۔ اس وقت کی بیان کردہ آیتوں میں "دار آخرت" سے مراد جنت اور نجات وانعام خداوندی ہے۔ "یَوَدُّ اَحَدُھُمْ" یعنی اُن میں سے ہر ایک یہ خواہش رکھتا ہے کہ اُسے ہزار برس کی زندگی مل جائے۔ یہاں "ھُمْ" کی ضمیر سے مراد خود یہودی ہیں اور یہی تفسیر زیادہ بہتر ہے مگر بعض مفسروں نے اس سے مراد مشرکوں کو لیا ہے۔ ان آیاتِ کریمہ میں فرشتوں کے دو مشہور نام آئے ہیں ایک جبریل دوسرے میکال علیہما السلام۔ "جبریل" کا لفظ تیرہ طریقوں سے بولا گیا ہے مثلاً جَبرِیل، جَبرائیل، جَبرَئیل اور جَبرِیل وغیرہ ان آیات میں اس کا تلفظ جبریل ہے اور یہی زیادہ فصیح بھی ہے۔ "میکال" کو چھ طرح بولا گیا ہے مثلاً میکائیل، میکائیل اور میکال وغیرہ کچھ مفسروں نے کہا ہے کہ یہ دونوں سُریانی زبان کے لفظ ہیں۔ سُریانی زبان سامی زبان کی ایک شاخ ہے جس میں جَبر یا جبر اور میک بندہ اور غلام کو کہتے ہیں اور "ایل" سے مراد اللہ کی ذات ہے اس طرح جبریل اور میکائیل یا میکال سے مراد بندۂ خدا ہے۔

حضرت جبریل علیہ السلام اسلامی اصطلاح میں ایک عظیم ترین فرشتہ کا نام ہے جن کا اہم کام وحی الٰہی کو مرسلین کے پاس لیجانا ہے اُن ہی کا دوسرا نام "ناموسِ اکبر" ہے۔ مگر یہودی انھیں فرشتہ عذاب سمجھتے تھے اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو فرشتۂ وحی کہتے تھے اور اُن ہی کو افضل جانتے تھے۔ یہاں قرآن حکیم نے یہود کو تنبیہ کی ہے اور بتایا ہے کہ وحی لیجانا جبریل ہی کا کام ہے۔ وہ فرشتہ عذاب نہیں ہیں اور جو کچھ بھی وہ وحی لاتے ہیں وہ اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ کے حکم سے لاتے ہیں۔ مشہور روایتوں کی بنا پر میکال یا میکائیل بھی ایک انتہائی باعزت اور مقرب فرشتہ کا نام ہے جن کے متعلق مخلوقات کو رزق پہنچانے کا کام ہے اس طرح تشریعی امور کا تعلق حضرت جبریل سے ہے اور تکوینی چیزوں کا تعلق حضرت میکائیل سے ہے۔ ان آیاتِ کریمہ کی ابتدا میں یہ بتایا گیا کہ یہودی اس کا دعویٰ کرتے تھے کہ اُن کے سوا جنت میں کوئی نہ جائے گا اس لئے اُن سے فرمایا گیا ہے کہ جب تم کو اپنے جنتی ہونے کا یقین ہے تو پھر مرنے کی تمنا کیوں نہیں کرتے اور موت سے کیوں بھاگتے ہو پھر فرمایا گیا کہ اس زبانی دعوے کے باوجود چونکہ وہ اپنی بداعمالیوں اور گناہوں کو خوب جانتے ہیں اس لئے وہ موت کی آرزو بھی نہیں کریں گے۔

کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قیامت میں اُنھیں اس کی ضرور سزا ملے گی اور اسی وجہ سے وہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کے خواہشمند ہیں تاکہ جس قدر بھی ممکن ہو وہ آخرت کے عذاب سے بچے رہیں مگر عمر کی زیادتی اور اُس کا طولانی ہونا عذاب الٰہی سے اُنھیں ہرگز نہیں بچا سکتا۔ جبکہ اللہ اُن کے گناہوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ پھر اسے بتایا گیا کہ یہود حضرت جبریل سے عداوت رکھتے ہیں اور یہ غلط خیال رکھتے ہیں کہ وہی اس قوم کی تباہیوں اور اس پر عذاب الٰہی کے نزول کا سبب ہیں درآنحالیکہ جبریل علیہ السلام فرشتۂ وحی ہیں اور جو کچھ اُنھیں اللہ کا حکم ہوتا ہے اُسی کے مطابق عمل کرتے ہیں پھر ایک عام اعلان کر دیا گیا کہ جو شخص بھی اللہ کے رسولوں اور اُس کے فرشتوں کی نافرمانی کرے گا اور اُن سے عداوت رکھے گا اور اُن سے کفر اور انکار کا ارتکاب کرے گا تو اللہ بھی اُس کا دشمن ہے اور یقیناً وہ شخص غضب الٰہی کا مستحق ہے۔ آخر میں رسول عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف خطاب ہے اور فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اُنھیں روشن معجزے اور واضح آیات عطا کی ہیں جن سے اُن کی رسالت کی صداقت پوری طرح ثابت ہے اور ان روشن دلیلوں اور معجزات کا انکار صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو ربانی احکام اور الٰہی قانون سے بغاوت کرنے کے عادی اور خوگر ہو چکے ہیں۔

(درس ۲۱) أَوَكُلَّمَا عٰهَدُوا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ ۚ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُولٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيقٌ مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُورِهِمْ كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ۝ وَاتَّبَعُوا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِينُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِينَ كَفَرُوا يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هٰرُوتَ وَمٰرُوتَ ۚ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ أَحَدٍ حَتّٰى يَقُولَآ إِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۚ فَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۚ وَمَا هُمْ بِضَآرِّينَ بِهٖ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۚ وَلَقَدْ عَلِمُوا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖ أَنْفُسَهُمْ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ وَلَوْ أَنَّهُمْ اٰمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۚ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ۝ ع

پ ۱ رکوع ۱۲ کی آخری ۴ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ

(کیا ایسا نہیں کہ) جب کبھی اُن لوگوں نے کوئی عہد کیا تو اُن میں کی کسی (نہ کسی) جماعت نے اُسے توڑ ڈالا

بلکہ اُن میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو ایمان نہیں رکھتے اور جب اُن کے پاس اللہ کی طرف سے کوئی رسول آیا جو اُس کتاب کی تصدیق کرنے والا ہو جو اُن کے پاس ہے تو اُن اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے کتاب اللہ کو اپنی پشت کے پیچھے پھینک دیا گویا وہ لوگ کچھ جانتے ہی نہیں اور اُس چیز کے پیچھے ہو لئے جسے سلیمانؑ کی بادشاہت کے زمانہ میں پڑھا کرتے تھے اور سلیمانؑ نے تو کبھی کفر نہیں کیا البتہ شیطان ہی کفر کیا کرتے تھے وہ لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے اور وہ (پیچھے ہو لئے) اُس علم کے بھی جو بابل کے دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اُتارا گیا تھا اور وہ دونوں کسی شخص کو بھی نہیں سکھاتے تھے جبتک یہ نہ کہدیتے تھے کہ ہم تو بس ایک (ذریعہ) آزمائش ہیں اس لئے کہیں تم کافر نہ ہو جانا اس پر بھی لوگ اُن دونوں سے وہ سحر سیکھ لیتے تھے جس سے وہ مرد اور اُس کی زوجہ کے درمیان جدائی ڈال دیتے تھے حالانکہ یہ لوگ کسی کو بھی اُس کے ذریعہ سے نقصان نہیں پہنچا سکتے مگر اللہ ہی کے اذن سے اور یہ ایسی چیزیں سیکھتے ہیں جو انھیں ضرر دیتی ہیں اور نفع نہیں پہنچاتیں اور وہ اِسے اچھی طرح جان چکے ہیں کہ جس شخص نے اُس کو اختیار کرلیا اُس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور بیشک وہ چیز بُری ہے جس کے عوض میں اُنھوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا ہے کاش اُنھیں اِس کا علم ہوتا اور اگر وہ لوگ ایمان لاتے اور پرہیز گار بنتے تو اللہ کے یہاں کا معاوضہ بہتر تھا کاش وہ سمجھتے۔

تشریح و تفسیر: "نبذ" کے معنی ہیں کسی چیز کو ناقابل التفات اور بے حیثیت سمجھ کر پھینک دینا یہ یہودیوں کی قدیم عادت کی طرف اشارہ ہے کہ جب وہ کوئی عہد خدا، رسول یا کسی اور سے کرتے تھے تو اُس کی پابندی نہیں کرتے تھے اور ہمیشہ معاہدہ کو توڑنے اور اُس کی خلاف ورزی کرنے کی کوشش میں لگے رہتے تھے اور صرف معاہدہ میں اور قول و قرار کی پابندی ہی میں اُن کا یہ حال نہ تھا بلکہ اُنھوں نے توراۃ کو بھی اپنے پس پشت ڈال رکھا تھا۔

"شیطان" کے اصلی معنی متمرّد اور سرکش کے ہیں اس لئے لغوی حیثیت سے یہ لفظ ہر اُس مخلوق کے لئے بولا جا سکتا ہے جس میں شرارت اور سرکشی، بغاوت اور نافرمانی پائی جاتی ہو۔ اِن آیات میں بعض بڑے مفسروں نے "شیاطین" سے سرکش اور گمراہ و خبیث جنات مراد لئے ہیں جو عہد حضرت سلیمانؑ میں اُن کے تابع تھے مگر جب وہ زمانہ گذر گیا تو سلطنت سلیمانی کی طرف سے بے خوف ہو کر وہ سرکشی اور حق سے بغاوت کر کے کام میں مشغول ہو گئے اور کچھ مفسروں نے اِس سے مراد اُن شیاطینِ انس یعنی سرکش انسانوں کو لیا ہے جو حضرت سلیمانؑ کے خلاف بغاوت میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے اور

جادوگری کے فن میں بھی بڑی مشق اور مہارت رکھتے تھے جن کا ذکر عہد عتیق کے صحیفوں میں تفصیل کے ساتھ پایا جاتا ہے مگر اکثر مفسروں نے انسان اور جن دونوں ہی کے سرکش افراد مراد لئے ہیں۔ ان آیاتِ کریمہ میں بھی اسرائیلی قوم کی جہالت اور کفر و نافرمانی کا مسلسل طور پر ذکر ہے۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اِس قوم میں غداری اور عہد شکنی بہت معمولی بات ہے اور یہ دراصل توراۃ پر ایمان ہی نہیں رکھتے تھے اِس لئے کسی قسم کے عہد۔ قرار اور خصوصاً آخری نبیؐ کی بعثت کے عہد پر یہ لوگ باقی نہ رہے۔ اِس طرح اگر یہ قرآن حکیم کے منکر ہیں تو توراۃ کے ہر حکم کو بھی اِس سے قبل اپنے عمل اور کردار سے ٹھکرا چکے ہیں۔ پھر یہودیوں کے کردار کا ایک نیا رُخ ظاہر کیا گیا ہے کہ اُن کی حالت یہ ہے کہ وہ بجائے الٰہی احکام سیکھنے کے اور بجائے اُن کی پیروی کرنے کے شیطانی علوم کو سیکھنے اور شیطان کی پیروی کرنے پر فخر کرنے لگے۔ ان شیطانی علوم سے مراد کہانت اور جادوگری کے فنون اور اُن کے تمام شعبے ہیں۔ اسرائیلیوں کو فن سحر کی طرف قدیم زمانہ میں جس طرح گہری دلچسپی تھی خود عہد سرورؐ کائنات میں بھی اُسی طرح اُن میں جادو اور کہانت کی طرف رغبت عام طور پر پائی جاتی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ اُن لوگوں کے باپ دادا جس طرح عہد سلیمانی میں جادوگری میں بتلا رہا کرتے تھے اور بجائے دینی علوم کے سحر و کہانت کے غیر اسلامی اور سفلی فن حاصل کرنے میں اپنی عمریں برباد کرتے تھے یہ لوگ بھی اُن ہی کی پیروی میں ان ہی شیطانی مشغلوں میں پڑے رہتے ہیں۔ حضرت سلیمانؑ کی سلطنت کا مرکزی علاقہ شام اور فلسطین کا خطہ تھا اِس لئے یہ بتایا گیا ہے کہ عہد سرورؐ دو عالم کے یہودی اپنے آباؤ اجداد کی طرف سے اِس فلسطینی سحر کے پوری طرح وارث ہوئے ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ لوگ بابل کے فنونِ سحر کے بھی وارث ہیں۔ یہ ایک گہری تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ بخت نصر کلدانی بادشاہ نے جب اسرائیلیوں پر حملہ کیا تھا تو اُس کے نتیجہ میں یہ قوم دو ٹکڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ جس میں سے ایک جلا وطن ہو کر خطۂ بابل ہی میں بس گیا تھا یہ وہ خطہ تھا جسے اِس وقت عراق کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اور دوسرا وہ جو جلا وطنی کے بعد پھر فلسطین میں واپس آ گیا تھا۔ غرض فلسطین اور بابل دونوں ہی سحر و نیر بخات میں مشہور تھے اس لئے یہ فرمایا گیا ہے کہ عہد سرورؐ کائنات کے اسرائیلی اِن دونوں شیطانی علوم کے مرکزوں کے وارث تھے اور گمراہیوں کے دُہرے اثرات اُن کی سیرت اور کردار میں پائے جاتے تھے۔ اِس سلسلہ میں ہاروت و ماروت دو فرشتوں کا بھی ذکر آیا ہے جنہیں اللہ نے انسانی صورت میں بھیجا تھا اور انھوں نے "بابل" میں پہنچ کر لوگوں کو سحر سے بچنے کے طریقے سکھائے تھے اور اُن کی تعلیم دینے کے وقت وہ لوگوں کو بتا بھی دیتے تھے کہ سحر کرنا جائز نہیں ہے اور اِس میں ایسی صورتیں بھی ہیں جو نہ صرف معصیت اور حرام ہیں بلکہ انسان کو کفر میں بھی مبتلا کر دیتی ہیں۔ غرض اُن

فرشتوں کا کام اصلاحِ عقائد تھا اور وہ سحر کے گہرے رموز لوگوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ اس لئے تعلیم دیتے تھے کہ وہ ساحروں کے جال میں پھنسکر گمراہ نہ ہو جائیں

(درس ۲۲) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقُولُوا رَاعِنَا وَقُولُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوا ۗ وَلِلْكَافِرِينَ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ مَا يَوَدُّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَلَا الْمُشْرِكِينَ أَنْ يُنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِنْ خَيْرٍ مِنْ رَبِّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ○ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنْسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَمَا لَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ مِنْ وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ○ أَمْ تُرِيدُونَ أَنْ تَسْأَلُوا رَسُولَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوسَىٰ مِنْ قَبْلُ ۗ وَمَنْ يَتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاءَ السَّبِيلِ ○ وَدَّ كَثِيرٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِمْ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○

پ ۱ رکوع ۱۳ کی ابتدائی ۶ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

اے ایمان والو! تم "رَاعِنَا" نہ کہا کرو اور "اُنْظُرْنَا" کہا کرو اور غور سے سنتے رہا کرو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ جو لوگ کافر ہیں خواہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرک ہوں وہ اس کو پسند نہیں کرتے کہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر کوئی بھی بھلائی اُتاری جائے حالانکہ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے خاص کر لیتا ہے اور وہ بڑے ہی فضل والا ہے۔ ہم جب کوئی آیت منسوخ کر دیتے ہیں یا اس کو بھلا دیتے ہیں تو اُس سے بہتر یا ویسی ہی (اور) آیت لے آتے ہیں کیا تم نہیں جانتے کہ یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے، کیا تمہیں خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے اور اللہ کے سوا تمہارا نہ کوئی سرپرست ہے نہ مددگار ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ تم بھی رسولؐ سے ویسے ہی سوالات کرو جس طرح پہلے زمانہ میں موسیٰؑ سے سُوالات کئے جا چکے ہیں اور جو شخص ایمان کے بدلہ میں کفر اختیار کر لے گا تو وہ یقیناً سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔ بہت سے اہلِ کتاب تو دل ہی سے چاہتے ہیں کہ تم کو ایمان لانے کے بعد پھر

کافر بنا دیں حسد کی وجہ سے جو اُن کے دلوں میں ہے اور (یہ بھی) اسکے بعد کہ اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے
پس تم معاف کرتے رہو اور درگذر کرتے رہو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجدے۔ بلیشک اللہ ہر چیز پر
قدرت رکھنے والا ہے۔

تشریح وتفسیر: "رَاعِنَا" رَعْیٌ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی چرنے کے بھی ہیں اور چرانے
کے بھی اِس کے علاوہ رعایت کرنے اور حفاظت کرنے کے بھی آتے ہیں۔ اِس کے ساتھ ہی اگر "نون"
اس کے اصلی مادہ میں شامل ہو تو یہ "رَاعِن" ہو جائے گا جس کے معنی مست اور احمق کے ہیں۔ اِس کے
علاوہ "رَاعِنا" کی عین کو اگر ذرا کھینچ کر پڑھا جائے تو اِس کے معنے "ہمارے چرواہے" کے ہو جاتے
ہیں۔ بات یہ تھی کہ جب حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن حکیم کی تلاوت فرماتے تھے اور احکام
خداوندی کی تفصیل بیان کرتے تھے۔ پھر اگر کوئی بات لوگوں کی سمجھ میں نہ آتی تھی تو وہ عرض کرتے
تھے کہ دوبارہ اسے ہمیں سمجھائیے۔ یہودیوں نے ایسے موقعوں پر انتہائی شرارت سے ایک خاص
لفظ "راعنا" بولنا شروع کر دیا تھا جس کے ظاہری معنی یہ ہیں کہ آپ ہماری رعایت فرمائیے اور ہمیں
دوبارہ اس بات کا مطلب سمجھا دیجئے لیکن در پردہ ان کی نیت صرف یہ ہوا کرتی تھی کہ وہ آنحضرتؐ کی
توہین کریں۔ عام مسلمان چونکہ یہود کی اِس شرارت اور اِس گستاخانہ جذبہ سے غافل تھے اِس لئے وہ
بھی اپنے جذبۂ عقیدت سے یہی لفظ اُس کے ظاہری معنی میں بول دیا کرتے تھے۔ چونکہ اس لفظ سے
ایک بُرا مفہوم بھی پیدا ہوتا تھا اس لئے مسلمانوں کو منع کر دیا گیا کہ یہ لفظ نہ بولا کریں بلکہ اس کے
بجائے آنحضرتؐ کی خدمت میں "اُنْظُرْنَا" کہیں یعنی ہم پر نظر توجہ فرمائیے۔ اس حکم سے یہ بھی مفہوم نکلتا
ہے کہ کوئی ایسا لفظ جس سے توہین کا پہلو ظاہر ہوتا ہو کسی محترم شخصیت کے لئے کبھی نہ بولا جائے۔

اِسی سلسلہ میں یہودیوں کے اِس عقیدہ کی رد کی گئی ہے کہ جب کوئی حکم آجاتا ہے تو اُس کا منسوخ ہونا
ممکن ہی نہیں ہے اِس لئے توراۃ کے احکام نہ تو انجیل سے منسوخ ہو سکتے ہیں اور نہ قرآن سے۔ اِس کا
جواب یہ دیا گیا کہ تمام احکام اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور جب اُس کی مصلحت ہوتی ہے تو وہ اپنے
ایک حکم کو ہٹا کر اُس کی جگہ پر دوسرا حکم عطا کر دیتا ہے اور اِسی طرح جب وہ چاہتا ہے تو لوگوں کے
ذہنوں سے کسی آیت کی یاد کو مٹا بھی دیتا ہے۔ اُس کے وہ حکم جو خاص حالتوں اور مخصوص مصلحتوں
کی وجہ سے ہوا کرتے ہیں اُن حالات اور مصلحتوں کے بدل جانے سے وہ بھی بدل جاتے ہیں۔ اِس فرمانِ الٰہی
میں بیت المقدس سے کعبہ کی طرف قبلہ کی تبدیلی اور اسی طرح کے دوسرے احکام کا منسوخ کیا جانا شامل ہے
غرض ان آیات میں مسلمانوں کو گفتگو کرنے کا ادب سکھایا گیا ہے۔ پھر یہود کی اُس نفرت وعداوت کا ذکر ہے

جو انہیں رسولؐ اللہ اور مسلمانوں سے تھی۔ ساتھ ہی اللہ کی طرف سے آیات و احکام کے منسوخ ہونے اور بھلا دینے کے جواز کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔ اس سلسلہ آیات میں یہ بھی فرمایا جا چکا ہے کہ سچا مومن وہی ہے جس کا قدم منزل یقین و استقامت سے کبھی نہ ہٹے۔ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۔ یعنی جس نے اپنے ایمان کو شک اور کفر سے بدل لیا وہ برگزیدہ راستہ پر نہیں ہے۔ یہ ایک وسیع اور جامع فرمانِ خداوندی ہے جس میں حقیقی ایمان کی شان اور سچے مومن کے اصلی مقام کو سمجھایا گیا ہے اور اس طرح اس حقیقت کو سمجھایا گیا ہے کہ سچا مومن وہی ہے جو مصیبتوں سے ڈر کر یا دنیاوی منصب و دولت و عزت کی لالچ میں کبھی جادۂ استقامت سے اپنا قدم نہ ہٹائے۔ ہمیشہ اللہ کے خاص اور برگزیدہ بندوں نے اس پیغامِ خداوندی کو اپنی زندگی، اپنے عمل اور اپنے قول سے نوعِ بشر کے سامنے بار بار پیش کیا ہے اور رہتی دنیا تک باقی رہنے والی مثالیں قائم کی ہیں۔ کربلا کی سرزمین پر نواسۂ رسولؐ کی شہادتِ عظمیٰ بھی اسی استقامتِ دینی اور یقینِ محکم کا ایک ہمیشہ باقی رہنے والا سبق ہے۔ حضرت سید الشہداء علیہ السلام اور آپ کے اصحاب باوفا جن مصیبتوں اور آفتوں میں گھرے ہوئے تھے ان میں کسی عام انسان کے لئے ثابت قدم رہنا آسان کام نہ تھا مگر فرزندِ رسولؐ نے اور سپاہِ حسینیؑ کے ہر مجاہد نے اور ایک ایک بچہ نے استقامت اور عزم ایمانی کی نہ مٹنے والی عظیم مثالیں پیش کر دیں اور یہ بتا دیا کہ ضلالت و گمراہی کا بڑے سے بڑا خوفناک طوفان بھی سچے مومن کے قدمِ استقلال و یقین میں کبھی جنبش نہیں پیدا کر سکتا اور نہ وہ کبھی اپنی متاعِ ایمان کو کفر اور باطل کی کسی قیمت سے بھی بدل سکتا ہے چاہے وہ کتنی ہی دلفریب

(درس ۲۳)

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ ع وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ

فِيهَا اسْمُهُ وَسَعَىٰ فِي خَرَابِهَا ۚ أُولَٰئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ أَنْ
يَدْخُلُوهَا إِلَّا خَائِفِينَ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَلَهُمْ
فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ○ وَلِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ
فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۖ بَلْ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ
وَالْأَرْضِ ۖ كُلٌّ لَهُ قَانِتُونَ ○ بَدِيعُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ
وَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ ○

پ ۱ رکوع ۱۳ کی آخری ۳ اور رکوع ۱۴ کی ابتدائی ۵ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ

اور نماز کو پابندی سے پڑھا کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو کچھ بھلائی تم اپنے لئے پہلے سے بھیجدو گے اُسے اللہ کے پاس پاؤ گے تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُس کو خوب دیکھنے والا ہے اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ بہشت میں ہرگز کوئی نہ جانے پائے گا سوائے اُن کے جو یہودی ہوں یا نصرانی ہوں یہ اُن کی صرف آرزوئیں ہیں کہدو کہ اپنی سند لاؤ اگر تم سچے ہو۔ ہاں جو شخص بھی اپنے چہرہ کو اللہ کے آگے جُھکائے اور وہ نیک کام کرنے والا ہو تو۔ اُس کے لئے اُس کا اجر اُس کے پروردگار کے پاس موجود ہے اور ایسے لوگوں کے لئے نہ تو کسی قسم کا خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور یہود کہتے ہیں کہ نصاریٰ کسی بنیاد پر نہیں ہیں اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہود کسی بنیاد پر نہیں حالانکہ یہ (دونوں گروہ) آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ اسی طرح ان ہی کی سی باتیں وہ لوگ بھی کرتے ہیں جو کچھ بھی علم نہیں رکھتے تو اللہ ان کے درمیان روز حشر اُس امر میں فیصلہ کردے گا جس میں وہ جھگڑتے رہتے ہیں اور اُس سے بڑھ کر کون شخص ظالم ہوگا جو اللہ کی مسجدوں کو اِس سے روک دے کہ اُن میں اُس کا نام لیا جائے اور اُن کو برباد کرنے کی کوشش کرے خود یہی لوگ ہیں جو اس قابل نہیں کہ اُن میں داخل ہوں مگر ڈرتے ہوئے ایسے ہی لوگوں کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں بڑا عذاب ہے اور اللہ ہی کے لئے ہیں مشرق اور مغرب تو تم جدھر رُخ کرو اُدھر اللہ کی ذات ہے۔ بیشک اللہ بڑا وسعت والا بڑا علم والا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ اولاد رکھتا ہے۔ پاک ہے وہ! اصل یہ ہے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اُسی کا ہے۔ سب اُسی کے فرمانبردار ہیں وہ آسمانوں اور زمین کا ایجاد کرنے والا ہے اور جب وہ کسی کام کے لئے حکم کرتا ہے تو یہی فرماتا ہے اُس کے لئے کہ ہوجا بس وہ ہوجاتا ہے۔

تشریح وتفسیر: "ھُود" یہ ایک مشہور پیغمبر کا بھی نام ہے جو حضرت نوح علیہ السلام کی آٹھویں

پشت میں تھے اور قوم عاد کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر بیان کردہ آیات میں "ھُود" سے مراد یہودی قوم ہے جبکہ لفظی حیثیت سے ایک قول کی بنا پر یہ "ھائد" کی جمع ہے۔ اور "ھائد" توبہ کرنے والے کو کہتے ہیں مراد بہر حال یہاں پر یہودی ہی ہیں "نصارٰی" نصرانی کی جمع ہے۔ اس لفظ کا اطلاق حضرت عیسٰی علیہ السلام کے متبعین پر ہوتا ہے۔ یہ لوگ شمالی فلسطین کے شہر "ناصرہ" کی طرف منسوب ہیں جو حضرت عیسٰی بن مریم علیہما السلام کا ابتدائی مسکن تھا۔

پہلی آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ہر حال میں نماز اور زکوٰۃ کے حکم پر پابندی کے ساتھ عمل کرتے رہو اور جب جہاد کا حکم آئے گا تو اُس پر بھی عمل کرنا۔ یہ مدینہ کے مسلمانوں کی طرف خطاب ہے اور ساتھ ہی اُنہیں یقین دلایا گیا ہے کہ تمہارے نیک اعمال کبھی ہرگز ضائع نہ ہوں گے بلکہ اُن کا ثواب آخرت میں ضرور مل جائے گا اس طرح اُن تمام باطل عقائد کی نفی ہو جاتی ہے جن میں معاد اور آخرت کی جزا اور سزا کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

پھر اہل کتاب کے عقائد پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے کہ اُن میں سے ہر قوم کا یہی خیال تھا کہ جنت کی وہی حقدار ہے۔ یہود کہتے تھے کہ جنت ہماری ہے اور نصارٰی دعوے کرتے تھے کہ وہ ہماری ہے اور ان ہی باطل خیالات سے یہ اپنے دلوں کو بہلایا کرتے تھے مگر اُن کی عقل و فہم کے قلیل سرمایہ میں ایسی کوئی دلیل اور سند کہاں موجود تھی جو ان کی سچائی ثابت کر سکتی۔ اس کے بعد بتایا گیا ہے کہ نجات اخروی ان بے بنیاد خوش اعتقادیوں سے حاصل نہ ہوگی بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ عقیدہ اور عمل میں بھرپور مطابقت پائی جائے اور اِن دونوں باتوں کی بنیاد خالق کائنات کے مقرر کئے ہوئے اصول اور قوانین پر ہو۔ قیامت میں اہلِ یقین و ایمان کی حالت بیان کرتے ہوئے یہاں صرف اس قدر فرمایا گیا ہے کہ اُن پر نہ تو کوئی خوف طاری ہوگا اور نہ اُنھیں کسی بات کا حُزن و ملال ہوگا۔ خوف کا تعلق فیصلۂ الٰہی کے بعد کی باتوں سے ہے اور حُزن پچھلی دنیوی زندگی سے متعلق ہے۔ یعنی دنیا میں بھی اُن کے اعمال اچھے تھے اور آخرت میں بھی اُن کو کسی سزا کا خوف نہ ہوگا۔ پھر یہود و نصارٰی کے باہمی اختلافات کا بیان ہے کہ ایک فریق دوسرے فریق کے مذہب کو بے بنیاد کہتا ہے اور ہر ایک دوسرے کی تکفیر کرتا ہے حالانکہ یہ سب اہلِ کتاب ہیں یعنی آسمانی کتابوں کے پڑھنے والے ہیں اور ظاہر ہے کہ ان آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں باہمی کوئی تضاد اور اختلاف موجود نہیں ہے اور ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اس لئے ان قوموں میں اس قدر شدید اختلاف کیوں ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ یہ تو اہلِ کتاب کا حال تھا رہیں مشرک قومیں جو اہلِ کتاب میں داخل نہ تھیں وہ تو سارے ہی پیغمبروں اور اُن کی شریعتوں کی منکر ہیں تو اب ان تمام باتوں کا

آخری صحیح فیصلہ قیامت ہی میں ہوگا اور اللہ بتادے گا کہ حق پر کون ہے۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ مسجدوں کی بے حرمتی کرتے ہیں اور ان کو برباد کرتے ہیں اور لوگوں کو ان میں عبادت کرنے اور خدا کا ذکر کرنے سے روکتے ہیں ان سے بڑا ظالم کوئی نہیں ہے۔ اس جملہ سے بیت المقدس کی تاریخی تباہی کی طرف اشارہ ہے جو نصاریٰ کے ہاتھوں ہوئی تھی اور بعض کے نزدیک اس سے مشرکین مکہ مراد ہیں جنھوں نے مسجد الحرام اور مکہ میں داخلہ سے مسلمانوں کو روکا تھا اور تمام مساجد کے لئے احترام و تعظیم کا ایک عام حکم بھی ہے۔ آخر میں یہود و نصاریٰ کی سمت و جہت پرستی اور اللہ کی ذات کے لئے اُن کے عقیدہ جسمانیت Anthropomorphism کی مطلق نفی کر دی گئی یہ فرما کر کہ اللہ کسی جہت میں محدود نہیں بلکہ وہ مشرق و مغرب کا مالکِ حقیقی ہے۔ جس خطۂ زمین میں بھی کوئی چاہے اُس کے حکم کے مطابق اپنا رخ درست و صحیح کر کے اُس کی عبادت کر سکتا ہے۔ پھر یہودی حضرت عزیرؑ کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے اس لئے یہ بتایا گیا کہ اللہ کا کوئی بیٹا اور بیٹی نہیں ہے۔ وہ اولاد، ازدواج اور جسمانی و مادی حالات و کیفیات سے پاک اور منزہ ہے اور کائنات کی ہر چیز کا وہی تنہا مالک اور خالق ہے۔ (مدرسہ)

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِىْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِىٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ ع يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

پ ۱ رکوع ۱۴ کی آخری ۴ اور رکوع ۱۵ کی ابتدائی ۲ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

جو لوگ کچھ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اللہ ہم سے کلام کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں

نہیں آتی اسی طرح انھیں کی سی باتیں وہ لوگ کر چکے ہیں جو اُن سے پہلے تھے اور سب کے قلب باہم ایک دوسرے کے مشابہ ہیں۔ بیشک ہم نے اپنی نشانیاں صاف صاف بیان کر دی ہیں اُن لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور دوزخ والوں کے بارے میں تم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی اور تم سے یہود و نصاریٰ کبھی ہرگز خوش نہ ہوں گے جبتک تم اُن کے دین کی پیروی نہ کرنے لگو کہدو کہ بیشک اللہ کی ہدایت ہی (دراصل) ہدایت ہے۔ اور اگر تم اس علم کے بعد بھی جو تمہیں پہنچ چکا ہے اُن کی خواہشوں کی پیروی کرنے لگے تو تم کو خدا سے بچانے والا نہ کوئی سرپرست ہوگا اور نہ مددگار جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے (اور) وہ اُسے اُسی طرح پڑھتے ہیں جس طرح اُس کو پڑھنے کا حق ہے وہی اُس پر ایمان لاتے ہیں اور جو کوئی اس سے کفر کرے گا تو ایسے ہی لوگ نقصان اُٹھانے والے ہیں۔ اے اولاد یعقوب میری وہ نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم کو بخشیں اور یہ کہ میں نے تمہیں عالمین پر فضیلت عطا کی اور اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئیگا اور نہ اُس کی طرف سے کوئی معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ اُسے کوئی سفارش ہی فائدہ پہنچائے گی اور نہ اُن لوگوں کی مدد کی جائے گی۔

تشریح و تفسیر: "اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ" سے مشرکین عرب مراد ہیں "لَوْلَا" "ھَلَّا" کے معنی میں بولا گیا ہے جس کا ترجمہ "کیوں نہیں" کے جملہ کے ساتھ کیا جاتا ہے جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا۔ مشرکین کہا کرتے تھے کہ اگر (اُن کے بقول) یہ بات صحیح ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے کلام کرتا ہے تو پھر وہ ہم سے بھی کیوں کلام نہیں کرتا۔ مگر اُن کی جہالت اور کم عقلی تو اسی بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اللہ سے کلام کرنے کے لائق ہونے کے لئے صرف بشر اور محض انسان ہونا کافی سمجھتے تھے اور یہ نہیں جانتے تھے کہ اس مرتبہ تک پہنچنے کے لئے ایسی صفتوں کی ضرورت ہے جو کسی عام انسان میں نہیں پائی جاتیں بلکہ یہ صرف اُن ہی بندگانِ الٰہی میں ہوتی ہیں جو اس خاص منزلت کے اہل ہوتے ہیں اور اللہ انھیں اس مرتبہ کے لئے منتخب فرماتا ہے۔ "آیۃٌ" کے لفظی معنی نشان اور علامت کے ہیں مگر قرآن حکیم میں کثرت کے ساتھ اس کو معجزہ اور دلیل کے لئے بولا گیا ہے۔ "معجزہ" اسلامی اصطلاح میں ایسے واقعہ یا ایسی چیز کو کہتے ہیں جو کائنات کے عام ضابطوں اور قاعدوں سے ہٹکر ظاہر ہو اور اُس کے وجود میں آنے کا سبب کائنات کے ظاہری وسائل و اسباب نہ ہوں اور اُس کا ظہور اللہ کی جانب سے اُس کے رسولؐ کی تائید اور حمایت کے لئے ہو۔ "مِلَّۃ" کے لفظی معنی طریقہ اور مذہب کے ہیں لیکن اصطلاحی طور پر "مِلَّۃ" اُس دستور اور نظامِ عمل کا نام ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے

اپنے بندوں کے لئے مقرر فرما دیا ہے "دین" اور "مِلّة" ایک ہی چیز ہے یعنی دستورِ الٰہی۔ مگر فرق صرف
اس قدر ہے کہ اُس دستور کو اللہ کی جانب سے معین اور مقرر ہونے کے لحاظ سے "ملّة" کہا جاتا ہے اور
اُس پر عمل کرنے اور اُس کی پیروی کرنے والوں کے لحاظ سے اُسے "دین" کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی
ملّة اور دین کے لفظ کبھی مجازی طور پر باطل مذاہب کے لئے بھی بول دئے جاتے ہیں مگر حقیقی معنی وہی ہیں جو
بیان کئے گئے۔ غرض ان آیات کریمہ کی ابتدا میں بتایا گیا ہے کہ کفار و مشرکین برابر اس پر اصرار کرتے رہتے
تھے کہ اللہ اُن سے براہِ راست کلام کرے یا خاص طور پر اُن کے لئے کوئی عظیم معجزہ ظاہر ہو جس سے وہ مجبور
ہو کر رسالتِ محمدی کا اقرار کریں اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے اس قسم کی فرمائشیں
گذشتہ پیغمبروں سے بھی کی جاتی رہی ہیں اور اس جہالت و گمراہی میں اگلے اور پچھلے لوگوں کی حالت ایک
دوسرے سے ملتی جلتی ہے۔ پھر اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ ہم نے تو اپنی نشانیاں پوری طرح ظاہر
کر دی ہیں مگر یہ نشانیاں، یہ دلیلیں اور یہ معجزے اُن ہی لوگوں کو نظر آتے ہیں جن میں ہٹ دھرمی، ضد،
جہالت اور دشمنی یا تعصب نہ ہو اور اُن کے دل ان تمام گندگیوں سے پاک اور صاف ہوں لیکن اگر ایسا
نہیں ہے تو پھر نہ کوئی دلیل کافی ہو سکتی ہے اور نہ کوئی معجزہ۔ جہاں تک دلائل و معجزات کا تعلق ہے
سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تشریف لانے سے متعلق گذشتہ آسمانی کتابوں میں پیشین گوئیاں
بکثرت موجود ہیں پھر آپ کی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ معجزات اور آیاتِ الٰہیہ کا آئینہ دار ہے اور ساتھ
ہی قرآن حکیم آپ کی سچائی کا ایک عظیم ثبوت ہے جو لفظی اور معنوی، ظاہری اور باطنی ہر حیثیت سے معجزہ
ہے اور قیامت تک کوئی اِس کا مثل نہیں لا سکتا "اِنَّا اَرْسَلْنٰكَ" فرما کر یہ اعلان کیا گیا کہ حضرت
خاتم المرسلین کا کام صرف ہدایت کا پیغام پہنچا دینا اور اللہ کے قہر و عذاب سے ڈرا دینا ہے اس کے بعد
اگر کوئی کفر اختیار کرے گا اور حق کی پیروی نہ کرے گا تو اُس کی ذمہ داری آپ کی ذاتِ اقدس پر نہیں
ہو سکتی۔ پھر یہود و نصاریٰ کے تعصب اور ہٹ دھرمی کا ذکر ہے کہ وہ رسول اللہ سے اُسی وقت
راضی ہو سکتے ہیں جبکہ بفرضِ محال آپ اُن کے دین کو قبول فرما لیں اور چونکہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہے
اِس لئے اِس کی توقع کرنا کہ وہ لوگ اپنی دشمنی اور مخالفت سے باز آجائیں گے بیکار ہے۔ اِسی ضمن میں
یہ بھی بتایا گیا کہ جو اہلِ کتاب اپنی آسمانی کتاب کو غور سے پڑھتے ہیں اور احکامِ خداوندی کو سمجھنے اور
اُن پر عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں ضد اور تعصب سے کام نہیں لیتے وہ یقیناً رسولِ اسلام اور
قرآن حکیم پر ایمان لائیں گے اور اس سے انکار نہ کر سکیں گے اور جو ضد کریں گے اور ہٹ دھرمی سے کام
لیں گے وہ دنیا اور آخرت میں گھاٹے میں رہیں گے۔ آخر میں اولادِ یعقوب علیہ السلام پر اپنی نعمتوں کا

ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ ہم نے اُنھیں اُس وقت تک کی تمام قوموں کے مقابلہ میں فضیلت عطا
کی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ فضیلت توحید و نبوت پر اقرار و ایمان ہی کی وجہ سے تھی جو بعد میں کفر و شرک کے
سبب سے ختم ہو گئی اور یہ شرف اور فضیلت اور عزت و عظمت صرف ایسی ہی صورت میں دوبارہ
کسی کو حاصل ہو سکتی ہے جبکہ وہ سچے دل سے ایمان اختیار کرلے کیونکہ آخرت میں نجات اور
بارگاہ خداوندی میں عزت کا حصول اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔

(درس ۲۵) وَإِذِ ابْتَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ ۖ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ
لِلنَّاسِ إِمَامًا ۖ قَالَ وَمِن ذُرِّيَّتِي ۖ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ ○
وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا ۖ وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ
إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ
لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ ○ وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ
رَبِّ اجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا آمِنًا وَارْزُقْ أَهْلَهُ مِنَ الثَّمَرَاتِ مَنْ
آمَنَ مِنْهُم بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ قَالَ وَمَن كَفَرَ فَأُمَتِّعُهُ قَلِيلًا
ثُمَّ أَضْطَرُّهُ إِلَىٰ عَذَابِ النَّارِ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ○ وَإِذْ يَرْفَعُ
إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ
إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ○ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ
لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا
وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ○ رَبَّنَا وَابْعَثْ
فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ
وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ○

پ ۱ رکوع ۱۵ کی آخری ۶ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

اور جب ابراہیمؑ کو اُن کے پروردگار نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ اُن کو پورے طور پر بجالائے
تو اللہ نے فرمایا کہ میں تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔ اُنھوں نے عرض کی اور میری اولاد میں سے
بھی۔ ارشاد ہوا کہ میرا عُہدہ نافرمانوں کو نہیں ملے گا اور جب ہم نے قرار دیا خانہ کعبہ کو لوگوں کے لئے
جمع ہونے کی اور امن کی جگہ اور تم مقام ابراہیمؑ کو نماز پڑھنے کی جگہ بنالو اور ہم نے ابراہیمؑ اور اسمٰعیلؑ
کی طرف حکم بھیجا کہ تم دونوں میرے گھر کو خوب پاک صاف رکھو طواف کرنے والوں اور اعتکاف

کرنے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لئے اور جس وقت ابراہیم نے دعا کی کہ
اے میرے پروردگار اس شہر کو امن والا بنا دے اور اس میں اُن بسنے والوں کو پھلوں سے رزق عطا فرما
جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں۔ اللہ نے فرمایا کہ جو کفر کرے گا میں اُس کو بھی کچھ روز فائدہ
اٹھانے دوں گا پھر اُسے دوزخ کے عذاب میں جبراً بلاؤں گا اور وہ کیسا برا ٹھکانا ہے اور جب ابراہیم
و اسمٰعیل خانہ کعبہ کی بنیادیں بلند کر رہے تھے۔ اے ہمارے پروردگار ہماری خدمت قبول فرما بیشک
تو ہی بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار باقی رکھ
اور ہماری اولاد میں سے بھی ایک امت پیدا کر جو تیری فرمانبردار ہو اور ہم کو ہمارے احکام حج بھی
بتا دے اور ہمارے حال پر توجہ رکھ یقیناً تو ہی بڑا توجہ فرمانے والا ہے بڑا مہربان ہے۔ اے ہمارے
پروردگار اور اس جماعت میں اِن ہی میں سے ایک ایسا پیغمبر بھیج جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر
سُنائے اور انھیں کتابِ الٰہی اور دانائی کی تعلیم دے اور انھیں پاک صاف کرے یقیناً تو ہی بڑا
زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے۔

تشریح و تفسیر: "ابتلاء" کے معنی امتحان کے ہیں۔ اللہ اپنے بندوں کا امتحان اِس لئے
لیا کرتا ہے کہ انھیں جزا اور ثواب کا استحقاق حاصل ہو جائے اِس کے ساتھ ہی اُن کی شانِ ایمان و
یقین بھی دوسروں کے سامنے ظاہر و آشکار ہو سکے اور اُن کے لئے مثال اور نمونہ بن سکے۔ یہ امتحان
اس غرض سے نہیں ہوا کرتا کہ معاذ اللہ اُن کی شانِ ایمان سے خدا بے خبر ہے اور اس امتحان کے ذریعہ
سے اُس کو علم حاصل ہوگا۔ بلاشبہ وہ علام الغیوب ہے، اُس کی ذات کے سامنے ہر چیز عیاں اور ظاہر
ہے۔ وہ اس کا محتاج نہیں کہ کسی کا امتحان لے کر اُس کی حالت معلوم کرے بلکہ وہ ہر مخلوق کی ہر حالت
سے ہر وقت باخبر ہے۔ "کلمات" "کلمۃ" کی جمع ہے جس کے اصلی معنی اُس لفظ کے ہیں جو با مقصد و بامعنی
ہو۔ قرآن حکیم میں ان لفظوں کو بار بار بولا گیا ہے اور جا بجا الگ الگ معنی مراد لئے گئے ہیں۔ بیان کردہ
آیات میں کلمات کی تفسیر سے متعلق علماء نے بہت سے قول بیان کئے ہیں جن کا حاصل یہ ہے کہ یہ اللہ
کے چند خاص احکام تھے جن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا تھا۔ اِن ہی احکام اور ان ہی
باتوں میں سے قربانیِ فرزند کا حکم بھی تھا جس کا اظہار حضرت ابراہیمؑ کے خواب میں کیا گیا۔ آپ حضرت
نوح علیہ السلام کی گیارھویں پشت میں تھے۔ آپ کا زمانہ تقریباً دو ہزار ایک سو ساٹھ برس قبل حضرت
مسیحؑ ہے۔ علامہ مسعودی کے نزدیک آپ کی عمر مبارک ۱۹۵ سال کی ہوئی اور بعض نے ۱۷۵ سال لکھے
ہیں۔ آپ نے اپنے عہد کے عظیم ترین جبار بادشاہ نمرود کے اقتدار کو مٹا کر بنی نوع انسان کے دلوں میں

امت مسلمہ میں سے جو یہاں آباد ہو اُس کی طرف ایک ایسا رسول بھیج جو اُس کو تیری آیتیں پڑھ کر سُنائے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور اُس کے نفوس کو پاک کرے۔ اللہ نے یہ مبارک دعا بھی قبول فرمالی اور حضور سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعائے ابراہیمی کی قبولیت بن کر قیامت تک باقی رہنے والی شریعت لے کر دنیا میں تشریف لائے یہ فرماتے ہوئے کہ میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دعا، حضرت عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی والدہ حضرت آمنہ کا خواب ہوں۔

(مدہش) يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا ٱسْتَعِينُوا بِٱلصَّبْرِ وَٱلصَّلَوٰةِ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ مَعَ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝ وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ أَمْوَٰتٌۢ ۚ بَلْ أَحْيَآءٌ وَلَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَىْءٍ مِّنَ ٱلْخَوْفِ وَٱلْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ ٱلْأَمْوَٰلِ وَٱلْأَنفُسِ وَٱلثَّمَرَٰتِ ۗ وَبَشِّرِ ٱلصَّٰبِرِينَ ۝ ٱلَّذِينَ إِذَآ أَصَٰبَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوٓا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّآ إِلَيْهِ رَٰجِعُونَ ۝ أُولَٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَٰتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰٓئِكَ هُمُ ٱلْمُهْتَدُونَ ۝

پ ۲ رکوع ۳ کی ابتدائی ۵ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

اے ایمان والو صبر اور نماز سے مدد چاہو بیشک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں اُنھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں البتہ تم شعور نہیں رکھتے اور ہم ضرور تمہاری آزمائش کریں گے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال اور جان اور پھلوں کے نقصان سے اور (اے رسولؐ) ایسے صبر کرنے والوں کو خوشخبری سُنا دو کہ جب اُن پر کوئی مصیبت آپڑتی ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور بیشک ہم اُسی کی طرف پلٹ کر جانے والے ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت (بھی) اور یہی لوگ ہدایت پانے والے ہیں۔

تشریح وتفسیر: "صبر" کے لفظی معنی ہیں کسی پریشانی اور مصیبت و تکلیف میں اپنے کو قابو میں رکھنا لیکن اسلامی اصطلاح میں "صبر" کی تعریف اس سے زیادہ وسیع اور جامع ہے یعنی "حبس النفس علیٰ مایقتضیہ العقل والشرع" نفس کو اُن باتوں کا پابند رکھنا جو عقل و شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہوں اِس لئے وہ تمام بندشیں اور پابندیاں جن سے یہ مقصد حاصل ہوتا ہو وہ

سب صبر کی تعریف میں شامل ہوں گی چاہے جن باتوں سے اِن پابندیوں کا تعلق ہو وہ عیش اور لذت سے ربط رکھتی ہوں یا رنج و مصیبت سے۔ دوسرے لفظوں میں۔ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں اور پابندیوں کے اندر رہنا اور اُن سے تجاوز نہ کرنا ہی "صبر" ہے۔ خواہ یہ بات زندگی کے کسی شعبہ ہی سے کیوں نہ تعلق رکھتی ہو۔ یہاں ہمیں یہ چیز نہ بھولنا چاہیے کہ عقل سلیم کے تمام تقاضے وہی ہیں جو شریعت کے ہیں جبکہ عقل پورے طور پر حقائق سے آگاہ بھی ہو جائے اس لئے عقل اور شریعت کے احکام اور ہدایات الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ عقل بھی وہی کہے گی جو شریعت بتاتی ہے اگر اُسے اصلیت اور حقیقت سے پوری واقفیت حاصل ہو جائے۔ تو اب نتیجہ میں صرف یہی بات رہ جاتی ہے کہ جو نظام زندگی خدا نے انسان کے لئے مقرر کر دیا ہے اُسی کا پابند رہنا "صبر" ہے۔ اور اس نظام زندگی اور ان الٰہی حدود کی تفصیل وہی ہے جو ہمیں کتاب اللہ اور سیرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضورؐ کے ارشاداتِ گرامی سے حاصل ہوئی ہے۔ رہی عقل انسانی تو اگر اُس کو اپنے پورے وسائل حاصل ہو سکیں اور سارے موانع اُس کے سامنے سے ہٹ جائیں تو وہ بھی وہی کہے گی جو شریعت اور نبوت کہتی ہے اور جہاں تک خود انسان کی نفسانی خواہشات کا تعلق ہے، اُن کی اس سلسلہ میں کوئی بھی اہمیت اور وقعت نہیں ہے اور ہمیں ہر حال اور ہر بات میں پیروی اور پابندی کرنا ہے صرف اُن حدوں اور بندشوں کی جو ہمارے خالق عظیم و حکیم نے ہمارے لئے معین کر دی ہیں چاہے وہ ہماری خواہشات کے مطابق ہو جائیں یا اُن کے خلاف ثابت ہوں۔ ماہ رمضان کو "صبر کا مہینہ" اور خود روزہ کو بھی "صبر" اسی بنا پر کہا جاتا ہے کہ اِس میں حدودِ شریعت کی پابندی کا وہ مفہوم پایا جاتا ہے جس کا ابھی ذکر کیا گیا۔ امیر المومنین حضرت علیؑ نے "صبر" کے تذکرہ میں فرمایا ہے: "الصبر صبران صبرٌ علی ما تکرہ وصبرٌ عما تحب" یعنی صبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ صبر ہے جو اُن چیزوں پر کرتے ہو جو تمہارے لئے تکلیف اور رنج کا باعث ہوتی ہیں اور اُنھیں تم پسند نہیں کرتے اور دوسرا صبر اُن باتوں کے مقابلہ میں ہوتا ہے جنہیں تم دل سے چاہتے ہو مگر عقل و شرع کی پابندیوں کی وجہ سے اُن سے باز رہتے ہو۔ اِن ہی دو قسموں میں صبر کا ہر شعبہ اور ہر رخ آجاتا ہے۔ صبر کے ذکر کے بعد "نماز" کا ذکر ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ ان دونوں چیزوں یعنی صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو کیونکہ انفرادی اور اجتماعی نجات و فلاح کا راز صرف ان ہی دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ "صبر" ایک سلبی حالت کا نام ہے اور "صلوٰۃ" اس کے مقابلہ میں ایک ایجابی عمل ہے اور یہ دونوں لفظ اُن تمام حالتوں اور اعمال کے لئے ایک عنوان کی حیثیت بھی رکھتے ہیں جو اِن کے وسیع مفہوم کے اندر شامل ہوں۔ صبر کی بحث میں ہمیں یہ بھی یاد

رکھنا چاہئے کہ جن باتوں کو ہماری فطرت چاہتی ہے یعنی وہ جو ہمارے پیدائشی تقاضے ہیں اور شریعت نے بھی اُن پر کسی وجہ سے کوئی پابندی نہیں لگائی ہے۔ اُن پر عمل کرنا قطعاً منافی صبر نہ ہوگا اور نہ وہ چیزیں بے صبری میں شمار ہوں گی۔ اِن آیات کریمہ میں ایک اور لفظ آیا ہے "لَنَبْلُوَنَّكُمْ" ہم تمہاری ضرور آزمائش کریں گے۔ اِس لفظ کا اصلی مادہ "بَلْوٌ" ہے جس کے معنے امتحان لینے اور جانچنے یا آزمائش کرنے کے آئے ہیں۔ "بَلَاءٌ" کا لفظ بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے اور خود تکلیف اور مصیبت اور غم کے معنی میں بھی مگر یہ ضروری نہیں ہے کہ یہ آزمائش اور یہ امتحان صرف مصیبتوں اور رنج و غم ہی کے ذریعہ سے ہو بلکہ یہ نعمتوں اور عیش و آرام کے ذریعہ سے بھی ہوتا ہے۔ اِس مقام پر بھی ہمیں اِس رُخ کو نظر انداز نہ کرنا چاہئے کہ اللہ اپنے بندوں کا امتحان اِس وجہ سے نہیں لیا کرتا کہ اُسے اُن کی قابلیت اور صلاحیت کا (العیاذ باللہ) علم نہیں ہے اور اِس امتحان کے ذریعہ سے اُس کو علم حاصل ہو جائے گا۔ بلا شبہ وہ علّام الغیوب ہے اور اُس کے علم سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اِس امتحان و ابتلا کی بظاہر دو وجہیں ہیں ایک تو یہ کہ محض قابلیت سے اجر نہیں مل سکتا جب تک اُس قابلیت کا عملی طور پر ظہور نہ ہو جائے اور یہ ظہور اُسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان مقامِ امتحان میں آجائے اور دوسری بات یہ ہے کہ جب تک کوئی شخص مقامِ امتحان و آزمائش میں آکر کامیابی حاصل نہ کرے گا اور اپنی قابلیت اور صلاحیت کا عملی ثبوت نہ دے گا وہ دوسروں کے لئے قوتِ عمل اور ثباتِ قدم کا نمونہ اور مثال نہیں بن سکتا۔ غرض پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اپنے اللہ سے کبھی غافل نہ رہے، اُس کا شکر ادا کرتا رہے اور ناشکری سے بچے اور اب یہ سمجھایا گیا ہے کہ ہمیشہ ہمیں گناہ اور برائیوں سے بچنا چاہئے اور پابندی سے عبادت کرنا چاہئے جس کا مرکزی عمل نماز ہے۔ نماز کی پابندی ہر مسلمان کے لئے بے حد ضروری ہے۔ اس کے بعد یہ بھی بتا دیا گیا کہ جو لوگ راہِ خدا میں قتل ہو جائیں اُنھیں عالم برزخ میں ایک خاص زندگی عطا کی جاتی ہے اور ایسے پاک لوگوں کو ہرگز مردہ نہ سمجھنا چاہئے۔ یوں تو ہر مومن کو اسی قسم کی حیات ملتی ہے مگر شہیدوں کا مرتبہ چونکہ خصوصیت رکھتا ہے اس لئے اُن کا یہاں خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے بشرطیکہ وہ شہادت صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو اور اس میں ایسے اغراض شامل نہ ہوں جو دینی روح کے منافی ہوں اور آخر میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اللہ کی بارگاہ میں خصوصی منزلتیں تو بغیر امتحان اور آزمائش کے حاصل نہیں ہوتیں اور سچے مومن کی شان یہی ہے کہ وہ ہر آزمائش میں ثابت قدم رہے اور اللہ کے راستے سے قدم نہ ہٹائے۔ ایسے ہی لوگ اللہ کی رحمت و کرم کے مستحق ہوتے ہیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۙ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ (درس ۲۷)

پارہ ۲ رکوع ۳ کی درمیانی ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ

بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جو شخص خانۂ کعبہ کا حج یا عمرہ کرے اُس پر اِن دونوں کے درمیان آمد و رفت کرنے میں کچھ گناہ نہیں اور جو شخص خوشی سے کوئی نیک کام کرے تو اللہ بڑا قدردان بڑا علم رکھنے والا ہے۔ بیشک جو لوگ اُس چیز کو چھپاتے ہیں جسے ہم نے کھلی ہوئی نشانیوں اور ہدایت میں سے نازل کیا ہے اِس کے بعد کہ ہم اُسے لوگوں کے لئے کتاب میں صاف صاف بیان کر چکے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور اُن پر لعنت کرنے والے (بھی) لعنت کرتے ہیں مگر جو لوگ توبہ کریں اور درست ہو جائیں اور حق بات کو ظاہر کر دیں تو یہی لوگ ہیں جن کی توبہ کو میں قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا رحمت والا ہوں۔

تشریح و تفسیر: صفا اور مروہ سے مراد مکہ کی دو مشہور پہاڑیاں ہیں جن کے اب کچھ نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ "صفا" کے لفظی معنی صاف پتھر اور چٹان کے ہیں اور "مروہ" کے معنی سفید نرم پتھر کے ہیں۔ صحیح روایات میں اِس کا ذکر آیا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت ہاجرہؓ کو حضرت اسمٰعیلؑ کے ساتھ کعبہ کے قریب بحکم خدا تنہا چھوڑ دیا تھا اور حضرت ہاجرہ اپنے کمسن بچہ کے لئے پانی کی تلاش میں بےچین تھیں تو اِن ہی دونوں پہاڑیوں پر بار بار جا کر دور دور تک دیکھتی تھیں کہ شاید کوئی قافلہ نظر آجائے تو بچہ کے لئے پانی طلب کریں اور اِس کی پیاس بجھا دیں۔ حضرت ہاجرہؓ کی اِسی مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہیں وہ سعی ہے جو مناسکِ حج میں کوہِ صفا اور مروہ کے درمیان کی جاتی ہے۔ "شعائر"۔ "شَعِیرۃ" کی جمع ہے اِس کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ "شعائراللہ" کے معنی ہیں اللہ کے دین کی علامتیں اور نشانیاں اور حج کے ذکر میں اس سے مراد عباداتِ حج کی علامتیں ہوتی ہیں۔ "حج" اسلامی عبادتوں کا مشہور چوتھا رکن ہے۔ یہ ہر بالغ مسلمان پر ساری عمر میں ایک مرتبہ فرض ہے جبکہ اُس شخص کے لئے وجوبِ حج کی تمام شرطیں بھی پائی جائیں جیسے صحت و استطاعت اور راستہ کا امن وغیرہ۔ "اِعْتَمَرَ" کا مصدر "اعتمار" ہے۔ اعتمار

اور "عُمرہ" کے لفظی معنی زیارت کرنے کے آتے ہیں جس طرح "حج" کے لفظی معنی قصد اور ارادہ کے ہیں مگر شریعت کی اصطلاح میں حج اور عمرہ مخصوص عبادتوں کا نام ہے۔ عمرہ کو حج اصغر بھی کہتے ہیں کیونکہ اِس میں حج کی طرح کثیر عبادتیں نہیں ہوتیں۔ صرف احرام، طواف کعبہ، اور صفا و مروہ کے درمیان سعی کی جاتی ہے پھر سر کے بال اُتروا کر عمرہ تمام کر دیا جاتا ہے۔ اِس میں نہ وقوفِ عَرَفات ہے، نہ قیام مُزدلفہ اور نہ مِنیٰ کی عبادتیں۔ حج کا زمانہ بھی معین و مقرر ہے مگر عمرہ سال بھر میں کسی وقت بھی کیا جا سکتا ہے، اس کا زمانہ معین نہیں ہے۔ بعض علمارِ اسلام کے نزدیک عمرہ تمام زندگی میں ایک بار سنّت مؤکدہ ہے اور بعض اکابرِ اسلام کے نزدیک حج کی طرح وہ بھی عمر میں ایک بار فرض ہے۔ ایک مرتبہ سے زیادہ سب کے نزدیک بلا اختلاف مستحب ہے بشرطیکہ نذر یا عہد شرعی کی وجہ سے اِس کا وجوب نہ پیدا ہو جائے۔ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ صفا اور مروہ پہاڑیاں شعائرُاللہ میں داخل ہیں اِن کے درمیان سعی کرنا مناسکِ حج کا جزو ہے۔ بات یہ تھی کہ جاہلیت کے دور میں مشرکوں نے اِن پہاڑیوں پر بُت رکھدیئے تھے اور اُن کو دوڑ دوڑ کر چھُوا کرتے تھے اِس لئے جب وہاں سے بتوں کے نشانات مٹا دئے گئے تو اس وقت بھی مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ ایسا نہ ہو کہ اِن کے درمیان سعی کرنا شعائرِ شرک میں داخل ہو جائے۔ یہاں آیت میں اِسی بات کی طرف اشارہ ہے کہ اب جبکہ بت پرستی اور شرک کے آثار مٹ چکے ہیں اِن کے درمیان سعی کرنا عین عبادت ہے کیونکہ یہ شرک کی نہیں بلکہ اصل میں توحید کی یادگاریں اور اللہ کے برگزیدہ بندوں کی عبادت کے مقامات ہیں جن کی یاد قائم رکھنا ملّتِ اسلامیہ کے لئے اور فرزندانِ توحید کے لئے ضروری ہے اور یہ سعی اِس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ حق نے ان مقامات پر باطل کو اور ایمان و اسلام نے کفر و شرک کو شکست دی ہے۔

"یَطَّوَّفَ" "طَوْف" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کے گرد گھومنا مگر یہاں دو چیزوں کے درمیان آنا جانا مراد ہے۔ یہ آنا اور جانا صفا اور مروہ کے درمیان سات مرتبہ ہوتا ہے۔ اور اس فاصلہ کے کچھ حصہ میں دوڑ کر بھی چلنا ہوتا ہے اسی لئے اِس کا نام سعی رکھا گیا ہے۔ بیان کردہ آیتوں سے قبل صبر کا ذکر کیا گیا تھا اب حج کی عبادتوں کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اِن دونوں باتوں میں بڑی گہری مناسبت ہے، کیونکہ حج کی تمام عبادتیں مفہومِ صبر کا بہترین اور کامل ترین مظہر ہیں جس وقت سے حاجی احرام باندھتے ہیں اُن پر شدید پابندیاں لگا دی جاتی ہیں اور مناسکِ حج میں ہر قدم اُن کے لئے صبر کی ایک کڑی منزل ہے۔ اسی مقام پر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فرض کام کا انجام دینا تو بہرحال ضروری ہے لیکن اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے اللہ کی راہ میں ایسے نیک کام کرے جو اُس پر فرض یا واجب نہ ہوں تو اُس کا بھی ثواب اُسے ضرور عطا ہوگا اور اُس کے استحقاق سے زیادہ مِلے گا۔ "تَطَوَّعَ" کے معنی یہی ہیں کہ اپنی خوشی سے

ایسا کام کرنا جو فرض نہ ہو۔ پھر یہاں اللہ کی ذات کے لئے "شاکر" کا لفظ بولا گیا ہے۔ اِس کے معنی ہیں کسی کا شکر ادا کرنے والا جبکہ "مشکور" اُس بات کو یا اُس شخص کو کہتے ہیں جس کا شکر ادا کیا جائے۔ اِس جگہ یہ کہنا شاید بے جا نہ ہوگا کہ بہت سے لوگ "مشکور" کا لفظ "شاکر" یا "متشکر" کی جگہ پر بول دیتے ہیں جو قطعی طور پر اِس کا غلط استعمال ہے۔ غرض لفظ "شاکر" جب کبھی اللہ کی ذات کے لئے بولا جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بندوں کی تھوڑی سی فرمانبرداری اور اطاعت پر اُنھیں اُن کے حق سے بہت زیادہ اجر عطا فرماتا ہے۔ اِس کے بعد اہلِ کتاب یعنی یہود و نصاریٰ کا تذکرہ ہے کہ ہم نے توراۃ و انجیل میں رسالتِ محمدیؐ کے جو دلائل اور نشانیاں صاف طریقہ پر بیان کر دی تھیں اُن تمام باتوں کو پوری طرح جانتے ہوئے اُن لوگوں نے حق باتوں پر پردہ ڈالا اور اُنھیں چھپا دینے کی بھرپور اور ناپاک کوشش کی اِس لئے یہ لوگ اللہ کی لعنت کے مستحق ہو گئے اور اللہ کے ساتھ ساری کائنات بھی اِس حق پوشی پر اُن کے لئے لعنت کرتی ہے۔ اِس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ حق کو خوب پہچانتے ہوئے اُس کو چھپانا اسلام کی تعلیم کے خلاف اور قابلِ لعنت ہوتا ہے اور آخر میں اپنی رحمتِ کاملہ کی طرف بھی اشارہ فرمایا گیا ہے کہ اِس جرمِ عظیم کے باوجود اگر کوئی سچے دل سے توبہ کر لے اور اپنے اِس گناہ پر اظہارِ ندامت کرے اور اُن باتوں کو جو آسمانی کتابوں میں درج ہیں ظاہر کر دے تو اللہ اُس کی توبہ کو قبول کرے گا اور اپنے دامنِ رحمت میں اُس توبہ کرنے والے کو جگہ عنایت فرمائے گا۔

(درس ۲۰) اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ مَاتُوۡا وَ ہُمۡ کُفَّارٌ اُولٰٓئِکَ عَلَیۡہِمۡ لَعۡنَۃُ اللّٰہِ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ وَ النَّاسِ اَجۡمَعِیۡنَ ۝ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنۡہُمُ الۡعَذَابُ وَ لَا ہُمۡ یُنۡظَرُوۡنَ ۝ وَ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ الرَّحۡمٰنُ الرَّحِیۡمُ ۝ اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ وَ اخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَ النَّہَارِ وَ الۡفُلۡکِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا وَ بَثَّ فِیۡہَا مِنۡ کُلِّ دَآبَّۃٍ ۪ وَّ تَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَ السَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَ الۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ۝

پ ۲ رکوع ۳ کی آخری ۳ آیات اور رکوع ۴ کی ابتدائی ایک آیت۔ سورۃ البقرۃ۔

بیشک جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں مر گئے یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ کی اور فرشتوں

کی اور تمام لوگوں کی لعنت ہے، وہ ہمیشہ اسی میں پڑے رہنے والے ہیں نہ تو اُن پر سے عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُنھیں مہلت دی جائے گی۔ اور تمہارا خدا بس ایک خدا ہے اُس کے سوا کوئی خدا نہیں جو بڑا مہربان بڑا رحم والا ہے۔ بیشک آسمانوں اور زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے بدلتے رہنے ہیں اور کشتیوں میں جو لوگوں کے نفع کی چیزیں لیکر دریا میں چلتی ہیں اور پانی میں جو اللہ نے آسمان سے نازل کیا پھر اُس سے زمین کو اُس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کیا اور اُس میں ہر طرح کے حیوانات پھیلا دیئے اور ہواؤں کے بدلنے میں اور بادل میں جو آسمان اور زمین کے درمیان اس کے حکم کا تابع ہے۔ (ان سب چیزوں میں) یقیناً اُن لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو عقل رکھتے ہیں۔

تشریح وتفسیر: "اختلاف" اتفاق کی ضد ہے۔ اس کے دوسرے معنی ایک کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں۔ یہاں دونوں ہی باتیں مراد ہیں یعنی دن اور رات آپس میں ایک دوسرے سے حالات اور صفات میں الگ الگ ہیں اور ایک دوسرے کے بعد میں آتے ہیں۔ لفظ "اختلاف" ان دونوں معنوں میں قرآن حکیم میں جا بجا بولا گیا ہے۔ اور لیل و نہار میں یہ دونوں ہی باتیں پائی جاتی ہیں۔ "فُلْكٌ" کے معنی کشتی کے ہیں یہ واحد اور جمع دونوں ہی کے لئے بولا جاتا ہے اور خود قرآن مجید میں بھی اسے دونوں طرح بولا گیا ہے۔ اس لفظ کے عموم اور وسعت میں ہر قسم کی کشتی شامل ہے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی ہو، بادبانی کشتیاں ہوں یا مشین سے چلنے والے بڑے بڑے جہاز ہوں۔ زمین کی موت سے مراد اس کا بے جان اور خشک ہو جانا اور اس کی زندگی یہ ہے کہ وہ سرسبز و شاداب ہو جائے۔ "دَبِيبٌ" اور "دَبٌّ" آہستہ چلنے کو کہتے ہیں اسی سے "دَابَّةٌ" کا لفظ بنا ہے جس سے مراد ہر قسم کا چلنے والا ہے چاہے وہ صرف دو پیروں سے چلتا ہو یا چار ہاتھ پیر سے یا پیٹ کے بھل قرآن میں سورہ نور کے اندر اس کی تشریح کر دی گئی ہے۔ "بَثٌّ" کے معنی ہیں کسی چیز کو منتشر کرنا یا پھیلا دینا "تَصْرِيف" کا اصلی مادہ "صَرْف" ہے، کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنے یا تبدیل کرنے کے لئے بولتے ہیں۔ "تصریف الرِّيَاح" سے مراد ہے ہواؤں کے دھارے کو ایک طرف سے دوسری طرف پھیر دینا۔ "سَحَاب" سے مراد بادل ہے۔ "بَحْر" اصل میں سمندر کے لئے بولتے ہیں مگر اس لفظ کا اطلاق بہت بڑی ندیوں پر بھی ہوتا ہے۔ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ کفر کی حالت میں مر جائیں اور اپنے کفر سے توبہ نہ کریں اُن پر اللہ اور فرشتے لعنت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ تمام لوگ بھی۔ یہاں "النَّاس" سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک صرف صاحبانِ ایمان ہیں کیونکہ صحیح معنی میں انسان وہی لوگ ہیں جو اپنے اللہ کو پہچانتے ہوں اور اُس پر ایمان رکھتے ہوں۔ اس سے قبل کی آیت

میں بتایا جا چکا ہے کہ اگر کفر کے بعد کوئی توبہ کر لے تو وہ لعنت خداوندی سے بچ سکتا ہے اور اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ توبہ نہ کرنے کی صورت میں ایسا شخص جو کفر ہی کی حالت میں مرجائے وہ دائمی لعنت کا سزاوار ہوگا جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہے گا "خالدین فیھا" میں "ھا" کی ضمیر لعنت کی طرف ہے یا جہنم کی طرف پھرتی ہے۔ دونوں صورتوں میں حاصل ایک ہی ہے یعنی ایسا شخص دائمی عذاب میں گرفتار رہیگا۔ اس عذاب میں نہ تو تخفیف ہوگی اور نہ اُس شخص کو مہلت دی جائے گی۔ تخفیف اور کمی کا تعلق عذاب میں داخلہ کے بعد سے ہے اور مہلت نہ ملنے کا تعلق داخلۂ عذاب سے قبل کے حالات سے ہے۔ اس کے بعد پھر تمام بنی نوع انسان کی طرف خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے کہ تم سب کا خدا صرف ایک ہے اور وہی رحمان و رحیم ہے۔ اس اعلان سے خدائی میں شرک کے ہر پہلو کو باطل کر دیا گیا اور توحید کے مسلک کی پوری وضاحت ہوگئی اور یہ بھی بتا دیا گیا کہ خدائے واحد و یکتا کے علاوہ چھوٹے چھوٹے خداؤں اور دیوتاؤں کا بھی کوئی وجود ممکن نہیں ہو سکتا۔ پھر اس پر دلیل یہ دی گئی ہے کہ زمین و آسمان کی خلقت، دن اور رات کا اُلٹ پھیر، کشتیوں اور جہازوں کا سمندروں اور دریاؤں میں اِدھر سے اُدھر جانا اور انسانوں کے لئے نفع بخش اشیاء کا اِن کے ذریعے سے منتقل ہونا، بلندیوں سے بارش کا نزول پھر زمین سے نباتات کا اُگنا، حیوانات کی تخلیق، ہواؤں کا بار بار اپنے دھارے بدلنا، بادلوں کی تسخیر غرض یہ تمام چیزیں وہ ہیں جو بغیر کسی حقیقی موثر، حقیقی مدبر اور بلا کسی خالقِ حکیم اور قادرِ مطلق ذات کے کسی طرح وجود میں نہیں آسکتیں اور یقیناً اُس کا واحد ہونا بھی ضروری ہے اس لئے کہ تمام مظاہر فطرت کی یک رنگی، باقاعدگی، نظم و ترتیب اور ان سب کا باہمی تعاون اور اشتراکِ عمل ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا اگر ان کا پیدا کرنے والا اور ان کا پروردگار ایک نہ ہوتا ساتھ ہی یہاں اُن تمام چیزوں کے خصوصیت کے ساتھ نام بھی لئے گئے ہیں جن کی لوگ کوشش کیا کرتے تھے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ چیزیں خود مؤثر اور صاحبِ اختیار ہرگز نہیں ہیں بلکہ یہ سب کی سب مخلوق ہیں اور اپنے خالق کے احکام کی تابع ہیں نہ آکاش دیوتا ہے اور نہ دھرتی ماتا، نہ دن اور رات جاندار اور قابل پرستش ہیں نہ سورج اور چاند یا دوسرے ستارے پوجا کے لائق ہیں، نہ زمین پر پھیلے ہوئے جانور، گائے، بیل اور بندر وغیرہ اس قابل ہیں کہ اُن کے سامنے سر عبودیت خم کیا جائے۔ یہ سب مخلوق ہیں اور کسی یکتا مصوّر اور خالقِ عظیم کی قدرتِ کاملہ کا نقشِ تخلیق ہیں اور وہی وحدہٗ لاشریک اللہ ان سب کا رب اور پالنے والا ہے۔ کائنات کی ایک ایک چیز ہر صاحبِ عقلِ سلیم کو فکر و نظر کی دعوت دے رہی ہے کہ وہ ان آثارِ تخلیق سے توحید و ربوبیت کے اصلی راز کا پتہ لگائے اور کثرت کی رنگینیوں اور دلفریبیوں میں محو ہو کر

وحدت کی حقیقت سے بے خبر نہ ہو جائے اسی لئے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اس پوری کائنات کی ہر چیز میں دلیلیں اور نشانیاں موجود ہیں مگر صرف اُن کے لئے جو عقل رکھتے ہیں اور اپنی عقل سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں۔

(۲۹) وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَرَاَوُا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ۭ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ۭ وَمَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ۝

پارہ ۲ رکوع ۴ کی آخری ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ

اور کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو دوسروں کو اللہ کا شریک بنا کر اُن سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی اللہ سے (رکھنا چاہئے) اور جو ایماندار ہیں وہ اللہ کی محبت میں بہت شدید ہوتے ہیں۔ اور کاش ظالم لوگ اِس بات کو دنیا ہی میں جان لیتے جسے وہ آخرت میں عذاب کو دیکھ کر سمجھیں گے کہ تمام طاقت خدا ہی کی ہے اور یہ کہ خدا کا عذاب بہت ہی سخت ہے (وہ کیسا وقت ہوگا) جب وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی تھی اُن لوگوں سے بیزار ہو جائیں گے جنھوں نے اُن کی پیروی کی تھی اور عذاب کو خود دیکھ لیں گے اور اُن کے باہمی تعلقات ٹوٹ جائیں گے اور پیروی کرنے والے کہنے لگیں گے کاش ہمیں ایک مرتبہ پھر پلٹنا مل جاتا تو ہم بھی ان سے اسی طرح بیزاری کرتے جیسے یہ ہم سے الگ ہو گئے۔ بس اسی طرح اللہ اُن کے اعمال کو حسرت بنا کر دکھائے گا اور وہ دوزخ سے کبھی نہ نکلنے پائیں گے۔

تفسیر و تشریح: "اَنْدَاد" (نِدّ) کی جمع ہے اس کے معنی مثل اور مشابہ کے بھی ہیں اور ضد مقابل اور مخالف کے بھی۔ یعنی یہ لفظ کبھی مثل اور کبھی ضد دونوں ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس لفظ کی وسعت کے اندر ہر قسم کا شرک آجاتا ہے خواہ وہ مجوسیوں کے عقیدہ کی طرح کا ہو جو اہرمن اور یزدان کو خدائی میں ایک دوسرے کا ضد مقابل جانتے ہیں یا دوسرے مشرکوں کے اعتقاد کی طرح جو دیوتاؤں کو چھوٹے خدا کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ عام طور پر یہاں مفسروں نے "انداد" کے لفظ سے بتوں اور دیوتاؤں کو لیا ہے جن کی مشرک قومیں پرستش کیا کرتی تھیں۔ یہی معنی قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر اس لفظ سے

لئے گئے ہیں اور بعض کے نزدیک اِس سے مراد وہ انسان ہیں جو کفر و ضلالت میں گمراہوں اور مشرکوں کی قیادت کرتے ہیں اور درحقیقت حاصل سب کا ایک ہی ہے یعنی وہ تمام چیزیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں جو کسی نوعیت اور کسی حیثیت سے بھی اقتدار خداوندی کے منافی اور اس کی توحید مطلق سے انکار کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہوں خواہ وہ بتوں کی طرح بے جان ہوں یا انسان و حیوان کی طرح ذی حیات ہوں۔ غرض جو چیز بھی انسان کو اُس کے حقیقی خالق اور پروردگار سے کسی اور کی طرف ہٹاتی ہو وہ "انداد" کے مفہوم میں داخل ہو گی۔

"وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ" کے جملہ میں "تقطّع" کے معنی ہیں پارہ پارہ ہونا اور ٹوٹ پھوٹ جانا اور "سبب" کئی معنی میں بولا جاتا ہے، رسّی، سیڑھی، ذریعہ اور وسیلہ، راستہ، محبت، رشتہ داری، روابط اور تعلقات یہاں یہی آخری معنی مراد ہیں۔ "كَرَّةً" کے معنی دوسری بار کے ہیں یعنی پیروی کرنے والے قیامت میں حسرت سے کہیں گے کہ ہمیں کاش دنیا کی طرف دوبارہ پلٹنا نصیب ہو جاتا۔ "حَسْرَةً" مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ اسم ہونے کی حالت میں اس کی جمع "حَسَرَات" ہو گی معنی ہیں ارمان، غم و افسوس اور پشیمانی اور ندامت۔ بیان کردہ آیت میں جہاں یہ لفظ آیا ہے وہاں مراد یہ ہے کہ جس طرح قیامت میں کفار و مشرکین کو اِس کی حسرت ہو گی کہ وہ ایک مرتبہ پھر دنیا کی طرف پلٹا دئے جائیں مگر اُن کی یہ حسرت پوری نہ ہو سکے گی اور مایوسی، ندامت اور غم و افسوس کے سوا اُنھیں کچھ بھی حاصل نہ ہو گا اسی طرح ان کے تمام دنیاوی اعمال اور سب کیا دھرا حسرت و ندامت اور رنج و افسوس ہی بن کر رہ جائیں گے اور آخرت میں عذاب جہنم کے سوا اُنھیں کچھ بھی نہ ملے گا۔

ان آیات کریمہ میں پہلی آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ بہت لوگ ایسے بھی ہیں جو خدا کا شریک دوسروں کو بناتے ہیں اور اُن سے اُسی طرح لگاؤ اور محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اُنھیں خدا سے کرنا چاہئے مگر جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ خدا سے محبت رکھنے میں بہت زیادہ سخت و شدید ہیں۔ اس آیت سے دو بنیادی باتوں کی ہمیں تعلیم دی گئی ہے ایک تو یہ کہ غیر اللہ سے محبت کرنا ممنوع نہیں ہے مگر اُن ہی حدود میں جو شرعی اور عقلی حیثیت سے جائز ہوں اور اس محبت میں ربوبیت کا کوئی ہلکا سا بھی شائبہ نہ پایا جاتا ہو اور دوسری بات یہ کہ اسلام نے جس خدا پر عقیدہ رکھنے کی تعلیم دی ہے وہ کوئی دہشتناک اور ڈراونا خدا نہیں ہے جیسا کہ بعض غیر مسلم قوموں نے اسلام دشمنی کے جنون میں دنیا کو یہ کہہ کر گمراہ اور بدظن کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام کا خدا محض ایک دہشتناک اور بھیانک خدا ہے جس کے پاس عذاب و سزا اور جہنم کے شعلوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے ان اسلام دشمن قوموں کی علمی سازشوں اور مکاریوں کا پردہ چاک کر دیا ہے یہ بتا کر کہ انسان کا اصلی تعلق اپنے خالق اور معبود سے صرف اُنس و محبت ہی کی

بنیاد پر قائم ہے اور جو سچے مومن ہوتے ہیں وہ اپنے خدا سے محبت کرنے میں سب سے زیادہ سخت و شدید ہوتے ہیں یعنی جیسی محبت و الفت وہ اپنے خدا سے رکھتے ہیں کائنات میں کسی کے ساتھ بھی نہیں رکھتے۔ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ" کے جملہ کا اشارہ اسی حقیقت کی طرف ہے کہ اہلِ ایمان اپنے خدا کو اپنا دشمن نہیں جانتے بلکہ اُسے اپنا محبوب ترین اور شفیق ترین پروردگار سمجھتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہوا کہ اُن کی اپنے خدا سے محبت کائنات کی ہر محبت پر غالب اور حاکم ہوا کرتی ہے اور وہ جس شخص کو یا جس چیز کو بھی چاہتے ہیں صرف اس وجہ سے کہ اِس محبت سے اُنھیں اپنے حقیقی محبوب یعنی خدا کی رضامندی اور خوشنودی حاصل ہو جائے گی۔ عذاب اور سزا کا معاملہ تو صرف ضمنی حیثیت رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص برائی کا کام کرتا ہے وہ عدل و انصاف کے ہر قانون کی نظر میں سزا پانے کا مستحق ہو جاتا ہے مگر جہاں تک بندہ اور خدا کے رشتۂ محبت کا تعلق ہے یہ اسلام ہی ہے جس نے دنیا کو اِس حقیقت سے آگاہ کیا ہے کہ سچا مومن وہی ہوتا ہے جو خدا سے زیادہ کسی اور سے محبت نہیں کرتا اور جس سے بھی محبت کرتا ہے خدا ہی کے لئے اور اُسی کی وجہ سے کرتا ہے۔ اِسی بات کی طرف حدیث میں بھی ان لفظوں کے ساتھ اشارہ فرمایا گیا ہے کہ "لَا يُحِبُّهٗ اِلَّا لِلّٰهِ" مومن جس کسی سے بھی محبت کرتا ہے صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے کیونکہ اُس کا اصلی محبوب تو خود وہی ہے۔ اِس محبت کا عقلی اور لازمی نتیجہ صرف یہی نکلتا ہے کہ جب مومن کے نزدیک خدا سے بڑھ کر کوئی محبوب نہیں ہو سکتا تو پھر اُس کی اطاعت کے مقابلہ میں اُس کے غیر کی اطاعت کا کوئی جواز بھی اُس کے لئے باقی نہیں رہ سکتا۔ اور اُس کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر دینا اُس کے لئے ہر بات سے زیادہ ضروری ہوگا ورنہ محبوب اور محبت کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ سکیں گے۔ یہی وہ رشتۂ محبت و اطاعتِ خداوندی ہے جو دنیا اور آخرت میں فلاح و نجات کا سبب ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ اِس کے علاوہ غیر اللہ سے جس قدر بھی رشتے ہوں گے وہ سب بیکار اور ٹوٹ جانے والے ہیں۔ صرف رشتۂ محبت الٰہی میں بخشش اور نجات ہے اور اُسے چھوڑ کر غیر اللہ سے ہر تعلق اور وابستگی میں حسرت و یاس اور ناکامی و محرومی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(درس) ۳۰. يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّلَا تَتَّبِعُوا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْۗءِ وَالْفَحْشَاۗءِ وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَاۗءَنَا ۭ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَاۗؤُھُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَـيْــــًٔـا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ○ وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَاۗءً وَّنِدَاۗءً ۭ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ○

پارہ ۲ رکوع ۵ کی ابتدائی ۴ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

اے لوگو کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال پاکیزہ۔ اور شیطان کے نقش قدم کی پیروی نہ کرو یقیناً وہ تمہارا کھلا ہوا دشمن ہے وہ تو تمھیں بس بُرائی اور بے حیائی ہی کا حکم دیتا ہے اور اس کا کہ تم اللہ پر وہ جھوٹ باتیں رگا دو جن کا تم علم نہیں رکھتے اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُتارا ہے اُس کی پیروی کرو تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ داداؤں کو پایا ہے اگرچہ اُن کے باپ دادا کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں اور جو لوگ کافر ہیں اُن کا حال تو اُس شخص جیسا ہے جو ایسے جانور کو پکارے جو کچھ بھی نہ سنتا ہو سوائے پکارنے اور چلّانے کے یہ لوگ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں تو وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔

تشریح و تفسیر: "حلال" غذاؤں سے مراد یہاں وہ غذائیں ہیں جو شریعت کی طرف سے ممنوع اور حرام نہ ہوں اور "طیّب" سے مراد وہ حلال غذائیں ہیں جو جائز اور صحیح و درست وسائل و ذرائع سے حاصل کی گئی ہوں یعنی وہ مثلاً چوری، غصب، رشوت اور دوسرے حرام ذریعوں سے حاصل نہ کی جائیں اور کچھ مفسر یہ کہتے ہیں کہ "حلال و طیّب" کے یہاں پر ایک ہی معنی ہیں اور تکرار کی غرض صرف تاکید ہے اور اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان ہمیشہ حرام چیزوں سے بچتا رہے۔ کیونکہ "حلال اور طیّب" انسان کے لئے وہی غذا ہوسکتی ہے جس کا کھانا اُس کے لئے ہر طرح درست اور جائز ہو۔ حاصل دونوں تفسیروں کا ایک ہی ہے یعنی اللہ کی جانب سے صرف اُن ہی غذاؤں کے کھانے کی اجازت ہے جنھیں اُس نے اپنے حکم کے ذریعے سے حرام نہ کردیا ہو اُس شخص کے لئے جو انھیں کھانے کا ارادہ رکھتا ہو۔ اسلام نے انسان کو اکل حرام سے بڑی شدت کے ساتھ روکا ہے اور درحقیقت یہی وہ زہر ہے جس سے انفرادی اور اجتماعی زندگیاں تباہی کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اگر غذا کے ناجائز

حرام اور غلط استعمال سے ایک طرف انسان کا اپنا جسم طرح طرح سے فساد اور بربادی کی نذر ہو جاتا ہے تو دوسری طرف یہی زہر قوموں اور معاشروں کو بھی تباہ کرتا ہے۔ انسانی زندگی کی بنیادی چیز۔ تو اس کی غذا ہی ہے اگر اُس میں کسی نوعیت سے بھی اعتدال باقی نہ رہا تو اس سے اُس زندگی کا متاثر ہونا لازمی ہے۔ اسلام کے نزدیک "اکل حلال" کی بڑی اہمیت ہے اور قرآن و حدیث میں بڑی شدت کے ساتھ اِس کی تاکید فرمائی گئی ہے۔ اِس سلسلہ کی حدیثوں میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اگر کسی کے شکم میں ذراسی بھی حرام غذا ہو گی تو اُس کی دعا کبھی قبول نہ ہو گی۔ قبولیتِ دعا کے لئے اہم ترین شرط "اکل حلال" ہے۔ "خُطْوَةٌ" اُس فاصلہ کو کہتے ہیں جو چلنے والے کے دو قدموں کے درمیان ہوتا ہے اس کی جمع "خطوات" آتی ہے۔ "خُطُوَاتِ شَیْطَان" کا اتباع نہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اُس کا مطلب یہ ہے کہ شیطانی باتوں پر عمل نہ کرو اور گمراہی کی راہ نہ اختیار کرو۔ اگرچہ یہاں پر یہ جملہ حلال و حرام غذاؤں کے تذکرہ کے ضمن میں فرمایا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت مسلمان کی پوری زندگی اِس کے اندر شامل ہے اور اُس کے لئے اللہ کا حکم یہی ہے کہ وہ کبھی کوئی ایسا کام نہ کرے جو شیطانی مقصد کو قوت دیتا ہو اور انسان کو حق کے راستہ سے دور کرتا ہو "سُوْء" اور "فحشاء" کے کئی معنی بیان کئے گئے ہیں جن میں سے ایک معنی یہ ہیں کہ "سُوْء" عام برائی کو کہتے ہیں اور "فَحْشَاء" اُس برائی کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھی ہوئی ہو۔ یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ شیطان برائیوں اور گمراہوں کا سرچشمہ ہے اِس لئے اُس کی پیروی حق کے راستہ سے یقیناً ہٹا دے گی، وہ ہمیشہ برائی اور بے حیائی کی طرف لے جاتا ہے اور انسانی ذہن کا رُخ اللہ کی طرف سے پھیر دیتا ہے اس لئے وہ باتیں ہرگز نہ کرو جن میں شیطان کی پیروی کا ذرا سا شائبہ بھی پیدا ہوتا ہو۔ "اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَی اللّٰہِ" کے جملہ میں "قول" کے لفظ کے ساتھ "علیٰ" کا لفظ آیا جب اِس طرح کہا جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی شخص کے خلاف کوئی بات بنا لینا اور اُس پر ایسی بات لگا دینا جو جھوٹ اور اُس پر بہتان ہو اور اُس نے نہ کی ہو یا نہ کہی ہو۔ اس کے وسیع مفہوم میں اپنی ذاتی مرضی اور خواہش کی وہ تمام باتیں جو اللہ کی طرف غلط طور پر منسوب کر دی جائیں اور کفر و بدعت کے تمام اقوال داخل ہیں۔ اَلْفَیْنَا " "لَفٰی" سے بنا ہے اور "اِلْفَاءٌ" اس کا مصدر ہے معنی ہیں کسی چیز کو پا لینا یہاں یہ بتایا گیا ہے کہ جب کفار سے خواہ وہ کسی قسم کے کافر ہوں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ راہ حق کو اختیار کریں اور رسالتِ محمدیؐ کا اقرار کریں اور اُن کے سامنے زبردست اور ناقابل انکار دلیلیں پیش کی جاتی ہیں تو اُن کا جواب اُن سے بن نہیں پڑتا بس اتنا کہہ کے اپنی جان بچانا چاہتے ہیں کہ ہم اُن باتوں کو نہیں مانیں گے بلکہ ہم تو اپنے آباؤ اجداد کے طریقہ پر چلتے ہیں اور اُسی کو حق سمجھتے ہیں۔ قرآن حکیم نے یہاں بنی نوع انسان

کو فکر و نظر کی اہمیت سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ تقلید صرف ایسی ہی باتوں میں کرنا جائز ہے جو
عقلِ سلیم اور شریعت کے نزدیک درست ہوں اور جن کی بنیاد مضبوط عقلی اور ذکری دلیلوں اور
دینی مسلمات پر ہو۔ گمراہوں اور جاہلوں کی اندھی تقلید کرنا چاہے وہ کسی کے آباؤ اجداد ہوں یا کوئی
اور ہو کسی طرح بھی جائز نہیں ہو سکتا۔ "اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ" کے جملہ
سے وہ اسلامی نظریے کھل کر ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ گمراہوں کی تقلید کرنا قطعاً جائز
نہیں ہے خواہ وہ کیسی ہی شخصیت رکھتے ہوں دوسرے یہ کہ تقلید یعنی کسی کی بات ماننا اور اُس کے
طریقے کو اختیار کرنا جائز اور ہر طرح قابلِ تحسین و تعریف ہے اگر وہ طریقہ عقلی اور شرعی نقطۂ نظر سے
درست ہو اور وہ شخص جس کی تقلید کی جارہی ہے یقینی طور پر ایسا مقام رکھتا ہو کہ اُس کے طریقے
کو اختیار کرنے میں گمراہی اور حق و صداقت کی راہ سے بھٹک جانے کا کوئی امکان نہ ہو۔ آخر میں
فرمایا گیا ہے کہ اِن کافروں اور منکرینِ حق کی مثال ایسے جانوروں کی سی ہے جو پکارنے والے کی آواز
تو سن لیتے ہیں مگر اُس کی گفتگو کے معنی اور مفہوم کو نہیں سمجھتے۔ صدائے حق کی گونج اُن کے کانوں سے
ٹکراتی تو ہے مگر اُن کے دلوں میں نہیں اُترتی۔ یہ بہرے ہیں۔ انھیں حق کی آواز نہیں سنائی دیتی
یہ گونگے ہیں۔ ان کی زبانوں سے اقرارِ حق کا ظہور نہیں ہوتا اور یہ اندھے ہیں کہ انھیں حق اور ہدایت
کے جگمگاتے ہوئے سورج کی روشنی نظر نہیں آتی۔

درس (۳۱) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا
لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ
الدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ
غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّ
الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَشْتَرُوْنَ بِهٖ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ
اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ښ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

پارہ ۲ رکوع ۵ کی درمیانی ۳ آیاتِ کریمہ۔ سورۃ البقرۃ۔

اے ایمان والو کھاؤ پاک چیزوں میں سے جو ہم نے تم کو دی ہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہو اگر تم خاص
اُسی کی بندگی کرنے والے ہو اُس نے تو تم پر بس مُردہ جانور اور خون اور سور کا گوشت اور جس جانور پر
اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا جائے حرام کیا ہے پس جو شخص مجبور ہو جائے نہ تو سرکشی کرنے والا ہو اور

نہ حد سے نکل جانے والا ہو تو اُس پر کچھ گناہ نہیں۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔ بیشک جو لوگ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کو چھپاتے ہیں اور اُس کے بدلہ میں تھوڑی سی قیمت لے لیتے ہیں۔ یہ لوگ بس آگ سے پیٹ بھرتے ہیں اور اللہ قیامت کے دن نہ اُن سے کلام کرے گا اور نہ انھیں پاک کرے گا اور اُن کے لئے دردناک عذاب ہے۔

تشریح و تفسیر: "کُلُوا" "اَکل" سے بنا ہے اور امر کا صیغہ ہے جو جمع کے لئے ہے۔ اہل ایمان کی طرف خطاب ہے اور اُنھیں حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کی عطا کی ہوئی جائز و حلال اور پاک و پاکیزہ چیزیں کھائیں مگر اس حکم سے مراد صرف یہ ہے کہ اُن کے لئے ان چیزوں کا کھانا مباح اور جائز ہے البتہ جو چیزیں خدا نے مباح نہیں کی ہیں اُن کا کھانا اُن کے لئے حرام ہوگا۔ یہاں پر صیغۂ امر وجوب کے لئے نہیں ہے بلکہ صرف اباحت اور اجازت کے لئے آیا ہے۔ مفسرین کے نزدیک اِس جگہ پر لفظ "کُلُوا" کا مفہوم صرف کھانے پینے ہی میں محدود اور منحصر نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ وسیع ہے یعنی ہر طرح کے استعمال اور رزق خداوندی سے ہر طرح کا فائدہ حاصل کرنے کے جواز کو ظاہر کرتا ہے۔ آگے چل کر "وَاشْکُرُوا" بھی امر ہی کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں۔ اللہ کی نعمتوں پر اُس کا شکر ادا کیا کرو۔ یہاں البتہ ادائے شکر کا حکم وجوب کے معنی ظاہر کرتا ہے یعنی مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اللہ کا شکر ادا کرے۔ "اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیْکُمُ" فرما کر اُن چیزوں کو بیان کرنا مقصود ہے جن کا کھانا مسلمان کے لئے حرام ہے۔ اِس جگہ خصوصیت سے ایسی چار چیزیں بتائی گئی ہیں۔ مُردار۔ خون۔ سور کا گوشت اور وہ جانور جو غیر خدا کے لئے ذبح کیا جائے۔ یہاں ہم کو یہ بات یاد رکھنا چاہیے کہ حرام غذاؤں کا انحصار صرف ان ہی چیزوں میں نہیں ہے جن کا ان آیات میں ذکر ہے بلکہ ان کے علاوہ اور بھی ایسی چیزیں ہیں جن کا کھانا حرام ہے اور اُن کی حرمت متواتر و صحیح حدیثوں کے ذریعے سے پوری طرح ثابت ہے۔ دراصل ان آیات میں حرام غذاؤں کی مکمل تفصیل بیان کرنا بھی مقصود نہیں ہے۔ یہاں تو فقط اُن چیزوں کی حرمت کا ذکر کیا گیا ہے جنھیں مشرکوں نے جائز کر رکھا تھا تاکہ مسلمانوں کو یہ معلوم رہے کہ یہ چیزیں اللہ کی طرف سے قطعاً حرام کی گئی ہیں۔ "مَیتہ" یا مردار وہ مُردہ جانور کہلاتا ہے جو بغیر کسی کے ہلاک کئے ہوئے خود بخود مر جائے یعنی اِس کو کسی نے ذبح نہ کیا ہو یا ذبح یا نحر تو کیا مگر اس کا یہ عمل شریعت کے قواعد کے مطابق نہ ہو ایسے مردہ جانور کو کھانا حرام ہے۔ مچھلی اور ٹڈی اِس حکم ذبح سے مستثنیٰ ہیں اُس تفصیل کے ساتھ جس کا ذکر مختلف اسلامی مکاتب فکر کی فقہی کتابوں میں موجود ہے۔

"میتہ" کے بعد دوسری حرام چیز "دَم" یعنی خون ہے۔ پھر تیسری چیز لحم خنزیر یعنی سور کا گوشت

ہے۔ یہاں حرمت کے ذکر میں صرف اُس کے گوشت کا بیان ہے، اُس کے جسم کے دوسرے اجزا کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ جانور کے جسم کا اہم ترین حصّہ اُس کا گوشت ہی ہوا کرتا ہے اسی لئے محض اُسی کے ذکر پر اکتفا کی گئی جس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ جب اُس کا گوشت ناپاک اور حرام ہے تو اُس کے جسم کے دوسرے اجزا کس طرح حلال اور پاک ہو سکتے ہیں چنانچہ جمہور علما کا اِس پر اتفاق ہے کہ اُس کے جسم کی کوئی چیز بھی نہ حلال ہے اور نہ پاک ہے۔

"وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ" میں "اُهِلَّ" فعل مجہول کا صیغہ ہے۔ اِس کا مصدر "اِهْلَال" جس کے اصلی معنی ہیں ہلال یعنی چاند کا نکل آنا یا پھر چاند دیکھنے کے بعد آواز بلند کرنا اور پکار کر اُسے شہرت دینا لیکن بعد میں یہ لفظ ہر موقع پر پکارنے اور آواز بلند کرنے کے لئے بولا جانے لگا۔ یہاں بر ظاہری ترجمہ یہ ہے کہ جس جانور کو ذبح کرتے وقت غیرِ خدا کا نام لیا جائے وہ مردار ہو کر حرام ہو جاتا ہے۔ چونکہ مشرک لوگوں میں عام رواج تھا کہ وہ اپنے بتوں اور معبودوں کے نام پر جانوروں کو ذبح کرتے اور بھینٹ چڑھاتے تھے اِس لئے یہ بتایا گیا ہے کہ ایسا ذبیحہ جس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے ناپاک اور "میتۃ" ہے اور اُس کا کھانا حرام ہے۔ مفسرین کے نزدیک اِس حکم کی وسعت میں محض غیر اللہ کا نام لینا ہی نہیں بلکہ تقرب و عبادت کی نیت سے جانور کو اُس کے لئے نامزد کر کے ذبح کرنا بھی شامل ہے اور ایسی صورت میں وقتِ ذبح تکبیر کہدینے سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوگا جبکہ اِس عمل سے تقربِ الٰہی کے بجائے کسی دوسرے کا تقرب مقصودِ اصلی ہو یا نیت تقرب میں خدا کے ساتھ اُس کے غیر کو بھی شریک کر لیا جائے۔ دونوں حالتوں میں یہ عمل ناجائز اور اِس طرح کا ذبیحہ حرام ہو جائے گا۔ علامہ نیشاپوری نے اپنی مشہور تفسیر میں یہاں تک لکھدیا ہے کہ علماءِ امت کے نزدیک ایسا کرنے والا مرتد ہے اور اُس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ ہے اِس کے ساتھ ہی مفسرین نے اِس کی بھی تشریح کر دی ہے کہ "غیر اللہ" سے محض بُت اور معبودانِ باطل ہی مراد نہیں ہیں بلکہ ہر وہ شخص اور ہر وہ چیز مراد ہے جو اللہ کے علاوہ ہے۔ پھر "فَمَنِ اضْطُرَّ" فرما کر اِس حکمِ حرمت سے ایسی حالت کو مستثنےٰ کر دیا گیا ہے جہاں انسان مجبور ہو جائے اور اِن چیزوں کے بغیر زندگی کا بچانا اُس کیلئے ممکن ہی نہ ہو بشرطیکہ اُس کے عمل میں اللہ کی نافرمانی یا شرعی حدوں سے تجاوز اور اُن کی خلاف ورزی کرنے کا شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو کیونکہ اسلام نے خودکشی کی اجازت نہیں دی ہے۔ آخر میں علماءِ یہود کا ذکر ہے جو آسمانی کتابوں کے شرعی احکام اور سرورِ کائنات کے متعلق اُن کتابوں کی پیشین گوئیوں کو چھپاتے تھے اور اس حق پوشی کے بدلہ میں نفعِ دنیوی حاصل کیا کرتے تھے۔ اُنھیں اور ایسے تمام لوگوں کو جو اخفائے حق کے مجرم ہوں خبردار کیا گیا ہے کہ وہ اس بدترین کام کی قیمت کھا کر اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں اور وہ یاد

رکھیں کہ قیامت کے دن وہ اللہ کے غضب سے نہیں بچ سکتے اور اُس کے لطف و کرم اور رحمت و مغفرت سے محروم رہیں گے۔

(درس ۳۱) اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ○ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۗ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍ بَعِيْدٍ ○ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○

پارہ ۲ رکوع ۵ کی آخری ۲ اور رکوع ۶ کی ابتدائی ایک آیت۔ سورۃ البقرۃ۔

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے گمراہی کو خرید لیا ہے ہدایت کے بدلہ میں۔ اور عذاب کو مغفرت کے عوض میں پس یہ لوگ کیسی برداشت رکھتے ہیں دوزخ کی آگ کے لئے۔ اور یہ سزا اِس لئے ہوگی کہ اللہ نے تو کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا تھا۔ اور بیشک جن لوگوں نے کتاب میں اختلاف ڈالا وہ بڑی دور کی مخالفت میں پڑے ہوئے ہیں۔ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم (عبادت میں) اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لیا کرو بلکہ نیکی تو یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن پر اور فرشتوں اور کتاب اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اسکی محبت میں مال صرف کرے۔ قرابت داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور مسافروں اور سوال کرنے والوں پر اور گردنیں آزاد کرانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا رہے اور جو لوگ اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہوں جب وہ عہد کرلیں اور صبر کرنے والے ہوں تنگدستی اور بیماری میں اور لڑائی کے وقت۔ یہی لوگ ہیں جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو پرہیزگار ہیں۔

تشریح و تفسیر: "اِشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى" جس کے معنی ابھی یہ بیان ہوئے کہ اُن لوگوں نے ہدایت کے بدلہ میں گمراہی کو خرید لیا ہے۔ یہاں یہودی مراد ہیں اور بتایا گیا ہے کہ اُنھوں نے رسالت نبوی کی اُن تمام پیشین گوئیوں کو جو توراۃ اور دوسری کتابوں میں تھیں چھپا دیا اور اس کے بجائے کہ وہ اُن سے

لوگوں کو آگاہ کر کے اُن کی ہدایت کرتے، اُنھیں مخفی کر کے سب کو گمراہ کرنے کی کوشش کی اور خود بھی اُس کے منکر ہو گئے اور اِس کے ساتھ ہی اُنھوں نے دوسرے احکام خداوندی پر بھی پردہ ڈالا اور نفع دنیوی حاصل کرنے میں لگے رہے اِس طرح گویا اُنھوں نے گمراہی کے عوض میں ہدایت اور حق کو بیچ ڈالا۔ اِس ارشادِ الٰہی کا تعلق یہودیوں اور یہودی مزاج گمراہوں کی دنیوی زندگی کے اعمال بد سے ہے کہ اُنھوں نے اپنی اِس زندگی میں الٰہی ہدایتوں کو چھپایا بھی اور ٹھکرایا بھی اور گمراہی و ضلالت کو اُبھار کر ترقی بھی دی اور خود بھی اُسے اختیار کیا۔ "وَالعَذَابَ بِالمَغفِرَةِ" اور اُنھوں نے عذاب الٰہی کو مغفرت اور بخشش کے بدلے میں خرید لیا اِس جملہ کا تعلق اُن کی اُخروی زندگی سے ہے۔ یعنی چونکہ آخرت کی زندگی نتیجہ ہوتی ہے دنیوی اعمال کا اِس لئے یہاں کی اِس خرید و فروخت کا حاصل اخروی زندگی میں یہ ہوگا کہ اُنھیں بخشش کے بجائے عذاب جہنم کی سخت ترین سزا بھگتنا پڑے گی۔ "فَمَآ اَصبَرَهُم عَلَى النَّارِ" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ واقعی بڑے صبر کرنے والے ہیں اور یہ اُن کی کوئی اچھی صفت ہے بلکہ یہاں یہ جملہ استہزا کے طور پر اور حقارت کے عنوان پر بولا گیا ہے اور تعجب کا اظہار مقصود ہے کہ وہ کیسی جرأتِ گناہ رکھتے ہیں کہ اُنھیں جہنم کی اِس شدید ترین سزا کا بھی کوئی خوف نہیں! پھر فرمایا گیا ہے کہ یہ سزا اُنھیں اِس وجہ سے دی جائے گی کہ اُنھوں نے کتاب خداوندی کا انکار کیا اور اُس کی باتوں کو نہیں تسلیم کیا درآنحالیکہ اللہ نے اپنی کتاب کو حق کے ساتھ نازل فرمایا تھا اور اُس کی ہر بات سچّی تھی کتاب الٰہی سے یہاں مراد توراۃ ہے اور بعض کے نزدیک یہ "اسم جنس" ہے اور مراد ہیں تمام آسمانی کتابیں اور یہی تفسیر زیادہ بہتر ہے۔ "شقاق" کے معنی باہمی نزاع، ضد اور اختلاف کے ہیں۔ "بَعِید" سے حق و صداقت سے دور ہو جانا مقصود ہے۔ "بِرّ" نیکی اور طاعت کو کہتے ہیں۔ اِس جگہ "لیس البِرّ" کہہ کر اس بات کی تشریح فرما دی گئی ہے کہ نیکی، طاعت اور بھلائی یہ نہیں ہے کہ لوگ حالتِ عبادت میں مشرقی یا مغربی سمت کی طرف مُنہ کر لیا کریں بلکہ حقیقی نیکی اور اصلی طاعت وہ باتیں ہیں جن کا یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، بذاتِ خود مشرق یا مغرب کی طرف رُخ کر لینے میں کوئی اہمیت یا نیکی نہیں ہوتی جبتک وہ کسی نیک غرض اور اچھے مقصد کے لئے نہ ہو تو درحقیقت خیر اور نیکی کا تعلق اُس مقصد سے ہوگا نہ کہ صرف سمت اور جہت سے۔ پھر یہ نیکی اور طاعت بھی صرف دو ہی طرح کی ہو سکتی ہے، ایک اعتقادی اور فکری دوسرے عملی۔ بیان کردہ آخری آیت میں انتہائی معجزانہ جامعیت کے ساتھ اِن دونوں قسموں کی تشریح فرما دی گئی ہے۔ یہاں قرآنِ حکیم نے قدیم مشرکوں اور اُن کی تقلید میں اہلِ کتاب کی ایک بڑی گمراہی یعنی سمت و جہت پرستی کے باطل عقیدہ کی طرف اشارہ کیا ہے جو مشرقی سمت کو مطلع زندگی اور مغربی جہت کو خطۂ فنا سمجھ کر اُن کی ذاتی عظمت و تقدیس

کے قائل تھے اور سمجھایا ہے کہ مشرق و مغرب کی یا کسی سمت کی بھی ذاتی حیثیت سے کوئی اہمیت نہیں ہوتی اور نہ اُس میں کسی قسم کے خصوصی تقدس اور بڑائی کا تصور جائز ہو سکتا ہے بلکہ جہتیں اور سمتیں جس قدر بھی ہیں وہ سب اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور سب اُس کے نزدیک برابر ہیں۔ اب جہاں تک نماز میں خانۂ کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہے تو اِس سے کسی خاص سمت اور جہت کی ذاتی تقدیس اور اہمیت ہرگز مقصود نہیں بلکہ اس کی اصلی غرض خود بیت اللہ کی مرکزی حیثیت ہے خواہ وہ نماز پڑھنے والوں کے لئے کسی سمت میں بھی پڑ جائے تاکہ کرۂ زمین کے ہر خطہ میں بسنے والے تمام توحید پرستوں کے لئے اللہ کا یہ مقدس گھر فکری اور دینی ہر سطح پر باہمی وحدت و یگانگت کے حصول کا وسیلہ ثابت ہو سکے اور اُن سے ہر قسم کی تفریق کا زہر دور کیا جا سکے۔ اس میں نہ مشرق و مغرب کی قید ہے اور نہ جنوب و شمال یا اُن کی درمیانی جہتوں اور سمتوں کی کوئی شرط ہے۔ سمت پرستی کے اس مشرکانہ رجحان کو پوری طرح باطل کر دینے کے بعد پھر اس کی وضاحت بھی کر دی گئی ہے کہ انسان کی اصلی نیکی اور حقیقی بھلائی ہے کیا۔ اس سلسلہ میں عقائد و اعمال سے متعلق جتنی بھی اہم ترین بنیادی تعلیمات ہیں اُن سب کی طرف انتہائی جامعیت کے ساتھ اشارہ کر دیا گیا ہے۔ پہلے عقائد کا بیان ہے پھر معاملات کا ذکر ہے اُس کے بعد عبادات اور آخر میں اخلاق کی تشریح ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کے لئے خیر و فلاح اور بِرّ و طاعت کے جس قدر بھی پہلو ہو سکتے ہیں اُن سب کو بتا دیا گیا ہے۔

(درس ۳۳) يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِنْ رَبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ○ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَآأُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

پارہ ۲ رکوع ۶ کی درمیانی ۲ آیات۔ سورۃ البقرۃ۔

اے ایمان والو تم پر مقتولوں کے باب میں قصاص فرض کیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلہ میں آزاد اور غلام کے بدلہ میں غلام اور عورت کے بدلہ میں عورت ہاں جسے اُس کے بھائی (فریق مقابل) کی طرف سے کچھ معافی حاصل ہو جائے تو معقول طور پر مطالبہ کرنا اور خوبی کے ساتھ اُس کے پاس پہنچا دینا چاہئے یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے رعایت اور مہربانی ہے پس جو کوئی اس کے بعد بھی زیادتی کرے تو اُس کے لئے دردناک عذاب ہے اور تمہارے لئے قصاص میں زندگی ہے اے عقل والو تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔

تشریح و تفسیر: "کُتِبَ" کے معنی ہیں لکھا گیا مگر یہاں اس سے مراد ہے فرض کیا گیا۔ "القصاص"

"قصٌّ" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی کاٹ دینے کے بھی آتے ہیں اور نقش قدم پر چلنے اور اتباع و پیروی کرنے کے بھی۔ اس طرح "قصاص" کا مفہوم یہ ہو گا کہ ویسا ہی عمل کیا جائے جیسا اس سے قبل کیا گیا تھا۔ اسی معنی کی مناسبت سے اِس لفظ "قصاص" کو مساوی بدلہ کے لئے بولتے ہیں یعنی خون کے عوض میں خون اور زخم کے بدلہ میں زخم کے لئے۔ "قتلیٰ" "قتیل" کی جمع ہے جس کے معنی مقتول کے ہیں یہاں مقصود یہ ہے کہ جب مقتولوں کے خون کا بدلہ لیا جائے تو اُس کی نوعیت اور حیثیت سب کے لئے یکساں رہے یہ نہ ہو کہ اونچی حیثیت کے آدمی کے خون کی قیمت معاشرہ کے ایک عام آدمی کے خون سے زیادہ سمجھی جائے جیسا کہ قدیم جاہلی قوموں میں رواج تھا اور آج بھی بعض حکمراں قوموں کی ذہنیت پر یہ طبقاتی تفریق مسلط ہے۔ پھر یہاں "یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا" فرما کر اہلِ ایمان کی طرف اجتماعی طور پر خطاب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ انفرادی طور پر لوگوں کو قصاص لینے کا اختیار نہیں ہے۔ بلکہ یہ کام اسلامی حکومت کا ہے جو مقررہ ضوابط کے تحت اِس کا نفاذ کرے گی۔ یہاں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ حکم قصاص مقتول کے وارثوں کا انتہائی حق ہے ورنہ وہ قاتل کو معاف بھی کر سکتے ہیں۔ اور اُس سے قصاص کے بجائے دیت یعنی خون بہا بھی لے سکتے ہیں "مِنْ اَخِیْہِ" میں "اَخٌ" کے معنی بھائی کے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام اِس حادثۂ قتل کے باوجود قاتل اور مقتول کے وارث کو اُن کی باہمی دینی اخوت کے رشتہ کو یاد دلا رہا ہے کہ وہ اِس عمل سے ٹوٹا نہیں ہے تا کہ آئندہ اُن کی دشمنی کو جس حد تک بھی ممکن ہو کم کرنے کی کوشش کی جائے جبکہ اِس کے برخلاف عربوں کی قدیم تاریخ بتاتی ہے کہ ایسے حالات میں زبردست گروہ بندیاں ہوتی تھیں اور صرف آدمی ہی نہیں بلکہ جانور کے خون تک کے بدلہ میں برسوں انسانی خون پانی کی طرح بہایا جاتا تھا اور بڑی حد تک تو آج بھی دنیا کا یہی حال ہے "فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ" سے مراد یہ ہے کہ اگر مقتول کا وارث دیت لینا طے کرے تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ دستور کے مطابق انتہائی معقولیت کے ساتھ یہ مطالبہ کرے۔ "وَاَدَآءٌ اِلَیْہِ بِاِحْسَانٍ" کا حاصل یہ ہے کہ دیت اور خون بہا مقرر ہو جانے کی صورت میں قاتل پوری دیانتداری اور حسن و خوبی کے ساتھ اِس دیت کی ادائیگی کرے اور مقتول کے وارث کو کسی قسم کی بھی زحمت اور پریشانی میں مبتلا نہ کرے۔ اِن آیات سے قبل کی آیت میں اجمالی طور پر اسلامی تعلیمات و احکام کی تمام اہم بنیادوں کی طرف اشارہ کیا گیا تھا اور اب اُن باتوں کی تفصیل بتائی جا رہی ہے۔ قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ گذشتہ درس کی آخری آیت میں جس بات کی وضاحت کی گئی تھی وہ یہی تھی کہ انسان کی حقیقی نیکی اور بھلائی صرف اِس چیز میں ہے کہ وہ اُن اعتقادی اور عملی تمام تعلیمات پر عمل کرے جنھیں قرآن حکیم نے یہاں بنیادی حیثیت سے بیان کر دیا ہے۔ اِسی میں اُس کی فلاح ہے اور اسی میں اُس کی نجات ہے۔ اِن بنیادی باتوں میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اللہ پر سچے دل سے ایمان اختیار کرے اور اُس کی توحید اور تمام صفات پر

کامل یقین رکھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا کوئی بھی مسلک جس میں اللہ پر ایمان رکھنا شامل نہ ہو خیر وفلاح سے کوئی تعلق نہیں رکھتا خواہ وہ کوئی معاشی نظام ہو یا اخلاقی اور سیاسی نظام ہو یا Agnosticism (عقلیت) یعنی مذہب عقلی یہ عقیدہ کہ یعنی یہ عقیدہ کہ ہم کچھ نہیں جانتے (لا ادریت) ہمیں وحی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ ہماری عقل ہر چیز کے لئے کافی ہے کی طرح کوئی مسلک ہو۔ اس کے ساتھ ہی یوم حساب یعنی قیامت اور فرشتوں، آسمانی کتابوں اور پیغمبروںؑ پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔ فکر و نظر اور عقائد کی یہی وہ اہم بنیادیں ہیں جن میں دنیا ہمیشہ گمراہ ہوتی اور ٹھوکریں کھاتی رہی ہے اس لئے قرآن حکیم نے سب سے پہلے اِن ہی باتوں کو بیان کیا ہے تاکہ شرک و کفر کے اصلی اسباب کی جڑیں کاٹ کر اعتقادات کی پوری طرح تطہیر کر دی جائے اور وہ بیج ہی باقی نہ رہے جس سے گمراہی اور ضلالت کی پیدائش ہوتی ہے۔ عقائد کی اصلاح کے بعد اعمال کا ذکر ہے اور اُن میں سب سے پہلے معاشی نظام کے متعلق الٰہی احکام کی تشریح فرمائی گئی ہے اور اس کی ہدایت ہے کہ ہر صاحبِ استطاعت کو چاہیے کہ وہ اپنے مال سے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں مسافروں اور سوال کرنے والے ضرور تمندوں کی اعانت کرے اور غلاموں کی یا اُن مسلمانوں کی جو کافروں کی قید میں ہوں امداد کرے اور اُنھیں آزادی دلائے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ کے خوشحال افراد پر یہ اخلاقی ذمہ داری لگائی گئی ہے کہ وہ مناسب نظم وضبط کے ساتھ شرعی طریقوں سے جس حد تک بھی ممکن ہو حاجتمند لوگوں کی دستگیری اور اعانت کرتے رہیں اور اُن کی تکلیفیں اور مصیبتیں دور کرنے میں اُن کی مدد کریں۔ یہ ہیں اسلام کے معاشی اور معاشرتی نظام کی وہ اہم بنیادیں جنھیں قرآنِ حکیم نے بڑی جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ پھر عبادات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس سلسلہ میں محض نماز اور زکوٰۃ کا نام لیا گیا ہے جو تمام مالی اور بدنی یا فکری عبادتوں کیلئے مرکزی حیثیت کی حامل ہیں۔ یہاں نماز کے ساتھ خاص طور پر زکوٰۃ کا ذکر ہے جو ہر مالکِ نصاب پر فرض کی گئی ہے اور جو اسلام کے معاشی نظام کا اہم ترین جزو ہے۔ آخر میں پھر اخلاقیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے اور اُس کے لئے دو انتہائی اہم اصول بیان کئے گئے ہیں۔ ایک "وفائے عہد" جس میں وہ تمام اقرار اور عہد داخل ہیں جو ایک انسان دوسرے انسان سے یا کوئی بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے اور دوسری چیز "صبر" ہے جس کے وسیع مفہوم میں ہر وہ پابندی داخل ہے جو عقل و شریعت کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ اس طرح اِن دونوں باتوں کے اندر مسلمان کی پوری اخلاقی زندگی آجاتی ہے۔ غرض اعتقادات، معاملات، عبادات اور اخلاق کے اِس مختصر مگر انتہائی جامع بیان کے بعد اس وقت کی بیان کردہ آیات میں ان ہی باتوں کی تشریح فرمائی جارہی ہے اور سب سے پہلے قانونِ قصاص کا ذکر کیا گیا ہے اِس قانون کا تعلق صرف ایسے قتل سے ہے جو قصد اور ارادہ کے ساتھ ہو اور اس کا سب سے بڑا مقصد انسانی جان کا تحفظ اور معاشرہ میں امن وامان بحال رکھنا

ہے کیونکہ بدامنی کی حالت میں کوئی بھی معاشرہ کبھی زندہ نہیں رہ سکتا۔ اسی کی طرف آخر میں ان لفظوں کے ساتھ اشارہ فرمایا گیا ہے "وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا أُولِي الْأَلْبَابِ" اے عقل رکھنے والو قانون قصاص میں تمہارے لئے زندگی ہے۔

(درس ۲) كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۚ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ○ فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ ۚ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ ۚ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ ۖ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ○

پارہ ۲ رکوع ۶ کی آخری ۳ اور رکوع ۷ کی ابتدائی ۲ آیات سورۃ البقرۃ۔

تم پر فرض کیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی نظر آئے بشرطیکہ کچھ مال بھی چھوڑ رہا ہو تو وہ ماں باپ اور رشتہ داروں کے حق میں معقول طریقہ پر وصیت کرے یہ ضروری ہے پرہیزگاروں کے لئے پھر جو شخص اُسے اُس کے سُن لینے کے بعد بدل ڈالے تو اُس کا گناہ بس اُن ہی لوگوں پر ہوگا جو اُسے بدلیں گے بیشک اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔ البتہ جس کو وصیت کرنے والے کے متعلق کسی بدعنوانی یا گناہ کا خوف ہو پھر وہ اُن لوگوں میں صلح کرادے تو اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔ اے ایمان والو تم پر روزے فرض کئے گئے جیسا کہ اُن لوگوں پر فرض کئے گئے تھے جو تم سے پہلے تھے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ (یہ روزے) گنتی کے چند روز کے ہیں، پھر تم میں سے جو شخص بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں سے شمار ضروری ہے اور جو لوگ روزہ کو بڑی مشکل سے برداشت کرسکتے ہوں اُن کے ذمہ فدیہ ہے، ایک محتاج کا کھانا پھر جو کوئی اپنی خوشی سے نیکی کرے تو اُس کے لئے بہتر ہے اور اگر تم علم رکھتے ہو تو تمہارے لئے یہی اچھا ہے کہ تم روزے رکھو۔

تشریح وتفسیر: "اِنْ تَرَكَ خَيْرًا" میں لفظ "خیر" سے مراد مال ہے جو مرنے والا چھوڑتا ہے۔ "وَصِيَّةُ" سے مراد ہے نصیحت کے طریقہ پر کسی کو کچھ ہدایت کرنا جہاں تک اِس کے عام لفظی مفہوم کا تعلق ہے اِس میں اس کی کوئی قید و شرط نہیں ہے کہ وہ وصیت اُن باتوں کے لئے ہو جو وصیت کرنے والے کی حیات سے متعلق ہوں یا اُس کی موت کے بعد سے تعلق رکھتی ہوں۔ البتہ شرعی اصطلاح میں اس سے مراد وہ ہدایات ہیں جن کا نفاذ کسی شخص کی موت کے بعد سے تعلق رکھتا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی جب کبھی اس لفظ کو اللہ کی طرف نسبت دی جاتی ہے کہ اُس نے اپنے بندوں کو فلاں بات کی وصیت فرمائی ہے تو اِس سے مراد اُس کا حکم اور فرمان ہوتا ہے۔

اسلامی قانونِ وصیت کی بنا پر بعض باتیں ایسی ہیں جن کے لئے وصیت کرنا واجب ہے جیسے قرض اور امانت کی ادائیگی یا جیسے فریضۂ حج اور کفارہ اور زکوٰۃ و خمس کی ادائیگی یا اسی طرح کے اور واجب حقوق اِن کے علاوہ دوسری باتوں کے لئے وصیت کرنا کبھی مستحب ہوتا ہے اور کبھی صرف مباح و جائز۔ لیکن جو وصیت بھی شرعی حیثیت سے صحیح ثابت ہو اُس کی تعمیل کرنا ہر صورت میں فرض ہے اور اُس میں کسی قسم کی تبدیلی کرنا یا اُس کی تعمیل ہی نہ کرنا جائز نہیں ہے۔ رہیں وہ چیزیں جو شرعاً جائز نہیں ہیں تو اُن کیلئے وصیت کرنا بھی جائز نہیں ہے اور اُس کی تعمیل بھی ممنوع ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ قرضہ، امانت اور دیگر واجب حقوق کی ادائیگی میں اِس کی کوئی قید نہیں ہے کہ وہ "ترکہ" کے ایک ثُلث یعنی اُس کے تیسرے حصہ سے زیادہ نہ ہو بلکہ اِس میں جس قدر بھی خرچ کرنا واجب ہوگا وہ کیا جائے گا۔ چاہے سارا ہی ترکہ کیوں نہ صرف ہو جائے۔ کیونکہ ان حقوق کی ادائیگی ہر حال میں تقسیم میراث پر مقدم ہے اور اُن سے بھی پہلے میت کی تجہیز و تکفین کے واجبات کی ادائیگی ہر چیز پر مقدم ہے۔ اِس کے بعد اگر کچھ بچ رہیگا تو اُس پر حکم میراث جاری ہوگا۔

صرف اُس وصیت کی تعمیل اور نفاذ میں جو واجب حقوق کی ادائیگی کے لئے نہ ہو بلکہ مستحب اور مباح باتوں کے لئے ہو، "ثُلث" کی شرط ہے یعنی وہ قرضہ اور دیگر واجب حقوق کی ادائیگی کے بعد باقی ترکہ کے تیسرے حصہ سے زیادہ نہ ہو ورنہ تہائی سے زیادہ حصہ میں وہ وصیت باطل ہو جائے گی اور اس زائد حصہ کے بقدر اُس پر عمل کرنا جائز نہ ہوگا مگر صرف ایسی حالت میں جائز ہو سکتا ہے جب میت کے وارث اِسکی اجازت دیدیں "موصی" وصیت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ "جَنَفٌ" جانبداری، بے جا رعایت، بدعنوانی اور نادانستہ غلطی کو کہا جاتا ہے۔ "اِثْمٌ" قصد و ارادہ کے ساتھ نافرمانی اور گناہ کے لئے بولتے ہیں۔ "يُطِيقُونَهُ" کا مصدر "طَاقَةٌ" ہے۔ اِس کے اصلی معنی قدرت اور قوت کے ہیں اور کبھی اِس سے

مراد ایسی قدرت اور قوت ہوا کرتی ہے جس سے کسی کام کو بڑی مشقت اور بہت دشواری کے ساتھ کیا جا سکے۔ یہاں جس آیت میں یہ لفظ آیا ہے اس کی تفسیر میں کئی قول ہیں مگر اہلبیت اطہار علیہم السلام نیز حضرت ابن عباس رضؓ اور بعض دوسرے صحابہ کرام اور تابعین کی روایتوں سے اور علامہ طبری، قرطبی اور زمخشری جیسے بلند پایہ مفسروں کی تحقیق سے اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہوئی ہے بلکہ محکمات میں داخل ہے اور یہاں ایسے لوگوں کا حکم بیان ہو رہا ہے جو کسی نہ کسی طرح روزہ رکھ لینے کی قدرت تو رکھتے ہوں مگر بے انتہا مشقت اور بڑی تکلیف کے ساتھ جیسے بڑی عمر کے بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں یا ایسے مستقل بیمار جو تندرست و شفایاب نہیں ہوتے۔ حاملہ عورتوں اور دودھ پلانے والی عورتوں کو بھی اسی حکم میں شامل کیا گیا ہے۔ مگر ان پر بعد میں قضا روزے رکھنا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے۔ اس مسئلہ کی مزید تشریح فقہ و حدیث کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ملے گی۔ غرض اس قسم کے لوگوں کے لئے اس کی اجازت ہے کہ وہ روزہ نہ رکھیں اور اس کے عوض میں ان پر واجب ہے کہ وہ ہر روزہ کا فدیہ ادا کریں یعنی ایک محتاج کو کھانا دید یا کریں جس کی مقدار مقرر کردی گئی ہے۔

"فدیہ" کے لفظی معنی بدلہ اور عوض کے ہیں اور شرعی اصطلاح میں اس سے مراد ہے مال کی ایک معین مقدار کا خرچ کرنا یا کوئی دوسرا عمل بجالانا جس کے ذریعہ سے کوئی شخص عبادت میں کوتاہی کے گناہ سے اپنے آپ کو بچا سکے۔ بیان کردہ آیتوں کی ابتدا میں وصیت کے متعلق احکام بیان ہوئے تھے۔ یہ آیۂ وصیت بعض کے نزدیک منسوخ ہوگئی ہے مگر اکثر علماء اسے بھی محکمات میں داخل سمجھتے ہیں۔ جن لوگوں کے نزدیک یہ منسوخ نہیں ہوئی ہے وہ بھی ورثہ کی تقسیم سے متعلق تمام احکام کی بنیاد اب آیۂ میراث ہی کو سمجھتے ہیں جو آیۂ وصیت کے بعد نازل ہوئی ہے۔

ان آیات کی باقی تشریح اس کے بعد کی آیتوں کے ساتھ انشاء اللہ بیان کی جائے گی۔

(درس ۳)

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰی وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ؕ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ○ وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لِیْ وَلْیُؤْمِنُوْا بِیْ لَعَلَّهُمْ یَرْشُدُوْنَ ○

پارہ ۲ رکوع ۷، کی درمیانی ۲ آیات۔ سورۃ البقرۃ۔

رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور اس میں کھلی ہوئی دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی پس جو شخص تم میں سے اِس مہینہ کو پائے تو اُس پر لازم ہے کہ وہ مہینہ بھر روزہ رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو (اُس پر) دوسرے دنوں کا شمار ضروری ہے۔ اللہ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے اور تمہارے حق میں دشواری نہیں چاہتا اور یہ (چاہتا ہے) کہ تم گنتی کو پورا کر لیا کرو اور یہ کہ تم اللہ کی بڑائی کرو اِس بات پر کہ تم کو اُس نے ہدایت کی اور تاکہ تم لوگ شکر ادا کرو اور جب تم سے میرے بندے مجھ کو دریافت کریں تو میں قریب ہی ہوں۔ دعا مانگنے والے کی دعا کو قبول کرتا ہوں جب وہ مجھ سے دعا مانگتا ہے پس لوگوں کو چاہیئے کہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ نیک راستہ پر آجائیں۔

تشریح و تفسیر: "رمضان" کا لفظ "رَمَضٌ" سے بنا ہے جس کے معنی دھوپ کی سخت تپش کے ہیں۔ عربی زبان کے بعض ماہروں نے لکھا ہے کہ جب عربوں نے اس مہینہ کا نام رکھا تھا تو وہ زمانہ بے حد گرمی اور سورج کی سخت تپش کا تھا پھر جب اس نام کی شہرت ہوگئی تو اس کے ساتھ گرمی کے زمانہ کی قید باقی نہ رہی۔ بعض لوگوں نے اِس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ "رمضان" خدا کا ایک نام ہے جس کے معنی ہیں گناہوں کو بخشنے والا۔ چونکہ یہ مہینہ خدا کی رحمت اور بخشش سے ایک خصوصی نسبت رکھتا ہے اِسی بنا پر اس کو "رمضان" کہا جاتا ہے۔

"قرآن" اصل میں مصدر ہے اور اِسی طرح "قراءۃ" بھی مصدر ہے۔ یہ دونوں "قَرْءٌ" سے بنے ہیں جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ اِسی مناسبت سے ان دونوں لفظوں کو پڑھنے کے معنی

بولا جانے لگا ہے کیونکہ اُس میں بھی حرفوں اور لفظوں کو باہم ملا دیا جاتا ہے کچھ علماء نے اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اللہ نے قرآن حکیم میں تمام کائنات کے علوم کو جمع کر دیا ہے اسی لئے اُس کا یہ نام ہے۔ البتہ اسلامی اصطلاح میں "قرآن" کا لفظ اُس کتاب الٰہی کے لئے مخصوص ہے جو سرورِ کائنات پر اُتری ہے۔ اِس کے علاوہ کسی دوسری کتاب کو قرآن نہیں کہا جا سکتا خواہ وہ آسمانی کتاب ہو یا کوئی اور۔ اِسی طرح اصطلاح میں "قراءۃ" کا لفظ بھی ترتیل کے ساتھ قرآن حکیم کی تلاوت کیلئے خاص کر دیا گیا ہے۔ اِس سلسلہ میں یہ عرض کر دینا بھی شاید بے محل نہ ہو گا کہ بہت سے لوگ اس لفظ کو غلط طریقہ پر "قرأت" کہہ دیتے ہیں جو تلاوت کے مفہوم میں قطعاً غلط استعمال ہے بلکہ یہ ایک دوسرا ہی لفظ ہے جس کے معنی متعدی بیماری اور وبا کے ہیں۔ تلاوت اور پڑھنے کے معنی میں صحیح لفظ "قراءۃ" ہی ہے۔ "بَیِّنَۃ" روشن اور صاف دلیل کو کہتے ہیں۔ "فُرْقَان" مصدر بھی ہے اور اسم صفت بھی۔ یہاں اسم مراد ہے اور معنی ہیں، وہ چیز جو حق اور باطل میں فرق کرنے والی ہو "عِدَّۃ" کے کئی معنی ہیں یہاں پر مراد تعداد اور گنتی ہے۔ "فَلْیَسْتَجِیْبُوْا" کا مصدر "اِستجابۃ" ہے جو اپنے اصلی مادہ "جَوْبٌ" سے بنا ہے۔ "استجابۃ" کا لفظ جب بندوں کے لئے کہا جائے تو اس کے معنی حکم ماننے کے ہوتے ہیں اور جب خدا کے لئے بولا جائے تو بندوں کی دعا قبول کرنا مراد ہوتا ہے۔ گذشتہ درس میں جن آیات کی تفسیر بیان ہوئی تھی اُن کی ابتدا میں وصیت کے حکم کا ذکر کیا گیا تھا۔ یہ حکمِ وصیت جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا جا چکا ہے بیشتر مفسرین کے نزدیک آیۂ میراث کی وجہ سے منسوخ نہیں ہوا ہے بلکہ میراث کی آیت جو سورۂ نساء میں ہے اس حکم وصیت کی تشریح اور تفصیل ہے اِس کے ساتھ ہی اسے "منسوخ" کہنے والے ہوں یا "محکم" سمجھنے والے ہوں سب ہی اِس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ وصیت کرنا بہر حال جائز عمل ہے اور بہت سی صورتوں میں مستحب اور باعث ثواب بھی ہے اور کبھی ایسی صورت میں جب قرض و امانت یا دوسرے حقوق واجبہ کی ادائیگی لازم ہو تو واجب بھی ہے مگر مباح یا مستحب ہونے کی صورت میں یہ شرط رہے گی کہ وہ وصیت، میت کی تجہیز و تکفین کے واجبات اور قرض و امانت جیسے واجب اور ضروری حقوق کی ادائیگی کے بعد بقیہ ترکہ کے تہائی حصہ سے زیادہ نہ ہو حکم وصیت کے تذکرہ کے بعد گذشتہ آیتوں میں روزہ کی فرضیت کا بیان تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ یہ کوئی نیا حکم نہیں ہے بلکہ یہ حکم اگلی امتوں کے لئے بھی تھا۔ پھر بیماری اور سفر کی حالت میں وقتی طور پر روزہ ترک کرنے کی سہولت کا ذکر کیا گیا تھا اور سب کے آخر میں ایسے لوگوں کا حکم بیان ہوا تھا جن کو روزہ رکھنے میں بڑی مشقت اور بے حد تکلیف برداشت کرنا پڑتی ہو جیسے بڑی عمر کے بوڑھے یا اُسی طرح کے

دوسرے لوگ کہ وہ روزہ ترک کر سکتے ہیں اور پھر ہر روزہ کے بدلہ میں ایک محتاج کو کھانا دیدیا کریں جس کی مقدار علماء نے مقرر کردی ہے۔ اِن تمام باتوں کے بعد اب بیان کردہ آیات میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جو روزے فرض کئے گئے ہیں وہ پورے ماہِ رمضان کے روزے ہیں اور یہ وہ مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ نے قرآنِ حکیم کو نازل فرمایا ہے۔ اِس نزول سے یہاں مراد دو باتیں ہو سکتی ہیں، ایک یہ کہ اِسی ماہ میں پورا قرآن بیت العزۃ سے آسمانِ اول پر نازل کر دیا گیا تھا پھر بعد میں تقریباً بائیس سال کی مدت میں تھوڑا تھوڑا حسبِ ضرورت نازل ہوتا رہا اور دوسری بات یہ کہ اِسی مہینہ سے نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی۔ اس بیان کے بعد پھر مرض یا سفر کی وجہ سے جو روزے نہ رکھے گئے ہوں اُن کے ادا کرنے کا حکم بتایا گیا ہے۔ اور آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اللہ اپنے کسی بندے سے دور نہیں ہے اور جو بھی اُسے پکارتا ہے اور اُس سے دعا مانگتا ہے وہ اُس کے نزدیک ہی ہوتا ہے اور اگر اُس کی حکمت و مشیت کے منافی نہ ہو تو اُس کی دعا کو قبول فرماتا ہے۔

(درس ۳۶)

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَآئِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ ۖ فَالْـَٔانَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ○ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○

پارہ ۲ رکوع ۷، کی آخری ۲ آیات ۔ سورۃ البقرۃ۔

جائز کر دیا گیا ہے تمہارے لئے روزوں کی رات میں اپنی ازواج کے نزدیک جانا وہ تمہارے لئے لباس ہیں اور تم اُن کے لئے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم خیانت کرتے تھے اپنے نفسوں سے تو اُس نے تمہیں معاف فرمایا اور تم سے درگذر کی پس اب تم اُن سے ملو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا ہے اُس کو تلاش کرو اور کھاؤ اور پیو یہاں تک کہ تم پر صبح کا سفید خط سیاہ خط سے نمایاں ہو جائے پھر رات (ہونے

تک روزہ کو پورا کرو اور جب تم اعتکاف کی حالت میں ہو مسجدوں میں تو اپنی ازواج سے نہ ملو۔ یہ اللہ کے
مقرر کیے ہوئے ضابطے ہیں تو تم اِن سے باہر ہونے کے قریب بھی نہ جانا۔ اللہ اسی طرح اپنی آیتیں صاف
صاف بیان کرتا ہے لوگوں کے لئے تاکہ وہ پرہیزگار بن جائیں۔ اور آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز
طریقہ سے نہ کھاؤ اور نہ اموال کو حاکموں تک پہنچاؤ کہ اِس طریقہ سے لوگوں کے مال کا ایک حصہ تم گناہ کے
ذریعہ سے کھا جاؤ حالانکہ تم علم رکھتے ہو۔

تشریح وتفسیر: "رَفَث" کا لفظ جنسی خواہشات کے لئے بولا جاتا ہے۔ "تَخْتَانُوْنَ" کا مصدر
"اختیان" اور اصلی مادّہ "خَوْنٌ" ہے۔ یہ "خیانت" سے بنا ہے۔ خیانت ونفاق دونوں تقریباً ہم معنی
ہیں مگر محلِ استعمال میں کچھ تھوڑا سا فرق ہے۔ "اختیان" کے معنی عام طور پر اہلِ لغت نے خیانت ہی کے
لکھے ہیں لیکن علامہ راغب اصفہانی نے کہا ہے کہ اس کے معنی خود عملِ خیانت کے نہیں ہیں بلکہ اس سے
ارتکاب خیانت کے لئے اسباب اور حالات کا مہیا کرنا مقصود ہے۔ "خَیط" کے معنی ہیں تاگا، ڈورا، دھاگا
"الخیطُ الابیض" اور "الخیط الاسود" کے معنی ہیں "سفید ڈورا اور سیاہ ڈورا" مگر مراد یہ ہے کہ
روزہ رکھنے کے لئے رات میں اُس وقت تک کھایا پیا جاسکتا ہے کہ فجر کی سفید دھاری رات کی کالی
دھاری سے مشرق کی طرف الگ نظر آنے لگے۔ "عَاکِفُوْنَ فِی الْمَسَاجِد" میں "عکف اور عکوف" کے
اصلی معنی لُزوم وثبات اور دوام کے آتے ہیں اِسی سے اعتکاف بنا ہے جو اِس جگہ مراد ہے۔ شرعی اصطلاح
میں اعتکاف کے معنی ہیں ایسی مسجد میں عبادت کی نیت سے قیام کرنا جہاں نماز جماعت ہوتی ہو، اعتکاف
کے لئے اکثر علماء کے نزدیک روزہ شرط ہے۔ ہر زمانہ میں شرعی ضابطوں کے مطابق اعتکاف کرنا مستحب
ہے اور خصوصیت کے ساتھ ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں "سنّت مؤکدہ" ہے۔ بعض صورتوں میں
یہ واجب بھی ہوجاتا ہے جیسے اگر اِس کی نذر مان لی جائے۔ اِس کی مدّت اور دیگر تفصیلی باتوں اور احکام کی
تشریح فقہی کتابوں میں کر دی گئی ہے۔ "تُدْلُوْا بِھَا اِلَی الْحُکَّامِ" کے جملہ میں "تُدْلُوْا" کا لفظ "دَلْوٌ"
سے بنا ہے۔ یہ مصدر بھی ہے اور اسم بھی ہے۔ جب یہ مصدر ہوتا ہے تو اس کی معنی کنویں میں ڈول ڈالنے
کے بھی آتے ہیں اور کھینچنے کے بھی اور جب اسم ہو تو یہ خود ڈول کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ اسی سے "اِدْلَاءٌ"
کا لفظ نکلا ہے اور اِس کے معنی بھی کنویں میں ڈول ڈالنے کے آتے ہیں۔ پھر مجاز کے طریقہ پر کسی چیز کو کہیں
پہنچانے یا اس کو ذریعہ اور وسیلہ قرار دینے کے ہوگئے ہیں اور جب اِس کے ساتھ "مال" کا ذکر ہو
اور "اِلیٰ" کے لفظ کو بھی ملایا جائے تو صاف طور پر اس سے کسی جگہ مال و دولت پہنچانا مقصود ہوا کرتا
ہے۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ مال کو حکّام تک رشوت یا دوسرے حرام اور غیر شرعی مقاصد کے لئے نہ پہنچایا جائے

اِن آیاتِ کریمہ کے ابتدائی حصّہ میں خدا کے اِس حکم کا اعلان ہے کہ روزوں کی راتوں میں اپنی ازواج کے نزدیک جانا جائز ہے جو اس آیت کے نزول سے قبل ممنوع تھا روزوں کی راتوں سے مراد وہ راتیں ہیں جن کے ختم ہو جانے پر طلوع فجر صبح صادق سے روزہ کی ابتدا ہوتی ہو۔ دوسرے بہت سے اسلامی احکام کی طرح اس حکم کے نفاذ کی بھی تاریخی ترتیب دیکھنے سے یہ حقیقت ظاہر ہو جاتی ہے کہ شریعت اسلام کو ایک دم سے نافذ نہیں کیا گیا بلکہ کثیر باتیں ایسی ہیں جن کے متعلق احکام آہستہ آہستہ اور بتدریج و ترتیب کے ساتھ نازل ہوئے ہیں۔ کہیں تو پہلے حکم سخت تھا پھر کچھ عرصہ کے بعد اُس میں سہولتیں دی گئیں اور اُسے نرم کر دیا گیا۔ اور کبھی پہلے نرم حکم تھا بعد میں اُسے زیادہ سخت کر دیا گیا۔ یہ تغیّر و تبدل اور یہ ترتیب انسانی فطرت کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔ غرض روزہ کی رات سے متعلق اِس اباحت و اجازت کا حکم بھی اِسی نظریہ کے تحت دیا گیا ہے۔ اللہ کے اِس اعلانِ عام سے یہ بات بھی صاف ہو جاتی ہے کہ ازدواجی تعلقات اپنے جائز و حلال اور شرعی حدود کے اندر کمال عبادت و روحانیت اور تزکیۂ نفس کی معیاری سطح کے منافی نہیں ہو سکتے جیسا کہ راہبانہ زندگی کی تعلیم دینے والوں نے بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ وسوسہ بٹھا رکھا ہے۔ اسلام کی نظر صرف اِس بات پر رہتی ہے کہ زندگی کے عام فطری تقاضوں کو اُن معتدل اور جائز و صحیح حدوں کے اندر محدود رکھا جائے جو انسان کے خالق نے اُس کے لئے مقرر کر دی ہیں اور اُن کی خلاف ورزی کسی نوعیت اور کسی بہانہ سے بھی نہ کی جائے۔ یہاں پہلی آیت کے یہ جملے: "كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ" یا "فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ" اور "وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا" وغیرہ اُن ہی حالتوں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جو اس قانون کے تدریجی نفاذ کا باعث ہوئے اور ہو سکتے ہیں۔ اِس سلسلہ میں بہت سی روایتیں لکھی گئی ہیں مگر اُن سب کو اِسی نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہئے کہ یہ سب واقعات اور روایتیں اُن انسانی تقاضوں کی عکّاسی کرتی ہیں جن کے مطابق نفاذِ قانون میں تدریج اور ترتیب ضروری ہوتی ہے۔

اِس کے بعد روزہ کا وقت بتایا گیا ہے کہ وہ طلوع فجر سے شروع ہو کر لیل یعنی رات کے آتے ہی ختم ہو جاتا ہے اور پھر اعتکاف کے حکم کی تشریح فرمائی گئی ہے۔ پھر دوسری آیت میں ایک جامع حکم دیا گیا ہے کہ آپس کے تمام لین دین کے معاملات میں اُن صورتوں کو نہ اختیار کیا جائے جنھیں اللہ نے حرام کر دیا ہے۔ اِس مختصر سی آیت کی بلاغت و جامعیت کی کوئی حد نہیں ہے جس کے گنتی کے چند لفظوں میں انسان کے پورے اقتصادی نظامِ زندگی کا حل بتا دیا گیا ہے۔

مال و دولت سے متعلق صرف دو ہی تصور ہو سکتے ہیں ایک اُس کی تحصیل اور دوسرے اُس کا مصرف

اِس آیت میں ان دونوں باتوں کے لئے ایک جامع قانون بتادیا گیا ہے۔ نہ تو مال و دولت حرام ذریعوں
اور ناجائز وسیلوں سے حاصل کیا جائے اور نہ اُسے ایسے مقاصد کیلئے خرچ کیا جائے جنھیں اللہ نے ممنوع
قرار دیدیا ہے۔ اِن ہی حرام اور ممنوع مصارف میں وہ رقمیں اور تحفے وغیرہ بھی داخل ہیں جو کسی شکل میں
کسی نام سے یا کسی رنگ اور نوعیت سے افسروں، حکام اور ہر قسم کے ذمہ داران حکومت تک بلاواسطہ
یا بواسطہ پہنچائے جائیں۔ چونکہ اِس قسم کے مصارف کی حرمت میں بڑی شدّت ہے اِسی بنا پر مالیات
کے اس جامع حکم کے بیان میں رشوت کی حرمت کی خاص طور پر وضاحت فرما دی گئی ہے۔

(درس ۲۷) يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ وَلَيْسَ
الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِھَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَاْتُوا
الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ○ وَقَاتِلُوْا
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا
يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ○ وَاقْتُلُوْھُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ وَ
اَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ
وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ
قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ۭ كَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ○ فَاِنِ انْتَهَوْا
فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَقٰتِلُوْھُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ
وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَي الظّٰلِمِيْنَ ○

پارہ ۲ رکوع ۸ کی ابتدائی ۵ آیات۔ سورۃ البقرۃ۔

لوگ تم سے نئے چاندوں کے بارے میں سوال کرتے ہیں، کہدو کہ وہ لوگوں کے لئے اور حج کے لئے
اوقات کی پہچان کا ذریعہ ہیں اور یہ بھلائی نہیں ہے کہ تم گھروں میں اُن کی پشت کی طرف سے آؤ البتہ بھلائی
یہ ہے کہ کوئی شخص تقویٰ اختیار کرے اور گھروں میں اُن کے دروازوں ہی سے آؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو
تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ اور تم اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں اور حد سے باہر نہ نکلو۔
بیشک اللہ حد سے باہر نکل جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور انھیں جہاں کہیں پاجاؤ قتل کردو اور
جہاں سے اُنھوں نے تمہیں نکالا ہے تم بھی اُنھیں نکالدو اور فتنہ قتل سے بھی سخت تر ہے اور اُن سے مسجد الحرام
کے قریب قتال نہ کرو جبتک وہ خود اُس جگہ تم سے نہ لڑیں ہاں اگر وہ خود تم سے جنگ کریں تو تم بھی اُن کو
قتل کرو، یہی سزا ہے کافروں کی۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو بیشک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے اور

اُن سے یہاں تک لڑتے رہو کہ فساد باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ ہی کا رہ جائے پھر اگر وہ رُک جائیں تو سختی کسی پر بھی نہیں ہے سوائے ظلم کرنے والوں کے۔

تشریح و تفسیر: عام طور پر "ہِلال" ہر ماہ کی پہلی اور دوسری رات کے چاند کے لئے بولتے ہیں اس کے بعد کے چاند کو "قمر" کہتے ہیں پھر "بدر" چودھویں رات کے چاند کا نام ہے۔ اسی طرح آخری دو تاریخوں یعنی چھبیسویں اور ستائیسویں رات کے چاند کو بھی "ہلال" کہا جاتا ہے "اَہِلَّۃ" کا لفظ اس کی جمع ہے "مَوَاقِیْت" "میقات" کی جمع ہے۔ اس کے معنی کسی چیز کے معین وقت کے ہیں یا اُس وعدہ کے ہیں جس کیلئے کوئی وقت مقرر کیا گیا ہو اور کبھی "میقات" کا لفظ ایسی جگہ کے لئے بھی بولتے ہیں جس کو کسی کام کے لئے معین کیا گیا ہو جیسے میقاتِ حج اُس مقام کو کہتے ہیں جو احرام باندھنے کے لئے مقرر ہے۔ "ثَقِفْتُمُوْهُمْ" "ثقف" سے بنایا گیا ہے۔ اِس کے اصلی معنی کسی کام کو مہارت کے ساتھ کرنے کے آتے ہیں پھر اس کو کسی چیز کے پالینے کے لئے بولنے لگے۔ یہی معنی یہاں بھی مراد ہیں کہ اُن لوگوں کو جہاں پاؤ قتل کرو "ثَقُفَ" کے اصلی معنی ہی کے لحاظ سے "ثَقَافَۃٌ" علم و حکمت اور تہذیب اور واقفیت کے لئے بولتے ہیں "فِتْنَۃٌ" کے کئی معنی ہیں مثلاً عذاب، امتحان و آزمائش، فساد، کفر و شرک وغیرہ۔ یہاں کفر و شرک مراد ہے۔ "عُدْوَان" ظلم و زیادتی کو کہتے ہیں۔ یہاں لفظی ترجمہ یہ ہوا کہ زیادتی اُن ہی لوگوں پر کرنا جائز ہے جو خود ظلم و زیادتی کرتے ہیں مگر اِس سے یہاں پر ظلم کرنے کی سزا دینا مراد ہے خواہ وہ قتل کی صورت میں ہو یا کسی دوسری شکل میں عربی زبان کا ایک خاص طریقہ یہ بھی ہے کہ عمل کی جزا کے ذکر میں وہی لفظ لاتے ہیں جو اُس عمل کے لئے بولا گیا ہو جیسے استہزار، مکر وغیرہ کی سزا میں یہی لفظ قرآن میں جابجا بولے گئے ہیں اور کہا گیا ہے کہ کافروں نے مکاری کی تو اللہ نے بھی اُن کے ساتھ مکر کیا یا اُنھوں نے دین اور اہل دین کی ہنسی اُڑائی تو اللہ بھی ان کے ساتھ استہزار کرتا ہے اور مراد یہ ہے کہ اللہ نے اُنھیں مکر و استہزار کی سزا دی اور اُن پر عذاب نازل فرمایا۔ اِس قسم کا کلام ایک ادبی صنعت اور خوبی ہے اور اس کا نام "صنعتِ مشاکلت" ہے یعنی عمل کی جزا کے لئے وہی لفظ لانا جو خود اُس عمل کے لئے لایا گیا ہو چنانچہ یہاں پر بھی عدوان اور ظلم کی سزا اور سزائے قتل کے لئے "عُدوان" ہی کا لفظ بولا گیا ہے اور مقصود قتل اور ظلم کی سزا ہے

ان آیات میں سب سے پہلے یہ بیان کیا گیا ہے کہ لوگ چاند کی مختلف کیفیتوں اور بدلتے ہوئے حالات کے متعلق دریافت کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ سب کیفیتیں لوگوں کے لئے اُن کے عام ضروریاتِ زندگی میں وقت کی شناخت کا ذریعہ ہیں اور اُن کی عبادتوں کے لئے بھی مقررہ اوقات کے پہچاننے کا وسیلہ ہیں۔ عبادات میں یہاں خاص طور پر حج کا ذکر شاید اس وجہ سے کیا گیا ہے کہ اس کی

عام طور پر بڑی اہمیت تھی۔ قرآن مجید اُن ہی باتوں پر زور دیتا ہے جن کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہو اور جن کے ذریعے سے انسان اپنے کسی شعبۂ زندگی کو بھی فائدہ پہنچا سکتا ہو یہاں قرآن نے چاند کی اصلیت اُس کی ساخت اور اُس کی تخلیق سے بحث نہیں کی بلکہ صرف اُن ہی چیزوں کو بتایا ہے جو آدمی کی روزمرہ زندگی سے متعلق تھیں اور خاص طور پر اس بات کے پوچھنے والوں کے ماحول سے تعلق رکھتی تھیں تاکہ یہ بتا دیا جائے کہ چاند کوئی دیوتا نہیں ہے جو پوجنے کے لائق ہو بلکہ ایک مخلوق ہے اور اُسے اللہ نے انسان کی خدمت کے لئے بنایا ہے۔

اس کے بعد حکم دیا گیا ہے کہ گھروں میں دروازوں کے ذریعے سے آیا کرو۔ اُن کی پشت کی طرف سے آنے میں کوئی نیکی نہیں ہے۔ اِس تعلیم سے مشرکوں کے اس طریقہ کو باطل کیا گیا ہے کہ وہ حج کا احرام باندھنے کے بعد اپنے گھروں میں دروازہ سے نہیں بلکہ مکان کے پیچھے سے یا چھت پر چڑھ کر داخل ہوا کرتے تھے۔ اِس کے علاوہ اِس آیت کے مفہوم سے دو باتیں اور بھی معلوم ہو گئیں۔ ایک یہ کہ ہر کام کو اُسی طریقہ پر کرنا چاہئے جو اُس کے لئے اللہ نے مقرر کر دیا ہے اور دوسرے یہ کہ جس چیز کو اللہ نے جائز کیا ہے اُسے اپنے دل سے ناجائز قرار دینے کا کسی کو بھی حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اِس سلسلہ میں ضمناً اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے کہ اصلی نیکی یہ ہے کہ اللہ کی ناراضی کا دل میں خوف ہو اور اُس کے احکام سے سرکشی و نافرمانی کرنے کی جرأت سے پرہیز کیا جائے اور صرف اُس قانون پر عمل ہو جو اُس نے خود معین و مقرر فرما دیا ہے۔ اِس طرح نیکی کا معیار یہ ہوا کہ اللہ کے حکم اور اُس کے قانون پر عمل کیا جائے اور شر یا بدی یہ ہوئی کہ انسان حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی کرے۔ اِس وضاحت کے بعد یہ بات خود بخود صاف ہو جاتی ہے کہ شر اور بُرائی کا سرچشمہ درحقیقت خود انسان ہی ہے جو اللہ کی نافرمانی کرکے بھلائی کو بُرائی سے بدل دیتا ہے۔ اللہ کے خالق شر ہونے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ اُس کی ذات تو خیر ہی خیر اور کمال ہی کمال ہے اور جو ایسا ہو اُس سے بُرائی کا ظہور ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ ان آیات کا باقی مضمون ان کے بعد کی آیات کے ساتھ آئندہ انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ۭ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۠ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ○ وَاَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ وَاَحْسِنُوْا ۛ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ○ وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَھْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ○

پارہ ۲ رکوع ۸ کی آخری ۳ آیات۔ سورۃ البقرہ۔

حرمت والا مہینہ تو حرمت والے مہینہ کے عوض میں ہوتا ہے اور سب حرمتیں ایک دوسرے کے بدلہ کی چیزیں ہیں تو جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی اُس نے تم پر زیادتی کی ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور سمجھ لو کہ یقیناً اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے اور اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہو اور اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں تباہی میں نہ ڈالو اور نیکی کرتے رہو بیشک اللہ اچھے کام کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو پس اگر تم روک دیئے جاؤ تو جو بھی قربانی کا جانور میسّر ہو (پیش کر دو) اور اپنے سروں کو نہ منڈواؤ جب تک کہ قربانی اپنے مقام پر نہ پہنچ جائے لیکن اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اُس کے سر میں کچھ تکلیف ہو تو اُس پر فدیہ ہے روزوں سے یا خیرات سے یا ذبح سے پھر جب تم امن کی حالت میں ہو تو جو کوئی عمرہ سے فائدہ اُٹھائے اُسے حج کے ساتھ ملا کر وہ جو بھی قربانی میسر ہو کر ڈالے پس جسے قربانی میسر نہ ہو وہ تین دن روزے رکھے حج کے زمانہ میں اور سات روزے جب تم واپس ہو یہ پورے دس روزے ہو گئے۔ یہ حکم اُس شخص کے لئے ہے جس کے گھر والے مسجد الحرام کے نزدیک نہ رہتے ہوں اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب سمجھ لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

اِس وقت کی بیان کردہ آیات سے قبل کی آیتوں میں پہلے چاند کی مختلف حالتوں کا ذکر ہوا تھا

جن سے وقت کی پہچان میں مدد ملتی ہے۔ اسی کے ساتھ حج کی طرف اشارہ بھی تھا اور ضمناً یہ بھی بتایا گیا تھا کہ مشرکوں میں احرام حج باندھنے کے بعد اپنے گھروں میں بجائے دروازہ کے اُن کے پیچھے کی جانب سے داخل ہونے کی جو رسم تھی وہ بالکل بے اصل اور باطل تھی بلکہ گھروں کے اندر دروازہ ہی سے آنا چاہیے اِس سلسلہ میں یہ سمجھایا گیا تھا کہ نیکی اور بھلائی کا معیار صرف یہ ہے کہ اللہ کے مقرر کئے ہوئے قانون پر عمل کیا جائے اور ہر کام اُسی طرح انجام دیا جائے جس طرح اُس نے حکم دیا ہے۔ قانونِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر انسان کو اچھائی اور برائی کا تعین خود کرنے کا حق نہیں ہے۔ اِسی تذکرہ میں مسلمانوں کو کفارِ مکہ سے جنگ کرنے کی اجازت کا ذکر بھی آیا تھا یہ وہ وقت تھا جب ذیقعدہ ۷ھ میں مسلمان معاہدۂ حُدیبیہ کے دوسرے سال عمرہ کی غرض سے مکہ جانے والے تھے۔ اُس وقت یہ ہدایت فرمائی گئی تھی کہ اگر حرمِ خدا میں کفار جنگ کی ابتدا کر دیں تو اُن کے دفاع میں مسلمان بھی جنگ کریں مگر یہ جنگ کسی دنیوی مقصد کے لئے نہ ہو بلکہ صرف دینِ حق کی حفاظت کے لئے ہو اور اُن حدود اور ضوابط کے مطابق ہو جنہیں اللہ نے معین فرمادیا ہے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا تھا کہ اگر اِس کے بعد کفار اپنی حرکتوں سے باز آجائیں یعنی اسلام اختیار کر لیں تو اللہ اُن کے گناہوں کو بخش دے گا۔ اور اگر وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں اور اپنی فتنہ پردازیوں کو نہ چھوڑیں تو اُن سے اُس وقت تک لڑو کہ اُن کا فتنۂ کفر و شرک سرزمینِ حرم میں بالکل باقی نہ رہے اور اللہ کا مقدس گھر اور اُس کے گرد و پیش کی ساری زمین دشمنانِ اسلام کی نجاست سے پاک ہو جائے۔ یہاں ضمنی طور پر اِس بنیادی ضابطہ کی طرف بھی صاف اشارہ ہے کہ مشرکینِ عرب پر "جزیہ" کا حکم جاری نہیں ہو سکتا اور اُن کے لئے اسلام اختیار کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ اس وقت کی زیرِ بحث آیتوں میں بھی اِسی مضمون کا سلسلہ جاری ہے۔ یہاں سب سے پیشتر یہ بتایا گیا ہے کہ کسی مہینہ کی حرمت و عزت تو بس اُسی وقت تک ہے جبکہ دوسرا فریق بھی اُس کا پاس و لحاظ کرے۔ صورتِ حال یہ تھی کہ عربوں میں چار مہینے حُرمت والے سمجھے جاتے تھے یعنی ذیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب۔ ان میں لڑائی بند رہتی تھی اور اکثر و بیشتر ان کا احترام کیا جاتا تھا۔ اِسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ اگر کفار ان مہینوں کا خود سے احترام ترک کر دیں اور مسلمانوں پر جنگ مسلط کر دی جائے تو پھر مسلمان بھی کوئی پروانہ کریں اور پوری شدت کے ساتھ لڑیں۔ یہاں اللہ اور اُس کے پیغمبرؐ کے دشمنوں سے انتقام لینے اور اُن سے دفاعی جنگ کی عام اجازت کے باوجود مسلمانوں کو اِس کی سختی کے ساتھ ہدایت بھی ہے کہ وہ ہر حال میں ظلم اور اللہ کی نافرمانی سے پرہیز رکھیں اور اُن حدوں سے باہر نہ ہوں جو اُس نے مقرر فرما دی ہیں پھر جان کے جہاد کے ذکر کے بعد مال کے جہاد کا بیان ہے اور مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ دین کی راہ میں اور ملتِ اسلامیہ کی جنگی اور

دوسری ضرورتوں میں اپنی دولت خرچ کرنے سے کبھی دریغ نہ کریں اور کنجوسی یا فضول خرچی کرکے اپنی تباہی کو دعوت نہ دیں۔ بیان کے اسی سلسلہ میں حج اور عمرہ کے بعض مسائل کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ سب سے پہلی چیز تو یہی ہے کہ عمرہ اور حج کی تمام عبادتوں میں اخلاص نیّت کا ہونا اور اُنھیں تمام غیر دینی مقاصد سے پاک رکھنا ضروری ہے۔ اِس بنیادی ضابطہ کے بعد اس حکم سے آگاہ کیا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص دشمن کے خطرہ یا بیماری کی وجہ سے حج کے راستہ ہی میں مجبور ہوکر رُک جائے تو اُسے اِس کی اجازت ہے کہ قربانی کا جو جانور اُس کو میسر ہو ذبح کرکے اپنا احرام کھول ڈالے۔ اِس قربانی کا مقام اکثر علماء کے نزدیک وہی جگہ ہے جہاں یہ مجبوری پیدا ہوئی ہو خواہ وہ حرم سے باہر ہی کیوں نہ ہو اور بعض کے نزدیک اِس جگہ سے مراد سرزمین حرم ہے۔ پھر اُن بیماروں کا بیان ہے جنھیں حالتِ احرام میں سر کی حجامت کرانا پڑے اور بتایا گیا ہے کہ ایسے لوگوں کو اس امر کی اجازت ہے مگر اُنھیں اِس کے فدیہ میں تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت اختیار کرنا پڑے گی۔ وہ تین روزے رکھیں یا چھ مسکینوں کو صدقۂ فطر کے مطابق غذا دیں یعنی گیہوں وغیرہ یا قربانی کریں جو کم از کم ایک بکری کی ہونا ضروری ہے۔ اِس کے بعد امن و اطمینان کی صورت حال کا ذکر ہے کہ اگر ایسی حالت میں کوئی شخص ایامِ حج میں عمرہ اور حج دونوں عبادتوں کو انجام دے تو اُس پر قربانی کرنا واجب ہے جو قربانی بھی اُسے میسر ہو۔ پھر اگر کسی شرعی مجبوری کی وجہ سے قربانی سے معذور ہو تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ اِس کے عوض میں زمانۂ حج میں دسویں ذیحجہ سے پہلے تین روزے رکھے اور سات روزے حج سے فراغت کے بعد رکھے۔ اس سلسلہ میں بعض علماء کے نزدیک اپنے وطن کی طرف اِس کی واپسی ضروری ہے اور بعض کے نزدیک ضروری نہیں ہے اِس کے ساتھ ہی فرمایا گیا ہے کہ یہ حکم صرف اُن لوگوں کا ہے جو مسجد الحرام کے نزدیک رہنے والے نہ ہوں اور اکثر علماء کے نزدیک یہ وہی لوگ ہیں جو حدودِ میقات کے باہر رہتے ہیں۔ آخر میں پھر اسی بات پر زور دیا گیا ہے کہ اللہ سے ہمیشہ ڈرتے رہو اور اسے کبھی نہ بھولو کہ اُس کی گرفت اور اُس کی سزا بڑی سخت ہے۔

(درس ۳۹) وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۖ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ۖ وَاِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۚ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۚ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۚ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ۚ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۚ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۱ کی آخری ۲ آیات۔ سورۃ البقرۃ)

اور تم سے لوگ یتیموں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں کہہ دو کہ اُن کی مصلحت کی رعایت کرنا بہتر ہے اور اگر تم اُن کے ساتھ (خرچ) شامل کر لو تو وہ تمہارے بھائی ہی ہیں اور اللہ اصلاح کرنے والے سے الگ فسادی کو خوب جانتا ہے اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مصیبت میں ڈال دیتا بے شک اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے۔ اور تم مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں اور یقیناً ایماندار کنیز بہتر ہے مشرک (آزاد) عورت سے اگرچہ وہ تمہیں پسند ہو اور اپنی عورتوں کو بھی مشرکوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ لوگ ایمان نہ لائیں اور بے شک ایماندار غلام تک بہتر ہے (آزاد) مشرک شخص سے اگرچہ وہ تم کو پسند ہو۔ وہ لوگ دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اللہ جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے اپنے حکم سے اور لوگوں سے اپنے احکام صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

تشریح وتفسیر: "یَتٰمٰی" "یتیم اور یتیمہ کی جمع ہے جبکہ" ایتام" صرف "یتیم" کی جمع آتی ہے انسانوں میں یتیم اور یتیمہ اُس لڑکے یا لڑکی کو کہتے ہیں جو ابھی بلوغ کی حد تک نہ پہنچے اور اُس کا باپ مرجائے پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اُسے یتیم نہیں کہا جائیگا۔ جانوروں میں یتیم اُس بچہ کو کہتے ہیں جسکی ماں مرگئی ہو۔ انسان کے جس بچہ کے ماں باپ دونوں مرگئے ہوں اُسے عربی میں "لَطِیْم" اور جس انسانی بچہ کی صرف ماں مرگئی ہو اُسے "عَجِیّ" کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اردو زبان میں "یسیر" کا لفظ اُس کمسن انسانی بچہ کے لئے بولتے ہیں جس کی ماں مرگئی ہو مگر یہ خالص اردو محاورہ ہے جبکہ اس لفظ کے عربی زبان میں اصلی معنی قلیل اور آسان کے ہیں۔ لفظ "یتیم" کا مصدر "یُتم اور یَتم" آتا ہے۔ "یتیم" کبھی اُس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کی کوئی نظیر اور مثل نہ ہو جیسے "دُرِّ یتیم" یعنی بے مثل موتی۔ یا "یَتِیمَۃُ الدَّھر" یعنی یگانۂ روزگار

"اَعْنَتَ" کا مادّہ "عَنَتٌ" ہے اور مراد ہے کسی کو تکلیف یا مصیبت میں مبتلا کرنا۔ "اَعْجَبَتْکُمْ" میں "اِعْجَاب" کا اصلی مادّہ "عَجَبٌ" ہے۔ "اعجاب" اسی سے بنا ہے اور معنی ہیں دلکشی ظاہر کرنا یا غرور و تکبر پیدا کرنا۔ یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔

جہاں تک یتیموں کے معاملات کا تعلق ہے اسلام نے اُن کی تربیت اور اُن کے حقوق کی حفاظت کے وہ تمام انتظامات کر دئے ہیں جو ممکن ہو سکتے تھے اور اگر اس سلسلہ میں اسلامی تعلیم پر پوری طرح عمل کیا جائے تو کوئی یتیم بچہ ایک لمحہ کے لئے بھی اسے محسوس نہ کر سکے کہ اُس کے سر پر اس کا شفیق باپ موجود نہیں ہے۔ مکہ میں اعلانِ اسلام سے پہلے عرب معاشرہ میں یتیموں کی کوئی جگہ نہ تھی یہاں تک کہ وہ اپنے باپ کے ترکہ سے بھی محروم رکھے جاتے تھے۔ یتیموں کی فلاح و بہبود کے لئے اسلام ہی کی کوششوں کا یہ نتیجہ ہے کہ آج ساری دنیا کو اُن سے ہمدردی کا احساس پیدا ہو گیا ہے اور ہر ملک میں یتیم خانے پائے جاتے ہیں لیکن یہ تاریخ کی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلانِ نبوت سے قبل دنیا میں کہیں بھی کوئی یتیم خانہ اور یتیموں کے لئے تربیتی مرکز موجود نہ تھا جبکہ مسلمانوں کا ہر گھر یتیموں کی پناہ کے لئے کھلا ہوا تھا اور ہر مسلمان اُن کی خدمت کرنے کو اللہ کی عبادت سمجھتا تھا۔ یہ سب کچھ اسلامی تعلیم کی برکت تھی جس نے اِس بے کس طبقہ کو مایوسی اور ذلت کے گہرے غار سے نکال کر انسانی معاشرہ کا سر تاج بنا دیا۔ قرآن حکیم نے کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے "فَاَمَّا الْیَتِیْمَ فَلَا تَقْهَرْ" (پارہ ۳۰ رکوع ۱۸ سورۃ الضحیٰ) تم کبھی کسی یتیم پر قہر و ظلم نہ کرنا اور دوسری جگہ فرمایا ہے کہ جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طریقہ پر کھاتے ہیں وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے (النساء پ ۴ رکوع ۱۲) اللہ نے قرآن حکیم میں لفظ یتیم کو کائنات میں سب سے افضل ہستی یعنی خود حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے بول کر یتیموں کے مرتبہ کو اس قدر اونچا کر دیا ہے کہ اب اسلامی معاشرہ میں اِس لفظ کے ساتھ احساس کمتری کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ "اَلَمْ یَجِدْکَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی" (الضحیٰ پارہ ۳۰ رکوع ۱۸) کیا اللہ نے (اے رسول) تم کو یتیم پا کر پناہ نہیں دی۔ اِن آیات میں جنہیں ابتدا میں لکھا گیا تھا یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا ذکر ہے اور اس کا حکم دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کی ولائت و سرپرستی میں یتیم بچوں کی پرورش ہو رہی ہو اُنھیں چاہئے کہ وہ ہر حال میں یتیموں کے مال اور جائداد کے لئے اور خود اُن بچوں کے لئے جو بہتر اور مناسب تر صورت ہو اُسے اختیار کریں اور اُنھیں کبھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کریں اگر بہتری اِس میں ہو کہ یتیموں کے مال کو اپنے مال سے الگ رکھیں تو اس پر عمل کریں اور اگر اُنھیں اپنے ساتھ شریک رکھنے میں یتیموں کا فائدہ ہو تو حقیقی بھائیوں کی طرح اُنھیں اپنا شریک بنا لیں غرض اُنھیں نفع پہنچانے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہیں اور اس کام میں ذرہ برابر کوتاہی

نہ کریں یتیموں کے متعلق یہ حکم دے کر پھر مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح کرنے کا حکم بیان کیا گیا ہے کہ یہ کسی طرح بھی مسلمانوں کے لئے جائز نہیں ہے۔ نہ مسلمان مرد مشرک عورتوں سے نکاح کر سکتے ہیں اور نہ مسلمان عورتیں مشرک مردوں سے یہاں فرمایا گیا ہے کہ ایک ایماندار کنیز بھی ہر قسم کی مشرک آزاد عورت سے افضل ہے اور ایک ایماندار غلام بھی بڑے سے بڑے مشرک مرد سے بہتر ہے۔ یہ حکم اُس وقت تک ہے جب تک مُشرک لوگ ایمان نہ لے آئیں۔ ظاہر ہے کہ ایمان لانے کے بعد پھر یہ ممانعت باقی نہ رہے گی۔ یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک مشرکین اور مشرکات سے مراد ہر قسم کے کافر ہیں چاہے وہ بُت پرست ہوں یا اہل کتاب ہوں مگر بعض کے نزدیک صرف اہل کتاب عورتیں اس حکم سے مستثنیٰ اور الگ ہیں بشرطیکہ وہ صحیح معنی میں اہل کتاب ہوں۔

(درس ۴۰)

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ○ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ○ وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۲ کی ابتدائی ۴ آیات ۔ سورۃ البقرۃ)

اور تم سے لوگ عورتوں کی ہر مہینہ کی خاص عادت کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہدو کہ وہ نجاست ہے پس تم اس حالت میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور جبتک وہ طاہر نہ ہو جائیں اُن سے نزدیکی اختیار کرو۔ پھر جب وہ طاہر ہو جائیں تو اُن کے پاس جاؤ جہاں سے اللہ نے تمہیں اجازت عطا کی ہے۔ بیشک اللہ دوست رکھتا ہے توبہ کرنے والوں کو اور دوست رکھتا ہے پاک صاف رہنے والوں کو۔ تمہاری ازواج تمہاری زراعت ہیں تو تم اپنی زراعت میں جس طرح چاہو جاؤ اور اپنے حق میں آئندہ کے لئے (نیک) عمل کرتے رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ تم اُس سے ضرور ملنے والے ہو اور (اے رسول) تم ایمان والوں کو خوشخبری سنا دو اور (مسلمانو) تم اللہ (کے نام) کو اپنی قسموں (کے ذریعہ) سے نیک سلوک اور پرہیزگاری کرنے اور لوگوں کے

درمیان صلح کرا دینے کے لئے مانع نہ ٹھہراؤ اور اللہ سب کچھ سنتا جانتا ہے۔ تمہاری قسموں میں مہمل (قسم) پر اللہ تم سے مواخذہ نہیں کرے گا البتہ تم سے اُن قسموں پر مواخذہ کرے گا جن کا تمہارے دلوں نے قصد کر لیا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا بردبار ہے۔

تشریح و تفسیر: "فَاعْتَزِلُوا" عزل، سے بنایا گیا ہے اس کا مصدر 'اعتزال' ہے جس کے معنی علیحدہ ہونے اور کنارہ کش ہو جانے کے ہیں۔ "تَطَهَّرْ" طُهر سے بنا ہے اور معنی ہیں کامل طور پر پاکیزگی حاصل کرنا۔ "تَوَّاب" کا لفظ جب خدا کے لئے بولتے ہیں تو اس سے توبہ کو قبول کرنے والا مراد ہوتا ہے اور جب بندوں کے لئے بولتے ہیں تو وہاں توبہ کرنے والا مقصود ہوتا ہے۔ "حَرْث" کا لفظ جب "مصدر" ہو تو اسے زمین میں بیج ڈالنے اور اُسے کھیتی کے لئے تیار کرنے کے لئے بولتے ہیں اور جب اس "اسم" مراد ہو تو خود کھیتی اور زراعت مقصود ہوا کرتی ہے۔ "عُرْضَةً" کے مشہور معنی ہدف اور نشانہ کے ہیں اور اسی کی مناسبت سے اکثر مفسرین نے اس کو مانع اور حجاب کے معنی میں لیا ہے۔ "لَغْو" بے معنی، مہمل اور باطل کلام کو کہتے ہیں "لغو قسم" سے جس کا بیان کردہ آیت میں ذکر ہے، مراد وہ قسم ہے جو بے خیالی اور غیر ارادی طور پر منہ سے نکل جائے جس طرح کچھ لوگوں کا تکیہ کلام ہوتا ہے کہ وہ بغیر مقصد کے بار بار قسم کے لفظ بولتے رہتے ہیں۔ اسی طرح غصہ کی حالت میں لوگ قسمیں کھانے لگتے ہیں۔ اِس قسم کی قسموں میں کوئی پختگی اور واقعی قصد و عزم کا وجود نہیں ہوتا۔ اِس طرح کی تمام قسمیں جو بے اختیار زبان پر آجائیں اور اُن میں قصد و ارادہ شامل نہ ہو اُن پر کوئی مواخذہ نہیں کیا جائے گا۔ مواخذہ صرف اُن قسموں پر ہوگا جو قصد و ارادہ کے ساتھ زبان پر آئیں۔ اِس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اگرچہ تکیۂ کلام کی سی بے ارادہ و بے مقصد قسموں پر کوئی شرعی مواخذہ نہیں ہے لیکن بہر حال یہ عادت مذموم ہے اور اس کو دفع کرنے کی کوشش کرنا ضروری ہے۔

بیان کردہ آیات کی ابتداء میں عورتوں کے لئے کچھ خصوصی احکام کا بیان ہے اور اس سلسلہ میں جس "اعتزال" یعنی کنارہ کشی کا حکم دیا گیا ہے اُس کا تعلق محض ازدواجی مقاصد سے ہے، نہ کہ عام معاشرتی زندگی سے جیسا کہ بعض دوسری قوموں نے اِس میں بے حد مبالغہ آمیزی سے کام لیکر اور اس "اعتزال" کو وسعت دیکر عورت کی زندگی کے ہر پہلو تک پھیلا دیا ہے۔ اسلام نے ایسا نہیں کیا بلکہ اِس امتناعی حکم کو بڑی حد محدود رکھا ہے اور یہی ایک عادلانہ معاشرتی نظام کا تقاضا بھی ہے۔ اللہ نے مرد اور عورت کو پیدا کیا ہے اور اُن کی فطرت میں ازدواجی زندگی کی قدریں داخل کی ہیں اس لئے یہ بات بھی ضروری تھی کہ وہ اپنی رحمت کاملہ سے ہمیں ان امور میں اپنی مشیت اور اپنے احکام سے بھی آگاہی عطا فرمائے۔ اِسی لئے قرآن حکیم میں ہماری زندگی

کے ان تمام پہلوؤں کی وضاحت کردی گئی ہے اس کے ساتھ ہی یہ فرمایا کہ "اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے" اِس کی وضاحت کردی گئی کہ اسلام کے نزدیک انسان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ ہر وقت اپنی نجاستوں، برائیوں، کمزوریوں اور غلطیوں پر کامل احتساب رکھے اور انھیں دور کرنے کی کوشش کرتا رہے تاکہ اُس کی فردِ حساب خدا کے سامنے صاف اور بے داغ رہے۔ یہاں جس طہارت اور پاکیزگی کی تعلیم دی گئی ہے اُس میں مادّی اور روحانی، ذہنی اور اخلاقی، عملی، انفرادی اور سماجی اجتماعی اور ہر طرح کی تطہیر اور پاکیزگی شامل ہے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ نیک کاموں کو ترک کرنے کے لئے اللہ کی قسم کھانا اور اُس قسم کو اس بات کا حیلہ بنانا کہ نیکیاں چھوڑ دی جائیں، کسی طرح جائز نہیں ہے۔ نیک باتوں کا ترک کرنا یوں ہی کیا کم بُرا ہے چہ جائیکہ اس پر اللہ کی قسم کھانا حد سے زیادہ بُرا ہے۔ اور اگر اس طرح کی کوئی قسم کھائی گئی ہے تو اس کے خلاف عمل کرنا اور اُس کا توڑنا ضروری ہے۔

یہاں اس کی طرف بھی صاف اشارہ ہے کہ بلا ضرورت اور کثرت کے ساتھ اللہ کی قسم نہ کھانا چاہئے۔ اس لئے کہ اس عمل سے اللہ کے پاک ناموں کی سبکی اور بے عزتی ہوتی ہے۔ ہاں جس موقع پر اس کی ضرورت ہو اور قسم کھانے کا پوری طرح جواز موجود ہو تو وہاں قسم کھانے میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا گیا ہے کہ اگر غفلت کی حالت میں اور بغیر قصد و ارادہ کے خواہ عادت کی بنا پر یا کسی اور غیر شعوری طریقہ پر منہ سے غلط قسم نکل جائے تو اُس قسم پر کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ مواخذہ اور گرفت دنیا اور آخرت میں صرف ایسی ہی قسموں پر ہے جن میں جھوٹ کی آمیزش جان بوجھ کر کی گئی ہو۔

(درس)

لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ۭ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ۭ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۲ کی آخری ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

جو لوگ قسم کھا بیٹھتے ہیں اپنی ازواج کے پاس جانے سے، اُن کے لئے چار مہینے کی مہلت ہے، پس اگر یہ لوگ رجوع کرلیں تو اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ اور اگر طلاق ہی کا پختہ ارادہ کرلیں تو بیشک اللہ بڑا سننے والا

بڑا جاننے والا ہے اور طلاق والی عورتیں اپنے کو تین میعادوں تک روکے رہیں اور اگر وہ عورتیں اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو اُن کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اُس کو پوشیدہ رکھیں جو کچھ اللہ نے اُن کے شکم میں خلق فرمایا ہے اور اس مدت میں اُن کے شوہر انھیں واپس لے لینے کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں۔

اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جس طرح مردوں کے اُن پر حق ہیں، دستور کے مطابق اور مردوں کو عورتوں پر فضیلت حاصل ہے اور اللہ بڑا زبردست بڑا حکمت والا ہے۔

"تشریح و تفسیر": "یُؤلُون" کا مصدر "ایلاء" ہے۔ اس کا اصلی مادہ "اَلْوٌ" ہے۔ قسم کھانے کو کہتے ہیں۔ "اَلِیَّۃٌ" خود قسم کے معنی میں بولتے ہیں۔ "ایلاء" سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی زوجہ کو ضرر پہنچانے کی نیت سے اس کی قسم کھالے کہ وہ اُس کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کی شرطیں اور پوری تفصیل شریعت کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ "تَرَبُّص" "انتظار کرنے کو کہتے ہیں۔ "فَآءُوْ" کا مصدر "فَیْءٌ" ہے اور معنی ہیں لوٹ آنا یا رجوع کرلینا۔ "بَعْلٌ" کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ ایک معنی شوہر کے ہیں وہی یہاں مراد ہیں۔ "بُعُوْل" اس کی جمع ہے۔ "معروف" سے مراد ہر وہ قول یا فعل ہے جس کی خوبی عقل اور شریعت سے ثابت ہو۔ بیان کردہ آیات کی ابتدا میں "ایلائے شرعی" کا حکم بیان ہوا ہے۔ جاہلیت کے زمانہ میں عربوں میں رواج تھا کہ وہ اپنی بیویوں سے ازدواجی تعلق ترک کردینے کی قسم کھالیا کرتے تھے اور فوراً ہی ہمیشہ کے لئے اُن کے تمام حقوق سے بھی دستبردار ہو جایا کرتے تھے۔ اس طرح اُن کی یہ "قسم" اُن کے رشتۂ زوجیت کو دائمی طور پر توڑ دینے کے برابر تھی۔ اس ظالمانہ رسم سے عموماً گھریلو زندگیاں تباہی کا شکار ہوتی رہتی تھیں اور خاص طور پر عورتوں کی صنف کو بے پناہ نقصان پہنچتا تھا۔ اسلام نے انھیں بتایا کہ یہ طریقہ انسانیت سوز اور غلط ہے اس سے رشتۂ زوجیت ختم نہیں ہو جاتا۔ ساتھ ہی ایسے جامع اصول مقرر کردیئے جن کی وجہ سے اس "قسم" کے نقصانات اور بُرے نتائج سے مکمل بچاؤ ممکن ہو گیا۔ مثلاً ایسی صورت میں جبکہ یہ "قسم" چار ماہ کی مدت سے کم کے لئے ہو تو اسلام نے اس قسم پر باقی رہنے کی بھی اجازت دی ہے اس شرط کے ساتھ کہ اس میں کسی طرح کی عقلی اور شرعی خرابی نہ ہو پھر اس مدت کے پورا ہو جانے کے بعد ازدواجی حقوق کی ادائگی پر پابندی خود بخود اُٹھ جاتی ہے اور اس طرح رشتۂ زوجیت میں کسی قسم کا کوئی خلل اس "قسم" سے پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس "قسم" کو توڑ کر کفارہ ادا کر دیا جائے۔ ہر صورت میں رشتۂ نکاح اس سے متاثر نہ ہو سکے گا۔ دوسری حالت میں یعنی جبکہ اس "قسم" کی مدت زیادہ ہو تو صرف چار ماہ تک اس کی پابندی کی جائے گی بشرطیکہ اسے کفارہ ادا کرکے توڑ نہ دیا گیا ہو اور اس کے باقی رکھنے کا عقلی اور شرعی جواز بھی موجود ہو۔ اکثر علماء کے

نزدیک چار مہینہ کی مدت گزرتے ہی مرد کو اپنی اس زوجہ کی طرف یا رجوع کرنا پڑے گی یا پھر اُسے طلاق دینا ضروری ہوگا اور بعض کے نزدیک اِس مدت کا گزر جانا ہی طلاق کے برابر ہو جائے گا لیکن ہر حالت میں چار ماہ تک عورت محض اس قَسَم کی وجہ سے رشتۂ زوجیت سے الگ نہیں قرار دی جا سکتی۔ غرض اسلام کی مقرر کی ہوئی یہ چار ماہ کی مدت اس قدر کافی ہے کہ اس میں مرد اور عورت دونوں اپنے ازدواجی رشتہ کو باقی رکھنے اور بہتر بنانے کے لئے پوری طرح ٹھنڈے دل سے غور و فکر کر کے کوئی کوئی مستقل فیصلہ کرنے کے اہل ہو سکتے ہیں اور جلدی یا غصّہ کی کیفیت میں کسی ہنگامی اقدام سے جو برے نتائج ممکن ہیں ان سے محفوظ رہ سکتے ہیں اس طرح اسلام نے "ایلاء" یعنی زوجہ سے بے تعلقی کی قَسَم کے غیر محدود نفاذ کو روک دیا اور اُس کے لئے ایسے جامع اصول اور حدود مقرر کر دیئے جن سے ازدواجی زندگیاں ہر قسم کی بدنظمی، خرابی اور بے اعتدالی سے محفوظ ہو گئیں اور مرد و عورت دونوں کو اپنا بہتر مستقبل تعمیر کرنے کا موقع حاصل ہو گیا۔ "ایلاء" کا حکم بیان فرما کر پھر طلاق کے احکام بیان کئے گئے ہیں۔ یہاں صرف اُن ہی عورتوں کی طلاق مراد ہے جو آزاد ہوں یعنی کنیز شرعی نہ ہوں اور سنِ بلوغ تک پہنچ چکی ہوں اسی طرح بعض دیگر شرطیں بھی اُن میں موجود ہوں جن کا تفصیل کے ساتھ شریعت کی کتابوں میں ذکر کر دیا گیا ہے۔

دوسری قسم کی عورتوں کے ان احکام کو قرآن پاک میں اور جگہ بیان فرمایا گیا ہے طلاق پانے کے بعد ایک خاص مدت مقرر ہے جسے پورا کئے بغیر عورت دوسرا نکاح نہیں کر سکتی مگر مرد کو اُس میعاد کے اندر اکثر صورتوں میں نکاح کی تجدید کئے بغیر عورت کی طرف رجوع کر لینے کا اختیار ہوتا ہے اور بعض صورتوں میں یہ حق نہیں بھی ہوتا۔ اسی مدت کو "عدت" کہا جاتا ہے۔ جس طلاق کے بعد عورت کی "عدت" کے زمانہ میں مرد کو اُس کی طرف رجوع کا اختیار دیا گیا ہے اُسے طلاق رجعی اور جس میں یہ حق نہ ہو اُسے طلاقِ بائن کہتے ہیں۔ طلاق کے بعد "عدت" کے تقرر میں اللہ کی بہت سی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں مثال کے طور پر مرد و عورت دونوں کو اپنے مستقبل پر پوری طرح غور کرنے کا جو موقع مل جاتا ہے یا اولاد کے حکم میں ہونے اور نہ ہونے کا پتہ چل جاتا ہے اسی طرح کی اور مصلحتیں بھی ہیں۔ ان آیات میں عورتوں کے جس طبقہ کا ذکر ہے اُن کے زمانۂ "عدت" کے لئے بتایا گیا ہے کہ یہ اُس مدت کا نام ہے جس میں اُن کی ہر مہینہ کی خاص عادت کا تین پے در پے وقفوں میں عادت کے مطابق ظہور ہو جاتا ہو۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اس مدت کے اندر مرد کو اس کا حق ہے کہ وہ عورت کی طرف رجوع کرلے مگر ساتھ ہی یہ بات بھی سمجھا دی گئی ہے کہ اگرچہ قانونی حیثیت سے مرد کو رجوع کا حق حاصل ہے مگر اس رجوع کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ اب اچھا سلوک کیا جائے اور ازدواجی تعلقات میں بہتری اور اصلاح کی بھرپور کوشش ہو نہ یہ کہ اس رجوع سے مزید تلخی پیدا

کی جائے اور غیر اخلاقی مقاصد کے حصول کی سعی کی جائے مثلاً عورت کو ناجائز دباؤ میں رکھنا، اُس سے زبردستی مہر معاف کرانا یا اُس پر ظلم کرنے کا کوئی نیا راستہ تلاش کرنا مقصود ہو کیونکہ ایسی صورت میں قانونی طور پر رجوع تو صحیح ہو جائے گی مگر مرد اللہ کے گناہ اور ناراضی سے نہیں بچ سکتا۔ آخر میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ شوہر کہیں اِس خیالِ خام میں نہ رہیں کہ اُن کی بیویوں پر اُن کے بس حق ہی حق ہیں اور بیویوں کا کوئی حق خود اُن پر نہیں ہے۔ اِسی طرح بیویاں بھی اِس خوش فہمی میں مبتلا نہ ہوں کہ مردوں ہی پر اُن کے سب حق ہیں اور خود اُن پر کوئی فرض اور ذمّہ داری مردوں کی طرف سے عائد نہیں ہوتی۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ ہر صنف پر کچھ ذمّہ داریاں بھی ہیں اور دوسرے پر اُس کے کچھ حق بھی ہیں جنھیں سمجھنا اور پورا کرنا ہر صنف کے لئے ضروری ہے۔ اِس کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ حقوق و فرائض کے اس طرح ایک سطح پر ہونے کے باوجود مرد کو عورت پر بہر حال کچھ ترجیح اور فضیلت ضرور عطا کی گئی ہے۔ حسّی و تکوینی شواہد و دلائل سے اِس ارشادِ خداوندی کی پوری طرح وضاحت کی جا سکتی ہے مگر اِس سلسلہ میں ہمارے لئے صرف اسی قدر جان لینا کافی ہے کہ یہ فرمان اُس بلند و برتر ہستی کا ہے جو اِن دونوں صنفوں کی اور ساری کائنات کی پیدا کرنے والی ہے اور اُن کی خوبیوں اور کمزوریوں کو اور اُن کے باہمی پیدائشی تناسب کو اُس سے بہتر کون جان سکتا ہے۔

(درس ۴۴) اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاکٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِیْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَیْتُمُوْھُنَّ شَیْئًا اِلَّآ اَنْ یَّخَافَآ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ ؕ تِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ فَلَا تَعْتَدُوْھَا ۚ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ ○ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا تَحِلُّ لَہٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰی تَنْکِحَ زَوْجًا غَیْرَہٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَھَا فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَآ اَنْ یَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ یُّقِیْمَا حُدُوْدَ اللّٰہِ ؕ وَتِلْکَ حُدُوْدُ اللّٰہِ یُبَیِّنُھَا لِقَوْمٍ یَّعْلَمُوْنَ ○ وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَھُنَّ فَاَمْسِکُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْھُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَلَا تُمْسِکُوْھُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَہٗ ؕ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰیٰتِ اللّٰہِ ھُزُوًا ۫ وَّاذْکُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَیْکُمْ مِّنَ الْکِتٰبِ وَالْحِکْمَۃِ یَعِظُکُمْ بِہٖ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰہَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۳ کی ۳ آیاتِ کریمہ بسورۃ البقرۃ)

طلاق (رجعی) تو دو ہی مرتبہ ہے اس کے بعد یا تو دستور کے موافق روک لینا ہے یا پھر حسنِ سلوک کے ساتھ چھوڑ

دینا ہے اور تمہارے لئے جائز نہیں ہے کہ تم جو کچھ اُنھیں دے چکے ہو اُس میں سے کچھ واپس لے لو مگر جبکہ دونوں
کو اِس کا ڈر ہو کہ وہ اللہ کے ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے پھر اگر تم کو اِس بات کا خوف ہو کہ وہ دونوں اللہ کے
ضابطوں کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو اُس مال میں دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا جسے دے کر عورت اپنی جان چھڑا لے
یہ سب اللہ کے ضابطے ہیں تو ان سے باہر نہ نکلنا اور جو کوئی اللہ کے ضابطوں سے باہر نکل جائے گا تو ایسے ہی
لوگ ظلم کرنے والے ہیں پھر اگر (تیسری بار) کوئی اپنی بیوی کو طلاق دیدے تو وہ اُس پر اب حلال نہ رہے گی
جبتک اِس مرد کے سوا کسی دوسرے شخص سے نکاح نہ کرلے پس اگر وہ دوسرا مرد بھی اسے طلاق دیدے تو
(عدت گذرنے کے بعد) اِن دونوں پر کچھ گناہ نہ ہوگا اگر یہ دونوں (دوبارہ نکاح کرکے) پھر باہم مِل کریں
اگر ان دونوں کو یہ گمان ہو کہ یہ اللہ کی حدوں کو قائم رکھ سکیں گے۔ یہ اللہ کے (مقرر کئے ہوئے) ضابطے
ہیں انھیں وہ صاف صاف بیان کرتا ہے اُن لوگوں کے لئے جو علم رکھتے ہیں اور جب تم نے اپنی عورتوں کو
طلاق دی ہو اور وہ اپنی عدت گذرنے کے قریب پہنچ جائیں تو (اب یا تو) اچھے عنوان سے اُنھیں روک لو
یا اچھے طریقہ پر اُنھیں آزادی دیدو اور اُنھیں اذیت پہنچانے کے لئے نہ روکو تاکہ اُن پر زیادتی کرنے لگو اور
جو کوئی ایسا کرے گا تو وہ اپنی جان پر ظلم کرے گا اور اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ ٹھہراؤ اور اللہ کا جو احسان
تم پر ہے اُسے یاد کرو اور اُس کتاب وحکمت کو بھی جو اُس نے تم پر اتاری ہے کہ اُس سے وہ تمہیں نصیحت
کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ ہر چیز کو ضرور جانتا ہے۔

تشریح وتفسیر: "تسریح" کے معنی ہیں رہائی دینا، چھوڑ دینا۔ یہ "سرح" کے لفظ سے بنایا گیا ہے۔
"جُناح" جیم پر پیش کے ساتھ گناہ کے معنی میں بولتے ہیں جبکہ "جَناح" جیم پر زبر کے ساتھ طائر کے
بازو کو کہتے ہیں جس کی مدد سے وہ پرواز کرتا ہے اسی طرح انسان کے بازو، ہاتھ اور پہلو کو بھی کہتے ہیں
اس کے علاوہ "جَناح" کا لفظ لشکر کے بازو یعنی اُس کا "میمنہ یا میسرہ" نیز حفاظت، حمایت، پناہ، امان
سرپرستی اور بچاؤ کے لئے بھی بولتے ہیں اور کبھی پناہ گاہ، مقام امن اور خود پشت پناہ، حمایتی اور سرپرست
کے معنی میں بھی آتا ہے۔ بیان کردہ آیات میں یہ لفظ جیم پر پیش کے ساتھ ہے جس کے معنی
یعنی جرم یا گناہ کے ابھی بیان کئے جا چکے ہیں۔ "اِفتِدَاءٌ" کے معنی ہیں اپنے کو کسی کی قید یا گرفت سے
کچھ مال دے کر چھڑا لینا۔ اس مقصد کے لئے مال یا جو چیز بھی دی جائے اُس کو "فِدیۃ" کہتے ہیں۔ "اِعتِدَاء"
اور "تَعَدّی" حد سے نکل جانے کو کہتے ہیں۔ "ضِرَارٌ" ضر سے بنا ہے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانا اور اذیت
دینا۔ "ھُزُوٌ" ہنسی اڑانے کے لئے بولتے ہیں۔ "اِستِہزَاء" بھی اسی معنی میں بولا جاتا ہے۔
جاہلیت کے زمانہ میں یہ دستور تھا کہ زوجہ کو جتنی بار چاہتے تھے لوگ طلاق دیدیا کرتے تھے اور ہر مرتبہ

عدت کی میعاد گذرنے سے پہلے ہی رجوع کر لیتے تھے اور اس طرح عورتوں کو ہمیشہ اذیت دیتے رہتے تھے
اسلام نے عورتوں کی صنف کو اس شدید کرب و تکلیف اور ظلم و ستم سے نجات عطا کی اور حکم دیا کہ اس طلاق کی حد
جس میں رجوع کرنا زمانۂ عدت میں مرد کے لئے جائز ہے صرف دو بار ہے یعنی دو مرتبہ طلاق واقع ہونے تک
تو یہ حقِ رجوع باقی رہتا ہے مگر تیسری طلاق کے بعد پھر یہ اختیار اور حق باقی نہیں رہتا اور مرد زمانۂ عدت
میں عورت کی طرف رجوع نہیں کر سکتا۔ اس طرح پہلی طلاق اور پھر آخری طور پر دوسری طلاق کے بعد مرد کو
دو قسم کے اختیار حاصل تھے کہ وہ یا تو عدت کے وقفہ میں عورت کی طرف رجوع کرے یا رجوع نہ کرے اور
عدت کو پورا ہو جانے دے جس کے بعد اگر مصالحت ممکن ہو تو پھر اسی عورت سے دوبارہ نکاح کر لے
لیکن تیسری طلاق کے بعد مرد نہ تو زمانۂ عدت میں عورت کی طرف رجوع ہی کر سکتا ہے اور نہ عدت گذرنے
کے بعد اُس سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے جبتک وہ عورت کسی دوسرے شخص سے شرعی دستور کے مطابق
نکاح نہ کر لے اور ازدواجی مقاصد کا نفاذ نہ ہو جائے اور ساتھ ہی اُس دوسرے مرد سے طلاق پا کر
عدت کی میعاد بھی نہ پوری ہو جائے۔ اس میں ایک خصوصی شرط یہ بھی ہے کہ دوسرا نکاح اور اُس کے بعد
طلاق کا حصول اس مخصوص غرض کے لئے نہ ہو کہ عورت کو پہلے شوہر کے لئے حلال اور جائز کر دیا جائے ایسا
کرنے والوں پر کھلے ہوئے لفظوں میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لعنت فرمائی ہے یعنی ایسے لوگوں
کے لئے جو واقعی طور پر نکاح کا ارادہ نہ رکھتے ہوں اور اُن کا طلاق دینا بھی واقعی حالات پر مبنی نہ ہو بلکہ
یہ سب کچھ پیشہ ورانہ ذہنیت اور طریقہ پر عمل میں آئے اور ساتھ ہی اُن لوگوں پر بھی لعنت کی گئی ہے جن کیلئے
یہ کام انجام دیئے جائیں۔ "اِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ أَوْ تَسْرِيحٌ بِإِحْسَانٍ" سے مراد یہ ہے کہ اگر مرد پہلی یا دوسری
طلاق کے بعد عورت کی طرف زمانۂ عدت میں رجوع کرے تو اس سے اُس کا مقصود اصولِ شریعت کی پابندی
اور حسنِ معاشرت پر عمل کرنا ہو نہ یہ کہ اذیت اور تکلیف پہنچانا اور من مانی کارروائیوں کے لئے اُس کو غیر اخلاقی
دباؤ میں اور قانونی گرفت میں مبتلا رکھنا۔ ایسا ہرگز نہ ہونا چاہئے اور اگر مرد رجوع نہ کرے تو دوسرا طریقہ یہ ہوگا
کہ وہ عورت کو خوشگوار اور باعزت صورت سے رخصت کر دے تاکہ وہ عدت کے بعد کسی دوسرے سے
یا پھر خود اسی پہلے مرد سے دوبارہ عقد کر سکے لیکن بہر حال یہ سب کچھ تیسری مرتبہ طلاق ہونے سے پہلے ہی
ممکن ہو سکے گا تیسری طلاق کے بعد پھر وہی حکم ہے جو ابھی بیان ہوا۔ اس تشریح کے بعد اس بات کی ہدایت
فرمائی گئی ہے کہ مرد کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ اُس نے اپنی زوجہ کو جو مہر ادا کیا ہے اُسے طلاق دینے کے بدلہ
میں واپس لے البتہ اگر مرد کا ازدواجی حقوق اور ذمہ داریوں کی ادائیگی میں کوئی قصور نہ ہو اور سرکشی زوجہ کی
طرف سے ہو اور اُسی کا قصور ہو اور اس کا اندیشہ ہو کہ ایسے حالات میں احکام شریعت کی پابندی نہ ہو سکیگی

تو عورت اس قدر مال دے کر جو اُس کے مہر کی مقدار سے زیادہ نہ ہو اور بعض کے نزدیک زیادہ بھی دے کر شوہر سے علیحدگی حاصل کر سکتی ہے۔ اور شوہر اس مال کو قبول کر سکتا ہے اسی کا نام "خلع" ہے۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنا چاہئے کہ بغیر کسی واقعی اور شرعی جواز کے یعنی بلا سبب اور بغیر کسی معقول عذر کے محض ذاتی اور دنیوی اغراض کے تحت عورت کا "خُلع" کے قانون سے غلط طور پر فائدہ اُٹھانا اور شوہر سے اس طرح علیحدگی حاصل کرنا سخت ترین گناہ ہے لیکن اگر نُشوز یعنی سرکشی اور نفرت عورت کی طرف سے نہ ہو اور اُس کا بالکل قصور نہ ہو بلکہ قصور اور زیادتی مرد ہی کی طرف سے ہو تو ایسی صورت میں طلاق کے عوض میں عورت سے مال کی کسی مقدار کا قبول کرنا مرد کے لئے قطعاً جائز نہ ہوگا۔ نکاح، طلاق، ایلاء، خلع اور رجوع وغیرہ پر جو سخت ترین پابندیاں اسلام نے عائد کی ہیں اُن کا مقصد یہی ہے کہ نہ تو عورت اپنے شوہر کے ظلم و ستم اور زیادتیوں اور ناجائز دباؤ اور قانونِ ازدواج کے ناجائز اور غلط استعمال کا شکار بن سکے اور نہ مرد ہی اپنے جائز اختیارات اور شرعی و عقلی حقوق سے محروم کیا جا سکے اس طرح گھریلو معاملات کی پوری طرح اصلاح ممکن ہو جائے اور مرد و عورت دونوں اپنے اپنے فرائض پر عمل کرنے کے قابل ہو سکیں اور عمل بھی کریں، اُن میں سے ہر ایک کے حقوق پورے کئے جائیں، احکام خداوندی کی مکمل احترام اور سنجیدگی کے ساتھ پابندی اور تعمیل کی جائے اور شرعی ضوابط و قوانین کو کھیل تماشا بنانے کی کوئی شخص بھی کوشش نہ کر سکے۔

(درس ۳۴)

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۝ وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ ۖ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۚ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَٰلِكَ ۗ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۗ وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝ وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا ۖ فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ۝

(پارہ ۲ رکوع ۱۴ کی ابتدائی ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

اور تم جب اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور وہ اپنی عدت کو پورا کر لیں تو اُنھیں اپنے ان ہی پہلے شوہروں کے ساتھ (دوبارہ) یا دوسروں کے ساتھ نکاح کرنے سے نہ روکو جبکہ وہ آپس میں دستور کے مطابق رضامند ہوں یہ نصیحت اُس شخص کے لئے کی جاتی ہے جو تم میں سے اللہ پر اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ یہی تمہارے حق میں زیادہ پاکیزہ اور زیادہ صفائی کی بات ہے اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ اور مائیں اپنے بچوں کو پورے دو برس دودھ پلائیں یہ مدت اُس کے لئے ہے جو دودھ پلانے کے پورے زمانہ کی تکمیل کرنا چاہے اور جس کا وہ بچہ ہے اُس کے ذمہ ہے (ماؤں کا) کھانا اور کپڑا۔ دستور کے مطابق۔ کسی شخص کو حکم نہیں دیا جاتا مگر اُس کی برداشت کے مطابق۔ نہ کسی ماں کو اُس کے بچہ کے باعث تکلیف پہنچائی جائے اور نہ کسی باپ کو اُس کے بچہ کے باعث تکلیف دی جائے اور وارث پر بھی اسی طرح کی ذمہ داری ہے۔ پھر اگر دونوں (ماں اور باپ) اپنی باہمی رضامندی اور مشورہ سے (دو برس کے اندر) دودھ چھڑا دینا چاہیں تو دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے اور اگر تم لوگ اپنی اولاد کو کسی اُنّا سے دودھ پلوانا چاہو جب بھی تم پر کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ تم حوالہ کر دو جو کچھ تم نے دستور کے مطابق دینا مقرر کیا ہے اور اللہ سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس کا خوب دیکھنے والا ہے۔ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں تو وہ عورتیں چار مہینہ اور دس روز اپنے کو روکے رکھیں پھر جب وہ اپنی مدت پوری کر لیں تو جو کچھ وہ اپنے حق میں دستور کے مطابق کریں اُس میں تم پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔

تشریح وتفسیر: "تَعْضُلُوْهُنَّ" کا مادہ "عَضْلٌ" ہے۔ یہ لفظ جب عورتوں کے نکاح سے متعلق بولا جائے تو اس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ انھیں نکاح کرنے سے روک دیا جائے اور اُن پر اس سلسلہ میں رکاوٹ اور پابندی لگا دی جائے۔ اسی طرح جب اس کو مرد کے لئے بولا جاتا ہے تو مقصود یہی ہوتا ہے کہ اُس کے اور اُس کی زوجہ کے درمیان جدائی ہو جائے۔ اس لئے یہاں "لَا تَعْضُلُوْهُنَّ" کا مطلب یہی ہوا کہ اُن عورتوں کو نکاح کے حق سے محروم نہ کیا جائے۔ "یُرْضِعْنَ" کا مصدر "اِرْضَاع" ہے۔ مُرضِع اور مُرضِعہ، اُس عورت کو کہتے ہیں جو کسی بچہ کو دودھ پلاتی ہو۔ "رَضَاعَةٌ" اور "رِضَاعَةٌ" دونوں طرح بولتے ہیں، بچہ کی شیرخوارگی کو کہتے ہیں۔ "رَضِیْعٌ" اور "مُرْتَضِعٌ" خود شیرخوار بچہ کے لئے بولتے ہیں۔ "حَوْلٌ" کے کئی معنی آتے ہیں مثلاً کسی چیز کے درمیان حائل ہو جانا، متغیر ہونا وغیرہ۔ اس کے ایک معنی "سال" کے بھی ہیں اور یہاں یہی مراد ہیں "حَوْلَیْنِ کَامِلَیْنِ" یعنی پورے دو سال۔ "کِسْوَةٌ" لباس کو کہتے ہیں۔ "فِصَالٌ" بچہ کی دودھ بڑھائی کے لئے بولتے ہیں۔ "یُتَوَفَّوْنَ" کا مصدر "تَوَفِّی" ہے۔ اصل میں اس کے معنی کسی چیز کو پورا پورا حاصل کر لینے یا

اُسے تکمیل کی حد تک پہنچا دینے کے ہیں۔ اسی لئے کبھی اسی مناسبت سے یہ موت اور وفات دینے اور کبھی نیند غالب کر دینے کے معنی بھی بولا جاتا ہے۔ نیند کے معنی میں اللہ نے قرآن حکیم میں اس طرح فرمایا ہے "وَهُوَ الَّذِي يَتَوَفَّاكُم بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُم بِالنَّهَارِ" (الانعام آیت ۶۰) وہ اللہ وہی تو ہے جو رات کے وقت تم کو وفات یعنی نیند عطا کرتا ہے۔ اور جو کچھ تم دن میں کرتے رہتے ہو اُسے جانتا ہے۔ یہاں پر "وفات" سے موت مراد نہیں ہے بلکہ انسان پر رات کے وقت نیند کو غالب کرنا اور اُسے سُلا دینا مقصود ہے۔ اسی طرح سورۃ آلِ عمران (آیت ۵۵) میں فرمایا گیا ہے: اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ" یعنی وہ وقت بھی قابلِ ذکر ہے جب اللہ نے فرمایا کہ اے عیسیٰ میں تم کو تمہارا پورا حق زندگی عطا کروں گا اور ابھی تو تمہیں میں اپنے یہاں اٹھانے والا ہوں۔ یہاں "تَوَفِّي" کے معنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی موت کے نہیں ہیں بلکہ اُن کے طولِ حیات کی طرف اس سے واضح طور پر اشارہ فرمایا گیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے طولِ زندگی اور اُن کے اب بھی زندہ اور باقی رہنے پر پوری اُمت اسلامیہ کا اتفاق و اجماع ہے۔ چونکہ قرآن حکیم میں محل اور موقع کی مناسبت سے ایک ہی لفظ الگ الگ جگہ پر مختلف معنوں میں بولا گیا ہے اس لئے اِس بات میں کوئی حرج نہیں ہے کہ یہاں تلاوت کردہ آیات میں "تَوَفِّي" سے شوہروں کی موت مراد ہے جبکہ دوسری جگہ اس کے دوسرے معنی مراد ہیں جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا۔

جن آیتوں کی تفسیر بیان کی جا رہی ہے اُن میں سے پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب طلاق پانے کے بعد عورت کی عدّت کا زمانہ پورا ہو جائے تو کسی شخص کو بھی خواہ وہ اُس کا پہلا شوہر ہو یا کوئی دوسرا ہو اس کا حق نہیں ہے کہ وہ اُسے اُس کے پہلے شوہر سے یا کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے سے روک دے اور اُس پر پابندی لگا دے بشرطیکہ کوئی شرعی رکاوٹ موجود نہ ہو اور اگر کوئی ایسی رکاوٹ موجود ہے تو بیشک عورت کو روک دینا درست ہوگا اور کبھی روکنا واجب بھی ہو جائے گا۔ اس کی تفصیل فقہ کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے "اِذَا طَلَّقْتُمُ" میں خطاب تمام امت کی طرف ہے۔ "اَزْوَاجَهُنَّ" میں ازواج یعنی شوہروں سے مراد پہلے شوہر بھی ہیں اور آئندہ ہونے والے شوہر بھی یعنی جس شخص کے ساتھ بھی شرعی طور پر نکاح کرنا جائز ہو اُس کے ساتھ نکاح کرنے سے عورت کو نہ روکا جائے۔ یہی ایسا طریقہ ہے جو اللہ کے نزدیک ہر طرح مناسب تر اور پاکیزہ تر ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا کہ اگر ماں باپ باہمی رضامندی اور آپس کے مشورہ سے اس بات کو مناسب سمجھیں کہ دو سال کے تمام ہونے سے پہلے ہی بچّہ کا دودھ بڑھا دیا جائے تو یہ بھی جائز ہے مگر ہر حال میں دودھ پلانے والی ماں کے کھانے کپڑے کی ذمّہ داری بچّہ کے باپ پر ہے۔ اس حکم

میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو نکاح میں باقی ہوں اور وہ بھی جو طلاق کے بعد عدت کا زمانہ گذار رہی ہوں اور وہ بھی جن کی عدت گذر چکی ہو۔ پھر ایسی صورت میں جبکہ بچہ کا باپ زندہ نہ ہو یہ ذمہ داری بچہ کے اُن قریبی رشتہ داروں کی ہوگی جو اُس کے محرم بھی ہوں اور شرعی وارث بھی ہوں۔ اگر وہ بچہ مرجائے۔ ایسے لوگ اُس کی شیر خوارگی کا خرچ ادا کرنے کے ذمہ دار ہوں گے بشرطیکہ بچہ کی ملکیت میں اس قدر مال موجود نہ ہو جو ان اخراجات کے لئے کافی ہوسکے ورنہ پھر اُسی سے ان اخراجات کو پورا کرنا واجب ہوگا۔

اِس سے قبل کی آیتوں میں عدۂ طلاق کا ذکر فرمایا گیا تھا اب آخر میں وفاتِ شوہر کی عدت کا حکم بیان ہوا ہے کہ اگر کسی عورت کا شوہر فوت ہوجائے تو اُسے چار ماہ اور دس دن عدت پوری کرنا ہوگی اور اس مدت میں وہ کسی شخص کے ساتھ نکاح نہیں کرسکتی۔ البتہ اس مدت کے گذر جانے پر کرسکتی ہے بشرطیکہ اُسے حمل نہ ہو اور اگر وہ حاملہ ہے تو جبتک بچہ کی ولادت نہ ہوگی اُسے کسی کے ساتھ نکاح کرنا جائز نہ ہوگا۔ اس سلسلہ کے بقیہ احکام اس کے بعد کی آیات کی تفسیر کے ساتھ انشاءاللہ آئندہ بیان ہوں گے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ وَلَٰكِنْ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ○ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِينَ ○ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۴ کی آخری ایک اور رکوع ۱۵ کی ابتدائی ۲ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

اور تم پر کوئی گناہ نہیں اس میں کہ تم عدت والی (مذکورہ) عورتوں کے پیغام نکاح سے متعلق مبہم اشارہ میں

کوئی بات کہو یا یہ ارادہ اپنے دلوں ہی میں چھپائے رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تم عنقریب اُن عورتوں کا ذکر کرو گے البتہ اُن سے کوئی وعدہ (مخفی طور پر بھی) نہ کرو مگر عزت وحرمت کے مطابق کوئی بات چاہو تو کہدو اور عقدِ نکاح کا عزم اُس وقت تک نہ کرو جب تک مقرر میعاد اپنی انتہا کو نہ پہنچ جائے اور جان لو کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اللہ اُسے ضرور جانتا ہے تو اُس سے ڈرتے رہو اور سمجھ لو کہ یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا بڑا بردبار ہے۔ تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم اپنی اُن بیویوں کو جن سے ابھی تک تم بے تعلق رہے ہو اور نہ تم نے ان کے لئے کچھ مہر مقرر کیا ہے، طلاق دیدو اور اُنھیں کچھ خرچ دو یہ خرچ وسعت والے کے ذمّہ اُس کی حیثیت کے لائق ہے اور تنگی والے کے ذمّہ اُس کی حیثیت کے مطابق ہے۔ یہ خرچ دستور کے مطابق ہو (اور یہ) نیکی کرنے والوں پر واجب ہے۔ اور اگر تم نے اپنی بیویوں کو طلاق ایسی حالت میں دی کہ تم اُن سے بے تعلق تو رہے لیکن اُن کے لئے کچھ مہر مقرر کر چکے ہو تو جتنا مہر تم معین کر چکے ہو اُس کا آدھا ادا کرنا واجب ہے مگر یہ کہ عورتیں خود معاف کر دیں یا وہ معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا اختیار ہو اور تمہارا معاف کر دینا پرہیزگاری سے زیادہ نزدیک ہے۔ اور آپس میں احسان کرنا فراموش نہ کرو بیشک جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُسے خوب دیکھتا ہے۔

تشریح وتفسیر: "عَرَّضْتُمْ" کا مصدر "تعریض" ہے اس سے مراد یہ ہے کہ اس طرح کلام کرنا جس سے مُبہم طور پر کسی ایسے مقصد کی طرف اشارہ ہوتا ہو جس کا اظہار کلام کے ظاہری معنی میں نہ ہو۔ "خِطْبَة" "خ" پر زیر کے ساتھ شادی کے پیغام کے لئے بولتے ہیں جبکہ "خُطْبَة" "خ" پر پیش کے ساتھ وعظ ونصیحت پر مشتمل بیان اور تقریر یا کسی کتاب کے دیباچہ اور اُس کے مقدمہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ "اَكْنَنْتُمْ" "كِنٌّ" سے بنایا گیا ہے۔ کسی بات یا کسی چیز کے چھپانے کو کہتے ہیں۔ "مَكْنُوْنٌ" اُس چیز کے لئے بولا جاتا ہے جو چھپی ہوئی اور محفوظ ہو جیسے "لُؤْلُؤٌ مَكْنُوْنٌ" محفوظ موتی۔ "عزم" کسی کام کو حتمی طور پر کرنے کا ارادہ۔ "عُقْدَةٌ" گرہ کو کہتے ہیں اور پختگی ومضبوطی کے لئے بھی بولتے ہیں۔ اسی طرح گرہ لگانے، باندھنے یا مضبوط کرنے کو "عَقْدٌ" کہتے ہیں۔ "اَلْكِتَاب" سے یہاں مقصود "عدت" کا وہ زمانہ اور میعاد ہے جو اللہ نے اپنی کتابِ پاک میں مقرر فرما دی ہے۔ "اَجَلٌ" سے یہاں اس میعاد کی آخری حد مراد ہے۔ "فَرِيْضَةٌ" سے یہاں مقصود عورت کا مہر ہے۔ تلاوت کردہ آیات میں پہلی آیت کا حاصل یہ ہے کہ عدت کے زمانہ میں کسی دوسرے شخص کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی کی بیوہ یا طلاقِ بائن پانے والی عورت سے نکاح کر لے (کیونکہ ایسا نکاح قطعی طور پر باطل ہے) یا عورت سے اس عدت کے اندر آئندہ نکاح کرنے کا وعدہ لے یا اُس عورت کے لئے پیغامِ نکاح بھیجے یا عدت کے اندر ہی نکاح کر لینے کا

قطعی طور پر ارادہ کرلے کیونکہ اس طرح کا ارادہ اور عزم کرنا بھی حرام ہے جس طرح اس ارادہ پر عدت کے اندر عمل کرنا حرام ہے۔ جہاں تک طلاق رجعی کا تعلق ہے اُس کے عدۃ کے زمانہ میں تو عورت اپنے شوہر کی زوجیت ہی کے حکم میں باقی رہتی ہے لہذا وہاں تو اس قسم کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ اِس بیان کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر مرد کے دل میں یہ نیّت ہو کہ وہ عدۃ وفات گذرنے کے بعد اُس عورت سے نکاح کرے گا یا انتہائی مُبہم اور مجمل اشارہ کے طور پر اُس عورت کو یا اس کے ولی کو یہ محسوس کرنے کا موقع دے کہ اس کا ارادہ یہ ہے کہ عدّت کے بعد نکاح کرے گا تو اس مُبہم اور خفی اشارہ میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ طلاقِ بائن پانے والی عورت کے عدۃ کا بھی یہی حکم ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ اللہ دلوں کا حال پوری طرح جانتا ہے اِس لئے کسی ناجائز بات کے تصور اور ارادہ سے بچتے رہو اور اگر کبھی بھولے سے کوئی غلطی ہو جائے تو فوراً صدقِ دل سے خدا کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کرو یقیناً وہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور اُن کی لغزشوں سے درگذر کرنے والا ہے۔

"لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ" اور اس کے بعد کی عبارت سے اس حکم کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ اگر نکاح کے موقع پر مہر کا ذکر نہ کیا گیا ہو اور بغیر تعینِ مہر نکاح کر لیا گیا ہو تو یہ بھی جائز اور درست ہے اور اگر ایسی صورت میں ازدواجی مقاصد بھی حاصل نہ ہوئے ہوں پھر بھی طلاق دیدی جائے تو شوہر پر مہر تو لازم نہ ہوگا کیونکہ اُس کا تقرر ہی نہیں کیا گیا تھا البتہ ایسی حالت میں اُس پر اپنی حیثیت اور مقدرت کے مطابق عورت کے ساتھ مال وغیرہ سے ضروری اور مناسب سلوک کرنا واجب ہوگا جس کی تفصیل حدیثوں میں موجود ہے۔ رہی شوہر کی حیثیت کی تعیین تو وہ حاکمِ شریعت کرے گا۔ اس سلسلہ میں شریعت جو کچھ اُس عورت کو مرد سے دلوائے گی وہی گویا اُس کے مہر کے قائم مقام ہو جائے گا اگرچہ قانونی واصطلاحی طور پر اُسے مہر نہیں کہا جاتا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر تعین مہر نہ ہونے کی صورت میں ازدواجی اقدار کا حصول ہو چکا ہو تو ایسی طلاق کی حالت میں عورت کو مہرِ مثل دینا واجب ہوتا ہے یعنی اُس قدر مہر جتنا اُس کے خاندان میں اُس کی مثل عورتوں کا عام طور پر مقرر ہوتا ہو۔ آخر میں ایسی صورت کا بھی حکم بیان ہوا ہے کہ نکاح کے وقت مہر تو مقرر ہو چکا ہو لیکن اس سے قبل کہ ازدواجی اقدار کا حصول ہو طلاق دیدی جائے تو آدھا مہر ادا کرنا لازم ہوگا لیکن خود عورت یا اُس کا شوہر جس نے طلاق دیدی ہے اگر چاہیں تو اپنے اپنے حق سے دستبردار ہو سکتے ہیں یعنی عورت اپنے مہر کے اس آدھے حصہ کو بھی معاف کر دے یا مرد بجائے آدھے حصہ کے پورا ہی مہر ادا کر دے۔ اور اگر ادا کر چکا ہو تو واپس نہ لے۔ "الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ"

سے مراد بہت سے مفسروں کے نزدیک طلاق دینے والا شخص ہے اور بعض کے نزدیک اس سے مراد عورت کے وہ ولی ہیں جن کی اجازت کے بغیر وہ نکاح نہیں کر سکتی۔ پھر مردوں سے خطاب ہے کہ اگر تم اپنے حق سے درگذر کرو اور پورا مہر دید و تو یہ بات پرہیزگاری سے زیادہ قریب ہے یہاں اس فرمان سے پہلے قول کی تائید ہوتی ہے کہ آیت کے اس حصہ سے ولی نہیں بلکہ عورت کا شوہر ہی مراد ہے اگرچہ بعض لوگوں نے "وَاَنْ تَعْفُوْٓا" سے مردوں اور عورتوں سب کو مراد لیا ہے لیکن یہ بات بھی ممکن نہ ہو سکے گی کہ دونوں کا اپنے حق سے درگذر کرنا ایک ہی وقت میں جمع ہو جائے اس بنا پر صاف تفسیر یہی ہے کہ اس سے مراد شوہر کا اپنے حق سے دستبردار ہونا ہے یعنی یہ کہ اُسے آدھے مہر کو روک لینے کا جو حق حاصل تھا اُسے استعمال نہ کرے اور پورا مہر ادا کر دے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ تم کسی حالت میں بھی عفو و درگذر اور لطف و احسان اور حسن اخلاق کی قدروں کو ترک نہ کرو اور جو کچھ بھی کرو نکاح ہو یا طلاق سب کچھ انسانیت کے بلند ترین معیار کے مطابق ہو جس کی اللہ نے تمھیں تعلیم دی ہے۔

حَافِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝

(درس ۴۵)

(پارہ ۲ رکوع ۱۵ کی درمیانی اور آخری ۵ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

سب نمازوں کی پابندی کرو اور درمیان والی نماز کی اور اللہ کے سامنے ادب سے کھڑے رہا کرو پس اگر تمھیں خوف ہو تو پیادہ ہی پڑھ لیا کرو یا سواری پر پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو اللہ کو یاد کیا کرو جس طرح اُس نے تمھیں سکھایا ہے جسے تم نہیں جانتے تھے اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور بیویاں چھوڑ جائیں تو اُن پر اپنی بیویوں کے حق میں سال بھر تک خرچ دینے اور اُنھیں گھر سے نہ نکالنے کی وصیت کرنا لازم ہے ہاں اگر وہ خود ہی چلی جائیں تو تم لوگوں پر کچھ گناہ نہیں اس بات میں کہ وہ عورتیں اپنے حق میں کوئی اچھی چیز کریں اور اللہ بڑا زبردست ہے بڑا حکمت والا ہے۔ اور طلاق پانے والی عورتوں کو فائدہ

پہنچانا قاعدہ کے مطابق مقرر ہوا ہے، اُن لوگوں پر جو پرہیزگار ہیں۔ اللہ اسی طرح اپنے احکام تمہارے لئے صاف صاف بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ لو۔

تشریح و تفسیر:-

"الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی" (بیچ کی نماز) سے اکثر مفسروں کے نزدیک نمازِ عصر مراد ہے۔ "قٰانِتِیْنَ" (قنوت) سے بنا ہے جس کے معنی طاعت و عبادت اور خضوع و خشوع نیز دعا کے آتے ہیں اور کبھی ادب کے ساتھ چپ رہنے کے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں خضوع و خشوع کی حالت اور سوائے ذکرِ الٰہی کے اور باتوں سے زبان کو روکنا ہی مراد ہے۔

اِن آیات سے قبل ازدواجی احکام کا ذکر تھا اب کچھ نماز کا بیان ہے جس کے بعد پھر طلاق، وفات اور ان باتوں کی عدت وغیرہ کے حکم بتائے جائیں گے۔ قرآنی آیتوں کی اس ترتیب سے اس چیز کی وضاحت اور صراحت ہو جاتی ہے کہ اِسلام میں حقوقِ خدا اور حقوقِ عباد کی اہمیت ساتھ ساتھ ہے اور جہاں انسان کو نماز، روزہ اور دوسری عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے ساتھ ہی اُس کو بندوں کے حقوق اور اجتماعی زندگی کے فرائض کو سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے کی ہدایت بھی کی گئی ہے۔ غرض بارگاہِ خداوندی سے حکم ہو رہا ہے کہ نمازوں کو پابندی کے ساتھ پڑھا کرو۔ یہاں "محافظتِ نماز" کا مفہوم یہ ہے کہ نماز کو پورے خضوع و خشوع اور پوری توجہ اور رجوعِ قلب کے ساتھ صحیح وقت پر تمام واجبات و مستحبات اور سنن وارکان کے ساتھ بھرپور پابندی سے ادا کیا جائے اور اس کو اپنی زندگی اور پیدائش کا اہم ترین مقصد سمجھا جائے نہ یہ کہ اس سے صرف دفع الوقتی، سر سے بوجھ اُتارنا اور العیاذ باللہ بیگار ٹالنا مقصود ہو یا ظاہرداری، نمائش اور دکھاوا مراد ہو۔ اس کے بعد "صلوٰۃ وسطیٰ" کا خصوصیت سے ذکر ہے جس کے لفظی معنی تو "درمیانی نماز" کے ہیں مگر اس سے مراد کونسی نماز ہے۔ اس میں مفسروں کے کئی قول ہیں۔ زیادہ شہرت اسی کی ہے کہ اس سے عصر کی نماز مراد ہے۔ دوسرے قول نمازِ ظہر و صبح اور مغرب و عشار کے بھی ہیں اور بعض نے فرض نمازوں میں سے غیر معین طریقہ پر کوئی ایک نماز مراد لی ہے۔ "قانتین" کا لفظ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا "قنوت" سے بنا ہے جو انتہائی معنوی جامعیت رکھتا ہے اور اس سے خضوع و خشوع اور دعا یا حضورِ قلب کی تمام کیفیتیں مراد ہیں اور مقصود یہ ہے کہ اللہ کے سامنے جب نماز پڑھنے کی غرض سے حاضری دی جائے تو بے حد توجہ قلب اور انتہائی ادب کے ساتھ اور سوائے دعا اور تلاوت و ذکرِ الٰہی کے کوئی اور بات زبان پر نہ لائی جائے۔

نماز کی اہمیت اِس بات سے بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس کے بعد دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ

خوف اور جنگ کی حالت میں بھی اس کا کسی نہ کسی درجہ میں حکم موجود ہے اور جبتک ذرا سی بھی قدرت اور امکان موجود ہو یہ کسی طرح سے بھی ادا ہونا ضروری ہے البتہ جنگ یا کسی دوسری طرح کے خوف کی حالت میں نماز کے احکام اسی ماحول کے مطابق ہوں گے جس میں اُسے ادا کرنا ہو گا۔ غرض حکم دیا گیا ہے کہ اگر مسلمانوں کو دشمنوں کی طرف سے جنگی خطرے ہوں یا وہ اسی قسم کے دوسرے خطروں میں بتلا ہو جائیں تو پھر اُن کے لئے جس طرح بھی ممکن ہو اور جس حد تک ممکن ہو سکے نماز کے فریضہ کو ادا کریں۔ یہ نمازِ خوف پیادہ بھی پڑھی جا سکتی ہے اور سواری پر بھی اور اشارہ سے بھی ادا ہو سکتی ہے قبلہ کی طرف رُخ ہو سکے یا نہ ہو سکے یعنی مجبوری اور خوف و ہراس کا جیسا بھی موقع ہو گا اُس طرح ادا کی جائے گی۔ پھر اگر جماعت سے پڑھنا ممکن ہو تو اُس طرح۔ اگر ایک امام جماعت ہو جب بھی اور اگر کئی امام موجود ہوں اُس وقت کئی جماعتوں کی صورت میں بھی پڑھی جا سکتی ہے نمازِ خوف اور اُس کے تنہا اور جماعت کے ساتھ پڑھنے کے تمام طریقوں کے تفصیلی حکم فقہ و حدیث کی کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں۔

نماز کے اس ذکر کے بعد دوبارہ ازدواجی احکام کا بیان کیا گیا ہے کہ جن لوگوں کی موت اُس کے آثار اور علامتوں کے لحاظ سے نزدیک آ گئی ہو اُنھیں چاہئے کہ وہ اپنی بیویوں کے لئے اس بات کی وصیت کر جائیں کہ اُن کو ایک سال تک اُن کے گھر سے نہ نکالا جائے اور اس زمانہ میں اُن کے ضروری اخراجات بھی شوہر کے ترکہ سے ادا کئے جائیں۔ اس طرح کی وصیت کا حکم ابتدائے اسلام میں تھا اور اُس زمانہ تک تھا جبتک میراث کے احکام اور وارثوں کے حصّوں کی تعیین نہیں کی گئی تھی۔ اور اکثر مفسروں کے نزدیک وفاتِ شوہر کی جو موجودہ عدّت مقرر ہے یعنی "چار ماہ اور دس روز" اس کا بھی تعیّن نہیں کیا گیا تھا۔ جب اس مدت کے تقرر کا حکم ہو گیا اور احکام میراث کی آیات اتریں تو اب اِس پچھلے حکمِ وصیت کی ضرورت نہ رہی جو اُس وقت کے حالات کے لئے تھا اسی طریقہ کو "نسخ اور کسی حکم کا منسوخ ہونا" کہتے ہیں۔ اس طرح اب عورت کے لئے اُس کے شوہر کی وفات کی عدّت "چار ماہ اور دس روز" مقرر ہے اور شوہر کے ترکہ میں سے زوجہ کا حصّہ ایک چوتھائی ($\frac{1}{4}$) ہو گا اگر شوہر کی کوئی اولاد موجود نہیں ہے اور اگر اُس کی اولاد موجود ہے تو پھر زوجہ کو آٹھواں حصّہ ($\frac{1}{8}$) ملے گا۔ مزید تفصیل فقہ کی کتابوں میں ہے۔

اکثر علماء شوہر کی وفات کے بعد زوجہ کے لئے اُس کی اِس عدّت کے زمانہ میں شوہر ہی کے چھوڑے ہوئے گھر میں رہنا ضروری جانتے ہیں اور بعض اِسے ضروری نہیں سمجھتے۔

آخر میں فرمایا گیا ہے کہ تمام طلاق پانے والی عورتوں کو کسی نہ کسی درجہ میں نفع حاصل ہونے کا
حق ہے۔ یہاں "متاعٌ" کا لفظ بولا گیا ہے جو ہر اُس قسم کے نفع پر مشتمل ہے جسے شریعت نے
مقرر کر دیا ہے خواہ مہر کی صورت میں ہو یا لباس اور سامان اور کچھ خرچ کی شکل میں ہو یا ایامِ عدت
کے اخراجات کی حیثیت میں ہو اور بعض مفسروں نے اس لفظ کی تشریح اس طرح سے بھی کی ہے
کہ ان آیات سے قبل جن خاص قسم کی طلاق پانے والی عورتوں کا ذکر ہو چکا ہے یعنی جن کا مہر بھی مقرر نہ
ہوا ہو اور نہ ازدواجی اقتدار کا حصول ہوا ہو تو اُن کے لئے اس قسم کا حسنِ سلوک خرچ اور جوڑے وغیرہ
کی شکل میں واجب ہے اور دوسری تمام عورتوں کے لئے جنہیں کسی صورت سے بھی طلاق ملی ہو اُن کے
واجب حقوق کے علاوہ اس طرح کا حسنِ سلوک کرنا مستحب ہے۔ بہرحال غرض یہ ہے کہ اگر زن و شوہر
میں میل نہ ہو سکے اور طلاق دینا ہی پڑے تو شوہر کو چاہیے کہ وہ حسنِ سلوک اور اچھے برتاؤ کے جذبہ
کو کبھی فراموش نہ کرے۔ اسلام چونکہ معلمِ اخلاقِ انسانی ہے اس لئے وہ ہر ہر قدم پر اپنی ہر تعلیم میں اس
عظیم ترین مقصد کو ہٹنے نہیں دیتا۔ اُس کی کوشش ہے کہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کا معیار بلند سے
بلند تر ہو جائے اور گھریلو، خاندانی، نسلی اور ہر طرح کے جھگڑے ختم ہو جائیں اور نسلِ انسانی سُکھ اور چین
کی زندگی بسر کر سکے اور انسانی معاشرہ کا کوئی ایک فرد بھی اپنے حقوق سے محروم نہ کیا جا سکے۔

(درس ۴۶)

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ
فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ○ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا
أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ○ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا
فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۶ کی ابتدائی ۳ آیاتِ کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت سے ڈر کر اپنے گھروں سے نکل
کھڑے ہوئے تھے تو اللہ نے اُن سے کہا کہ مر جاؤ پھر اُس نے انھیں زندہ کر دیا۔ بیشک اللہ لوگوں پر
بڑا فضل کرنے والا ہے لیکن اکثر لوگ شکر نہیں ادا کرتے اور اللہ کی راہ میں قتال کرو اور سمجھ لو کہ اللہ بڑا سننے
والا خوب جاننے والا ہے۔ کون ایسا ہے جو اللہ کو قرضہ دے پھر اللہ اُسے بڑھا کر اُس کے لئے کئی گنا کر دے
اور اللہ ہی کمی کر دیتا ہے اور وہی کشائش عطا کرتا ہے اور تم سب اُسی کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔

"قرض" کے اصلی معنی کسی چیز کو کاٹ دینے کے ہیں۔ اسی مناسبت سے 'اُدھار' کو بھی قرض کہتے ہیں۔ اس لئے کہ اُس میں مال کے ایک حصہ کو جُدا کیا جاتا ہے اس شرط پر کہ وہ پھر واپس کر دیا جائے۔ اللہ کو قرض دینے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی راہ میں مال یا جو چیز بھی ہو اُسے اُس طرح خرچ کیا جائے جس کا شریعت نے حکم دیا ہے۔ "ضَعف اور ضُعف" ضاد پر زبر اور پیش کے ساتھ جب "اسم" ہو تو کمزوری اور ناتوانی کے لئے بولتے ہیں اور زیر کے ساتھ یعنی "ضِعف" کے معنی دُگنا یا اُس سے بھی زیادہ کے ہوتے ہیں۔ 'اَضعاف' اِس کی جمع ہے۔ اس سے بڑی کثرت اور بہت زیادتی کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ "یَقْبِضُ وَیَبْصُطُ" میں 'قَبْضُ' کے معنی تنگ کر دینے یعنی چھوٹا کرنے کے اور کم کرنے کے ہیں اور 'بَسْطُ' کے معنی وسیع کرنے اور کشائش پیدا کرنے کے آتے ہیں۔ یہاں ایک بات یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ "یَبْسُطُ اور یَبْصُطُ" سین اور صاد کے ساتھ دونوں طرح پڑھا گیا ہے۔ نافع، عاصم، کسائی اور بزی کی قرات 'ص' کے ساتھ ہے۔ باقی قاریوں نے اِسے 'س' کے ساتھ پڑھا ہے۔ معنی اور مقصود دونوں کے ایک ہی ہیں "اَلَمْ تَرَ" کے جملہ میں "رویت" سے مراد آنکھ سے دیکھنا نہیں ہے بلکہ غور و فکر کی دعوت دینا مقصود ہے۔

یہاں 'اَلَمْ تَرَ' فرما کر ہر شخص کی طرف خطاب کیا جا رہا ہے جس میں غور و فکر کی صلاحیت ہو اور وہ دنیا کے واقعات اور حوادث کو دیکھ کر یا سنکر عبرت و نصیحت حاصل کر سکے۔ یا یہ خطاب خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہے اور اس سے بھی مقصود یہی ہے کہ دنیا کے تمام سمجھدار لوگ اس واقعہ سے عبرت حاصل کریں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے ایک قدیم دور کی طرف اشارہ ہے کہ اُن کی ایک بہت بڑی جماعت اپنے شہر سے نکل کھڑی ہوئی تھی جس کا سبب یا تو جہاد کے حکم سے فرار تھا یا طاعون کی وبا سے بچنا مقصود تھا۔ ان لوگوں کی تعداد چالیس سے ستر ہزار تک بتائی گئی ہے یہ لوگ جس شہر میں رہتے تھے اُس کا نام "داوَرْدان" تھا جو عراق کے شہر "واسط" کے قریب تھا اور بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ان کے شہر کا نام "اَذْرِعات" تھا جو "شام" میں تھا غرض یہ لوگ طاعون سے یا جہاد کے حکم سے بھاگ نکلنے کی غرض سے روانہ ہو گئے پھر جب ایک دوسرے مقام پر پہونچے تو حکم خدا سے سب کو موت آ گئی اور جس موت کے ڈر سے بھاگے تھے اُسی نے اُنھیں آ لیا۔ اس واقعہ کے بعد جب ایک لمبی مدت گزر گئی اور حضرت حزقیلؑ پیغمبر کا زمانہ آیا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تیسرے جانشین تھے اور اُن کا اس مقام کی طرف سے گذر ہوا تو آپ نے اُن کی بوسیدہ اور گلی ہوئی ہڈیوں پر نظر کی پھر خدا سے دعا کی کہ اُنھیں پھر سے زندگی عطا فرمائے یہ دعا قبول ہوئی اور پیغمبرؑ کو حکم ملا کہ ان بکھری ہوئی اور گلی ہوئی

ہڈیوں سے خطاب کرو اور کہو کہ اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے کہ پھر سے زندہ ہو جاؤ۔ حضرت حزقیلؑ نے حکمِ خداوندی کی تعمیل کی اور اُن سے خطاب کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً وہ ہڈیاں آپس میں مل کر زندہ جسموں کی شکل میں ہوگئیں اور جس طرح وہ لوگ ایک ساتھ مر گئے تھے اُسی طرح سب کے سب ایک ساتھ ہی زندہ ہو گئے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ حضرت حزقیلؑ ہی کی قوم کے لوگوں کا واقعہ ہے جو جہاد یا طاعون کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور ایک ساتھ ہی مر گئے پھر حضرت حزقیلؑ اُن کی تلاش میں نکلے ایک مقام پر اُنھیں مردہ پایا اور بعد میں آپ کی دعا سے اُنھیں دوبارہ زندگی ملی۔ اس دوسری روایت کی بنا پر اُن کے دوبارہ زندہ ہونے کا واقعہ اُن کی موت سے تقریباً آٹھ روز بعد کا ہے۔ پہلی آیت میں "حَذَرَ الْمَوْتِ" کا جملہ ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بہر حال موت کے خوف سے بھاگے تھے۔ اور مرنے سے بچنا چاہتے تھے اِس لئے خدا نے اُنھیں موت دے کر دوبارہ زندہ کیا تاکہ اُن کے سامنے یہ حقیقت پوری طرح صاف ہو جائے کہ زندگی اور موت کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔ کوئی موت سے کتنا ہی بچنے کی کوشش کرے مگر موت کا جو وقت مقرر ہو چکا ہے اُس سے بچ جانا کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے یہی بات سورۂ نساء میں بھی فرمائی گئی ہے۔ اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ یعنی تم جہاں کہیں بھی ہوگے موت تمہیں پالے گی خواہ تم مضبوط و مستحکم قلعوں ہی میں ہو۔ اِس طرح کبھی واقعات کا ذکر کر کے اور کبھی نصیحت آمیز انداز میں حکم دے کر مسلمانوں کو ہمت و شجاعت کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ سچے مسلمان کی شان یہ نہیں ہے کہ وہ کبھی موت سے خوف کرے، وہ ثباتِ قلب اور بہادری کا مجسمہ ہوتا ہے، اُس کا حوصلہ ہمیشہ بلند رہتا ہے وہ مصیبتوں اور بلاؤں کے طوفانوں سے ٹکر لیتا ہے اور اپنے عزم و ثبات و ہمت کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور سب سے بڑی دولت سمجھتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے اللہ پر بھروسا اور پکا یقین رکھتا ہے اور سچے مومن کے اس یقین و ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت اور کوئی مصیبت متزلزل نہیں کر سکتی۔ اِسی کے ساتھ اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ جس طرح حضرت حزقیلؑ پیغمبر کی دعا سے ہزارہا مردے زندہ ہوگئے اور اللہ نے اُنھیں اِسی دنیا میں دوبارہ حیات عطا کر دی اسی طرح وہ قیامت میں بھی مردوں کو زندہ کر سکتا ہے اور کرے گا۔ غرض کوئی بھی مصیبت آپڑے اور خوف و ہراس کا کتنا ہی بھیانک ماحول ہو مگر مسلمان کو پوری شجاعت اور استقلال کے ساتھ اُس کا مقابلہ کرنا چاہیے اور بزدلوں کی طرح اُس سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اللہ ہی کا فضل و کرم ہے جس پر ساری کائنات جی رہی ہے اور اس پوری دنیا کو اُس نے اپنے

فضل اور اپنی نعمتوں سے بھر دیا ہے اور مخلوقات کو جو کچھ بھی ملا ہے اور ملتا ہے وہ سب اُسی کی بارگاہ سے مگر اس کے باوجود اکثر لوگ اُس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ واقعات سے سمجھا کر اور مسلمانوں کی ہمت بڑھا کر اور یہ بتا کر کہ موت وحیات سب کچھ خدا ہی کے اختیار میں ہے پھر حکم دیا گیا ہے کہ جب یہ صورت ہے کہ زندگی اور موت اللہ ہی کے قبضہ میں ہے تو پھر اُس کی راہ میں اور اُس کے دین کی نصرت کے لئے اُس کے منکروں اور دشمنوں اور کافروں سے جہاد میں مشغول ہو جاؤ اور ایک لمحہ کے لئے بھی ہمت نہ ہارو اور اگر اس کام میں کوئی شخص سستی اور غفلت کا مرتکب ہوگا تو اُسے یاد رکھنا چاہئے کہ خدا سمیع و علیم ہے یعنی ہمارے ہر فعل اور قول سے باخبر ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اگر ہم دین الٰہی کی نصرت وحمایت میں غفلت اور بدعملی سے کام لیں گے تو ہمارے افعال واعمال خدا سے چھپ نہ سکیں گے اور ہم اُس کی سزا اور عذاب کے مستحق ہو جائیں گے۔ جہاد کے حکم کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص اللہ کو قرضِ حسنہ دے گا تو وہ اُسے بدرجہا زیادہ کر کے واپس فرمائے گا۔ اس سے اشارہ دو باتوں کی طرف ہے ایک تو یہ کہ جہاد کے اخراجات اور تیاریوں کے لئے جس قدر امداد دی جائے گی وہ گویا اللہ کو قرض دینا ہے اور اس کے عوض میں بے انتہا اجر وثواب ملے گا۔ دوسرے یہ ایک عام اعلان ہے کہ جو کوئی بھی نیکی کرے گا اور اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرے گا خواہ وہ کوئی نیک کام کیوں نہ ہو اس کا بے حساب عوض اور اجر اُس کی بارگاہ سے عطا ہوگا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ سچے مومن کی شان یہی ہے کہ وہ نہ مصیبت سے ڈرے اور نہ موت سے خوف کرے اور نہ اللہ کی راہ میں اور اُس کے دین کی حمایت ونصرت میں اپنی جان اور اپنی دولت صرف کرنے سے کسی حال میں بھی دریغ کرے۔

(درس ۸۷)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰىۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْاؕ قَالُوْا وَمَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَاؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ○ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًاؕ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِؕ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهٗ بَسْطَةً فِى الْعِلْمِ وَالْجِسْمِؕ وَاللّٰهُ يُؤْتِىْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُؕ

وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ○ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيهِ سَكِينَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَاٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○

(پارہ ۲ رکوع ۱۶ کی درمیانی اور آخری ۳ آیات کریمہ - سورۃ البقرۃ)

کیا تم نے نہیں دیکھا موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت کو جبکہ انھوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لئے ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اللہ کی راہ میں قتال کریں (پیغمبر نے) کہا کہیں ایسا تو نہ ہو کہ اگر تم پر قتال فرض کر دیا جائے تو تم نہ لڑو۔ اُنھوں نے کہا بھلا ہمارے لئے کیا عذر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ نہ کریں حالانکہ ہم نکالے جا چکے ہیں اپنے گھروں سے اور اپنے فرزندوں سے مگر جب اُن پر قتال فرض کر دیا گیا تو ان میں سے تھوڑے آدمیوں کے سوا سب کے سب پھر گئے اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے اور اُن لوگوں سے اُن کے نبی نے کہا کہ اللہ نے تمہارے لئے طالُوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے وہ کہنے لگے اُسے ہمارے اوپر کس طرح حکومت حاصل ہو سکتی ہے حالانکہ سلطنت کے حقدار اُس سے زیادہ تو ہم ہیں اور اُسے مال میں بھی تو وسعت نہیں دی گئی ہے (نبی نے) کہا کہ اُسے اللہ نے تمہارے مقابلہ میں منتخب کر لیا ہے اور اُسے علم اور جسم (دونوں) میں کشادگی زیادہ عطا کی ہے اور اللہ اپنا مُلک جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ وسعت والا ہے سب کچھ جاننے والا ہے اور اُن سے اُن کے نبی نے کہا کہ اُس کی سلطنت کی نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس وہ صندوق آ جائے گا جس میں تسکین (کا سامان) ہے تمہارے پروردگار کی طرف سے اور اُن میں سے کچھ بچی ہوئی چیزیں بھی ہیں جنھیں آلِ موسیٰؑ اور آلِ ھارونؑ نے چھوڑا تھا۔ اُس (صندوق) کو فرشتے لے آئیں گے۔ بیشک اُس میں تم لوگوں کے لئے ایک نشانی ہے اگر تم ایمان والے ہو۔

تشریح وتفسیر: "مَلَاْءٌ" ایسی جماعت کے لئے بولتے ہیں جس میں کسی قوم کے صاحبانِ رائے اور بزرگ لوگ ہوں "عَسَيْتُمْ" عسیٰ کے لفظ سے بنا ہے جس کے معنی امید ظاہر کرنے کے آتے ہیں۔ اِس کے ساتھ "ھَلْ" کا لفظ شامل کیا گیا ہے جس کے معنی عام طور پر کسی بات کے متعلق سوال کرنے اور دریافت کرنے کے ہوتے ہیں مگر یہاں پر اس سے توقع اور امید کرنے میں تاکید اور قوت کا اظہار مقصود ہے۔ "طالُوت" بنی اسرائیل کے سب سے پہلے بادشاہ تھے جن کا زمانۂ سلطنت گیارھویں صدی قبل مسیح میں گزرا ہے یہ وہی ہیں جنھیں اسرائیلی قدیم کتابوں میں "شاؤل" (Saul) کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ مجاہد

بن جبیرؒ کی اور دوسرے کثیر مفسروں کے نزدیک ان ہی کے زمانہ میں حضرت شموئیلؑ پیغمبر تھے جو حضرت یعقوب علیہ السلام کی نسل میں تھے۔ قرآنی اعلان کے مطابق طالوت کی سلطنت خاص عطیۂ خداوندی تھی جس کا حضرت شموئیلؑ نے اظہار کیا تھا۔ یہ صرف بادشاہ تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام ان کے داماد تھے جو ان کے بعد بنی اسرائیل کے دوسرے بادشاہ ہوئے اور ساتھ ہی نبوت کے منصب پر فائز تھے۔

"مَلِکٌ" سے بادشاہ، حاکم اعلیٰ اور سردار لشکر کو مراد لیتے ہیں۔ اس کی جمع "مُلوک اور اَملاک" آتی ہے۔

"مُلکٌ" سے یہاں مراد حکومت، سلطنت اور مادی اقتدار ہے کبھی "مُلکٌ" کے معنی اس سے بھی زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ "مِلکٌ" اُس چیز کو کہتے ہیں جس کا انسان مالک ہو۔ غرض یہ لفظ جس طرح بھی پڑھا جاتا ہے اس کے الگ الگ معنی پیدا ہو جاتے ہیں۔

"بَسْطَةً فِی الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ" یعنی طالوت کو علم و جسم دونوں میں بڑی کشادگی اور وسعت عطا ہوئی۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اُنھیں اللہ نے مملکت کے انتظام اور جنگی فنون سے متعلق وسیع علم عطا کیا تھا اور ساتھ ہی جسمانی قوت و طاقت، قد و قامت اور شان و وجاہت بھی دوسروں سے بہتر دی تھی۔ "سَکِیْنَةٌ" رعب، وقار اور اطمینان کو کہتے ہیں۔ "تابُوت" کے معنی صندوق کے ہیں۔ "تابوتُ السّکینة" سے مقصود وہ مخصوص، خوبصورت اور محترم صندوق ہے جس میں توراۃ کا نسخہ اور دوسرے تبرکات انبیاء بنی اسرائیل محفوظ تھے۔ اسرائیلی اُس کی بڑی تعظیم کرتے تھے اور میدان جنگ میں بھی اُس کو حفاظت اور برکت کی غرض سے اپنے ساتھ رکھا کرتے تھے۔ کچھ عرصہ کے بعد فلسطینیوں نے یہ صندوق بنی اسرائیل سے چھین لیا تھا اس حادثہ کو اسرائیلی اپنے لئے انتہائی نحوست اور بدشگونی سمجھتے تھے اور بے حد اضطراب اور بے چینی کے ساتھ اس کا انتظار کرتے رہتے تھے کہ وہ صندوق اُن کو پھر مل جائے۔ طالوت کی حکومت کے زمانہ میں یہ صندوق واپس آگیا تھا۔ اس کے دوسرے نام "تابوتُ العہد اور تابوت الشہادۃ" بھی ہیں حضرت داؤد علیہ السلام نے اس صندوق کو بعد میں "صِہْیُون" پہاڑ پر جو شہر اُورشلیم کے علاقہ میں واقع ہے پہنچا دیا تھا جسے آپ کے بعد آپ کے فرزند حضرت سلیمان علیہ السلام نے "ہیکلِ سلیمانی" کی تعمیر کے بعد اُسی میں رکھا تھا۔ یہودیوں میں اب بھی شہرت اِسی بات کی ہے کہ اِس وقت بھی وہ "تابوت" ہیکل سلیمانی کی بنیادوں کے اندر زمین میں دفن ہے۔ اِن آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد کچھ زمانہ تک تو بنی اسرائیل بحیثیت مجموعی صحیح راستہ پر رہے اور اُن میں ایسے لوگ موجود تھے جو موسوی شریعت پر عامل تھے مگر پھر رفتہ رفتہ راہِ راست سے دور ہٹتے گئے، سرکشی بڑھتی گئی، ظلم و جور، عیاشیاں رنگ رلیاں زور پر تھیں۔ دنیا کی لذّتوں اور مال و دولت کی ریل پیل میں پھنسے ہوئے تھے اور خدا کو

بالکل بھول گئے تھے۔ ان تمام بداعمالیوں کی اس دنیا ہی میں یہ سزا ملی کہ اُن کے دشمن اُن پر غالب آگئے اُنھیں اُن کی آبادیوں اور شہروں سے نکال دیا گیا اور مال و دولت، ملک اور حکومت ہر چیز سے محروم کر دیئے گئے لاوی بن یعقوبؑ جن کے گھرانے میں پیغمبری کا سلسلہ چلا آرہا تھا اُن کی تمام اولاد دشمنوں کے حملوں میں کام آگئی اور صرف ایک حاملہ عورت باقی بچی تھی جس کا شوہر قتل ہو چکا تھا۔ بالآخر اُس عورت کے یہاں اس نامور بچہ کی ولادت ہوئی جس کا نام حضرت شمویلؑ ہے۔ عرصہ کے بعد جب آپ کی نبوت کا اعلان ہوا تو بچے کھچے اور لُٹے پٹے بنی اسرائیل نے اُن سے عرض کی کہ اب ہم اپنے گناہوں پر تائب ہیں اور اپنے دشمنوں کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں اس لئے آپ ہمارے لشکر کا سردار اور ہمارا بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اُس کی کمان میں جہاد کر سکیں آخر طالوت کو اللہ کے حکم سے حضرت شمویلؑ نے اُن کا امیر مقرر کیا اس پر پھر اُنھوں نے سرکشی کرنا شروع کر دی اور کہنے لگے کہ آپ نے طالوت کو کیسے حکومت سپرد کئے جانیکا اعلان کیا ہے حالانکہ یہ نہ تو بنی اسرائیل کے اُس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس میں نبوت چلی آرہی ہے اور نہ ان کا تعلق اس نسل ابراہیمی سے ہے جس میں حکومت اور بادشاہت کا سلسلہ قائم ہے۔ اس وقت تک صورت حال یہ تھی کہ عام طور پر بنی اسرائیل کے انبیاءؑ لاوی بن حضرت یعقوبؑ کی نسل سے ہوتے رہے اور سلطنت اور حکومت یا جنگ سے متعلق امور جس خاندان سے وابستہ تھے اُس کا تعلق یھودا بن یعقوبؑ سے تھا اور طالوت جنھیں اُس وقت حکومت ملی تھی اُن کا ان دونوں خاندانوں میں سے کسی سے بھی تعلق نہ تھا بلکہ وہ بنی اسرائیل کے تیسرے خاندان سے تھے جو بنیامین بن یعقوبؑ کی اولاد تھا اور یہ بات تو سب جانتے ہی ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کی اولاد پر مشتمل کل بارہ خاندان تھے جن کی طرف بار بار قرآنِ حکیم میں اشارہ فرمایا گیا ہے اور اُنھیں لفظ "اَسْبَاط" سے یاد کیا گیا ہے جو "سِبْط" کی جمع ہے اور اس سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی تمام اولاد ہی ہے جو بارہ قبیلوں یا خاندانوں میں منقسم تھی۔ حضرت شمویلؑ نے بنی اسرائیل کی اس بات کا یہ جواب دیا کہ اُنھیں حکومت تو اللہ نے دی ہے اُس کو نہ خود میں بدل سکتا ہوں اور نہ تم اُس کا انکار کر سکتے ہو پھر اُن میں جو صفتیں ہیں اُن کے لحاظ سے بھی وہ ہم سب سے بہتر ہیں یعنی وہ جسمانی اور علمی دونوں حیثیتوں سے تم پر فضیلت رکھتے ہیں۔

چونکہ ان آیات کا تعلق آئندہ کی آیتوں سے ہے اس لئے ان کی مزید تشریح و تفسیر آئندہ کی آیتوں کے ساتھ بیان کی جائے گی۔

(درس ۴۸)

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيكُمْ بِنَهَرٍ ۚ
فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي
إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ ۚ
فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ ۙ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا
الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلَاقُوا اللّٰهِ ۙ
كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ
الصَّابِرِينَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَّثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ۝ فَهَزَمُوهُمْ
بِإِذْنِ اللّٰهِ ۙ وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَآتَاهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَ
عَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ
الْأَرْضُ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ تِلْكَ آيَاتُ اللّٰهِ نَتْلُوهَا
عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ وَإِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ۝

(پارہ ۲ رکوع ۱۷، کی ابتدائی ۴ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

پھر جب طالوت فوجوں کو لیکر روانہ ہوئے تو کہا کہ اللہ تمہارا ایک نہر کے ذریعہ سے امتحان لینے والا ہے تو جو کوئی اُس میں سے پانی پی لیگا وہ میرا نہیں ہے اور جو کوئی نہ چکھے تو وہ میرا ہے مگر ہاں جو کوئی اپنے ہاتھ سے ایک چُلّو بھرے لیکن ان سب نے اُس سے پانی پی لیا بجز اُن میں سے تھوڑے سے آدمیوں کے پس جب وہ اور جو ایمان لانے والے اُن کے ساتھ تھے نہر کے پار اُتر گئے تو وہ لوگ کہنے لگے کہ آج تو ہم میں جالوت اور اُس کی فوجوں سے مقابلہ کی طاقت نہیں اور وہ لوگ جنھیں یقین تھا کہ وہ اللہ کے سامنے پیش ہوں گے کہنے لگے کہ بارہا چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر اللہ کے حکم سے غالب آگئی ہیں اور اللہ تو صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور جب وہ جالوت اور اُس کی فوجوں کے مقابل آئے تو بولے اے ہمارے پروردگار ہم پر صبر نازل فرما اور ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری نصرت فرما پھر اُنھوں نے اُن کو اللہ کے حکم سے شکست دی اور داؤد نے جالوت کو قتل کر دیا اور اللہ نے داؤد کو بادشاہت اور دانائی عطا کی اور جو کچھ چاہا اُنھیں سکھایا اور اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض لوگوں کے ذریعہ سے دفع نہ کرتا رہتا تو روئے زمین پر فساد برپا ہو جاتا لیکن اللہ تو جہان والوں پر بڑا فضل رکھنے والا ہے۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمھیں ٹھیک ٹھیک سُناتے ہیں اور بیشک تم ضرور مرسلین میں سے ہو۔

تشریح وتفسیر: "مُبۡتَلِیۡکُمۡ" میں ابتلار "بَلَآءٌ" سے بنا ہے جس کے معنی غم، مصیبت اور تکلیف کے ہیں۔ "ابتلار" کے معنی ہیں تکلیف اور مصیبت سے کسی کا امتحان لینا۔ "نَھَرٌ" اور "نَھۡرٌ" دونوں طرح بولتے ہیں۔ اس سے مراد وہ بہتا ہوا وسیع پانی ہوتا ہے جسے ہم اردو میں ندی اور کبھی دریا بھی کہتے ہیں۔ یہاں اس نہر سے مراد "دریائے اُردُن" ہے فلسطین کے علاقہ میں اس سے زیادہ اہمیت کا حامل کوئی دوسرا دریا نہیں ہے۔ اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی طرف ہے اور یہ بُحیرۂ طبریہ سے گذرتا ہوا "بحر میّت" (Dead Sea) میں گرتا ہے۔ "اغتراف" سے مراد چُلّو میں پانی لینا اور "غُرۡفَةً" سے مقصود چلّو بھر پانی ہے "جَالُوۡت" فلسطینی لشکر کا مشہور سردار تھا جس کا ذکر یہود کی "کتاب مقدس" میں "جُلیات" کے نام سے کیا گیا ہے۔ یہ بڑا طاقتور انسان تھا اور بڑا ظالم و جابر سپہ سالار۔ اس کی دہشت اور خونریزی کے خوف سے دور دور تک کے لوگ اپنے علاقے چھوڑ کر بھاگ چکے تھے۔ جالوت کے جارحانہ حملوں نے بنی اسرائیل کی آبادیوں کو تاراج کر ڈالا تھا۔ آخر میں حضرت داؤدؑ کے ہاتھ سے مارا گیا۔ "فِئَةٌ" گروہ اور جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد میں باہمی تعاون موجود ہو "اِفۡرَاغ" سے انڈیلنا مراد ہے۔ "اَلۡحِکۡمَةَ" سے اس جگہ نبوت مراد ہے۔

بالآخر جب بنی اسرائیل نے طالوت کی بادشاہت تسلیم کرلی تو لشکر کی تیاریاں شروع ہوگئیں ایک روایت کے مطابق جو حضرت ابن عباسؓ سے منقول ہے اس لشکر کی تعداد تین لاکھ تین ہزار تین سو تیرہ تھی اور بعض نے اس سے کم بھی لکھی ہے۔ غرض جب یہ لوگ جالوت کے مقابلہ کے لئے نکلے تو گرمی کے دن تھے پانی نہ ہونے اور پیاس کی شدّت سے پریشان ہوگئے۔ اُس وقت طالوت نے اُن سے کہا کہ عنقریب تمہارے راستہ میں ایک نہر آئے گی یہ وہی دریائے اُردن تھا جس کا ابھی ذکر کیا جاچکا ہے۔ پھر انھیں ہدایت کی گئی کہ تم لوگ اگرچہ بے حد پیاسے ہو لیکن یہ تمہارا امتحان ہے کہ تم کتنے صبر و شکر کرنے والے ہو اس لئے اس دریا کو عبور کرجانا اور اس کا پانی نہ پینا بس اس قدر اجازت ہے کہ ایک آدمی ایک چُلّو بھر پانی پی سکتا ہے۔ جو شخص اس ہدایت پر عمل کرے گا وہ تو میرا ساتھی ہے اور جو اس سے زیادہ پیئے گا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مگر جب لشکرِ طالوت اُس دریا کے پاس پہنچ گیا تو پھر سب کے سب اس فرمان کی خلاف ورزی کرنے لگے اور سب نے خوب جی بھر کے پانی پی لیا۔ صرف تین سو تیرہ آدمی ایسے تھے جنھوں نے اس حکم پر عمل کیا اور پانی نہ پیا اور اگر پیا تو ایک چُلّو سے زیادہ نہیں پیا۔ جن لوگوں نے پانی بالکل نہیں پیا صرف ایک ہی چُلّو پیا اُن کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور یہی وہ مخلص ایماندار تھے جنھوں نے طالوت کے ساتھ دریائے اُردن کو پار کرلیا۔ ان کے علاوہ جتنے بھی تھے اُن میں سے کوئی بھی دریا کو عبور نہ کرسکا اور

بعض مورخوں نے کہا ہے کہ سب نے عبور کر لیا تھا لیکن پانی پینے والے لشکریوں نے جالوت کی ٹڈی دل فوج دیکھ کر ہمت ہار دی اور کہنے لگے کہ ہم اتنی بڑی فوج سے جو بہترین اسلحہ سے مسلح ہے مقابلہ نہیں کر سکتے اور اس وجہ سے وہ سب کے سب واپس ہو گئے تھے سوائے اُن تین سو تیرہ ایماندار لوگوں کے جنھوں نے پانی نہیں پیا تھا۔ اُس وقت حضرت شمویلؑ جو کچھ پہلے کہہ چکے تھے اُس کی سچائی سامنے آ گئی کیونکہ جب بنی اسرائیل نے اُن سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لئے بھی ایک بادشاہ مقرر کر دیجئے تاکہ ہم اس کی کمان میں لشکر کی تنظیم کریں اور فلسطینی لشکر کے حملوں کا مقابلہ کر سکیں تو اس کے جواب میں حضرت شمویلؑ نے فرمایا تھا کہ آج تو تم امیر لشکر اور بادشاہ کا تقرر چاہتے ہو اور جہاد جہاد کی پکار کر رہے ہو لیکن ایسا نہ ہو کہ جب امیر لشکر مقرر کر دیا جائے اور جہاد کا حکم ہو تو پھر تم اپنے عہد و قرار سے پھر جاؤ اور میدان چھوڑ دو اس کے جواب میں بنی اسرائیل نے کہا تھا کہ ایسا کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم جہاد کے ارادہ سے ہاتھ اُٹھا سکیں اِس لئے کہ ہم کو فلسطینیوں سے دوستی کی کسی وقت بھی توقع نہیں ہو سکتی جبکہ وہ ہمارے خون کے پیاسے ہیں اور اب تک اُنھوں نے ہمیں تباہ کرنے میں اور ہماری نسلوں اور آبادیوں کو تاراج کرنے میں کیا کسر اُٹھا رکھی ہے۔ اس کے بعد جب طالوت کی بادشاہت کا اعلان ہوا تو یہی بنی اسرائیل تھے جنھوں نے مخالفت شروع کر دی اور کہنے لگے کہ یہ شاہی کی قابلیت نہیں رکھتے اور ہم ان کو بادشاہ نہیں تسلیم کر سکتے کیونکہ ان کا تعلق نہ تو نبوت کے خاندان سے ہے اور نہ شاہی نسل سے ہے بلکہ یہ بنیامین بن یعقوبؑ کے خاندان یعنی اولاد سے ہیں۔ اس کے بعد حضرت شمویلؑ نے اس کا اعلان کیا تھا کہ نبوت اور سلطنت جسے اللہ دینا چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اِس کے لئے نہ تو وہ کسی خاندان کا پابند ہے اور نہ نسل یا خطہ کا اور طالوت کو جو خاص سلطنت ملی ہے وہ اللہ کے حکم سے نہ کہ کسی انسان کے حکم اور تجویز سے پھر آپ نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس حقیقت کے ثبوت میں عنقریب ایک نشانی بھی ظاہر ہو جائے گی اور وہ یہ ہو گی کہ جو متبرک اور مقدس صندوق تم سے فلسطینیوں نے چھین لیا ہے جسے تم ہمیشہ فتح و ظفر کی علامت سمجھا کرتے تھے وہ بھی جلد ہی تمہیں بغیر کسی کوشش اور زحمت کے واپس مل جائے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا تھا اور فلسطینیوں نے اُس صندوق کو دو بیلوں کی ایک گاڑی پر رکھ کر بنی اسرائیل کی آبادیوں کی طرف اُن بیلوں کو ہنکا دیا تھا پھر فرشتوں نے اُنھیں سیدھا اُن کے پاس پہنچا دیا اور بعض نے لکھا ہے کہ یہ تابوت فرشتے خود اُٹھا کر لائے تھے اور اس کو بنی اسرائیل آسمان کی طرف سے اُترتے ہوئے دیکھ رہے تھے غرض اپنی توقع اور تصور کے خلاف اُس صندوق کو پا کر بنی اسرائیل کو کوئی شبہہ نہ رہا تھا کہ طالوت کو صرف خدا کے حکم سے سلطنت عطا ہوئی ہے۔ ان تمام باتوں کے بعد پھر بھی وہ امتحان میں پورے نہ اُترے اور طالوت کے واضح اور صاف حکم کے باوجود تین سو تیرہ بہادر ایمانداروں کے

سواسب نے اس حکم کی مخالفت کی اور دریائے اُردن کا پانی خوب جی بھر کر پی لیا اور در اصل یہ حکم اسی مصلحت کی بنا پر تھا بھی کہ مومن اور منافق الگ الگ ہو جائیں اور دشمن کے مقابلہ میں اپنی صفوں کے اندر کوئی ایک فرد بھی ایسا باقی نہ رہے جس سے غداری، جاسوسی، کمزوری اور بزدلی ظاہر ہو سکے اور جو جماعت بھی میدان کارزار میں فلسطینیوں کے سامنے نکلے اُس کے افراد میں بھر پور یکجہتی اور کامل اتحاد ہو اور ملک و قوم اور اللہ کے دین کے بچاؤ کے سوا اُس کی زندگی کا کوئی دوسرا مقصد ہی نہ ہو اور وہ اپنے خون کا آخری قطرہ تک اس مقدس مقصد پر قربان کرنے کے لئے تن من دھن کی بازی لگا دے۔ اور ایسا ہی ہوا طالوت نے اس قدر شدید امتحان لیا جس میں ایک قلیل جماعت کے سواسب ناکامیاب ہو گئے۔ صرف تین سو تیرہ ایسے سچے اور باوفا نکلے جنھوں نے نہ تو اپنی تعداد کی بے انتہا کمی کی پروا کی اور نہ دشمن کی کثرت اور اسلحہ کی فراوانی کو خطرہ میں لائے کیونکہ اُن کا ایمان کامل تھا، اُنھیں اپنے اللہ پر پورا بھروسا تھا اور اُنھیں یقینِ کامل تھا کہ فتح دینے والا تو اللہ ہے۔ اسلحہ کی زیادتی اور لشکر کی کثرت سے فتح حاصل نہیں ہوا کرتی۔

اسی ایماندار جماعت میں حضرت داؤد علیہ السلام بھی تھے۔ جن کے ایک چھوٹے سے پتھر مارنے سے جالوت سر کے بھل زمین پر آ رہا اور فلسطینیوں کو عبرتناک شکست اٹھانا پڑی حضرت براءؓ بن عازب صحابی فرمایا کرتے تھے کہ طالوت کے جس چھوٹے سے لشکر کو جالوت کے ٹڈی دل لشکر کے مقابلہ میں فتح حاصل ہوئی تھی اُس کی تعداد کے متعلق اصحاب کرام میں عام شہرت تھی کہ وہی تھی جو جنگ بدر میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھیوں کی تھی یعنی تین سو تیرہ۔ بلاشبہ اس عبرتناک واقعہ میں ہر دور کے مسلمانوں کیلئے ہمت و جراُت اور شجاعت کا ایک یادگار سبق ہے۔

اس واقعہ کی بقیہ ضروری تشریح و تفصیل آئندہ بیان ہوگی۔

(۹۹)

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۟ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

(پارہ ۳ رکوع ۱ کی آخری ایک اور رکوع ۲ کی پہلی ایک آیت۔ سورۃ البقرۃ)

یہ (ہمارے) رسول ہیں جن میں بعض کو بعض پر ہم نے فضیلت دی ہے۔ ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا ہے اور اُس نے اُن میں سے بعض کے درجے بلند کئے ہیں اور ہم نے مریم کے بیٹے عیسیٰ کو کھلی ہوئی دلیلیں عطا کیں اور ہم نے اُن کی تائید کی روح القدس کے ذریعے اور اگر اللہ چاہتا تو اُن کے بعد کے لوگ آپس میں نہ لڑتے بعد اس کے کہ دلیلیں آچکی تھیں لیکن اُن میں پھوٹ پڑ گئی پس اُن میں سے کچھ تو وہ تھے جو ایمان لے آئے اور کچھ وہ تھے جو کافر ہوئے اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ آپس میں خونریزی نہ کرتے لیکن اللہ وہی کرتا ہے جس کا ارادہ کر لیتا ہے۔ اے ایمان والو جو کچھ ہم نے تمہیں عطا کیا ہے اُس میں سے خرچ کرو اس سے پہلے کہ وہ دن آجائے جس میں نہ تجارت کام آئے گی اور نہ دوستی اور نہ سفارش اور کافر لوگ ہی ظالم ہیں۔

تشریح و تفسیر: "بَیِّنَات" "بَیِّنَۃٌ" کی جمع ہے۔ روشن اور واضح دلیل اور نشانی کے لئے بولتے ہیں یہاں مراد معجزات اور دوسرے دلائل و شواہد ہیں خواہ وہ حسی ہوں یا عقلی۔ "اَیَّدْنَا" کا مصدر تائید ہے جس کے معنے قوت دینے کے ہیں۔ اِس کا اصلی مادّہ "اَیدٌ" ہے۔ "روحُ القُدُس" سے مراد حضرت جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ "اِقْتَتَلَ" کا مصدر "اِقْتِتَال" ہے۔ تَقَاتُل اور اقتتال کے ایک ہی معنی ہیں یعنی باہم ایک دوسرے سے قتال و جدال کرنا۔ "خُلَّۃٌ" خالص محبت اور دوستی کو کہتے ہیں۔

گذشتہ آیات میں حضرت طالوت کی جنگ کا ذکر تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ کس طرح ایک مختصر سی بہادر جماعت نے فلسطینیوں کے قہار لشکر کو شکست دی تھی۔ حضرت شمویلؑ اُس وقت پیغمبر تھے۔ اُن کے اور حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں تقریباً پانچسو سال کا فاصلہ تھا۔ غرض جب طالوت نے بنی اسرائیل کو جالوت سے جہاد کا حکم دیا تو حضرت داؤدؑ کے والد "ایشا" کو بلا کر حکم دیا کہ وہ اپنے تمام بیٹوں کو لے کر آئیں اور یہ بات بتائی کہ "ایشا" ہی کے فرزندوں میں سے ایک فرزند جالوت کا قاتل ہوگا اور اُسی کے بدن پر حضرت موسیٰؑ کی زرہ ٹھیک اُترے گی۔ ایشا نے اپنے تمام فرزندوں کو پیش کیا مگر زرہ کسی کے بدن پر ٹھیک نہ ہوئی آخر وہ سب سے چھوٹے بیٹے حضرت داؤدؑ کو لیکر آئے جو باپ کی دنبیاں (بھیڑیں) چرا رہے تھے۔ یہ بہت کمسن اور دُبلے پتلے تھے مگر زرہ اُنھیں کے بدن پر ٹھیک اُتری۔ داؤد علیہ السلام کی جھولی میں تین چھوٹے چھوٹے پتھر رکھے ہوئے تھے۔ اُدھر جالوت اپنے عظیم لشکر کے آگے آگے ایک بڑے ہاتھی پر بیٹھا ہوا تھا پورا بدن لوہے سے ڈھکا ہوا، سر پر تاج شاہی اور پورے بدن میں صرف چہرہ کھلا ہوا تھا پیشانی پر ایک یاقوت آویزاں تھا جس کی چمک دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ حضرت داؤدؑ نے اپنی گوپھن سے جالوت کو ایک پتھر مارا اور اُسی یاقوت کو نشانہ بنایا جو اُس کی پیشانی پر آویزاں تھا وہ پتھر یاقوت کو توڑ کر جالوت کے دماغ میں اُتر گیا جس کی وجہ سے وہ کٹی ہوئی شاخ کی طرح زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے

لشکر کو بھی جمے رہنے کی ہمت نہ رہی اور وہ سب کے سب یا تو قتل کر دیئے گئے یا اِدھر اُدھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بنی اسرائیل کا اُس وقت مرکز "الجلیل" کا کوہستانی علاقہ تھا اور اُسی کے شہر "رَمَلہ" میں حضرت شموئیلؑ بھی مقیم تھے۔ یہ آخری لڑائی قدیم خطۂ "اُردُن" کی سرزمین "غور" میں ہوئی تھی اور اسی کے مشہور شہر "بیسان" کے قریب "جالوت" قتل ہوا تھا اور اُس کے عظیم لشکر کو حضرت داؤدؑ کے ہاتھوں عبرتناک شکست کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔ طالوت کی وفات کے بعد حضرت داؤدؑ جو اُن کے داماد تھے ان کی جگہ پر بنی اسرائیل کی تاریخ کے دوسرے عظیم بادشاہ تسلیم کر لئے گئے اور ساتھ ہی آپ نبی بھی تھے۔ آپ کی مشہور الہامی کتاب کا نام "زبور" ہے۔ حضرت داؤدؑ نے سات برس تک حکومت کی۔ آپ کا دور ملکی فتوحات اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے ایک مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ نے پہلے تو اپنا دارالحکومت "حَبْرُوْن" کے مقام کو بنایا تھا جہاں حضرت ابراہیم الخلیل علیہ السلام کی قبر ہے اور اسی مناسبت سے اس جگہ کو "الخلیل" کے نام سے شہرت حاصل ہو گئی ہے مگر کچھ عرصہ کے بعد آپ نے اُورِیشلم (یروشلم) یعنی بیت المقدس کو جو "اَلْقُدُس" کے نام سے بھی مشہور ہے اپنا پایہ تخت بنا لیا تھا۔ آپ ہی کے مشہور فرزند حضرت سلیمانؑ تھے۔ مسجد "بیت المقدس" کی ابتدائی تعمیر حضرت داؤدؑ ہی کے دور میں ہوئی تھی پھر اس کی تکمیل حضرت سلیمانؑ نے کی تھی۔ گذشتہ آیات کے مطالعہ سے دو باتیں کھل کر ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ قلّت اور کثرتِ لشکر جنگ کے موقع پر کوئی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ ہمیشہ فتح و کامیابی کا معیار ایمانی قوت، عزمِ محکم اور شجاعت و بہادری نیز آپس کے بھرپور اتحاد پر ہے چاہے جماعت قلیل ہو یا کثیر ہو۔ اس کے ساتھ ہی اصلی اور دائمی فتح صرف اُس کو ملتی ہے جسے اللہ عطا کرتا ہے اور یہ کہ اللہ صرف اُن لوگوں کے ساتھ ہے جو صبر اور استقامت کے ساتھ اُس کے احکام کی تعمیل میں مشغول رہا کرتے ہیں۔ اسی لئے اپنے بھرپور وسائل کے ساتھ مسلمانوں کو ہمیشہ خدا ہی سے نصرت اور فتح کی دعا کرتے رہنا چاہئے کیونکہ بغیر اُس کے حکم کے فتح حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر یہ بھی فرما کر کہ "لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ" بتا یا گیا تھا کہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ وہ ہمیشہ بعض لوگوں کے ذریعہ سے بعض کی تکلیف اور مصیبت اور اُن پر جو کچھ ظلم ہو رہا ہو اُسے دفع کرتا ہے اور اگر ایسا نہ ہوتا تو ساری دنیا ظلم وجور سے بھر کر تباہ و برباد ہو جاتی۔ یہ دوسری اہم بات ہے جو ہمیں گذشتہ آیات سے معلوم ہوئی تھی اور اسی بنا پر ہمیں ہر وقت اللہ سے دعا کرنا چاہئے کہ وہ ہمیشہ ہم سے مصیبتوں اور بلاؤں کو دور رکھے اور اپنی رحمتِ کاملہ ہر وقت ہمارے شاملِ حال کرے۔ علامہ ابن جریر طبری نے اس سلسلہ میں دو حدیثیں بھی لکھی ہیں۔ ایک حدیث میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا ہے کہ ایک نیک اور ایماندار مسلمان کی وجہ سے اُس کے آس پاس کے

سو سو گھرانوں سے اللہ بلاؤں کو دور کر دیتا ہے۔ دوسری حدیث میں اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ ایک سچے اور نیک مسلمان کی وجہ سے اللہ اُس کی اولاد اور ذرّیت، اُس کے گھر والوں اور اُس کے قرب و جوار میں رہنے والوں کی اصلاح فرما دیتا ہے اور اُس نیک مومن کی موجودگی تک وہ سب حفاظت اور امن و امان میں رہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر شخص کو نیک اور سچا مسلمان بننے کی کوشش کرنا چاہئے تاکہ ساری دنیا ظلم و جور اور فسادات سے پاک ہو جائے اور پورا انسانی معاشرہ امن و سکون کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اس کے بعد اس وقت کی تلاوت کردہ آیتوں میں سب سے پیشتر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے پیغمبروں کی منزلت اور درجات میں فرق رکھا ہے اور بعض کو بعض پر فضیلت عطا فرمائی ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جن سے بغیر واسطۂ ملک اللہ نے کلام کیا ہے جیسے کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام سے اور معراج میں خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ ان رسولوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جنھیں اللہ نے بہت سے درجات میں رفعت و بلندی دی ہے۔ اس آخری جملہ سے اکثر مفسرین کے نزدیک خود حضورؐ کی ذاتِ اقدس مراد ہے کیونکہ آپ کی ذات افضل خلائق ہے۔ اس کے بعد حضرت عیسیٰؑ کا ذکر ہوا ہے اور اُنھیں "ابن مریم" کہا گیا ہے یہ بتانے کے لئے کہ وہ خدا کے فرزند نہیں ہیں بلکہ مریم کے بیٹے ہیں اور خدا کی ایک مخلوق ہیں جسے اُس نے نبوت عطا کی ہے۔ پھر یہ بھی بتا دیا کہ اللہ نے حضرت جبرئیلؑ کے ذریعہ سے اُن کی حفاظت فرمائی اور اس طرح اس کی بھی وضاحت کر دی گئی کہ جس طرح ساری کائنات اللہ کی محتاج ہے اسی طرح عیسیٰؑ بھی اس کی حفاظت اور اُس کی رحمت کی احتیاج رکھتے ہیں اور اُس سے کبھی بے نیاز نہیں ہو سکتے کیونکہ وہ خدا نہیں ہیں اور نہ اُس کے فرزند ہیں بلکہ اُس کے نیک بندہ ہیں۔

پھر اس کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ خدا نے بندوں کو عقل و شعور دے کر اور اُن کی ہدایت کا پورا سامان کر کے اُنھیں اختیار دیدیا ہے کہ وہ چاہے ایمان اختیار کریں یا کفر اختیار کریں یعنی اُس نے اُنھیں کسی بات پر مجبور نہیں کیا ہے مگر ساتھ ہی اسے بھی سمجھا دیا ہے کہ جو کفر اختیار کرے گا اُس کا ٹھکانا جہنم کے سوا کہیں اور نہ ہوگا اور جو ایمان اختیار کرے گا اُسے جنّت عطا کی جائے گی۔ اس طرح مصلحت ایزدی یہی تھی کہ بندوں کو مجبور نہ کیا جائے تاکہ وہ جزا یا سزا کے مستحق بن سکیں۔ پھر آخر میں اہل ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ خدا کے دیئے ہوئے رزق میں سے اُس کی راہ میں خرچ کیا کریں تاکہ وہ اُنھیں اس کا ثواب عطا کرے۔ اس انفاق میں زکوٰۃ فرض اور تمام دوسرے صدقات اور نیک مقاصد کیلئے خرچ شامل ہیں خواہ وہ واجب ہوں یا مستحب ہوں اور یہ بھی سمجھایا گیا ہے کہ جو کچھ خرچ کرنا ہو خدا کی راہ میں تو وہ اسی دنیا میں کر و ورنہ آخرت میں پھر اس کا موقع نہ رہے گا اس لئے کہ دنیا ہی مقام عمل ہے

اور آخرت مقام جزا و سزا ہے وہاں تو اعمال کی خرید و فروخت ممکن ہوگی اور نہ دوستی اور سفارش کام آئے گی۔ اور اگر انبیاءؑ اور مقربان بارگاہ خداوندی کی سفارش کسی کے کام بھی آئے گی تو صرف اُس وقت جب خدا اُنھیں سفارش کرنے کی اجازت عطا کرے گا اور جس کے لئے سفارش کی جائے گی اُس میں لازمی طور پر ایمان بھی ہوگا۔ اس ارشاد سے اس بات کی مطلق نفی کردی گئی کہ کوئی پیغمبر اپنی اُمّت کے لئے اُس کے گناہوں کا فدیہ نہیں بن سکتا بلکہ بخشش کے لئے انسان کا ذاتی عمل نیک ضروری ہے۔

(درس ۸) اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ○ لَاۤ اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ ۙ قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ ۚ فَمَنْ یَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰی ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ○ اَللّٰهُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اَوْلِیٰٓـُٔهُمُ الطَّاغُوْتُ یُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَی الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(پارہ ۳ رکوع ۲ کی درمیانی اور آخری ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ البقرۃ)

اللہ ہی ذات ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ زندہ ہے سب کا سنبھالنے والا ہے نہ اُس کو اُونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اُسی کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ایسا ہے جو اُس کے سامنے بغیر اُس کی اجازت کے سفارش کرسکے وہ جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے موجود ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے اور وہ لوگ اُس کے معلومات میں سے کسی چیز کو بھی گھیر نہیں سکتے بجز اُس کے جسے وہ خود چاہے اُس کی کرسی نے سب آسمانوں اور زمین کو اپنے اندر لے رکھا ہے اور اُس پر ان دونوں کی نگرانی ذرا بھی گراں نہیں ہوتی اور وہی ہے عالیشان بڑی عظمت والا۔ دین میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت گمراہی سے الگ ظاہر ہوچکی ہے تو جو کوئی معبود باطل سے انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اُس نے بڑا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کے لئے ٹوٹنا نہیں ہے۔ اللہ ہی اُن لوگوں کا سرپرست ہے جو ایمان لے آئے، اُنھیں

اندھیروں سے روشنی کی طرف نکال کر لاتا ہے اور جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اُن کے سرپرست معبودانِ باطل ہیں جو اُنھیں نور سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں یہی لوگ اہلِ دوزخ ہیں اُس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔

تشریح و تفسیر: "اَلْقَیُّوْمُ" اللہ کا ایک مبارک نام ہے۔ ہمیشہ باقی رہنے والا جس کو زوال نہ ہو اور ہر چیز اُس کی ذات ہی سے قائم رہ سکتی ہے۔ "سِنَۃٌ" کا اصلی مادہ "وَسْنٌ" ہے۔ یہ مصدر بھی ہے اور اسم بھی ہے۔ یعنی اونگھنے کو بھی کہتے ہیں اور خود اُونگھ کو بھی۔ "اَلْکُرْسِیُّ" عام طور پر اُس چیز کو کہا جاتا ہے جس پر بیٹھا جاتا ہے اللہ کی کرسی سے مراد بعض نے اُس کا علم لیا ہے اور بعض نے اُس کی قدرت اور حکومت اور بعض نے ایسا وسیع جسم جس سے بڑا سوائے عرش الٰہی کے کوئی دوسرا جسم نہیں ہے۔ "اِکْرَاہ" کے معنی ہیں کسی کو ایسے کام پر مجبور کرنا جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔ "رُشْدٌ" ہدایت کو کہتے ہیں اور "غَیٌّ" گمراہی کو "طَاغُوْت" اس لفظ کا اطلاق ہر معبودِ باطل اور سرکش اور شیطان پر ہوتا ہے "عُرْوَۃٌ" کسی چیز کے اُس حصہ کو کہتے ہیں جسے تھام کر اُس کو اُٹھایا جا سکے اور اس چیز کو بھی جسے پکڑ کر کوئی لٹک جائے۔ "وُثْقٰی" "اَوْثَق" کی تانیث ہے۔ معنی ہیں بہت زیادہ مضبوط اور مستحکم "اِنْفِصَامٌ" ٹوٹ جانے اور کٹ جانے کو کہتے ہیں۔ "ظُلُمَات" سے مقصود کفر و گمراہی کے اندھیرے ہیں اور "نُوْر" سے مراد حق و دیانت کی روشنی ہے۔

تلاوت کردہ آیات کریمہ میں سے پہلی عظیم آیت "آیۃ الکرسی" کے نام سے موسوم اور مشہور ہے اس آیت میں اسلام کی بنیادی تعلیمات کی طرف انتہائی معجزانہ جامعیت کے ساتھ اشارہ فرمایا گیا ہے۔ تمام محدثین و مفسرین اسلام نے اس آیت کریمہ کی عظمت اور جامعیت کا اعتراف کیا ہے اور اپنے تو اپنے یورپین مترجموں نے بھی جو اپنی اسلام دشمنی میں بڑی شہرت رکھتے ہیں اس آیت کی ہمہ گیر معنویت اور جامعیت کو تسلیم کیا ہے۔ احادیث میں کثرت کے ساتھ اس آیۂ مبارکہ کی فضیلتیں بیان ہوئی ہیں۔ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص ہر فرض نماز کے بعد اس آیت کی تلاوت کرتا رہے اُس کا مرتبہ اُس مومن کا سا ہوگا جس نے پیغمبروں کے ساتھ دشمنانِ اسلام سے جہاد کر کے شہادت پائی ہو۔ دوسری حدیث میں ہے کہ جو شخص اس کو سوتے وقت پڑھتا ہے رات بھر اُس کی اُس کے گھر والوں کی اور اُس کے ہمسایہ والوں کی ہر بلا سے حفاظت ہوتی ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور سرورِ کائنات نے فرمایا ہے کہ جو شخص "آیۃ الکرسی" کی تلاوت کرتا ہے اللہ اُس سے ہزاروں بلاؤں اور برائیوں کو دفع فرما دیتا ہے وہ بھی جن کا تعلق دنیا سے ہو اور وہ بھی جو آخرت سے متعلق ہوں۔ ایک بحث یہ بھی ہے کہ آیۃ الکرسی "وَھُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ" تک ہے یا "ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ" تک ہے۔ مگر ائمہ اہلبیت علیہم السلام اور صحابۂ کرام

رضوان اللہ علیہم میں اسی بات کی شہرت تھی کہ یہ آیۂ کریمہ "وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ" پر ختم ہو جاتی ہے۔ اور اس کے بعد کی آیت جو "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" سے شروع ہوتی ہے وہ "آیۃ الکرسی" میں داخل نہیں ہے اسی لئے علماء کی اکثریت اسی کی قائل ہے۔

یہ آیت "اللہ" کے عظیم الشان نام سے شروع ہوئی ہے جس کے معنی اور مفہوم میں کسی قسم کی کوئی کمزوری اور نقص و عیب ممکن نہیں ہے اور اس نام سے مراد ہی وہ کامل ذات ہے جو ہر برائی اور ہر عیب سے پاک ہو اور ہر کمال رکھتی ہو۔ پھر اس کے بعد اس بات کی مطلق طور پر نفی کا اعلان ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی معبود نہیں ہو سکتا نہ چھوٹا معبود اور نہ بڑا معبود۔ بلکہ اللہ ہی ساری کائنات کا تنہا اور اکیلا معبودِ مطلق ہے اور اس معبودیت میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں۔ وہ "حیّ" ہے یعنی ازلی و ابدی ہے ہر چیز کو فنا ہو سکتی ہے مگر اُس کو فنا نہیں۔ وہ "قیّوم" ہے یعنی نہ صرف خود باقی اور دائم ہے بلکہ دوسری چیزوں کی بقا بھی اُسی کی وجہ سے ہے اور اُسی کے حکم سے ہے۔ زمین اور آسمان کی تمام مخلوقات اور ساری چیزوں کا وہی مالک ہے اور پوری کائنات پر اُسی کا اقتدار اور حکومت ہے۔ اِن عظیم صفتوں کے بیان سے نظریۂ اُلوہیت کے خلاف اُن بدعتوں اور غلط عقیدوں کی پوری طرح نفی کر دی گئی جن میں اہلِ کتاب اور مشرک قومیں مبتلا تھیں۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اُس کے سامنے کسی کی مجال نہیں کہ وہ کسی کی بھی سفارش کر سکے جب تک اللہ خود سفارش کے لئے اذن اور اجازت نہ عطا فرمائے اس ارشاد سے اُس خیال کو باطل کرنا مقصود ہے جس کی بنا پر لوگ حضرت مسیحؑ کی "شفاعت کبریٰ" کے قائل ہوئے ہیں اور اُنھیں اُمت کے گناہوں کا "فدیہ" سمجھتے ہیں اس طرح اسلام کے نزدیک کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہوں کو اپنے اوپر نہیں اوڑھ سکتا اور اس طرح "اَلْفَادِیْ" (The Redeemer) کے عقیدہ کو سرے ہی سے پوری طرح باطل کر دیا گیا۔ پھر یہ بتایا گیا کہ اللہ کا علم کائنات کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے بلکہ اُس کے علم کی کوئی حد ہی نہیں اُس کے علم میں کوئی دوسرا اضافہ نہیں کر سکتا وہ دنیا اور آخرت نیز مخلوق کے نزدیک جو چیزیں غائب و حاضر ہیں اور جو گذر چکیں اور آئندہ ہونے والی ہیں اور وہ جو محسوس ہیں اور وہ جو عقل و شعور سے سمجھی جاتی ہیں سب ہی کو جانتا ہے۔ علم کا اصلی مرکز تو اُسی کی ذات ہے جس میں جہل کا کوئی تصور اور شائبہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا اس کے بعد مخلوقات کو جو کچھ علم حاصل ہوتا ہے وہ اُسی کے علم اور اُسی کی مشیت سے اُس کے سامنے ہر بات اور ہر چیز شہود و حضور کے عالم میں ہے اور کوئی شے اُس کے علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتی "غیب و شہادۃ" یعنی حاضر اور غائب علوم کی تفریق تو کائنات کے لحاظ سے ہے نہ کہ اُس کی ذات اور اس کے علم کے لحاظ سے نہ اُس پر اونگھ اور غفلت طاری

ہوتی ہے اور نہ وہ نیند میں مبتلا ہوتا ہے۔ وہ ہر برائی اور ہر احتیاج اور ہر عیب اور نقص سے بلند و برتر ہے۔ اُس کے عظیم اور لامتناہی علم و اقتدار کی وجہ سے زمین و آسمان اور اُن کی ہر چیز کی حفاظت اور نگرانی اُس کے لئے ذرا بھی گراں نہیں ہوتی اور اگر اُس کی یہ حفاظت ایک لمحہ کے لئے ہٹ جائے تو ساری کائنات فنا ہو جائے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ دین کے بارے میں کسی قسم کا کوئی اکراہ یعنی زبردستی نہیں ہے۔ انسان کو عقل و شعور عطا کیا گیا ہے چاہے وہ غلط راہ اختیار کرے اور گمراہ ہو کر نقصان اُٹھائے اور چاہے تو سیدھی راہ اختیار کرے اور نجات حاصل کرے۔ اللہ نے کسی پر بھی دین اور عقیدہ کے لئے جبر اور زبردستی نہیں کی ہے۔ البتہ سچائی کی راہ بتانے اور گمراہی سے بچانے کے لئے ہر طرح کا انتظام ضرور کر دیا ہے اور اس طرح ہدایت اور گمراہی دونوں چیزیں ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ الگ ہو گئی ہیں جن کو پہچاننے میں کوئی بھی دشواری نہیں ہو سکتی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ آیت بعد میں مشرکوں سے حکم جہاد کی وجہ سے منسوخ ہو گئی ہے لیکن بعض کہتے ہیں کہ یہ منسوخ نہیں ہوئی اور یہی زیادہ صحیح ہے ارشاد الٰہی کا تعلق عقیدہ سے ہے کیونکہ درحقیقت دین عقیدہ ہی کا نام ہے جو قلب و شعور سے متعلق ہوتا ہے، فقط اُن لفظوں کا نام نہیں ہے جو زبان سے ظاہر ہوتی ہیں اور ظاہر ہے کہ انسان کے دل میں جو عقیدہ بھی ہو گا وہ کسی قسم کے بھی جبر اور دباؤ سے متاثر نہیں ہو سکتا جبکہ ہاتھ پیروں اور زبان کو متاثر اور مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اس بنا پر حکم جہاد سے اِس ارشاد خداوندی کی جامعیت اور وسعت پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

اِس کے بعد آخر میں بڑی جامعیت کے ساتھ سمجھایا گیا ہے کہ انسان کی عقل و شعور کے سامنے دو چیزیں ہیں ایک حق دوسرے باطل۔ ایک نور اور روشنی دوسرے تاریکی اور اندھیرا شیطانی اور طاغوتی طاقتیں اُسے باطل اور تاریکی کی طرف دعوت دیتی ہیں اور اللہ اُس کو نور اور روشنی کی طرف ہدایت فرماتا ہے اور اس کے لئے اُس نے جس قدر سامان بھی ممکن تھا وہ سب مہیا کر دیا ہے۔ اب جو شخص تاریکیوں کی طرف جا کر گمراہ ہو گا اور اللہ کی راہ کو چھوڑے گا وہ اپنا ٹھکانا ہمیشہ کے لئے دوزخ میں بنالے گا اور جو اللہ کے راستہ پر رہے گا اور ایمان کا سہارا لے گا تو یہی سہارا وہ ہو گا جو اُسے نجات دے گا اور کبھی نہ ٹوٹ سکے گا۔

(درس ۵۱) اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖۤ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ○ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّهِىَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰى يُحْىٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ○

(پارہ ۳ رکوع ۳ کی ابتدائی ۲ آیات کریمہ سورۃ البقرۃ)

کیا تم نے اس شخص کے حال پر نظر نہیں کی جس نے ابراہیم سے اُن کے پروردگار کے بارے میں مباحثہ کیا تھا اس سبب سے کہ اللہ نے اُسے بادشاہت دے رکھی تھی جبکہ ابراہیم نے اُس سے کہا کہ میرا پروردگار تو وہ ہے جو زندگی بخشتا ہے اور موت دیتا ہے وہ کہنے لگا کہ زندگی اور موت تو میں دیتا ہوں ابراہیم نے کہا اچھا اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو اُس کو مغرب سے نکالدے اس پر جو کافر تھا وہ حیران ہو گیا اور اللہ ظالموں کو راہ ہدایت نہیں دکھاتا یا (تم نے) اُس شخص (کے حال) پر نظر کی جو ایک بستی سے گذرا تھا اس حال میں کہ وہ اپنی چھتوں کے بھل گری ہوئی تھی وہ کہنے لگا کہ اللہ اس بستی کو اس کی موت کے بعد (اب) کیونکر زندگی دیگا۔ اس پر اللہ نے اُس شخص کو سو برس تک مردہ رکھا پھر اُسے جلا اُٹھایا پھر پوچھا کہ تو کتنی مدت اس حالت میں رہا۔ اُس نے کہا کہ میں اس حالت میں کوئی دن بھر یا ایک دن سے بھی کچھ کم رہا۔ فرمایا نہیں بلکہ تو سو سال تک رہا۔ تو اپنے کھانے اور پینے کی طرف تو دیکھ کہ ابتک ذرا بھی سڑا گلا نہیں ہے اور اپنے گدھے کو دیکھ اور یہ سب اس لئے کہ ہم تجھے ایک نشان لوگوں کے لئے بنا دیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھ ہم اُنھیں ترتیب دیئے دیتے ہیں اور پھر اُن پر گوشت چڑھاتے ہیں پھر جب اُس پر (یہ سب) روشن ہو گیا تو اُس نے کہا میں یقین رکھتا ہوں کہ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تشریح و تفسیر: "حُجّۃ" اُس دلیل کو کہتے ہیں جو کسی صحیح و درست مقصد کی وضاحت کرے مگر کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ "حُجّۃ" کو بحث اور "تکرار" کرنے کے لئے بھی بول لیتے ہیں اور اسی مناسبت سے "مُحاجّہ"

باہم تکرار کرنے، جھگڑنے اور مباحثہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی سے "حَاجَّ" ماضی کا صیغہ بنا ہے اور معنی یہ ہیں کہ اُس کافر نے ابراہیم علیہ السلام سے بحث کی اور جھگڑا کیا۔ جس شخص نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا کے بارے میں مباحثہ اور تکرار کی تھی وہ مفسرین کے نزدیک "نمرود" تھا۔ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں "کلدانی" قوم کا ایک بڑا مشہور اور بے حد ظالم بادشاہ تھا۔ سرزمین کلدان کا پائے تخت "بابل" اور اسی مملکت کا ایک مشہور شہر "اُور" بھی تھا۔ یہی "اُور" وہ شہر تھا جہاں سے حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کی تھی جب وہ "نمرود" کے ظلم و ستم سے پریشان ہو گئے تھے "کلدانیہ" کی پرانی مملکت تقریباً اسی سرزمین میں تھی جہاں موجودہ مملکت عراق ہے۔ "خَوٰی" کا مصدر "خَوَاءٌ" ہے، مکان یا دیوار کے گر جانے کو کہتے ہیں۔

"عَرش" چھت کو کہتے ہیں۔ "عُروش" اِس کی جمع ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ بستی ایسی تھی جس کے سارے مکان گرے ہوئے پڑے تھے اور وہ بالکل ویران ہو چکی تھی صرف مکانوں کے نشانات باقی تھے۔ "یَتَسَنَّہْ" "سَنَۃٌ" سے بنا ہے۔ یہ لفظ اُس وقت بولتے ہیں جب کسی چیز پر کئی برس گذر جائیں اور جب اِسے کھانے پینے کی چیزوں کے لئے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد اُن کا سڑ جانا اور اُن میں بدبو پیدا ہو جانا مقصود ہوا کرتا ہے "لَمْ یَتَسَنَّہْ" کا مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں بدبو نہیں پیدا ہوئی تھی اور وہ سڑی نہیں تھیں حالانکہ اُن پر سو برس گزر گئے تھے۔ "نُنْشِزُ" کا مادہ "نَشْزٌ" ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن سڑی گلی ہڈیوں کو اپنی اپنی جگہ پر سے اُٹھنے کا حکم دیا اور اُنھیں آپس میں اُسی طرح جوڑ دیا جس طرح وہ اپنی پہلی زندگی میں جڑی ہوئی تھیں۔ بعض لوگوں نے اس لفظ کو "نُنْشِرُ ھَا" بجائے "ز" کے "ر" کے ساتھ پڑھا ہے جو "نَشر" سے بنا ہے اور اس کے معنی دوبارہ زندہ کرنے کے ہیں حاصل تقریباً دونوں قراءتوں کا ایک ہی ہے۔ یعنی اللہ نے اُن گلی سڑی ہڈیوں کو دوبارہ زندگی عطا فرمائی۔

"یہ نمرود" وہی ظالم بادشاہ تھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں جلانے کی کوشش کی تھی مگر اللہ نے اپنے اس عظیم بندہ کے لئے نمرود کی جلائی ہوئی آگ کو گلزار بنا دیا اور آپ اُس آگ میں ڈالے جانے کے بعد بھی بالکل محفوظ رہے بلکہ وہ پوری آگ بالکل ٹھنڈی ہو گئی۔ قرآن حکیم میں اللہ نے اس واقعہ کو سورۂ "انبیاء" میں بیان فرمایا ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل یہودیوں کی بعض کتابوں میں بھی ملتی ہے اور اب مزید تحقیق کے بعد یورپ کے محققوں نے بھی اس کو ایک "کہانی" نہیں بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی حیثیت سے تسلیم کر لیا ہے۔ پرانی تاریخ سے بھی اِس بات کا پتہ چلتا ہے کہ نمرود خدا کی طرح اپنی پرستش کراتا تھا۔ اُس نے بڑا اونچا تخت بنوایا تھا جس پر وہ اجلاس کیا کرتا تھا۔ عام طور پر اُس وقت کلدانیوں کا قومی مذہب سورج کی پرستش تھی اور اُسی کو وہ اپنا سردار

اور سب سے بڑا دیوتا سمجھتے تھے اور نمرود اپنے آپ کو سورج کا مظہر اعظم اور اوتار سمجھتا تھا۔ اُس وقت کے موحد اعظم حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام اور کافر و مشرک نمرود سے جب اللہ کی ہستی کے بارے میں مباحثہ ہوا تو سب سے پیشتر حضرت خلیل اللہ علیہ السلام سے اُس نے پوچھا کہ تمہارے پاس اِس کی کیا دلیل ہے کہ میں خدا نہیں ہوں تو آپ نے فرمایا کہ اللہ تو سب کو زندگی عطا کرتا ہے اور موت بھی وہی دیتا ہے اور تجھ میں یہ بات نہیں ہے اُس نے فوراً دو مجرموں کو بلوایا پھر ایک کو قتل کرا دیا اور دوسرے کو چھوڑ دیا اور کہنے لگا کہ دیکھو میں نے ایک کو زندگی دیدی اور دوسرے کو مار ڈالا تو اب سوائے میرے کوئی دوسرا خدا نہیں ہو سکتا یہ سنکر موحدِ اعظم ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اچھا اگر یہ بات تیری سمجھ میں نہ آسکی تو اس کا جواب دے کہ میرا خدا سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو خدا ہے تو پھر مغرب کی طرف سے سورج کو نکال دے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا استدلال پہلے بھی اسی بنیاد پر تھا کہ کائنات پر اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہے اور دوسرا استدلال بھی اسی بنیاد پر تھا صرف مثال اور طریقہ بدل گیا تھا اور خاص طور پر آپ نے سورج کا اس غرض سے ذکر کیا کہ وہی کلدانیوں کا خدائے اعظم تھا۔ یہ بات سُن کر نمرود اس طرح حیران رہ گیا کہ پھر وہ کچھ بول ہی نہ سکا اور ساری مملکت کے سامنے نمرود اور اُس کے مصنوعی خدائے اعظم "سورج دیوتا" کی اور خود نمرود کی بے بسی پوری طرح نمایاں ہو گئی اور یہ ثابت ہو گیا کہ کائنات کی جتنی چیزیں ہیں خواہ وہ سورج ہو یا کوئی اور چیز سب کی سب کسی کے بنائے ہوئے نظام تکوینی کی پابند ہیں اور اس نظام میں عالم کی کوئی طاقت ردّ و بدل نہیں کر سکتی اور وہی قادرِ مطلق جس نے ایسا مضبوط و مستحکم نظام بنایا ہے تمام جہان کا پروردگار ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے اس واقعہ کو بیان کر کے پھر حضرت "عُزیرؑ" کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِن کا زمانۂ نبوت حضرت مسیحؑ سے تقریباً پانچسو برس قبل کا ہے۔ مفسروں کی اکثریت نے اس واقعہ کی حضرت عُزیرؑ ہی کی طرف نسبت دی ہے مگر بعض نے کچھ اور انبیاء کا ذکر کیا ہے۔ جس بستی کا یہاں ذکر ہے اُس کے لئے بھی مفسروں کی اکثریت اِسی طرف گئی ہے کہ اس سے مراد اُورشلم یعنی بیت المقدس ہے۔ اِس شہر کو "بخت نصر" بادشاہ نے ۵۸۶ ء قبل مسیحؑ میں بالکل تاراج کر ڈالا تھا۔ جب حضرت عُزیرؑ اس طرف سے گذرے اور اُس ویران بستی پر نظر پڑی تو بے چین ہو گئے اور فرمانے لگے کہ اللہ! یہ ویران بستی کس طرح زندہ ہو گی۔ یہاں ہمیں اس بات کو پوری طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرت عُزیرؑ مُردوں کے دوبارہ زندہ ہو سکنے میں شک و شبہ کا اظہار نہیں کر رہے تھے بلکہ اُن کی حیرت اللہ کی قدرت پر تھی کہ وہ اس ویرانی اور تباہی کے بعد بھی اس پر کامل قدرت رکھتا ہے کہ ان بے جان ذرّوں کو دوبارہ خلعتِ حیات پہنا دے اور زندگی عطا کر دے کیونکہ آخرت کی زندگی اور حشر و نشر پر تو عام مومنوں کو بھی یقین ہوتا ہے چہ جائیکہ ایک پیغمبر جسے اللہ نے اپنی نیابت کے منصب جلیل سے سرفراز فرمایا ہو۔

غرض اس کے بعد فوراً حضرت عزیرؑ کی روح جسم سے نکل گئی اور اُن کی سواری کا گدھا بھی مرگیا یہاں تک کہ اسی حالت میں سو برس گذر گئے۔ اس عرصہ میں بیت المقدس پھر سے آباد ہوگیا۔ اُس وقت اللہ نے حضرت عزیرؑ کو زندہ کیا اور فرشتہ کے ذریعہ سے اُن سے دریافت کیا کہ اب تک کتنا زمانہ گذرا ہوگا چونکہ صبح کے وقت اُن کی روح نکلی تھی اور جب دوبارہ حیات ملی تو شام کا وقت تھا اس لئے حضرت عزیرؑ نے کہا کہ کوئی ایک دن گزرا ہوگا اس پر اللہ نے انھیں بتایا کہ ایک روز نہیں بلکہ سو برس گزر چکے ہیں اُن کے سامنے اُن کے گدھے کی ہڈیاں بکھری ہوئی پڑی تھیں مگر جو کھانے پینے کی چیزیں تھیں وہ اُسی طرح باقی رہیں اور ذرا سی بھی خرابی اُن میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کے بعد اللہ کی قدرت سے وہ سواری کا گدھا زندہ ہوگیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر حضرت عزیرؑ پکار اُٹھے کہ میں تو پہلے ہی سے جانتا ہوں اور یقین رکھتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

درحقیقت ان تمام واقعات کا جنھیں قرآن حکیم نے بیان کیا ہے یہی ایک عظیم تر پہلو ہے کہ انسان اپنی عاجزی اور اللہ کی قدرتِ کاملہ کو پوری طرح سمجھ لے اور اپنے مقصدِ تخلیق کو سمجھ کر احکامِ خداوندی پر کاربند ہوجائے تاکہ وہ اُس منصب اور اُس مقام کو حاصل کرسکے جس کے لئے اللہ نے اُسے پیدا کیا ہے۔

(درس ۵۲) اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ○

(پارہ ۳ رکوع ۶ کی درمیانی ۲ آیات سورۃ البقرۃ)

جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ (قیامت میں) نہیں کھڑے ہوں گے مگر جس طرح وہ شخص کھڑا ہوتا ہے جسے شیطان چھو کر خبطی بنا دے۔ یہ حالت اِس لئے ہوگی کہ وہ کہتے تھے کہ بیع بھی تو سود ہی کی طرح ہے حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔ پھر جس کسی کو اُس کے پروردگار کی طرف سے نصیحت پہنچ گئی اور وہ باز آگیا تو جو پہلے ہوچکا وہ اُسی کا ہے اور اُس کا معاملہ اللہ کے حوالہ ہے اور جو شخص پھر سود لینے لگے تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں وہ اُس میں ہمیشہ پڑے رہیں گے۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور اللہ کسی ناشکرے گنہگار کو دوست نہیں رکھتا۔

تشریح وتفسیر: "الرّبٰو" "ربُوٗ" سے بنا ہے۔ اِس کے اصلی معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں

لیکن عام طور پر اس سے مراد مال کی زیادتی اور منفعت ہوتی ہے جو راس المال یعنی اصل رقم کے علاوہ ہو "یَتَخَبَّطُہُ" "خَبْطٌ" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو اندھا دھند مارنا جیسے اونٹ کا اپنے پاؤں زمین پر بے تحاشا مارنا یا لکڑی سے درخت کے پتے جھاڑنا۔ اسی مناسبت سے شیطان کے ساتھ "یَتَخَبَّطُ" کا لفظ جو یہاں بولا گیا ہے، اُس سے مراد ہے شیطان کا کسی شخص کو سخت اذیت دینا اور اُسے خبطی اور دیوانہ بنا دینا۔ "مَحْقٌ" کے معنی مٹانے اور باطل کرنے کے ہیں جبکہ "اِرْبَاءٌ" کے معنی بڑھانے اور زیادہ کرنے کے ہیں۔ "صَدَقَةٌ" سے مراد ہر وہ چیز ہے جو انسان اپنے مال سے تقرّب الٰہی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے یعنی خیرات جو ثواب کی نیت سے دی جائے۔ کبھی یہ لفظ 'زکوٰۃ' کے لئے بھی بولا جاتا ہے جیسے سورۂ توبہ میں "اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ" فرما کر زکوٰۃ فرض مراد لی گئی ہے۔ "کُفْر" کے لفظی معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں اور اسی مناسبت سے رات کو بھی کافر کہا گیا ہے کیونکہ وہ بھی اپنی تاریکی سے چیزوں کو چھپا لیتی ہے۔ ثَعْلَبَہ بن صُعَیْر مَازِنِی، زمانۂ جاہلیت کے ایک مشہور شاعر کا مصرع ہے "اَلْقَتْ ذُکَاءُ یَمِیْنَهَا فِیْ کَافِرٍ" شتر مرغ کا جوڑا جب اپنے رہنے کی جگہ کی طرف شام کو صحرا سے پلٹتا ہے۔ اُس منظر کو بیان کرتا ہے کہ سورج نے اپنا داہنا ہاتھ رات کے اندر ڈال دیا تھا یعنی وہ غروب ہو گیا تھا۔ اور اسی معنی کی مناسبت سے اللہ کے منکر کو بھی کافر کہتے ہیں اور نعمتوں کے منکر اور ناشکرے کو بھی۔ تلاوت کردہ آیت میں "کَفَّار" مبالغہ کے معنی میں آیا ہے یعنی بہت زیادہ ناشکری کرنے والا۔ "اِثْمٌ" کے معنی یہاں گناہ کے ہیں۔ اسی سے "اَثِیْمٌ" بنا ہے اور معنی ہیں گنہگار۔

ان آیاتِ کریمہ سے قبل اُن لوگوں کا ذکر کیا گیا تھا جو اللہ کی راہ میں خیرات دیتے ہیں اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے نیک کاموں میں اپنی پاک کمائی خرچ کرتے ہیں اور زکوٰۃ وغیرہ کی قسم سے جو حقوق اُن پر مقرر کر دیئے گئے ہیں اُن کو ادا کرتے ہیں اور اپنے مستحق رشتہ داروں اور دوسرے حاجتمندوں کی خبر گیری اور امداد و اعانت کرتے ہیں اور جن کے دلوں میں دوسروں کے برے وقت میں کام آنے کا جذبہ اور تڑپ موجود ہوتی ہے۔ ان نیک اور اللہ کے اطاعت گزار بندوں کا تذکرہ کرنے کے بعد اب اُن لوگوں کا ذکر کیا جا رہا ہے جو دوسروں کی مدد اور اُن کے ساتھ ہمدردی کرنے کے بجائے اُن پر ظلم کرتے ہیں، اُن کی غربت اور بے بسی سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں اور اپنے شخصی مفاد کے لئے اُن کا طرح طرح سے استحصال کرتے ہیں اور اُن کے خونِ ناحق سے اپنی زندگی اور عیش و عشرت کے چراغ روشن کرتے ہیں۔ تو اس سلسلہ میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جو لوگ سود کھاتے ہیں جب قیامت میں وہ اپنی قبروں سے اُٹھیں گے تو دیوانوں اور مجنون لوگوں کی طرح ہوں گے یعنی وہ سیدھے کھڑے بھی نہ ہو سکیں گے اور اس طرح چلیں گے

جیسے پاگل چلتے ہیں۔ ذکر تو یہاں قیامت کا ہے لیکن سود خواروں کی حالت دنیا میں بھی کچھ اسی طرح کی ہوا کرتی ہے۔ یہ لوگ روپیہ کی فکر میں دیوانہ وار پھرتے رہتے ہیں اور ہر وقت اُن کے ذہنوں پر سود کا بھوت سوار رہا کرتا ہے اور حرص و ہوس کے یہ دیوانے کسی کی عزت و آبرو برباد کرنے اور اُس کی زندگی اور سب کچھ مٹا دینے کے لئے کسی ظلم سے بھی دریغ نہیں کرتے اِس طرح اُن کے سود کی ایک ایک پائی کے سامنے انسانی زندگی اور اُس کی عزت و وقار کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ عربی زبان میں "مس شیطانی" سے مراد جنون لیا جاتا ہے۔ اِسی محاورہ کو ان آیات میں بولا گیا ہے۔ یہ مقصود نہیں ہے کہ جنون کا مرض شیطان ہی کے عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ سود کے کاروبار کے لئے حضرت جابرؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک حدیث نقل کی ہے جس میں آپ نے سود کھانے والے یعنی اُس سے کسی طرح کا بھی فائدہ اٹھانے والے پر سود دینے والے پر یا اس کے لئے تحریر و دستاویز لکھنے والے اور گواہی دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ شبِ معراج حضورؐ کو کچھ لوگ دکھائے گئے تھے جن کے پیٹ بے حد بڑے بڑے تھے اور اُن کے اندر سانپ بھرے ہوئے تھے جو اُنہیں ڈس رہے تھے آپ نے حضرت جبریل علیہ السلام سے دریافت فرمایا کہ یہ کون لوگ ہیں تو اُنھوں نے عرض کی یہ سود خوار لوگ ہیں۔ اسلام نے سود خواری کو بدترین گناہ قرار دیا ہے چنانچہ علامہ حافظ ابن ماجہ اور دوسرے محدثین اسلام نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث کثرت کے ساتھ نقل کی ہے۔ الربا سبعون حوبًا ایسرھا ان ینکح الرجل امہ۔ سود اس قدر بڑا گناہ ہے کہ اگر اس کو ستر اجزاء میں تقسیم کر دیا جائے تو اس کا ایک ہلکے سے ہلکا جزو اس عظیم گناہ کے برابر ہوگا کہ کوئی شخص اپنی ماں کو اپنی زوجہ قرار دے۔ اس گناہ کی اسی شدت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تلاوت کردہ آیات کے بعد کی آیتوں میں سود خواری کے عمل کو اور سودی معاملات کرنے کو اللہ اور رسولؐ سے جنگ کرنے کا درجہ دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ایک مسلمان کے لئے گناہ کی شدت کا کوئی تصور ممکن ہی نہیں ہو سکتا اس کے ساتھ ہی تلاوت کردہ آیات میں فرمایا گیا ہے کہ سود خواروں کی یہ حالت قیامت میں اس لئے ہوگی کہ اُنھوں نے سود کے معاملہ کو عام بیع و شراء کا درجہ دیا تھا اور بیع کی طرح اُسے بھی حلال سمجھ رکھا تھا اور یہ کہتے تھے کہ مالی نفع آخر تجارت میں بھی تو ہوتا ہے تو پھر جب بیع و شراء اور بیوپار حرام نہیں ہے تو سود کیوں حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ یہ دونوں چیزیں ایک سطح پر کسی طرح بھی نہیں ہو سکتیں نہ تو اخلاقی حیثیت سے اور نہ معاشی اور اقتصادی حیثیت سے۔ سود کی تو ایک معین رقم ساہوکار اور مہاجن کو ہر حال میں ملنا ہے خواہ سود پر قرض لینے والے کا کچھ بھی حال ہو جائے۔ زندہ درگور ہو کر رہے، تباہ و برباد ہو جائے

اُس کی عزت و آبرو سب مٹ جائے یا اُس کی زندگی ہی ختم ہو جائے لیکن ساہوکار کے سود کی تلوار اُس کی جان، عزت و آبرو اور اُس کی زندگی کے ہر لمحہ پر کھچی رہے گی اور اس کام میں سود خوار کو کسی قسم کی محنت کرنے کی تکلیف گوارا نہیں کرنا پڑتی مگر اُس کے برخلاف تجارت کرنے والے کو شدید محنت کرنا ہوتی ہے اُسے مصیبتیں اُٹھانا پڑتی ہیں، اپنا خون اور پسینا ایک کرنا ہوتا ہے اور اس سخت محنت کے باوجود اُس کو ہر وقت نفع اور نقصان دونوں کا خطرہ لگا رہتا ہے اور کبھی کبھی اس محنت اور ذہانت اور عمل پیہم اور سعی و جہد مسلسل کے باوجود اُسے خسارہ کے شدید جھٹکے بھی برداشت کرنا ہوتے ہیں اور نتیجہ میں کبھی وہ اپنا سب کچھ گنوا بیٹھتا ہے پھر تجارتی کاروبار تو پیدا ہو کر ختم ہو تا رہتا ہے مگر سود خوار کے مطالبات کا وزن مدت اور مہلت کے ساتھ بڑھتا ہی رہتا ہے اس کے ساتھ ہی بیع و شرا میں تو ایک چیز کے عوض میں دوسری چیز موجود ہوتی ہے مگر سود کے عوض میں دوسری طرف کوئی چیز نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ یہ آرام کے ساتھ بے عمل رہ کر مفت خوری کی ایک بدترین شکل ہے۔ اسلام میں سود کے جواز کی کوئی گنجائش موجود نہیں ہے۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اعلان فرما دیا تھا کہ: وَرِبَا الجاھلیۃ موضوعٌ "زمانۂ جاہلیت کے تمام سود باطل کر دیئے گئے۔ بنی نوع انسان کی رگ رگ سود خوار ول کے خونخوار پنجوں میں دبی ہوئی تھی، غریب اور بے بس لوگ سود کی بے رحم تلوار کے نیچے سسک رہے تھے۔ حضورؐ کے اس روح پرور اعلان نے اُن کے گلوں سے سود خواروں کی غلامی کے طوق اُتار پھینکے اور دنیا کے مسلم معاشرہ کو اقتصادی و معاشی نجات و فلاح کا ایک ایسا وسیلہ ہاتھ آگیا جس پر عمل کر کے وہ ہر قسم کی سربلندی حاصل کر سکتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ لوگ اپنی بدنصیبی کی وجہ سے اس پر عمل نہ کریں اور اس کے فائدوں سے محروم رہ جائیں۔ سود کی بحث چونکہ بعد کی آیتوں میں بھی ہے اس لئے آئندہ اس موضوع پر کسی قدر تفصیل سے بحث کی جائے گی۔

(درس ۵۳) اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَہُمۡ اَجۡرُہُمۡ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَلَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ○ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَذَرُوۡا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰۤوا اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ○ فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا فَاۡذَنُوۡا بِحَرۡبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ ۚ وَاِنۡ تُبۡتُمۡ فَلَکُمۡ رُءُوۡسُ اَمۡوَالِکُمۡ ۚ لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ○ وَاِنۡ کَانَ ذُوۡ عُسۡرَۃٍ فَنَظِرَۃٌ اِلٰی مَیۡسَرَۃٍ ؕ وَاَنۡ تَصَدَّقُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ○ وَاتَّقُوۡا یَوۡمًا تُرۡجَعُوۡنَ فِیۡہِ اِلَی اللّٰہِ

ثُمَّ تُوَفّٰی کُلُّ نَفْسٍ مَّا کَسَبَتْ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ ○

(پارہ ۳ سورۃ البقرۃ رکوع ۶ کی آخری ۵ آیات کریمہ)

بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیئے اور نماز کی پابندی کی اور زکوٰۃ ادا کی اُن کے لئے اُن کا ثواب اُن کے پروردگار کے پاس ہے اور اُن پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اے ایمان والو اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اُسے چھوڑ دو اگر تم ایمان والے ہو لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا تو پھر اللہ اور اُس کے رسولؐ سے جنگ کرنے کے لئے خبردار ہو جاؤ اور اگر تم نے توبہ کرلی تو تمہارے اصل مال تمہارے ہی ہیں نہ تم (کسی پر) ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائے اور اگر کوئی تنگدست ہو تو اُسے آسودگی تک مہلت ہے اور اگر تم معاف کر دو تو تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے اگر تم علم رکھتے ہو اور اُس دن سے ڈرتے رہو جس میں تم سب اللہ کی طرف پلٹائے جاؤ گے پھر ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

تشریح و تفسیر: "ذَرُوْا مَا بَقِیَ مِنَ الرِّبٰوا" میں "ذَرُوْا" "وَذْرٌ" سے بنا ہے جس کے ایک معنی ترک کرنے اور چھوڑ دینے کے ہیں جو اس جگہ پر مراد ہیں اور یہ حکم اور امر کے مفہوم میں جمع کا صیغہ ہے جس کے مخاطب وہ تمام لوگ ہیں جنہوں نے سود کھانے سے توبہ کرلی ہو "فَاْذَنُوْا" میں اس کے اصلی مصدر "اِذْنٌ" سے یہاں مقصود ہے کسی بات کو سُن کر سمجھ لینا اور جان لینا یعنی تم سب جان لو اور خبردار ہو جاؤ کہ سود کا لین دین اور رسولؐ سے جنگ کرنے کے برابر ہے۔ "نَظِرَۃٌ" کے معنی ہیں دیر کرنا اور تاخیر کرنا "مَیْسَرَۃٌ" کے معنی آسانی، کشائش اور فراخی و خوش حالی کے ہیں۔ "تُوَفّٰی" مجہول کا صیغہ ہے۔ "تَوْفِیَہ" مصدر ہے۔ معنی ہیں بغیر کسی کمی کے کسی کے حق کو پورا پورا دیدینا۔

تلاوت کردہ آیات کی ابتدا اُن ایمانداروں کی تعریف سے کی گئی ہے جو اللہ کے احکام پر عمل کرتے ہیں اُس کی مخلوق کے ساتھ احسان اور اچھے سلوک سے پیش آتے ہیں، پابندی سے نماز پڑھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ ایسے نیک لوگوں کو قیامت میں کوئی رنج اور خوف نہ ہوگا اور اللہ کی بارگاہ سے اُنھیں اُن کے نیک اعمال کا پورا پورا بدلہ عطا کیا جائے گا۔ یہ فرما کر دوبارہ سود کا ذکر کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اُس کی حرمت کا حکم آجانے کے بعد نہ صرف یہ کہ اُس کا لین دین قطعی طور پر بند کر دیا جائے بلکہ اس حکم سے پیشتر کا جو کچھ بقایا سود ہو اُس کو بھی چھوڑ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس کا بھی اعلان فرمایا گیا ہے کہ سود کی اس حرمت اور ممانعت کے بعد بھی کوئی مسلمان اگر سود کا لین دین کرے گا یا اس حکم حرمت سے قبل کے بقایا سود کا مطالبہ کرے گا تو اُس کو اللہ اور رسولؐ سے جنگ کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔

چونکہ یہ حکم کسی محدود زمانہ یا کسی معین جگہ کے لئے نہیں ہے اس لئے اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ جب بھی کوئی شخص اسلام اختیار کرے تو اس سے قبل حالت کفر میں وہ جو سودی لین دین کرتا تھا اُس کی اُس سے باز پرس نہ ہو گی جس کی طرف اس سے قبل کی آیات میں "فَلَهُ مَا سَلَفَ" کا جملہ خاص طور پر اشارہ کر رہا ہے۔

مفسرین اسلام نے اس کی تصریح کی ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں ثقیف کے قبیلہ بنی عمرو بن عمیر اور بنی مخزوم کے قبیلہ بنی مغیرہ کے درمیان سود کا کاروبار جاری تھا اسلام لانے کے بعد بنی عمرو نے بنی مغیرہ سے اپنا سود طلب کیا تو انھوں نے کہا کہ اب ہم اسلام لانے کے بعد اُسے ادا نہ کریں گے۔ اس جھگڑے کی خبر حضرت عتاب بن اُسید عامل مکہ کو ہوئی تو انھوں نے اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مطلع کیا سرورِ کائنات نے اُن کے جواب میں یہ آیت قرآنی اُنھیں بھیجدی اور اللہ کے اس حکم سے آگاہ فرمایا کہ حالتِ کفر کا بقایا سود اسلام لانے کے بعد مسلمان سے نہیں لیا جا سکتا چنانچہ بنی عمرو اس سے تائب ہو گئے اور اُنھوں نے اپنے تمام سودی مطالبات چھوڑ دیئے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر اس حکم حرمت کے آجانے کے بعد مسلمان سودخواری کی معصیت سے توبہ کریں گے تو اُن کا پچھلا اصل سرمایہ اُنھیں اسلامی حکومت دلوا دے گی لیکن اگر اُنھوں نے اس فعل سے توبہ نہ کی تو پھر وہ اصل سرمایہ سے بھی محروم کر دیئے جائیں گے اور وہ بحق حکومت اسلامی ضبط ہو جائے گا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ تم خود کسی دوسرے پر ظلم نہ کرو اور دوسرا شخص بھی تم پر ظلم نہ کرنے پائے۔ قرض دینے والے کا ظلم یہ ہے کہ وہ قرض لینے والے سے اصل رقم پر سود لے اور قرض لینے والے کا ظلم یہ ہو گا کہ وہ اصل رقم ہی ہضم کر جائے۔ اسلام دونوں کے ساتھ انصاف چاہتا ہے تاکہ کوئی شخص بھی اپنے جائز حد سے تجاوز نہ کرے اور اپنے حقوق سے بھی محروم نہ کیا جا سکے۔ پھر ارشاد ہوا ہے کہ اگر تمہارے کسی قرضدار کے پاس اس قدر مال نہ ہو کہ وہ تمہارے مقرر کئے ہوئے وقت پر قرضہ ادا کر سکے اور وہ مجبور و پریشان حال ہو تو اُسے کچھ اور مہلت دیدو اور اُس پر سختی نہ کرو اور اُس جدید مہلت کا بھی کوئی معاوضہ طلب نہ کرو بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ ایسے تنگدست اور مجبور لوگوں کے ذمہ جو تمہارا قرض ہو اُسے معاف ہی کر دو۔ مفسرین نے ایسے کثیر واقعات کا ذکر کیا ہے جب اہلبیت اطہار اور اصحاب کرام نے ایسے مجبور لوگوں کے لئے بڑے بڑے قرضے معاف کئے تھے اور اُن سے اپنی قرض دی ہوئی رقم واپس نہیں لی گئی۔ حدیث میں ہے کہ اگر کوئی مسلمان خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے غازی کی مدد کرے یا کسی مجبور ولاچار قرضدار کے لئے آسانی پیدا کرے اور اُس کی اعانت کرے یا کسی غلام کو آزادی دلوانے میں سعی کرے تو قیامت کے دن اللہ

اُسے اپنے سایۂ رحمت میں جگہ عطا فرمائے گا جب کہ اُس کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ موجود نہ ہوگا مسند احمد میں ایک اور حدیث ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ جو شخص کسی مفلس و تنگدست سے اپنا قرضہ وصول کرنے میں نرمی کرے اور اُسے مہلت دے تو جتنے دن تک وہ قرضدار اپنے قرض کی رقم ادا نہ کرسکے گا تو قرض دینے والے شخص کو مہلت دینے کے عوض میں مہلت کے ہر دن میں قرضہ کے برابر رقم خدا کی راہ میں خیرات کرنے کا ثواب ملتا رہے گا۔ اسلام چونکہ انسانی معاشرہ کی ترقی و فلاح چاہتا ہے اسی لئے اُس نے سود خواری کے تمام طریقوں کو حرام کیا ہے کیونکہ سود خواری کی بنیاد ہی اس ترقی و فلاح کے نظریہ کے منافی ہے۔ سودی نظام ایک شخص کو خوش حال کرتا ہے تو سیکڑوں کو تباہ حال بنا دیتا ہے جبکہ اسلام سب ہی کو خوشحال بنانا چاہتا ہے۔ سودی نظام کی بنیاد سود خوار کے یک طرفہ فائدہ پر ہے اور اس میں باہمی جذبۂ تعاون و ہمدردی کا کوئی پاس و لحاظ نہیں ہوتا اور اسی لئے وہ اپنے قرضدار کے نقصانات سے قطعاً بے پروا ہوتا ہے جبکہ اسلام چاہتا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ مکمل تعاون کرے یعنی اُس کے نفع اور نقصان دونوں میں اُس کا شریک حال رہے۔ اور اسی لئے اداروں یا اشخاص کے وہ تمام قرضے جن میں نفع لینے کی تو شرط رکھی گئی ہو مگر نقصان میں شرکت کی کوئی ذمہ داری نہ لی گئی ہو یعنی تجارتی مشارکت کے بجائے یک طرفہ بنیاد پر صرف نفع لینے کی شرط ہو جو مسلّم طور پر "ربا" ہے کسی طرح جائز نہیں ہوسکتے۔ چاہے وہ قرضے شخصی مصارف کے لئے ہوں یعنی (Consumptive) بنیاد پر ہوں یا منفعت بخش مقاصد کے لئے دیئے جائیں یعنی وہ (Productive) بنیاد پر ہوں۔ دونوں صورتوں اور حالتوں میں قرضہ کی رقم پر سود لینا حرام ہے (Productive Loan) یعنی منفعت بخش مقاصد کے لئے قرضہ پر سود لینے کا ایک انتہائی خطرناک پہلو یہ بھی ہے کہ اُس کی وجہ سے قرضہ لینے والے لوگ اپنی مصنوعات کی قیمت مقرر کرنے میں اپنے پورے مصارف اور اپنے بھرپور نفع کے ساتھ ہی لازمی طور پر سود اور قرضہ کی اصل رقم کی ادائیگی کو بھی شامل کریں گے جس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ تمام مصنوعات اور اشیاءِ صرف کی گرانی کی کوئی حد باقی نہ رہے گی اور پوری قوم ہمیشہ سخت ترین تجارتی اور اقتصادی بحران میں مبتلا رہے گی اور صرف چند آدمی اپنی من مانی دولت سمیٹتے رہیں گے اور اس طرح مختصر طور پر اس وقت بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ سود خواری سرمایہ دارانہ بُرائیوں اور معاشرتی اقتصادی اور اخلاقی خرابیوں کی ایک بہت بڑی بنیاد ہے اور بڑی گہری جڑ ہے اسی وجہ سے اسلام نے سود خواری کی ہر ممکن شکل کو حرام کر دیا ہے اور یہاں تک بھی حکم دیا گیا ہے کہ جس معاملہ میں سود خواری کا شبہہ بھی پایا جاتا ہو اُس کو بھی چھوڑ دو۔ اس حکم حرمت سے صرف وہ مجبور اور بے بس لوگ مستثنیٰ ہیں جو سود پر

قرضہ لینے کے لئے اُس طرح مجبور ہوں جیسے کوئی جاں بلب بھوکا کبھی مردار کھانے پر اپنی زندگی بچانے کے لئے مجبور ہو جائے یا کسی کے گھر میں لاش پڑی ہو اور اُس کے پاس اس قدر پیسہ نہ ہو کہ وہ اُس کے دفن و کفن کا انتظام کر سکے تو ایسے مجبور اور لاچار شخص کے لئے سودی قرض بدرجۂ مجبوری اور بقدر ضرورت جائز ہوگا۔ مجبوری کے تمام مواقع پر اسی معیار کو سامنے رکھنا چاہیے جس میں تعیش کا ذرا سا بھی شائبہ نہ آنے پائے۔ مگر یہاں اسے بھی نہ بھولنا چاہیے کہ اگر کسی جگہ کوئی شخص اس مجبوری کی حالت پر پہنچ جائے تو وہ پورا معاشرہ گناہگار ہوگا جس نے اُس کی اِس حالت کا پورا علم رکھتے ہوئے اُس کی طرف سے غفلت کی ہو اور اُس کی اعانت نہ کی ہو اور اسی کے ساتھ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ سودی قرضہ دینے والے مسلمان پر اپنے قرضدار سے سود لینے پر اس طرح کی کوئی مجبوری اور بےبسی کسی وقت بھی نہیں ہو سکتی اس لئے وہ تو کسی حال میں اِس معصیت سے نہیں بچ سکتا۔

(۲۸۲) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَـيْـــًٔـا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ ھُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىھُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْـَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْھَا ۭ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۠ وَلَا يُضَاۗرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ڛ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ○

(پارہ ۳ سورۃ البقرۃ رکوع ۷ کی پہلی ایک آیت)

اے ایمان والو جب تم آپس میں ایک دوسرے سے ایک مقررہ مدت کے لئے قرض کا معاملہ کرو تو اُسے لکھ لیا کرو اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے

سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اُسے تعلیم دی ہے پس چاہیے کہ وہ لکھ دے اور چاہیے کہ وہ شخص لکھوائے جس کے ذمہ حق واجب ہو اور چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اُس کا پروردگار ہے اور اس میں سے کچھ بھی کم نہ کرے پھر اگر وہ شخص جس کے ذمہ حق واجب ہے کم عقل یا کمزور ہو یا وہ خود لکھوانے کی قدرت نہ رکھتا ہو تو لازم ہے کہ اُس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوا دے اور اپنے مردوں میں سے دو کو گواہ بنا لیا کرو پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ایسے گواہوں میں سے جنہیں تم پسند کرتے ہو تاکہ اگر اُن دو عورتوں میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور گواہ جب بلائے جائیں تو انکار نہ کریں اور قرض کا معاملہ خواہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو اُس کی میعاد بھی لکھنے میں کاہلی نہ کرو یہ لکھنا اللہ کے نزدیک زیادہ قرینِ عدل ہے اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والا ہے اور اس کا زیادہ سزاوار ہے کہ تم کسی شبہہ میں نہ پڑو مگر یہ کہ کوئی سودا دست بدست ہو جو آپس میں تم کرتے ہی رہتے ہو تو اس کے نہ لکھنے میں تم پر کوئی الزام نہیں اور خرید و فروخت کے وقت گواہ کر لیا کرو اور کسی کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر تم ایسا کرو گے تو اس میں تم کو گناہ ہوگا اور اللہ سے ڈرتے رہو اور اللہ تم کو تعلیم دیتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

تشریح و تفسیر: "تَدَایَن" "دَین" سے بنایا گیا ہے معنی ہیں قرض کا لین دین کرنا۔ "یَاْبیٰ" کا مصدر "اِبَاءٌ" ہے جس کے معنی شدت سے انکار کرنے کے آتے ہیں "یُمْلِلُ" کا مصدر "اِملال" ہے "املال" اور "املاء" دونوں کے معنی تحریر لکھوانے کے ہیں۔ اس معنی میں اہل حجاز املال بولتے ہیں اور بنی تمیم املاء کہتے ہیں قرآن میں دونوں طرح آیا ہے۔ "تَبَایُع" کے معنی ہیں خرید و فروخت کرنا۔ "بیع" بیچنے کو کہتے ہیں اور "شراء" خریدنے کو لیکن کبھی کبھی ایک کو دوسرے کے معنی میں بھی بولتے ہیں چنانچہ قرآن مجید میں اس کی مثالیں موجود ہیں "فُسُوق" سے مراد ہے اللہ کے حکم کے خلاف کرنا اور جو حد اُس نے معین فرما دی ہے اُس سے نکل جانا۔

اس آیہ کریمہ میں حکم خداوندی ہے کہ جب ادھار کا کوئی معاملہ کیا جائے تو اُس کی خوب لکھا پڑھی کر لی جائے تاکہ کوئی غلط فہمی اور بھول چوک باقی نہ رہنے پائے۔ یہ حکم مدینہ والوں کے معاملات سے متعلق تھا مگر اسلام کی تعلیمات چونکہ دائمی ہیں اس لئے یہ حکم بھی ہر دور اور ہر زمانہ کے لئے ہے اور ظاہر ہے کہ اس پر عمل کرنے سے لوگ ہزاروں مقدمات اور جھگڑوں اور فسادات سے محفوظ ہو سکتے ہیں ورنہ کسی تحریر اور دستاویز نہ ہونے کی صورت میں سیکڑوں اختلافات پیدا کئے جا سکتے ہیں خصوصاً ایسی حالت میں جب زبانی کسی شہادت کا وجود بھی نہ رہے اور معاملہ کرنے والے خود بھی زندہ نہ ہوں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص قرض کے معاملہ کو تحریر کرے وہ عدل و انصاف کے ساتھ

بالکل ٹھیک لکھا کرے اور تحریر میں کسی فریق کے ساتھ ناانصافی نہ کرے پھر یہ کہ جو لکھا پڑھا آدمی ہو وہ بلا کسی صحیح عذر کے لکھنے سے انکار نہ کرے۔ خدا کا یہ احسان ہے کہ اُس نے اُس شخص کو لکھنے پڑھنے کی توفیق عطا کی ہے تو اُس کی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ اَن پڑھ لوگوں کی مدد کرے اور اُن کا پڑھنے لکھنے کا کام کر دے۔ اس اخلاقی ذمہ داری سے مراد شرعی وجوب نہیں ہے بلکہ یہ صرف ثواب کا کام ہے اور مستحب ہے اور اگر کوئی اس کام پر اجرت لینا چاہے تو جائز ہے۔

ادھار معاملہ کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ مال ادا کر دیا جائے اور قیمت بعد میں دی جائے دوسرے یہ کہ قیمت پہلے دیدی جائے اور مال بعد میں دیا جائے۔ دونوں صورتیں صحیح اور جائز ہیں لیکن تمام شرائط اور مدت وغیرہ میں کوئی اجمال نہ ہو بلکہ ہر بات کو صاف صاف لکھ دیا جائے تاکہ بعد میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہ ہو سکے۔ یہ لکھا پڑھی کا حکم اس لئے نہیں دیا گیا ہے کہ اس سے کسی قسم کی بے اعتمادی ظاہر کرنا مقصود ہے بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ معاشرہ میں باہمی اختلاف کو ہوا نہ دی جا سکے اور آپس کے تمام معاملات بالکل صاف ستھرے رہا کریں اس لئے کہ معاملات صاف نہ رہنے اور مجمل رہجانے ہی کی وجہ سے آپس کے جھگڑے سر اٹھاتے ہیں اور بعض اوقات ان جھگڑوں میں خاندان اور قومیں اور ملک تباہی کی آگ میں جل کر ختم ہو جاتے ہیں۔ قرآن حکیم سے بہتر نظام حیات آج تک دنیا نہ لا سکی جس میں انسانی زندگی کے معمولی سے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹے مسائل کا حل بھی بتا دیا گیا ہے تاکہ انسان اپنے کسی شعبۂ زندگی میں بھی بے بس نہ رہے اور ہر دشواری پر قابو پانے کی راہ اُسے مل سکے اور فلاح و خوشحالی اور امن و اطمینان کی جس قدر صورتیں ممکن ہوں وہ ان سے فائدہ حاصل کر سکے۔ اس آیت میں آپس کی بد معاملگی کی تمام بنیادوں کو ختم کر دیا گیا ہے کیونکہ یہی ایک ایسا زہر ہے جو انسان کی اجتماعی و ملی حیات کو پارہ پارہ کر کے اس کو تباہی کے غار میں ڈال سکتا ہے۔ اس طرح یہ حکم دیا گیا ہے کہ آپس میں خرید و فروخت کرنے والے خود بھی پوری دیانت اور سچائی پر عمل کریں اور اگر اُن کی طرف سے کوئی تیسرا شخص لکھنے پڑھنے اور دوسری باتوں میں اُن کی نیابت کرے تو وہ بھی انصاف اور عدل کو کسی وقت بھی ہاتھ سے نہ جانے دے پھر یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اُس لکھنے والے کو بھی کسی طرح کا نقصان نہ پہنچایا جائے یعنی اُس کو مجبور کر کے کام نہ لیا جائے، بیگار نہ لی جائے، اُس پر زبردستی نہ کی جائے، اور اگر وہ اجرت طلب کرے تو اُسے پوری اجرت ادا کی جائے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ لکھنے والے کو احکام اور شرائط تحریر کا پورا علم ہونا چاہئے تاکہ وہ غلطیاں نہ کر سکے اور ناانصافی وغیرہ کا ارتکاب نہ ہو۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ جس کے ذمہ کوئی حق واجب الادا ہو وہ

خود دستاویز لکھے اور اگر وہ کسی مجبوری کی وجہ سے لکھنے کے قابل نہ ہو تو پھر اس کا ولی شرعی یا مختار اور نائب ووکیل یا کسی دوسرے ملک کے رہنے والے یا دوسری زبان بولنے والے کے لئے اُس کا ترجمان اُس دستاویز کو تحریر کرے مگر امانت و دیانت ہر حال میں شرط ہے۔ اس کے ساتھ ہی دو مسلمان گواہ بھی ہونا چاہئیں جو ہر طرح ثقہ اور قابلِ اعتماد ہوں اور اگر دو مسلمان مرد موجود نہ ہوں تو ایک مسلمان مرد اور دو مسلمان عورتیں بھی گواہ کی جا سکتی ہیں مگر دیانت اور حسنِ سیرت و کردار ہر ایک کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ گواہ کو گواہی دینے یا گواہ بننے سے انکار نہ کرنا چاہیئے جبکہ اسے اس کام کے لئے بلایا جائے بشرطیکہ اُسے کوئی عذر نہ ہو جو شرعی طور پر قابلِ تسلیم ہو۔ لیکن اگر تجارتی معاملات قرض کی صورت میں نہیں بلکہ دست بدست ہوں تو پھر لکھنے کی ضرورت نہیں ہے مگر گواہ پھر بھی مقرر کر لینا بہتر ہے تاکہ بعد میں کوئی نزاع نہ پیدا ہو سکے۔ "وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ" کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے۔ یعنی لکھنے والے اور گواہی دینے والے کو کسی طرح کا کوئی ضرر اور نقصان نہ پہنچایا جائے یا وہ خود اس معاملہ کے فریقوں کو کسی طرح کا ضرر نہ پہنچائے اور یہ دونوں ہی باتیں مقصود ہیں اور اہمیت کی حامل ہیں۔

(درس ۵۵) وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗۤ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ ۝ لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِىْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ ۝ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۚ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۗ وَاغْفِرْ لَنَا ۗ وَارْحَمْنَا ۗ اَنْتَ مَوْلٰنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝

(پارہ ۳ سورۃ البقرۃ رکوع ۷ کی آخری ایک آیت اور رکوع ۸ کی ۳ آیات)

اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ہو تو رہن رکھنے کی چیزیں قبضہ میں دی جائیں اور اگر تم میں سے کوئی کسی شخص پر بھروسا رکھتا ہے تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے اُسے چاہیئے کہ وہ دوسرے کی امانت کا حق ادا کردے اور چاہیئے کہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اُس کا پروردگار ہے۔ اور تم گواہی کو نہ چھپاؤ اور جو کوئی اُسے چھپائے گا اُس کا دل بے شبہ گنہگار ہے اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اُس کو خوب جانتا ہے۔ اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اگر تم اُس کو ظاہر کردو جو تمہارے دلوں میں ہے یا اُسے چھپائے رکھو اُس کا تم سے اللہ حساب لے گا پھر جسے چاہے گا بخشدے گا اور جس پر چاہے گا عذاب کریگا اور اللہ ہر چیز پر بڑا قدرت رکھنے والا ہے۔ رسول نے ایمان اختیار کیا اُس پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر نازل کیا گیا اور مومنین بھی اُس پر ایمان لائے۔ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور اُس کے فرشتوں پر اور اُس کی کتابوں پر اور اُس کے پیغمبروں پر ہم اُس کے پیغمبروں میں باہم کوئی فرق نہیں کرتے اور انھوں نے کہا کہ ہم نے سُن لیا اور ہم نے اطاعت کی اے ہمارے پروردگار ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ اللہ کسی شخص کو تکلیف نہیں دیتا مگر اُس کی طاقت کے مطابق۔ جو اچھا کام کرے گا اُس کا نفع اُسی کے لئے ہے اور جو بُرا کام کرے گا اُس کا وبال اُسی پر پڑے گا۔ اے ہمارے پروردگار اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے غلطی ہو جائے تو ہماری گرفت نہ فرما۔ اے ہمارے پروردگار ہم پر ویسا بوجھ نہ ڈال جیسا ہم سے پہلے کے لوگوں پر تو نے ڈالا تھا۔ اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ بوجھ نہ اُٹھوا جس کے اٹھانے کی ہم میں طاقت نہ ہو اور ہم سے درگذر فرما اور ہمیں بخشدے اور ہم پر رحم کر، تو ہی ہمارا کارساز ہے بس تو ہمیں کافروں کی قوم پر غلبہ عطا فرما۔

تشریح وتفسیر:۔ یہاں "رِهَانٌ" رَهْنٌ کی جمع ہے۔ "رَهْنٌ" اصل میں مصدر ہے جس کے معنے ہیں گروی رکھنا مگر اس کا استعمال "مَرْهُوْن" یعنی اس چیز کے لئے ہونے لگا جو گروی رکھی جائے اور قرض کے معاملات میں بطور ضمانت کے قرار دی جائے۔ یہاں گروی رکھی ہوئی چیزیں مراد ہیں۔ آیت میں "رِهَانٌ مَقْبُوْضَةٌ" سے مقصود وہ گروی رکھی ہوئی چیزیں ہیں جو قرض دینے والے کے قبضہ میں قرض لینے والے کی طرف سے دیدی جائیں "اٰثِمٌ قَلْبُهٗ" کا ظاہری طور پر مطلب تو یہ ہے کہ سچی گواہی کو چھپانے والے کا قلب گنہگار ہوگا مگر اصل میں اس سے مقصود یہ ہے کہ خود انسان گنہگار ہوگا۔ چونکہ تمام اعضائے بدن تک روح انسانی کے احکام قلب ہی کے ذریعہ سے پہنچتے ہیں اس لئے اس گناہ کی نسبت مجازی طور پر قلب ہی کی طرف دیدی گئی ہے جبکہ قلب انسانی ظہور گناہ کا صرف وسیلہ ہے اور اصلی گنہگار خود روحِ انسانی ہے۔ اس بحث میں یہ نکتہ بھی سامنے رہنا چاہیئے کہ قرآن وحدیث کی زبان میں

لفظ "قلب" اکثر و بیشتر مادی دل کے لئے نہیں بلکہ خود روح انسانی ہی کے لئے بولا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں پھر یہاں پر اس کے حقیقی معنی ہی مراد ہوں گے۔ اسی کے ساتھ یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ پیدا ہوتا ہے کہ چاہے ظاہر میں لوگ ایسے شخص کو جو سچی گواہی کو چھپا دینے کے جرم کا مرتکب ہوا ہو کیسا ہی بیگناہ سمجھیں اور اُس کی یہ حرکت کسی پر ظاہر نہ ہو سکے مگر اُس کی روح گنہگار ہونے سے بچ نہ سکے گی "اصر" کے معنی بوجھ کے ہیں اور یہاں اس سے مراد وہ احکام ہیں جن پر عمل کرنے میں بہت زیادہ مشقت اور دشواری برداشت کرنا پڑے۔

ان آیاتِ کریمہ کی ابتداء میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ اگر کوئی شخص سفر میں ہو اور وہاں اُسے کسی سے کچھ قرض لینا پڑے اور لکھا پڑھی کرنے کے لئے کوئی کاتب نہ ملے یا اور کوئی دشواری ہو جس کے سبب سے دستاویز وغیرہ کی تیاری نہ کی جا سکے تو قرضہ کے عوض میں جس شخص سے قرضہ لیا جائے اُس کے پاس کوئی چیز گروی رکھ دینا چاہیئے۔ چونکہ سفر میں دستاویز کی تیاری و تکمیل اور گواہوں کا ملنا آسان نہیں ہوتا اس وجہ سے خاص طور پر اس جگہ یہ حکم سفر کی حالت کے لئے بیان ہوا ہے ورنہ اگر کوئی سفر میں نہ ہو اور کتابت و گواہی کا انتظام بھی آسانی سے ممکن ہو جب بھی کسی چیز کو گروی رکھ کر قرضہ لینا ہر طرح جائز ہے مگر یہاں اِسے نہ بھولنا چاہیئے کہ جس کے پاس کوئی چیز گروی رکھی گئی ہو اُس کو اُس پر تصرف کرنے کا حق نہ ہو گا جبتک گروی رکھنے والا یعنی اُس چیز کا اصلی مالک اس تصرف کی اجازت نہ دیدے پھر فرمایا گیا ہے کہ اگر قرضہ دینے والے کو اُس کے لینے والے پر پورا بھروسا اور اعتماد ہو تو اُسے اس بات کا اختیار ہے کہ وہ اپنے پاس بغیر کسی چیز کو گروی رکھے ہوئے قرضہ دیدے مگر ہر صورت میں قرضہ لینے والے کا یہ فرض ہو گا کہ امانت اور قرض کو قرارداد کے مطابق واپس کرے اور معاملہ میں کسی قسم کی خیانت نہ کرے اور اللہ سے ڈرتا رہے قرآن حکیم نے یہاں باہمی معاملات کے دونوں رُخ سمجھا دیئے ہیں یعنی قانونی رُخ بھی اور اخلاقی رُخ بھی خیانت اور بد معاملگی ان میں سے کسی رُخ پر بھی جائز نہ ہو گی۔ یہ اسلام اور قرآن ہی کی خصوصیت ہے کہ اُس نے ہمارے ہر قدم پر ہمیں اس حقیقت سے باخبر رکھا ہے کہ ہمارے تمام ظاہری اور باطنی معاملات اور قلبی وسوسوں اور نیتوں تک کو اللہ جانتا ہے اور اُس سے ہم اپنی کسی بات کو کسی وقت بھی پوشیدہ نہیں رکھ سکتے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ انسانوں کے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا ہو کیونکہ جب تک یہ نہ ہو گا اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی برائیوں سے پاک نہیں ہو سکتی۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ گواہی کو چھپانے کی کوشش نہ کی جائے۔ واقعہ کو جانتے ہوئے سچی گواہی کو چھپانے کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ گواہی

دینے ہی سے انکار کیا جائے دوسرے یہ کہ غلط گواہی دی جائے اور واقعہ کے خلاف بیان کیا جائے یہ دونوں ہی باتیں حرام ہیں۔ گواہی دینے پر اجرت لینا بھی جائز نہیں ہے۔ البتہ سواری وغیرہ کے انتہائی ضروری اخراجات لئے جا سکتے ہیں۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ جو کچھ تمہارے دلوں کے اندر گزر رہا ہے اُس پر بھی اللہ محاسبہ فرمائے گا۔ یہاں مراد فاسد عقیدے ہیں یا معصیت و گناہ کے ارادے جو آدمی کے دل میں اس کے عزم و اختیار سے پیدا ہوتے ہیں۔ رہے وہ وسوسے جو قہری طور پر کبھی بغیر ارادہ کے دل میں آجاتے ہیں اور اُن کا نہ اعتقاد ہوتا ہے اور نہ اُن کو عمل میں لانے کا کوئی عزم و ارادہ ہوتا ہے بلکہ اُن کی برائی محسوس ہوتے ہی طبیعت اُن سے بیزار ہو جاتی ہے تو ایسے وسوسے اور غیر ارادی تخیلات مواخذۂ الٰہی سے خارج ہیں۔

اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ جو گناہ اس طرح قابل مواخذہ ہوں گے اُن کو بخش دینے بخشنے کا اللہ کو پورا اختیار ہے البتہ دوسری جگہ اس کا بھی اعلان ہے کہ شرک کا گناہ نہیں بخشا جائے گا بیان کردہ آیات میں پھر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ جن باتوں پر ایمان لانا ضروری ہے اُن پر ایمان لانے کے حکم سے کسی شخص کو الگ اور مستثنیٰ نہیں کیا گیا ہے۔ جس طرح سب اہل ایمان ان باتوں پر ایمان رکھتے ہیں خود رسولؐ بھی ایمان رکھتے ہیں کیونکہ وہ بھی اللہ کے بندے ہیں۔ نہ وہ خدا ہیں، نہ خدا کے بیٹے ہیں اور نہ خدا اُن میں سمایا ہوا ہے۔ البتہ پیغمبروںؑ کا ایمان عام اہل ایمان کی منزل سے بدرجہا بلند ہے اور اُن سب میں بھی سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جو درجہ ہے وہ کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔ پھر یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ تمام پیغمبروں کو یکساں طور پر اللہ کا پیغمبر سمجھنے میں کسی قسم کی تفریق کرنا یعنی بعض کو ماننا اور بعض کی تکذیب کرنا جائز نہیں ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کا عمل رہا ہے۔ بلکہ اپنے اپنے دور میں سب ہی اللہ کے سچے پیغمبر تھے جن میں آخری رسول حضرت خاتم الانبیاء ہیں جن کے بعد اب قیامت تک کوئی نبی نہ آئے گا اور نہ آپ کی شریعت کے بعد اب کوئی اور شریعت آئے گی۔

آخر میں دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا ہے کہ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ انتہائی عاجزی کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں اپنی خطاؤں کا اعتراف کریں، اطاعت و فرمانبرداری کا دل سے اقرار کرتے رہیں مغفرت و رحمت کو اللہ سے ہر وقت طلب کرتے رہیں پھر کافروں اور مشرکوں کے مقابلہ میں اپنی کامیابی اور فتح کی دعا کریں اسی کے ساتھ یہ بھی ظاہر ہے کہ ہماری دعاؤں کے قبول ہونے کا استحقاق ہمیں صرف اُسی وقت حاصل ہو سکے گا جب ہم اللہ کی بندگی اور طاعت کے صحیح معیار پر پورے اتریں گے۔ ان آیاتِ کریمہ پر سورۃ البقرۃ کی تفسیر ختم ہو گئی ہے۔ آئندہ انشاء اللہ سورۂ آل عمران کی تفسیر شروع کی جائے گی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

(درس ۵۶) سُوۡرَۃُ اٰلِ عِمۡرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ وَّھِیَ مِائَتَا اٰیَۃٍ وَّعِشۡرُوۡنَ رُکُوۡعًا

الٓمّٓ ○ اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡحَیُّ الۡقَیُّوۡمُ ○ نَزَّلَ عَلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ وَاَنۡزَلَ التَّوۡرٰىۃَ وَالۡاِنۡجِیۡلَ ○ مِنۡ قَبۡلُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَاَنۡزَلَ الۡفُرۡقَانَ ؕ اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ اللّٰہِ لَھُمۡ عَذَابٌ شَدِیۡدٌ ؕ وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُوانۡتِقَامٍ ○ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَخۡفٰی عَلَیۡہِ شَیۡءٌ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ ○ ھُوَ الَّذِیۡ یُصَوِّرُکُمۡ فِی الۡاَرۡحَامِ کَیۡفَ یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَکِیۡمُ ○

(پارہ ۳ سورۂ آل عمران رکوع ۹ کی ابتدائی ۶ آیات)

الف، لام، میم۔ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں جو حی ہے سب کا سنبھالنے والا ہے۔ اُسی نے تم پر برحق کتاب اُتاری اُن کتابوں کی تصدیق کرنے والی جو اس سے پہلے آچکی ہیں اور اُسی نے توراۃ وانجیل کو اس سے پیشتر لوگوں کی ہدایت کے لئے اتارا اور اُسی نے فرقان کو نازل کیا۔ بیشک جن لوگوں نے اللہ کی آیتوں سے انکار کیا اُن کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ سب پر غالب ہے، انتقام لینے والا ہے۔ بیشک اللہ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں، وہی ہے جو ماں کے شکم کے اندر جس طرح چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے۔ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں (وہی) ہر چیز پر غالب ہے، بڑا حکمت والا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ "الحیّ" اللہ کی حیات کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ مخلوقات کی طرح معاذ اللہ پہلے کبھی زندگی سے محروم تھا بلکہ وہ ہمیشہ سے زندہ ہے اور ہمیشہ زندہ رہیگا موت کا اور فنا کا اُس کی ذات کیلئے تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ در اصل حیات ایک ایسی صفت ہے جس سے علم اور قدرت کی صفتوں کا ظہور ہوا کرتا ہے اور یہ دونوں صفتیں انتہائی کمال کے درجہ پر اللہ کی ذاتِ اقدس میں موجود ہیں اس لئے اُس کا حی اور زندہ ہونا ضروری ہے۔ اور اُسی کی حیات سے سارے عالم کی حیات وابستہ ہے۔ لیکن مخلوقات اور خالق کی حیات میں یہ بنیادی فرق ہے کہ مخلوقات کی حیات عارضی ہے اور دوسرے کی محتاج ہے اور خالقِ عالم کی زندگی ازلی و ابدی ہے اور اُس کی زندگی کا سبب خود اُسی کی ذاتِ پاک ہے وہ اپنی صفتوں میں کسی غیر کی طرف احتیاج نہیں رکھتا۔ "القیّوم" سے مراد یہ ہے کہ اللہ بغیر کسی کی طرف

احتیاج کے خود ہی باقی اور قائم ودائم ہے اور سارے عالم کا نگراں اور اُس کو قائم رکھنے والا اور سنبھالنے والا ہے۔ کوئی مخلوق بغیر اُس کی قدرت اور مشیت کے باقی نہیں رہ سکتی۔

"الفرقان" اصل میں مصدر تھا جس کے معنی ہیں الگ الگ کر دینا۔ مگر اب خصوصیت کے ساتھ اس کو حق و باطل میں فرق کر دینے کے لئے بولتے ہیں یہاں پر بجائے مصدر کے اس کو اسم فاعل یعنی حق و باطل میں فرق کرنے والے کے معنی میں بولا گیا ہے۔ "فُرقان" سے یہاں اکثر مفسروں نے خود قرآن حکیم کو مراد لیا ہے اور بعض نے معجزات مراد لئے ہیں۔

سورۂ بقرہ میں عام طور پر یہودیوں کی طرف خطاب تھا اور اب سورۂ آل عمران کی ابتدا سے اسّی سے کچھ زیادہ آیتوں میں نصرانیوں کے اُس وفد کا ذکر ہے جو "نجران" سے حضرت رسالتماب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں ۹ھ ہجری میں آیا تھا اسی کے ساتھ ہی مجموعی طور پر اس سورہ کا خطاب زیادہ تر نصرانیوں ہی کی طرف ہے۔ "نجران" یمن کا مشہور شہر ہے جس میں عہد نبویؐ میں نصرانیوں کی بڑی آبادی تھی اور وہیں سے ساٹھ نمائندوں پر مشتمل ایک وفد آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا تھا تاکہ وہ آپ سے مذہبی مسائل پر گفتگو کرے۔ اس اہم ترین وفد میں چودہ شخصیتیں بہت نمایاں حیثیت رکھتی تھیں اور اُن میں بھی تین اشخاص خصوصیت سے اعلیٰ ترین منصب پر فائز تھے۔ "عبدالمسیح عاقب" پورے وفد کا امیر تھا۔ "ایہم" وفد کا مدبر اور منتظم اعلیٰ تھا اور ابو حارثہ بن علقمہ سب سے بڑی مذہبی اور علمی شخصیت کی حیثیت سے ساتھ تھا اس وقت کی عیسائی سلطنتیں اس کا بڑا احترام کرتی تھیں اور اُسے اس وقت کی پوری عیسائی دنیا کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا تسلیم کیا جاتا تھا اس وفد کی پوری تفصیل سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ اسی سلسلہ میں مباہلہ کا ذکر آئندہ آیات میں آئے گا۔ ابتدائی آیت میں اس بات کو صاف طور پر بتایا گیا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی چھوٹا یا بڑا معبود ممکن ہی نہیں ہے اور کائنات کی کوئی بھی ہستی نہ تو اُس کی ذات میں شریک ہے اور نہ اُس کے صفات میں اور اس طرح اس حقیقت کو پوری طرح صاف کر دیا گیا کہ اسلام کا عقیدۂ توحید کسی قسم کے شرک اور کسی طرح کے نقص و کمزوری کا اللہ کی ذات میں متحمل نہیں ہو سکتا جس کے نتیجہ میں وہ تمام غلط عقائد سرے ہی سے باطل ہو گئے جو مسیحیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق اختیار کئے تھے۔ اسی کے ساتھ ہی "الحیّ القیوم" فرما کر اللہ کی ذات سے ہر قسم کے تغیر و فنا اور احتیاج کی مطلق نفی کر دی گئی یعنی وہ غیر فانی ہے اور ازلی و ابدی ہے اور ہر چیز اُسی کی قدرت اور حکم سے زندہ، باقی اور قائم ہے۔ اسی کے ساتھ اس کا بھی اعلان ہے کہ قرآن ایک سچی اور برحق کتاب ہے جو سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ نے

اتاری ہے۔ اِس بیان میں دو باتوں کی تعلیم دی گئی ہے ایک یہ کہ یہ ہر طرح سچی کتاب ہے اور اس میں جو کچھ بھی ہے وہ سب برحق ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ نہ خود رسولؐ اللہ نے بنائی ہے اور نہ کسی اور نے بلکہ اسے اللہ ہی نے اپنے رسولؐ پر نازل فرمایا ہے اور یہ اُن تمام آسمانی کتابوں کی بھی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے دوسرے پیغمبرؑوں پر نازل ہوئی تھیں۔ یہاں توراۃ و انجیل سے جن کی قرآن نے تصدیق کی ہے وہ آسمانی کتابیں مراد ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر اللہ کی طرف سے اتری تھیں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ قرآن موجودہ مجموعۂ توراۃ و انجیل کی تصدیق کرتا ہے قطعی طور پر غلط ہے کیونکہ اس وقت "توراۃ" کچھ صحیفوں کے مجموعہ کا نام رکھ لیا گیا ہے جن کے لفظی شکل میں الہامی ہونے کا خود یہود کو بھی دعوےٰ نہیں ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اصلی توراۃ سے اس مجموعہ کا کوئی تعلق نہیں اسی طرح موجودہ انجیل بھی متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا نام رکھا گیا ہے جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق کچھ حکایتیں نقل کی گئی ہیں یا کچھ اور باتیں درج ہیں لیکن خود مسیحی افراد کے نزدیک بھی ان میں سے کوئی صحیفہ آسمانی نہیں ہے بلکہ یہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کا بنایا ہوا ہے اس لئے نہ تو قرآن کی تصدیق کا ان موجودہ مجموعوں سے کوئی دور کا بھی تعلق ہو سکتا ہے اور نہ ان کی ہر بات قرآن حکیم کے مقابلہ میں بطور حجت کے پیش کی جا سکتی ہے قرآن نے جس توراۃ و انجیل کو مجموعۂ ہدایت کہا ہے وہ یہ موجودہ مجموعے نہیں ہیں۔ "وَاللّٰہُ عَزِیۡزٌ ذُو انۡتِقَامٍ" کا مطلب صاف ہے کہ اللہ بڑا زبردست اور صاحب اقتدار ہے اور رحیم ہونے کے باوجود وہ سرکشوں اور ظالموں پر عذاب کرنے اور اُنھیں عدل و انصاف کے ساتھ سزا دینے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ آیت میں جس انتقام کا ذکر ہے اُس سے یہی مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ جس میں یہ قدرت نہ ہو وہ خدا نہیں ہو سکتا۔ یہاں انتقام کا وہ مطلب نہیں ہے جو ہم آپس کی گفتگو میں مراد لیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک مرتبہ پھر اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ اللہ کے علم سے آسمان و زمین کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی اور آخر میں اس حقیقت کو بھی یاد دلایا گیا ہے کہ ماں کے شکم میں انسانوں کی صورتیں اور نقشے بنانے والا یعنی جس کے حکم و مشیت سے یہ نقشے بنتے ہیں وہ سوائے اللہ کے کوئی دوسرا نہیں ہے جس کی ذات و صفات اور آثارِ قدرت میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں۔

(درس ۵۷)

هُوَ الَّذِیْۤ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَ اُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ وَ مَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗۤ اِلَّا اللّٰهُ ؔۘ وَ الرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَ مَا یَذَّكَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ○ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِیَوْمٍ لَّا رَیْبَ فِیْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا یُخْلِفُ الْمِیْعَادَ ○

(پارہ ۳ سورۂ آل عمران رکوع ۹ کی آخری ۳ آیات)

وہ (اللہ) وہی ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی، اس میں بعض آیتیں مُحکم ہیں اور وہی کتاب کی اصل ہیں اور دوسری آیتیں متشابہ ہیں تو وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہے وہ متشابہات ہی کی پیروی کرتے ہیں گمراہی پھیلانے کی غرض سے اور اُن کے (غلط) مطلب کو تلاش کرنے کے قصد سے۔ اور اُن کی حقیقی مراد کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا پختہ علم رکھنے والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو اس پر ایمان لے آئے یہ سب ہی ہمارے پروردگار کی طرف سے ہے اور نصیحت تو بس عقل والے ہی قبول کرتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمارے دلوں کو کج نہ کر اس کے بعد کہ تو ہمیں ہدایت کر چکا ہے اور اپنی بارگاہ سے ہمیں رحمت عطا فرما بیشک تو ہی بڑا عطا کرنے والا ہے اے ہمارے پروردگار بیشک تو سب لوگوں کو جمع کرنے والا ہے اُس دن جس میں کچھ شبہ نہیں یقیناً اللہ وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

تشریح وتفسیر:۔ "مُحکَمَاتٌ" وہ آیات ہیں جن کے معنی صاف ہوں اور اُن میں کسی قسم کا اجمال اور اشتباہ نہ ہو اور "متشابہات" وہ آیتیں ہیں جن کی تفسیر صاف نہ ہو پھر متشابہات کی بھی تین قسمیں ہیں بعض وہ ہیں جن کا علم خدا کے سوا کسی کیلئے ممکن نہیں ہے جیسے قیامت کے آنے کا وقت یا خود اللہ کی ذات کو معلوم کرنا۔ کچھ متشابہات وہ ہیں جن کا علم عام لوگوں کو تو نہیں مگر راسخین فی العلم یعنی جو لوگ پختہ اور گہرا اور وسیع علم ومعرفت رکھتے ہیں اُنھیں تعلیم الٰہی کے وسیلہ سے حاصل ہو سکتا ہے اور کچھ متشابہات وہ ہیں جو غور وفکر کے بعد عام لوگوں کو بھی معلوم ہو سکتے ہیں جیسے عربی کی مشکل ترکیبوں اور مشکل لفظوں کے معنی معلوم کرنا۔ اِس تشریح کو سامنے رکھ کر یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ آیت میں "اِلَّا اللّٰهُ" پر وقف کر کے پڑھنا بھی صحیح ہے اور "وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ" کو ملا کر پڑھنا بھی درست ہے۔ ان دونوں

صورتوں کو علماء تفسیر نے جائز قرار دیا ہے۔ غرض اگر "متشابہات" سے مراد صرف وہ آیتیں لی جائیں جو سوائے اللہ کے دوسرا نہیں جانتا تو "اِلّا اللہ" پر وقف کیا جائے گا اور اگر اس کے معنی میں وسعت تسلیم کی جائے تو پھر "والرّاسخون" کو ملا کر پڑھا جائے گا۔ یعنی کچھ ایسی آیتیں ہیں جنھیں اللہ تو جانتا ہی ہے اور اُس نے اُن کا علم دوسروں کو بھی عطا کر دیا ہے جو پختہ علم و معرفت رکھتے ہیں اور وہ انبیاءؑ و مرسلینؑ ہیں اور اُن میں بھی سب سے افضل سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس ہے اور اس کے بعد پھر وہ جلیل القدر ائمہؑ کی ہستیاں ہیں جنھیں حضورؐ کے وسیلہ سے ان اسرارِ الٰہیہ کا علم خاص حاصل ہوا ہے۔ "تاویل" سے مراد کبھی تفسیر و بیان کو لیا جاتا ہے اور کبھی حقیقت و اصلیت یا انجام اور نتیجہ کو "زَیغ" کے معنی ہیں اعتدال کی حالت سے ہٹ جانا۔

اِن آیات کی ابتدا میں فرمایا گیا ہے کہ قرآن حکیم میں دو طرح کی آیتیں ہیں کچھ تو بالکل صاف اور صریح ہیں اور اُن میں کسی قسم کا شک و شبہہ ممکن نہیں ہے اور کچھ وہ ہیں جن کی حقیقی مراد معلوم کرنے میں دشواری ہوتی ہے اور اُن کی تفسیر میں مختلف پہلو نکلتے ہیں اس لئے یہ بتا دیا گیا ہے کہ اصل و بنیاد کتاب الٰہی کی صرف وہی آیتیں ہیں جو محکم ہیں رہیں متشابہ آیات تو انھیں بھی "محکمات" ہی کے مفہوم کے دائرہ میں رکھ کر سمجھنے کی کوشش کرنا چاہیے اور اُن کا کوئی ایسا مطلب نکالنے کی سعی نہ کی جائے جو محکم آیتوں کی تفسیر کے خلاف ہو۔ اس طرح یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ آیاتِ محکمات ہی قرآن اور دین کی اصل اور بنیاد ہیں اور ان ہی کے مفہوم کی روشنی میں "متشابہات" کے معنی کو بھی سمجھنا چاہیئے اور کسی حال میں بھی "محکمات" کے مفہوم سے انحراف کرنا جائز نہ ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ جن لوگوں کے دل ایمان و یقین کی نعمت سے محروم ہیں اور وہ دین کی طرف سے شک و شبہہ میں مبتلا ہیں وہ ان ہی متشابہ اور مجمل آیتوں کی تفسیر کو اپنے بدترین مقاصد پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں اور لفظی گنجائشوں سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی گمراہیوں پر قرآن حکیم کی طرف سے اپنے خیالِ باطل کے مطابق مہرِ تصدیق ثبت کرنے کی سعی لاحاصل کرتے ہیں۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اس کوشش سے اُن کی غرض صرف یہ ہوتی ہے کہ عوام کو دھوکا دیں، انھیں گمراہ کریں اور حق باتوں کو اُن کی نظروں سے چھپا دیں جیسا کہ اہلِ کتاب نے قرآن حکیم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لئے "روح اللہ" اور "کلمۃ اللہ" کے جملوں سے اُن کی ابنیّت کو یعنی انھیں خدا کا بیٹا ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ نہ دیکھا کہ سورۂ "زُخرف" میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ "اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ" یعنی عیسیٰ تو اللہ کے بندہ ہیں جن پر ہم نے احسان کیا ہے کہ انھیں نبوت عطا کی۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ "راسخین فی العلم" اپنے علم و معرفت کی زیادتی اور بلندی کے باوجود عاجزی

طور پر خدا کی بارگاہ میں دست بدعا رہتے ہیں کہ ہمیں ہمیشہ گمراہی سے محفوظ فرما۔ ہماری حالت کہیں بنی اسرائیل کی سی نہ ہو جائے جو الٰہی کتابوں اور پیغمبروں کی مسلسل کوشش ہدایت کے باوجود گمراہ ہو گئے تھے اور اپنی نافرمانیوں اور کفر و الحاد کے سبب عذاب خداوندی کے پوری طرح مستحق بن گئے تھے۔ پھر وہ لوگ قیامت کے دن کو یاد کرتے ہیں اور عرض کرتے ہیں کہ پروردگار تو اُس روز سب کو زندہ کر کے جمع کرے گا اور ہر شخص کو اُس کے عمل کی جزا یا سزا دے گا اور بیشک اللہ اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔ ان تمام بیان کردہ آیتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہمیں الٰہی احکام کی خلاف ورزی کرنے اور اُن کی تعمیل سے گریز کرنے کی کبھی ذرہ برابر بھی کوشش کرنے کی جرأت نہ کرنا چاہیئے اور اللہ کی نافرمانی کرکے اپنی دنیا اور آخرت کو برباد نہ کرنا چاہیئے۔ بیشک سچا مومن وہی ہے جو ہمیشہ اللہ سے ڈرتا رہے! اُس کے احکام کی سچے دل سے تعظیم کرے گمراہیوں اور فتنہ و فساد سے دور رہے اور اپنی خواہش نفس کو ہمیشہ مشیت خداوندی کے تابع رکھے۔

(۸۹) اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ۚ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ۚ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ ۝

(پارہ ۳ رکوع ۱۰ کی ابتدائی ۴ آیات سورۂ آل عمران)

بیشک جو لوگ کافر ہو گئے نہ اُن کے مال اللہ کے مقابلہ میں کچھ کام آئیں گے اور نہ اُن کی اولاد یہی لوگ دوزخ کے ایندھن ہیں جیسی قوم فرعون اور اُن سے پہلے والوں کی حالت ہوئی۔ اُنھوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلایا تو اللہ نے اُن کے گناہوں کے باعث اُن کی گرفت کی اور اللہ بڑا سخت سزا دینے والا ہے۔ جن لوگوں نے کفر اختیار کیا ہے اُن سے تم کہدو کہ عنقریب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف جمع کیے جاؤ گے اور وہ برا ٹھکانا ہے۔ بیشک تمہارے لئے اُن دو گروہوں میں ایک نشانی ہے جن میں باہم مقابلہ ہوا، ایک گروہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا اور دوسرا کافروں کا گروہ تھا یہ اُنھیں کھلی آنکھوں

اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے اور اللہ اپنی مدد سے جس کی چاہتا ہے تائید کرتا ہے۔ بیشک آنکھوں والوں کے لئے اس میں بڑی عبرت ہے۔

تشریح وتفسیر:۔ "وَقُود" سے مراد ایندھن ہے یعنی وہ لکڑیاں وغیرہ جس سے آگ جلائی جائے "دَاب" کے اصلی معنی ہیں مسلسل چلنا اور کبھی اسے برابر جاری رہنے والی عادت کے لئے بھی بولتے ہیں اور یہی معنی ان آیات میں مراد ہیں۔ "مِہَاد" ہموار کی ہوئی زمین کو کہتے ہیں یہاں مراد بچھونا یا ٹھکانا ہے۔ "عِبْرَۃٌ" کے معنی ہیں گزرے ہوئے واقعات سے نصیحت حاصل کرنا۔ "اَبْصَار" بَصَرٌ کی جمع ہے اور یہ آنکھوں کے لئے بولتے ہیں مگر کبھی اس سے بصیرت اور عقل مراد ہوتی ہے اور یہی یہاں بھی مقصود ہے۔

یہاں پہلی آیت میں اس بات کو پوری طرح سمجھا دیا گیا ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں مال اور اولاد میں سے کوئی چیز بھی کام نہیں آسکتی۔ پھر یہ چیزیں اُس کی رحمت سے انسان کو بے نیاز کر سکتی ہیں اور نہ اُس کے عذاب سے محفوظ کر سکتی ہیں اس لئے اللہ کے سوا کوئی طاقت ایسی نہیں ہے جو اُس کے عذاب سے بچا سکے اور کفر کرنے والوں کو جہنم کا ایندھن بننے سے روک سکے۔ اس ارشادِ الٰہی کا مفاد تو عام ہے یعنی دنیا بھر میں جو بھی اور جب بھی کفر اختیار کرے گا اُسے عذاب خداوندی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی لیکن اس فرمان کے پہلے مخاطب اہلِ کتاب ہیں کیوں کہ وہی قومِ فرعون اور گذشتہ اُمتوں کے کفر وشرک کے حالات اور اُن پر نزولِ عذاب کے واقعات سے باخبر تھے جس کا ذکر یہاں پر دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ فرعون والوں نے اور اُن سے پہلے کی اُمتوں نے جس طرح خدا کی آیتوں کی تکذیب کی تھی اور اُس کے نتیجہ میں وہ دنیا میں بھی معذّب ہوئے اور آخرت میں بھی عذاب الٰہی کے مستحق بن گئے اور قہر خداوندی کے مقابلہ میں نہ اُن کے لشکر کام آئے اور نہ مال و دولت اور شان وشوکت نے کچھ کام دیا اسی طرح جو بھی خدا کی نافرمانی کرے گا اور اُس کی کتابوں اور رسولوں کی تکذیب کرے گا اور اس کے احکام وہدایات کی توہین وتذلیل کرے گا اُسے خدا کی گرفت سے کوئی چیز بھی نہیں بچا سکتی نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا ہے کہ کافروں سے کہہ دو کہ عنقریب تم سب کو شکست ہوگی۔ یہاں "کافروں" سے مراد وہ تمام مشرکین اور اہلِ کتاب ہیں جنھیں مسلمانوں کے ہاتھوں بعد میں شکست اٹھانا پڑی تھی جس وقت یہ آیت اتری تھی اور مسلمانوں کی فتح اور یہود ومشرکین کی ہزیمت کی پیشگوئی کی گئی تھی اُس وقت مسلمان جس بے بسی اور بے سروسامانی اور افلاس وتنگدستی میں زندگی گزار رہے تھے وہ تاریخ کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اُن کے پاس نہ مادی وسائل تھے نہ اقتصادی اور معاشی ذرائع موجود تھے۔ اُن کے لئے نہ کسی اندرونی

امداد کا سہارا تھا اور نہ کسی بیرونی مدد کا آسرا۔ بلکہ اِس کے برخلاف اُن کے دو بدترین دشمن اُنھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے ایک یہودی دوسرے مشرکین مکہ جن کی عظیم عسکری قوت اور مال و دولت کے لحاظ سے اُن کے اور مسلمانوں کے درمیان کوئی توازن ہی نہ تھا۔ ایسی مایوسی اور بے بسی کی فضا میں کون انسان علم بشری کی سطح پر اس بات کی پیشینگوئی کر سکتا تھا کہ اس وقت کے مسلمان آئندہ مشرکوں اور یہودیوں سے ٹکرلیں گے اور اُنھیں شکست دیدیں گے۔ مگر قرآن نے اُس وقت جو پیشینگوئی کی تھی اور جس پر اس وقت کی جاہل دنیا ہنس رہی ہوگی وہ بالآخر حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی اور تمام مشرکوں اور اہلِ کتاب خصوصاً یہودیوں کو بعد میں جس طرح ذلّت آمیز شکست ہوئی اور جس طرح اُن کا غرور و تکبر مسلمانوں کے ہاتھوں خاک میں مل گیا وہ ساری دنیا پر روشن ہے۔ یہ اِس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ قرآن حکیم الہامی کتاب ہے اور اُس میں جو کچھ بھی ہے وہ سب برحق ہے۔ پھر یہود و نصاریٰ اور مشرکین و کفار بلکہ تمام لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ جنگ بدر سے عبرت حاصل کریں جس میں مسلمانوں کی قلت لشکر اور تعداد و اسلحہ اور جنگی ذخائر کی بے انتہا کمی اور نایابی کے باوجود اُنھیں اللہ نے مشرکوں کے مسلح و منظم انبوہ کثیر کے مقابلہ میں فتح مبین عطا فرمائی تھی۔ ساتھ ہی اس کا کھلے ہوئے لفظوں میں اعلان بھی فرمایا گیا ہے کہ کافر کبھی اپنی طاقت و کثرت پر گھمنڈ نہ کریں اور نہ اس دھوکے میں رہیں کہ فتح صرف سامان جنگ کی زیادتی اور تعداد لشکر کی فراوانی ہی سے حاصل ہوا کرتی ہے بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ فتح و کامیابی عطا کرنا صرف اللہ کے اختیار میں ہے وہی جس کی چاہتا ہے نصرت و تائید فرماتا ہے۔ بلا شبہہ وہ صرف اُن ہی لوگوں کی نصرت کرتا ہے جو اُس کے فرمانبردار ہوتے ہیں اور اُس کے احکام کے سامنے سر تسلیم خم رکھتے ہیں اور اُس کی آیتوں اور اُس کے رسولوںؑ کی تکذیب کی جرأت نہیں کرتے۔ جن کے دلوں میں اللہ کا ڈر ہوتا ہے اور جو اپنی زبان، دل اور تمام اعضاء و جوارح سے اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ وہ سچے توحید پرست اور حقیقی مسلمان ہیں کیونکہ اُن کے کانوں میں قرآن کی یہ آواز گونجتی رہتی ہے کہ نافرمانوں اور گنہگاروں اور آیاتِ الٰہی کے منکروں کو اللہ کے قہر و عذاب سے کوئی چیز بھی نہیں بچا سکتی۔ اِن آیات میں مجموعی طور پر اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ موجود ہے کہ وقتی طور پر صرف مادّی اور فوجی اور علاقائی فتح حاصل ہونا حقیقی، اصلی اور دائمی فتح نہیں ہوتی۔ ایسی فتوحات تو صرف آنی جانی چیزیں ہیں اور بے حد ناپائیدار ہوتی ہیں۔ اصلی اور دائمی فتح نیک اور سچّے مقصد کی فتح ہوتی ہے جو صرف اللہ عطا کرتا ہے اور جو ایمان و یقین اور خدا کی سچّی طاعت و بندگی ہی سے حاصل ہوا کرتی ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ○ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ○ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ○ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۰ کی درمیانی ۴ آیات کریمہ۔ سورۂ آل عمران)

لوگوں کے لئے خوشنما کردی گئی ہے محبت مرغوب چیزوں کی (خواہ) وہ عورتیں ہوں اور بیٹے ہوں اور سونے اور چاندی کے لگے ہوئے ڈھیر اور نشان پڑے ہوئے گھوڑے ہوں اور چوپائے ہوں اور زراعت ہو۔ یہ سب دنیوی زندگی کے لئے نفع کی چیزیں ہیں اور اچھا ٹھکانا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ تم کہدو کہ کیا میں تم کو ایسی چیز کی خبر دوں جو ان چیزوں سے بہتر ہے۔ پرہیزگاروں کے لئے اُن کے پروردگار کے پاس ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں وہ اُن میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ ازواج اور اللہ کی خوشنودی ہوگی اور اللہ اپنے بندوں کا خوب دیکھنے والا ہے۔ (یہ وہ لوگ ہیں) جو کہتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم یقیناً ایمان لے آئے ہیں پس تو ہمارے گناہ بخشدے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے (یہی لوگ) صبر کرنے والے اور سچے اور فرمانبردار اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں میں استغفار کرنے والے ہیں۔

تشریح وتفسیر: "اَلشَّهْوَةُ" جب مصدر ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں نفس کا اُس چیز کی طرف شدت سے مائل ہونا جسے وہ چاہتا ہو۔ اس کے ساتھ ہی کبھی اس لفظ کو خود اُس چیز کے لئے بھی بولتے ہیں جس کی طرف طبیعت میں شوق و رغبت موجود ہو اور کبھی اس کو خود خواہش اور رغبت کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ آیت میں "شَهَوَات" "شَهْوَة" کی جمع ہے اور یہاں اس سے مراد وہی چیزیں ہیں جن کی طرف رغبت پائی جائے۔ "زُيِّنَ" کے معنی ہیں "خوشنما بنایا گیا اور زینت دی گئی"۔ یہاں پر اس بات میں بحث کی گئی ہے کہ جو ذات دلوں میں خواہش اور رغبت کا جذبہ پیدا کرنے والی ہے اُس سے کون مراد ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک یہاں اس سے اللہ ہی کی ذات اقدس مراد ہے جس نے انسانی فطرت

اور طبیعت میں اس جذبہ کو خلق کیا ہے اور ساتھ ہی اس کو عمل میں لانے کے لئے حدیں بھی مقرر کر دی ہیں اور حلال و حرام کی پوری طرح وضاحت کر دی ہے تاکہ اس طرح وہ اپنے مخلص بندوں کو نافرمانوں سے الگ کر دے اور انسان کی آزمائش کرے۔ شیطان کا کام اس جذبہ کو خلق کرنا نہیں ہے بلکہ وہ اس کے غلط اور ناجائز استعمال کی طرف انسان کو دعوت دیتا ہے۔ "قَنَاطِیْرِ" "قِنطار" کی جمع ہے اس کے معنی ہیں کثیر مال و دولت۔ "مُقَنْطَرَۃ" کا لفظ بھی اسی مفہوم کی زیادتی اور کثرت کو ظاہر کرتا ہے جس سے تہ بہ تہ لگے ہوئے ڈھیر مراد ہیں۔ بعض مفسروں نے ان دونوں لفظوں کی تشریح میں مال کی مقدار پر بھی بحث کی ہے لیکن اس پوری بحث کا حاصل صرف زیادتی اور کثرت مال ہی کا اظہار ہے۔ "اَلْخَیْلُ الْمُسَوَّمَۃ" "خیل" کا لفظ اکثر علماء کے نزدیک واحد کے لئے نہیں بلکہ جمع کے لئے بولتے ہیں یعنی گھوڑوں کی جماعت اور جتھے کے لئے۔ یہاں یہی مقصود ہے۔ "مُسَوَّمَۃ" کے اس جگہ کئی معنی بیان ہوتے ہیں جن میں سے ایک معنی ہیں "نشان لگے ہوئے" یعنی ایسے گھوڑے جن پر اُن کی نسلی اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے خاص نشانات ڈال دیئے گئے ہوں غرض یہاں ہر معنی کے لحاظ سے صفتوں اور خوبیوں کی بنیاد پر گھوڑوں کا ممتاز ہونا ظاہر کیا گیا ہے۔

ان آیات کی ابتدا میں فرمایا گیا ہے کہ انسان کے دل میں اللہ نے بہت سی چیزوں کی طرف رغبت کو داخل کیا ہے اور وہ فطری طور پر اُن چیزوں کی طرف مائل رہتا ہے۔ اس سلسلہ میں چند چیزوں کو مثال کے طور پر ذکر کیا گیا ہے جیسے اولاد، عورتیں، سونے اور چاندی کے ڈھیر، گھوڑے، مویشی اور کھیتی باڑی۔ مقصود یہ ہے کہ دنیا کی مادّی زندگی اور اس کا انفرادی و اجتماعی نظام اُس وقت تک قائم نہیں رہ سکتا جب تک اُن چیزوں کی طرف دل میں کشش نہ ہو جو اس دنیوی نظامِ حیات کے لئے ضروری ہیں جن کے بغیر نہ انفرادی زندگی کو دوام حاصل ہو سکتا ہے اور نہ اجتماعی زندگی کو اسی لئے اللہ نے انسانی طبیعت میں اس کشش، اس جذبہ اور اس لگاؤ کو داخل کر دیا ہے اس طرح یہ جذبہ اور پیدائشی رجحان یا رغبت گناہ نہیں بلکہ عین تقاضائے فطرت ہے یہاں انسان کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ اپنے اس جذبہ کو عقل و شریعت کے تابع رکھے اور اُس اعتدال میں فرق نہ آنے دے جو مشیت الٰہی نے مقرر کر دیا ہے اور ہمیں انبیاء و مرسلین کے ذریعہ سے اُس کی تعلیم دیدی ہے یعنی اس فطری لگاؤ اور رغبت کا ناجائز استعمال نہ ہو بلکہ اس کو احکامِ الٰہی کے مطابق استعمال کیا جائے۔ یہاں یہ صاف طور پر سمجھا دیا گیا ہے کہ دنیوی زندگی کے یہ سارے سامان فانی ہیں، انہیں بقا ہرگز حاصل نہیں ہے اور یہ چیزیں اس قابل نہیں ہیں کہ انسان

ان ہی کا ہو رہے اور آخرت کو بھول جائے۔ یہ دنیوی ساز و سامان صرف اس لئے ہے کہ اس کی مدد سے جائز طریقہ پر مادی زندگی گزاری جا سکے اور آخرت کی دائمی اور لازوال زندگی کے لئے تیاری کی جا سکے پھر یہ بتایا گیا ہے کہ اخروی نعمتیں صرف ان ہی بندگانِ خدا کو ملیں گی جو اس کے حکم پر سر جھکاتے ہیں اُس کے مطیع ہیں اور اُس سے ڈرتے ہیں۔ ڈرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صرف زبان سے کہتے ہیں کہ ہم ڈرتے ہیں اور اس کا کوئی ثبوت نہیں دیتے بلکہ حقیقی ڈرنے والے صرف وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جن کے قول کے ساتھ اُن کا عمل بھی رضائے الٰہی کے مطابق ہو اور وہ کوئی بات ایسی نہ کریں اور کوئی کام ایسا نہ کریں جو اللہ کی ناراضی کا سبب ہو، چاہے اُس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہو یا اُس کے بندوں اور اُس کی مخلوق سے ہو۔ ساتھ ہی اسے بھی بار بار بتایا جاتا ہے کہ تم کبھی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ تمہارے افعال و اعمال سے بے خبر ہے۔ نہیں، بلکہ وہ ہر بات سے پوری واقفیت رکھتا ہے اور اُس سے کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں رکھی جا سکتی۔ پھر صاحبان تقویٰ کی صفتیں بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے کہ اپنی اس منزلِ ایمانی کے باوجود وہ ہر وقت استغفار میں مشغول رہا کرتے ہیں اور اپنی مغفرت کی درگاہ خداوندی سے مناجات کرتے رہتے ہیں۔ وہ مصیبتوں پر صبر کرنے والے ہیں، قول اور فعل کے سچے ہیں، فرمانبردار اور فروتنی کرنے والے ہیں، اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے ہیں اور راتوں میں پچھلے پہر خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ سے استغفار میں مشغول رہتے ہیں۔

(درس ۶۰)

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

(پارہ ۳ رکوع ۱۰ کی آخری ۳ آیات۔ سورۂ آلِ عمران)

اللہ نے اس کی گواہی دی ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں اور فرشتوں نے بھی اور علم والوں نے بھی، وہ عدل کے ساتھ انتظام رکھنے والا ہے۔ کوئی معبود نہیں سوائے اُس زبردست کے جو حکمت والا ہے۔ یقیناً دین

تو اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے اور اہلِ کتاب نے جو اختلاف کیا تو وہ محض آپس کی ضد سے کیا اِس کے بعد کہ اُنھیں صحیح علم پہنچ چکا تھا اور جو شخص اللہ کی آیتوں سے اِنکار کریگا تو بیشک اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔ پھر بھی اگر یہ لوگ تم سے حجت کریں تو کہدو کہ میں تو اپنا رُخ اللہ کی طرف کر چکا اور جو میرے پیرو ہیں (وہ بھی) اور تم اہلِ کتاب اور اُمّی لوگوں سے دریافت کرو کہ کیا تم بھی اسلام لے آئے ہو پس اگر وہ اسلام لے آئے تو بس راہِ ہدایت پر آگئے اور اگر وہ روگردانی کریں تو تمہارے ذمّہ صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ بندوں کا خوب دیکھنے والا ہے۔

تشریح وتفسیر: "مَلٰئِکَۃ" مَلَک کی جمع ہے جو اصل میں مالک تھا پھر "مَلاک" ہو گیا اور بعد میں کثرت استعمال سے "مَلَک" بولا جانے لگا۔ یہ "اَلُوْكٌ" یا "اَلُوْکَۃٌ" سے بنا ہے جس کے معنی پیام رسانی کے ہیں چونکہ یہ خالق کے پیغامات اُس کی مخلوق تک پہنچاتے ہیں اس لئے اِنھیں "ملئکہ" کہا جاتا ہے۔ یہ نوری مخلوق ہیں، بدی اور گناہ کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ اللہ نے انھیں یہ قابلیت عطا کی ہے کہ یہ حسب ضرورت مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں۔ ان کی تعداد کا علم اللہ ہی کو ہے۔ "بَغْیٌ" کے اصلی معنے ہیں مقررہ حدوں سے تجاوز کرنا اور ہٹ جانا۔ یہاں اس سے مراد آپس کی نفسانفسی، ضد، حسد اور قیادت و ریاست کی حرص وطمع ہے۔ "حَاجُّوْكَ" کا مصدر "مُحَاجَّۃ" ہے جس کے معنی باہم جھگڑے اور بحث وتکرار کرنے کے ہیں۔ یہ "حُجَّۃ" سے بنا ہے۔ حجۃ اُس دلیل کو کہتے ہیں جو کسی صحیح بات کو ثابت کرے مگر کبھی مجازی طور پر اُس کو مطلق بحث وتکرار اور آپس میں جھگڑنے کے لئے بھی بولتے ہیں۔ "اَلاُمِّیُّ" کے کئی معنی آتے ہیں۔ جو نہ لکھ سکتا ہو اور نہ پڑھ سکتا ہو۔ دوسرے معنی ہیں "اُمُّ القریٰ" یعنی مکہ کا رہنے والا اور تیسرے معنی ہیں وہ قوم جو اہلِ کتاب نہ ہو۔ اس تیسرے معنی کے لحاظ سے قرآن مجید میں جہاں یہ لفظ بولا گیا ہے وہاں اس سے مشرکین عرب مراد لئے گئے ہیں۔ بیان کردہ آیت میں بھی مشرکین عرب ہی مراد ہیں۔

سورۂ آل عمران کی ابتدا میں نصرانی عقائد کی غلطیوں کی وضاحت فرمائی گئی تھی اور اُن بنیادی گمراہیوں کی نشاندہی کی گئی تھی جن پر ان باطل عقیدوں کی تعمیر کی گئی ہے پھر اُن وجوہ اور اسباب کی طرف توجہ دلائی گئی جو اس قسم کی گمراہیوں کا سبب بنتے ہیں اور انسان کو طلبِ حق کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے سے روک دیتے ہیں۔ ان موانع واسباب میں مرکزی حیثیت دنیوی سامانِ عیش وعشرت ہی کو حاصل ہے جس کی محبت اور لگن میں پھنس کر اور اُسی کو زندگی کا اصل مقصد سمجھ کر آدمی اعتدال کی راہ کو چھوڑ بیٹھتا ہے اور جادۂ حق سے مُنہ موڑ کر اللہ کے احکام کو حقیر جاننے لگتا ہے

یہی بے اعتدالی شیطان کی پیروی کی اصل اور اللہ کی نافرمانی کی بنیاد ہے۔ انسان کی نجات صرف اسی میں ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو اپنی آزمائش سمجھے اور اللہ کے بتائے ہوئے راستہ پر سختی کے ساتھ جما رہے۔

اب اس وقت کی بیان کردہ آیتوں میں پھر توحید کا کھلے لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کے معبود ہونے میں اور اُس کے صفات میں کوئی بھی اُس کا شریک نہیں بن سکتا۔ وہی وحدہٗ لاشریک معبود ہے اور وہی اکیلا تمام کائنات کا پیدا کرنے والا اور پرورش کرنے والا ہے اس دعوے پر سب سے پہلے گواہی خود اللہ کی ہے اور یہ گواہی تمام آسمانی کتابوں میں موجود ہے اور ساتھ ہی کائنات کے ذرہ ذرہ میں پائی جاتی ہے اس لئے کہ عالمین کی لاتعداد مخلوقات میں سے ہر چیز کا وجود خود اس کا ثبوت اور اس کی گواہی ہے کہ اُس کا پالنے والا اور پیدا کرنے والا واحد و یکتا ہے اور اُس کی خدائی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے، پھر اس پر سارے فرشتے گواہ ہیں اور جس قدر علم رکھنے والی ہستیاں ہیں وہ سب اس کی شہادت دیتی ہیں۔ یہاں علم والوں سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو کتاب الٰہی کا علم رکھتے ہیں اور جو حقائق عالم سے واقف ہیں دنیوی سطحی علم اس مقام پر کسی شمار میں نہیں ہے صاحبانِ علم و معرفت کے اسی شرف اور خصوصیت کے لحاظ سے اُن کو فرشتوں کے ساتھ اِس جگہ رکھا گیا ہے۔ پھر ارشاد ہوا ہے کہ درحقیقت دین، اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے اور اسی کی تبلیغ کے لئے تمام پیغمبروںؑ کو بھیجا گیا تھا جو اپنے اپنے دور میں اس دین الٰہی کی تعلیم دیتے رہے اُن احکامِ خداوندی کے تحت جو اس دور کے تقاضوں کے مطابق تھے اور اب آخر میں اِسی دین الٰہی کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیش کیا اور آپ نے اس کی وحی الٰہی کے مطابق اس طرح تعلیم دی جو قیامت تک آنے والے ہر دور کے تمام تقاضوں کے لئے پوری جامعیت رکھتی ہے۔ پھر انصاف کرنے کے لئے دو باتوں کا ہونا ضروری ہے ایک اقتدار کا ہونا دوسرے ہر کام حکمت و دانائی سے کرنا تو یہ دونوں صفتیں اللہ کی ذات میں پورے کمال کے ساتھ موجود ہیں۔ اسی مفہوم کی طرف "قَائِمًا بِالْقِسْطِ" اور "الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ" کے جملوں سے اشارہ فرمایا گیا ہے۔ اِس کے بعد ارشاد ہوا کہ رسالت محمدیؐ اور دین اسلام ایک ایسی واضح اور روشن حقیقت ہے جس کا اعلان پچھلی تمام کتب آسمانی کر چکی ہیں اور کسی شخص کے لئے بھی اس سے انکار ممکن ہی نہیں ہے پھر اگر اہلِ کتاب اِس کا انکار کرتے ہیں تو سوائے ان کی ہٹ دھرمی اور حسد اور دنیوی جاہ و اقتدار کی ہوس کے اس کا باعث اور کیا ہو سکتا ہے جیسا کہ نجران کے وفد کے راس و رئیس ابو حارثہ بن علقمہ نے جو اُس وقت کی ساری عیسائی دُنیا کا سب سے بڑا عالم تھا اس کا کھلے لفظوں میں اپنے بھائی کرز بن علقمہ سے ذکر کیا تھا کہ محمد عربی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یقیناً وہی نبی برحق ہیں جن کی بشارت توراۃ و انجیل نے

دی ہے مگر میں اس کا اعلان نہیں کر سکتا کیونکہ میں اس سے ڈرتا ہوں کہ اس کے بعد عیسائی دنیا میں جو میری
عزت ہے وہ فوراً ختم ہو جائے گی۔ ابو حارثہ کے اسی کلام سے متاثر ہو کر بعد میں کرزؓ اسلام سے مشرف ہو گئے تھے۔

(درس ۶۱) إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ
حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ
فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ○ أُولٰٓئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ
فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نَّاصِرِينَ ○ أَلَمْ تَرَ إِلَى
الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلٰى كِتَابِ اللّٰهِ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ ○
ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّآ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ
وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ○ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنٰهُمْ
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۱ کی ابتدائی ۵ آیات۔ سورۃ آل عمران)

بیشک جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں اور پیغمبروں کو ناحق قتل کر ڈالتے ہیں اور اُن لوگوں کو بھی قتل
کرتے ہیں جو انصاف کرنے کا حکم دیتے ہیں تو ایسے لوگوں کو تم دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے
اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور اُن کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ کیا تم نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا
ایک حصہ دیا گیا، اُنھیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ اُن میں فیصلہ کردے پھر اُن میں سے ایک
گروہ بے رخی کرتا ہوا مُنہ پھیر لیتا ہے۔ یہ اس سبب سے کہ وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ چھوئیگی
بھی نہیں سوائے گنتی کے چند دنوں کے اور اُنھیں اُن کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال رکھا ہے اُن ہی
باتوں نے جنھیں وہ تراشتے رہے ہیں پس کیا حال ہوگا جبکہ ہم اُنھیں اُس دن جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی
شک نہیں اور ہر شخص کو جو کچھ اُس نے عمل کیا ہے اُس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائیگا

تشریح وتفسیر: "حَبِطَتْ" "حَبطٌ" سے بنایا گیا ہے اس کے معنی ہیں کسی کام کا برباد اور اکارت
ہو جانا۔ "نَصِیبٌ" معین حصہ کو کہا جاتا ہے۔ "یتولّٰی" کا مصدر تولّی ہے اور اصلی مادہ "وَلِیَ" "وَلِیَ"
کا لفظ جب بغیر "عن" کو ملائے ہوئے اکیلا بولا جائے جسے اصطلاح میں "متعدی بنفسہ" کہا جاتا ہے تو اس کے
معنی دوستی اور توجہ کرنے اور کسی چیز کی طرف رغبت کرنے اور مائل ہو جانے کے ہوتے ہیں لیکن جب اس کے
ساتھ "عن" کا لفظ لایا جاتا ہے چاہے اُس کا ذکر ہو یا نہ ہو دونوں حالتوں میں اُس کے معنی مُنہ پھیرنے، روگردانی

اور اعراض کرنے اور دور ہو جانے کے ہو جاتے ہیں چنانچہ اس جگہ بھی اعراض کرنے اور بے رخی کرنے ہی کے معنی ہیں۔ "غَرَّ" "غُرور" سے بنایا گیا ہے۔ غرور جب مصدر ہو تو اس کے معنی فریب اور دھوکا دینے کے ہوتے ہیں اور جب اسم ہو تو خود دھوکے اور فریب، خود بینی و خود نمائی اور گھمنڈ کے معنی میں ہوتا ہے عین پر زبر کے ساتھ یعنی غَرور کے معنی فریب دینے والے کے ہیں شیطان کے لئے خاص طور پر یہ لفظ بولا جاتا ہے کیونکہ ہر قسم کے فریب اور گمراہی کی اصل وہی ہے۔ "افتراء" کا مادہ "فری" ہے۔ اس کا زیادہ استعمال بہتان باندھنے اور جھوٹا الزام لگانے کے لئے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ان ہی موقعوں پر اسے بولا گیا ہے۔ "وُفِّیَ" کا مصدر "توفیۃ" ہے جس کے معنی ہیں بلا کسی طرح کی کمی کرنے کے کسی چیز کو پورا پورا دیدینا۔

یہاں پھر اہل کتاب کے کفر و سرکشی کا ذکر فرمایا جا رہا ہے کہ وہ آیات الٰہی سے انکار کرتے رہتے تھے اور اُن باتوں کی تکذیب کیا کرتے تھے جو انبیاء کرام علیہم السلام اللہ کی طرف سے اُن کے پاس لائے تھے اور صرف یہی نہیں بلکہ اُن کی سرکشی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ انھوں نے پیغمبروں کی صرف تکذیب ہی نہیں کی بلکہ اُن کو قتل بھی کیا اور اُن کے خونِ ناحق سے اپنے ہاتھ رنگے۔ حضرت یرمیاہؑ، حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰؑ کا قتل اور حضرت عیسیٰؑ کو قتل کرنے کی ناکام کوشش۔ یہ سب چھپی ہوئی باتیں نہیں ہیں بلکہ مسلّمہ تاریخی حقیقتیں ہیں۔ کچھ حدیثوں میں اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک روز صبح کے وقت تینتالیس[۴۳] پیغمبروں کو شہید کیا تھا اور جن ایمانداروں نے قاتلوں کو اس گناہِ عظیم سے روکنے کی کوشش کی تھی اُن کو بھی اُسی دن کے آخری حصہ میں تہ تیغ کر ڈالا تھا جن کی تعداد ایک سو ستر[۱۷۰] تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے فرمایا ہے کہ بنی اسرائیل نے دن کے ابتدائی حصہ میں تین سو[۳۰۰] انبیاء کو شہید کیا تھا اور شام کو حسبِ دستور بازاروں میں اپنی دوکانوں پر سبزی اور ترکاری بیچنے میں مشغول ہو گئے۔ گویا انبیاءؑ و مرسلینؑ کا قتل کرنا کوئی ایسا کام ہی نہ تھا جو ذرا بھی توجہ کے لائق ہوتا بلکہ معاذ اللہ ایک کھیل تھا جس کی کوئی وقعت نہ تھی اس ظلم و سرکشی کی سزا اُنھیں دنیا میں بھی ملی اور وہ ہمیشہ طرح طرح کے سخت عذابوں میں مبتلا رہے اور آخرت میں بھی عذابِ الیم میں گرفتار ہوں گے۔

قرآن مجید نے بنی اسرائیل کی جس سرکشی اور ناحق دشمنی کی وضاحت کی ہے وہ کوئی انوکھی چیز نہیں ہے بلکہ خود اُن کی کتابیں بھی اِس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہیں۔ اس کے بعد کی آیت میں "الکتٰب" سے مراد اُس کا عام مفہوم ہے جس میں توراۃ و انجیل اور دوسری آسمانی کتابیں شامل ہیں اور "کتاب اللہ" کے جملہ سے جو بعد میں ہے قرآن مجید مراد ہے مقصود یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو تمام تحریفات وغیرہ سے

بچا ہوا جو تھوڑا سا علم کتاب مل سکا ہے وہی اس کے لئے کافی تھا کہ بنی اسرائیل نبوتِ محمدیؐ اور قرآن مجید کی صداقت کو سمجھ لیتے اور ایمان لے آتے۔ بعض مفسروں نے دونوں جگہ توراۃ مراد لی ہے اور کہا ہے کہ "نصیباً من الکتاب" سے علم کی فراوانی مقصود ہے۔ جس کی بنا پر مطلب یہ ہوگا کہ علماء بنی اسرائیل کے پاس توراۃ کا کافی علم موجود ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ اس میں آنے والے نبیؐ کی کیا کیا صفتیں بیان ہوئی ہیں اور وہ سب سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پوری اترتی ہیں اور آپ کی ذاتِ مبارک کے سوا کسی اور پر وہ پوری اتر ہی نہیں سکتیں مگر اس کے باوجود وہ انتہائی ہٹ دھرمی پر تلے رہتے ہیں اور گویا دن کے اجالے میں کھلے ہوئے سورج کا انکار کرتے ہیں۔ حاصل دونوں تفسیروں کا یہی ہے کہ تمام کتب سماویہ نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تشریف آوری کی کھلے لفظوں میں بشارت دی تھی مگر اس کے بعد بھی بنی اسرائیل نے آپ کی نبوت سے محض اپنی ضد اور حسد و بغض اور نسلی تعصب اور اس تکبر و غرور کی وجہ سے کہ نبوت و سلطنت کے وہی وارث ہیں حق و صداقت سے انکار کیا اور مستحق عذاب الٰہی بن گئے۔ اس تکبر ہی کی بنا پر وہ یہ بھی کہنے لگے کہ ہم تو انبیاءؑ کی اولاد ہیں اس لئے باوجود گناہ کرنے کے ہمیں جہنم کی آگ اذیت نہیں دے سکتی۔ دوسرے یہ کہ ہمارے نبی ہمیں آگ میں جانے سے بچالیں گے اور اگر ہم آگ میں ڈالے بھی گئے تو چند روز کے سوا آگ ہمیں چھو بھی نہ سکے گی اور کوئی یہ کہنے لگا کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ ہمارے گناہوں کا کفارہ بن چکے ہیں۔ غرض سارے بنی اسرائیل خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی اسی غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ وہ دنیا میں جس قدر بھی سرکشی، گناہ اور توہینِ احکام الٰہی کرتے رہیں اور جتنا بھی ظلم و ستم ڈھاتے رہیں نہ انھیں دنیا میں کوئی سزا ملے گی اور نہ آخرت میں۔ کیونکہ وہ انبیاءؑ کی اولاد ہیں مگر ان کا یہ تکبر کام نہ آسکا اور بنی اسرائیل کی زندگی دنیوی عذابوں کی ایک طویل اور ہولناک تاریخ بن گئی پھر جب قیامت آئے گی تو وہ اس دنیوی عذاب سے بہت زیادہ سخت عذابوں میں گرفتار ہوں گے۔

(درس ۶۲) قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَ تَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ٘ وَ تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ١ؕ بِیَدِكَ الْخَیْرُ١ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَ تُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ٘ وَ تُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَ تُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ٘ وَ تَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ لَا یَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِیْنَ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِیْنَ١ۚ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَیْسَ

مِنَ اللّٰهِ فِیْ شَیْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً ؕ وَ یُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ الْمَصِیْرُ ○ قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِیْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ یَعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۱ کی درمیانی ۴ آیات سورہ آل عمران)

تم یوں کہو کہ اے اللہ تمام جہان کے مالک تو جسے چاہے سلطنت عطا کرے اور تو جس سے چاہے سلطنت چھین لے اور تو جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے، تیرے ہی ہاتھ ہے سب خوبی بیشک تو ہی ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو بے جان سے جاندار کو نکالتا ہے اور جاندار سے بے جان کو نکالتا ہے اور جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔ ایمان داروں کو نہ چاہیئے کہ وہ مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا دوست بنائیں اور جو کوئی ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں مگر ایسی حالت میں کہ اُن کے شر سے بچاؤ کرنا چاہو اور اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ تم کہہ دو کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے خواہ تم اُس کو پوشیدہ رکھو یا ظاہر کر دو اللہ اُسے جانتا ہے اور اُسے سب معلوم ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ "ملك" سے یہاں تمام جہان مراد ہے جس پر اقتدار کامل سوائے اللہ کے کسی کو بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی مفہوم کی طرف "مالك" کا لفظ اشارہ کر رہا ہے۔ اللہ ہی جسے چاہتا ہے اقتدار و سلطنت عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اُس سے چھین لیتا ہے۔ اس میں جہان اور حکمتیں اور مصلحتیں ہوتی ہیں جنھیں اللہ ہی خوب جانتا ہے، ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ سے وہ اپنے بندوں کی آزمائش کرتا ہے۔ جنھیں سلطنت ملتی ہے اُن کی بھی اور جن لوگوں پر کسی کو حکومت و سلطنت عطا ہوتی ہے اُن کی آزمائش بھی کہ وہ کس حد تک احکام خداوندی کی تعمیل کرتے ہیں۔ "تؤتی" کے معنی ہیں۔ عطا کرتا ہے۔ "تنزع" کے معنی ہیں۔ واپس لے لیتا ہے اور چھین لیتا ہے۔ "ولوج" کے معنی داخل ہونے اور "ایلاج" کے معنی داخل کرنے کے آتے ہیں۔ اسی سے "تولج" بنا ہے یعنی اے اللہ! تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کبھی رات بڑی ہو جاتی ہے اور کبھی دن بڑا ہو جاتا ہے۔ اور یہ سب کچھ اللہ ہی کی قدرت کا نتیجہ ہے۔ "حی" سے مراد جاندار ہے اور "میت" سے مقصود بے جان چیز ہے۔ بعض نے اس کے معنی میں اور زیادہ وسعت

بتائی ہے جس کے لحاظ سے لفظ "حیّ" کے مفہوم میں علم رکھنے والے اور ایمان والے بھی شامل ہیں اور لفظ "میت" میں جاہل و کافر بھی داخل ہیں۔

ان آیات کی ابتدا میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ سے امت مسلمہ کو اللہ کی بارگاہ میں مناجات اور دعا کرنے کا طریقہ بتایا گیا ہے اور ارشاد ہو رہا ہے کہ اے رسولؐ تم اس طرح دعا مانگو اور دوسرے بھی اس کی پیروی کریں کہ اے مالک الملک تو جسے چاہتا ہے سلطنت عطا فرما دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اُس کو واپس لے لیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلت دیتا ہے۔ تیرے ہی اقتدار میں ہر بھلائی اور نیکی ہے اور تو ہی ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ دن اور رات کے گھٹانے اور بڑھانے پر بھی تو ہی قادر ہے۔ جاندار کو بے جان چیز سے اور بے جان کو جاندار شے سے پیدا کرنے والا تو ہی ہے اور جسے چاہتا ہے تو ہی بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔ علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ ان دونوں آیات کی تلاوت کر کے اگر ادائے قرض اور وسعتِ رزق کی دعا مانگی جائے تو وہ ضرور مستجاب اور قبول ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صحیح و مستند حدیثوں میں ان آیات کی اس خصوصی تاثیر کا ذکر منقول ہے جسے حضورؐ نے بڑی تاکید سے فرمایا ہے اللہ کو "مالک الملک" کہہ کر سمجھایا گیا ہے کہ نظامِ عالم کا ردّ و بدل اور پیدائش و موت، سلطنت دینا اور اُسے چھین لینا یہ سب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ پھر جسے وہ چاہتا ہے اُس کو ملک و سلطنت کا کوئی حصہ اُس کی اور دوسروں کی آزمائش کے لئے عطا کر دیتا ہے تاکہ ایماندار و اطاعت شعار لوگ اُن لوگوں سے جدا ہو سکیں جو نافرمان اور گنہگار رہتے ہیں، خدا شناسی اور خدا فراموشی کی حدیں آشکار ہو سکیں اور ظلم و عدل کی حقیقتیں نمایاں ہو جائیں۔ اس مناجات کی تعلیم میں اُن لوگوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو دنیوی جاہ و عزت کی طمع میں حق پوشی سے اور خداوندی احکام سے روگردانی کرنے سے خوف نہیں کرتے جیسا کہ ابو حارثہ بن علقمہ نے اپنے بھائی کرز بن علقمہ سے کہا تھا کہ میں خوب جانتا ہوں کہ محمدؐ عربی وہی رسول منتظر ہیں جن کی بشارت توراۃ و انجیل میں موجود ہے لیکن اگر میں ان پر اپنے ایمان کا اعلان کر دوں تو عیسائی بادشاہ جو مال و دولت مجھے دیتے رہتے ہیں اُس کا سلسلہ فوراً بند ہو جائے گا اور مجھے بیشمار دولت سے محروم ہونے کے ساتھ ہی ہر قسم کے اعزاز و اکرام سے بھی محروم ہو جانا پڑے گا۔ اس مناجات میں اس کا بھی جواب ہے کہ تم جس دنیوی جاہ و دولت کو حق و صداقت کے مقابلہ میں اس قدر اہمیت دیتے ہو اس کی وقعت سراب سے زیادہ نہیں ہے اور یہ سب کچھ انسان کے بس میں نہیں بلکہ اللہ کے اختیارِ کامل میں ہے جسے چاہے دیدے اور جس سے چاہے سلب کر لے اس لئے ہمیشہ اللہ ہی کی بارگاہ سے

ہو گئے رہو اور اُس کی مرضی پر کسی اور بات کو ترجیح نہ دو۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ یہ آیت اُن منافقوں اور یہودیوں کا جواب ہے جنھوں نے فتح مکہ کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس سے مسلمانوں کے لئے مملکت کسریٰ اور سلطنت روم کی فتح کی پیشنگوئی سنکر اُس کا مضحکہ اڑایا تھا اور بعض نے کہا ہے کہ جنگ خندق میں حضورؐ کی اس قسم کی پیشنگوئی پر منافقوں نے جو کچھ اعتراض کیا تھا اُس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔ مکہ ماہ رمضان ۸ھ ہجری میں فتح ہوا تھا اور جنگ خندق جسے جنگِ احزاب بھی کہتے ہیں ماہ ذیقعدہ ۵ھ ہجری میں واقع ہوئی تھی۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ کفر و اسلام ایک دوسرے کی ضد ہیں اس بنا پر مسلمانوں کے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام کے مفاد کو پسِ پشت ڈال کر کفار و مشرکین سے ساز باز کریں۔ اُن سے اشتراکِ عمل صرف اُن ہی حدود میں کیا جا سکتا ہے جو اسلام اور مسلمانوں کے مفاد کے لئے ضروری ہوں اور جن کے بغیر اُس کا تحفظ نہ ہو سکے۔ بلکہ بعض حالات میں اس قسم کا اشتراک اور تعاونِ عمل مسلمانوں کے ملی مفاد کے تحفظ کے لئے ناگزیر اور لازمی بھی ہو جاتا ہے۔ یہاں ضمنی طور پر مسلمانوں کو اس بات کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ خود اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سیکھیں اور اللہ پر بھروسا رکھیں اور غیروں کے سہارے تلاش نہ کریں۔

(درس ۶۴) يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚۛ وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوٓءٍ ۚۛ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُۥٓ أَمَدًۢا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ ٱللَّهُ نَفْسَهُۥ ۗ وَٱللَّهُ رَءُوفٌۢ بِٱلْعِبَادِ ۝ قُلْ إِن كُنتُمْ تُحِبُّونَ ٱللَّهَ فَٱتَّبِعُونِى يُحْبِبْكُمُ ٱللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَٱللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا۟ ٱللَّهَ وَٱلرَّسُولَ ۖ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَإِنَّ ٱللَّهَ لَا يُحِبُّ ٱلْكَٰفِرِينَ ۝ إِنَّ ٱللَّهَ ٱصْطَفَىٰٓ ءَادَمَ وَنُوحًا وَءَالَ إِبْرَٰهِيمَ وَءَالَ عِمْرَٰنَ عَلَى ٱلْعَٰلَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنۢ بَعْضٍ ۗ وَٱللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

(پارہ ۳ رکوع ۱۱ کی آخری ایک آیت اور رکوع ۱۲ کی ابتدائی ۴ آیات۔ سورۂ آل عمران)

جس دن ہر شخص جو کچھ اُس نے نیک عمل کئے ہیں اُنھیں اپنے سامنے موجود پائے گا اور جو کچھ اُس نے بُرے عمل کئے ہیں (وہ بھی)۔ وہ اس بات کی آرزو کرے گا کہ کاش اُس کے اور اُس دن کے درمیان دور دراز کی مسافت ہوتی اور اللہ تم کو اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ بندوں پر بہت مہربان ہے۔ کہدو کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے گناہ بخشدے گا۔

اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ کہدو کہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کرو اس پر بھی اگر وہ روگردانی کریں تو بیشک اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ بیشک اللہ نے منتخب کیا ہے تمام جہان پر آدم کو اور نوح کو اور اولاد ابراہیم اور اولاد عمران کو جو آپس میں ایک دوسرے کی اولاد ہیں اور اللہ بڑا سننے والا بڑا جاننے والا ہے۔

تشریح وتفسیر: "مُحْضَرًا" حضور سے بنا ہے۔ یہاں مقصود ہے موجود اور حاضر کیا ہوا۔ "تَوَدُّ" "وُدٌّ" سے بنایا گیا ہے۔ آرزو اور تمنّا کرنا مراد ہے۔ "اَمَدٌ" طویل زمانہ اور لمبی مسافت یا زیادہ فاصلہ کے لئے بولتے ہیں۔ اَمَد اور اَبَد میں زمانہ کے لحاظ سے یہ فرق ہے کہ "اَمَد" کا لفظ غیر محدود مدت کے لئے بولا جاتا ہے اور "اَمَد" کا لفظ اُس محدود مدت کے لئے بولتے ہیں جو معلوم نہ ہو۔ یہاں بعض نے طویل زمانہ اور بعض نے بعید مسافت مراد لی ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے یعنی عذاب قیامت سے بچنے کی تمنا کرنا جس کا پورا ہونا ممکن نہ ہوگا۔ "اِصْطِفَاءٌ" کے معنی ہیں خالص اور پاک صاف چیز کا لے لینا یا ممتاز کردینا۔ "آل" کا لفظ کئی معنوں میں بولا جاتا ہے یہاں آل ابراہیمؑ سے مراد آپ کی وہ نسل ہے جو آپکے بیٹوں حضرت اسمٰعیلؑ اور حضرت اسحٰقؑ سے چلی تھی۔ اسحٰقؑ علیہ السلام سے بنی اسرائیل پیدا ہوئے اور اسمٰعیل علیہ السلام امیّین یعنی امّت عرب کی اصل تھے۔ پھر آل عمرانؑ کا ذکر ہے بعض مفسروں نے یہاں عمران بن یَصْہر کو مراد لیا ہے جو حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام کے والد تھے اور بیشتر مفسروں نے عمران بن ماتان کو مراد لیا ہے جو حضرت مریم علیہا السلام کے والد تھے اور حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام کی نسل سے تھے۔ اسی دوسرے قول کو ترجیح دی گئی ہے اس لئے کہ اس سورہ میں خصوصیت کے ساتھ حضرت عیسیٰؑ ہی کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ عمرانؑ اُن کے نانا تھے۔ عمران نام کے ان دونوں بزرگوں کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو سال کا زمانہ گزرا تھا۔ "ذُرِّيَّةٌ" سے مراد انسان کی اولاد اور نسل ہوتی ہے۔

ان آیات کی ابتدا میں قیامت کے دن کو یاد دلایا گیا ہے جب دنیا کی پوری زندگی کا نتیجہ سامنے ہوگا اور ہر نیک وبد کی جزا یا سزا انسان کی نگاہوں کے آگے آجائے گی اور ہر ایک شخص کا نامۂ عمل اُس کے ہاتھ میں ہوگا۔ اُس وقت مجرم اور گنہگار لوگ اس کی آرزو کریں گے کہ کاش ہمیں دوبارہ دنیوی زندگی مل جاتی اور ہم نیک اعمال کرتے اور کاش یہ دن اور یہ ہولناک منظر ہم سے بہت دور ہوجاتا۔ مگر مجرموں کی یہ تمنا کیسے پوری ہوگی! اس لئے کہ قیامت کا دن جزا یا سزا کے لئے مقرر ہے۔ عمل کا موقع تو صرف دنیا ہی میں ہے جو اُس وقت گزر چکا ہوگا۔

پھر "يُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ" فرما کر یہ بھی سمجھایا گیا کہ اللہ نے انسان کو طرح طرح سے اُس کی غلطیاں

بتائی ہیں اس کی گمراہیوں کی نشاندہی کی ہے اور اُسے ہدایت وضلالت کی راہوں سے آگاہ کر دیا ہے اور قیامت کے آنے سے قبل اُس کی ہولناکیوں سے باخبر کر دیا ہے۔ گناہ اور معصیت کی پاداش کیا ہوگی اور نیکیوں کی جزا کیا ملے گی۔ سب کچھ ظاہر کر دیا ہے۔ یہ سب اس غرض سے کیا گیا ہے کہ انسان اُس خوفناک دن کے آنے سے قبل اس دنیا کی زندگی ہی میں عذاب کی گرفت سے بچنے کا انتظام کر لے سچے دل سے خدا اور رسولؐ پر ایمان اختیار کرے اور کوئی ایسا کام نہ کرے جو قہر الٰہی اور عذاب خداوندی کا باعث ہو۔ غرض بچنے کا ذریعہ ایمان اور عمل صالح ہے اور بچانے والا صرف اللہ ہے۔ قیامت کے دن جب ایمان کی جانچ ہوگی اور اعمال پر محاسبہ ہوگا تو نہ کسی کی سفارش کام آئے گی اور نہ کوئی دوسرا کسی کے لئے فدیہ بن سکے گا۔ قرآن نے صاف صاف اس کا اعلان کر دیا ہے کہ یہودیوں کی طرح سفارش انبیاءؑ کا عقیدہ اور نصاریٰ کی طرح حضرت مسیحؑ کے فدیۂ امت اور کفارہ بن جانے کا خیال قطعاً بے بنیاد ہے بلکہ اصل یہی ہے کہ اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے بخش دے اور جس پر چاہے عذاب کرے اور عذاب سے بچنے کا سب سے بڑا وسیلہ انسان کا ایمان اور ذاتی عمل نیک ہے۔ اُس کا جیسا عمل ہوگا اُسی کے مطابق اُس کو جزا یا سزا ملے گی اس میں سفارش یا فدیہ اور کفارہ ہو جانے کے عقیدہ کی کوئی گنجائش ممکن نہیں ہے۔ شفاعت بھی صرف اُن لوگوں کی ہوگی جو مومن ہوں گے کافروں مشرکوں اور منافقوں کے حق میں شفاعت ممکن نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد "واللہ رؤف بالعباد" فرما کر اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا کہ اگر اللہ کے بندے اُس کے خوف سے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے گناہ کے کام ترک کر دیں گے اور برائیاں چھوڑ کر نیکیاں اختیار کریں گے تو پھر یہ سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ کے انعام اور اس کی رحمت و مہربانی کی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ ایسے ایسے انعام عطا فرمائیگا جن کا کسی کو تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہونے کا اور صرف خوشنودی ہی نہیں بلکہ اُس کی محبت کے حصول کا واحد وسیلہ یہ ہے کہ اُس کے رسولؐ کی سنت کی پیروی کی جائے اور اُن کا اتباع کیا جائے۔ پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ کے دشمنوں یعنی کافروں، مشرکوں اور منافقوں سے ترک موالات کرو اور اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کے محبوب بننے کی سعی کرو اور اُس کی صورت یہ ہے کہ سنت محمدیؐ پر عمل کرو۔ اور یہاں یہ بات خود آنحضرتؐ سے فرمائی گئی کہ یہود و نصاریٰ اور دوسرے لوگوں کو یہ پیغام پہنچا دو کہ اگر تم لوگ اللہ سے محبت کا دعویٰ کرتے ہو تو اس دعوے کی کسوٹی یہ ہے کہ تم میری پیروی کرو جس کے بعد اللہ بھی تم کو دوست رکھے گا۔ اس پیروی کا نتیجہ یہ ہوگا کہ پچھلے گناہ دھل جائیں گے اور آئندہ رحمت و مغفرت الٰہی کے دروازے کھل جائیں گے۔ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ "نحن ابناء اللہ

وَاَحِبَّاءُهٗ "ہم اللہ کے بیٹے اور اُس کے محبوب ہیں۔ یہاں یہ بات صاف کردی گئی کہ اللہ کا بیٹا ہونا تو ممکن ہی نہیں ہے۔ رہا اس کا محبوب ہونا تو یہ اُسی وقت ممکن ہے کہ اُس کے آخری رسولؐ کی پیروی کی جائے اور اُن کی رسالت پر صدق دل سے ایمان اختیار کیا جائے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی نے آدمؑ و نوحؑ اور آل ابراہیمؑ اور آل عمرانؑ کو تمام جہان پر فضیلت عطا کی تھی اور اُنھیں منتخب کیا تھا۔ ان میں سے بعض لوگ بعض کی اولاد اور ذریت میں سے تھے۔ نوح علیہ السلام حضرت آدم علیہ السلام کی ذریت میں تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت نوح و آدم علیہما السّلام دونوں کی ذریت میں تھے اور حضرت عمرانؑ بن ماتان ان سب کی ذریت میں سے تھے لیکن بہرصورت یہ اصطفاء اور انتخاب صرف اِسی بنا پر تھا کہ یہ گھرانے توحید اور دینِ حق کے علمبردار تھے کیونکہ انسان کے لئے وجہ فضیلت یا وجہ افضلیت صرف اُس کا ایمان ہی ہوسکتا ہے جس کی سب سے بڑی بنیاد اللہ کی معرفت اور اُس کی فرمانبرداری ہے۔

(درس ۶۴) اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ○ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَاۤ اُنْثٰی ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْۤ اُعِیْذُهَا بِكَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ○ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِیَّا ؕ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَكَرِیَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ یٰمَرْیَمُ اَنّٰی لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۲ کی درمیانی ۳ آیات سورۂ آل عمران)

(وہ وقت یاد کرو) جب عمران کی بیوی نے عرض کی اے میرے پروردگار میں نے تیرے لئے نذر مانی ہے اس بچہ کی جو میرے شکم میں ہے کہ وہ آزاد رکھا جائیگا۔ پس تو مجھ سے قبول فرما بیشک تو ہی ہے بڑا سننے والا خوب جاننے والا۔ پھر جب اُس نے لڑکی کو جنا تو بولی اے میرے پروردگار میں نے تو لڑکی جنی اور اللہ تو خوب جانتا تھا کہ اُس نے کیا جنا ہے اور لڑکا اس لڑکی جیسا نہیں ہوسکتا تھا اور میں نے اس لڑکی کا نام مریم رکھا ہے اور میں اِسے اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے تیری پناہ میں دیتی ہوں پھر اُس کے پروردگار نے اُسے اچھی طرح قبول فرمایا اور اُسے بہترین طریقہ پر بڑھایا اور اُس کا سرپرست زکریاؑ کو بنا دیا۔ جب کبھی زکریاؑ اُس کے پاس حجرہ میں آتے تھے تو اُس کے پاس کچھ کھانے کی چیزیں

پاتے تھے تو کہنے لگے کہ اے مریم یہ چیزیں تمہیں کہاں سے مل جاتی ہیں انھوں نے جواب میں کہا کہ یہ اللہ کی طرف سے آتی ہیں۔ بیشک اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق عطا فرماتا ہے۔

تشریح و تفسیر:- "اِمْرَاَتُ عِمْرَانَ" اس کا لفظی ترجمہ "زوجۂ عمران" ہے۔ یہاں عمران سے مراد عمران بن ماتان ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نانا تھے۔ ان سے اٹھارہ سو برس پیشتر اسی نام کے ایک دوسرے بزرگ بھی تھے۔ اُن کے والد کا نام "یصہر" تھا اور وہ خود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے والد تھے۔ یہاں زوجۂ عمران سے مراد حضرت حنہ بنت فاقوذا ہیں جو حضرت مریم علیہا السلام کی ماں تھیں۔ ان کی قبر دمشق میں ہے۔ "مُحَرَّرًا" سے مراد ہے، صرف اللہ کی خدمت کے لئے۔ دوسرے تمام کاموں سے آزاد۔ "مَرْیَم" کے لفظی معنی عبادت گزار کے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ عربی زبان کا لفظ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ اُس وقت کی اسرائیلی زبان کا لفظ ہے۔

"نَبْتٌ" اور "نَبَاتٌ" جب مصدر ہو تو اس کے معنی زمین سے اُگنے کے ہوتے ہیں اور جب اسم ہو تو خود اُس درخت یا جڑی بوٹی کو کہتے ہیں جو زمین سے اُگتی ہے۔ اسی سے "انبات" بنا ہے۔ معنی ہیں اُگانا۔ "محراب" سے یہاں مراد وہ حجرہ ہے جو حضرت مریمؑ کی عبادت گاہ تھا کبھی یہ لفظ مسجد کے صدر مقام اور کبھی خود مسجد کے لئے بھی بولتے ہیں۔

حضرت عمرانؑ کی زوجہ حنہ بنت فاقوذا نے منت مانی تھی کہ جو بچہ میرے شکم میں ہے اُس کو میں اللہ کے نام پر "مُحَرَّر" یعنی آزاد کردوں گی اور وہ تمام دنیوی مشغلوں سے الگ رہ کر ہمیشہ اللہ کی خدمت میں لگا رہے گا۔ اس سے ایک لطیف دعائیہ اشارہ تھا کہ اُن کے یہاں لڑکا پیدا ہو کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کے لئے قبول نہیں کی جاتی تھیں پھر جب حضرت مریمؑ پیدا ہوئیں تو وہ حسرت سے کہنے لگیں کہ پروردگار یہ تو لڑکی ہے۔ یہاں پر یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تو خود ہی اس بات سے باخبر تھا اُسے اس کے بتانے کی ضرورت نہ تھی بلکہ یہ صرف اُس صورت حال کا بیان ہے جو اُس وقت وقوع میں آئی تھی اور مقتضائے بشریت کی بنا پر حضرت حنہ کے مُنہ سے بے ساختہ یہ جملہ نکل گیا تھا۔ غرض اللہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ اِس لڑکی کی منزلت اور بلند مرتبہ وہی خوب جانتا ہے اور جس طرح کے بیٹے کی تمنا تھی وہ باعتبار مرتبہ اس لڑکی کے برابر نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر فرمایا گیا کہ حنہ کی اس نذر کو لڑکی کی صورت میں اللہ نے قبول کر لیا جو بیت المقدس کی تاریخ میں ایک انوکھی بات تھی۔ Dictionary of the Bible اور Legends of lady Mary نیز دوسری مسیحی کتابوں میں اس کی تصریح ہے کہ حضرت مریم تین سال کی عمر میں خدمت بیت المقدس کے لئے قبول کر لی گئی تھیں۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے

اُن کی پرورش کی اور اللہ نے اُنھیں اپنی رحمت خاص سے روحانی، جسمانی اور اخلاقی اور ہر حیثیت سے بہترین طریقہ پر نشوونما عطا فرمائی۔ کفالتِ مریمؑ کے لئے حضرت زکریاؑ کا انتخاب ایک خاص صورت پر قرعہ کے ذریعہ سے عمل میں آیا تھا جس کی تشریح آئندہ کی آیات میں آئے گی۔ حضرت مریمؑ کی تربیت کے واقعات کا اسلامی روایات میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ پیدائش کے بعد ماں اپنی بیٹی کو بیت المقدس میں علماء واحبار کے پاس لائی تاکہ وہ اس کی پرورش کا انتظام کریں پھر قرعہ میں حضرت مریمؑ کے خالو یا بہنوئی حضرت زکریاؑ کا نام نکلا۔ آپ نے اُنھیں پرورش کیا اور جب وہ سن تمیز کو پہنچیں تو اُن کے لئے بیت المقدس میں ایک حجرہ مقرر کیا جو بلندی پر تھا اور بغیر سیڑھی کے وہاں کوئی نہیں جا سکتا تھا۔ آپ جب کہیں باہر جاتے تھے تو اُس حجرہ میں قفل ڈال دیا کرتے تھے اور رات کے وقت حضرت مریمؑ کو اُن کی خالہ کے پاس لیجاتے تھے جہاں وہ رات بسر کیا کرتی تھیں۔ حضرت زکریاؑ جب باہر سے واپس آکر بیت المقدس کے حجرہ میں داخل ہوتے تھے تو مریمؑ کے پاس جاڑے کے میوے گرمی میں اور گرمی کے میوے جاڑے میں دیکھتے تھے۔ اس کرامت کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام نے بھی اپنے لئے بڑھاپے میں اللہ سے اولاد کی دعا کی تھی جس کے نتیجہ میں حضرت یحییٰؑ پیدا ہوئے۔ یہ زکریاؑ جن کا یہاں ذکر ہے مورخین اسلام کے نزدیک وہی ہیں جنھیں یہود نے ایک غلط الزام لگا کر شہید کر ڈالا تھا۔ غرض حضرت مریمؑ اس جلالت و عصمت کے باوجود پیغمبری کے درجہ پر فائز نہ تھیں اسی بنا پر اہلِ تحقیق نے کرامات اولیاء کے جواز و امکان میں اس آیت کو بطور ایک واضح شہادت اور صریح دلیل کے تسلیم کیا ہے۔

(درس ۶۵)

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ○ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ○ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ○ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ○

(پارہ ۳، رکوع ۱۲ کی آخری ۴ آیات سورہ آل عمران)

وہیں زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی عرض کی اے میرے رب مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد

عطا فرما۔ بیشک تو دعا کا بڑا سننے والا ہے پس اُن کو فرشتوں نے آواز دی اس حالت میں کہ وہ حجرہ میں کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے کہ اللہ آپ کو یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے جو کلمۃ اللہ کی تصدیق کرنے والے ہیں اور سردار ہوں گے اور اپنے نفس کو بہت روکنے والے ہوں گے اور نبی ہوں گے صالحین میں سے۔ زکریا نے عرض کی اے میرے پروردگار میرے یہاں بیٹا کس طرح ہوگا حالانکہ میں بالکل بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ ارشاد ہوا اسی طرح اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔ زکریا بولے اے میرے پروردگار میرے لئے کوئی نشانی مقرر فرما دے اللہ نے فرمایا کہ تیرے لئے نشانی یہ ہے کہ تو لوگوں سے تین دن تک بات نہ کر سکے گا بجز اشارہ کے اور کثرت کے ساتھ اپنے پروردگار کو یاد کرتے رہو اور دن ڈھلے بھی اور صبح کو بھی تسبیح کیا کرو۔

تشریح و تفسیر :۔ "یحییٰ" بعض کے نزدیک یہ لفظ غیر عربی ہے اور بعض اسے عربی بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ "حیوۃ" سے مشتق ہے۔ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰؑ سے اکثر لوگوں کے نزدیک ۶ ماہ عمر میں بڑے تھے۔ حضرت یحییٰؑ ہی نے اُن کی سب سے پہلے تصدیق بھی کی تھی۔ اُن کی والدہ کا نام ایشاع تھا جو بعض کے نزدیک حضرت مریمؑ کی بہن تھیں اور کچھ لوگوں نے لکھا ہے کہ وہ اُن کی خالہ تھیں اس طرح حضرت یحییٰؑ یا تو حضرت عیسیٰؑ کے خالہ زاد بھائی تھے یا خود حضرت مریمؑ کے خالہ زاد بھائی تھے۔ اسرائیلی جدید صحیفوں میں یحییٰؑ کا نام یوحنا المعمدان لکھا ہوا ہے اور اُن کی والدہ کا نام بجائے "ایشاع" کے "الیصابات" تحریر ہے۔ "مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" میں کلمۃ اللہ سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور بعض نے "کتاب اللہ" کو مراد لیا ہے۔ "حَصُوْر" سے وہ شخص مراد ہے جو جنسی امور کی طرف رغبت اور توجہ نہ رکھتا ہو۔ "عاقِر" "عَقْر اور عُقْر" سے بنایا گیا ہے بانجھ عورت کو کہتے ہیں "رَمْز" سے اشارہ مراد ہے۔ "عَشِیّ" زوال آفتاب سے غروب تک کے سارے وقت کو کہا جاتا ہے۔ "عِشَاءٌ" وہ وقت جو غروب آفتاب کے بعد شروع ہوتا ہے اُس کو کہتے ہیں۔ اسی طرح "اِبکار" طلوع آفتاب سے ایک پہر دن چڑھے تک کے لئے بولا جاتا ہے۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے جب حضرت مریم علیہا السلام کے پاس جنتی میوے دیکھے تو خود بھی دعا کی "هُنَالِكَ" سے مراد ہے "اُسی جگہ اور اسی وقت" دعا یہ تھی کہ خدایا مجھے بھی اسی طرح اولاد عطا فرما جس طرح تو نے والدۂ مریمؑ کو مریمؑ عطا کیں۔ دعا قبول ہوگئی اور بشارت ملی کہ فرزند کی ولادت ہوگی جس کا نام "یحییٰ" رکھ دیا گیا ہے جو کلمۃ اللہ حضرت مسیحؑ کی تصدیق کرے گا، اور وہ فرزند سردار ہوگا اور دنیوی لذتوں اور جنسی خواہشات و رجحانات کی طرف توجہ نہ رکھنے والا ہوگا یعنی اس قسم کی خواہشات پر اُن کو پورا قابو

تھا اور وہ بے حد متقی اور پرہیز گار تھے۔ اس خوشخبری کو سُن کر حضرت زکریاؑ نے عرض کی کہ پروردگار آخر یہ عطیہ الٰہی مجھے کس طرح ملے گا۔ مقصود یہ تھا کہ کیا میری جوانی پلٹ آئے گی اور میری زوجہ ولادت فرزند کے لائق ہو جائے گی یا کوئی اور انقلاب رونما ہوگا؟ یہ سب اِس وجہ سے کہ وہ خود بھی بہت بوڑھے تھے یعنی ایک روایت کی بنا پر اُن کی عمر ایک سو بیئس۱۲۰ برس کی ہو چکی تھی اور اُن کی زوجہ بھی اٹھانوے۹۸ سال کی تھیں اور بانجھ بھی تھیں اس لئے ظاہری حالت کی بنا پر ایسی صورت میں اولاد کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی مگر قدرت خدا سے کوئی بات بھی بعید نہیں ہو سکتی۔ غرض حضرت زکریاؑ صرف اس نعمت خداوندی کی تشریح چاہتے تھے یہ مطلب کسی طرح بھی نہیں ہے کہ معاذ اللہ اُنھیں اِس بشارت میں کوئی شک وشبہ تھا بلکہ اُنھیں بشارت کی صحت کا یقین کامل تھا محض اُس کی تفصیل چاہتے تھے۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے درگاہ خداوندی میں درخواست کی تھی "رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی" اے میرے پروردگار مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کس طرح زندہ کریگا" اِس کا بھی مطلب یہی ہے کہ حضرت خلیل اللہ علیہ السلام کو اس کا یقین تھا کہ اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا مگر اُس کی تشریح و تفصیل کا مشاہدہ کرنا چاہتے تھے۔ یہی صورت حضرت زکریاؑ کی دعا کے متعلق بھی تھی۔ دعائے حضرت زکریاؑ کے جواب میں ارشاد ہوا کہ حالات میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی بلکہ اسی حالتِ مایوسی میں فرزند عطا ہوگا۔ زکریاؑ نے پھر عرض کی کہ جب یہ فرزند عطا ہوگا تو اُس وقت اس کی کیا علامت ظاہر ہوگی جس سے یہ بات سمجھ میں آجائے کہ اب فرزند کی ولادت ہونے والی ہے تاکہ میں جلدی سے اُس پر ادائے شکر کروں۔ یہاں پر حضرت زکریاؑ نے یہ عرض کی تھی کہ اے اللہ اس بات کی ایک "اٰیۃ" یعنی نشانی مقرر فرما دے تو جواب میں فرمایا گیا کہ نشانی یہ ہے کہ تم تسبیح الٰہی تو بدستور کرتے رہوگے لیکن تین روز تک تمہیں لوگوں سے بات چیت کرنے کی طاقت نہ رہے گی اور اُن سے بول نہ سکوگے صرف اشارہ سے اپنا مطلب ظاہر کر سکوگے۔ مقصود یہ تھا کہ یہ کوئی مرض نہ ہوگا کہ زبان کلام کرنے کے قابل نہ رہے بلکہ یہ ایک معجزہ ہوگا، ایک آیت الٰہی ہوگی کہ محض تسبیح و تہلیل کے لئے اور عبادت کے لئے تو زبان پورا کام کرے مگر جب لوگوں سے بات چیت کی جائے تو گونگی ہو جائے۔ ان آیتوں میں اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ حضرت یحییٰؑ بن زکریاؑ ہی وہ پہلے انسان ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کی تصدیق کی تھی عمر میں دونوں کی فرق تھا۔ یحییٰ علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام سے تین سال یا چھ روایتوں کی بنا پر کم وبیش چھ ماہ عمر میں بڑے تھے۔ حضرت زکریاؑ کے بڑھاپے میں جبکہ آپ کی زوجہ بھی بانجھ ہونے کے باوجود بہت زیادہ کبیر السن ہو چکی تھیں، فرزند کی ولادت یقیناً قدرتِ خدا کی ایک بڑی نشانی تھی۔ پھر اس کی ایک اور نشانی بات نہ کر سکنے کی مقرر ہونا دوسرا معجزہ تھا اور یہ سب گویا اس بات کی تمہید تھی کہ جب بڑھاپے

اور مایوسی کے سن میں اس طرح اولاد کا ہونا ممکن ہے تو اس کے بعد آنے والا واقعہ یعنی ولادت عیسیٰ بن مریمؑ بھی پوری طرح ممکن ہے کیونکہ عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے اُسی اللہ نے خلق فرمایا تھا جس نے زکریاؑ کو بڑھاپے میں یحییٰؑ جیسا فرزند دیا اور جس نے آدم علیہ السلام کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر دیا تھا۔

(۲۳) وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفَىٰكِ عَلَىٰ نِسَآءِ الْعَٰلَمِينَ ○ يَٰمَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّٰكِعِينَ ○ ذَٰلِكَ مِنْ أَنۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَٰمَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ○ إِذْ قَالَتِ الْمَلَٰٓئِكَةُ يَٰمَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ○ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّٰلِحِينَ ○ قَالَتْ رَبِّ أَنَّىٰ يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ ۖ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۚ إِذَا قَضَىٰٓ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ○ (۶۶)

(پارہ ۳ رکوع ۱۳ کی ابتدائی ۶ آیات کریمہ سورہ آل عمران)

(اور وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا اے مریم بیشک اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا ہے اور پاک بنایا ہے اور سب جہان کی عورتوں کے مقابلہ میں منتخب فرمایا ہے۔ اے مریم اپنے پروردگار کی اطاعت کرتی رہو اور سجدہ کرتی رہو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہو۔ یہ واقعات غیب کی خبروں میں سے ہیں۔ ہم تم پر ان کی وحی کر رہے ہیں۔ تم اُن لوگوں کے پاس نہ تھے جب وہ اپنے قلم ڈال رہے تھے کہ اُن میں سے کون شخص مریم کی سرپرستی کرے اور نہ اُس وقت تم اُن کے پاس تھے جب وہ باہم اختلاف کر رہے تھے (وہ وقت یاد کرو) جب فرشتوں نے کہا تھا کہ اے مریم اللہ آپ کو خوشخبری دیتا ہے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا جو دنیا اور آخرت میں باعزت اور مقرب لوگوں میں سے ہوگا اور وہ لوگوں سے گہوارہ میں بھی کلام کرے گا اور پختہ عمر میں بھی اور صالحین میں سے ہوگا۔ مریم نے عرض کی اے میرے پروردگار میرے یہاں لڑکا کیونکر ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے۔ ارشاد ہوا اللہ اسی طرح جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تو اس کے لئے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔

"تشریح و تفسیر: "مَرْيَمُ" کا لفظ اکثر محققین کے نزدیک عربی زبان کا نہیں ہے۔ یہاں متعلقہ جملہ سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فرشتے اُن لوگوں سے بھی ہمکلام ہوتے ہیں جو نبی نہیں ہوتے البتہ یہ بات ثابت ہے کہ فرشتوں کے لائے ہوئے تبلیغی پیغامِ خداوندی صرف پیغمبروںؑ ہی کے ساتھ مخصوص ہوا کرتے ہیں "عالمین" سے سارا جہان مراد ہے اور صحیح تر قول یہی ہے کہ یہاں اس سے مراد وہ مخصوص جہان ہے جس میں خود حضرت مریمؑ موجود تھیں نہ کہ قیامت تک کا سارا جہان۔ اور "نِسَاءُ العَالَمِين" سے مقصود اُسی مخصوص جہان اور اُسی مخصوص زمانہ کی تمام عورتیں ہیں جن سے آپ افضل و اشرف تھیں۔

"يَكْفُلُ" کا مصدر "كَفْل اور كَفَالَة" ہے اور معنی ہیں کسی کی تربیت اور پرورش وغیرہ کا ذمہ دار اور ضامن ہوجانا "مَهْد" بچوں کے گہوارہ کو کہتے ہیں اور کبھی "مَهْد اور مِهَاد" ہموار کی ہوئی زمین کے لئے بھی بولتے ہیں۔ "كُهُولَة" ادھیڑ عمر کو اور "كَهْل" ادھیڑ عمر والے کو کہتے ہیں۔ یہاں اُس وقت کا ذکر فرمایا گیا ہے جب فرشتوں نے حضرت مریم علیہا السلام کو یہ خوشخبری دی تھی کہ انھیں خدا نے منتخب اور برگزیدہ قرار دیا ہے اور اُس وقت کی تمام عورتوں پر انھیں فضیلت عطا کی ہے۔" اصطفاء" کے معنی برگزیدہ کرنے اور منتخب کرنے کے ہیں۔ پہلی آیت میں حضرت مریمؑ کے لئے یہ لفظ دو مرتبہ بولا گیا ہے پہلے "اصطفاء" سے مراد یہ ہے کہ اُن کی پیدائش ہی برگزیدہ تھی اور دوسرے سے مقصود ہے کہ آپ کی پوری زندگی کو اُن خصوصیتوں اور فضیلتوں پر مشتمل قرار دیا گیا جو دوسری عورتوں کو حاصل نہ تھیں۔

پہلی دونوں آیتوں سے یہود و نصاریٰ کی مکمل رد کردی گئی ہے۔ یہود کی تو اس طرح کہ انھوں نے حضرت مریمؑ کی شانِ اقدس میں جو گستاخیاں کی تھیں اُن سے آپ کی ذات قطعی طور پر ارفع و اعلیٰ تھی اور نصاریٰ کی رد اس طرح کہ مریمؑ اللہ کی ایک نیک کنیز تھیں اور اُس کی عبادت گزار اور فرمانبردار ہونے کی وجہ سے اُنھیں اُس نے منتخب فرمایا تھا۔ اس صفت کے علاوہ اُن میں کوئی ایسی بات ممکن ہی نہ تھی کہ اُن کے متعلق اِس کے خلاف کسی غلط عقیدہ کو قائم کیا جا سکے۔ پھر اُس واقعہ کو یاد دلایا گیا ہے جب اُن کی تربیت حضرت زکریا علیہ السلام کے سپرد ہوئی تھی۔ چونکہ والدِ حضرت مریمؑ حضرت عمرانؑ خدامِ ہیکل سلیمانی کے سردار تھے اس لئے سوال پیدا ہوا کہ اُن کی یتیم بچّی کی تربیت کون شخص کرے خدامِ حرم میں سے ہر شخص اس کا آرزومند تھا کہ یہ شرف اُسی کو مل جائے۔ آخر قرعہ ڈالا گیا جس کی صورت یہ تھی کہ توراۃ لکھنے کے قلم دریائے اُردن میں ڈال دیئے گئے دوسروں کے قلم تو پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہنے لگے مگر حضرت زکریاؑ کا قلم ٹھہر گیا بلکہ پانی کے بہاؤ کے خلاف اوپر کی طرف چڑھنے لگا اور یہی اُن کی فتح و کامیابی کی علامت تھی بالآخر حضرت مریمؑ کی تربیت حضرت زکریاؑ کے سپرد ہوئی جو بعض کے

نزدیک اُن کے خالو اور بعض کے نزدیک بہنوئی تھے۔ آگے کی آیتوں میں اس عقیدہ کو ہر حیثیت سے اور ہر رُخ سے باطل کر دیا گیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بشریت سے الگ کوئی مرتبہ یا وجود رکھتے تھے اور اسی لئے انھیں یہاں ابن مریمؑ اور کلمۃ اللہ کہکر خطاب کیا گیا ہے تاکہ اس حقیقت کو پوری طرح سمجھا دیا جائے کہ وہ صرف ایک مقرب عبد خدا تھے اور اُس کی ایک ممتاز مخلوق تھے جنھیں اس نے مسِ بشری کے بغیر محض اپنی قدرتِ کاملہ سے خلق فرمایا تھا اور نبوت و رسالت کے عہدہ جلیلہ پر فائز کیا تھا۔

(درس ۶۷)

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۝ وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّىْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّىْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْىِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِىْ بُيُوْتِكُمْ ۭ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِىْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۣ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّىْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

(پارہ ۳ رکوع ۱۳ کی درمیانی ۴ آیاتِ کریمہ۔ سورہ آلِ عمران)

اور اللہ اُس کو کتاب و حکمت اور توراۃ و انجیل کی تعلیم دے گا اور وہ بنی اسرائیل کے لئے پیغمبر ہوگا اور کہے گا کہ میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے نشانی لیکر آیا ہوں، میں تمہارے لئے گیلی مٹی سے پرندہ کے مانند شکل بنا دیتا ہوں پھر اُس میں دم کر دیتا ہوں تو وہ شکل اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور اللہ ہی کے حکم سے مُردوں کو زندہ کرتا ہوں اور جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ تم اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے ہو وہ سب تمہیں بتا دیتا ہوں بیشک ان تمام باتوں میں تمہارے لئے ضرور ایک نشانی ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔ اور میں تصدیق کرنے والا ہوں اُس کتاب یعنی توراۃ کی جو مجھ سے پہلے آئی تھی اور میں اس لئے آیا ہوں کہ تم پر پہلے جو کچھ حرام کر دیا گیا تھا اُس میں سے کچھ تمہارے لئے حلال کر دوں اور میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے نشانی لیکر آیا ہوں پس تم اللہ سے ڈرتے رہو اور میری اطاعت کرو۔ بیشک اللہ میرا بھی پروردگار ہے

اور تمہارا بھی پس اُسی کی عبادت کرو یہی سیدھی راہ ہے۔

تشریح وتفسیر:۔ "الکتاب" سے یہاں پچھلی تمام آسمانی کتابیں مراد ہیں اور صرف حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ تک کی اہمیت کے لحاظ سے توراۃ وانجیل کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے "الحکمۃ" سے مراد عقل و دانائی کی باتیں ہیں۔ "الطین" پانی ملی ہوئی مٹی کو کہتے ہیں "نَفَخ" کے معنی پھونکنے کے ہیں۔ "اُبْرِئُ" "بَرْءٌ" اور "بُرْءٌ" سے بنا ہے۔ اس کا مصدر "اِبْرَاءٌ" ہے۔ معنی ہیں شفا دینا اور نجات دلانا۔ "اَکْمَہ" سے اکثر مفسرین کے نزدیک پیدائشی اندھا مراد ہے۔ "اَبْرَص" اُس مریض کو کہتے ہیں جس کے بدن میں سفید داغ کی بیماری ہوجاتی ہے۔ خود اس مرض کا نام "ر" پر زبر کے ساتھ "بَرَص" ہے۔ "تَدَّخِرُوْنَ" کا مصدر "اذتخار" ہے جو علم صرف کے قواعد کے مطابق "ادّخار" بن گیا۔ معنی ہیں مستقبل کے لئے کچھ ذخیرہ کرنا۔ اس کا اصلی مصدر "ذُخْر" ہے نہ کہ "دُخْر"۔ حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کی صفتیں بیان کی جارہی ہیں اور حضرت مریمؑ کو خبر دی جارہی ہے کہ جو فرزند اُن کو عطا ہوگا اُسے اللہ کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تعلیم دیگا اور وہ رسول بنا کر بنی اسرائیل کی طرف بھیجا جائے گا۔ اس بات میں کہ حضرت عیسیٰؑ تمام دنیا کے لئے رسول بن کر آئے تھے یا صرف بنی اسرائیل کے لئے، دو مسلک ہیں۔ صحابہؓ کرام اور ائمہ اہلبیت اطہار علیہم السلام کی بعض روایات میں اس کی تصریح ہے کہ اُن کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کے لئے ہوئی تھی اور اس بنا پر آیت کے اس فقرہ یعنی "وَرَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ" کا مطلب یہ ہوگا کہ اُنھوں نے بنی اسرائیل سے جو کچھ خطاب کیا تھا وہ بحیثیت رسول کے تھا اور وہ اُن میں رسول کی حیثیت سے تھے نہ یہ کہ اُنھیں اللہ نے صرف بنی اسرائیل ہی کے لئے مبعوث کیا تھا اور اُن کے علاوہ دوسرے لوگوں کے لئے وہ نبی نہ تھے البتہ یہ بات ضرور تھی کہ جبتک وہ زمین پر رہے اور آسمان پر نہیں اٹھائے گئے تھے اُن کی دعوت صرف بنی اسرائیل ہی میں محدود رہی تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا قول یہ ہے کہ اُن کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لئے ہوئی تھی۔ احادیث وروایات کے پیش نظر پہلا قول زیادہ قوی ہے۔ "رَسُوْلاً" کے لفظ سے یہ بھی بتایا گیا کہ یہودیوں نے اُن کے متعلق جس طرح کی غلط بیانی اور جسارت کی تھی اور آپ کو معاذاللہ ساحر وغیرہ کہا تھا ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ آپ اللہ کے سچے رسول تھے اور اُس نے آپ کو ہدایت خلق کے لئے نبی بنا کر مبعوث فرمایا تھا۔ پھر اسی سلسلہ میں اس کا بھی ذکر ہے کہ اُنھوں نے بنی اسرائیل سے یہ کہا تھا کہ میں اللہ کی جانب سے کچھ معجزے لیکر آیا ہوں ایک تو یہ کہ گیلی مٹی لیکر اُس سے پرندہ کی شکل بناتا ہوں پھر اُس پر کچھ دم کرتا ہوں اور وہ اللہ کے حکم سے اصلی پرندہ بن جاتا ہے۔ یہاں یہ بات نہ بھولنا چاہئے کہ لفظ "خلق" کے معنی کہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں لایا جائے صرف اللہ ہی کی ذات اقدس کے ساتھ مخصوص ہیں

کسی دوسرے کیلئے اس معنی میں یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا اس معنی کے علاوہ اس کے دو معنی اور بھی ہیں یعنی اندازہ کرنا اور صورت بدل دینا ان دونوں معنی میں اس لفظ کا اطلاق غیر اللہ کے لئے بھی ہوتا ہے چنانچہ زیر بحث آیت میں لفظ خلق کی نسبت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف شکل و صورت بدلنے ہی کے لحاظ سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ معجزہ اُسی واقعہ کو کہا جاتا ہے جو عام تکوینی اسباب سے ہٹکر صرف کسی نبی کی تصدیق اور تائید کے لئے اللہ کی قدرت سے ظاہر ہو اور جسے عام حالات و اسباب کا فطری تقاضا نہ کہا جا سکتا ہو۔ اور جس پر اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا قدرت نہ رکھتا ہو۔ غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے ساتھ ہی اپنے دوسرے معجزوں کا بھی ذکر فرمایا تھا کہ میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھوں اور کوڑھیوں کو بھی شفا دیتا ہوں اور مردوں کو بھی اُسی کے حکم سے زندہ کر دیتا ہوں۔ ان معجزات کا ذکر کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں کی مسلمہ انجیلوں میں بھی موجود ہے اور ان میں سے بعض کا ذکر انجیل برنابا اور Coptic church یعنی قبطی کلیسا کی انجیل میں پایا جاتا ہے۔ یہاں قرآنِ حکیم نے "باذن اللہ" کی قید لگا کر اس حقیقت کو صاف کر دیا کہ حضرت عیسیٰ بن مریمؑ جس قدر معجزات دکھاتے تھے وہ سب حکمِ خدا سے ہوتے تھے اور اُسی کی قدرت سے اُن کا ظہور ہوتا تھا نہ کہ خود حضرت عیسیٰؑ کی قوت سے کیونکہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھنے والا صرف اللہ ہی ہے۔
اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے عیسیٰ علیہ السلام کو اُن تمام چیزوں کا بھی علم عطا کیا تھا جنھیں لوگ اپنے گھروں میں ذخیرہ کرتے تھے اور اُن میں سے کوئی چیز بھی اُن سے چھپائی نہ جا سکتی تھی آخر میں حضرت عیسیٰؑ کے اس قول کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ میں اس لئے نبی بنا کر بھیجا گیا ہوں کہ اپنے سے پیشتر آنے والی کتاب یعنی توراۃ کی تصدیق کروں اور اُس کے عام قوانین اور اصول کو باقی رکھتے ہوئے اس زمانہ کے تقاضوں کے مطابق خداوندی حکم کے تحت صرف کچھ جزئی تبدیلی کر دوں اور وحی الٰہی کے مطابق بعض احکام کی سختی کو نرمی سے بدل دوں اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعثت حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جو بھی احکام تھے وہ اُس وقت کے لحاظ سے بالکل درست تھے مگر بعثت حضرت عیسیٰؑ کے وقت زمانہ کی تبدیلی کے ساتھ پچھلے فرعی احکام میں کچھ جزئی تبدیلیاں ضروری تھیں جو حکم الٰہی کے مطابق عمل میں لائی گئیں۔ اس کو حکم کی تکمیل بھی کہہ سکتے ہیں اور اسی کا نام "نسخ" بھی ہے۔ حاصل سب کا یہی ہے کہ بعض پچھلے احکام کے نفاذ کا زمانہ معین اور محدود تھا اور جب وہ پورا ہو گیا تو اُن کی جگہ پر آئندہ آنے والے زمانہ کے حالات کے مطابق دوسرے خداوندی احکام آ گئے نہ یہ کہ پچھلے حکم ہی غلط تھے بلکہ وہ ہر طرح اُس دور کے لئے صحیح و درست اور برحق تھے جس میں اُنھیں نافذ کیا گیا تھا۔

(درس) ۲۸

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○ وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ○ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۳ کی آخری ۳ رکوع ۱۴ کی ابتدائی ایک آیت سورہ آل عمران)

پھر جب عیسٰی نے اُن کا کفر معلوم کر لیا تو کہنے لگے کہ کون لوگ ایسے ہیں جو اللہ کی راہ میں میرے مددگار ہوں حواری بولے کہ اللہ کے مددگار ہم ہیں، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور آپ گواہ رہیے گا کہ ہم فرمانبردار ہیں اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے ہیں اُس پر جو تو نے نازل کیا ہے اور ہم نے رسول کی پیروی اختیار کر لی ہے پس تو ہمیں بھی گواہوں میں لکھ لے اور کافروں نے مکر کیا اور اللہ نے بھی تدبیر کی اور اللہ سب تدبیر کرنے والوں سے بہتر ہے۔ (وہ وقت بھی ذکر کے قابل ہے) جب اللہ نے فرمایا اے عیسٰی میں تجھے پوری طرح لینے والا ہوں اور تجھے اپنی جانب اُٹھانے والا ہوں اور اُن لوگوں سے جو کافر ہیں تجھے پاک کرنیوالا ہوں اور جو تیرے پیرو ہیں انھیں قیامت تک اُن لوگوں پر غالب رکھنے والا ہوں جو منکر ہیں پھر تم سب کا لوٹنا میری ہی طرف ہے۔ پس میں تمہارے درمیان اُس بات میں فیصلہ کر دونگا، جس میں تم باہم اختلاف کرتے رہتے تھے۔

تشریح وتفسیر

"حواری" حضرت عیسٰی علیہ السلام کے انصار و اصحاب کو کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ "حَوَر" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی کپڑا دھو کر صاف کرنے کے آتے ہیں۔ "حواری کا لفظ نصیحت کرنے والے، نصرت کرنے والے اور مخلص دوست کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے اس لفظ کا اطلاق" دھوبی پر بھی ہوتا ہے جو کپڑے دھو کر صاف کرتا ہے۔ "یہ"

کے معنی ہیں کسی شخص کو تدبیر کے ساتھ اُس کے مقصد اور ارادہ سے ہٹا دینا اور روک دینا اس عمل سے اگر کوئی صحیح اور نیک بات مقصود ہو تو یہ قابلِ تعریف ہوگا ورنہ لائق مذمت ہوگا۔ اس کی نسبت جب اللہ کی طرف ہو تو اس سے مراد وہی تدبیر ہوا کرتی ہے جو دُرست و جائز اور حق ہو اور لائق مدح و ثنا ہو "مُتوفیك" میں لفظ متوفی کا مصدر "توفی" ہے اس کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا لے لینا موت پر بھی اس کا اطلاق اسی معنی کے لحاظ سے ہوتا ہے کیونکہ اس میں بھی کوئی خاص عضو نہیں بلکہ پوری جان ہی اللہ کی طرف چلی جاتی ہے پھر اگر روح اور جسم دونوں لے لئے جائیں تو یقیناً اس پر لفظ "توفی" کا اطلاق بالکل صحیح ہوگا۔ قرآن مجید نے "توفی" کا لفظ صرف موت ہی کے لئے نہیں بولا ہے بلکہ نیند کے لئے بھی بولا ہے۔ سورہ انعام میں ارشاد ہوا ہے "وَھُوَ الَّذِی یَتَوَفّٰکُمْ بِالَّیْلِ" اللہ وہی ہے جو رات کے وقت تم کو وفات دیتا ہے یعنی تم پر نیند کو غالب کر دیتا ہے۔ اس بنا پر جب "توفی" کے کئی معنی ہوگئے تو اب حضرتِ عیسیٰؑ کے متعلق تلاوت کردہ آیت میں اس کے معنی کا تعین صرف احادیث ہی کی روشنی میں اور اجماع اُمتِ مسلمہ ہی کے ذریعہ سے کیا جا سکتا ہے۔ متواتر اور صحیح حدیثیں اور اجماع امت اسی بات کے حق میں ہے کہ "توفی" کے یہاں مراد یہی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ آسمان پر زندہ اُٹھا لئے گئے اور اُن کا آسمان سے نزول صرف اُسی وقت ہوگا جب اللہ کی مشیت ہوگی۔ ایک مشہور حدیث میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے: اِنَّ عِیْسٰی لَمْ یَمُتْ وَاَنَّہٗ رَاجِعٌ اِلَیْکُمْ قَبْلَ یَوْمِ الْقِیٰمَۃِ (دُرِّ منثور) بیشک حضرت عیسیٰؑ کو موت نہیں آئی ہے اور یقیناً وہ قیامت آنے کے قبل تمہاری طرف واپس آئیں گے۔

غرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب یہود کو دیکھا کہ وہ اُن کی نبوت کے منکر ہیں اور اُن پر طرح طرح کے جھوٹے الزام لگا رہے ہیں تو اور لوگوں کو اپنی امداد کے لئے پکارا اس پر حواریوں نے لبیک کہی اور اپنے ایمان کا اعلان کیا بالکل اسی طرح جیسے سرورِ کائنات نے مکّہ کے مشرکوں کے خلاف دوسرے لوگوں سے مدد طلب فرمائی تھی اور اس طلب پر انصارِ مدینہ نے لبیک کہی اور سرورِ کائنات اور آپ کے ساتھیوں کی اس طرح مدد کی جو قیامت تک تاریخ کے اوراق پر سنہرے حروف سے لکھی

رہے گی۔ اس کے بعد اللہ نے یہود کے اُس ناپاک گروہ کا ذکر فرمایا ہے جس نے حضرت عیسیٰؑ کی رسالت کے انکار ہی پر اکتفا نہیں کی تھی بلکہ اُن کی ایذا رسانی یہاں تک کی کہ انھیں ہلاک کرنے کی تدبیریں بھی کرتا رہا۔ اس ظالم یہودی گروہ نے اُس وقت کے رومیوں کی مشرک عدالت سے اللہ کے پیغمبرؑ کو پھانسی دینے کا حکم جاری کرایا اور آپ پر مُلکی بغاوت اور مذہبی الحاد کا جھوٹا الزام عائد کیا گیا مگر یہودیوں کی ساری سازشیں ناکام ہوگئیں اور اللہ نے حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کو آسمان پر اُٹھا لیا اور اُس ظالم و کافر گروہ کے ظلم سے انھیں بچا لیا اور اب وہ قیامت سے پہلے زمین پر اتریں گے جب اللہ چاہے گا، پھر آخر میں اس کا بھی اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو جو حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کے سچے ماننے والے اور انھیں نبی برحق سمجھنے والے ہیں قیامت تک تمام کافروں پر سربلندی عطا فرمائے گا ان سچے متبعین عیسیٰؑ سے مراد اُمّت مسلمہ ہے اس لئے کہ یہ بات ممکن ہی نہیں ہوسکتی کہ کوئی حضرت عیسیٰؑ کی نبوّت کا اقرار بھی کرے اور اُن کی پیشنگوئیوں کو نہ مانے اور اُن بشارتوں کا انکار کرنے کی جرأت کرے جو انھوں نے سرورِ کائنات کی تشریف آوری کے سلسلہ میں دی تھیں اور اپنے پیروؤں کو اس کا حکم دیا تھا کہ جب آخری رسولؐ تشریف لائیں تو تم اُن پر ایمان اختیار کرنا اس بنا پر حضرت عیسیٰؑ کے سچے متبع تو وہی ہوسکتے ہیں جو ان کے اس حکم پر عمل کریں اور حضورؐ کی رسالت پر ایمان رکھتے ہوں، یہی وہ لوگ ہیں جنھیں یہودی اور تمام کفار و مشرکین پر ہمیشہ حجت و دلیل اور اخلاق و ایمان کے اعتبار سے فوقیت حاصل رہے گی۔ اس لئے کہ حقیقی سربلندی تو یہی ہے۔ مادی اور دنیوی فوقیت اس کے سامنے کوئی بھی حقیقت نہیں رکھتی۔ پھر جب قیامت آئے گی تو ہر بات کا آخری فیصلہ ہو ہی جائے گا۔

(رکوع) فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِي الدُّنْيَا وَ
الْاٰخِرَةِ ؗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝
ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ مَثَلَ
عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ
كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝

(پارہ ۳ رکوع ۱۴ کی درمیانی ۵ آیات۔ سورۂ آل عمران)

پس جو لوگ کافر ہو گئے ان پر میں دنیا اور آخرت (دونوں) میں سخت عذاب کرونگا اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل بھی کیے تو اللہ انھیں اُن کے پورے پورے اجر عطا کرے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہ جسے ہم تم کو پڑھکر سُناتے ہیں نشانیوں میں سے ہے اور پرحکمت ذکر میں سے ہے۔ بیشک عیسٰی کا حال اللہ کے نزدیک آدم کے حال کی طرح ہے۔ اللہ نے انھیں مٹی سے بنایا پھر اُن کو حکم دیا کہ ہوجا پس وہ (فوراً) ہوگئے۔ یہ امر حق تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہوجانا۔

تشریح و تفسیر: "یُوَفِّیْھِمْ" میں "یُوَفِّیْ" کا مصدر "تَوْفِیَہ" ہے جس طرح "تَوَفِّیْ" کے معنی پورا پورا لے لینے کے ہیں اسی طرح "تَوْفِیَہ" کے معنی پورا پورا دیدینے کے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ جو ایماندار لوگ نیک عمل کرتے ہیں انھیں بغیر کسی کمی کے پورا پورا اجر و ثواب عطا ہوگا اور اُن کے حق میں ذرہ برابر بھی کمی نہ ہوگی۔ "نَتْلُوْہُ" میں "نَتْلُوْا" جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر "تِلَاوَۃٌ" ہے اس کے معنی ہیں کسی کتاب کا پڑھنا اُس کے معانی کو سمجھنے کے لئے اور اُن پر غور و فکر کرنے کے لئے خاص طور پر اس لفظ کو صرف آسمانی کتابوں کے پڑھنے کے لئے بولتے ہیں جنہیں اس لئے پڑھا جائے کہ اُن کے مطالب اور معانی پر غور کیا جا سکے اور اُن کے احکام پر عمل مقصود ہو۔ آسمانی کتب کے علاوہ دوسری کتابوں یا کسی قسم کی بھی کتابت اور تحریر کو پڑھنے کے لئے یہ لفظ اصطلاحی طور پر نہیں بولا جاتا۔ البتہ جس وقت "تلاوۃ" کا لفظ اللہ کی ذات کے لئے بولا جاتا ہے جیسا

کہ تلاوت کردہ آیت میں ہے تو اس سے مراد کلام کا نازل کرنا ہوتا ہے۔ "الآیات" سے یہاں مراد سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سچائی اور آپ کی نبوّت کے برحق ہونے کی دلیلیں اور نشانیاں ہیں۔ "الذّکرُ الحکیم" سے مُراد قرآنِ حکیم ہے اور بعض نے لوحِ محفوظ کو مراد لیا ہے۔ قرآن کے ساتھ لفظ حکیم کہنے سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں ایک یہ کہ وہ پُر از حکمت و دانائی ہے دوسرے یہ کہ وہ مستحکم ہے یعنی اُس میں جو کچھ بھی فرمایا گیا ہے وہ بالکل درست اور شک و شبہہ سے بالاتر ہے کہ "اِمْتِرَاءٌ" "مِرْیَۃٌ" سے بنا ہے جس سے مراد شک کرنا ہے۔ اسی سے یہاں "المُمْتَرِیْن" بنایا گیا ہے۔ معنی ہیں شک کرنے والے۔ گذشتہ آیات میں یہودیوں کی مکاریوں اور ظالمانہ حرکتوں کا تذکرہ تھا جو وہ حضرت عیسیٰؑ بن مریمؑ کی شان میں کرتے رہے اور پھر فرمایا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے اُن کے ہر مکر کو توڑ دیا اور اُن کی وہ تمام سازشیں حرفِ غلط کی طرح مٹ گئیں جو وہ پیغمبر کے خلاف کرتے رہے تھے اور بالآخر اللہ نے حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر زندہ اُٹھا لیا اور اب وہ صرف قیامت سے قبل ہی زمین پر واپس آئیں گے۔ قرآن مجید نے حیاتِ مسیحؑ کا صاف طور پر اعلان کیا ہے جس میں کسی طرح کا کوئی بھی اجمال نہیں پایا جاتا۔ بہت سے قدیم مسیحی فرقے بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے جن میں (Basilidians) فرقہ بھی شامل ہے۔ مشہور یورپین مصنف (De Bunsen) نے اپنی کتاب Islam or True Christianity میں ان تمام مسیحی فرقوں کے نام تحریر کئے ہیں لیکن بعد میں پولوسی مسیحیت نے اس اصلی واقعہ کے خلاف وفاتِ مسیحؑ یعنی اُن کے کفارہ ہو کر وفات پا جانے کے غلط عقیدہ کو شہرتِ عام دے دی۔ قرآن مجید کا اعلان اس سلسلہ میں بالکل صاف ہے۔ یہاں تلاوت کردہ آیات میں بھی اور "سورۂ نساء" میں مزید وضاحت کے ساتھ ان الفاظ میں: وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ" یعنی نہ وہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کو ہلاک کر سکے اور نہ سولی ہی پر چڑھا پائے بلکہ وہ شبہہ میں ڈال دئے گئے تھے اور پھر آگے چل کر فرمایا گیا ہے: "وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ" اور یقینی بات تو یہ ہے کہ ان لوگوں نے عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے انھیں اپنی طرف اُٹھا لیا۔ غرض حضرت عیسیٰؑ ابن مریمؑ کا حال بیان فرما کر ارشاد ہوا ہے کہ جن لوگوں نے نبوت عیسیٰؑ کا انکار کیا اور حق کو جھٹلایا، یعنی یہود، ہم اُن پر دُنیا اور آخرت دونوں میں شدید

عذاب کریں گے اور کوئی بھی انھیں ہمارے عذاب سے نہ بچا سکے گا اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ جو لوگ سچے دل سے ایمان اختیار کریں گے اور ہمارے حکم پر چلیں گے اور اچھے عمل کریں گے انھیں اُن کی پوری پوری جزا عطا کی جائے گی اور ذرہ برابر بھی اُن کے ثواب میں کمی نہ ہوگی لیکن بہرحال اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا" ظالمین" کے لفظ کی وسعت میں یہودی بھی شامل ہیں جو نہ صرف نبوتِ حضرت عیسیٰؑ کے منکر ہیں بلکہ اُن کی شانِ اقدس میں انتہائی سخت گستاخیاں بھی کرتے رہے ہیں اور وہ تمام مسیحی بھی شامل ہیں جو انھیں بشریت کے درجہ سے اُٹھا کر الوہیت تک لے گئے ہیں اور نبوت کے بجائے اُن کی خدائی کے یا اُن کے ابن اللہ ہونے کے قائل ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ "ظلم" حدِ اعتدال سے ہٹنے کا نام ہے چاہے وہ افراط اور حد سے بڑھانے کی شکل میں ہو یا تفریط اور حد سے گھٹانے کی صورت میں۔ اس بنا پر جن لوگوں نے بھی حضرت عیسیٰؑ کو اُن کے مقام سے گھٹایا یا بڑھایا سب ہی" ظالمین" کے مفہوم میں داخل ہوں گے اور اُن سے اللہ کی نفرت ثابت ہوگی۔ پھر آخر میں فرمایا گیا ہے کہ عیسیٰؑ کی مثال اللہ کے نزدیک آدمؑ جیسی ہے جنہیں اُس نے مٹی سے پیدا کیا تھا۔ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ فقط یہ دیکھ کر کہ حضرت عیسیٰؑ بغیر باپ کے پیدا ہو گئے اُنھیں خدا کا بیٹا کہنے لگے انھیں حضرت آدمؑ کو بھی دیکھنا چاہیئے جن کو خدا نے بغیر ماں باپ کے خلق فرمایا تھا مگر انھیں خدا یا خدا کا بیٹا کوئی نہیں کہتا حالانکہ اُن کی پیدائش حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے زیادہ تعجب خیز تھی اسی طرح عیسیٰؑ بھی نہ خدا ہیں اور نہ خدا کے بیٹے ہو سکتے ہیں بلکہ اُس کی مخلوق ہیں اور اُس کے پیغمبر ہیں اور صرف ایک بشر ہیں۔ جس طرح خود حضرت آدمؑ بشر تھے اور اللہ کی ایک مخلوق اور اُس کے پیغمبر تھے کیونکہ مخلوق ہونے کا دار و مدار کسی خاص طریقۂ خلقت پر نہیں ہوتا بلکہ صرف پیدائش پر اور عدم سے وجود میں آنے پر ہے خواہ وہ کسی طریقہ سے ہو اور کسی صورت پر ہو۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَآءَنَا وَأَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ○ إِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ وَإِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِالْمُفْسِدِيْنَ ○ قُلْ يٰٓأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۴ کی آخری ۳ اور رکوع ۱۵ کی ابتدائی ایک آیت سورہ آل عمران)

پھر جو کوئی تم سے اس بات میں حجت کرے، اس کے بعد کہ تمہارے پاس (اس کا) علم پہنچ چکا ہے تو تم اُن سے کہدو کہ اچھا آؤ ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں اور تمہارے بیٹوں کو بھی اور اپنی عورتوں کو اور تمہاری عورتوں کو بھی اور اپنے نفسوں کو اور تمہارے نفسوں کو بھی۔ پھر ہم (درگاہ خداوندی میں عاجزی) کے ساتھ التجا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت بھیجیں بیشک یہی ہے سچا واقعہ اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔ اور بیشک اللہ ہی زبردست ہے حکمت والا ہے۔ پھر اگر یہ لوگ اب بھی قبول نہ کریں تو یقیناً اللہ فسادیوں کو خوب جاننے والا ہے۔ تم کہدو کہ اے اہل کتاب آجاؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہم میں تم میں برابر ہے وہ یہ کہ ہم سب سوائے اللہ کے کسی اور کی عبادت نہ کریں اور کسی کو بھی اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی شخص کسی کو بھی اللہ کے علاوہ پروردگار نہ قرار دے۔ پھر اگر وہ لوگ روگردانی کریں تو (اے مسلمانو) تم لوگ کہدو کہ گواہ رہنا ہم تو تابع فرمان ہیں۔

تشریح و تفسیر: "حَآجَّكَ" میں "حَآجَّ" فعل ماضی کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر "مُحَاجَّةٌ" ہے جس کے معنی ہیں باہم تکرار و حجت کرنا اور جھگڑنا۔ "نبتھل" کا مصدر "ابتھال" ہے مشہور معنی ہیں عاجزی اور خضوع و خشوع کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا کرنا مگر یہاں "ابتھال" "مُباھلہ" کے معنی میں آیا ہے جو "بُھْلٌ" سے بنا ہے اور اس کے معنی ہیں بددعا کرنا اور لعنت کرنا اس طرح "مباھلہ" کے معنی ہوں گے آپس میں ایک کا دوسرے کے

بد دعا کرنا کہ اگر وہ جھوٹا ہے تو اس پر اللہ کی لعنت ہو اور وہ تباہ و برباد ہو جائے ابتھال سے یہی معنی یہاں مُراد ہیں۔ "قَصَصَ" کا لفظ جمع نہیں ہے بلکہ واحد ہے۔ معنی ہیں واقعات اور خبروں پر مشتمل ایسا بیان اور ایسی حکایت جسکا ایک حصّہ دوسرے حصّوں سے مربوط اور مسلسل ہو مگر جب "قَصَصُ" کے بجائے "قِصَصُ" بولتے ہیں "ق" پر زیر کے ساتھ تو "قِصّہ" کی جمع مُراد ہوتی ہے یعنی بہت سے قِصّے اور متعدد واقعات۔

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السلام کے متعلق پوری وضاحت کے ساتھ صحیح واقعات بیان فرما کر اب حضور سرورِ کائنات کی طرف خطاب کر کے ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر اس واضح بیان کے بعد بھی کوئی شخص تم سے حجّت کرے اور اپنی ضد پر قائم رہے اور جھوٹے اعتقادات پر جما رہے تو ایسے تمام لوگوں کو تم مباہلہ کی دعوت دے دو اور اپنے مخالفوں سے کہو کہ ہم تم سب مل کر اپنے بیٹوں، اپنی عورتوں اور اپنے نفسوں کے ساتھ مباہلہ کے لئے نکلیں اور درگاہِ خداوندی میں عاجزی کے ساتھ التجا کریں کہ ہم دونوں فریقوں میں جو جھوٹا ہو اُس پر اللہ اپنی لعنت نازل فرمائے۔ آیۂ مباہلہ اور اُس سے متعلق دوسری آیتوں کے نزول کا سبب نصاریٰ کا وہ وفد تھا جو نجران کے عیسائیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کے متعلق سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بحث و گفتگو کرنے کے لئے ۹ھ ہجری میں مدینہ آیا تھا۔ نجران، یمن کا ایک مشہور شہر ہے جو اُس زمانہ میں عیسائیت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ عیسائی وفد میں ساٹھ آدمی تھے جن میں سے چودہ ۱۴ اشخاص اُن کے سردار تھے اور اُن میں سے تین نمائندے پورے وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ عبدالمسیح عاقب امیرِ وفد تھا، اَیْہَمْ مشیرِ وفد تھا اور ابو حارثہ بن علقمہ اُن کے سب سے بڑے مذہبی رہنما اور عظیم ترین دینی قائد کی حیثیت میں تھا۔ علامہ فخر الدین رازی اور علامہ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ جس وقت یہ وفد مدینہ کے ارادہ سے روانہ ہونے لگا تو جس خچر پر ابو حارثہ بن علقمہ سوار تھا اُس نے ٹھوکر کھائی۔ یہ دیکھ کر اُس کے بھائی کُرز بن علقمہ کی زبان سے نکلا "تَعِسَ الْاَبْعَدُ" دور والا شخص ہلاک ہو جائے۔ اس سے اُس کی مُراد معاذ اللہ سرورِ دو عالم کی ذاتِ اقدس تھی۔ یہ سُنتے ہی ابو حارثہ نے کہا "تَعِسَتْ اُمُّکَ" تیری ماں ہلاک ہو جائے۔ کُرز اپنے بھائی کا یہ کلام سُنکر حیران رہ گئے۔ پھر اُن کے پوچھنے پر کہ ابو حارثہ نے ایسا کیوں کہا اُس نے جواب دیا:۔
خدا کی قسم میں خوب جانتا ہوں کہ محمدؐ وہی رسول ہیں جن کی بشارت توراۃ و انجیل اور دوسری آسمانی کتابوں میں موجود ہے۔ اس لئے کُرز! تم اُن کی شان میں ایسی گستاخی نہ کرو۔ کُرز

بولے کہ پھر تم اُن کی نبوت کا اعلان کیوں نہیں کر دیتے۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر میں اس کا اعلان کر دوں گا تو عیسائی سلطنتوں کی طرف سے جو بے شمار دولت مجھے مل رہی ہے اور عیسائی دُنیا میں جو میرا بے انتہا اعزاز و اکرام ہے وہ سب ایک لمحہ میں ختم ہو کر رہ جائے گا۔ یہی وہ بات تھی جو کرزؔ کے دِل میں چبھتی رہی اور بالآخر وہ کچھ عرصہ کے بعد اسلام سے مشرف ہو کر صحابہؓ کرام کی صف میں داخل ہو گئے۔ آیۂ مباہلہ کی شان نزول کے سلسلہ میں محدثینؒ مفسرین اسلام نے بالاتفاق لکھا ہے کہ جب نجران کے لوگ سب کچھ سمجھانے کے بعد بھی اپنی گمراہی پر اڑے رہے تو حضورؐ نے بحکم خدا انھیں مباہلہ کی دعوت دی جس پر ارکان وفد نے ایک روز کی مہلت طلب کی دوسرے روز جب وہ لوگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا کہ سرورؐ کائنات گود میں اپنے چھوٹے نواسہ حضرت امام حسینؑ کو لئے ہوئے ہیں دوسرے نواسہ حضرت امام حسنؑ کی انگلی پکڑے ہوئے ہیں۔ بنت رسولؐ حضرت فاطمہؑ زہرا آپ کے پیچھے ہیں اور اُن کے پیچھے شیر خدا امیرالمؤمنین حضرت علیؑ ہیں۔ اس شان سے حضورؐ باہر تشریف لاتے ہیں اور اپنے اہلبیتؑ اطہار سے فرما رہے ہیں کہ جب میں جھوٹوں پر بد دعا کروں تو تم سب ملکر آمین کہنا۔ یہ نورانی منظر دیکھکر اُن کے سب سے بڑے مذہبی رہنما نے اہل وفد سے کہا کہ میں اس وقت ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جو اگر دعا کر دیں تو پہاڑ بھی اپنی جگہ ٹھہر نہ سکیں اور سرک جائیں تم کیا چیز ہو، ان سے مباہلہ کر کے ہلاکت میں مبتلا نہ ہو ورنہ روئے زمین پر ایک نصرانی بھی باقی نہ رہے گا۔ آخر اُن لوگوں نے مقابلہ کا ارادہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کر لیا اور یمن واپس چلے گئے اس پر حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ اگر وہ مجھ سے مباہلہ کرتے اور میں بد دعا کر دیتا تو مدینہ کا پورا وادی آگ بنکر اُن پر برس پڑتا اور ایک ہی سال کے اندر کل نصاریٰ کرۂ زمین سے ختم ہو جاتے اور نجران کا بھی نام و نشان باقی نہ رہتا۔

(درس ۷۱)

يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْۤ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○ هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ○ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ○ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۵ کی درمیانی ۴ آیات - سورۂ آلِ عمران)

اے اہلِ کتاب تم ابراہیم کے بارہ میں کیوں جھگڑ رہے ہو حالانکہ توراۃ اور انجیل تو ان کے بعد ہی نازل ہوئی ہیں تو تم کیوں عقل سے کام نہیں لیتے۔ ہاں تم لوگ وہی تو ہو جو اُسی امر میں جھگڑ چکے ہو جس کا تمہیں کچھ تو علم تھا تو اب ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔ اور اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ باطل سے بے تعلق سچے مسلمان تھے اور مشرکوں سے بھی نہ تھے۔ بیشک سب لوگوں سے زیادہ نزدیک تر ابراہیم سے وہی لوگ ہیں جنھوں نے اُن کی پیروی کی اور یہ نبی ہیں اور وہ لوگ ہیں جو اِن پر ایمان لائے ہیں اور اللہ ایمان لانے والوں کا حامی ہے۔

تشریح و تفسیر: "توراۃ و انجیل" کے لفظوں کو بعض علماء نے عربی زبان کے لفظ قرار دے کر انھیں "وَرْیٌ" اور "نَجْلٌ" سے مشتق قرار دیا ہے اور اسی مناسبت سے "توراۃ" کے معنی نور اور روشنی کے اور "انجیل" کے معنی دانائی اور علوم کی اصل کے بتائے ہیں۔ کچھ لوگ انھیں عبرانی یا سُریانی لفظ کہتے ہیں۔ یونانی زبان میں "انجیل" کے معنی بشارت کے ہیں۔ یہ دونوں مشہور آسمانی کتابیں ہیں۔ "توراۃ" حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی اور "انجیل" حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر۔ مگر اب ان اصلی آسمانی کتابوں کا وجود باقی نہیں رہا ہے۔ قرآنِ حکیم نے جا بجا ان ہی اصلی آسمانی کتابوں کا ذکر کیا ہے اور ان ہی کی تصدیق بھی کی ہے۔ آجکل کی زبان میں "توراۃ" ([illegible]) متعدد صحیفوں کے مجموعہ کا نام ہے جن کی تنزیلِ لفظی یا مُنَزَّل مِنَ اللہ ہونے کا کسی کو بھی دعویٰ

نہیں۔ اسی طرح "انجیل" (Gospel) نام ہے حضرت مسیح علیہ السلام کی سیرت اور تعلیمات وغیرہ کے مجموعہ کا جسے الگ الگ اُن کے چار حواریوں اور شاگردوں: مَتّیٰ، یُوحنّا، لُوقا اور مُرقس نے اپنے اپنے انداز اور طریقہ پر جمع کیا ہے لیکن ان میں سے بھی کسی مجموعہ کے آسمانی اور مُنزّل من اللہ ہونے کا کسی کو دعویٰ نہیں ہے اس کے ساتھ ہی موجودہ بول چال میں "عہد عتیق" (Old Testament) صحیفوں اور رسالوں کے اُس مجموعہ کے لئے بولا جاتا ہے جس کا تعلّق حضرت مسیحؑ کی پیدائش کے قبل کی تعلیمات اور تاریخی حالات وغیرہ سے ہے جس میں موجودہ محرّف توراۃ کے اسفار بھی شامل ہیں اور "عہد جدید" (New Testament) اُس پورے مجموعہ کو کہا جاتا ہے جس کا تعلق حضرت مسیحؑ اور اُن کے نائبوں اور شاگردوں کی زندگی اور تعلیمات وغیرہ سے ہے جس میں موجودہ انجیل کے نسخے بھی داخل ہیں پھر ان دونوں یعنی "عہد عتیق" اور "عہد جدید" کے مجموعہ کو "الکتاب المقدس" کا نام دے دیا گیا ہے "حنیف" اُس شخص کے لئے بولتے ہیں جو باطل سے کنارہ کش ہو اور دین حق پر استقامت کے ساتھ جما رہے۔ "وَلِیُّ" سے اس جگہ حامی و ناصر اور مددگار مراد ہے۔

گذشتہ آیات میں اس کی طرف اشارہ تھا کہ توحید کا اقرار اہلِ کتاب اور مسلمانوں سب میں مشترک تھا مگر اہلِ کتاب نے اس مسلک اور اس اقرار سے بغاوت کی اور شرک و کفر کی طرف مائل ہوگئے البتہ مسلمان اُس مسلک پر جمے ہوئے ہیں۔ اب ان آیتوں میں بتایا گیا ہے کہ ایک دوسری بات بھی مسلمانوں اور اہلِ کتاب میں مشترک طریقہ پر پائی جاتی ہے اور وہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت اور اُن کی تعظیم و تکریم چنانچہ یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک قوم اُن کی عزّت کرتی ہے اور اس کی دعویدار ہے کہ حضرت خلیلؑ اسی قوم سے تھے اور اُسی کے دین پر تھے۔ اس جگہ پر اس بے اصل و بے معنی بات کا جواب دیا گیا ہے یہ کہکر کہ توراۃ اور انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بہت بعد ہوا تھا اس لئے یہ بالکل صاف سی بات ہے کہ وہ کسی طرح بھی نہ نصرانی ہو سکتے ہیں اور نہ یہودی کیونکہ یہ ساری اصطلاحیں اُن کے بعد کی ہیں۔ اُن کے زمانہ میں نہ توراۃ تھی اور نہ انجیل اور نہ کوئی یہودی مذہب تھا اور نہ کسی نصرانی مسلک کا وجود تھا۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جب تمہاری حالت یہ ہے کہ تم توراۃ و انجیل ہی کو نہ سمجھ سکے اور ان ہی کے مسائل کا صحیح فیصلہ نہ کر سکے حالانکہ ان

باتوں کے متعلق تم کو کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل تھی تو ایسی حالت میں تم کو اس کا کیا حق ہے کہ تم دین ابراہیمؑ کے متعلق بے معنی اور لاحاصل بحثیں کرو جس کا تمہیں مطلق علم نہیں ہے۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا ہے کہ یہاں "ھٰانتم" کے لفظ کا اشارہ اُن یہودیوں اور نجران کے مسیحیوں کی طرف ہے جو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں آپس میں جھگڑ رہے تھے اور ہر ایک فریق اس کا دعویدار تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اُسی فریق سے تعلق رکھتے تھے۔ غرض فرمایا گیا ہے کہ جب اہل کتاب کو خود اپنی کتابوں کا پورا علم نہیں ہے اور وہ بات بات میں آپس میں جھگڑتے رہتے ہیں کبھی حضرت مسیحؑ کے واقعات پر، کبھی آخری رسولؐ کی تشریف آوری کی بشارتوں پر اور کبھی دوسری باتوں پر حالانکہ ان کتابوں سے اُنھیں کچھ تھوڑی سی مس ہے تو ایسی بات جس کو وہ بالکل ہی نہیں جانتے اور اُس سے کوئی مس نہیں رکھتے یعنی مسلکِ ابراہیمیؑ اُس کے متعلق اُن کی بحث بالکل بے معنی اور فضول ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ اصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ خالص اور سچے مُسلمان تھے، خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور دینِ حق اور حقیقی اسلام پر مضبوطی اور استقامت کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ یہاں جس یہودیت اور نصرانیت کی نفی کی جارہی ہے وہ لوگوں کی رواج دی ہوئی اور بنائی ہوئی یہودیت و نصرانیت ہے ورنہ جو مسلکِ توحید حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا تھا وہ حضرت ابراہیمؑ کا تھا اور جس طرح حضرت خلیل سچے اور خالص مسلمان تھے اسی طرح حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ بھی سچے موحد، خالص مسلمان اور اللہ کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔

اور جو دین ابراہیمؑ تھا وہی دین عیسیٰؑ و موسیٰؑ تھا اور وہی تمام انبیاؑ و مرسلینؑ کا دین تھا یعنی مسلکِ توحید اور دینِ اسلام اور اسی دینِ خداوندی کی تبلیغ کے لئے اللہ نے ہر نبی اور ہر رسول کو دنیا میں بھیجا۔ اسی دین کی تبلیغ کے لئے ابراہیمؑ و موسیٰؑ اور عیسیٰؑ بھی آئے تھے اور اسی کی تبلیغ کے لئے سب کے آخر میں سرورؐ کائنات تشریف لائے۔ اس دین الٰہی کو موجودہ یہودیت اور نصرانیت سے دور کا بھی کوئی ربط اور تعلق نہیں ہوسکتا۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جب یہ حقیقت صاف ہوگئی تو اب حضرت ابراہیمؑ سے باعتبارِ دین اور بلحاظ عقائد صرف وہی لوگ قریب تر ہوسکتے ہیں جنھوں نے آپ کے زمانہ میں صحیح معنی میں آپ کی پیروی کی تھی اور خود سرورؐ کائنات اُن سے قریب تر ہوسکتے ہیں جو وہی پیغام توحید لیکر آئے تھے جو حضرت ابراہیمؑ

لائے تھے اور وہ اُمّت مسلمہ اُن سے قریب تر ہو سکتی ہے جو حضورؐ کے بتائے ہوئے مسلکِ توحید پر گامزن ہے اور اس طرح اب موجودہ یہودیت اور مسیحیت نہیں بلکہ اسلام محمدیؐ ہی دینِ ابراہیمیؑ کا صحیح جانشین ہے اور خود سرورِ کائنات کی ذاتِ اقدس اور حضورؐ کا اتباع کرنے والی اُمّت مسلمہ ہی اس مسلکِ ابراہیمیؑ کی وارث ہے۔

(درس ۲۷) وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ○ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ○ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ○

(پارہ ۳ رکوع ۱۵ کی آخری ۳ آیات (سورۂ آل عمران)

اہلِ کتاب میں سے ایک گروہ کو تو یہی پسند ہے کہ تمہیں گمراہ کر کے رہے اور اصل یہ ہے کہ وہ اپنے سوا اور کسی کو بھی گمراہ نہیں کرتے اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے۔ اے اہلِ کتاب تم اللہ کی آیتوں سے کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو۔ اے اہلِ کتاب تم حق کو باطل کے ساتھ کیوں مخلوط کرتے ہو اور حق بات کو چھپاتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو۔

تشریح وتفسیر: " وَدَّتْ " ماضی مونث واحد کا صیغہ ہے اس کا مصدر "وُدٌّ" ہے جس میں " واو " کو زیر زبر اور پیش تینوں حرکتوں کے ساتھ پڑھا جاسکتا ہے۔ " وُدٌّ " کے معنی ہیں کسی چیز سے الفت و محبت اور اُس کے ہوجانے کی تمنا کرنا اور جب یہ اسم ہو تو اسکے معنی خود محبت و الفت ہی کے ہو جاتے ہیں۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ " وُدٌّ " کے معنی صرف محبت ہی کے ہوتے ہیں اور اُس کی تمنا یا آرزو کرنے کا پہلو اس میں شامل نہیں ہوتا یہاں پر تمنا اور آرزو کا پہلو " وَدَّتْ " کے مفہوم میں شامل ہے۔ " طائفۃٌ " کسی چیز کے ایک حصہ اور ٹکڑے کو بھی کہتے ہیں اور لوگوں کے گروہ اور جماعت کے لئے بھی بولتے ہیں خاص طور پر ایسی جماعت جس میں کوئی خاص مسلک یا ذہنی اور فکری رجحان مشترک طریقہ پر پایا جاتا ہو جس کی وجہ سے اُس جماعت کو دوسرے گروہ سے امتیاز حاصل ہو سکے۔ اس کے ساتھ ہی کبھی " طائفہ " کا لفظ ایک فرد کے لئے بھی بول دیتے ہیں۔ اس کا اصلی مادہ " طوف " ہے جس کے معنی گھومنے اور گردش کرنے کے ہیں۔ " تَلْبِسُوْنَ " کا مصدر " لَبْسٌ "

نہیں بلکہ لَبسٌ ہے یعنی لام پر زبر کیساتھ - معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز کے ساتھ خلط کردینا اور اُسے مخفی کردینا جبکہ " لُبسٌ " کے معنی کسی چیز کو پہن لینے کے ہیں - یہاں مقصود یہ ہے کہ وہ لوگ حق کو باطل کے ساتھ مخلوط کرکے اُسے چھپانے کی کوشش کرتے ہیں - " طائفۃٌ من اھلِ الکتاب " سے یہود مراد ہیں. مقصود یہ ہے کہ اہل کتاب یعنی یہود کی جرأت اسقدر بڑھ چکی تھی اور وہ خدا کی آیتوں، اُس کی کتابوں اور اُس کے پیغمبروں کی تکذیب کے اتنے عادی ہوگئے تھے اور انھیں اپنی دولت و ثروت، دینوی جاہ و اقتدار اور بداعمالیوں پر کچھ اتنا غرہ تھا کہ اسلام اختیار کرنا کیسا وہ خود مسلمانوں ہی کو گمراہ کرنے اور دینِ حق سے برگشتہ کرنے کی فکر میں سرگرداں رہا کرتے تھے اور اس کے لئے کوئی ترکیب اور کوئی حربہ ایسا نہ تھا جسے وہ اختیار نہ کرتے ہوں تاکہ مسلمانوں کی صفوں میں ابتری اور انتشار پھیلے، اُن کے دِلوں میں دین کی طرف سے شک و شبہ پیدا ہو اور وہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو تنہا چھوڑ کر الگ ہوجائیں - مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کردیا گیا کہ دشمنوں کی ان کوششوں کے باوجود انھیں اپنے مقصد میں کوئی بھی کامیابی حاصل نہ ہوسکی اور وہ سچے مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ نہ کرسکے بلکہ ان ذلیل کوششوں کے نتیجہ میں خود اپنے ہی نامۂ عمل کو سیاہ کرتے رہے - نہ اسلام کا کچھ بگاڑ سکے اور نہ مسلمانوں ہی کو گمراہ کرسکے - " وَمَا یَشْعُرُوْنَ " اور وہ اس کا شعور نہیں رکھتے کہ اُن کی حرکتوں کا اثر اُلٹ کر خود اُن ہی پر پڑتا ہے اور اُن کی دُنیا اور آخرت دونوں تباہ و برباد ہوجاتی ہیں - اس کے بعد ارشاد ہوا کہ اے اہل کتاب تم اللہ کی آیتوں کو کیوں جھٹلاتے ہو حالانکہ تم اُن کی سچائی سے پوری طرح واقفیت رکھتے ہو یہ اللہ کی آیتیں وہ ہیں جو تمہاری کتابوں کے اندر پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہیں اور جن میں نبوت محمدؐ کی بشارتوں کا ذکر ہے اور آخری رسولؐ کی ساری علامتوں کا کھلے لفظوں میں تذکرہ کیا گیا ہے جو سب کی سب ذات محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر منطبق ہوتی ہیں مگر تم ہو کہ ان تمام آیاتِ خداوندی کا سرے سے انکار ہی کئے جاتے ہو حالانکہ تمہارے قلوب ان باتوں کا پورا علم رکھتے ہیں - یہ سب اس وجہ سے کہ تم میں آیاتِ الٰہیہ کو جھٹلانے کی عادت ہے اور تم احکام خداوندی کے مقابلہ میں سرکشی کے خوگر ہو چکے ہو اور ساتھ ہی تمہیں اس پر حسد بھی ہے کہ تمہاری نسل سے الگ ہٹ کر بنی اسمٰعیلؑ میں سے کیوں نبی بھیجا گیا اور بنی اسرائیل سے کیوں نہیں آیا - تمہیں اتنا بھی شعور نہیں

کہ اللہ کسی نسل اور قبیلہ کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ اپنے بندوں میں سے جسے بھی چاہتا ہے اپنے اس منصب جلیل سے سرافراز کرتا ہے۔

ان آیات میں جنہیں ابھی تحریر کیا گیا اہل کتاب کی چند خاص عادتوں کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔ ایک یہ کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے کی اور انھیں سرورِ کائنات اور دین اسلام کی طرف سے بددل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اس کے بجائے کہ وہ اسلام کی حقانیت سے آگاہی حاصل کرنے کی سعی کریں، حق و دیانت کی تلاش کریں اور اپنی گمراہیوں کو چھوڑ کر صراط مستقیم کو اختیار کرلیں یہ سب کچھ اس لئے کہ وہ اپنی بداعمالیوں اور قومی و نسلی جنون میں مبتلا ہیں جس نے اُن کی آنکھوں پر مستقل طور پر پردے ڈال دئے ہیں اور اُن سے شعور کی صلاحیت کو کلّی طور پر چھین لیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انھیں اچھی طرح علم ہے کہ اُن کی کتابوں میں نبوت محمّدی کی بشارت اور صاف طریقہ پر اُس کا اعلان موجود ہے مگر اس کے باوجود وہ اس کے منکر ہیں محض اپنی ہٹ دھرمی اور عصبیت اور ضد کی بنا پر۔ اور اس طرح وہ گویا دن کے وقت کھلے ہوئے آسمان میں چمکتے ہوئے سورج کا انکار کرتے ہیں۔ تیسری چیز یہ ہے کہ وہ اپنی کتابوں کی صریح عبارتوں کو کچھ اس طرح خلط ملط کرتے ہیں اور بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں جس کے نتیجہ میں حق بات لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہو جائے اور وہ غلط فہمیوں کا شکار ہو جائیں اور اس گمراہ کن مقصد کی تحصیل کے لئے وہ کسی بھی تاویل یا تحریف سے گریز نہیں کرتے اور اس طرح وہ پورے علم ویقین کے ساتھ اور اچھی طرح جان بوجھ کر حق و دیانت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ ان آیات کریمہ میں اُس دور کے یہودیوں کی تاریخ کا ایک مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے کہ اُن کا ظاہر و باطن کبھی ایک نہیں رہا، اُن کے قول و فعل میں ہمیشہ منافرت اور تضاد کا وجود رہا، وہ کبھی مسلمانوں کے اور رسولؐ اسلام کے دوست نہیں رہے انھوں نے اپنے رسولوں کا بھی مذاق اُڑایا، اپنی کتابوں کی بھی تکذیب کی، احکام خداوندی سے روگردانی کرتے رہے، بداعمالیوں اور عیش پرستیوں میں مبتلا رہے جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ آسمانی عذابوں میں گرفتار رہے، تباہیوں کا شکار رہے، خدا کی رحمت اُن سے دور رہی پھر آخرت میں جو کچھ بھی ایسے لوگوں کا حال ہوگا وہ ظاہر ہے۔

(درس ۳)

اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیۡ بِبَکَّۃَ مُبٰرَکًا وَّ هُدًی لِّلۡعٰلَمِیۡنَ ۞ فِیۡهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبۡرٰهِیۡمَ ۚ وَ مَنۡ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ وَ لِلّٰهِ عَلَی النَّاسِ حِجُّ الۡبَیۡتِ مَنِ اسۡتَطَاعَ اِلَیۡهِ سَبِیۡلًا ؕ وَ مَنۡ کَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الۡعٰلَمِیۡنَ ۞ قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ٭ۖ وَ اللّٰهُ شَهِیۡدٌ عَلٰی مَا تَعۡمَلُوۡنَ ۞ قُلۡ یٰۤاَهۡلَ الۡکِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰهِ مَنۡ اٰمَنَ تَبۡغُوۡنَهَا عِوَجًا وَّ اَنۡتُمۡ شُهَدَآءُ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۞

(پارہ ۴ رکوع ۱ کی درمیانی ۴ آیات۔ سورہ آل عمران)

بیشک سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لئے مقرر کیا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے برکت والا اور تمام جہاں کے لئے راہنما۔ اُس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں (جیسے) مقامِ ابراہیم اور جو کوئی اُس میں داخل ہو جاتا ہے اُس کو امن مِل جاتا ہے اور لوگوں کے ذمّہ ہے اللہ کے لئے حج کرنا اُس گھر کا جو شخص وہاں تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو اور جو کوئی کفر کرے تو بیشک اللہ تمام جہاں سے بے نیاز ہے۔ کہدو کہ اے اہل کتاب تم اللہ کی نشانیوں سے کیوں انکار کرتے ہو اور اللہ اُن تمام اعمال کا گواہ ہے جو تم کرتے ہو۔ کہدو کہ (اے) اہل کتاب تم کیوں روکتے ہو اللہ کی راہ سے اُس شخص کو جو ایمان لا چکا ہے اس راہ میں کجی نکال نکال کر۔ حالانکہ تم خود گواہ ہو اور اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ہے۔

تشریح و تفسیر۔ "بَکَّۃَ" اکثر مفسروں کے نزدیک "مکہ" ہی کا دوسرا نام ہے اور بعض کہتے ہیں کہ "مکّہ" سے کل شہر مراد ہے۔ اور "بکّہ" سے مقصود مسجد الحرام ہے۔ "مقامِ ابراھیم" سے مراد عام طور پر وہی پتھر لیا جاتا ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانۂ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ یہ پتھر کعبۂ مکرّمہ سے قریب ہی ایک حجرہ میں اب بھی محفوظ ہے۔ مگر بعض مفسروں نے اس سے پوری سرزمین حرم مراد لی ہے۔ "فِیۡهِ" اور "دَخَلَهٗ" کے لفظوں میں ضمیر واحد "بیت" ہی کی طرف پھرتی ہے اور "بیت" سے بھی خانہ کعبہ ہی مراد ہے البتہ چونکہ سرزمین حرم خود خانۂ کعبہ ہی کی وجہ سے محترم قرار دی گئی ہے اس لئے وہ بھی مفہوم "بیت"

کے اندر شامل ہے۔ "حج" کے لفظی معنی کسی کام کا قصد کرنے کے آتے ہیں۔ مگر شرعی
اصطلاح میں خانۂ کعبہ کی زیارت کے قصد کرنے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جس کے ساتھ
مخصوص عبادتیں اور شرائط و احکام مقرر ہیں۔ حَجّ اور حِجّ دونوں مصدر ہیں اور زبر اور
زیر دونوں طرح اس لفظ کو عرب بولا کرتے ہیں، مگر علامہ راغب اصفہانی اور بعض دیگر علماء
نے کہا ہے کہ "حَجّ" مصدر ہے اور "حِجّ" اسم مصدر ہے۔ "تَبْغُوْنَهَا" کا مصدر
"بَغْیٌ" ہے۔ جس کے ایک معنی ہیں کسی چیز کی طلب میں اعتدال سے تجاوز کر جانا اور یہی
معنی یہاں بھی مراد ہیں۔ "عِوَجٌ" اُس کجی اور ٹیڑھے پن اور بے اعتدالی کو کہتے
ہیں جسے صرف عقل و بصیرت سے محسوس کیا جا سکے۔ "اول بیت" کے جملہ سے مراد لینے میں
بہت سے قول ہیں لیکن امیر المؤمنین حضرت علیؑ کا ارشاد ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ کعبہ کرۂ ارض پر
سب سے پہلا وہ گھر ہے جو عبادتِ خدا کے لئے زمین پر بنا۔

پہلی آیت میں یہود کے اس خیال کو باطل کیا گیا ہے کہ مسجد بیت المقدس کی تعمیر کعبہ سے قدیم تر
ہے اس لئے یہ بتایا گیا ہے کہ زمین پر کعبہ سے قبل کوئی ایسی عمارت نہ تھی جس کو خدا کی عبادت
کے لئے بنایا گیا ہو۔ مسجد بیت المقدس کی تعمیر تو بہت بعد میں ہوئی تھی۔ بلکہ حدیثوں میں یہاں تک
بھی آیا ہے کہ خانۂ کعبہ کے مقام کو زمین کی خلقت سے دو ہزار سال پہلے اللہ نے خلق فرمادیا
تھا۔ "مکہ" کے لفظ کے متعلق بعض لوگوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ کلدانی لفظ ہے جس
کے معنی گھر یا آبادی کے ہیں۔ قدیم شامی زبان میں "بکہ" کے بھی یہی معنی ہیں چنانچہ شام
کے ایک قدیم شہر کا نام "بَعْلَبَکّ" ہے جو "بَعْل" بُت کی طرف منسوب ہے
آبادیوں کے ناموں میں اردو اور فارسی وغیرہ میں اس قسم کی لفظی ترکیبیں بہت زیادہ بولی جاتی ہیں
حضرت داؤدؑ کی زبور میں "مکہ" کا یہ نام یعنی بکہ سب سے پیشتر آیا ہے۔ بیان کردہ
آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ شروع ہی سے خانۂ کعبہ ہر طرح کی برکتوں سے بھرا ہوا ہے اور تمام
جہان کے لئے ہدایت کا سرچشمہ بنایا گیا ہے۔ اس میں خدا کی نشانیاں ہیں۔ جیسے مقام ابراہیم
علیہ السلام یہ جس پتھر کا نام ہے پہلے خانۂ کعبہ کے بالکل متصل تھا مگر بعد میں طواف کرنے
والوں کی دشواریوں کی وجہ سے اسے کچھ ہٹا دیا گیا تاکہ لوگ آسانی سے طواف کر سکیں۔ طواف
کعبہ کے بعد مقام ابراہیمؑ پر دو رکعت نماز ادا کی جاتی ہے۔ خانہ کعبہ ہی کی وجہ سے تمام سرزمین
حرم محل امن قرار دی گئی ہے۔ یہاں نہ صرف انسانوں کے لئے امن ہے بلکہ جانوروں اور گھاس

اور درختوں کے لئے بھی امن ہے۔

خانۂ کعبہ کی فضیلت کا ذکر کر کے پھر حج کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ حج ارکان اسلام میں سے ایک رُکن ہے اور اس کی فرضیت پر اُمّت اسلامیہ کا اجماع ہے۔ یہ ہر بالغ مسلمان مرد اور عورت پر عمر میں ایک مرتبہ فرض کیا گیا ہے بشرطیکہ اُس میں استطاعت موجود ہو۔ یعنی اس کے لئے سفر حج کرنا اور عبادات حج بجالانا ممکن ہوں اور وہ تمام شرطیں اُس میں پائی جاتی ہوں جو استطاعت و قدرت کے لئے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ ایک مرتبہ سے زیادہ حج کرنا مستحب ہے جبکہ نذر وغیرہ کی وجہ سے اُس کی ادائیگی واجب نہ ہوگئی ہو۔

حج کی اہمیت قرآنِ مجید کے اس جملہ سے اچھی طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ جو شخص اس سے کفر کرے یعنی حج کی فرضیت سے انکار کر دے تو اللہ کو کسی کی بھی کوئی پروا نہیں ہے اور وہ سارے جہاں سے غنی اور بے نیاز ہے۔ حج کا حکم بتانے کے بعد اہل کتاب سے خطاب کیا گیا ہے جن سے خاص طور پر یہود مراد ہیں جن کی زندگی کا سب سے بڑا مشن یہ تھا کہ وہ مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہیں اور اُن کے اتحاد و اتفاق کو مٹا کر آپس میں نفاق اور پھوٹ پیدا کریں۔ اُن سے فرمایا گیا ہے کہ تم اللہ کی صاف اور کھلی ہوئی نشانیوں کا جان بوجھ کر کیوں انکار کرتے ہو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اللہ تمہاری ان حرکتوں سے بے خبر ہے۔ ایسا ہرگز نہیں بلکہ وہ تمہارے تمام افعال و اعمال اور تمہاری تمام نیتوں اور ارادوں سے پوری طرح واقف ہے جس کی سزا بھگتنے کے لئے تمہیں تیار رہنا چاہئے۔ اس جگہ ان آیات الٰہیہ سے نبوتِ سرورِ کائنات کے دلائل مراد ہیں اور کفر سے امر کا انکار مقصود ہے۔ آخر میں سرورِ کائنات کو اس کا بھی حکم دیا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب سے دریافت فرمائیں کہ تم تو دولت اسلام سے اپنی بدنصیبی کی وجہ سے محروم ہی ہو پھر دوسروں کے لئے کیوں چاہتے ہو کہ وہ بھی اس سے فیضیاب نہ ہوسکیں یا جو اس سے فیضیاب ہو چکے ہیں وہ پھر محروم ہو جائیں اور اس کی کوشش میں تم اسلام، قرآن اور رسولِ عربی کی ذات اقدس میں طرح طرح کے بے اصل و بے بنیاد عیب نکالتے رہتے ہو اور اس کے باوجود کہ تم خود بھی اپنی ان سازشوں کو سمجھتے ہو اور دینِ محمدؐ کی صداقت سے بھی باخبر ہو پھر بھی ان گمراہیوں سے اور اس ہیر پھیر سے باز نہیں آتے اور اُن تمام پیشین گوئیوں کو بھی توڑ مروڑ کر بیان کرتے ہو جو پچھلی کتابوں میں کھلے ہوئے لفظوں میں موجود ہیں اور سب رسولِ عربی کی ذات پر منطبق ہوتی ہیں۔ یہودیوں

کی ان کوششوں کا تاریخ میں تفصیل سے ذکر موجود ہے پھر جب انھیں کچھ نہ بن پڑتا تھا تو وہ اس کی کوشش کرتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں میں زبردست انتشار اور پھوٹ ڈال دیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایسے موقع پر جب مدینہ کے دو مشہور قبائل اوس و خزرج کے مسلمان جمع تھے تو ایک یہودی نے جس کا نام شاس بن قیس تھا ان دونوں جنگجو قبیلوں کی ایک مشہور لڑائی یعنی "جنگ بُعاث" سے متعلق انتہائی اشتعال انگیز اشعار کسی سے پڑھوا دیئے جس کے نتیجہ میں قریب تھا کہ اوس و خزرج کے مسلمانوں کے درمیان خونریزی ہو جاتی مگر فوراً ہی سرکار دو عالم تشریف لے آئے اور اس عظیم فتنہ کو حضورؐ نے روک دیا۔

درس ۱۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ○ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ○ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ○ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا ۗ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ○

(پارہ ۴ رکوع ۱ کی آخری ۲ اور رکوع ۲ کی ابتدائی ۲ آیات کریمہ، سورہ آل عمران۔)

اے ایمان والو اگر تم اُن لوگوں میں سے کسی فریق کا کہنا مان لوگے جنہیں کتاب دی گئی تھی تو وہ لوگ تمہیں تمہارے ایمان لے آنے کے بعد پھر کافر بنا دینگے۔ اور تم کفر کس طرح کر سکتے ہو حالانکہ تم کو اللہ کی آیتیں پڑھکر سنائی جاتی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسولؐ موجود ہے اور جو شخص اللہ کے دین کو مضبوط تھام لیتا ہے اُسے سیدھے راستہ کی طرف ضرور ہدایت کی جاتی ہے۔

اے ایمان والو اللہ سے ڈرو جو اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور جان نہ دینا سوائے

ایسی حالت کے کہ تم مسلمان ہو اور رشتۂ الٰہی کو تم سب ملکر مضبوط تھامے رہو اور باہم پھوٹ نہ ڈالو اور اپنے اوپر اللہ کا یہ انعام یاد رکھو کہ جب تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اُس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی پس تم اُس کے فضل سے باہم بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارہ پر تھے تو اُسی نے تمہیں اُس سے بچالیا۔ اللہ اسی طرح تمہارے لئے اپنی نشانیاں صاف صاف بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

تشریح و تفسیر :۔ "یَعْتَصِمْ اور اِعْتَصِمُوا" کا مصدر "اعتصام" ہے معنی ہیں مضبوط تھام لینا۔ "عَصْمٌ" اس کا اصلی مادّہ ہے۔ "حَبْلٌ" کے معنی رسی کے ہیں مگر یہاں وہ وسیلہ مراد ہے جس سے احکام خداوندی معلوم ہوسکیں، یعنی دینِ اسلام یا قرآن حکیم۔ "تُقَاۃ" ابن منظور اور جوہری کے نزدیک مصدر ہے۔ اس کا ماضی "اِتَّقیٰ" ہے۔ "تُقَاۃ" اصل میں "وُقیۃ" تھا۔ واو۔ ت۔ سے اور ی۔ الف۔ سے بدل کر "تقاۃ" کہا جانے لگا۔ اصلی مادّہ "وَقْیٌ" ہے۔ "اَلَّفَ بَیْنَھُم" کے معنی ہیں۔ لوگوں کے درمیان اُلفت و محبت پیدا کردی۔ "شَفَا" کے معنی کسی چیز کی حد اور کنارہ کے ہیں۔ اس کا مادّہ "شَفْوٌ" ہے اور جمع "اَشْفَاء" آتی ہے یہ "شِفَاء" سے الگ ہے جس کے معنی مرض سے صحت ہونے کے ہیں۔ "حُفْرَۃ" گڑھے کو کہتے ہیں۔ "نَقْذٌ اور اِنْقَاذ" بچانے اور نجات دینے کو کہتے ہیں۔

ان آیات میں مسلمانوں کو تنبیہہ کی جارہی ہے کہ وہ اہل کتاب کی حرکتوں سے ہوشیار رہیں اور اُنکے فریب میں آکر اُن کی پیروی نہ کرنے لگیں کیونکہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے سخت ترین مخالف اور دشمن ہیں اور اس کی کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح انھیں راہِ حق سے ہٹادیں اور پھر کفر و شرک کی طرف پلٹادیں۔ ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا جارہا ہے کہ اگر مسلمان سچے دل سے راہِ حق پر قدم جمائے رہیں تو اُنھیں کوئی طاقت کفر کی طرف نہیں لیجاسکتی۔ "وَکَیْفَ تَکْفُرُوْنَ" سے خطاب اُن مسلمانوں کی جانب ہے جو عہد سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھے۔ کہ تمہارے لئے ایمان کا راستہ چھوڑ کر کفر کی راہ

اختیار کرنے کی گنجائش ہی کب ہے اور تم ایسی حالت میں کس طرح کفر کی طرف رُخ کر سکتے ہو جبکہ دن رات تمہارے سامنے آیاتِ الٰہی کی تلاوت ہوتی رہتی ہے اور خاتمُ المرسلین سا جلیل ترین پیغمبر تمہارے درمیان موجود ہے جو تمہاری ہدایت اور رہنمائی کے لیئے ہر طرح کافی ہے۔ رسولِ عربی کی موجودگی تمہارے لیے ایک بڑا سہارا ہے جو ہر مشکل میں تمہاری پشت پناہی کرتے ہیں اور تمہارے دلوں سے ہر شک و شبہ کو مٹاتے رہتے ہیں مگر اس کے باوجود اس بات سے بھی تم کو خبردار کیا جاتا ہے کہ تم اہلِ کتاب کی چالوں اور سازشوں سے ہوشیار رہو اور کبھی اُن کی باتوں میں نہ آنا۔ اِس کے بعد " وَمَنْ یَّعْتَصِمْ بِاللّٰہِ " فرما کر اس بات کی پوری طرح وضاحت کردی گئی ہے کہ جو شخص اللہ کے راستہ پر مضبوطی سے قدم جما لیگا اور دل سے دینِ حق کو اختیار کرے گا اُسے کوئی بڑی سے بڑی شیطانی طاقت گمراہی کی طرف نہیں لیجا سکتی۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ مسلمانو تم اپنے دلوں میں اللہ کا خوف پیدا کرو اور اِس طرح ڈرو جو اُس سے ڈرنے کا حق ہے یعنی جس قدر تم میں قدرت و طاقت ہو جس قدر احساس و شعور ہو اس کے مطابق تم اللہ سے ڈرو اور صاحب تقویٰ اور پرہیزگار بنو۔ ظاہر ہے کہ اس پرہیزگاری اور تقویٰ کا حاصل یہی ہے کہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کی جائے اور کسی بات میں کبھی اس کی نافرمانی نہ کی جائے۔ زندگی بھی اسی فرمان برداری میں کٹے اور موت آئے تو اللہ ہی کی فرماں برداری میں آئے۔ " وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا " یعنی حبل اللہ اور رشتۂ الٰہی کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ۔ حبل اللہ کی تفسیر میں بہت سی باتیں کہی گئی ہیں لیکن سب کا حاصل " دینِ اسلام " ہے اسی کے اندر ہر بات آجاتی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اسلام پر پورے استحکام اور مضبوطی سے قائم رہو اسی پر جیو اور اسی پر مرو تو تمہاری انفرادی اور اجتماعی دونوں طرح کی زندگی کامیاب ہوگی۔ دنیا میں بھی فلاح حاصل کروگے اور آخرت میں بھی جہنم کے شعلوں سے محفوظ رہوگے۔ اس سے اس رخ کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں میں آپس کا اتحاد و اتفاق اور اخوت و یگانگت کا واحد ذریعہ اسلام ہی ہے۔ جس قدر ان میں اسلام اور قرآن کریم کی تعلیم پر عمل کرنے کا جذبہ بڑھتا جائے گا، اُن میں باہمی محبت و الفت بھی بڑھتی جائے گی خواہ اُن کی زبان، رنگ، نسل نباس، ملک اور خطوں میں کتنا ہی فرق ہو۔ اس کے برخلاف جس قدر وہ اسلام سے دور ہوتے جائیں گے اُسی قدر وہ ایک دوسرے سے بھی دور ہو جائیں گے۔ اور اُن کے افتراق و انتشار میں اضافہ ہوگا اور سگے بھائیوں کی طرح باہم میل اور محبت سے رہنے کے بجائے ایک دوسرے

کی جان و مال اور آبرو کا سخت ترین دشمن ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں سب کے سب تباہ و برباد اور ذلیل و رسوا ہو کر رہ جائیں گے اور اس زندگی کے بعد یوم حساب میں بھی رحمت الٰہی سے محروم ہو کر نارِ جہنم کا ایندھن بن جائیں گے۔

آخر میں "وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ" فرما کر اس بات کو بتایا گیا ہے کہ اسلام کا رشتہ وہ ہے جس کی برکتوں کو تم نے اپنی آنکھ سے بھی دیکھ لیا ہے جس کے بعد تمہیں اب اس حقیقت میں کوئی شبہہ نہ رہنا چاہیئے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایام جاہلیت میں کس شدت کے ساتھ ایک دوسرے کا دشمن تھا۔ پورے جزیرہ نمائے عرب میں ہر فرد دوسرے فرد سے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے برسرِ پیکار رہا کرتا تھا یہاں تک کہ لوگوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔ بات بات پر تلواریں چلا کرتی تھیں اور اشرف المخلوقات کا محترم خون بے دریغ پانی کی طرح بہتا رہتا تھا اور پوری انسانیت کرب و بے چینی اور دکھ اور بربادی کے گہرے غار میں سسک رہی تھی۔ اِن وحشی قبیلوں کی چھوٹی بڑی لڑائیوں کا کوئی حساب ہی نہیں کیا جاسکتا۔ جہاں تک لڑائیوں کے کچھ واقعات تاریخ کے صفحات میں آسکے ہیں اُن کی تعداد بھی ایک ہزار سات سو تک پہنچی ہے مدینہ کے اوس اور خزرج قبیلوں میں بھی تاریخ کے ایک طولانی عرصہ تک خونریزیاں ہوتی رہیں اور دونوں قبیلوں کے لوگ تباہی کا شکار ہوتے رہے۔ اور سب سے زیادہ ان کی اس آپس کی لڑائی سے یہودی فائدہ اٹھاتے رہتے تھے اوس و خزرج کی لڑائیوں میں سب سے آخری لڑائی "حرب بُعاث" تھی جس میں دونوں قبیلے بری طرح تباہ ہو گئے تھے۔ یہ لڑائی اعلانِ رسالتِ سرورِ کائنات سے کچھ قبل ہوئی تھی پھر اس قدر زبردست خونریزی اور مثالی دشمنی کے بعد یہ اسلام ہی تھا جس نے ان دونوں قبیلوں کو شیر و شکر بنا دیا اور جو لوگ خونخوار درندوں کی طرح ایک دوسرے کی جان لیا کرتے تھے وہ اسلام اور رسول اسلام کی بدولت مخلص بھائیوں کی طرح ایک دوسرے پر جان دینے لگے۔

(درس ۲۷) وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّ تَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ

اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ○ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ○ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

(پ، ۴ ۔ رکوع ۲ کی آخری ۶ آیات کریمہ ۔ سورۂ آل عمران)

اور چاہیئے کہ تم میں ایسی جماعت رہے جو نیکی کی طرف بلایا کرے اور بھلائی کا حکم دیا کرے اور بدی سے روکا کرے اور ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں ۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہوجانا جو ایک دوسرے سے الگ ہوگئے اور باہم اختلاف کرنے لگے اس کے بعد کہ اُن کے پاس روشن دلیلیں آچکی تھیں ۔ ایسے ہی لوگوں کے لیئے بڑا عذاب ہے اس روز جب کچھ چہرے سفید ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے ۔ پھر جن کے چہرے سیاہ ہوں گے (اُن سے کہا جائے گا) کیا تم ہی کافر ہوگئے تھے اپنے ایمان کے بعد تو اب عذاب کو چکھو اپنے کفر کے بدلہ میں ۔ اور جن لوگوں کے چہرے سفید ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے وہ اُسی میں ہمیشہ رہیں گے ۔ یہ اللہ کی آیتیں ہیں ہم اِنھیں تم کو ٹھیک ٹھیک پڑھ کر سناتے ہیں اور اللہ مخلوقات پر ظلم کرنا نہیں چاہتا ۔ اور اللہ ہی کا ہے (وہ سب) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہی کی طرف تمام امور لوٹائے جائیں گے ۔

تشریح و تفسیر: اُمَّۃ سے ہر وہ جماعت اور گروہ مقصود لیا جاتا ہے جس میں کوئی بات مشترک طور پر پائی جاتی ہو خواہ یہ اشتراک عقیدہ اور دین کا ہو، جغرافیائی ہو، نسل اور رنگ کا ہو یا کسی اور قسم کا ہو ۔ اس کے اور بھی معنی آتے ہیں مگر یہاں جماعت ہی مراد ہے ۔ "المعروف" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی اچھائی عقل اور شریعت سے ثابت ہو اس کے مقابلہ میں "مُنْکَر" کا لفظ بولا جاتا ہے جس سے مراد ہر وہ چیز ہوتی ہے جو عقل اور شریعت کے نزدیک بری ہو "مُفْلِح" کامیاب کو کہتے ہیں ۔ یہ "فَلَاح" سے بنایا گیا ہے ۔ جس کے معنی ہیں ہر قسم کی کامیابی کے خواہ وہ دینوی ہو یا اخروی ہو ۔ عربی زبان کے محققین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ لفظ "فلاح" سے زیادہ کوئی دوسرا لفظ اس قدر جامعیت نہیں رکھتا جس سے نیکی اور خیر و کامیابی کا اتنا وسیع مفہوم موجود ہو جتنا اس میں ہے "فَذُوْقُوْا"

کا مصدر "تِلَاوَۃٌ" ہے۔ اس کے معنی غور و فکر اور عمل کرنے کی غرض سے کتاب الٰہی پڑھنے کے ہیں مگر جب اس لفظ کی نسبت اللہ کی طرف ہو جیسا کہ یہاں پر ہے تو اس سے مراد نازل کرنا ہوتا ہے۔ یوں تو انفرادی طور پر بھی ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے اور برائی سے روکے اُس پیمانے اور حد پر جو اُس کی انفرادی شخصیت کے لیے ممکن ہے مگر تلاوت کردہ آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کام کے لیے ہر دور میں ایک خاص جماعت بھی ہونا چاہیئے جس کا کام ہی یہی ہو کہ وہ لوگوں کو نیک باتوں کی تعلیم دے اور برائیوں سے روکنے کی کوشش کرے اور اس طرح وہ برابر احکام خداوندی کی تبلیغ کرتی رہے، یہاں یہ بات بھی بالکل ظاہر ہے کہ اچھائی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ روکنے والے کو ان باتوں کا پورا علم بھی ہو ورنہ ایسا شخص جو اچھائی اور برائی میں تمیز نہ رکھتا ہو اور معروف و منکر کو نہ پہچانتا ہو وہ کسی طرح بھی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔ اس بنا پر یہ ضروری ہوا کہ امت مسلمہ میں ایک ایسی جماعت ہر زمانہ میں ہونا چاہیئے جو احکام شریعت سے پوری طرح باخبر ہو اور معروف و منکر کی حقیقتوں سے آگاہ ہو، قرآن اور حدیث کے مطالب پر کامل اطلاع رکھتی ہو تاکہ وہ دوسروں کو راہ حق کی طرف دعوت دے سکے اور گمراہیوں سے نجات دلا سکے۔ جو خود جاہل ہو وہ دوسروں کا جہل دور نہیں کر سکتا اور جو خود علم و معرفت نہ رکھتا ہو وہ کسی اور کو علم و عرفان کی روشنی کس طرح دے سکتا ہے اور جو خود ہی ہدایت یافتہ نہ ہو اور راہ حق کو نہ پا سکا ہو وہ دوسرے لوگوں کو کیونکر حق کا راستہ دکھا سکتا ہے۔ غرض ہر دور میں کچھ ایسے حق آگاہ اور حق شناس مسلمانوں کی ایک خصوصی جماعت رہنا چاہیئے جو حق و باطل کا علم کامل رکھتی ہو اور زیور تقویٰ سے آراستہ ہو اور اس کا کام ہی یہ ہو کہ وہ ہمیشہ تبلیغ حق کا فرض انجام دیتی رہے کیونکہ دنیا میں حق و صداقت کا قیام اور بقا اسی وقت ممکن ہے جب اسے قائم اور باقی رکھنے والے بھی موجود ہوں اور باقی رہیں۔

جہانتک برائیوں سے روکنے اور اچھائیوں کی طرف دعوت دینے کا تعلق ہے قرآن و حدیث میں بار بار اس کی اہمیت کی طرف امت مسلمہ کو متوجہ کیا گیا ہے۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ جو شخص کسی برائی کو دیکھے اُسے اپنے ہاتھ سے دفع کر دے اور مٹا دے اور اگر اُس کے لیے اس کا امکان نہ ہو تو پھر اُسے

اپنی زبان ہی سے دور کرنے کی کوشش کرے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو دل سے اُس پر نفرت کا
اظہار کرے دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تم اچھائی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے
رہو اور برائی سے روکتے رہو ورنہ تم عذاب خداوندی کے مستحق ہو جاؤ گے اور تم کتنی ہی دعائیں
کرو گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔

پھر ان آیات میں اس کا حکم دیا گیا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے
صاف اور روشن احکام خداوندی کے باوجود دین میں تفرقے ڈالے اور محض اپنی ذاتی مفاد
پرستی کے جذبات کو تسکین دینے کے لیے دینی اور ملّی وحدت کو پارہ پارہ کر کے الگ
الگ ٹولیاں بنالیں اور فرقہ بندیوں کی لعنت میں گرفتار ہو گئے۔ ایسے لوگوں سے یہاں
مراد اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنی وحدتِ
دینی و ملّی کو ہر قیمت پر برقرار رکھیں اور اہل کتاب کی طرح انتشار اور اختلاف کا شکار نہ
بن جائیں ورنہ وہ بھی عذاب الٰہی سے محفوظ نہ رہ سکیں گے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ جب قیامت کا دن آئے گا تو بندگان الٰہی میں سے بعض
کے چہرے پُر نور اور سفید ہوں گے اور کچھ ایسے ہوں گے جن کے چہرے سیاہ ہوں گے
اور یہ سب کچھ اُن اعمال و افعال ہی کا نتیجہ ہو گا جو انھوں نے دنیا کی زندگی میں کیے ہوں گے
پھر جن کے چہرے سیاہ ہوں گے اُن سے کہا جائے گا کہ تم نے اظہار ایمان اور اقرار کر
لینے کے بعد جو کفر کیا تھا اب اُس کی سزا اور عقوبت کا مزہ چکھو اس خطاب کے مخاطب
منافق بھی ہوں گے، مرتد بھی ہوں گے، اہل کتاب بھی ہوں گے جو رسولؐ اکرم کے متعلق
توراۃ و انجیل کی پیشین گوئیوں کا اقرار کر کے منکر ہو گئے اور اس کا مخاطب وہ تمام
منکرین حق اور کفار و مشرکین بھی ہوں گے جو عالم ارواح میں عہد اَلَستُ کے موقع پر
اقرار توحید کر چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جن لوگوں کے چہرے ان کے ایمان اور تقویٰ
کی وجہ سے روشن اور منور ہوں گے انھیں جنت میں جگہ دی جائے گی جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے
اور کبھی اُس سے جدا نہ ہوں گے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے جو حکم دیئے ہیں وہ سب برحق
ہیں اور ان میں ذرا بھی شک و شبہہ کی گنجائش ممکن نہیں ہو سکتی۔ وہ عادل ہے اس کا
کوئی حکم عدل کے خلاف نہیں ہو سکتا اور وہ کسی پر کبھی ظلم نہیں کرتا۔ زمین و آسمان کے اندر
جو کچھ بھی ہے وہ سب کا سب اسی کا ہے اور ہر بات کا آخری فیصلہ اسی کے اختیار میں

ہے۔ اُس کے فیصلہ میں نہ کوئی دخل دے سکتا ہے اور نہ اسے بدل سکتا ہے۔

(درس ۲۶)

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۗ وَلَوْ اٰمَنَ أَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ○ لَنْ يَّضُرُّوكُمْ إِلَّا أَذًى ۖ وَإِنْ يُّقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ ○ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ○ لَيْسُوا سَوَاءً ۗ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُونَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ○

(پارہ ۴ رکوع ۳ کی ابتدائی ۴ آیات کریمہ۔ سورۂ آلِ عمران)

تم لوگ بہترین امت ہو جو لوگوں کی ہدایت کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ تم اچھائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہت بہتر ہوتا۔ ان میں سے بعض تو ایمان والے ہیں مگر ان میں سے اکثر نافرمان ہیں وہ تم کو معمولی اذیت کے سوا ہرگز کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو تمہیں پیٹھ دکھا کر بھاگیں گے پھر ان کی مدد بھی نہ کی جائے گی۔ جہاں کہیں بھی وہ پائے جائیں ان پر ذلت ماری گئی ہے بجز اس کے کہ اللہ کی طرف سے کوئی عہد ہو یا لوگوں کی طرف سے کوئی عہد ہو اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہو گئے اور ان پر محتاجی کی مار پڑی یہ اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے ہیں اور پیغمبروں کو بلاوجہ قتل کرتے رہے ہیں۔ یہ سب اس سبب سے ہوا کہ انھوں نے نافرمانی کی اور حد سے گزرتے رہے یہ لوگ بھی سب یکساں نہیں ہیں۔ ان ہی اہل کتاب میں سے ایک جماعت حق پر قائم رہنے والی بھی ہے۔ یہ لوگ شب کے اوقات میں اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتے ہیں اور وہ سجدے کرتے رہتے ہیں۔

تشریح وتفسیر:۔ "ضَرَر" نقصان، خسارہ، دُکھ اور تکلیف کو کہتے ہیں۔

اس کے مقابلہ میں "اَذًی" بہت ہلکی اور معمولی تکلیف کے لیے بولتے ہیں۔ "یُوَلُّوْکُمُ" میں جو "فعل" بولا گیا ہے اُس کا اصلی مادّہ "وَلْیٌ" ہے اور مصدر "تَوْلِیَۃٌ" ہے۔ اس کے ساتھ جب پشت کا ذکر کرتے ہیں تو پشت پھیر کر بھاگ جانا مراد ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی جبکہ اس کے ساتھ "اَدْبَار" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی ہیں "پشتیں"، تو اس کے یہی معنی ہوں گے کہ وہ پیٹھ پھیر کر فرار کر جائیں گے اور مقابلہ کی تاب نہ لا سکیں گے۔ "ضُرِبَتْ" کا لفظ بہت سے معنوں میں بولا جاتا ہے مگر ایسے موقع پر جہاں اس طرح کہا جائے کہ احتیاج یا ذلّت و رسوائی کسی پر ماری گئی جیسا کہ ان آیات میں ہے تو اس سے مقصود یہ بتانا ہوتا ہے کہ یہ بُرائیاں اُس سے چمٹا دی گئیں اور اُس کے لیئے لازم کر دی گئیں "ثُقِفُوْا" کا مصدر "ثَقْفٌ" ہے جس کے معنی اس مقام پر کسی چیز کو پا لینے کے ہیں "حَبْلٌ" کے اصل معنی وسیلہ اور رسّی کے ہیں اور کبھی یہ عہد و پیمان و قرار کے لیئے بھی بولا جاتا ہے اور یہی یہاں بھی مراد ہے۔ "بَآءُوْ" کا مصدر "بَوْءٌ" ہے جس کے معنی پلٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ یہاں استحقاق مقصود ہے یعنی وہ لوگ غضب الٰہی کے مستحق بن گئے۔ "بَوْءٌ" کا استعمال اس قسم کی لفظی ترکیب میں ہمیشہ ایسے مقام پر کیا جاتا ہے جہاں اچھائی اور خیر کا قصد نہ کیا جائے۔ یہاں اس بات کی طرف بھی توجہ رہنا چاہیئے کہ "بَآءُوْ" جمع کا صیغہ ہے اور اس قسم کی جمع کے صیغوں میں عربی رسم الخط میں عام طور پر "واو" کے بعد ایک "الف" بھی لکھا جاتا ہے مگر چونکہ اس لفظ کی کتابت قرآن میں ہر جگہ اسی طرح بغیر الف کے عہد صحابہ کرام سے منقول چلی آتی ہے اس لیے اسے مستثنیٰ قرار دے کر اسی حالت پر باقی رکھا گیا ہے۔ "مِسْکِیْن" محتاج کو اور "مَسْکَنَۃٌ" احتیاج اور فقیری کو کہتے ہیں۔ "اٰنَآءَ" "ہی" کے ساتھ "اَنًی" اور اِنًی کی جمع ہے جس کے معنی دن یا رات کے ایک جزء یا حصہ کے ہوتے ہیں۔

"کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ" کے جملہ میں "کُنْتُمْ" کا خطاب بہت سے مفسرین کے نزدیک پوری امت اسلامیہ سے ہے اور مقصود یہ ہے کہ جس طرح اس امت کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمام پیغمبروں سے افضل ہیں اسی طرح خود یہ امت بھی خیر الامم ہے یعنی تمام دوسری امتوں سے افضل ہے اس کے خیر الامم ہونے پر کثرت سے حدیثیں موجود ہیں جن میں اس کی پوری وضاحت پائی جاتی ہے۔ لیکن اس کے

ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اس میں وہ صفات بھی پائی جائیں جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے یعنی اس کا اللہ کی ذات پر سچے دل سے ایمان ہو، احکام خدا و رسول پر عمل کرے۔ برائیوں سے محفوظ رہے اور دوسروں کو بھی نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے۔ اگر کسی میں اعتقاد اور عمل خیر کی یہ شرطیں موجود نہ ہوں گی تو وہ خیر الامم کا صحیح مصداق نہ بن سکے گا اور اس کے دائرہ میں شامل ہونے کا اور ان صفتوں اور فضیلتوں کے حصول کا استحقاق پیدا نہ کر سکے گا۔ غرض یہ امت خیر الامم تو ضرور ہے مگر اس کے اندر شامل ہونے کے لیے ایمان، عملِ صالح، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل بھی ضروری ہے۔ احکام خداوندی کی خلاف ورزی، نافرمانی، بدعملی اور فسق و فجور کے ساتھ خیر الامم کا عظیم الشان مفہوم کس طرح جمع ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مفسرین کی ایک اہم جماعت نے اس آیت کا مخاطب پوری امت کو نہیں بلکہ صرف اہلبیت اطہار علیہم السلام کو قرار دیا ہے جن کی تخلیق ہی ان صفات کے ساتھ ہوئی ہے۔ ایمان اور عملِ صالح اُن کی طبیعت میں داخل ہے اور اُن کا کام ہی یہ ہے کہ وہ خود اپنے کامل ایمان و یقین اور عملِ صالح کے باوجود دوسرے انسانوں کی بھی ہدایت کا کام انجام دیں۔ لیکن بہرحال اس بحث کا حاصل یہی ہے کہ حقیقی فضیلت اور بلندی کسی کو بھی بغیر ایمان اور عملِ صالح کے حاصل نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے یہاں خیر الامم کی اصلی تصویر پیش کر دی ہے کہ وہ قیامت تک توحید کی امانت دار رہیگی، الٰہی شریعت کا نفاذ اور اس کا تحفظ کرتی رہے گی۔ اُس کا کام ہی یہ ہوگا کہ وہ دنیا میں نظامِ عدل الٰہی کو ہمیشہ برقرار رکھے۔

اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ اگر اہل کتاب بھی ایمان لے آتے اور راہ حق اختیار کر لیتے تو ان کے لیئے بہت بہتر ہوتا لیکن دلائل و براہین کی پوری روشنی موجود ہوتے ہوئے بھی اُن میں اکثریت ان ہی لوگوں کی ہے جو فاسق و فاجر اور احکام الٰہی کے منکر ہیں مگر ساتھ ہی اُن میں کچھ مومن بھی ہیں جنھوں نے سچے دل سے ایمان اختیار کر لیا ہے اور سرور دو عالم کی نبوت کا دل سے اقرار کر کے صراط مستقیم پر آ گئے ہیں۔ یہاں ان لوگوں سے مراد ثعلبہ بن سلام، عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن سعیہ اور اسید بن سعیہ اور دوسرے یہودی قوم سے تعلق رکھنے والے اشخاص ہیں جو عہد رسالتمآبؐ ہی میں ایمان لے آئے تھے اور سچے دل سے مسلمان ہو گئے تھے۔ اس کے بعد اس کا اعلان ہے کہ یہود اپنی مادی

طاقت اور دولت کی فراوانی اور تنظیم کے باوجود مسلمانوں کا کبھی کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ اور کبھی انھیں مغلوب نہ کر سکیں گے۔ بلکہ خود یہود ہی ہمیشہ ذلیل و خوار رہیں گے اور آخر میں وہ تتہار ہ جائیں گے اور ان کا کوئی ناصر و مددگار باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور اسلام کی ابتدائی تاریخ کا ایک ایک حرف اس اعلان کی سچائی پر گواہ ہے۔ یہودیوں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں عبرتناک شکستیں ہوئیں اور ان کا دنیوی جاہ وجلال سب خاک میں مل کر رہ گیا۔ یہ تباہی اور بربادی اسی بداعمالی، آیاتِ الٰہی سے انکار، انبیاءؑ و مرسلینؑ کی تکذیب اور ان کا قتل، سیاہ کاریاں، فسق وفجور، اور حدود خداوندی کو توڑنے اور ان کی خلاف ورزی کرنے کا نتیجہ تھا جس میں وہ ہمیشہ مبتلا رہا کرتے تھے۔ اسی کے ساتھ اس کی بھی وضاحت کردی گئی ہے کہ یہ حالت اہل کتاب کی اکثریت کی تھی مگر اس کے باوجود اُن میں کچھ ایسے بھی تھے جو خداشناس اور حق پرست تھے اور انھوں نے توراۃ کی پیشین گوئیوں کو پوری طرح سمجھ لیا تھا اور اسی کے نتیجہ میں وہ سرورؐ کائنات پر ایمان لے آئے اور فلاح وبہبود اور نجات آخرت سے فیضیاب ہو گئے۔ قرآن حکیم نے ان ایمانداروں کی تعریف فرمائی ہے اور اس کا اعلان کیا ہے کہ ان کے ماضی کی تاریکی ان کے مستقبل کو روشن اور تابناک ہونے سے نہیں روک سکتی۔ ان کا سچے دل سے ایمان لے آنا اور ان کا عملِ نیک، ان کی نجات کی پوری ضمانت ہے۔ ان تمام باتوں کا خلاصہ یہی ہوا کہ نسل و رنگ اور دنیوی جاہ وجلال اور مادی واقتصادی برتری کیسی ہی ہو لیکن یہ چیز اُخروی نجات کا معیار نہیں ہے اُس کا اصلی معیار تو صرف ایمان، تقویٰ اور عمل صالح ہے۔

اِذۡ تَقُوۡلُ لِلۡمُؤۡمِنِيۡنَ اَلَنۡ يَّكۡفِيَكُمۡ اَنۡ يُّمِدَّكُمۡ رَبُّكُمۡ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُنۡزَلِيۡنَ ؕ بَلٰٓى ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَيَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ ○ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشۡرٰى لَـكُمۡ وَلِتَطۡمَئِنَّ قُلُوۡبُكُمۡ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ الۡعَزِيۡزِ الۡحَكِيۡمِ ○ لِيَقۡطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡۤا اَوۡ يَكۡبِتَهُمۡ فَيَنۡقَلِبُوۡا خَآئِبِيۡنَ ○ لَيۡسَ لَكَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَىۡءٌ اَوۡ يَتُوۡبَ عَلَيۡهِمۡ اَوۡ يُعَذِّبَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ ○ (درس) ۷۷

وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ یَغْفِرُ لِمَنْ یَّشَآءُ وَ یُعَذِّبُ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○

(پارہ ۴ رکوع ۴ کی آخری ۶ آیاتِ کریمہ ۔ سورۂ آل عمران)

جب تم (اے رسول) مومنوں سے کہہ رہے تھے کہ تمہارے لیے کیا یہ بات کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار تین ہزار فرشتے نازل کرکے تمہاری مدد کرے۔ ہاں اگر تم صبر کرتے رہے اور تقویٰ پر قائم رہے اور وہ تم پر اسی دم آپڑیں گے تو تمہارا پروردگار پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریگا جو نشان والے ہوں گے۔ اور یہ تو اللہ نے صرف اس لیے کیا کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں (اور حقیقت تو یہ ہے کہ) مدد تو صرف اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے جو زبردست ہے حکمت والا ہے (اور یہ مدد اس لیے تھی) کہ وہ کفر کرنے والوں کے ایک گروہ کو ہلاک کر دے یا انھیں ذلیل کرے کہ وہ ناکام ہو کر واپس جائیں۔ تمہیں اس بات میں کوئی دخل نہیں (اللہ) خواہ اُن کی توبہ قبول کرے یا ان پر عذاب کرے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔ اور اللہ ہی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے عذاب کرتا ہے اور اللہ بڑا بخشنے والا بڑا رحمت والا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ "مُسَوِّمِیْنَ" کا اصلی مادہ "سَوْم" ہے اور مصدر "تَسْوِیْم" ہے جس کے معنی نشان لگانے کے بھی ہیں اور چوپایوں کو چراگاہ میں چرنے کے لیئے چھوڑ دینے کے بھی ہیں۔ یہاں اکثر مفسروں نے پہلے ہی معنی مراد لیئے ہیں یعنی وہ فرشتے اپنے لیئے یا اپنے گھوڑوں کے لیے امتیازی نشانات قرار دینے والے ہیں "طَرَف" کسی چیز کے انتہائی حصہ یا کنارہ کو کہتے ہیں اور اسی مفہوم کی بنا پر یہاں بھی کفار کا ایک حصہ اور ایک گروہ مراد ہے "کَبْتٌ" کے معنی ہیں کسی کو ذلیل و رسوا کرنا یا ناکام و ذلیل کرکے واپس کر دینا۔

ان آیاتِ کریمہ سے مسلمانوں کی حربی تاریخ کے بعض اہم واقعات کی طرف اشارہ ہے۔ یہ سلسلۂ کلام ایک قریبی پچھلی آیت سے شروع ہوتا ہے جس کی ابتدا میں "وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ" فرمایا گیا ہے۔ یہ تین اہم اور بنیادی واقعات ہیں جو مسلمانوں کی ابتدائی مدنی زندگی سے خصوصی تعلق رکھتے ہیں ایک پہلی بڑی لڑائی یعنی جنگ بدر جس کا ذکر "وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ" فرما کر کیا گیا ہے۔ دوسری

اہم لڑائی یعنی جنگ اُحُد جس کا تذکرہ اس سے قبل کی آیت میں جو "وَاِذْ غَدَوْتَ" سے شروع ہوئی ہے فرمایا گیا ہے اور تیسرا واقعہ "حمراء الاسد" کا ہے جو اسی پارے کے نویں رکوع کی ابتدا میں بیان ہوا ہے اور جس کی طرف "اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰہِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَھُمُ الْقَرْحُ" فرما کر اشارہ کیا گیا ہے۔

جنگ بدر ماہ رمضان ۲ھ میں ہوئی تھی اور جنگ احد شوال ۳ھ میں۔ اور اسی کے بعد "حمراء الاسد" نامی مقام پر جو مدینہ سے تقریباً آٹھ میل پر واقع ہے، احد کے زخمی اور شکست خوردہ مسلمانوں کا لشکر سرورِ کائنات کی ایک ہی آواز پر پھر پہنچ گیا تھا محض یہ خبر سنکر کہ ابوسفیان اُحُد کی لڑائی میں فتح حاصل کر کے اُس کے نشہ میں دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کرنے کی غرض سے واپس آ رہا ہے مگر پھر کوئی لڑائی نہیں ہوئی اور ابوسفیان مسلمانوں کے اس جوشِ جہاد کو محسوس کر کے مکہ کی طرف واپس ہو گیا تھا۔ جنگ اُحُد اور مقام حمراء الاسد میں لشکر اسلام کے اجتماع کے واقعات بعد کے ہیں اور جنگ بدر اس سے پیشتر واقع ہوئی تھی مگر یہاں جنگ اُحُد کا پہلے ذکر ہے اور جنگ بدر کا بعد میں تذکرہ ہوا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک تو قرآن حکیم کا موضوع فن تاریخ نہیں ہے کہ وہ واقعات کو تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کرے بلکہ اُس کا موضوع اصلاح کردار اور تعلیم احکام و اخلاق ہے اور ایسی حالت میں جو واقعات کبھی بیان کیئے جاتے ہیں ان کی ترتیب ان کے وقوع کے سلسلہ کے مطابق نہیں ہوا کرتی بلکہ فطری اور صحیح طریقہ کلام یہی ہوتا ہے کہ مختلف واقعات کو بلا لحاظ تاریخ و ترتیب بیان کیا جائے اور نظر صرف اُس نتیجہ پر رہے جو اُن تمام واقعات سے نکلتا ہو قرآن حکیم کی نگاہ ہمیشہ روحانی اور اخلاقی نتائج پر رہتی ہے اس لیے وہ واقعات کی تاریخی ترتیب کا لحاظ نہیں رکھتا کیونکہ یہی واحد طریقہ ہے جو تعلیم اخلاق اور اصلاح کردار کے لیے انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ یہاں اصل میں جنگ اُحُد ہی کا ذکر مقصود ہے مگر چونکہ اس جنگ میں مسلمانوں کو خود ان کی اپنی غلطی اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت کے خلاف عمل کرنے کی وجہ سے شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا اس لیے محض تسکین کے لیے پچھلے واقعۂ بدر کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ اس طرح یہاں پر جنگ بدر کا ذکر محض ضمنی طور پر ہے جس کا مقصد شکست خوردہ مسلمانوں کی ہمت بڑھانا اور انھیں تسکین دینا ہے کہ اگر وہ ہمت نہ چھوڑیں اور استقلال و جرأت سے کام لیں اور وقتی

شکست پر مایوس نہ ہوں اور اپنے ہوش و حواس نہ کھو بیٹھیں تو اللہ ان کی اسی طرح نصرت فرمائے گا جس طرح اُس نے بدر کے میدان میں تین سو تیرہ نہتے مگر بے جگر، مستقل مزاج، ایمان کے پکے اور بہادر مسلمانوں کی مدد فرمائی تھی تاکہ اُحُد کی شکست کا غم مسلمانوں کے دلوں سے دھل جائے۔ جنگ بدر کا ذکر مستقل طور پر سورۂ انفال میں کیا گیا ہے۔ جنگ اُحُد میں مسلمانوں کو شکست کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ پہلی مرتبہ جب مسلمانوں ہی کو فتح ہوئی اور کفار پسپا ہو گئے تھے تو لوگ یہ سمجھ کر کہ اب کفار میدان سے بھاگ گئے اُن کا چھوڑا ہوا مالِ غنیمت لوٹنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ دیکھ کر لشکرِ اسلام کے پچھلے حصّے کی طرف جس گھاٹی پر سرورِ کائنات نے عبداللہؓ بن جبیر کو پچاس تیر اندازوں کے ساتھ اس تاکیدی حکم کے ساتھ مقرر فرما دیا تھا کہ کسی حالت میں بھی وہ اس جگہ کو نہ چھوڑیں مگر سوائے بارہ افراد کے جن میں عبداللہؓ بن جُبیر بھی تھے سب نے اس گھاٹی کو چھوڑ دیا اور مالِ غنیمت کی لوٹ میں شریک ہو گئے۔ یہ غیر محفوظ حالت دیکھ کر شکست خوردہ مشرکوں نے خالد بن ولید کی کمان میں پشت کی طرف سے غفلت کی حالت میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور گھاٹی کے بارہ محافظوں کو اس سے پہلے ہی تہہ تیغ کر ڈالا تھا۔

اس غیر متوقع حملہ نے لشکرِ اسلام کو بدحواس کر دیا اور اکثر و بیشتر لوگ میدان میں نہ جم سکے۔ اُس ہنگامہ میں شیرِ خدا حضرت علیؑ بن ابی طالب اور اسد الرسول حضرت حمزہؓ بن عبدالمطلب کی تلواریں صاعقۂ قہرِ الٰہی بن کر مشرکوں کے سروں پر گر رہی تھیں اور حضرت ابو دجانہؓ انصاری کمان کی طرح رسولؐ اللہ پر جھکے ہوئے تھے اور اس طرح وہ ہر تیر اپنے اوپر روک لیتے تھے اور حضورؐ تک آسے نہیں جانے دیتے تھے۔

اس مایوسی کو دفع کرنے کے لیئے جنگ بدر کا ذکر ہوا ہے اور یہ حکم دیا گیا ہے کہ مسلمان ہمیشہ اللہ پر بھروسا رکھیں اور کبھی اس کی رحمت و نصرت سے مایوس نہ ہوں کیونکہ اگر وہ اس کی اطاعت میں لگے رہیں گے تو وہ ان کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں ضرور نصرت فرمائے گا۔

(درس ۲۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝

(پارہ ۴ رکوع ۵ کی ابتدائی ۷ آیات کریمہ۔ سورۂ آل عمران)

اے ایمان والو سود بڑھا چڑھا کر کھاتے نہ چلے جاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم فلاح پا جاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور مغفرت کی طرف جو تمہارے پروردگار کی طرف سے ہے دوڑو اور اس جنت کی طرف دوڑو جس کی چوڑائی سارے آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو پرہیزگاروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خوشحالی اور کٹھن وقت میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو ضبط کرنے والے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جب کوئی بے جا حرکت کر بیٹھتے ہیں یا اپنے ہی حق میں کوئی ظلم کر ڈالتے ہیں تو اللہ کو یاد کرتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی طلب کرتے ہیں اور اللہ کے سوا دوسرا کون ہے جو گناہوں کو بخشتا ہو اور یہ لوگ اپنے فعل پر اصرار نہیں کرتے جبکہ جان رہے ہوں۔ ایسے لوگوں کی جزا اُن کے پروردگار کی طرف سے بخشش ہے اور بہشت کے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ اُن میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور نیک عمل کرنے والوں کے لیے کیا اچھا معاوضہ ہے۔

تشریح و تفسیر: "الرّبٰوا" کے اصلی معنی بڑھنے اور زیادہ ہونے کے ہیں شرعی اصطلاح میں یہ ایک خاص نوعیت کے اضافہ اور بڑھوتی کا نام ہے جو اصل سرمایہ پر ہوتی ہے اور اسی خاص نوعیت کے اضافہ کو اسلام نے حرام کیا ہے۔ "اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً" میں "اَضْعَاف" "ضِعْف" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں دوگنا "مُضٰعَفَةً" سے بھی یہی مفہوم مراد ہے۔ سود کی یہ

خاصیت ہے کہ وہ مفلس کو مفلس تر اور امیر کو امیر تر بنا تا ہے۔ یہاں اسی دُگنے چوگنے اور بڑھنے چڑھنے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ مقصود ہر گز نہیں ہے کہ مرکب سود تو نہ لو مگر مفرد سود لے سکتے ہو "اُعِدَّتْ" کا مصدر "اِعْدَاد" ہے معنی ہیں تیار کرنا، مہیا کرنا۔ "سَرَّاء" مسرت، خوشحالی اور آرام کو کہتے ہیں ضَرَّاء تنگی، بدحالی اور تکلیف کے لیے بولتے ہیں۔ کَظْمُ الغیظ غصّہ روکنے اور ضبط کرنے کو کہتے ہیں اور جو ایسا کرے اسے کاظم کہا جاتا ہے۔ "اِصْرَار" کے معنی ہیں کسی بات پر جم جانا اور اڑ جانا اور اُس سے باز نہ آنا۔ "عَرْض" کے معنی چوڑائی کے ہیں مگر یہاں مراد وسعت ہے۔

گذشتہ آیات میں جنگ اُحُد اور جنگ بدر کا ذکر کرکے مسلمانوں کو تقویٰ اور صبر کی تعلیم دی گئی تھی اور مایوسی، کم ہمتی اور بزدلی سے منع کیا گیا تھا اور اس حقیقت کو سمجھایا گیا تھا کہ اگر مسلمان صبر و تقویٰ کا دامن اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑیں گے تو اللہ کی نصرت ہمیشہ اُن کے ساتھ رہے گی۔ اب ان آیتوں میں سود خواری سے روکا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ میں سود کے حرام ہونے کو بتایا جا چکا ہے۔ اب پھر اس کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے۔ جہاد کے تذکرہ میں سود کی حرمت کے بیان کی بظاہر یہ وجہ معلوم ہوتی ہے کہ سود کھانے والے کے دل میں اپنے بھائی کے لیئے مالی قربانی دینے کا کوئی جذبہ موجود نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کا خواہشمند ہوتا ہے کہ پریشان لوگوں کی تکلیف، پریشانی اور مصیبت سے ہر ممکن صورت میں فائدہ حاصل کرے دوسروں کو کتنا ہی نقصان ہو مگر سود خوار کے اصل سرمایہ اور سود کی رقم میں کوئی کمی نہ آنے پائے تو پھر یہ بات ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص اپنے بھائی کے لیئے مالی قربانی نہ دے سکتا ہو بلکہ اپنے مالی فائدہ کو حکم خدا پر بھی ترجیح دے سکتا ہو، وہ اللہ کی راہ میں جان کی قربانی کس طرح دے گا۔ حرمت سود کے تذکرہ سے اس جگہ بظاہر اس رخ کی طرف بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سچے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی نظر میں جہاد بالسیف اور جہاد بالمال دونوں ہی کی اہمیت قائم رہے اور اُس کو یہ بات پوری طرح معلوم رہے کہ انسان کی جان و مال اور ہر چیز اللہ ہی کی ملکیت ہے اور اسے اسی طرح خرچ ہونا چاہیے جس طرح اللہ کا حکم اور اُسکی مرضی ہو۔

یہاں ایک طرف سود خواری سے منع کیا گیا ہے دوسری طرف تقوے اختیار کرنے کا حکم ہے اور فلاح کو تقوے کے حصول ہی سے وابستہ کیا گیا ہے یعنی سود خواری سے کتنا ہی دنیوی فائدہ حاصل ہو مگر اللہ کے نزدیک وہ ہر گز فلاح نہیں ہے۔ ساتھ ہی جہنم کی آگ سے ڈرایا گیا ہے جو

کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ سودخواری کا درجہ اس کفر کے برابر ہے جس کی سزا جہنم ہے۔

پھر اللہ اپنی اور اپنے رسولؐ کی اطاعت کا حکم دیتا ہے اور اس اطاعت پر رحم و کرم فرمانے کا وعدہ کرتا ہے۔ اس طرح سمجھایا گیا ہے کہ اسلام و ایمان صرف سلبی مفہوم ہی کا نام نہیں بلکہ اس کے لیے اطاعت اور عملِ صالح کا ایجابی پہلو بھی ضروری ہے۔ اس کے بعد فلاحِ دنیا و آخرت کے حصول کے لیے نیکیوں کی طرف سبقت کرنے کا حکم ہے تاکہ اس کے عوض میں وہ جنت حاصل ہو جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور جو صاحبانِ تقویٰ کے لیے تیار کی گئی ہے۔ پھر ایسے جنتی اور صاحبانِ تقویٰ لوگوں کی کچھ صفتیں بیان ہوئی ہیں کہ وہ خوشحالی اور تنگدستی اور راحت و تکلیف دونوں حالتوں میں راہ خدا میں اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں اور جب غصہ آتا ہے تو اسے ضبط کرتے ہیں اور اپنے نفس پر پورا قابو رکھتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ وہ بے حس تو نہیں ہیں۔ غصہ تو انھیں ضرور آتا ہے مگر ان کی عقل ان کے جذبات سے مغلوب نہیں ہوتی بلکہ انھیں اپنا تابع رکھتی ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حقیقت میں پہلوان وہ نہیں ہے جو کسی کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان تو وہ ہے جو غصّہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔ دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص غصہ کرنے اور اسے کسی پر اتارنے میں پوری قدرت رکھتے ہوئے اس کو ضبط کرلے تو اللہ اس کے دل کو امن و سلامتی اور ایمان سے لبریز کردیگا پھر فرمایا گیا ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ وہ اہل ایمان لوگوں کے قصور معاف بھی کر دیتے ہیں اور ان سے انتقام نہیں لیتے اس کے بعد "المحسنین" کہہ کر فرمایا گیا ہے کہ وہ اس منزل سے بھی آگے ہیں یعنی قصور کی صرف معافی ہی نہیں بلکہ وہ اس کے بعد حسنِ سلوک بھی کرتے ہیں۔ علامہ بیہقیؒ نے ایک روایت بیان کی ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؑ بن الحسینؑ امام زین العابدینؑ کے ہاتھوں پر آپ کی کنیز پانی ڈال رہی تھی۔ اس کی غلطی سے لوٹا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر آپ کے اوپر گر پڑا جس سے آپ زخمی ہو گئے۔ کنیز نے خوف و ندامت میں اسی آیت کی تلاوت کی پہلے اس نے "وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ" کہا امامؑ نے فرمایا بیشک میں نے غصّہ کو روک لیا اس نے پھر "وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ" کہا آپ نے فرمایا کہ میں نے تجھے معاف کردیا۔ پھر اس نے کہا "وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ" یہ سن کر آپ نے فرمایا "تجھے میں نے خدا کی راہ میں آزاد کردیا۔ تجھے اب اختیار ہے جہاں چاہے زندگی بسر کر" غرض ان صفات کو ذکر کرکے ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ

ان صاحبانِ تقویٰ کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ غلطی اور گناہ پر اصرار نہیں کرتے بلکہ اگر کبھی وہ بھول کر کوئی گناہ کر بیٹھتے ہیں تو فوراً توبہ و استغفار کر کے اُس کی تلافی کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جان بوجھ کر اور قصداً اللہ کی نافرمانی نہیں کرتے اور اگر کبھی اتفاق سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو استغفار و توبہ کرنے میں غفلت نہیں کرتے اور اللہ اپنی رحمت سے اُن کی توبہ کو قبول فرماتا ہے۔ بلاشبہ سچی توبہ اور صحیح استغفار وہی ہے جو دل سے ہو اور اس عزم کے ساتھ ہو کہ پھر گناہ نہ ہوگا ورنہ اگر ہاتھوں میں تسبیح تو ہو اور زبان پر اسماءِ الٰہی ہوں مگر دل گناہوں کی لذّت میں چور ہو اور نیت و ارادہ پر وسوسۂ شیطانی کا تسلط ہو تو پھر ایسا استغفار خود ہی قابلِ استغفار ہوگا۔

(درس ۳) قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِلْمُتَّقِينَ ۝ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝ إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ۝ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝

(پارہ ۴ رکوع ۵ کی آخری ۷ آیات کریمہ۔ سورۂ آلِ عمران)

یقیناً تم سے پہلے واقعات گذر چکے ہیں تو تم زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ہے۔ یہ (قرآن) ایک بیان ہے تمام لوگوں کے لئے اور پرہیزگاروں کے لئے ہدایت و نصیحت ہے اور تم نہ تو ہمت ہارو اور نہ غم کرو اور تم ہی غالب رہو گے اگر تم (سچے) مومن ہو۔ اگر تم زخمی ہوئے ہو تو تمہارے مخالف لوگ بھی ایسے ہی زخمی ہو چکے ہیں اور ہم ان دنوں کی اُلٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان کرتے ہی رہتے ہیں اور تاکہ اللہ ان لوگوں کو جان لے جو (سچے

دل سے) ایمان لائے ہیں اور تم میں بعض کو شہادت کا مرتبہ عطا فرمائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور (یہ وجہ بھی تھی) کہ اللہ ایمان لانے والوں کو پاک صاف کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ (مسلمانو!) کیا تم یہ سمجھ بیٹھے ہو کہ تم سب کے سب جنّت میں چلے ہی جاؤ گے حالانکہ ابھی تک اللہ نے تم میں سے اُن لوگوں کو جانا ہی نہیں جنہوں نے جہاد کیا اور نہ صبر کرنے والوں ہی کو جانا اور تم تو موت کی تمنا کر رہے تھے اس سے پہلے کہ تم اُس کے سامنے آؤ تو اب تو تم نے اُس کو کھلی ہوئی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

تشریح وتفسیر:۔ "سُنَنٌ" "سُنَّةٌ" کی جمع ہے۔ اس کے معنی طریقہ کے ہیں۔ مقصود وہ طریقے ہیں جو اللہ نے مختلف امتوں کے ساتھ اختیار کیے جب انھوں نے اُس کے دین اور اُس کے پیغمبروں کی تکذیب کی تھی یا عذاب کے وہ واقعات مراد ہیں جو گزشتہ امتوں پر گزرے تھے۔ کبھی "سُنَّةٌ" سے مراد خود امّت کو بھی لیا جاتا ہے "بَیَانٌ" کا لفظ مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ جب یہ اسم ہو تو اس کے معنی اُس وسیلہ اور ذریعہ کے ہوتے ہیں جس سے کبھی بات کی وضاحت کی جائے اور خود اُس صاف اور واضح کلام کو بھی کہتے ہیں جس سے کسی کا مقصد ظاہر ہو سکے "تَهِنُوْا" "وَهْنٌ" سے بنایا گیا ہے۔ جس کے معنی جسمانی طور پر کمزور ہونے یا اخلاقی اور ذہنی کمزوری ظاہر کرنے کے ہیں۔

"یَمْسَسْكُمْ" کا مصدر "مَسٌّ" ہے اس کو بہت سے معانی میں بولا جاتا ہے۔ ایک معنی تکلیف اور اذیت پہنچنے کے بھی ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ "قَرْحٌ" کے معنی اُس زخم کے ہیں جو بدن میں کسی بیرونی چیز سے پیدا ہو جائے۔ "یُمَحِّصُ" "مَحْصٌ" سے بنا ہے اور اس کا مصدر "تمحیص" ہے۔ ان دونوں کے معنی ہیں کسی چیز کو کھوٹ اور نقص وعیب سے پاک صاف کر دینا۔

اس سے قبل بتایا جا چکا ہے کہ ہجرت کے بعد ۳ھ میں اسلام کی دوسری بڑی لڑائی یعنی جنگ اُحُد میں تیر انداز محافظوں کی غلطی کی وجہ سے اسلامی لشکر کو زبردست جانی نقصان اور شکست برداشت کرنا پڑی تھی۔ اس لڑائی میں ستّر صحابہؓ شہید ہوئے تھے جن میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت حمزہؓ بھی تھے۔ ان تمام صحابہ کرامؓ کی لاشوں کی جس طرح مشرکوں نے بے حرمتی کی تھی اُس کی مثال نہیں ملتی خصوصیت کے ساتھ حضرت حمزہؓ کی لاش کے ساتھ جو سلوک کیا گیا وہ انتہائی وحشیانہ

تھا۔ خود حضورؐ بھی اس لڑائی میں زخمی ہو گئے تھے اور آپ کا جسم مبارک بھی خون آلودہ ہو گیا تھا
اور اسی طرح خون میں نہائے ہوئے سرورِ کائنات اُن گڑھوں میں سے ایک گڑھے میں گر گئے
تھے جو ابو عامر نے جا بجا کھود دیے تھے تاکہ مسلمان جنگ کی حالت میں اُن کے اندر گر جائیں۔ ابن
ہشام اور دیگر مورخوں نے لکھا ہے کہ فوراً اُسی وقت حضرت علیؓ دشمن کی صفوں کو چھوڑ کر حضورؐ
کے پاس آئے اور آپ کو سہارا دے کر اُس خطرناک گڑھے سے باہر لائے اور پھر میدان
پر غضبناک شیر کی طرح ٹوٹ پڑے۔ ابو دُجانہ انصاریؓ بے حد زخمی تھے مگر اسی حالت میں وہ رسالتمآبؐ
پر کمان کی طرح جھکے ہوئے آپ کی حفاظت کر رہے تھے۔ مورخین نے اس موقع پر اُمّ عُمارہؓ
نُسیبہ بنتِ کعب مازنیہؓ کا نام بھی لکھا ہے۔ یہ بہادر خاتون بھی دشمنوں کے اس طوفانی حملہ میں
شمعِ رسالت کے گرد پروانہ وار حفاظت کے فرض کو انجام دے رہی تھیں۔ ان کا کام زخمیوں
کو پانی پلانا تھا مگر جب انھوں نے دیکھا کہ سرورِ کائنات زخمی ہو گئے اور تنہا ہیں تو یہ تلوار لے کر
حضورؐ کے سامنے سینہ سپر ہو گئیں۔ حفاظتِ رسولؐ کی اس تاریخی خدمت میں اس بہادر
خاتون کے جسم پر نیزہ اور تلوار کے بارہ[۱۲] گہرے زخم آئے تھے مگر یہ پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جمی رہیں
اور ابن قمئہ جیسے مشہور مشرک بہادر کا شدید ترین حملہ بھی انھیں اپنی جگہ سے جنبش نہ
دے سکا اور اُس کے حملہ کے جواب میں انھوں نے بھی اُس پر تلوار کے کئی وار کیے مگر وہ
دُہری زرہ پہنے ہوئے تھا اس لیے بچ گیا لیکن اُس کی تلوار سے اِن کے کاندھے پر گہرا
زخم آگیا تھا۔ ابن قمئہ ہی کے ایک پتھر سے سرورِؐ کائنات کا سرِ اقدس شگافتہ ہوا تھا۔
آپ اپنے چہرۂ مبارک سے خون پونچھتے جاتے تھے اور فرما رہے تھے: پروردگارا! میری قوم کو
ہدایت فرما "فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ" کیونکہ یہ علم و معرفت نہیں رکھتے۔ غرض اسلامی لشکر میں افراتفری
تھی۔ ستّر صحابۂ کرامؓ کی لاشیں میدان میں پڑی ہوئی تھیں جنھیں مشرکوں نے انتہائی
وحشت و بربریت کے ساتھ مُثلہ کر دیا تھا صرف چند بہادر ایسے تھے جنہوں نے دشمن کے دفاع
میں جان کی بازی لگا دی تھی اور ہر چیز سے بے پروا ہو کر دشمن کی صفوں پر ٹوٹ پڑے تھے
جن میں سب سے اونچا نام شیرِ خدا حضرت علیؓ ابن ابی طالب ہی کا ہے جن کی تیغ شعلہ بار
نے نظامِ کفر و شرک کی دھجیاں اڑا دی تھیں مگر مجموعی طور پر لشکرِ اسلام کو جو جانی نقصان
اٹھانا پڑا اس کی وجہ سے مسلمانوں کے دل غم سے نڈھال تھے۔ اسی صورتِ حال کے
پیشِ نظر اللہ نے ان آیات میں مسلمانوں کو ڈھارس دی ہے کہ گذشتہ تاریخ میں اہلِ ایمان

کو راہ حق میں اسی طرح کے جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑے تھے مگر انھوں نے صبر سے کام لیا اور آخر میں انھیں کو فتح حاصل ہوئی اور اللہ نے دشمنان حق کو ہمیشہ کے لیئے ذلیل و خوار کر دیا پھر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن عام انسانوں کے لیئے تو صرف ایک اعلان اور واقعات اور چند حقائق کا ایک بیان ہے مگر اس سے فائدہ وہی لوگ اٹھائیں گے جو اپنے دلوں میں اللہ کا خوف رکھتے ہیں۔ پھر نصیحت فرمائی گئی ہے کہ مسلمانو! تم شکست اور مصائب کے سیلاب کے باوجود ہمت کبھی نہ ہارنا، کبھی مایوس نہ ہونا، اور کبھی غمگین نہ ہونا اور یہ یقین رکھو کہ یہ شکستیں اور آزمائشیں تو صرف مرد مومن کے ثبات و استقلال کو جانچنے کے لیئے ہوتی ہیں اور صرف عارضی ہوتی ہیں۔ درحقیقت فتح و کامیابی اسی سچے مومن کا مقدر بنتی ہے جو کبھی ہمت نہ ہارے اور مصیبتوں کا بے جگری سے مقابلہ کرے۔ اس لیے اگر تم میں سچا ایمان ہے تو تم ہی ہمیشہ غالب ہو گے۔ اور دنیا کی کوئی طاقت تمہیں تسخیر نہ کر سکے گی۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اگر احد میں تم کو شکست ہوئی اور تم نے زخم کھائے تو تمہارے دشمنوں کو بھی اس سے قبل جنگ بدر میں اس سے بڑی شکست اٹھانا پڑی تھی اور اس سے زیادہ زخم کھانا پڑے تھے تمہاری شکست اور تمہارے زخم انوکھے نہیں ہیں اور زمانہ کا یہ الٹ پھیر تو لوگوں کے درمیان ہمیشہ رہتا ہی ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ اللہ تمہارے ایمان و یقین اور عزم و ثبات و استقلال کو پرکھنا چاہتا ہے۔ اور یہ چاہتا ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں سچا ایمان ہے وہ منافقوں سے الگ ہو جائیں اور منزل یقین شک و شبہ سے پاک صاف ہو جائے جس طرح اصلی سونا نکھر کر ملاوٹ سے پاک ہو جاتا ہے جب اسے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈالا جاتا ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جنت تمہاری ملکیت نہیں ہے کہ تم فسق و فجور اور نفاق اور بے ایمانی کے باوجود ضرور اس میں جاؤ گے بلکہ جنت میں صرف وہ لوگ جائیں گے جو اپنے صبر و یقین اور ایمان و طاعت سے اللہ کے سامنے یہ ثابت کر دیں کہ وہ اس کے سچے اطاعت شعار بندے ہیں اور اس کے غیر اور اس کے دشمنوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ یورپین مورخین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ جنگ احد میں اگرچہ قریش مکہ کو ظاہری فتح حاصل ہوئی تھی اور مسلمانوں کو شکست اٹھانا پڑی تھی مگر یہی شکست قریش کے مستقل زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ یعنی مسلمان اس شکست کے بعد اسی بے پناہ ولولہ کے ساتھ آگے بڑھ گئے جو ہمیشہ خودداری و عزت نفس کی مالک قوموں کے دلوں میں شکستیں کھا کر اور

چوٹ کھا کر اُبھرا کرتا ہے کیونکہ وہ کبھی ہمت نہیں ہارتیں اور بلاؤں اور شکست و بربادی کے بھیانک طوفانوں کی ہر موج اُن کے عزم و جرأت کے سفینہ کے لیے ایک نیا ساحل پیدا کر دیتی ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِىٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِىْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(پارہ ۴ رکوع ۶ کی ۵ آیات کریمہ۔ سورہ آل عمران)

اور محمدؐ تو صرف ایک رسول ہیں اِن سے پہلے اور بھی رسول گذر چکے ہیں تو کیا اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے؟ اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں واپس ہو جائیگا وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا اور اللہ عنقریب شکر کرنے والوں کو بدلہ عطا کریگا اور کسی شخص کیلیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ بغیر حکم خدا کے مر جائے اسطرح کہ اُسکی میعاد لکھی ہوئی ہے اور جو کوئی دنیا کا فائدہ چاہتا ہے ہم اُسکو اسی سے اُسکا حصہ دیدیتے ہیں اور جو شخص آخرت کا ثواب چاہتا ہے ہم اُسے اُسکا حصہ دینگے اور ہم عنقریب شکر کرنے والوں کو جزا عطا کرینگے اور کتنے ہی پیغمبر گذر چکے ہیں جنکے ساتھ ہو کر اللہ والوں نے جنگ کی تھی پھر جو کچھ انھیں اللہ کی راہ میں تکلیف پہنچی اُسکی وجہ سے نہ تو انھوں نے ہمت ہاری اور نہ کمزور ہوگئے اور نہ (دشمن سے) دبے اور اللہ صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور اُنکا قول تو بس اتنا ہی تھا کہ وہ کہتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہمارے گناہوں کو اور جو کچھ ہمسے اپنے کاموں میں زیادتیاں ہوئی ہیں انھیں معاف فرما دے اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری نصرت کر تو اللہ نے انھیں دنیا کا بھی ثواب دیا اور آخرت کا بھی اچھا بدلہ عطا کیا اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

تشریح وتفسیر:۔ "خَلَتْ" کا لفظ زمان ومکان دونوں کے لیے بولا جاتا ہے یعنی زمانہ کا گزر جانا یا مکان اور جگہ کا خالی ہو جانا یا کسی جگہ کو چھوڑ کر چلا جانا خواہ یہ چلا جانا موت کی وجہ سے ہو یا اور کسی صورت میں ہو۔ "قَلْبٌ" جب مصدر ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں کسی چیز کو ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیرنا اور پلٹانا۔ اسی سے "انقلاب" بنا ہے۔ معنی ہیں پھر جانا، پلٹ جانا یا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدل جانا۔ "عَقِبٌ" پیر کے پچھلے حصہ یعنی ایڑی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع "اَعْقَاب" آتی ہے۔ اسی مناسبت سے اس کو ذرّیت اور اولاد کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں مقصود ہے پچھلے پاؤں یعنی کفر کی طرف پلٹ جانا۔ "اَجَلٌ" مقرر مدت کو کہتے ہیں اور کبھی اسے موت کے وقت کے لیے بھی بولتے ہیں۔ اس کی جمع "آجال" ہے۔ "تَاجِیل" اسی سے بنا ہے معنی ہیں مدت کا معین کرنا۔ اسی بنا پر "مُؤَجَّل" اس چیز کو کہا جاتا ہے جس کے لیے مدت مقرر کر دی جائے۔ اس کے مقابلہ میں "معجّل" عین کے ساتھ وہ ہے جو جلدی سے ہو جائے اور اس میں عجلت مقصود ہو۔ "رِبِّیُّوْن" "رِبِّیٌّ" کی جمع ہے۔ مفسرین نے اس لفظ کے بہت سے معنی بیان کیے ہیں اور سب ہی مراد لیے جا سکتے ہیں۔ جیسے عالم، زاہد، اللہ والے۔ پرہیزگار، تابع فرمان یا بڑا گروہ وغیرہ "وَهْنٌ" جسمانی یا اخلاقی کمزوری کو کہتے ہیں۔ "اِسْتِكَانَةٌ" کے معنی ہیں عاجزی ظاہر کرنا۔ اس لفظ کی اصل "سکون" "کَیْن" یا "کَوْن" ہے۔ مختلف علمائے لغت نے ان میں سے کسی ایک اصل کو اختیار کیا ہے۔ "اِسْرَاف" حد اعتدال سے تجاوز کر جانے کے لیے بولتے ہیں۔ اس لفظ کو زیادہ تر مال خرچ کرنے کے سلسلہ میں بولا جاتا ہے اور کبھی دوسری باتوں کے لیے بھی بولتے ہیں۔

یہ آیتیں بھی جنگ اُحد ہی کے متعلق نازل ہوئی تھیں جن میں مسلمانوں کو اُس شکست کے بعد جو انھیں اس لڑائی میں اٹھانا پڑی تھی، یہ بتایا جا رہا ہے کہ سرورِ کائنات بھی اسی طرح اللہ کے ایک رسول اور بشر ہیں جس طرح آپ سے پہلے اللہ نے اور رسولوں کو مبعوث فرمایا تھا کہ وہ بھی اس کے پیغمبر اور بشر تھے اللہ اس نے آپ کو سب رسولوں سے افضل بنا کر سب کے آخر میں بھیجا۔ تو جس طرح آپ سے پہلے آنے والے بعض رسولوں کو شہید کیا گیا تھا آپ کے لیے بھی شہادت ممکن ہے اور جس طرح انھوں نے وفات پائی یا اپنی امتوں سے جدا ہوئے آپ بھی جدا ہو سکتے ہیں یا وفات پا سکتے ہیں۔ یہ جدائی اور وفات یا شہادت

کوئی انوکھی چیز نہیں ہے جو آپ کے لیے ممکن نہ ہو سکتی ہو۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ ان پیغمبروں کی جدائی یا وفات اور شہادت کی وجہ سے اللہ کا دین تو نہیں مٹ گیا بلکہ ان کے ماننے والوں نے اپنی جانوں اور اپنے اموال کی زبردست قربانیاں دے کر اسے باقی رکھا اور اپنے انبیاء کے بعد بھی اس پر مضبوطی سے جمے رہے۔ نہ انھوں نے بے دلی اور مایوسی کا اظہار کیا، نہ ان میں کوئی کمزوری پیدا ہوئی۔ نہ ان کی ہمت ٹوٹی اور نہ انھوں نے دین حق سے روگردانی کی اسی طرح جنگ احدؐ میں اتفاقی شکست اٹھانے کے بعد اور رسولؐ اللہ کی شہادت کی محض افواہ سن کر جو مشرکین نے اڑائی تھی تمہیں بھی ہمت نہ ہارنا چاہیے تھا یہ نصیحت ان لوگوں کے لیے تھی جو مشرکوں کے اچانک حملہ سے بدحواس ہو کر میدان جنگ سے فرار کو گئے تھے اور جب انھوں نے حضورؐ کی شہادت کی بے بنیاد خبر سنی تو اور بھی دل شکستہ ہو گئے اور سوچنے لگے کہ اب رسولؐ کے بعد ہم مسلمان رہ کر کیا کریں گے اور کیوں نہ اب ہم ابوسفیان سے امان حاصل کر لیں اور اپنے پچھلے دین کی طرف پلٹ جائیں۔ یہ وہ لوگ تھے جن کا ایمان اس وقت تک پختہ نہ ہوا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ جب تک رسولؐ اللہ زندہ ہیں اسلام بھی باقی ہے اور جب آپؐ دنیا میں نہ رہیں گے تو وہ بھی ختم ہو جائے گا۔ ایسے ہی ضعیف العقیدہ لوگوں کے اعتقاد و ایمان کی اصلاح کی جارہی ہے یہ فرما کر کہ گذشتہ امتوں کے رسول بھی ہمیشہ ان میں باقی نہیں رہے مگر ان امتوں نے ان کے بعد ان کی پیروی ترک نہ کی اسی طرح تم بھی اس بات کو نہ دیکھو کہ رسولؐ اللہ تمہارے درمیان باقی ہیں یا نہیں۔ جب تم نے اُن کی ہدایت سے دین حق کو اختیار کر لیا اور صراط مستقیم پر آ گئے تو اب ہر حالت میں تم اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اور دل میں کسی قسم کا شک و شبہ نہ لاؤ۔ یہ اللہ کا دین ہے جس کی ذات اقدس حیؔ و قیوم اور ازلی و ابدی ہے اس لیے یہ دین بھی قائم و دائم رہے گا چاہے کوئی رسول اور نبی امت کے درمیان موجود رہے یا نہ رہے۔ اللہ اُن ہی لوگوں کو جزائے خیر عطا کرے گا جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت پر تادم مرگ جمے رہیں گے۔ علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں شیر خدا حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام کے اس ارشاد گرامی کو نقل کیا ہے کہ نہ ہم حضورؐ کی وفات پر اس دین حق سے الگ ہو سکتے ہیں اور نہ آپ کی شہادت پر۔ خدا کی قسم اگر سرور کائنات شہید ہو جائیں تو ہم بھی اسی دین پر مر مٹیں گے۔ خدا کی قسم میں آپ کا بھائی ہوں، آپ کا ولی ہوں اور آپ کا وارث ہوں۔ پھر ان آیات میں اللہ نے فرمایا ہے کہ جس شخص کو

بھی موت آتی ہے وہ اسی وقت آتی ہے جو اللہ نے اس کے لیئے مقرر کردیا ہے۔ نہ پہلے آسکتی ہے نہ بعد میں اس لیئے گھبرانے اور ڈرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کا عمل صرف دنیا ہی حاصل کرنے کے لیئے ہو تو اس میں سے اس کا حصّہ اس کو مل جاتا ہے پھر وہ آخرت میں خالی ہاتھ رہے گا۔ اور وہاں اُسے کچھ نہ ملے گا مگر جس کا مقصودِ عمل آخرت کا ثواب ہو اُسے آخرت تو ملتی ہی ہے ساتھ ہی دنیا میں بھی وہ اپنا حصّہ پالیتا ہے۔ اس کے بعد پھر مجاہدینِ میدانِ اُحد کی طرف خطاب ہوا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم سے قبل بھی بہت سے پیغمبروں نے اہلِ ایمان کو ساتھ لے کر دشمنانِ دینِ حق سے جہاد کیا تھا اور اُن کے اس جہاد میں اُن مجاہدوں کو بڑی بڑی تکلیفیں اٹھانا پڑیں مگر وہ ہمیشہ صبر و شکر کرتے رہے اور ایک لمحہ کے لیئے بھی اُن میں نہ تو سستی آئی، نہ دین میں شک و شبہہ پیدا ہوا اور نہ وہ کسی مصیبت، شکست اور ناکامی پر کبھی بددل ہوئے اور نہ ہمت ہارے اور نہ اللہ کے دشمنوں کے آگے انھوں نے سرِ اطاعت جھکایا بلکہ ہر مصیبت اور ہر شکست اُن کے لیئے امید کی ایک نئی کرن بن کر ابھرتی رہی اور اُن کے ولولوں کو دبا نہ سکی پھر اسی طرح تم بھی اپنی شکست پر کبھی نہ گھبراؤ اور پورے عزم اور بے جگری کے ساتھ اپنے موقفِ حق پر جمے رہو سرورِ کائنات کی زبانِ اقدس سے جب مسلمانوں نے یہ ارشادِ خداوندی سنا تو اُن میں وہ زبردست جوش اور ولولہ پیدا ہو گیا کہ اس شکست کے دوسرے ہی روز فقط یہ خبر سنتے ہی کہ ابوسفیان مدینہ پر حملہ کرنے کے لیئے پھر پلٹ رہا ہے مقام حمراءُ الاسد کی طرف جو مدینہ سے آٹھ (۸) میل پر تھا بپھرے ہوئے شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے جن میں وہ زخمی بھی شامل تھے جن کے لیئے راستہ چلنا دوبھر تھا اور کبھی وہ پیدل چلتے تھے اور کبھی کوئی دوسرا شخص اُنھیں اپنے اوپر اٹھا لیتا تھا اور جب شکست خوردہ مسلمانوں کے اس زبردست ولولہ جہاد کی خبر ابوسفیان کو پہنچی تو پھر اس نے مدینہ پر اپنے دوسرے حملہ کا ارادہ ترک کردیا اور درحقیقت یہی ولولۂ جہاد جو شکستِ احد کے بعد مسلمانوں کے دلوں میں ابھرا تھا کفر و شرک کی ابدی موت کا پیغام ثابت ہوا۔ غرض سچّے اور پکّے مسلمان کبھی شکستوں سے ہمت نہیں ہار بیٹھتے بلکہ یہ شکستیں اُن کے عزم و جرأت کو اور بڑھا دیتی ہیں اور ان کے کاروانِ زندگی کی تیز رفتاری کے لیئے آوازِ جرس ثابت ہوتی ہیں۔

(درس ۸) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى
اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ○ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ
خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ○ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ
بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ
وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ○ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ
تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْاَمْرِ وَ
عَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ
الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْھُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ
وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ ○

(پارہ ۴ رکوع ۷ کی ابتدائی ۴ آیات کریمہ - آل عمران)

اے ایمان والو اگر تم اُن لوگوں کی اطاعت کروگے جو کافر ہیں تو وہ تم کو پچھلے پیروں واپس کر دیں گے پھر تم گھاٹے میں رہ جاؤ گے بلکہ اللہ ہی تمہارا سرپرست ہے اور وہی بہترین مددگار ہے ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں رعب ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے اللہ کا شریک بنایا جس کے لیئے اُس نے کوئی دلیل نہیں نازل کی اور ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے ظلم کرنے والوں کے لیئے اور یقیناً اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا جب تم ان لوگوں کو اس کے حکم سے قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے (خود ہی) بزدلی کی اور حکم رسولؐ میں تم باہم جھگڑا کرنے لگے اور تم نے نافرمانی کی اسکے بعد کہ تمہیں اللہ نے دکھا دیا تھا جو کچھ تم چاہتے تھے۔ بعض لوگ تم میں سے وہ تھے جو دنیا چاہتے تھے اور بعض تم میں ایسے تھے جو آخرت کے طلبگار تھے۔ پھر اس نے تم کو ان کفار سے روک دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے اور اس نے تم سے یقیناً درگذر کی اور اللہ ایمان والوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

تشریح وتفسیر:- "مولیٰ" کا لفظ بہت سے معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہاں مراد وہ ذات ہے جسکی اطاعت کی جائے۔ "قلوب" قلب کی جمع ہے۔ جب یہ مصدر ہو تو اس کے معنی ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پھیر دینے کے ہوں گے اور جب اسم ہو تو اس کے ایک معنی اُس عضو کے ہیں جو آدمی کے سینہ میں دھڑکتا رہتا ہے مگر قرآن وحدیث کی زبان

میں اکثر "قلب" سے مراد نفس ناطقہ کو لیا جاتا ہے۔ اسی نفس ناطقہ کے کمال سے انسان میں
انسانیت کا صحیح معیار وجود میں آتا ہے۔ کبھی اس سے مراد خود روح انسانی ہوتی ہے اور
کبھی اس سے عقل مراد لی جاتی ہے "سلطان" کے مشہور معنی بادشاہ کے ہیں مگر قوت و اقتدار
کی مناسبت سے دلیل و برہان کو بھی "سلطان" کہا جاتا ہے اور وہی یہاں مراد ہے "مثویٰ"
جگہ اور ٹھکانے کے لیے بولتے ہیں "تحُسُّونَ" کا مصدر "حسّ" ہے۔ جس کے ایک معنی قتل
کرنے کے آتے ہیں اور وہی مراد ہیں۔ اسی معنی میں "حَسِیْسٌ" مقتول کو کہا جاتا ہے "فَشَل"
بزدلی کے لیے بولتے ہیں "صَرْفٌ" کے معنی ہیں پلٹا دینا، پھیر دینا، روک دینا۔ "ابتلاء" آزمائش کرنے
کو کہتے ہیں "بَلَاءٌ" غم، تکلیف، مصیبت، آزمائش سب کے لیے بولتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آزمائش
جس طرح مصائب اور غم اور مرض وغیرہ کے ذریعہ سے ہوا کرتی ہے اسی طرح راحت و آرام اور
نعمتوں سے بھی ہوتی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام نے فرمایا ہے:

"مَنْ وُسِّعَ علیہ دُنْیَاہُ فَلَمْ یَعْلَمْ اَنَّہٗ قَدْ مُکِرَ بِہٖ فَہُوَ مَخْدُوْعٌ عَنْ عَقْلِہٖ"

جس شخص پر دنیا وسیع کر دی گئی ہو اور وہ یہ نہ جانتا ہو کہ وہ آزمائشوں کی گرفت میں ہے تو وہ
فریب خوردہ اور عقل و فکر سے محروم ہے۔ قرآن مجید میں دونوں طرح کی آزمائشوں کا جابجا ذکر فرمایا
گیا ہے۔ جنگ اُحد ہی کے سلسلہ میں ان آیات کی ابتدا میں مسلمانوں کی طرف خطاب ہے
کہ تمہیں اس شکست کے بعد کفّار اور منافقین طرح طرح بہکاتے ہیں اور بہکائیں گے اور تمہاری
ہمت توڑنے کی کوشش کریں گے کیونکہ جب کوئی شخص مصیبتوں میں گھر جاتا ہے یا شکست کھا
کر بے سہارا ہو جاتا ہے تو اس کے دشمنوں کو اس کا پورا موقع مل جاتا ہے کہ وہ اُسے مختلف صورتوں
سے اپنے راستہ پر لگانے کی کوشش کریں اور گمراہ کریں اسی لیے حالات کے اس انتہائی خطرناک
رخ سے مسلمانوں کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ یہ تمہارے لیے انتہائی سخت امتحانی موقع ہے، تمہارا
دشمن اس سے قطعی طور پر فائدہ اٹھائے گا۔ ہر قسم کی لالچ دے گا، تمہارے دین سے تم کو بددل
کرے گا۔ تمہاری تنظیم اور یکجہتی میں رخنے ڈالے گا اور تمہیں اسلام سے ہٹا کر کفر و شرک کی طرف
مائل کرے گا۔ پھر اگر تم دشمنوں کے فریب میں آ گئے تو خدا نے جو نعمت دنیا و آخرت تمہیں دی ہے اس
سے قطعاً محروم ہو جاؤ گے اور اس کے نتیجہ میں خسارہ اور گھاٹے کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہو گا
ظاہر ہے کہ خاص طور پر ایسے وقت جب متحارب قوموں میں سے ایک قوم کو شکست ہو گئی ہو
غالب و فاتح قوم مغلوب اور شکست خوردہ قوم کی صفوں میں

کے اصول پر بددلی اور ابتری پھیلانے کی کوئی کوشش اٹھا نہیں رکھتی اور اپنے
اور خفیہ ایجنٹوں کے ذریعہ سے ان کی رہی سہی اعصابی طاقت کو بھی تباہ کر دیتی ہے۔ اور حقیقت
تو یہ ہے کہ یہ Fifth Columnists اور خفیہ ایجنٹ وہ کام کرتے ہیں جو بڑی بڑی منظم فوجوں
سے بھی نہیں ہو سکتا۔ غرض مسلمانوں کو اس خطرہ سے پوری طرح آگاہ کیا جا رہا ہے کہ شکست کے
اس امتحانی موقع پر اپنے براہ راست دشمن اور اس سے خفیہ گٹھ جوڑ رکھنے والے منافقوں کی
چالوں سے پوری طرح ہوشیار رہو ورنہ ایسا نقصان اٹھاؤ گے جس کی تلافی پھر کبھی ممکن نہ
ہو سکے گی۔ اور پھر اسی کفر و شرک کی طرف الٹے پاؤں واپس ہو جاؤ گے جس سے خدا نے تم کو نجات
دی تھی۔ "بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ" تم کبھی یہ نہ سمجھنا کہ اللہ کے مقابلہ
میں تم کسی اور سے مدد حاصل کر سکو گے اور اس لیے تم اللہ کو چھوڑ کر اس کے غیر کی اطاعت
کرنے لگو۔ اصل بات یہ ہے کہ صرف اللہ ہی تمہارا حاکم اور مددگار ہے اور اس کے بغیر اذن
کے کوئی بھی تمہاری نصرت نہیں کر سکتا۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ ہم تمہاری اس امتحانی شکست
کے باوجود کفار اور مشرکین کے دلوں میں تمہارا ایسا رعب ڈال دیں گے کہ وہ اپنی وقتی فتح
کے باوجود تمہاری طرف رخ بھی نہ کر سکیں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کفار کا لشکر اپنی فتح
اور غلبہ کے باوجود شکست خوردہ مسلمانوں پر دوبارہ حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکا اور حملہ کرنے
کے ارادہ کے باوجود فقط یہ سنتے ہی کہ مسلمان دوبارہ جنگ کے لیے مدینہ سے آٹھ میل
کے فاصلہ پر مقام حمراء الاسد میں آ گئے ہیں، انتہائی ہیبت زدہ اور مرعوب ہو کر مکہ کی
طرف واپس چلا گیا۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ نے اس سے قبل جو نصرت
کا وعدہ کیا تھا وہ کہاں گیا تو اسے یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ وعدہ صبر اور تقوےٰ کے ساتھ مشروط
تھا اور اسی لیے جب تک مسلمان اس پر جمے رہے ان کی اللہ کی طرف سے مدد ہوتی رہی
اور وہ اپنی قلیل تعداد سے کئی گنا زیادہ بڑے لشکر کی دھجیاں اڑاتے رہے اور بالآخر
انھیں کی فتح ہوئی اور کافروں کو اپنی کثرت اور وافر اسلحہ کے باوجود انتہائی شرمناک شکست
اٹھانا پڑی مگر جب مسلمان خود ہی صبر نہ کر سکے اور گھاٹی کی حفاظت کا جو حکم انھیں دیا گیا تھا
اس کی تعمیل میں ثابت قدم نہ رہے تو پھر وہ وعدہ نصرت بھی ختم ہو گیا جو ان باتوں کے ساتھ
مشروط تھا اسی وجہ سے صورت حال کا نقشہ بھی پلٹ گیا اور فتح بجائے مسلمانوں کے کافروں
کی طرف چلی گئی مگر اس شکست سے بھی یہ فائدہ ہوا کہ مومن اور منافق کی پہچان ہو گئی اور

لشکر اسلام کی پختگیِ ایمان کو اچھی طرح جانچ لیا گیا، جو سچے مومن تھے وہ رسول اللہ کے ساتھ آ گئے اور جو منافق اور دشمنوں کے ایجنٹ تھے وہ کافروں کی ہمنوائی کرنے لگے۔ پھر یہ امتحان ہٹا لیا گیا اور جن ایمان والوں سے نادانستہ طور پر لغزش کا ارتکاب ہوا تھا انھیں معاف بھی کر دیا گیا۔ بلاشبہ اللہ کی طرف سے ہمیشہ اہل ایمان کا طرح طرح سے امتحان لیا گیا ہے اور اُن کے ایمان کی آزمائش ہوتی رہی ہے اور پھر دنیا و آخرت کی کامیابی اُن ہی ایمانداروں کا مقدر بن گئی ہے جو اس آزمائش میں پورے اُترے ہیں۔

(درس ۸۲) إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۝ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝ إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝

(پارہ ۴ رکوع ۷ کی آخری ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ آل عمران)

(اُس وقت کو یاد کرو) جب تم لوگ چڑھے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور تمہارے پیچھے کی جانب سے رسول تمہیں پکار رہے تھے تو اللہ نے تم کو غم کے عوض غم دیا تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اُس چیز پر جو تمہارے پاس سے چلی جائے اور نہ اُس مصیبت پر جو تم پر پڑے اور اللہ تمہارے کاموں سے خوب خبر رکھنے والا ہے۔ پھر اُس نے غم کے بعد تم پر راحت نازل

کی جو غنودگی تھی کہ اس کا تم میں سے ایک گروہ پر غلبہ ہو رہا تھا اور ایک گروہ وہ تھا جسے اپنی جانوں کی پڑی تھی جو اللہ کے بارے میں حق کے خلاف جاہلیت کے خیالات قائم کر رہا تھا، وہ لوگ کہہ رہے تھے کیا ہمارے اختیار میں کچھ بھی کام ہے؟ تم کہہ دو کہ سب کام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں ایسی بات چھپائے ہوئے ہیں جسے وہ تم پر ظاہر نہیں کرتے، وہ کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کچھ بھی اختیار ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو کہ تم اگر اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی وہ لوگ جن کے لئے قتل مقدر ہو چکا تھا اپنی قتلگاہوں کی طرف نکل ہی آتے (اور یہ باتیں اس لئے ہوئیں) کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کی اللہ آزمائش کرے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو پاک صاف کر دے اور اللہ دلوں کا حال خوب جاننے والا ہے۔ یقیناً تم لوگوں میں جنہوں نے اس روز پشت پھیری تھی جب دونوں گروہ باہم ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے تو یہ بس اس وجہ سے ہوا تھا کہ انھیں شیطان نے لغزش دیدی تھی ان کے کچھ اعمال کے سبب سے اور بیشک اللہ نے اُن کو معافی دی یقیناً اللہ بڑا مغفرت کرنے والا بڑا حلم والا ہے۔

تشریح و تفسیر:- "اِصْعَاد" کے معنی اکثر اہل لغت کے نزدیک ہموار میدانوں یا وادیوں میں دور تک چلے جانے کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں "صُعُود" کے معنی بلند جگہ کی طرف چڑھنے کے ہیں مگر بعض نے کہا ہے کہ اصعاد اور صعود میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اس میں دور تک چلے جانے کا مفہوم ہر حالت میں شامل ہے "تَلْوٗن" کا اصلی مادہ "لَوْیٌ" ہے۔ جب اس کے ساتھ "علیٰ" کا لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنی ہو جاتے ہیں، کسی کو مُڑ کر دیکھنا، اس کا انتظار کرنا یا اس کی جانب التفات کرنا یا اُس کے لئے ٹھہر جانا، مگر عام طور پر یہ نفی کی صورت ہی میں بولا جاتا ہے یعنی جہاں یہ کہا جائے کہ کسی نے مڑ کر نہ دیکھا یا کسی کی جانب التفات نہ کیا "اُخْرٰی" کا لفظ بہت سے معنی میں بولا جاتا ہے مگر یہاں اس سے مراد پیچھے کی جانب ہے "ثَوَاب" کا لفظ بری اور اچھی دونوں قسم کی جزا کے لئے بولتے ہیں مگر زیادہ شہرت اچھی جزا اور اچھے بدلہ ہی کے لئے ہے۔ اسی سے "اَثَابَکُمْ" بنایا گیا "اِثَابَہٗ" کو بھی خیر و شر دونوں کے لئے بولا جاتا ہے چنانچہ ان آیات میں بھی بری جزا یعنی سزا ہی مراد لی گئی ہے۔

غَمًّاۢ بِغَمٍّ کا مطلب ہے غم کے بدلہ میں غم۔ اس میں پہلے غم سے مراد شکست کا غم ہے جو بدلہ میں دیا گیا اُس غم کے جس کا بعد میں ذکر ہے اور وہ رسول اللہ کا غم تھا کیونکہ بعض لوگوں

سے آپ کے حکم کے خلاف عمل ظاہر ہوا تھا اور انھوں نے درہ کی حفاظت کا کام چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے آپ کو رنج پہنچا تھا "اَمَنَۃً" کے معنی تسلّی، امن، عافیت اور راحت کے ہیں "نُعَاس" غنودگی کو کہتے ہیں۔ "مَضَاجِع" "مَضْجَع" کی جمع ہے جو اصل میں زمین کی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں لیٹا جائے یعنی خوابگاہ۔ یہاں مراد قتل گاہ ہے "ذَاتُ الصُّدُوْر" سے مراد دلوں کا حال ہے "جَمْع" کا لفظ مصدر بھی آتا ہے، معنی ہوں گے ملانا، یکجا کرنا اور یہ اسم بھی آتا ہے جس کے معنی گروہ کے ہیں۔ یہاں یہی مراد ہے۔ ان دو گروہوں سے جن کا یہاں ذکر ہے مقصود مسلمانوں کا گروہ اور کافروں کا گروہ ہے جن کے درمیان جنگ اُحُد میں باہم مقابلہ ہوا تھا۔ "زَلَّۃ" کے معنی پھسلنے کے ہیں اسی سے "اِسْتِزْلَال" بنا ہے۔ معنی ہوں گے پھسلانا یا کسی کے پھسل جانے کی خواہش کرنا۔

ان آیات میں بھی جنگ اُحُد ہی کے واقعات کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے کہ وہ وقت بھی بھولنے کے قابل نہیں ہے جب لشکر اسلام میں شکست کی وجہ سے افراتفری تھی اور مسلمان سپاہی اپنی جانوں کو بچانے کے لیے میدانوں، نشیبوں اور پہاڑ کی بلندیوں پر چلے جا رہے تھے ظاہر ہے کہ جب کسی لشکر کو شکست ہوتی ہے تو پھر اس کی صفوں میں نظم و ضبط باقی نہیں رہتا۔ یہی عالم اُس وقت تھا جب اُحُد میں تیر انداز اسلامی دستہ کی ذرا سی مگر انتہائی سنگین غلطی کی وجہ سے شکست ہوئی تھی اور کفار مکہ کے چالاک کمانڈروں نے بڑی پھرتی سے عقب کی طرف سے حملہ کر کے لشکر اسلام کو بدحواس کر دیا تھا اور پھر وہی ہوا جو عام طور پر ایسے شدید اور ہولناک موقع پر ہوا کرتا ہے یعنی کسی کو کسی کی خبر نہ رہی اور اس پر اضافہ یہ ہوا کہ ابن قمئہ نے مصعبؓ بن عُمیر کو شہید کر کے یہ مشہور کر دیا کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم شہید ہو گئے مصعبؓ آنحضرت کے سامنے علم لیے ہوئے تھے اور حضورؐ کی حفاظت کر رہے تھے۔ شکل میں کچھ سرورِ کائنات سے مشابہت بھی رکھتے تھے۔ عبد اللہ یا عمرو بن قمئہ نے ہو سکتا ہے کہ جنگ کے ہنگامہ میں یہی سمجھا ہو کہ اس نے حضورؐ ہی کو شہید کیا ہے کیونکہ وہ اسی ارادے سے آیا تھا۔ بعض سیرت نگاروں نے اس افواہ کی نسبت دوسروں کی طرف دی ہے۔ غرض اس ہولناک شکست کے بعد شہادتِ رسولؐ کی افواہ نے آگ کے شعلوں پر تیل کا کام کیا اور لشکر اسلام کے جو کچھ ہوش و حواس باقی تھے وہ بھی ختم ہو گئے۔ اس افراتفری میں نوبت یہاں تک پہنچی کہ سرورِ کائنات نے خود

بھی اپنی زبانِ مبارک سے مسلمانوں کو پکارا اگر موت اور خون کے اس طوفان میں لشکرِ اسلام کے سپاہی دور سے آپ کی آواز بھی شناخت نہ کر سکے۔ اسی مصیبت اور ہنگامے کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ تمہیں غم کے عوض میں غم دیا گیا۔ تم نے درّہ کی حفاظت چھوڑ کے رسول کو رنجیدہ کیا تھا اس لیے تمہیں شکست کا غم ملا مگر اس شکست میں بھی تمہارا امتحان تھا اور اس شکست سے تمہارے ولولۂ جہاد کو ایک نئی زندگی مل گئی اور اس کا سبق مل گیا کہ آئندہ کبھی تم اپنے بڑے سے بڑے جانی و مالی نقصان پر رنجیدہ، دل شکستہ اور مایوس نہ ہوا کرو۔ اور کسی حال میں بھی اپنے فرائض سے غفلت نہ کرو۔ ان دونوں غموں کی تشریح میں مفسرین نے اور گوشے بھی بیان کیے ہیں۔ اس ذکر کے بعد اس کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ عین اُس وقت جب لڑائی شباب پر تھی جو سچے ایماندار تھے اُن پر اللہ کی طرف سے نیند کو غالب کر دیا گیا تھا تاکہ ان کے دلوں سے خوف دور ہو جائے اور وہ تازہ دم ہو جائیں منافقوں کو اپنی جانوں کی پڑی ہوئی تھی اور انھیں یہ سکونِ نفس نصیب نہ تھا بلکہ وہ اللہ اور رسول کے خلاف کفر و جاہلیت کے اعتقادات کی تبلیغ کر رہے تھے اور ہر طرف گمراہی پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ لوگ عبداللہ بن اُبَیّ بن سلول مشہور منافق کے گروہ کے تھے جن کا کام ہی یہ تھا کہ اسلام اور رسول اسلام اور مسلمانوں کے خلاف طرح طرح کی افواہیں پھیلاتے رہیں۔

٥ اس شکست پر مسلمانوں کا مذاق اڑا رہے تھے اور کہتے تھے کہ ہمارا تو کچھ اختیار ہی نہ تھا ورنہ ہم مدینہ سے باہر ہرگز جنگ نہ ہونے دیتے بلکہ شہر کے اندر ہی رہ کر لڑتے۔ محمد (صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم) نے ہمارا کہنا نہ مانا اس لیے انھیں یہ شکست اٹھانا پڑی۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ موت اور اس کی نوعیت اور جگہ مقدر ہوتی ہے اس لیے انسان کو اُسی جگہ مرنا ہوگا جسے اللہ نے اُس کے لیے مقرر فرما دیا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس شکست سے مسلمانوں کا پوری طرح امتحان بھی ہو گیا کہ کس کا ایمان کس حد پر ہے اور جو بھید دلوں کے اندر چھپا ہوا تھا وہ سب کے سامنے آگیا پھر بھی یہ جو کچھ ہوا وہ محض اس وجہ سے کہ اللہ اور رسول کے حکم کی خلاف ورزی کی گئی تھی ورنہ یہ نتیجہ ہرگز نہ ہوتا اور اگر یہ جنگ مدینہ کے اندر رہ کر بھی لڑی جاتی اور احکام رسول کی خلاف ورزی ہوتی تب بھی نتیجہ یہی ہوتا بلکہ اس سے بدرجہا بدتر اور خوفناک تر نتائج سامنے آتے اور شہر مدینہ اس طرح تباہ ہو جاتا اور عورتوں اور بچوں پر بھی وہ

آفت آتی جس کا اندازہ ممکن نہ ہو سکتا۔

مختصر یہ ہے کہ ہمیں شکستیں اور مصیبتیں انسان کے عزم و ہمت کے لیے کسوٹی ہوا کرتی ہیں اور فتح و کامیابی ان ہی لوگوں کی قسمت کا نوشتہ ہے جو اپنے کردار اور ایمان اور سچائی کی بنا پر نصرت خداوندی کے حقدار ہوتے ہیں۔

جنگ اُحد اسلامی تاریخ میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور ان آیات میں اسی عظیم جنگ کا اور اس کے نتائج کا بار بار ذکر کیا گیا ہے اور ابھی یہ سلسلہ جاری ہے۔

(درس ۳) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ○ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ○ وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ○

(پارہ ۴ رکوع ۸ کی ابتدائی ۳ آیات کریمہ۔ سورۂ آل عمران)

اے ایمان والو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کفر اختیار کیا ہے اور اپنے بھائیوں کے متعلق کہتے ہیں جب کہ وہ لوگ زمین پر سفر کریں یا کہیں جہاد میں ہوں کہ اگر یہ لوگ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ انھیں قتل کیا جاتا تاکہ اللہ اس خیال کو ان کے دلوں میں حسرت کا سبب بنا دے اور اللہ ہی زندگی عطا کرتا ہے اور موت دیتا ہے اور جو کچھ بھی تم عمل کرتے ہو اللہ اس کو خوب دیکھتا رہتا ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کیے جاؤ یا اپنی موت مر جاؤ تو اللہ کی بخشش اور رحمت اُس سے کہیں بہتر ہے جس کو یہ لوگ جمع کرتے رہتے ہیں اور چاہے تم لوگ خود اپنی موت مر جاؤ یا قتل کر دیئے جاؤ یقیناً تم سب اللہ ہی کے پاس جمع کیے جاؤ گے۔

تشریح و تفسیر: "إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ" میں ضربوا کا مصدر "ضرب" ہے۔ اس لفظ کو بہت سے معنوں میں بولتے ہیں۔ ان میں سے ایک مشہور معنی مارنے کے ہیں مگر جب اس کے ساتھ "فی الارض" کہیئے تو اس کے معنی زمین پر سفر کرنے کے ہو جاتے ہیں خواہ یہ سفر جہاد کی غرض سے ہو یا تجارت وغیرہ کے لیے ہو۔ "غُزًّى" "غازی" کی جمع ہے اور اسے "غزو" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی مطلق قصد و ارادہ کے بھی ہیں اور دشمن سے جنگ کے لیے نکلنے

کے بھی ہیں "غَزْوَۃ" واحد ہے "غَزَوَات" اسکی جمع ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک دوسرا لفظ
بھی بولا جاتا ہے یعنی "سَرِیَّۃ" جس سے مراد ایسی چھوٹی جنگی جماعت ہوتی ہے جس کی تعداد
کم از کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ چار سو جنگی افراد پر مشتمل ہو۔ اسے کسی بڑی لشکر کشی کے
قبل خفیہ طور پر جنگی مقاصد کے تحت دشمن کی طرف روانہ کرتے ہیں۔ سنہ ۲ھ میں سرور کائنات
صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پہلی مرتبہ جہاد کا الٰہی حکم ملا تھا پھر سنہ ۹ھ تک یہ سلسلہ جاری رہا
اور چھوٹی بڑی جنگی کارروائیاں اور لڑائیاں ہوتی رہیں اس طرح آٹھ سال کے مختصر زمانہ میں
جو حربی واقعات رونما ہوئے وہ علامہ ابن قیم کی تحریر کے مطابق نواسی تھے۔ اس قدر کم عرصہ میں
دشمنوں سے اتنے جنگی مقابلوں کی کوئی دوسری مثال دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں نہیں
پائی جاتی۔ یہاں ہمیں کبھی اس بات کو نہ بھولنا چاہئے کہ ان سب کارروائیوں میں سرور
کائنات کی طرف سے کسی جارحانہ جنگی اقدام کا کوئی ثبوت کبھی نہیں پایا گیا بلکہ یہ سب حربی
اقدامات ہمیشہ دفاعی نقطۂ نظر ہی سے کیے جاتے رہے۔ دوسری قوموں کو اگر کبھی ایک
دو ہی جنگیں لڑنا پڑی ہیں تو برسوں وہ اپنا سر اٹھانے کے قابل نہ رہ سکیں اور اپنے خسارے
پورے نہ کر سکیں مگر رسول اسلام کی قیادت عظمیٰ کا یہ ایک عظیم معجزہ تھا کہ اس قدر زبردست
اور مسلسل جنگی مشغولیت کے باوجود جس سے ایک روز کی بھی فرصت ملنا مشکل تھی اور پھر اس کے
نتیجہ میں ہولناک اقتصادی کشمکش کا بھی سامنا رہتا تھا اور باہر سے کسی قسم کی بھی امداد
حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔ پھر اسی کے ساتھ آپ نے عالم انسانیت کے لیے
ایک ایسا مکمل قانون اور نظام زندگی بھی پیش کر دیا اور ایک ایسا الٰہی دستورِ حیات عطا
کیا جو بنی نوع انسان کے لیے منشاء خداوندی کا ترجمان اور علمی، اخلاقی، روحانی، اقتصادی
معاشی، تمدنی، اصلاحی، دفاعی و حربی، انفرادی اور اجتماعی ہر حیثیت سے ہمیشہ کیلئے حرف آخر
ہے اور جس نے انسانی فکر و ضمیر کے دھارے کو ایک ایسے تعمیری اور صحیح رخ کی طرف پھیر دیا جس
میں اس کی فلاح و نجات کی پوری ضمانت موجود ہے۔

"حَسْرَۃٌ" کے معنی غم اور افسوس کے ہیں اور جو چیز ہاتھ سے نکل جائے اس پر پشیمانی اور
ندامت کے لیے بھی بولتے ہیں "مُتُّمْ" موت سے بنا ہے اس کو اکثر قاریوں نے میم پر زیر
کے ساتھ پڑھا ہے جس طرح قرآن میں دوسری جگہوں پر میم پر زیر ہی کے ساتھ ہے مگر حفص
بن سلیمان نے صرف اس جگہ پر میم پر پیش کے ساتھ پڑھا ہے اور دوسرے مقامات پر

زیر کے ساتھ اور حفص ہی کی قرآءت کی زیادہ شہرت ہے اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ
قرآن کریم کی قرآءت کی بنیاد سماع پر ہے قیاس پر نہیں ہے۔ یعنی جس طرح خود حضورؐ سے اور
آپ کے اہلبیت اطہار علیہم السلام اور صحابۂ کرام رضؓ سے پڑھتے ہوئے سنا گیا ہے اُسی پر
آجتک عمل ہے۔ نحوی اور صرفی قیاس آرائیوں سے اس میں کام نہیں لیا گیا ہے۔ ان آیات
میں لفظ "کفر" سے مراد "نفاق" ہے اور کافروں سے مراد منافقین ہیں۔ مقصود یہ ہے
کہ جب مسلمان کسی دینی غرض سے سفر کرتے تھے اور وہاں اتفاق سے وفات پا جاتے تھے یا کسی جہاد
کے موقع پر شہید ہو جاتے تھے تو منافق لوگ کہنے لگتے تھے کہ اگر ہمارے یہ قومی یا نسبی بھائی
اپنے گھروں سے باہر نہ جاتے تو کبھی انھیں اس طرح موت نہ آتی۔ انھوں نے محمدؐ کی پیروی
کی اور اُن کے کہنے میں آ گئے اور گھر سے نکل پڑے اس لیئے یہ نتیجہ ان کو بھگتنا پڑا۔ یہاں پر
"بھائی" کا لفظ محض اس وجہ سے بولا گیا ہے کہ وہ سب کے سب عرب قوم اور عرب قبائل ہی
سے تعلق رکھتے تھے یا ایک دوسرے سے نسبی اور خاندانی رابطے رکھتے تھے۔ یہاں نفاق
کے لیئے "کفر" کا لفظ بولنا اس بات کا ثبوت ہے کہ درحقیقت ایمان و اسلام وہی ہے
جس میں قلبی تصدیق بھی موجود ہو اور جس کا دل منکر اسلام ہو اور صرف زبان سے وہ لوگوں
کو دھوکا دینے کے لیئے اسلام کا اظہار کرے اُس کا شمار حقیقت میں کافروں ہی کے ساتھ
ہوگا چاہے ظاہر میں اُس پر احکام اسلام جاری ہو جائیں۔ منافقوں کی ان باتوں اور
قیاس آرائیوں کو بیان کر کے اہل ایمان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ان لوگوں کی طرح اپنے دلوں
میں ایسے گمراہ کن اور شیطانی خیالات پیدا نہ ہونے دینا تاکہ ہمیشہ ان منافقوں کے دلوں
میں اس حسرت و افسوس کی آگ بھڑکتی ہی رہے اور آخر میں یہ اسی آگ میں جل کر خود ہی ختم
ہو جائیں۔ یہ بات پوری طرح یاد رکھو کہ موت اور زندگی صرف اللہ کے اختیار میں ہے اور موت
کے لیئے جو جگہ اور وقت مقرر ہے وہ کبھی ٹل نہیں سکتا۔ کتنے ہی ایسے واقعات دنیا میں گذر چکے
ہیں کہ لوگ انتہائی خوں ریز اور ہولناک لڑائیوں میں بڑے بڑے خطروں میں گھر جانے کے
بعد اور زخموں سے نڈھال ہو جانے کے بعد بھی بچ گئے اور جب موت آئی تو اپنے گھر میں بستر
پر اس لیئے ایک سچے مسلمان کو قیاس آرائیوں سے ہرگز کام نہ لینا چاہیئے بلکہ ہر وقت
مشیّت الٰہی پر راضی رہنا چاہیئے کیونکہ ڈرنے سے اُسے کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا اور اُس کی
کوئی تدبیر بھی موت کو اُس کے اصلی وقت سے ٹال نہ سکے گی اس کا یہ مطلب نہ سمجھنا چاہیئے

کہ مریض اپنے مرض کو دور کرنے کے لیئے علاج ہی نہ کرے یا کوئی شخص خطرہ سے بچاؤ کی تدبیر ہی نہ کرے۔ یہ تو لازمی طور پر کرنا چاہیئے۔ شریعت کا بھی یہی حکم ہے اور عقل کا بھی یہی تقاضا ہے مگر مراد یہ ہے کہ مرنے کا خوف دل سے نکال دو اور یہ خیال کرو کہ حکم خداوندی کی تعمیل میں اگر ہم میدان جنگ میں جائیں گے تو ضرور مارے جائیں گے لہٰذا گھر میں بیٹھے رہیں۔ جہاں تک اپنے تحفظ کا تعلق ہے وہ میدان جنگ میں بھی کیا ہی جاتا ہے اور کوئی عقلمند اپنے بچاؤ کی تدبیر کیئے بغیر جنگ کی آگ میں نہیں پھاند پڑتا مگر یہ سمجھ لینا کہ جنگ میں شمولیت لازمی طور پر موت کا سبب بن ہی جائیگی قطعاً غلط ہے۔ خود سرورِ کائنات اور آپ کے اہلبیتؑ و اصحابؓ میں کثیر تعداد ایسے بہادر افراد کی ہے جن کی پوری عمریں میدان جنگ کے برستے ہوئے خون اور کڑکتی ہوئی کمانوں میں گذر گئیں اور اُن کا بچپنا، جوانی اور بڑھاپا تلواروں کی جھنکار ہی میں بسر ہوا مگر جب موت آئی تو اپنے بستر پر آئی۔ غرض یہ بتایا جا رہا ہے کہ ایک سچا ایماندار اور پکا مسلمان وہ ہے جس کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کی مشیت اور حکم کا تابع رہے، اس کی نصرت و مدد پر بھروسا رکھے کبھی اپنے دل میں کافروں اور منافقوں کی طرح شک و شبہ کو اور بزدلانہ خیالات کو آنے کا موقع نہ دے اور اس پر یقین رکھے کہ تحفظ اختیار کرنا تو بہرحال ضروری ہے مگر موت کسی نہ کسی وقت ضرور آکے رہے گی اور ہزار تحفظ اور بچاؤ کی تدبیروں کے بعد بھی نصرت اگر ملتی ہے تو صرف اللہ ہی کی بارگاہ سے ملتی ہے اگر اُس کی مدد نہ ہو تو ہر تدبیر بیکار ہے اور ہر بچاؤ لاحاصل ہے اس لیئے ہمیشہ اُسی کی ذات سے دل کا لگاؤ رکھنا چاہیئے اور اُسی کی بارگاہ میں فتح و نصرت کے لیئے دست بدعا رہنا چاہیئے۔ اور یہ بھی یقین رکھنا چاہیئے کہ اگر میدان جنگ میں دین الٰہی کی حمایت کرتے ہوئے کوئی مسلمان قتل بھی ہو گیا تو اُس کی یہ موت اُن لاکھوں موتوں سے افضل اور بہتر ہو گی جو بستر پر آئیں۔ خدا کی راہ میں مردِ مومن کا قتل ہو جانا شہادت اور ابدی زندگی ہے اور اُس کی رگ گردن سے بہنے والا ہر قطرہ اس دنیا جیسی لاکھوں دنیاؤں کی مجموعی دولت و ثروت اور عیش و لذت سے بہت زیادہ قیمتی ہے۔

(درس ۸۴) فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ

الْمُتَوَكِّلِيْنَ ○ اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهٖ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ؕ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ○ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ○

(پارہ ۴، رکوع ۸ کی درمیانی ۵ آیات کریمہ - سورۂ آل عمران)

پس یہ بات اللہ کی رحمت ہی کی وجہ سے ہے کہ تم اُن کے ساتھ نرم رہے اور اگر تم تند خو اور سخت دل ہوتے تو وہ تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے تو تم انھیں معاف کر دو اور اُن کے لیے استغفار کرو اور اُن سے امور میں مشورہ کر لیا کرو، مگر جب پکا ارادہ کر لو تو پھر اللہ پر بھروسا رکھو۔ بیشک اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس پر توکل رکھتے ہیں اگر اللہ تمہاری نصرت کرے تو پھر تم پر کوئی بھی غالب نہیں آ سکتا اور اگر وہی تمہیں چھوڑ دے تو پھر کون ایسا ہے جو اُس کے بعد تمہاری نصرت کرے گا اور چاہیے کہ اہل ایمان صرف اللہ ہی ذات پر بھروسا رکھیں اور کسی نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ خیانت کا ارتکاب کرے اور جو شخص بھی خیانت کرے گا وہ قیامت کے دن اُس چیز کو حاضر کرے گا جس کی اُس نے خیانت کی تھی پھر ہر شخص کو اُس کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ اور اُن پر قطعاً ظلم نہیں کیا جائے گا کیا جو شخص اللہ کی رضا کا تابع ہے اُس شخص جیسا ہو جائے گا جو اللہ کے غضب کا مستحق بن گیا اور اُس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بری جگہ ہے۔ اللہ کے یہاں اُن لوگوں کے مختلف درجے ہیں اور جو کچھ بھی وہ کرتے رہتے ہیں اللہ اُس کو خوب دیکھنے والا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ "لِنْتَ" "لِین" سے بنا ہے جس کے معنی نرمی کے ہیں اصل میں اس کو جسمانی نرمی کے لیے بولتے ہیں مگر کبھی اس سے اخلاق اور طبیعت کی نرمی بھی مراد لیتے ہیں یہاں یہی مراد ہے "فَظّ" بدمزاج اور تند خو کو کہتے ہیں "غَلِیْظ" "غِلْظَة" سے بنایا گیا ہے اس کے معنی موٹاپے، گاڑھاپن، سختی اور شدت سب ہی کے آتے ہیں۔ مگر جب "غَلِیْظُ الْقَلْب" کہا جائے جس طرح یہاں کہا گیا ہے تو اس کے معنی سخت دل کے ہوں گے

"فَضٌّ" کے معنی کسی چیز کو توڑ کر ریزہ ریزہ کرنے کے ہیں اور "اِنفِضَاض" ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جانے اور منتشر ہو جانے کو کہتے ہیں "اِنفَضُّوا" اسی سے بنا ہے یعنی وہ متفرق اور منتشر ہو گئے ہوتے۔ "حَوْل" کے معنی بہت سے آتے ہیں مثلاً سال بھر یا کسی چیز کا حائل ہو جانا نیز طاقت و قوت یا تبدیلی اور ماحول کو کہتے ہیں۔ ماحول سے مراد وہ اطراف اور جہتیں ہیں جن میں کوئی انسان یا کوئی اور چیز گھری ہوئی ہو۔ یہاں یہی آخری معنی یعنی ماحول مراد ہے۔

"یَغُلُّ" اور "یُغَلُّ" "غُلُوْل" سے بنا ہے اس کے معنی خیانت کرنے کے ہیں جبکہ اسی مادہ سے "غُلٌّ" پیاس یا لوہے کے طوق کے لیے بولتے ہیں اور اسی کو اگر "غِلٌّ" پڑھا جائے تو اس کے معنی باطنی دشمنی اور کینہ پروری کے ہو جاتے ہیں۔ "تَوَفّٰی" کا مصدر "تَوْفِیَة" ہے معنی ہیں بلا کسی کمی کے پورا پورا دیدینا "رِضْوَان" عظیم خوشنودی کو کہتے ہیں۔ "سُخْطٌ" "سُخُطٌ" اور "سَخَطٌ" تینوں طرح سے اس لفظ کو بولتے ہیں، اس مقام پر اس کا تلفظ "سَخَط" ہے۔ معنی ہیں غضب، ناخوشی اور ناراضی۔

"فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ" سے شروع ہونے والی ابتدائی آیت جنگ احد سے متعلق ہے اور مراد یہ ہے کہ عین لڑائی کے موقع پر عقب کے محاذ سے تیر اندازوں کی جماعت کے کثیر افراد کا ہٹ جانا اور اس کو دشمن کے حملہ کے لیے غیر محفوظ کر دینا ایسی سنگین غلطی تھی جس پر ایسے افراد کو جنگی اور فوجی قوانین کے تحت حضور انور جو چاہتے سزا دیتے مگر رحمت خداوندی کے سبب سے آپ کا قلب اقدس ان کے لیے نرم رہا اور آپ نے ان سے کوئی مواخذہ نہ کیا میدان جنگ میں فوج کے ایک ایک فرد کی شدید ذمہ داریاں ہوا کرتی ہیں اور کسی ایک فرد کی معمولی سی غلطی سے فوجیں اور پھر ملک تباہ و برباد ہو سکتے ہیں احد میں بھی یہی ہوا تھا کہ مشرکوں کی ابتدائی شکست کے بعد یہ سمجھ کر کہ اب دشمن میدان چھوڑ چکا ہے اور کوئی خطرہ موجود نہیں ہے سرور کائنات کے اس حکم کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا گیا کہ تم شکست و فتح کسی حالت میں بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹنا اور دستہ کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر کے شدید اصرار کے باوجود تقریباً پچاس میں سے اڑتیس یا چالیس سپاہیوں نے درہ کی حفاظت کا کام چھوڑ دیا اور لوٹ میں شریک ہو گئے جس کے نتیجہ میں عقبی سمت سے دشمن نے اچانک تباہ کن حملہ کر دیا اور سامنے سے بھاگی ہوئی مشرک فوج بھی پلٹ آئی اور بالآخر مسلمانوں کو زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا مگر اس نتیجہ کے باوجود عام فوجی

کمانڈروں کی طرح نہیں بلکہ ایک مصلحِ عالم اور معلمِ اخلاق اور ہادیِ انسانیت رسول کی حیثیت سے رسولِ اسلام نے ان غلطی کرنے والوں پر کوئی سختی نہ کی اور حالات کا اس طرح مقابلہ کیا کہ جیسے کوئی بات ہی نہیں ہوئی تھی اور ہر شخص سے محبت او نرمی کے ساتھ پیش آتے رہے۔ اس ارشادِ خداوندی سے سرورِ کائنات کی سیرتِ طیبہ کا ایک عظیم اور انتہائی روشن پہلو بھی سامنے آجاتا ہے اور وہ یہ کہ آپ انتہائی رحم دل تھے اور قصور کرنے والوں سے انتقام لینے کے بجائے اُن سے درگزر کرتے تھے۔ اگر کسی مسلمان کو کوئی تکلیف ہوتی تھی تو اس کی تکلیف کو آپ خود اپنی ہی تکلیف سمجھتے تھے۔ آپ نہ تو سخت دل تھے اور نہ سخت زبان تھے بلکہ حسنِ اخلاق اور ہمدردی و محبت کا ایک ایسا مجسمہ تھے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کا سخت ترین دشمن بھی اگر کبھی آپ کی خدمت میں چند منٹ کیلئے بھی حاضر ہو جاتا تھا تو آپ کی عقیدت سے سرشار اور آپ کا کلمہ گو بن کر اٹھتا تھا۔ اللہ کا حضورؐ کو حکم تھا کہ مسلمانوں سے اگر کچھ غلطیاں سرزد ہو جائیں تو ان کے لیے استغفار کرو اور انھیں معاف کردو۔ اور اُن سے نجی امور میں مشورہ بھی کیا کرو۔ یہ معلوم ہے کہ خاتم المرسلینؐ مقام "ما ینطق عن الھویٰ" پر فائز تھے اور عالمِ علمِ لدنی اور صاحبِ وحی ہونے کی حیثیت سے کسی انسان سے بھی مشورہ کے محتاج نہ تھے مگر اس کے باوجود مشورہ کرنے کا حکم دیا گیا اور آپ نے بارہا اصحابِ کرامؓ سے مشورہ فرمایا۔ یہ محض اس لیے کہ لوگوں کی اس سے ہمت افزائی ہو اور تمام مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کی عادت پڑے۔ پھر حکم ہوتا ہے کہ جب تم کسی بات کا پختہ ارادہ کر لو تو اس پر عمل کرنے میں تذبذب، تردد اور بزدلی اور کم ہمتی کو اپنے قریب نہ آنے دو اور پورے عزمِ محکم کے ساتھ اس کام کو انجام دو اور اللہ پر کامل بھروسا رکھو کیونکہ وہ توکل اور بھروسا رکھنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ اللہ جس کی نصرت فرماتا ہے اس پر کوئی غالب نہیں آسکتا اور جو بدنصیب اس کی نصرت سے محروم ہو جائے پھر کائنات بھر میں کوئی بھی اس کی مدد کرنے والا نہ ہوگا۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ نبی کی شان اس بات سے بلند و برتر ہوتی ہے کہ وہ کسی امر میں بھی خیانت سے کام لے خواہ وہ مالِ غنیمت کی تقسیم ہو یا کسی اور مال کی تقسیم ہو یا کسی قسم کی بھی امانت کی حفاظت اور اس کی ادائیگی کا کام ہو۔ اس سلسلہ میں مفسرین نے منافقوں اور یہودیوں کی بعض گستاخیوں کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے حضورؐ

کی شان میں کی تھیں انھیں لغو باتوں کا اس مقام پر اس ارشادِ گرامی سے جواب دیا
گیا ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ خیانت جو شخص بھی کرے گا اسے قیامت کے دن اللہ کے حضور
میں اس چیز کو لانا پڑے گا جس کی اس نے دنیا میں خیانت کی تھی چاہے وہ چھوٹی سے
چھوٹی ہو یا بڑی سے بڑی ہو۔ حدیث میں ہے کہ حکامِ سلطنت جو لوگوں سے تحفے قبول کرتے
ہیں وہ بھی خیانت کے حکم میں داخل ہیں اور آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ جس شخص کی زندگی
رضائے خداوندی کے مطابق بسر ہو رہی ہو وہ کبھی اُس کے برابر نہیں ہو سکتا جو اپنی
بداعمالی کی وجہ سے غضبِ الٰہی کا مستحق بن چکا ہو۔ نیک عمل اور بدعمل لوگوں کے درجے
الگ الگ ہوتے ہیں ایک جنت کا حقدار ہے اور دوسرا جہنم کا سزاوار ہوگا اور اللہ ان
دونوں کے اعمال اور ظاہر و باطن سے اچھی طرح واقف ہے۔

(درس ۸۵)

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَ
اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ○ اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ
مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ
هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ وَمَآ
اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ○
وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ
اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ
وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ○ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ
وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○

(پارہ ۴ رکوع ۸ کی درمیانی ۵ آیاتِ کریمہ۔ سورۂ آل عمران)

یقیناً اللہ نے اہلِ ایمان پر بڑا احسان کیا کہ ان میں خود ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا
جو انھیں اُس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور انھیں پاک صاف کرتا ہے اور کتاب و
حکمت کی ان کو تعلیم دیتا ہے اگرچہ وہ لوگ اس سے قبل کھلی ہوئی گمراہی میں تھے اور

جب کبھی تم کو ایسی مصیبت اٹھانا پڑی جس سے دوگنی مصیبت تم (اپنے مدِّ مقابل دشمنوں پر)
ڈال چکے تھے تو تم کہنے لگے کہ یہ مصیبت کہاں سے آگئی (اے رسولؐ) کہدو کہ یہ تو خود تمہاری
ہی طرف سے ہے بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔ اور جو مصیبت تم پر اُس روز
پڑی تھی جب دو فوجوں میں مڈبھیڑ ہوئی تھی تو یہ اللہ کے اذن سے ہوئی اور اس لیے کہ اللہ
ایمان والوں کو جان لے اور منافقت کرنے والوں کو بھی جان لے۔ اور ان لوگوں سے کہا
گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جہاد کرو یا دشمن کو دفع کرو تو وہ کہنے لگے کہ اگر ہم کوئی واقعی لڑائی
دیکھتے تو ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ وہ اس روز بہ نسبت ایمان کے کفر سے بہت قریب تھے
وہ اپنے منہ سے ایسی باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں۔ اور جو کچھ وہ چھپائے
رہتے ہیں اللہ اُس کو خوب جانتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے ہی رہے (اور) اپنے
بھائیوں کے لیے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارا کہنا مانتے تو قتل نہ کیے جاتے۔ تم ان کے جواب میں
کہدو کہ اچھا اگر تم سچے ہو تو اپنی جانوں سے موت کو ہٹا دینا۔

تشریح و تفسیر:۔ "مَنَّ" ماضی کا صیغہ ہے اور "مِنَّۃ" سے بنا ہے جس کے معنی خود احسان
اور احسان کرنے کے ہیں۔ یہ احسان دو طرح سے ظاہر کیا جاتا ہے ایک عمل کے ذریعہ سے اور دوسرے
قول کے ذریعہ سے مگر قول اور زبان سے احسان جتلانا معیوب ہے جب تک کوئی دوسرا کفرانِ نعمت نہ
کرے "یَتْلُوْا" تلاوۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اللہ کی طرف سے نازل ہونے والی کتاب
کو اس اعتقاد سے پڑھنا کہ اس کے مضامین پر ایمان اور اس کے احکام پر عمل کرنا ضروری
ہے کسی عام کتاب کے پڑھنے کو تلاوت نہیں کہتے۔ "یُزَکِّیْھِمْ" کا مصدر تو "تَزْکِیَۃ" ہے
مگر یہ "زکوٰۃ" سے بنایا گیا ہے جس کے دو معنی ہیں ایک نمو اور بڑھنا دوسرے پاکیزگی۔ شرعی
"زکوٰۃ" کو بھی اسی وجہ سے اس نام سے پکارا جاتا ہے کہ اس میں یہ دونوں باتیں پائی جاتی
ہیں یعنی زکوٰۃ نکالنے سے نفس اور مال کی تطہیر ہو جاتی ہے اور مال میں برکت اور زیادتی بھی
حاصل ہوتی ہے۔ یہاں "تَزْکِیَۃ" سے مراد نفس کی تطہیر اور کردار کی اصلاح ہے "حِکْمَۃ"
کے معنی عدل و علم و عقل اور فلسفہ کے ہیں۔ یہاں مراد علم و عقل کے ذریعہ سے اصل
حقیقت دریافت کر لینا ہے۔ حکمت الٰہیہ سے کائنات کی چیزوں کا صحیح علم اور اُس علم کے
مطابق اُن کی تخلیق مراد ہوتی ہے اور انسانی حکمت سے دانائی اور نیکیوں پر عمل کرنے کے
لیے اُن کی معرفت مقصود ہوتی ہے۔ قرآن کو حکیم اس معنی میں کہا جاتا ہے کہ وہ دانائی اور

عقل کی باتوں پر مشتمل ہے "تعال" امر یعنی حکم یا طلب کے معنی میں آتا ہے اور کسی کو بلانا مقصود ہوتا ہے۔ اس کا اصلی مادہ "ع ل د" ہے یہاں پر امی کی جمع "تعالوا" بولی گئی ہے "درء" کے معنی دور کرنے اور دفع کرنے کے ہیں اسی سے "فادرؤا" بنایا گیا ہے۔

ان آیات کریمہ میں اللہ نے اپنے اس احسان عظیم کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اس نے انسان کی ہدایت کے لیے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مبعوث کیا مگر صرف مومنین کے ذکر کی خصوصیت اس وجہ سے ہے کہ آپ کی ہدایت اور بعثت سے فائدہ اٹھانے والے وہی لوگ ہوتے ہیں جو ایمان لے آتے ہیں اور جو لوگ ہدایت کے اس سورج کی روشنی سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتے اور اپنے کفر و گمراہی پر جمے رہتے ہیں وہ قابل ذکر نہیں ہیں۔ "من انفسھم" سے مراد یہی لوگ ہیں جو ایمان لے آئے اور جو نسل ابراہیمی اور ذریت خلیلی سے تعلق رکھتے ہیں جن کا پہلے پارے کے پندرھویں رکوع میں حضرت ابراہیم اور حضرت اسمعیل علیہما السلام کی دعا کے تذکرہ میں پوری وضاحت کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور پھر اس دعا کے آخری حصہ کا ان لفظوں میں ذکر ہے۔ "رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ط إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ o" یعنی اے ہمارے پروردگار ہماری ذریت ہی سلسلہ میں سے ایک رسول اُن ہی میں کا مبعوث فرما جو ان کے لیے تیری آیتوں کی تلاوت کرے اور انھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کے نفسوں کو پاک صاف کرے بیشک تو ہی بڑا زبردست بڑی حکمت والا ہے۔ اور اسی دعائے ابراہیمی کا ذکر کرتے ہوئے حضور انور فرمایا کرتے تھے جسے تمام محدثین اسلام نے لکھا ہے کہ "اَنَا دعوۃُ اَبِی اِبْرَاهِیْمَ وَبُشْرٰی عِیْسٰی وَرُؤْیَا اُمِّیْ" میں اپنے باپ حضرت ابراہیمؑ کی دعا، حضرت عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی والدۂ گرامی کا خواب ہوں یہ اس خواب کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت آمنہؓ نے سوتے میں یہ دیکھا کہ مجھ سے ایک سورج طالع ہو رہا ہے۔ غرض یہاں "مومنین" کے لفظ سے مراد حضورؐ کی وہ قوم ہے جو ذریت ابراہیمی پر مشتمل تھی اور ابتدائی تبلیغ کا رخ بھی اُن ہی کی طرف تھا کیونکہ اپنی خاص قوم اور اپنے کنبے کے لوگ انسان کی سرشت، خفیہ عادتوں اور کردار سے پوری طرح باخبر ہوتے ہیں اور جب گھر والے اور خاندان کے لوگ کسی کی بلند کرداری کی تصدیق کر دیں تو وہ اس شخص کے لیے

ایک بہت بڑی سند کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وہ احساس و تاثر کا فطری تقاضا تھا کہ سرورِ کائنات کو سب سے پیشتر اپنے خاندان والوں کی تعلیم و اصلاح کا حکم ہوا کہ تم اپنے قریبی رشتہ داروں تک اپنی دعوت کو پہنچاؤ (شعراء) پھر مکہ اور اس کے گرد و پیش کی تبلیغ کا حکم دیا گیا (شوریٰ و انعام) پھر یہ بتایا گیا کہ اپنے رسول کو تو ہم نے ساری بنی نوع انسان کی طرف بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے (سبا) اور آخر میں اس کا اعلان کر دیا گیا کہ رسالت محمدی تو تمام کائنات پر محیط ہے اور عالمین کی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کی طرف خاتم المرسلین کو مبعوث نہ کیا گیا ہو۔ "تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا" وہ ذات مبارک ہے جس نے اپنے بندہ محمدؐ پر قرآن کو اتارا تاکہ وہ تمام عالموں کو اللہ کے عذاب سے ڈرائیں (فرقان) اور سورۂ انبیا میں ان لفظوں کے ساتھ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (اے محمدؐ ہم نے تم کو تمام جہان کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اس عظیم احسان کا ذکر فرما کر کہ ہم نے انسانوں کی ہدایت کے لیے ایسا بلند ترین ذریعہ مقرر کیا اور ایسا کامل رسولؐ بھیجا پھر آپ کی خاص صفتوں کا ذکر کیا ہے یعنی تلاوت آیاتِ الٰہی، تطہیر نفوسِ بشر اور تعلیم کتاب و حکمت یہی وہ بنیادی باتیں ہیں جن کے اندر نوع بشر کی ہر قسم کی فلاح و نجات مضمر ہے۔

اس مبارک تذکرہ کے بعد پھر جنگ اُحد کا ذکر آیا ہے۔ اور شکست خوردہ مسلمانوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اُحد میں جو تمہیں شکست ہوئی تھی اور تمہارا زبردست جانی نقصان ہوا اس پر تم گھبرا گئے۔ تم یہ بھی تو دیکھو کہ اس سے قبل جنگ بدر میں تم نے اپنے دشمنوں کو اس سے دوگنی مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا یعنی اُن کے ستر نامور شہسوار قتل کر دئے تھے اور ستر گرفتار کر لیے تھے اور اُحد میں تمہارے آدمی شہید تو ہوئے مگر گرفتار کوئی نہ ہوا اور پھر یہ بھی دیکھو کہ یہ جو کچھ بھی ہوا وہ سب تمہاری بے صبری اور جنگی مصالح کی خلاف ورزی ہی کی وجہ سے ہوا جن کی پابندی کا تمہیں رسول اللہؐ نے انتہائی سختی کے ساتھ تاکیدی حکم دیا تھا اس لیے یہ شکست اور موت کی مصیبت صرف تمہاری اپنی غلطی اور ناعاقبت اندیشی ہی کا نتیجہ ہے مگر اس کے نتیجہ میں یہ بات بھی سامنے آگئی کہ تمہاری صفوں میں منافق کون ہے اور سچا مومن کون ہے۔ عبداللہ بن اُبی بن سلول منافق اور اس کے خفیہ ساتھیوں کے نفاق کا بھانڈا پھوٹ گیا اور جو سچے ایماندار تھے وہ رسولؐ کے گرد سمٹ آئے۔

عبداللہ بن اُبی اور اس کی جماعت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جب اس سازشی منافق گروہ کو جہاد اور دفاع کے لیے بلایا جاتا ہے تو یہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہمیں جنگ کے طریقوں کا علم ہی نہیں یا یہ کہ ہمیں اس کا یقین ہی نہیں کہ لڑائی ہوگی یہ سب خواب و خیال کی باتیں ہیں اور صرف ڈھونگ رچایا گیا ہے اس لئے ہم واپس جا رہے ہیں چنانچہ وہ سب کے سب رسول اللہؐ کو چھوڑ کر پہلے ہی چلدیئے تھے جنگ سے ناواقفیت کی بات تو صرف طنز کے طور پر کہی گئی تھی اس لئے عبداللہ منافق کی اس رائے کو نہیں مانا گیا تھا کہ دشمن کو شہر پر حملہ کرنے کا موقع دیا جائے اور شہر ہی کے اندر رہ کر مسلمان دفاعی جنگ کریں مگر اللہ تو جانتا ہی تھا کہ ان کے دل میں اسلام کی دشمنی رچی ہوئی ہے اور صرف زبان ہی سے یہ اسلام کے مدعی ہیں پھر منافقوں سے فرمایا گیا ہے کہ تم بڑا افسوس کرتے ہو کہ مسلمان اگر میدان جنگ میں نہ جاتے تو کیوں اپنی جانیں گنواتے تو ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تم اپنے گھروں میں رہ کر کب تک موت کے خونخوار پنجوں سے بچے رہتے ہو یعنی موت تو ایک نہ ایک روز آنا ہی ہے پھر اس طرح کیوں نہ مرو کہ تمہارا مرنا عزت کی ابدی زندگی اور شہادت کا رنگ لے کر لافانی اور لازوال بن جائے۔

(درس ۸۶)

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰىٓ اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ؕ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا ○

(پ ۴ رکوع ۱۲ کی درمیانی ایک آیت۔ سورۃ النساء)

اور تم یتیموں کی جانچ کرتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں ہوشمندی دیکھو تو ان کے مال اُن کے حوالہ کردو اور (ایسا نہ کرنا) کہ ان اموال کو فضول خرچی کر کے اور جلدی سے اس بنا پر کھا ڈالو کہ یہ یتیم بڑے ہو جائیں گے۔ اور جو شخص خوشحال ہو وہ تو اپنے کو ان اموال سے روکے ہی رکھے البتہ جو شخص نادار ہو وہ مناسب مقدار میں کھا سکتا ہے۔ پھر جب تم ان کے مال ان کے حوالہ کرنے لگو تو اُن پر گواہ بھی کر لیا کرو

اور اللہ حساب لینے کے لیئے کافی ہے۔

"اِبتلاء" کے معنی آزمائش کرنے کے آتے ہیں۔ کبھی تو یہ آزمائش اس طرح ہوتی ہے کہ جس کی آزمائش کی جائے اس کی اصلی حالت سے باخبر ہونا مقصود ہو اور کبھی اس طرح کہ آزمائش کرنے والے کو خود تو اس کی پوری حالت معلوم ہو مگر وہ چاہتا ہو کہ جس کی آزمائش کی جارہی ہے اُس کی نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی سب کچھ دوسروں کے سامنے ظاہر ہو جائے۔ اس لفظ کی نسبت جب کبھی اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس کے معنی یہی ہوتے ہیں کہ وہ شخص جس کی آزمائش ہو رہی ہے دوسروں کے سامنے بے نقاب ہو جائے اور اس کا اصلی کردار صاف طریقہ پر سب کے سامنے آجائے۔ اس کا ایک پہلو یہ بھی ہوتا ہے کہ اس شخص کو جزا پانے کا استحقاق حاصل ہو جائے کیونکہ محض استعداد پر جزا پانے کا کسی کو حق نہیں ہوتا جب تک اُس استعداد کے مطابق عمل بھی ظاہر نہ ہو۔ مثال کے طور پر جیسے کسی میں صبر و تحمل کی بھرپور استعداد موجود ہو مگر اُسے اس صفت کی جزا پانے کا استحقاق صرف اسی وقت ہو گا جب وہ مصائب اور مشکلات میں گھِر کر صبر و تحمل کا عملی مظاہرہ بھی کرے۔ غرض اللہ کو خود تو ہر بات کا علم ہے مگر وہ آزمائش اسی لیئے کرتا ہے کہ بندوں کو استحقاقِ جزا ہو سکے اور وہ دوسروں کے لیئے نمونہ، مثال اور عبرت بھی بن سکیں۔

"آنَسَ" "ایناس" سے بنا ہے۔ معنی ہیں دیکھنا۔ "اسراف" حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے کو کہتے ہیں۔ عام طور پر اس کو مال کے خرچ کے سلسلے میں بولتے ہیں۔ "بِدَار" مصدر ہے معنی ہیں کسی کام میں جلدی کرنا۔ "استعفاف" کسی بات سے رک جانے کو کہتے ہیں۔

"معروف" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو شریعت اور عقل کے مقرر کردہ معیار کے مطابق ہو۔

ان آیات سے قبل اس کا حکم دیا گیا تھا کہ بے عقل و بے شعور یتیم بچوں کو ان کا مال نہ دیا جائے کیونکہ وہ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے اس مال کو تباہ و برباد کر دیں گے اس بنا پر ضروری ہے کہ ان کے شرعی ولی یہ مال اپنی تحویل میں اور اپنی امانت و حفاظت میں رکھیں اور ان یتیم بچوں کی ضروریات کو پورا کرتے رہیں۔ اکثر مفسروں نے اس جگہ لفظ "سُفَہاء" میں یتیم بچوں کے علاوہ ان تمام بالغ افراد کو بھی شامل قرار دیا ہے جو عقل و شعور سے عاری ہوں خواہ اس بے شعوری کا سبب جنون ہو یا کوئی اور چیز۔

اب تلاوت کردہ آیات میں ارشاد ہو رہا ہے کہ یتیموں کے ولیِ شرعی کے لیئے ضروری ہے

کہ وہ ان کی جانچ کرتا رہے کہ ان میں خرید و فروخت اور دیگر مالی معاملات میں درست کام
کرنے کی صلاحیت کس حد تک آگئی ہے۔ یہ جانچ بلوغ کے سن تک پہنچنے سے قبل ہوگی تاکہ بلوغ و
رشد کے فوراً بعد، ولی، یتیموں کے اموال ان کے سپرد کر سکے۔ بلوغ کی عمر اور اس کی علامتوں
کا شریعت نے تعین کر دیا ہے جس کے بعد شرعی طور پر لڑکی یا لڑکے کو یتیم نہیں کہا جا سکتا سرورِ
کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے "لا یُتمَ بعدَ احتلام" یعنی بالغ ہو جانے کے
بعد پھر یتیمی باقی نہیں رہتی۔ اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت فرما دی گئی ہے کہ یتیموں کے ولی
کے لیے یہ بات کسی طرح بھی جائز نہیں ہے کہ وہ ان کا مال جو اس کی نگرانی اور امانت میں ہے
اس خوف سے کھا کر ختم کر دے کہ بچے بڑے ہو کر اپنے مال پر قبضہ کے حقدار ہو جائیں گے اور اسے ان کا
مال چھوڑنا پڑے گا بلاشبہ ولی کی بڑی سخت ذمہ داری ہے کہ وہ یتیموں کے مال کے ایک ذرہ
کو بھی حکم شرع کے خلاف خرچ نہ کرے اور اس میں کسی صورت سے بھی خیانت کا مرتکب نہ ہو۔
یہاں یتیموں کے اموال پر جس پابندی کا حکم دیا گیا ہے وہ اس وقت تک باقی رہے گی جب تک
یتیم لڑکی یا لڑکا بالغ نہ ہو جائے اور بلوغ کے ساتھ ساتھ اس میں "رشد" بھی نہ آ جائے۔
رشد کے معنی عام طور پر بیع و شرا اور دیگر انتظامی معاملات میں حسن کارکردگی، سلیقہ،
اور مہارت کے ہیں اس طریقہ کے مطابق جو عموماً عقل و شعور رکھنے والوں کا ہوتا ہے۔ بعض نے
اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگائی ہے کہ اس سلیقہ کے ساتھ ہی یتیم میں دینی امور اور ضروری مسائل
شرعیہ سے واقفیت اور اس کے مطابق اس کا عمل بھی ضروری ہے۔ بلاشبہ یہ دوسری
بات ہر حال میں ضروری ہے اور ایک مسلمان کے لیے یقیناً اس پر عمل لازمی ہے لیکن جمہور
فقہاء نے اس دوسری بات کو شرط نہیں قرار دیا ہے اور اس جگہ لفظ "رشد" کے مفہوم
میں اسکو داخل نہیں سمجھا ہے بلکہ بس دین اور کاروباری معاملات میں باشعور ہونے کو کافی
سمجھا ہے۔ اس کے بعد رہے دینی مسائل تو ان کے خلاف اگر عمل ہوگا تو اس کے احکام
الگ ہیں جن کا شرعی ضوابط کے ماتحت نفاذ کیا جائے گا۔

اس سلسلہ میں اس بات کو صاف طور پر سمجھا دیا گیا ہے کہ یتیم کا شرعی ولی اگر خود بھی
مالدار ہے تو اس کے لیے مال یتیم کے ایک ذرہ کو بھی لینا اور اپنے لیے یا کسی دوسرے کیلئے
اس کو کسی طرح سے بھی صرف کرنا اور اس سے فائدہ اٹھانا قطعاً جائز نہیں ہے البتہ اگر
ولی محتاج ہے اور اس کی گذر بسر کا کوئی وسیلہ موجود نہیں ہے تو وہ اپنی انتہائی شدید

ضرورت کے لیے اس مال میں سے کچھ لے سکتا ہے تاکہ اس کی وہ شدید ضرورت اور احتیاج دفع ہو سکے اور بعض علماء نے زیادہ احتیاط سے کام لے کر یہ بھی فرمایا ہے کہ اگر یہ محتاج ولی بعد میں کسی سبب سے مالدار ہو جائے تو اس کے لیے یہ بات ضروری ہوگی کہ جس قدر مالِ یتیم کا حصہ اس نے اپنی مجبوری اور حاجتمندی کے وقت لیا تھا اسے واپس کر دے۔

اس طرح یہ بات بہر حال اسلامی تعلیم کے معیار سے مطابقت رکھتی ہے کہ یتیموں کے محتاج اور فقیر ولی جو کچھ بھی ان کے مال کا حصہ اپنی انتہائی شدید ضرورتوں میں پورا کرنے کیلئے لے سکتے ہیں اس کو وہ یہ سمجھ کر نہ لیں کہ یہ ہمارے منصبِ ولایت و نگرانی کا حق یا اجرت ہے۔ اور وہ یہی خیال کریں کہ ولی ہونے کی ذمہ داریاں پورا کرنا ہمارا ذاتی فرض ہے اور شدید حاجت کے وقت بقدر ضرورت اس مال پر تصرف کرنے کی اجازت محض عارضی ہے۔

پھر آخر میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ جب ایسا وقت آجائے کہ یتیم کا مال اس کے سپرد کیا جانے لگے تو پوری طرح لکھا پڑھی اور گواہیاں لینے کا انتظام بھی ضروری ہے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو سکے۔

(رکوعہا) ۸۷

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُو الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ○ وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ○ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا ۖ وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ○

(پ ۴ رکوع ۱۲ کی آخری ۴ آیات سورۃ النساء)

مردوں کے لیے اس چیز میں حصہ ہے جس کو ماں باپ اور قریبی رشتہ دار چھوڑ جائیں خواہ وہ ترکہ کم ہو یا زیادہ (بہر حال) وہ حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اور جب ترکہ کی تقسیم کے وقت کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین موجود ہوں تو انھیں بھی اس میں سے کچھ دیدو اور ان سے اچھے عنوان سے بات کرو اور ایسے لوگوں کو ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ اپنے بعد چھوٹے ناتوان بچے چھوڑ جائیں تو انھیں

اُن بچوں کی کسقدر فکر رہے اس لیئے انھیں چاہیئے کہ وہ اللہ سے ڈریں اور چاہیئے کہ وہ سیدھی بات کیا کریں ۔ بیشک جو لوگ یتیموں کا مال ناحق کھا لیتے ہیں وہ یقیناً اپنے پیٹ میں آگ بھر لیتے ہیں اور عنقریب وہ بھڑکتی ہوئی آگ میں داخل ہوں گے ۔

تشریح و تفسیر : "نصیب" معین اور مقرر حصہ کو کہتے ہیں "مفروض" اُس چیز کو کہتے ہیں جو بلحاظ حکم قطعی اور لازمی قرار دیدی جائے ۔ یہاں "اُولُوا القربیٰ" سے مراد وہ کنبہ والے ہیں جو شرعی طور پر میت کے وارث نہ قرار پائیں ۔ لفظ "یتیم" کی تشریح اس سے قبل کئی مرتبہ کی جا چکی ہے ۔ اسوقت صرف اسقدر بیان کیا جاتا ہے کہ "یتامیٰ" یتیم اور یتیمہ دونوں کی جمع ہے اور "ایتام" صرف یتیم کی جمع ہے یعنی "یتامیٰ" کے مفہوم میں یتیم لڑکا اور یتیم لڑکی دونوں شامل ہوتے ہیں اور "ایتام" سے صرف یتیم لڑکے مراد لیے جاتے ہیں "ضِعاف" ضعیف کی جمع ہے معنی ہیں کمزور اور ناتوان ضعیف کی جمع "ضعفاء" بھی ہے "سَدِید" "سَداد" سے بنایا گیا ہے معنی ہیں صحیح ، سیدھا اور درست "یَصْلَوْنَ" کا مصدر "صِلِیٌّ" اور "صُلِیٌّ" اور "صِلِیٌّ" ہے معنی ہوتے ہیں آگ میں جلنا اور اس میں داخل ہونا "سَعْرٌ" آگ بھڑکنے کے لیے بولتے ہیں "سَعِیْر" بھڑکتی ہوئی آگ کو کہتے ہیں ۔ ابھی تک یتیموں کے اموال پر "حَجر" یعنی نابالغیت کی وجہ سے اُن کے تصرفات پر پابندی کے حکم کی تفصیل بیان کی گئی تھی جو Deprivation of [illegible] کی ایک شاخ ہے اب ان آیاتِ کریمہ میں میراث کے احکام کی طرف اجمالی طور پر اشارہ کیا گیا ہے ۔

زمانۂ جاہلیت میں عام طور پر لوگ میت کے ترکہ سے عورتوں کو محروم رکھتے تھے اور ساتھ ہی نابالغ لڑکوں اور لڑکیوں کو بھی کوئی حصہ نہیں ملتا تھا صرف مردوں کو میراث ملا کرتی تھی جو اہم کاموں میں اور جنگی معاملات میں مدد دینے کے قابل ہوتے تھے ۔ نابالغیت کے سبب سے یتیم بچے بھی عموماً وارث نہیں سمجھے جاتے تھے اور اس طرح یہ بچے ہمیشہ کس مپرسی کے عالم میں زندگی گزارا کرتے تھے اور کوئی بھی ان کے سروں پر ہاتھ رکھنے والا نہ تھا جو ان کی سرپرستی کرکے انھیں زندگی کی مصیبتوں سے نجات دلاتا ۔ اسلام نے میراث کے حکم میں مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی ان کا جائز مقام دیا اور اس کا اعلان کر دیا کہ مردوں کو خواہ ان کا سن کم ہو یا زیادہ ، بالغ ہوں یا نابالغ یعنی مردوں کی صنف کو اور اسی طرح عورتوں کی صنف کو خواہ وہ نابالغ لڑکی ہو یا وہ بلوغ کی حد تک پہنچ چکی ہو سبکو اُن کا مقرر حصہ ملیگا اور عمر کی کمی یا

کسی مخصوص صنف میں ہونے کی وجہ سے کسی حقدار کو بھی اس کے حق سے محروم نہیں کیا جاسکتا ہر صنف کے رشتہ داروں کے لیئے جو حق مقرر ہے وہ انھیں دیا جائے گا۔ عام اس سے کہ یہ رشتہ داری نسب کی وجہ سے ہو یا ازدواجی اسباب کی بنا پر ہو۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی میت کی میراث کی تقسیم کے وقت اس کے ایسے رشتہ دار آجائیں جن کا اس ترکہ میں کوئی حق ثابت نہ ہو یا غیر رشتہ دار یتیم اور محتاج لوگ جمع ہو جائیں اس امید پر کہ ان کے ساتھ بھی کچھ سلوک کیا جائیگا تو ایسے لوگوں کے ساتھ بہتر سلوک کرنا مستحب ہے۔ البتہ یہ سلوک اور مراعات صرف ایسے وارثوں کے حصّوں سے کی جاسکتی ہے جو بالغ و عاقل ہوں مگر جبکہ وہ نابالغ ہوں تو ان کے حصوں سے اس طرح کی مراعات اور سلوک کرنا جائز نہ ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ نابالغ ورثہ اپنے بالغ و عاقل ہونے کے بعد خود ہی اس قسم کا سلوک اپنے اختیار سے کریں۔ بہر حال ایسے موقع پر ہدایت کی گئی ہے کہ تمام رشتہ داروں کے ساتھ خصوصاً وہ جو محتاج بھی ہوں اور یتیموں کے ساتھ خصوصاً جبکہ وہ رشتہ دار بھی ہوں نیز عام مساکین اور صاحبان احتیاج کے ساتھ نیک برتاؤ اور اچھا سلوک کیا جائے۔ اس کی بھی ہدایت ہے کہ ان غیر وارث رشتہ داروں اور مساکین نیز یتیموں کے ساتھ ہر حال میں مناسب اور شائستہ گفتگو کی جائے خاص طور پر ایسی حالت میں جبکہ ورثہ نابالغ ہوں اور اس سبب سے کسی قسم کا حسن سلوک کرنا ممکن نہ ہو۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے کہ تم یتیموں کا ویسا ہی خیال رکھو جیسا کہ تم اس کے خواہشمند رہتے ہو کہ تمہارے بعد تمہاری اولاد کا دوسرے لوگ خیال رکھیں کیا کوئی شخص کبھی اس بات کو پسند کر سکتا ہے کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی یتیم اولاد کا مال، لوگ ظلم و جور سے لے لیں اور کھا کر ختم کر ڈالیں اسی طرح خود ان لوگوں کو بھی جو یتیموں کے مال کے نگران اور ولی ہوتے ہیں بلکہ ہر شخص کو اس کا خیال رکھنا لازم ہے کہ وہ یتیم کے مال میں ذرہ برابر خیانت کا ارتکاب کرنے کی جراءت نہ کرے اور اللہ کے غضب سے ڈرتا رہے کہ کہیں اس قسم کی حرکت کے نتیجہ میں وہ اس کے عذاب کی گرفت میں نہ آجائے جس سے پھر کائنات کی کوئی طاقت اس کو بچا نہ سکے گی " وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا " اور چاہیئے کہ وہ لوگ یتیموں سے سیدھی، سچی اور درست بات کیا کریں یعنی کوئی ایسی بات نہ کریں جس میں کسی قسم کے شر اور برائی کا پہلو ممکن ہو یا وہ گفتگو ان کے حقوق کے تلف ہو جانے کا سبب بن سکے۔ پھر آخر

ہیں ارشاد ہوا ہے کہ جو لوگ یتیموں کے مال پر ناحق اور بغیر کسی شرعی اجازت کے تصرف کرتے ہیں خواہ یہ تصرف کسی طریقہ سے بھی ہو اور کسی نام سے بھی ہو وہ درحقیقت آگ کھا رہے ہیں اور اپنے پیٹ کو انگاروں سے بھر رہے ہیں اور وہ یقیناً جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالے جائیں گے۔ مفسرین نے بیان کیا ہے کہ یتیموں کا مال ناحق کھانے والا قیامت کے دن جب قبر سے اٹھے گا تو اس کے منہ، آنکھوں اور جسم کے ہر حصہ سے آگ کے شعلے بھڑکتے ہوں گے اور ہر شخص میدان حشر میں پہچان لیگا کہ یہ یتیم کے مال کا غاصب اور اس کا ناحق کھانے والا ہے۔ اللہ ہمیں اس کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم یتیموں سے متعلق اپنی شرعی ذمہ داریوں کو پورا کریں اور ہمارا شمار ان لوگوں میں نہ ہو جو ان پر ظلم کرنے والے اور ان کے حق کو ضائع کرنے والے ہیں۔

(درس ۸۸)

يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ أَوْلَادِكُمْ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ إِنْ كَانَ لَهٗ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهٗ وَلَدٌ وَّوَرِثَهٗٓ أَبَوٰهُ فَلِأُمِّهِ الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهٗٓ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ اٰبَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصِينَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَآ أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗٓ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ فَإِنْ كَانُوٓا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَآءُ فِي الثُّلُثِ مِنْۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُّوصٰى بِهَآ أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَآرٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ

(پ ۴ رکوع ۱۳ کی ۲ آیات کریمہ۔ سورہ النسآء)

اللہ تمہیں تمہاری اولاد کے بارہ میں حکم دیتا ہے کہ ایک مرد یعنی لڑکے کا حصہ دو عورتوں یعنی لڑکیوں
کے برابر ہے اور اگر دو سے زیادہ عورتیں یعنی لڑکیاں ہی ہوں تو ان کے لیئے مورث کے ترکہ
کا دو تہائی حصہ ہے اور اگر ایک ہی لڑکی وارث ہو تو اس کے لیئے نصف حصہ مقرر ہے پھر اگر
مورث کے ماں باپ بھی موجود ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے لیئے مال کا چھٹا حصہ ہے ایسی
حالت میں جبکہ مرنے والے کے کوئی اولاد بھی ہو لیکن اگر اس کی کوئی اولاد نہیں ہے
اور والدین موجود ہیں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور ایسی صورت میں جب میت کے
بھائی بہن بھی موجود ہوں تو ماں کو صرف چھٹا حصہ دیا جائیگا یہ حکم اس وصیت کو پورا کرنے
کے بعد ہے جو مورث نے کی ہو یا ادائے قرض کے بعد۔ تمہارے باپ ہوں یا تمہارے بیٹے
تم نہیں جانتے کہ ان میں سے کون تمہیں نفع پہنچانے میں تم سے زیادہ قریب ہے۔ یہ سب
حصے اللہ کی جانب سے مقرر ہیں بیشک اللہ ہی علم والا، حکمت والا ہے۔ اور تمہارے
لیئے اس مال کا نصف حصہ ہے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں بشرطیکہ ان کے کوئی اولاد
نہ ہو اور اگر ان کے کوئی اولاد موجود ہے تو تمہارے لیے ان کے مال سے چوتھائی حصہ
مقرر ہے اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد جو وہ کر جائیں یا قرض کی ادائیگی کے بعد اور
تمہارے ترکہ سے تمہاری بیویوں کو چوتھائی حصہ دیا جائیگا اس صورت میں کہ تمہارے
کوئی اولاد نہ ہو لیکن اگر تمہارے کوئی اولاد موجود ہے تو پھر انہیں تمہارے ترکہ سے
آٹھواں حصہ دیا جائیگا تمہاری کی ہوئی وصیت کو پورا کرنے یا تمہارے قرض کی
ادائیگی کے بعد۔ اور اگر کوئی مورث کلالہ ہو یعنی ایسا مرد یا ایسی عورت ہو جس کے ماں باپ
بیٹا بیٹی کچھ نہ ہو اور اس کا ایک (مادری) بھائی یا ایک (مادری) بہن ہے تو اس بھائی
یا بہن کو ترکہ کا چھٹا حصہ ملیگا اور اگر وہ ایک سے زائد ہیں تو وہ سب ترکہ کے ایک
تہائی حصہ میں برابر کے شریک ہوں گے، اس وصیت کو پورا کرنے کے بعد جو مورث
نے کی ہو یا قرض کی ادائیگی کے بعد جبکہ کسی کو ضرر نہ پہنچائے یہ حکم اللہ کی طرف سے
ہے اور اللہ بڑا علم والا بڑا بردبار ہے۔

تشریح و تفسیر: "حظّ" کے معنی ایک معین اور مقرر حصہ کے ہیں "حظوظ"
اس کی جمع آتی ہے۔ اس کے معنی میں زیادہ نزدیکی اور اچھائی کا تصور شامل ہوتا ہے لیکن

کبھی برائی کے موقع پر بھی بولا جاتا ہے "کلالۃ" سے فقہاء و مفسرین کے نزدیک دو معنی مراد لیئے گئے ہیں (۱) خود وہ میت جس کے والدین اور اولاد موجود نہ ہو (۲) یا وہ ورثہ جو والدین اور اولاد کے علاوہ ہوں۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ والدین کے ساتھ دادا دادی بھی شامل ہوں گے مگر فقہاء امت کی اکثریت وہی کہتی ہے جسے پہلے بیان کیا گیا۔ تلاوت کردہ آیات میں "کلالۃ" سے مراد بالاتفاق ایسے ورثہ ہیں سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے صرف اخیافی" یعنی مادری بھائی بہن مراد ہیں حقیقی اور عینی یا علاتی یعنی صرف پدری بھائی بہن کے حصوں کا بیان اس سورۂ مبارکہ کے آخر میں آئے گا۔

پچھلی آیتوں میں اجمالی طور پر فرمایا گیا تھا کہ میت کے ترکہ سے اس کے تمام ورثہ حصہ پانے کے مستحق ہیں اور اللہ نے سب کا حصہ مقرر فرمادیا ہے اور کسی مستحق کو عورت ہونے کی وجہ سے یا نابالغ ہونے کے سبب سے یا یتیمی کی وجہ سے ترکہ سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ اب اُن حصوں کی تفصیل بیان ہورہی ہے کہ کونسا وارث میراث پانے میں دوسروں پر مقدم ہے اور اُسے کسقدر حصہ دیا جائے گا۔ سب سے پیشتر اولاد کا ذکر ہے اور بتایا گیا ہے کہ اگر کوئی میت اپنے پیچھے اپنی اولاد چھوڑے جس میں بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو بیٹی کو اکہرا اور بیٹے کو دہرا حصہ ملے گا اور اگر اس نے صرف ایک بیٹی یا چند بیٹیاں ہی چھوڑی ہوں تو اگر صرف ایک بیٹی ہے تو اسے ترکہ سے آدھا حصہ ملے گا اور اگر دو یا دو سے زیادہ ہوں تو انھیں دو تہائی دیا جائیگا پھر ماں باپ کا ذکر ہے کہ اُن میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملیگا اگر میت کی اولاد بھی ہو۔ مگر جبکہ اس کی اولاد موجود نہ ہو تو ماں کو ایک تہائی ملے گا اور جو کچھ بھی باقی بچے گا وہ سب باپ کو ملے گا۔ یہ حکم اس صورت میں ہے جبکہ میت کے بھائی بہن موجود نہ ہوں اور اگر وہ موجود ہیں تو پھر ماں ترکہ کا صرف چھٹا حصہ پائے گی لیکن ساتھ ہی ان بھائی بہنوں کا کوئی حصہ نہ ہوگا بلکہ بقیہ سب ترکہ باپ کو ملے گا۔ ترکہ کی یہ تقسیم بہرحال میت کے دفن و کفن، غسل اور ادائے قرض نیز وصیت کی تعمیل جو باقی ترکہ کے ایک تہائی حصہ سے زیادہ نہ ہو، ان سب باتوں کے بعد کی جائے گی۔

پھر شوہر کا حصہ بیان کیا گیا ہے کہ اسے میت یعنی زوجہ کے اولاد نہ ہونے کی صورت میں ترکہ کا آدھا حصہ اور اولاد ہونے کی صورت میں چوتھائی حصہ ملے گا اور شوہر کے ترکہ سے اس کے اولاد نہ ہونے کی حالت میں خواہ وہ کسی بیوی سے ہو زوجہ کو چوتھائی حصہ ملے گا اور اولاد ہونے کی صورت میں

آٹھواں حصہ دیا جائے گا۔ اور یہ سب کچھ تجہیز و تکفین اور نفاذ وصیت اور ادائے قرض کے بعد ہی ہوگا۔ ادائے قرض بہر حال نفاذ وصیت پر مقدم ہے۔ اس کے بعد "اخیافی" یعنی مادری بھائی بہن کے حصے بیان ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے والدین اور اولاد کو نہیں چھوڑ گیا ہے بلکہ صرف اس کے بھائی بہن ہیں تو اگر وہ مادری بھائی بہن ہیں تو انکے واحد ہونے کی صورت میں ان کو چھٹا حصہ ملے گا خواہ ایک بھائی ہو یا ایک بہن ہو اور اگر وہ ایک سے زائد ہیں اور صرف بھائی ہیں یا صرف بہنیں یا بھائی اور بہنیں دونوں ہیں تو ان سب کو ترکہ کا ایک تہائی حصہ ملے گا اور اس حصہ میں عورت اور مرد دونوں کو برابر ملے گا یعنی یہ نہ ہوگا کہ مرد کو دُہرا اور عورت کو اکہرا دیا جائے۔

آخر میں اس کا بیان ہے کہ یہ تمام قواعد اللہ کے مقرر کردہ ہیں اور حدود اللہ ہیں جنکی خلاف ورزی کرنے والے کی سزا جہنم کی آگ ہے۔

میراث کے ان احکام کی مزید تفصیل فقہ اسلامی کی کتابوں میں ملے گی وہاں اسکو دیکھا جاسکتا ہے۔ بعض لوگوں نے غیر مسلم قوموں کے میل جول سے ان احکام الٰہی کی کھلی ہوئی خلاف ورزی کی اور حقداروں کو ان کے حق سے محروم رکھا اور جاگیردارانہ اور ریاستی نظام قائم کیے جو قطعی طور پر غیر اسلامی تھے اور غیر اسلامی ہیں اور ہر مسلمان فرد اور ہر مسلمان حکومت کا فریضہ ہے کہ وہ حقداروں کو اس ظلم و جور سے بچانے کی بھرپور کوشش کرے۔

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۭ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْھَا ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْھَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ وَالّٰتِيْ يَاْتِيْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَاۗىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَيْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْھُنَّ فِي الْبُيُوْتِ حَتّٰى يَتَوَفّٰىھُنَّ الْمَوْتُ اَوْ يَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلًا ۝ وَالَّذٰنِ يَاْتِيٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْھُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝

(پ ۴، رکوع ۱۳ کی دو اور رکوع ۱۴ کی دو آیات کریمہ۔ سورۃ النساء)

یہ سب اللہ کے (مقرر کیے ہوئے) ضابطے ہیں اور جو کوئی بھی اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہ اسے بہشت کے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو کوئی بھی اللہ کی اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کردہ حدوں سے تجاوز کرے گا اُس کو وہ دوزخ کی آگ میں ڈال دیگا جس میں وہ ہمیشہ پڑا رہے گا اور اُس کے لیۓ ذلت کا عذاب ہے اور تمہاری عورتوں میں سے جو فحش اعمال کا ارتکاب کریں ان پر چار مرد اپنوں میں سے گواہی کے لیے مقرر کرو پھر اگر وہ مرد اس برے عمل کی گواہی دیدیں تو ایسی عورتوں کو گھروں کے اندر بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کا کام تمام کردے یا اللہ ان کے لیۓ کوئی اور راہ پیدا کردے اور تم میں سے جو بھی دو شخص (ایسی) ہی فحش کاری کے مرتکب ہوں تو انھیں اذیت پہنچاؤ پس اگر وہ دونوں توبہ کریں اور اصلاح کرلیں تو ان سے تعرض نہ کرو بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا بڑا رحم کرنے والا ہے۔

تشریح وتفسیر:- "فَوْزٌ" کامیابی کو کہتے ہیں اور "فَائِزٌ" خود کامیاب کے معنی میں آتا ہے "یَتَعَدَّ" کا مصدر "تَعَدِّی" ہے اس کا اصلی مادہ "عَدْوٌ" ہے۔ "تَعَدِّی" کے معنی حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ یہ تجاوز کمی اور زیادتی دونوں صورتوں میں ہوسکتا ہے۔ یعنی مقرر حد میں کسی طرح سے بھی تبدیلی کرنا اور تغیر پیدا کردینا جو جائز طریقہ پر نہ ہو "مُهِينٌ" کے معنی ہیں ذلیل کرنے والا اس کا مصدر "اَهَانَتْ" ہے یعنی ذلیل کرنا "هُوْنٌ" ذلیل ہونے کے لیۓ بولتے ہیں قرآن حکیم میں "العذابُ الْهُوْنُ" اسی معنی میں آیا ہے "فُحْش" "فَحْشَاء" اور "اَلْفَاحِشَةُ" اُس بے حیائی اور برائی کو کہتے ہیں جو حد سے بڑھی ہوئی ہو چاہے اُس کا تعلق قول سے ہو یا فعل سے ہو۔ آخری لفظ صیغۂ مونث کے ساتھ ہو یا صیغۂ مذکر کے ساتھ ہو خود اس مرد یا عورت کے لیے بھی بولتے ہیں جو بے حیائی اور فحش کاری میں حد سے بڑھ جائے۔ اس جگہ آیت میں اس لفظ سے مراد جنسی فحش کاری ہے۔ "وَالَّذَانِ یَاْتِیٰنِهَا" میں "هَا" کی مونث ضمیر "الفَاحِشَة" کے لفظ کی طرف پھرتی ہے جس کے معنی جنسی فحش کاری کے ابھی بیان کیۓ گۓ۔ ساتھ ہی یہاں "اَلَّذَانِ" جو تثنیہ کا صیغہ ہے یعنی کسی صنف کے بھی دو غیر معین افراد کو مراد لینے کے لیے بولا جاتا ہے یہاں اس سے مقصود دو مرد بھی ہو سکتے ہیں اور ایک مرد اور ایک عورت بھی۔ اس کی وسعت میں ہر دو صنف کے کوئی بھی دو فرد شامل ہیں "تَوَّابْ" کا لفظ جب بندوں کے لیۓ بولتے

ہیں تو اس سے مراد توبہ کرنے والا ہوتا ہے اور جب اسے اللہ کے لیئے بولتے ہیں تو اس سے مقصود توبہ کا قبول کرنے والا ہوتا ہے۔

"تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ" کہکر یہ بتایا گیا ہے کہ اب تک جو کچھ بھی احکام خداوندی بیان ہو چکے ہیں جن کا تعلق یتیموں سے ہے یا کسی مرنے والے کی وصیت یا اس کے ترکہ کی تقسیم سے ہے، یہ سب وہ قانون اور ضابطے ہیں جن کا مقرر کرنے والا خود اللہ ہے اس لیئے ان پر عمل کرنا ہر شخص کے لیئے لازم وضروری ہے اور درحقیقت صرف اُسی کی ذات کو اس کا حق بھی ہے کہ وہ انسانی زندگی اور پوری نوع بشر کی ہر صنف اور ہر دور میں پیدا ہونے والی انسانی نسل کے لیئے قانون ضوابط اور کسی نظام کی تعیین کرے۔ وہی انسان کا خالق ہے اور وہی اس کی ہر برائی اور اچھائی کا وہی جاننے والا ہے۔ خود انسانی افراد کی سمجھ اور فکر کا معیار ماحول کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ ان میں ہر ایک کا زاویۂ نظر دوسرے سے مختلف ہوا کرتا ہے، ہر ملک اور خطہ کے لوگ ہر بات کو الگ الگ طریقہ پر دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں بلکہ ایک ہی فرد کے خیالات اور نظریات، حالات اور ماحول کی تبدیلی اور تغیر سے بدلتے رہتے ہیں اس لیئے خود کوئی انسان تمام بنی نوع بشر کے لیئے ایسا قانون اور ایسے ضوابط نہیں بنا سکتا جو تمام انسانوں کے لیئے یکساں طور پر ہر لحاظ سے درست اور صحیح ہو سکتے ہوں اور اچھائی یا برائی کا ایک اٹل معیار بن سکیں اسی بنا پر قرآن حکیم نے اس کا اعلان کیا ہے کہ "حکم دینا صرف اللہ کا حق ہے" اس کے بعد انبیاءؑ ومرسلینؑ جو حکم دیتے ہیں وہ حقیقت میں اُسی حکم کی ترجمانی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ انبیاء کی منزل صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی نیابت میں اُس کے احکام پر دنیا والوں کو چلاتے ہیں اور اُن احکام پر خود بھی عمل کرتے ہیں ان کے لیئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ کردار وعمل اور طہارتِ نفس کے اس مرتبہ پر فائز ہوں کہ احکام خداوندی اور منشاء الٰہی کو پوری طرح سمجھ سکیں اور پوری امانتداری کے ساتھ اُس کو اللہ کے بندوں تک پہنچا سکیں نہ تو ان سے منشاء خداوندی کے سمجھنے میں غلطی ہو اور نہ پیغمبرانہ فرائض کی ادائیگی میں غلطی، خیانت یا کوتاہی ممکن ہو پھر اللہ کی مخلوق ان برگزیدہ ہستیوں کی ہدایت سے فیض بھی صرف اُسی وقت حاصل کر سکتی ہے جب وہ اس کا یقین رکھتی ہو کہ یہ ہستیاں مشیت خداوندی کی صحیح ترجمان ہیں اور اس ترجمانی کے مقدس فرض میں اُن سے کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ اگر لوگوں کو اس پر پورا بھروسا اور یقین حاصل نہ ہوگا تو

پھر وہ کسی صورت میں بھی ان سے ہدایت حاصل کرنے کے قابل نہیں بن سکیں گے۔ غرض یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ ترکہ، وصیت اور یتیموں کے متعلق جو جو حکم بتائے گئے ہیں ان پر عمل کرنا سب کے لیے لازم اور ضروری ہے اور اگر کوئی شخص اس کا خواہشمند ہے کہ وہ ایسی کامیاب زندگی بسر کرے جو دنیا اور آخرت کی ہر طرح کی فلاح و بہبود پر مشتمل ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ان احکام پر اور دوسرے تمام احکام الٰہی پر عمل کرے۔ اسلام کی نظر میں دولت کی فراوانی اور اسباب معیشت کی زیادتی اور وسائلِ تعیش کی کثرت کامیاب زندگی کا معیار ہرگز نہیں ہے بلکہ اس کا اصلی معیار صرف طہارت نفس اور کردار کی بلندی ہے۔ عیش و راحت کے وسائل کتنے ہی ناپید ہوں لیکن اگر کوئی اپنے ضمیر کی اصلاح و تعمیر رضائے الٰہی کے مطابق کرلے تو وہ اللہ کے نزدیک "فَوْزٌ عَظِیْمٌ" اور نجات و فلاح کا حقدار ہو جائے گا ورنہ وہ کچھ بھی کیوں نہ بن جائے بارگاہِ خداوندی میں اس کی کوئی بھی قیمت اور مقام نہ ہوگا۔ یہی اطاعت الٰہی اسے جنت کا مستحق بنا کر اس میں داخل کرے گی اور اس کے برخلاف اس کی نافرمانی اس کو جہنم کا ایندھن بنا دے گی۔ اِن آیات میں اس کے بعد اس کا ذکر ہے کہ ابتدائے اسلام میں ان عورتوں کے لیے جو صحیح طور پر ازدواجی زندگی میں قدم رکھ چکی ہوں اور پھر جنسی گناہ کا ارتکاب بھی کریں بطور سزا کے گھروں میں ان کی موت آنے تک حبس دوام کی عقوبت کا حکم تھا۔ جبکہ تمام عورتوں اور مردوں کے لئے خواہ وہ بن بیاہے ہوں یا ازدواجی زندگی میں داخل ہو چکے ہوں یہ عمومی حکم تھا کہ اگر وہ کسی طرح کے بھی جنسی جرائم کا ارتکاب کریں تو انھیں طرح طرح سے ایذا دی جائے اور تکلیف پہنچائی جائے اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے جب تک وہ لوگ ہمیشہ کے لیے ان گناہوں سے توبہ نہ کرلیں (اس تشریح کے ساتھ جو خصوصی طور پر منکوحہ عورتوں کے متعلق بیان ہوئی) مگر یہ تمام سابق احکام پھر اس وقت باقی نہ رہے جب سورۂ نور اور سورۂ مائدہ کی آیتوں اور خود سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاف اور صریح حدیثوں اور مختلف مواقع پر حضورؐ کے فیصلوں سے ان گناہوں کی سزائیں تازیانے مارنے اور سنگسار کرنے کی صورت میں آخری طور پر معین و مقرر کر دی گئیں۔ پہلی سزا بن بیاہوں کے لیئے اور دوسری سزا بیاہوں کے لیے۔ ان آیات کی تفسیر میں علماء نے بڑی گہری بحثیں کی ہیں جن کے تفصیلات تفسیر کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

(درس ۹) اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ

يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ○ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ○

(پ ۴ رکوع ۱۴ کی درمیانی ۲ آیات کریمہ۔ سورۃ النساء)

بیشک وہ توبہ جس کا قبول کرنا اللہ پر ہے وہ انہی لوگوں کی ہے جو نادانی سے کوئی بری بات کر بیٹھتے ہیں اور پھر جلد ہی توبہ بھی کر لیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرماتا ہے اور اللہ بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے۔ اور توبہ ایسے لوگوں کی نہیں ہوا کرتی جو برابر گناہ کرتے رہیں یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت آجائے تو اس وقت وہ کہنے لگے کہ بس اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ایسے لوگوں کی توبہ ہے جو ایسی حالت میں مریں کہ وہ کافر ہوں۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔

تشریح وتفسیر:۔ "توبٌ" کے معنی رجوع کرنے کے آتے ہیں لیکن جب اس کے ساتھ "اِلیٰ" کا لفظ لایا جاتا ہے جیسے کہا جائے "تَابَ اِلَی اللّٰہِ" تو اس کے معنی توبہ کرنے اور اللہ کی بارگاہ میں رجوع کرنے اور ندامت کا اظہار کرنے کے ہوتے ہیں۔ اور اگر اس کے ساتھ "عَلیٰ" کا لفظ آتا ہے جیسے یوں کہا جائے "تَابَ اللّٰہُ عَلَیْہِ" تو اس کے معنی توبہ قبول کرنے کے ہو جاتے ہیں یعنی اللہ نے فلاں شخص کی توبہ قبول فرمائی اور اسے بخش دیا۔

کسی گناہ سے اظہار برائت کی چند صورتیں ہوا کرتی ہیں ایک تو یہ ہے کہ گناہ کرنے والا اس سے قطعی طور پر منکر ہو کہ اس نے ایسا کیا ہے دوسرے یہ کہ وہ اس گناہ کا سبب بیان کرے کہ میں نے اس وجہ سے ایسا کیا تھا۔ ان دونوں صورتوں کو توبہ نہیں کہا جا سکتا مگر تیسری ہی صورت ہے جس کو توبہ کہا جا سکتا ہے اور وہ یہ ہے کہ گناہ کرنے والا اپنی غلطی اور جرم کا اقرار کرے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا دل سے اظہار کرے اور ساتھ ہی اگر وہ کوئی ایسا گناہ ہے جس کی تلافی ہو سکتی ہے تو وہ بھی کرے جیسے کفارہ ادا کرنا۔ "سُوْءٌ" برائی، فساد، عیب، نقص، رسوائی اور اسی طرح کے دوسرے معنوں میں بولتے ہیں "سَیِّئَۃٌ" برائی کو کہتے ہیں "سَیِّئات" اس کی جمع ہے "اَعْتَدْنَا" یا "عَتَادٌ" سے بنا ہے یا "عَدٌّ" سے دوسری صورت میں اس کی اصل "اَعْدَدْنَا" ماننا پڑے گی جبکہ دستور عرب کے مطابق "دال"

کو "د ت" سے بدل کر "اَعْتَدْنَا" پڑھا جاتا ہے۔ معنی دونوں صورتوں میں ایک ہی ہیں گے یعنی مہیا کرنا اور تیار رکھنا۔

مندرجہ بالا آیات سے قبل کی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ اللہ تواب اور رحیم ہے یعنی بڑا توبہ قبول کرنے والا اور بے حد رحم کرنے والا ہے۔ اس جملہ کی وسعت سے اس کا اندیشہ تھا کہ لوگ اس کے وسیع مفہوم سے ناجائز اور غلط فائدہ حاصل کر کے گناہ بھی کرتے رہتے اور توبہ بھی جاری رکھتے اس لیئے یہ ضروری تھا کہ اس بات کی تشریح کر دی جائے کہ "توبہ" کے اصلی معنی کیا ہیں اور اس کی قبولیت کس طرح ہوتی ہے۔ اسی بنا پر اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ معصیت چھوٹی ہو یا بڑی ہو توبہ کرنے والے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اس پر دل سے نادم ہو اور اللہ سے اس کا عہد کرے کہ آئندہ وہ اس کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ جب تک گناہ پر ندامت نہ ہو اور اس کے ترک کرنے کا عزم نہ ہو توبہ کے کوئی معنی نہیں ہو سکتے۔ "جَهَالَةٍ" کا مطلب یہ ہو گا کہ گناہ کرتے وقت آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑ گئے اور دنیوی اور حیوانی جذبات عقل و شعور پر غالب آ گئے یا اس عمل کی سزا اور اس کی ممنوعیت سے ناواقف ہونے کے سبب سے وہ گناہ عمل میں آیا ہو۔ غرض جس وقت بھی انسان کو اس کا شعور ہو جائے کہ وہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے اگر وہ دل سے نادم ہو گا اور اس کا پکا ارادہ کر لیگا کہ اب پھر کبھی وہ ایسا عمل نہیں کرے گا اور یہ بات ظاہر ہے کہ توبہ جس قدر جلد ممکن ہو عمل میں آنا چاہیئے کیونکہ توبہ اور ندامت اور ترک گناہ کے عزم میں جان بوجھ کر دیر کرنا خود اپنے مقام پر گناہ ہے اور اس کی دلیل ہے کہ انسان دل سے اس گناہ پر نادم نہیں ہے۔ اسی کے ساتھ بعض اوقات ایسی جہالت اور ناواقفیت بھی گناہ سمجھی جائے گی جس کا دور کرنا ممکن ہو اور کوئی شخص اس جہالت کو دور کرنے کی کوشش نہ کرے۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کو ایک حاکم کے دربار میں جانا ہے اور وہ اس دربار کے آداب کو سیکھ سکتا ہے پھر بھی نہ سیکھے اور یوں ہی وہاں چلا جائے اور وہ حرکتیں کرے جو اس دربار کے آداب کے خلاف ہوں تو وہ کس طرح سزا سے بچ سکے گا کیونکہ اس کا فرض تھا کہ ان آداب سے واقفیت حاصل کرے مگر اس نے جان بوجھ کر اور پوری سہولت کے باوجود غفلت سے کام لیا اور وہ آداب نہیں سیکھے اس لیے یہ جہالت بھی کسی طرح گناہ کی حد سے باہر نہیں قرار دی جا سکتی۔ مختصر یہ کہ توبہ وہی قابل قبول ہے اور اسی توبہ کے قبول کرنے کا اللہ نے اپنے رحم و کرم سے وعدہ فرمایا ہے جو گناہ پر دلی افسوس اور ندامت و شرمندگی

کے ساتھ ترکِ گناہ کے عزم بالجزم پر مشتمل ہو پھر اگر سرکشی کے جذبہ کے ساتھ گناہ کا ارتکاب کیا جائے تو ایسی حالت میں چھوٹے بڑے گناہ کا فرق بھی باقی نہیں رہتا اور گناہان صغیرہ اور کبیرہ سب ہی برابر ہو جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہم کو معلوم رہنا چاہیئے کہ اگر کوئی چھوٹا سا گناہ بھی برابر کیا جائے تو اس کی تکرار کی وجہ سے وہ بڑا گناہ بن جاتا ہے۔ مگر صدق دل سے توبہ ایسی چیز ہے جو اگر اپنے پورے شرائط کے ساتھ ہو تو پچھلے تمام گناہ دھو ڈالتی ہے اور انسان کا ذہن عمل گناہ کے ہر دھبہ سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ اس توبہ کرنے کی گنجائش اللہ نے ہر بندہ کے لیئے رکھی ہے بشرطیکہ توبہ اپنے معنی میں ہو اور توبہ کا مذاق نہ اڑایا جائے یعنی یہ نہ ہو کہ روز گناہ کیا جائے اور روز رسمی طور پر توبہ کر لی جائے یا یہ صورت بھی نہ ہو کہ آدمی عمر بھر گناہ میں مبتلا رہے اور یہ سمجھ رکھے کہ مرنے کے آثار پیدا ہوں گے اور دیکھوں گا کہ بس اب میں مرنے ہی والا ہوں اس وقت توبہ کر لوں گا۔ ایسی توبہ حقیقی اور توبۂ نصوح نہیں ہے بلکہ توبہ کا مذاق اڑانا ہے اور یہ خود اپنے مقام پر شدید ترین گناہ اور بارگاہ خداوندی میں عظیم ترین جسارت ہے۔ اللہ جل شانہ نے (سورۂ تحریم آیت ۸) میں ارشاد فرمایا ہے "تُوبُوا إِلَى اللَّهِ تَوْبَةً نَّصُوحًا" اللہ کی بارگاہ میں صاف پاک اور خالص دل سے توبہ کیا کرو امید ہے کہ وہ تمہارے گناہ بخش دیگا۔ صحابیٔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم یعنی حضرت ابو لبابہؓ بن عبد المنذر الانصاری سے ایک غلطی ہو گئی تھی اکثر روایات کی بنا پر جب سرور کائنات کی فوج نے جنگ خندق کے بعد بنی قریظہ کے یہود کی عہد شکنی کی وجہ سے ان کا محاصرہ کیا تھا اس وقت یہ غلطی ہوئی تھی اور بعض روایتوں کی بنا پر جنگ تبوک کے لیئے روانگی کے وقت فوج میں شرکت نہ کرنے کے عذر کی غلطی تھی مگر اس کا احساس ہوتے ہی کہ میں نے بڑی شدید غلطی کی حضرت ابو لبابہ رضی اللہ عنہ نے توبہ اس طرح کی کہ اپنی گردن رسی کے ساتھ مسجد نبیؐ کے ایک ستون میں باندھی اور دن رات وہیں پڑے رہتے تھے اور رویا کرتے تھے۔ نہ کھانا کھاتے تھے اور نہ پانی پیتے تھے آخر قبولیت توبہ کے متعلق اللہ کا حکم اترا اور جب اس کی خبر مسلمانوں کو ملی کہ ابو لبابہ کو اللہ نے معاف کر دیا ہے تو لوگ ہر طرف سے دوڑے کہ ہم ابو لبابہ کے گلے سے رسی کھول دیں مگر صحابی رسولؐ نے انکار کر دیا اور کہا کہ جب تک سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم خود تشریف لا کر اپنے دست مبارک سے میرے گلے سے رسی کی گرہ نہیں کھولیں گے میں یہ گرہ کسی اور سے نہیں کھلواؤں گا یہ سن کر حضورؐ مسکراتے ہوئے تشریف لائے اور وہ رسی کھول دی۔ ابو لبابہ حضورؐ کے قدموں پر گر پڑے

اور عرض کی کہ اب میں بنی قریظہ کی سرزمین پر کبھی عمر میں قدم نہیں رکھوں گا جہاں مجھ سے غلطی سرزد ہوئی تھی اور اسکی تلافی اس طرح کرتا ہوں کہ اپنا کل مال راہ خدا میں محتاجوں کو دیئے دیتا ہوں مگر حضورؐ نے اس سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ ابولبابہ اگر تم اپنا مال راہ خدا میں دینا ہی چاہتے ہو تو صرف ایک تہائی مال دیدو۔ سچے مسلمان کی توبہ کی یہ نشانی ہوا کرتی ہے۔ کاش اب بھی ایسے لوگ موجود ہوں۔

(درس ۹۱) يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا ؕ وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ فَاِنْ كَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ○ وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ○ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ○

(پ ۴ رکوع ۱۴ کی ۳ آیاتِ کریمہ۔ سورۃ النساء)

اے ایمان والو تمہارے لیئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ تم جبراً عورتوں کو ورثہ میں لے لو اور نہ اُن کو روک رکھو اس غرض سے کہ جو کچھ تم نے انھیں دے رکھا ہے اس کا کچھ حصہ اُن سے وصول کر لو سوائے اس صورت کے کہ وہ کھلی ہوئی بُرائی کا ارتکاب کریں اور ان کے ساتھ اچھے طریقہ پر رہو سہو پس اگر وہ تمہیں پسند نہ ہوں تو بہت ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند نہ کرو اور اللہ اس میں بڑی اچھائی رکھ دے اور اگر تم ایک زوجہ کے بجائے دوسری زوجہ اختیار کرنا چاہو اور تم اُس ایک زوجہ کو مال کا انبار دے چکے ہو تو تم اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو کیا تم بہتان رکھ کر اور صریح گناہ کر کے اس کو واپس لو گے؟ اور تم کیونکر اسے واپس لے سکتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے سے ازدواجی تعلقات پیدا کر چکے ہو اور وہ بیویاں تم سے مستحکم عہد و پیمان لے چکی ہیں۔

تشریح و تفسیر:- "کَرہ" اور "کُرہ" ان دونوں لفظوں کے معنی سخت ناپسندیدگی

کے آتے ہیں مگر بعض اہل لغت نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ "کَرْہٌ" (کاف پر زبر کے ساتھ) اُس سختی، مشقت اور ناپسندیدہ بات کو کہتے ہیں جو آدمی پر اُس کے وجود کے باہر سے زبردستی ڈالدی جائے اور "کُرْہٌ" (کاف پر پیش کے ساتھ) اس دکھ، سختی اور مشقت کو کہتے ہیں جو آدمی کو خود اپنی ذات ہی سے پہنچتی ہے۔ عام طور پر یہ ناپسندیدگی دو طرح سے ممکن ہو سکتی ہے ایک یہ کہ کوئی شخص کسی چیز کو دل سے تو پسند کرتا ہو مگر عقلی یا شرعی وقانونی طور پر اسے پسند نہ کرے یا عقلی و شرعی اور قانونی طور پر تو اسے پسند کرے مگر دل سے پسند نہ کرے۔ "عَضْلٌ" سے یہاں مراد سختی کے ساتھ کسی چیز کو روک دینا ہے "فَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ" میں "مُبَيِّنَةٌ" تبیین سے بنایا گیا ہے اور یہ لفظ متعدی اور لازم دونوں ہی معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اس مقام پر بھی دونوں معنی مراد لیے جا سکتے ہیں یعنی خود کھلی ہوئی اور صریح برائی یا ایسی برائی جو برائی کرنے والے شخص کی حیثیت اور کردار کو سب کے سامنے کھولدے اور آشکار کردے یہاں پر اس کے وسیع معنی میں جنسی گناہ اور شوہر کی نافرمانی خصوصیت سے شامل ہے "زَوْج" کا لفظ بیوی اور شوہر دونوں کے لیئے بولا جاتا ہے۔ یہاں بیوی مراد ہے۔

"مِيْثَاقٌ" کو پختہ عہد و پیمان اور "غَلِيْظٌ" کو سخت و شدید کے معنی میں بولتے ہیں ان آیات کی ابتدا میں "اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا" کے جملہ میں عورتوں کو وراثت کے ذریعہ سے اپنی ملکیت میں لینے کے مفہوم میں ان کے جسم یا ان کے مال کا جبراً مالک بن جانا۔ یہ دونوں ہی باتیں شامل ہیں۔

جاہلیت کے زمانہ میں اس وقت کی دنیا کے نزدیک انسانی معاشرہ میں عورت کا کوئی درجہ ہی نہ تھا وہ اپنے فطری اور بنیادی حقوق سے محروم تھی، وہ وراثت کے حق سے محروم تھی، وہ ازدواجی حقوق سے محروم تھی اور وہ ہر اس حق سے محروم تھی جو بحیثیت ایک انسان کے یا اس سے بھی زیادہ وسیع تر مفہوم میں بحیثیت ایک مخلوق کے اللہ نے اُسکے لیئے مقدر و معین فرمایا ہے۔ جہاں تک قدیم انسانی تاریخ کے اوراق ہمارا ساتھ دیتے ہیں ہمیں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلان نبوت سے قبل کے جاہلی دور میں عورت کی زندگی معمولی جانوروں اور ادنیٰ غلاموں اور کنیزوں سے بھی بدتر ملتی ہے۔ اُس کے وجود کو نجاست کے مترادف اور انسانی عظمت و بزرگی کے لیئے پستی اور ذلت اور

ایک بڑی رکاوٹ سمجھا جاتا تھا۔ کون ہے جو اس برصغیر میں "ستی" کی رسم اور عورتوں کے زندہ جلائے جانے کی تاریخ سے واقف نہ ہو، کون ہے جو عرب کے دور جاہلیت کی رسم "وَأد" یعنی لڑکیوں کو زمین میں زندہ دفن کر دینے کی عادت کو جانتا نہ ہو۔ بلا شبہ اسلام کا نسلِ انسانی پر یہ ایک عظیم احسان ہے کہ اس نے اس انسانی محترم صنف کو اس کے تمام ضروری حقوق عطا کیے اور اسے انسانی معاشرہ میں وہ مقام دیا جس کا وہ پیدائشی طور پر ہر طرح کا کامل استحقاق رکھتی تھی۔ مذکورہ آیات بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ وہ وقت تھا جب کسی کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ میں اس کی بیوی کو بھی شامل سمجھا جاتا تھا اور وہ غریب بھی اسی طرح وارثوں کی ملکیت میں منتقل ہو جاتی تھی جس طرح ترکہ کی دوسری چیزیں۔ ورثہ اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ کرتے تھے جو میت کی چھوڑی ہوئی جائداد کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اسلام نے اس کا اعلان کیا کہ کسی میت کے ورثہ تو اس میت کی بیوہ کے جسم کے مالک بن سکتے ہیں اور نہ اس کے مال کے۔ جسم کے مالک بن ہی نہیں سکتے۔ البتہ اگر وہ عورت اپنی رضا اور اپنی خوشی سے اپنا ذاتی مال یا میت کے ترکہ سے اسے جو حق ملنا چاہئے اس کے کل یا جزو حصہ کو کسی شخص کو بھی دیدے تو ایسا کرنا اس کے لیے جائز ہوگا۔ جاہلیت کے زمانہ میں میت کے وارث اس کی مالدار بیوی کو یا کبھی خود شوہر اپنی بیوی کو طرح طرح کی سخت اذیتیں دیا کرتے تھے تاکہ وہ کچھ رقم دے کر اس عذاب سے اپنی جان چھڑا سکے۔ اسلام نے ان تمام ناانصافیوں اور ظلم و جور کو روک دیا اور ایسے معتدل اور منصفانہ ضوابط نافذ کر دیئے جو مردوں اور عورتوں سب کے لیے پوری طرح مناسب اور درست تھے۔ اس کے ساتھ ہی عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک عام اعلان فرما دیا گیا۔ "وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ" یعنی ان کے ساتھ اچھے طریقہ کا برتاؤ کیا کرو، اگرچہ یہاں خطاب صرف شوہروں کی طرف ہے اور انھیں اپنی بیویوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تعلیم دی جا رہی ہے مگر اس منصفانہ سلوک اور برتاؤ کے حکم میں سہاگن، بیوہ اور مطلقہ ہر قسم کی عورتیں شامل ہیں اور اسلام نے ان سب کے حقوق کی تعیین کر دی ہے تاکہ ان میں سے کوئی صنف دوسری صنف کے حقوق ضائع نہ کر سکے اور کوئی بھی اپنے حدود سے تجاوز نہ کرنے پائے۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ بقرۃ (آیت/۲۲۸) میں ارشاد ہوا ہے: "وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ص وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ" یعنی (دستورِ شریعت کے مطابق (مردوں پر عورتوں کے بھی) اسی طرح حقوق

ہیں جس طرح عورتوں پر مردوں کے حقوق ہیں اور ساتھ ہی یہ بات بھی ہے کہ عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کا درجہ کچھ بڑھا ہوا ہے۔

غرض اسلام نے ازدواجی زندگی اور عورت اور مرد کے حقوق واختیارات کی مکمل طور پر تعیین کردی ہے جس میں عدل وانصاف کی پوری قدریں موجود ہیں اور ظلم وجور اور حق تلفی کا اس میں ہلکا سا شائبہ بھی ممکن نہیں ہو سکتا۔

وَاِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ ۙ وَّاٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَاۗؤُكُمْ مِّنَ النِّسَاۗءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَاۗءَ سَبِيْلًا ۝ (۹۲)

(پ ۴ رکوع ۱۴ کی آخری ۳ آیات کریمہ۔ سورۃ النساء)

اور اگر تم ایک زوجہ کے بدلے دوسری زوجہ اختیار کرنا چاہو اور تم اس زوجہ کو مال کا انبار دے چکے ہو تو تم اس مال میں سے کچھ بھی واپس نہ لو کیا تم بہتان رکھ کر یا صریح گناہ کر کے اسے واپس لو گے اور تم اس کو کیسے واپس لے سکتے ہو حالانکہ تم ایک دوسرے سے ازدواجی روابط قائم کر چکے ہو اور وہ بیویاں تم سے ایک مستحکم اقرار لے چکی ہیں اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ دادا نکاح کر چکے ہیں مگر ہاں جو اس حکم سے قبل (یعنی ایام جاہلیت میں) ہو چکا وہ ہو چکا۔ بیشک یہ بڑی بے حیائی اور نفرت کی بات تھی اور بڑا برا طریقہ تھا۔

تشریح وتفسیر:- "بُھْتَان" کا لفظ "بُھْتٌ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حیران ہو جانا اسی بنا پر بہتان ایسے جھوٹے الزام کو کہتے ہیں جسے سنکر انسان حیران ہو جائے۔ مقصود یہ ہے کہ اس زوجہ کے کردار پر کوئی جھوٹا الزام جنسی گناہ یا نافرمانی کا از روئے ظلم لگایا جائے تاکہ اس بہانہ سے اس کو دی ہوئی رقم اس سے واپس لی جا سکے "اِثْمٌ" سے مراد وہ عمل ہے جو شرعی طور پر جائز نہ ہو یعنی گناہ۔ اس کی جمع "اٰثَام" آتی ہے۔ "سَلَف" کے کئی معنی آتے ہیں جب اسے خرید وفروخت کے متعلق بولا جاتا ہے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ مال کی قیمت پیشگی ادا کر دی جائے اس طریقہ کو "بیع سلم" بھی کہتے ہیں مگر جب لفظ "سلف" زمانہ

سے متعلق ہو لیں تو اس سے مراد وہ چیز ہوتی ہے جس کا زمانہ گذر گیا ہو۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل یعنی ایام جاہلیت میں جو غلط قسم کے ازدواجی معاملات ہو چکے تھے ان پر ان لوگوں سے کوئی باز پرس نہ کی جائے گی جو اسلام لے آئیں نہ یہ کہ وہ باتیں اُس وقت مباح اور جائز تھیں۔ جو ازدواجی تعلقات اب حرام ہیں پہلے بھی حرام تھے مگر معافی صرف اس وجہ سے دی گئی کہ احکام خداوندی زمانہ جاہلیت کے ان لوگوں تک نہیں پہنچے تھے اور وہ ان سے بے خبر تھے "مقت" کے معنی ہیں کسی شخص کو کوئی بُرا کام کرتے ہوئے دیکھ کر اس سے بغض اور نفرت کرنا۔ اس جگہ اس لفظ کے معنی ناخوشی اور ناراضگی کے ہیں۔ اس قسم کے نکاح جو زمانۂ جاہلیت میں حرام طریقوں سے کیے جاتے تھے اُنھیں "نکاح المقت" کہا جاتا تھا اس لیئے کہ اگرچہ ان کا اُس زمانہ میں رواج تھا مگر انھیں بہرحال اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اپنی بیوی کو طلاق دینا چاہے اور اس کی جگہ کسی دوسری عورت سے نکاح کرنا مطلوب ہو تو اس مرد کے لیئے یہ بات کسی طرح جائز نہ ہوگی کہ وہ اپنی پہلی زوجہ کو جو مہر دے چکا ہے خواہ وہ کتنا ہی زیادہ ہو اُسے کسی بہانہ سے واپس لے لے۔ اسی طرح کوئی رقم اگر اس نے علاوہ مہر کے بھی اپنی بیوی کو دی ہے خواہ اس کی مقدار کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اُس سب کو یا اس کے کسی جزو کو واپس لینا ممنوع ہے جبکہ اُس زوجہ کی کوئی خطا نہ ہو اور یہ شخص صرف اپنی ہوائے نفس کی خاطر اُس پر جنسی گناہ یا نافرمانی کا بہتان رکھ کر از روئے ظلم و جبر اس زوجہ کو نکالکر کوئی دوسری عورت اپنی زوجیت میں لانا چاہتا ہو محض اُس اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے جسے اگلی آیت میں بیان کیا گیا تھا کہ جب کوئی صریح بے حیائی کا گناہ یعنی نافرمانی یا جنسی گناہ عورت سے ظہور میں آئے تو اس کو مہر کی جو رقم شوہر سے مل چکی ہے اس کل رقم کو یا اس کا کوئی جزو بذریعۂ خلع واپس لے سکتا ہے یا زوجہ کا کوئی اور حق یا حقوق خلع کے عوض میں زوجہ سے معاف کرا سکتا ہے کیونکہ یہ اجازت صرف اس وقت تک ہے جبکہ زوجہ اپنے شوہر کی شدید نافرمانی یا جنسی گناہ کی مرتکب ہو اس اجازت سے اگر کوئی ناجائز طور پر فائدہ اٹھانا چاہے کہ اپنی زوجہ پر غلط الزامات لگا کر اس سے خلع کے ذریعہ چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش کرے تو ایسا خلع قطعاً صحیح نہ ہوگا اور شوہر اپنی زوجہ سے مہر یا اس کا کوئی حصہ بھی واپس نہیں لے سکتا اور نہ دوسرے شرعی حقوق کو معاف کرنے پر اُسے مجبور کر سکتا ہے۔ غرض

بہتان اور جھوٹا الزام لگا کر بلا جرم و خطا زوجہ کو دیئے ہوئے مال مہر کا کل یا جزو حصہ واپس
لینا جائز نہیں ہے۔ ان آیات میں ایک جگہ "قِنطَار" کا لفظ آیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ
مہر کی مقدار جسقدر بھی ہو خواہ وہ مال کا ایک انبار ہی کیوں نہ ہو غیر شرعی عنوان سے شوہر
کے لیئے اپنی زوجہ سے اُسے یا اس کے کسی جزو کو واپس لینا ممنوع ہے۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی
ہوا کہ مہر کی مقدار زیادہ سے زیادہ بھی ہو سکتی ہے یعنی لاکھوں کروڑوں روپیہ کا مہر مقرر کرنے
میں بھی کوئی حرج نہیں ہے حالانکہ احادیث میں مہر کے کم رکھنے کی ہدایت ہے چنانچہ حضرت
عبد اللہ بن عباس رضی کی ایک صحیح حدیث میں منقول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے
فرمایا "اِنَّ مِنْ خَیْرِ النساء اَیْسَرُهُنَّ صَدَاقًا" عورتوں میں افضل اور بہتر وہ عورت ہے جس کا
مہر کم اور آسان ہو۔ اسی طرح کی اور بھی حدیثیں منقول ہیں۔ اس کی تشریح اس طرح کی جا سکتی
ہے کہ اولاً لفظ "قنطار" سے محض مال مہر ہی مراد نہیں ہے بلکہ مہر کے علاوہ جو جو چیزیں شوہر
نے اپنی زوجہ کو ہبہ کی ہیں وہ بھی اس میں داخل ہیں اور ان چیزوں کو بھی شوہر بطریق ظلم واپس
نہیں لے سکتا دوسرے یہ کہ اگر "قنطار" سے مراد صرف مال ہی ہو تو آیت سے صرف مہر کی زیادتی
کا جواز ثابت ہو سکتا ہے اور احادیث سے اس جواز کی نفی ثابت نہیں ہوتی بلکہ اس زیادتی
کے مقابلہ میں کمی مہر کو افضل قرار دیا گیا ہے اس کا حاصل صرف یہ ہوگا کہ مہر کی مقدار کو بہت
زیادہ بڑھا چڑھا کر مقرر کرنا جائز تو ہے مگر مکروہ ہے اور اس کے مقابلہ میں سرور کائنات صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم نے مہر کی مقدار کم اور آسان رکھنے کو مستحسن اور افضل قرار دیا ہے۔ عام طور پر
ہوتا یہ ہے کہ کبھی تو مہر کی مقدار بڑھا چڑھا کر مقرر کرنے سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اپنی نمائش کی
جائے یا اس غرض سے ہوتا ہے کہ شوہر کسی حال میں بھی بیوی کو طلاق نہ دے سکے اور ہمیشہ اسکی
گردن بندھی رہے یعنی نہ تو وہ اس قدر رقم کبھی ادا کر سکے گا اور نہ اُس کے لیئے طلاق دینا
ممکن ہو سکے گا اور اس طرح وہ اپنے ایک شرعی حق سے زندگی بھر کے لیئے محروم ہو جائے گا
اور اس کا جواز صرف اس طرح نکالا جاتا ہے کہ شوہر اس بھاری مہر کو اپنے اوپر برداشت کرنے
کا زبانی اقرار کر رہا ہے محض اس امید پر کہ آئندہ اللہ اس کے لیئے اس کی سبیل پیدا کر سکتا
ہے کہ وہ مہر کی یہ لاکھوں اور کروڑوں کی رقم ادا کر سکے حالانکہ سر دست اس کے پاس اس کا
کوئی وسیلہ اور کوئی ذریعہ بظاہر موجود نہیں ہے اگرچہ زیادتی مہر کے جواز کی یہ صورت پیدا
کی جا سکتی ہے لیکن ذرا سے غور و فکر کے بعد آسانی سے یہ بھی محسوس کیا جا سکتا ہے کہ اس

میں حقیقت کس حد پر ہے اور تصنع، تکلف اور بناوٹ کس حد پر۔ اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قلت مہر کو قابلِ تحسین اور جس عورت کا مہر آسان اور کم ہو اس کو بہترین عورت قرار دیا ہے۔

اس کمی مہر کی فضیلت اور بہتری کا ایک بنیادی رخ یہ بھی ہے کہ اس صورت میں شوہر اور زوجہ کی باہمی محبت والفت اور آپس کے روابط و تعلقات بغیر کسی بیرونی دباؤ کے ہوں گے اور آپس میں سچی محبت ہوگی نہ کہ بناوٹی اور زبردستی کی اور دوسری صورت میں جبکہ شوہر اس مہر کی بھاری مقدار کو اپنے سر پر ایک پہاڑ محسوس کر رہا ہو آپس کے تعلقات میں بھی تلخی پیدا ہونا ناگزیر ہوگا۔ بہرحال احادیث میں ہمیں کمی مہر کی طرف متوجہ کر کے قرآن حکیم کی صحیح تفسیر اور معتدل و مناسب ترازدواجی زندگی کے ایک نہایت ہی خوشگوار رخ کی تعلیم دی گئی ہے۔

پھر ان آیات کے آخر میں سوتیلی ماؤں کے ساتھ ازدواج کی حرمت کا بیان ہے اس حکم میں باپ کے ساتھ دادا اور نانا بھی شامل ہیں۔ اس قسم کے نکاح زمانہ جاہلیت میں جائز تھے مگر اسلام نے اُن کی حرمت کا اعلانِ عام کر دیا۔ ان عورتوں میں آباؤ اجداد کی منکوحہ اور مطلقہ بیویاں بھی شامل ہیں اور وہ عورتیں بھی شامل ہیں جن سے کسی طرح کے بھی ان کے ازدواجی روابط ہوں خواہ وہ روابط شرعی ہوں یا غیر شرعی، حقیقی ہوں یا غیر حقیقی اور صرف ظاہری۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ غَفُورًا رَحِيمًا ۝ (۹۳) وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ۖ كِتَابَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَأُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَاءَ ذَٰلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ ۚ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ

مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ○

(پ ۴ رکوع ۱۵ کی آخری آیت اور پ ۵ کے پہلے رکوع کی ابتدائی ایک آیت۔ سورۃ النساء)

تم پر حرام کردی گئیں تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور بھائی کی بیٹیاں اور بہن کی بیٹیاں اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمھیں دودھ پلایا ہے اور تمہاری دودھ شریک بہنیں اور تمہاری بیویوں کی مائیں اور تمہاری بیویوں کی وہ بیٹیاں جو تمہاری پرورش میں رہی ہیں جن بیویوں سے تمہارے ازدواجی تعلقات قائم ہو ہوچکے ہوں لیکن اگر ابھی تک تم نے اپنی اُن بیویوں سے (نکاح کے بعد) ازدواجی تعلقات قائم نہیں کیے ہیں تو پھر تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جو بیٹے تمہاری نسل سے ہوں ان کی بیویاں بھی تم پر حرام ہیں اور یہ بات بھی حرام ہے کہ اپنی زوجیت میں دو بہنوں کو جمع کرلو مگر ہاں جو کچھ (جاہلیت میں) ہوا وہ ہوچکا۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا بڑا مہربان ہے۔ اور وہ عورتیں بھی حرام کی گئی ہیں جو کسی کے نکاح میں ہوں۔ سوائے اُن عورتوں کے جو جہاد میں قید ہو کر تمہارے قبضہ میں آجائیں۔ ان احکام کو اللہ نے تم پر فرض کیا ہے اور جو (عورتیں) اُن (عورتوں) کے علاوہ ہیں جن کا بیان ہوا وہ تمہارے لیے جائز کردی گئی ہیں اس طرح کہ تم انھیں اپنے اموال کے ذریعے حاصل کرو (یعنی مال مہر یا کنیز کی قیمت سے) جبکہ تمہارا مقصود عفت کی زندگی قائم کرنا ہو نہ یہ کہ مال صرف کرنے کی غرض محض جنسی بے راہ روی ہو۔ تو جن عورتوں سے تم نے فائدہ اٹھایا ہے اُن کا جو مہر مقرر ہوچکا ہو وہ انھیں ادا کردو اور مہر مقرر ہوجانے کے بعد جو کچھ تم آپس کی رضامندی سے طے کرلو اس میں تم پر کچھ گناہ نہیں۔ بیشک اللہ بڑا جاننے والا بڑا حکمت والا ہے۔

تشریح وتفسیر:- "رَضَاعَۃٌ" اور "رِضَاعَۃٌ" "ر" پر زبر اور زیر کے ساتھ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ اس جگہ "ر" پر زبر کے ساتھ ہے۔ اس سے یہاں مراد یہ ہے کہ شریعت کے مقرر کردہ اصول وضوابط وشرائط کے ساتھ بچہ کسی عورت کا دودھ پیے۔

"رَبَائِبُ" "رَبِیْبَۃٌ" کی جمع ہے۔ یہاں مراد وہ لڑکیاں ہیں جو کسی عورت کے پہلے شوہر سے ہوں اور وہ انھیں اپنے دوسرے شوہر کے یہاں اپنے ساتھ لائے اور وہ اس دوسر

شوہر کے زیر تربیت ہوں "حُجُوْرٌ" جمع ہے "حِجْرٌ" کی۔ اس لفظ کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ یہاں اس کے معنی آغوش کے ہیں۔ مگر اصل میں اس مقام پر مقصود پرورش اور تربیت ہے۔ "جُنَاحٌ" سے گناہ مراد ہے جبکہ "جَنَاحٌ" جیم پر زبر کے ساتھ "بازو" کو کہتے ہیں "حَلَائِل" "حَلِیْلَةٌ" کی جمع ہے جس کے معنی زوجہ کے ہیں۔ پھر جو عورت آزاد ہو یعنی کنیز نہ ہو اور شریف یا پاکدامن ہو اس کو "مُحْصِنَةٌ" صاد پر زیر کے ساتھ بھی کہتے ہیں اور "مُحْصَنَةٌ" صاد پر زبر کے ساتھ بھی۔ لیکن جب کبھی اس لفظ کو حکم تحریم کے ساتھ بولا جائے گا تو اس سے ان ہی صفتوں کی وہ عورت مراد ہوگی جو شادی شدہ ہو کیونکہ اس طرح عام حکم تحریم کا تعلق شادی شدہ عورتوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ غیر شادی شدہ صاحب عفت و شرف عورتوں کے لیے مطلق اور عام حکم تحریم نکاح کوئی معنی نہیں رکھتا "سِفَاحٌ" کے معنی جنسی بے راہ روی کے ہیں "اِسْتِمْتَاعٌ" فائدہ اور نفع اٹھانے کو کہتے ہیں "فَرِیْضَةٌ" سے یہاں مقصود وہ مہر ہے جو شرعی قانون کے مطابق مقرر اور معیّن ہو چکا ہو۔

اس سلسلہ آیات میں "حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ" فرما کر ان عورتوں کی بنیادی اور جامع فہرست بیان کر دی گئی ہے جن سے نکاح کرنا حرام ہے اس قسم کی تفصیل توراۃ و انجیل میں موجود نہیں ہے۔ قرآن حکیم نے تحریم نکاح کے ان احکام کو اپنے معجزانہ انداز میں بیان کیا ہے اور ایسی مکمل جامعیت کے ساتھ جو نسب، رضاعت اور تمام ازدواجی رشتوں پر حاوی ہے۔ یہ قرآن پاک کی وہ معجزانہ خصوصیت ہے جو کسی دوسری الہامی کتاب میں نہیں پائی جاتی یہاں "اُمَّهَاتُکُمْ" میں ماؤں سے مراد اصلی مائیں اور ماں باپ کی مائیں یعنی دادیاں، نانیاں سب ہی ہیں "بَنَاتُکُمْ" میں بیٹیوں کے لفظ میں پوتیاں، نواسیاں سب شامل ہیں اسی طرح "اَخَوَاتُکُمْ" میں بہنوں کے لفظ کی وسعت میں حقیقی، سوتیلی یعنی علاتی اور مادری یعنی اخیافی بہنیں سب ہی داخل ہیں "عَمّٰتُکُمْ" میں پھوپھیوں کے لفظ میں باپ اور اس کے اوپر کے اجداد کی سب بہنیں آگئیں خواہ وہ حقیقی ہوں یا سوتیلی اور مادری اسی طرح "خٰلٰتُکُمْ" کے لفظ میں ماں کی بہن اور ماں کی دادیوں اور نانیوں کی بہنوں کا ہر طبقہ آگیا خواہ وہ نسبی تینوں قسم کی بہنیں ہوں یا رضاعی ہوں۔ بھتیجیوں میں ہر قسم کے بھائیوں کی بیٹیاں اور بھانجیوں میں ہر قسم کی بہنوں کی بیٹیاں شامل ہیں پھر رضائی ماؤں اور بہنوں کا ذکر ہے۔ اس میں بھی وہ سب

رشتے حرام ہیں جو نسب میں حرام کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد بیویوں کی ماؤں کے ساتھ نکاح کی حرمت
کا بیان ہے۔ اس حکم میں ان کی اصلی مائیں، دادیاں اور نانیاں نیز رضاعی مائیں اور ان کے اوپر
کے رشتے سب ہی شامل ہوں گے۔ لفظ "رَبَائِبُ" کے مفہوم میں بیویوں کی ان کے پہلے شوہر
سے ہر قسم کی بیٹیاں، پوتیاں اور نواسیاں سب شامل ہیں خواہ وہ دوسرے شوہر کے زیر پرورش ہوں
یا نہ ہوں۔ اسی کے ساتھ یہ بھی سمجھا دیا گیا ہے کہ بیویوں کے پہلے شوہر سے یہ ربیبہ بیٹیاں صرف ایسی
ہی صورت میں حرام ہوں گی جبکہ بیویوں کے ساتھ ازدواجی روابط قائم ہو چکے ہوں لیکن اگر ابھی تک
یہ روابط عملی صورت میں نہیں آئے ہیں اور طلاق ہو گئی تو ایسی صورت میں وہ ربیبہ حرام نہ ہوگی۔ اسکے
بعد بیٹوں کی بیویوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ ان میں پوتے نواسے شامل ہیں۔ اور رضاعی بیٹوں کا
بھی وہی حکم ہے جو نسبی بیٹوں کا حکم ہے۔ اس بات کی طرف بھی توجہ رہنا چاہیے کہ اس جگہ پر
"مِنْ اَصْلَابِکُمْ" کا جملہ فرما کر صرف صُلبی اور نسبی بیٹوں ہی کا ذکر ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایام
جاہلیت کے لوگ مُتَبَنّٰی یعنی لے پالک لڑکے کی بیوہ یا مطلّقہ کو بھی اصلی بہو کی طرح ہی حرام سمجھتے
تھے اس بنا پر "مِنْ اَصْلَابِکُمْ" کا خصوصیت سے ذکر کر دیا گیا تاکہ یہ غلط فہمی دور ہو جائے
ورنہ رضاعی بیٹوں کا حکم بھی وہی ہے جو نسبی اور صُلبی بیٹوں کا حکم ہے کیونکہ سرور کائنات صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کی متفق علیہ حدیث ہے: "یَحْرُمُ مِنَ الرَّضَاعِ مَا یَحْرُمُ مِنَ النَّسَبِ" یعنی جس
قسم کے نسبی رشتہ داروں کے ساتھ نسب کی وجہ سے نکاح حرام ہے اسی قسم کے رضاعی
رشتہ داروں سے رضاعت کی وجہ سے بھی نکاح حرام ہے۔ جہاں تک رضاعت کا تعلق ہے
اس کی شرطیں اور تفصیلی حکم فقہ کی کتابوں میں تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔ اس کے بعد ایک
عام حکم بتایا گیا ہے کہ شوہر دار عورتوں سے بھی ازدواجی تعلقات قائم کرنا حرام ہیں مگر اس
حکم سے صرف وہ عورتیں الگ ہیں جو جہاد میں مسلمانوں کے شرعی قبضہ میں آئی ہوں اور ان کے
شوہر دار الحرب میں زندہ موجود ہوں تو وہ عورتیں یعنی شرعی کنیزیں۔ قانون شریعت کی تفصیلات
کے مطابق حلال ہیں۔ اُن عورتوں کے علاوہ جن کی تفصیل کی طرف پہلی آیت میں انتہائی
جامعیت کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے۔ حرمت نکاح کی ان مزید صورتوں کی شمولیت کے
ساتھ جن کا بیان حدیث و سنت میں اسی آیت کی تشریح کے طور پر ثابت اور مسلّم ہے، دوسری
تمام عورتیں قانونِ شریعت کی بیان کردہ شرطوں کے ساتھ جائز ہوں گی۔ اس سلسلہ
میں فرمایا گیا ہے کہ وہ عورتیں آزاد ہوں یا کنیزیں ہوں انھیں تم قواعدِ شرع کے مطابق مہر یا قیمت

کے ذریعہ حاصل کر سکتے ہو لیکن ہر طرح یہ بات ضروری ہے کہ یہ ازدواجی تعلق باضابطہ زندگی اور عفّت و پاکیزگی کی زندگی گذارنے کے لیئے ہو اور قانون شرع کے مطابق ہو اور قطعاً اس ازدواجی تعلق میں جنسی بے راہ روی اور بے ضابطگی اور جانوروں کی طرح کی سی آزاد جنسی زندگی کا شائبہ بھی نہ آنے پائے ورنہ یہ روابط جائز نہ ہوں گے اور اس سلسلہ میں جو مال صرف ہو گا اس کی بھی اجازت نہ ہوگی۔ آخر میں فرمایا گیا ہے کہ جن عورتوں سے تم نے نکاح کا فائدہ حاصل کیا ہے انھیں ان کے مہر ادا کر دو کیونکہ یہ ان کا حق ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی تمھیں اس کی بھی اجازت ہے کہ تم میاں بیوی تقرر مہر کے بعد آپس کی رضامندی سے اس نکاح کی تفصیلات میں کچھ کمی بیشی کر لو اس آیۂ استمتاع کی تفسیر میں ابتدا ہی سے دو مکتب خیال قائم رہے ہیں اہلسنّت اس کی تفسیر دائمی نکاح کے ساتھ کرتے ہیں اور فقہ آل محمد علیہم السلام اس سے عقد منقطع یعنی غیر دائمی نکاح کے جواز کو ثابت کرتے ہیں اسی بنا پر "فِيمَا تَرَاضَيْتُمْ" کی تفسیر ہر ایک مکتب خیال کے نزدیک اُس کے مسلک کے مطابق ہوگی جس کی تفصیل کتب تفسیر میں پوری وضاحت کے ساتھ موجود ہے وہاں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ غرض فقہ آل محمد علیہم السلام کے مطابق اس سے جواز متعہ ثابت ہے۔

(درس ۹)

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا أَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ۗ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِإِيْمَانِكُمْ ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ وَآتُوْهُنَّ أُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ أَخْدَانٍ ۚ فَإِذَآ أُحْصِنَّ فَإِنْ أَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ۚ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ۚ وَأَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ○ يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ○ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۗ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ أَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ○

(پ ۵ کے پہلے رکوع کی آخری ایک آیت اور رکوع ۲ کی ابتدائی ۳ آیات سورۃ النساء)

اور جو شخص تم میں سے اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ صاحب شرف آزاد مسلمان عورتوں سے

نکاح کر سکے تو وہ تمہاری مسلمان کنیزوں سے جو تمہاری شرعی ملک میں ہیں نکاح کرے اور
اللہ تمہارے ایمان کو خوب جانتا ہے تم سب آپس میں ایک ہی ہو تو اُن کے مالکوں کی اجازت
سے اُن کے ساتھ نکاح کر لیا کرو اور اُن کے مہر انھیں دیدیا کرو دستور کے مطابق اس طرح کر
وہ عفّت کی زندگی گذاریں نہ یہ کہ وہ کنیزیں جنسی بے راہ روی کریں اور نہ یہ کہ وہ لوگوں سے خفیہ
ربط ضبط قائم کریں۔ پس جب وہ قیدِ نکاح کی پابند ہو جائیں اور پھر بے حیائی کا ارتکاب
کریں تو ان کے لیے اُس سزا کا نصف ہے جو صاحبِ شرف آزاد عورتوں پر مقرر ہے
کنیز کے ساتھ نکاح کر لینے کا یہ حکم اُس شخص کے لیے ہے جسے گناہ میں
مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو اور اگر تم صبر سے کام لو تو تمہارے لیئے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ بڑا بخشنے والا
بڑا مہربان ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیئے سب حکم کھول کر بیان کر دے اور تمہیں تم سے پہلے
گذر جانے والوں کے طریقے بتائے اور تم پر مہربانی فرمائے اور اللہ بڑا علم والا بڑا حکمت والا ہے۔
اور اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے حال پر مہربانی کرے اور جو لوگ خواہشاتِ نفس کے پیرو ہیں وہ
یہ چاہتے ہیں کہ تم سیدھی راہ سے بھٹک کر بہت دور ہو جاؤ

تشریح و تفسیر:۔ "طَوْلٌ" کے معنی استطاعت اور وسعت کے ہیں۔ "اَلْمُحْصَنٰتِ
الْمُؤْمِنٰتِ" میں "مُحْصَنٰت" سے مراد شریف اور آزاد عورتیں ہیں یعنی جو کسی کی کنیز نہ ہوں
اور اسی آیت میں دوسری جگہ "مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ" میں "مُحْصَنٰت" سے مقصود وہ کنیزیں
ہیں جو نکاح کی پابندی میں داخل ہو چکی ہوں "فَتَيٰت" جمع ہے "فَتَاةٌ" کی جس کے
معنی نوجوان عورت کے ہیں مگر جب اس لفظ کو کنیزوں کے لیئے بولا جاتا ہے تو اس میں عمر کی قید
نہیں رہتی بلکہ جوان اور بوڑھی ہر طرح کی کنیزوں پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔ "اُجُوْر"
"اَجْرٌ" کی جمع ہے یعنی اجرت اس جگہ اس سے مقصود مہر ہے "مُتَّخِذٰتِ اَخْدَان"
سے مراد وہ عورتیں ہیں جو در پردہ طریقہ پر لوگوں سے ناجائز ربط ضبط رکھتی ہوں "عَنَتٌ"
اصلی معنی ضرر و فساد کے ہیں لیکن یہاں اس سے مراد جنسی بے ضابطگی اور بے راہ روی ہے۔
"سُنَنٌ" "سُنَّةٌ" کی جمع ہے۔ یہاں اس سے مراد گذشتہ شریعتوں کے احکام اور انبیاء و
مرسلین علیہم السلام کے واقعات و حالات ہیں۔ اس کے قبل کی آیات میں اُن عورتوں کا ذکر
فرمایا گیا تھا جن سے نسبی، رضاعی یا ازدواجی رشتوں کی بعض صورتوں میں نکاح حرام ہے

جس کی کچھ تفصیل گذشتہ درس میں بیان کی جا چکی ہے اور باقی تفصیلات فقہ کی کتابوں میں
موجود ہیں۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جس شخص کو اس بات پر قدرت اور استطاعت نہ ہو کہ وہ صاحب
شرف، ایماندار اور آزاد یعنی جو کنیز نہ ہوں ایسی عورتوں سے نکاح کر سکے اور ان کا مہر ادا کر سکے
تو اس کے لیئے اس کی اجازت ہے کہ وہ کسی مسلمان کنیز سے عقد کر لے کیونکہ اس میں مہر کی کمی اور
دوسری سہولتیں حاصل ہوں گی اور ان کنیزوں کے مسلمان مالک انھیں غریب شوہروں کے عقد
میں دینے میں اپنی کوئی سُبکی محسوس نہ کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوا ہے کہ جہاں تک
ایمان کے اصلی مرتبہ کا تعلق ہے اللہ ہی کی ذات ہے جو اس سے پوری واقفیت رکھتی ہے کہ کس کا
ایمان زیادہ ہے اور کس کا کم ہے اس لیے جسقدر بھی مسلمان اور اہل ایمان ہیں وہ سب ظاہر میں
بحیثیت مومن اور مسلمان ہونے کے آپس میں ایک دوسرے کے برابر درجہ رکھتے ہیں خواہ وہ
غلام اور کنیز ہو یا مالک و آقا ہو، غریب ہو یا امیر ہو، حاکم ہو یا محکوم ہو اور کسی نسل اور کسی قوم سے تعلق
رکھتا ہو۔ غرض بحیثیت مسلمان ہونے کے سب کے سب یکساں ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ کسی کا رتبہ
ایمان اور تقویٰ میں دوسرے سے زیادہ ہے یا نہیں اس کو تو سوائے اللہ کے کوئی دوسرا نہیں جانتا
اس بنا پر یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ کسی مسلمان مرد یا عورت کو صرف اس کے غلام اور کنیز ہونے
کی وجہ سے حقیر سمجھنا کسی طرح درست نہیں ہے اور اس وجہ سے کسی مسلمان کو کسی مسلمان کنیز کے ساتھ
عقد کر لینے میں کوئی عار اور سُبکی محسوس نہ ہونا چاہیئے اس بنیاد پر کہ وہ آزاد نہیں کنیز ہے۔ کیونکہ وہ
باعتبار ایک مسلمان ہونے کے ہر مسلمان کے برابر حیثیت رکھتی ہے اور ہو سکتا ہے کہ مرتبۂ ایمانی
و اسلامی میں وہ کنیز اس آزاد مسلمان مرد سے اللہ کے نزدیک زیادہ بھی ہو جس کا علم سوائے اُسکے
کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ کنیزی اور غلامی تو صرف عارضی چیزیں ہیں۔ آقا
اور غلام و کنیز سب اولادِ آدم علیہ السّلام ہیں۔ اور اس طرح نسلی حیثیت سے بھی کسی کو دوسرے
پر فوقیت اور برتری حاصل نہیں ہے۔ "بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ" کے جملہ سے اسی مساواتِ انسانی
کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے تاکہ مسلمان معاشرے کا ہر فرد Superiority Complex
یعنی احساس برتری اور Inferiority Complex یعنی احساس کمتری کے ذہنی مرض سے
محفوظ رہ سکے اور کسی بھی انسانی فرد یا انسانی طبقہ کو صرف اُس کی غربت و افلاس یا اُس کی غلامی
کی وجہ سے حقیر و ذلیل نہ سمجھنے لگے۔ مختصر یہ کہ اس طرح اسلام نے پوری نوع بشر کو انسانی مساوات
کی تعلیم دی ہے اور مسلمان آزاد مردوں کو یعنی جو کسی کے غلام نہ ہوں کنیزوں کے ساتھ عقد کرنے کی

اجازت دی ہے اور اُن کنیز بیویوں کو وہ تمام ازدواجی حقوق دیئے گئے ہیں جو ہر طرح ظلم و ناانصافی
سے پاک ہیں۔ مگر شرط یہی ہوگی کہ ان مسلمان کنیزوں کے مالکوں سے اس کی اجازت بھی حاصل
کی جائے اور جس قدر بھی مہر مقرر ہو وہ ان کے مالکوں کو ادا کیا جائے اس لیئے کہ بحیثیت مالک
ہونے کے وہی اس کے حقدار ہوں گے۔ اس تشریح سے یہ بات بھی واضح ہوگئی ہوگی کہ جہاں
کنیز سے نکاح کرنے کی اجازت دی گئی ہے وہاں مراد کسی دوسرے مسلمان شخص کی مسلمان
کنیز ہے نہ کہ خود اپنی کنیز کیونکہ خود اپنی کنیز سے عقد نہیں ہوتا بلکہ اس کا خرید لینا اور اس کا اپنی ملک
میں آجانا ہی کافی ہوتا ہے۔ کنیزوں سے عقد کے جواز کا حکم ان لوگوں کے لیئے ہے جو غیر شادی شدہ
زندگی بسر کرنے پر صبر نہ کر سکیں اور اسقدر استطاعت بھی نہ رکھتے ہوں کہ کنیزوں کے سوا
دوسری پاکدامن و باعصمت عورتوں کا مہر ادا کر سکیں مگر ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر ان کے
لیئے برداشت کرنے کا امکان ہو تو صبر کرنا ہی ہر حال میں بہتر ہوگا۔ اس نکاح کی غرض بھی یہی ہے
کہ جن کنیزوں سے عقد کیا جائے اُن کی بے ضابطہ جنسی زندگی کو درست کیا جائے، انھیں بے
حیائی سے بچایا جائے اور قانون شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا جائے۔
پھر یہ بھی بتایا گیا کہ اگر کنیزیں نکاح کے بعد بھی کسی بے راہ روی اور بے حیائی کا ارتکاب کریں
تو ان کی سزا اُن بن بیاہی عورتوں کی سزا سے آدھی ہوگی جو آزاد ہوں یعنی کنیز نہ ہوں یہاں
یہ بات ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ اس سلسلہ میں بن بیاہی عورت اور بن بیاہے مرد کی سزا سو کوڑے
ہیں تو کنیز کی سزا پچاس کوڑے ہوں گے۔ یہی سزا غلام کی بھی ہوگی جو نکاح کے بعد یعنی
شادی شدہ ہو جانے کے بعد اس قسم کے عمل کا ارتکاب کرے۔ یہی پچاس کوڑوں کی سزا
اس غلام اور کنیز کی بھی ہے جو بن بیاہے ہوں جبکہ اُن شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی سزا
جو آزاد ہوں یعنی غلام نہ ہوں سنگسار کرنا ہے جسے "رجم" کہتے ہیں۔ پھر آخر میں ارشاد ہوا ہے
کہ اللہ کی مرضی یہی ہے کہ وہ اپنے تمام احکام کو تمہارے لیئے صاف صاف بیان کر دے
اور تمہیں ان انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے طریقوں سے آگاہ کرے جو تم سے قبل گذر چکے
ہیں، تمہارے گناہوں کو بخشے اور تم پر نظر رحم و کرم فرمائے۔ یہ سب اسی لیئے کہ تم حق کو پوری
طرح سمجھ لو اور اسی کو اختیار کرو۔ ظاہر ہے کہ شرعی احکام کی تعلیم اور تبلیغ کے بغیر کسی تکلیف
شرعی کے نافذ کرنے کا امکان ہی نہ تھا اس لیے احکام شریعت کی تشریح پہلے سے ضروری
تھی جو کتب الٰہیہ اور انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے کی گئی۔ اسی کے ذیل میں یہ بھی بتا دیا گیا

ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر رحیم ہے اور وہ چاہتا ہے کہ اُن سے برائیاں دور ہیں اور وہ گمراہیوں میں مبتلا ہو کر تباہ و برباد نہ ہوں مگر جو لوگ حق کے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں اور خواہشاتِ نفسانی کے پیرو ہیں وہ اسی کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ تمہیں اے مسلمانو! صراط مستقیم سے ہٹا دیں اور تم اللہ کے راستہ کو چھوڑ کر شیطان کے فریب میں گرفتار ہو جاؤ اس لیے تمہیں اس کی مکاریوں اور دھوکے اور دغا سے ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ نجات صرف اللہ کے حکم پر چلنے ہی میں ہے اور دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود محض اسی بات میں منحصر ہے کہ انسان ان احکام و ہدایات پر دل سے عمل کرے جو پیغمبروں کے ذریعہ سے اللہ نے اس کی رہنمائی کے لیے مقرر کیے ہیں اور یہ احکام وہ ہیں جو انسان کی خلقت کے ضعف کو دیکھتے ہوئے اس کی استطاعت اور قدرت و طاقت سے ہرگز زیادہ نہیں ہیں بلکہ بہت ہی سہل و آسان ہیں جنہیں وہ بڑی آسانی سے انجام دے سکتا ہے اور اس کے باوجود ان احکام میں بھی ہر طرح کی مزید سہولت کی گنجائش رکھی گئی ہے اور کسی موقع پر بھی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا گیا ہے۔ اس کے بعد بھی جو کوئی اللہ کی اس ہدایت سے فائدہ نہیں اٹھاتا اس سے زیادہ کون سی مخلوق بدنصیب ہو سکتی ہے!

(درس ۹۵) وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ ــــــــــــــــــ

تَنْبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِیْنَ ○ وَاِنَّ لَکُمْ فِی الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ؕ نُسْقِیْکُمْ مِّمَّا فِیْ بُطُوْنِهَا وَلَکُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ کَثِیْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْکُلُوْنَ ○ وَعَلَیْهَا وَعَلَی الْفُلْکِ تُحْمَلُوْنَ ○

(پ ۱۸ رکوع ① کی آخری ⑥ آیات کریمہ ۔ سورۃ المومنون)

(ترجمہ): اور ہم نے تمہارے اوپر سات آسمان بنائے ہیں اور ہم (اپنی) مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں اور ہم نے ایک اندازہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اُس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم ہی اُس کے ہٹا دینے پر قدرت رکھنے والے ہیں پھر ہم نے اُس کے ذریعہ سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے، اُن میں تمہارے لئے بکثرت میوے ہیں اور اُن میں سے تم کھاتے ہو اور ایک دوسرا درخت بھی جو طور سینا میں پیدا ہوتا ہے وہ تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوئے اُگتا ہے اور بیشک تمہارے مویشیوں میں غور کرنے کا موقع ہے۔ ہم تمہیں اُن کے شکموں کی ایک چیز (یعنی دودھ) پینے کے لئے دیتے ہیں اور (یقیناً) تمہارے لئے اُن میں بہت سے فائدے ہیں اور اُن میں سے بعض کو تم کھاتے بھی ہو اور اُن پر اور کشتیوں پر تم سوار پھرتے ہو۔

تشریح و تفسیر:

" وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِیْنَ " تک الفاظ کی تشریح کی جا چکی ہے اب اس درس میں اس کے بعد کی آیات کے مشکل لفظوں کی تشریح کیجاتی ہے " اَنْعَامٌ "، " نَعَمٌ " کی جمع ہے جس کے معنی چوپایہ کے ہیں جیسے اونٹ، بکری، گائے وغیرہ ــــ " عِبْرَةٌ " کے معنی نصیحت اور حالات و واقعات پر غور و فکر کرتے کے آتے ہیں۔ اس کی جمع " عِبَرٌ "، آتی ہے " نُسْقِیْکُمْ " سَقْیٌ "، سے بنایا گیا ہے۔ معنی ہیں پانی پلانا۔

اسی سلسلہ کے کچھ لفظ اور بھی ہیں جیسے " سِقَاءٌ " مشک۔ " سَاقِیْ " پلانے والا۔ " سَقَّاءٌ " مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت زیادہ پانی پلانے والا۔ " بُطُوْنٌ "، " بَطْنٌ "،

کی جمع ہے۔شکم کو کہتے ہیں۔ " فُلْكِ " کے معنی کشتی کے ہیں۔ یہ لفظ مذکر و مونث اور واحد و جمع ہر حالت میں ایک ہی طرح بولا جاتا ہے۔ " تُحْمَلُوْنَ " کا مادۂ " حَمْل " ہے معنی ہیں اُٹھانا۔ یہ جمع مجہول کا صیغہ ہے۔لفظی معنی ہیں۔ تم اُٹھائے جاتے ہو، یعنی تم اُن مویشیوں اور چوپایوں کی پیٹھوں پر سوار کیئے جاتے ہو اور کشتیوں پہ بھی اسی طرح سوار ہوتے ہو۔

اِس سورہ کی ابتدا میں مومن کی صفتیں بیان ہو چکی ہیں اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ بلندی ایمان اُس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جبتک یہ صفات کسی شخص میں نہ پائی جائیں اور اس کے ساتھ اللہ کی معرفت بھی اُس حد تک حاصل نہ ہو جائے جو حصولِ ایمان کے لئے ضروری ہے۔ پھر یہ بتایا گیا کہ جس اللہ کی تم کو معرفت حاصل کرنا ضروری ہے اُس کی صنعتیں بے حساب ہیں اور زمین سے آسمان تک اُس کی قدرت کے نمونے ہر ہر ذرہ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ نہ تو کوئی گِننے والا انھیں گن سکتا ہے اور نہ کوئی عقل رکھنے والا اُن کی اصلیت، و حقیقت تک پوری رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اُسی نے انسان کی تخلیق کی اُسے مٹی کے جوہر سے بنایا اور اُس مٹی کے پتلے کو روح دیکر زندگی سے ہمکنار کر دیا پھر وہی اُسے موت بھی دے گا اور موت کے بعد قیامت میں دوبارہ زندہ کرے گا۔ اس کے بعد یہ بات بھی بتادی کہ جو اللہ اس چیز پر قدرت رکھتا ہے کہ انسان جیسی مخلوق پیدا کر دے اُسی نے آسمان بھی خلق کیئے ہیں اور زمین بھی پیدا کی ہے اور وہی اکیلا خالق ہے جس نے آسمان و زمین کے درمیان کی ہر چیز خلق فرمائی ہے۔ اُسی نے بلندی سے پانی کو اُتارا اور زمین کے اندر اُسے ٹھہرا دیا، تاکہ وہ کنووں، نہروں اور دریاؤں اور سمندروں کی صورت میں اللہ کی مخلوق کو فائدہ دیتا رہے ساتھ ہی یہ بھی بتادیا کہ وہ اس پانی کے ہٹا دینے پر قدرت رکھتا ہے اور جب چاہے اسے ہم سے چھین سکتا ہے۔ یہ بڑے بڑے سمندر خشک ہو سکتے ہیں۔ میٹھے پانی کے یہ کنویں کھاری ہو سکتے ہیں اور زمین پہ بہتا ہوا اور کروٹیں لیتا ہوا پانی اس طرح سوکھ سکتا ہے کہ اُس کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔ پھر کھیتوں، باغوں، پھلوں اور پھولوں وغیرہ کی نعمتیں یاد دلا کر اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ یہ چوپایوں کی تخلیق بھی کسقدر عجیب و غریب اور کتنی عظیم ہے اور اس میں غور و فکر کرنے کا انسان کیلئے کتنا بڑا موقع ہے۔ دیکھو تو یہ چوپائے دانہ، گھاس اور نہ معلوم کیا کیا کھا جاتے ہیں مگر اس کے بعد بھی اُن کے پیٹ سے دودھ جیسی غذا نکلتی ہے۔ اُس خس و خاشاک سے ایسی اچھی

اور لذیذ اور پاک و پاکیزہ غذا ہونا کیسی بڑی قدرت و صنعت جس پر اللہ کے سوا کوئی بھی قدرت نہیں رکھتا۔
اور یہ بھی کسقدر عبرت کا مقام ہے کہ کسی دودھ دینے والے جانور نے ہمیں ملاوٹ کرکے دودھ
نہیں دیا اور اللہ نے اُس کو جو نعمتِ شیر بخشی تھی وہ اسی طرح اُس نے اصلی حالت میں ہمارے سپرد کردی
اب ایسی حالت میں ہم اُس انسان کے لئے کیا رائے قائم کرینگے جو عقل و تمیز رکھنے کے باوجود اور
فہم و شعور ہوتے ہوئے بھی اللہ کی اس نعمت کو ملاوٹ کرکے خراب کر دیتا ہے۔ بلاشبہ ایسا انسان
اُس بے فہم جانور سے بدرجہا بدتر ہوگا جو اللہ کی نعمت کو تبدیل کرکے اپنے کو اس سے پست بنا کے اور
ساتھ ہی اپنے اس عمل سے اللہ کی نعمت پر ناشکری کا عملی ثبوت بھی دے دے۔ دیکھنے میں تو
ملاوٹ کا جُرم ایک معلوم ہوتا ہے مگر نتیجہ بھی اُس سے اس ایک جرم کے ضمن میں بہت سے جرم
ظہور میں آجاتے ہیں۔ اُسنے اللہ کی اچھی نعمت کو خراب کر دیا، اُس نے اپنے اس عمل سے دوسرے
بیگناہ انسانوں کو فریب دیا، اصلی چیز میں ملاوٹ کی اور اصلی کے دام لئے، اُسنے اُس بے خطا
جانور کا بھی جرم کیا کہ اُس کی امانت میں خیانت کی اور اُس بے زبان کی طرف اس ملاوٹ کئے ہوئے
دودھ کو منسوب کر دیا حالانکہ یہ عمل خود اس انسان کا تھا مگر اس نے اُس جانور کی بے زبانی
سے غلط فائدہ اُٹھایا۔ اس ملاوٹ سے دوسرے انسانوں کی تندرستی کو جو نقصانات پہنچتے ہیں اُن
سب کا عذاب بھی اسی ملاوٹ کرنے والے کی گردن پڑ گیا۔ پھر اس طرح کے کاروبار سے کمائے ہوئے
پیسے بھی حاصل کرنا حرام ہے اور اُن کا ہر مصرف ناجائز و حرام ہے۔ ان سب باتوں کا مواخذہ اُسی
انسان سے ہوگا جو ملاوٹ کرتا ہے۔ اس طرح یہ دیکھنے میں تو صرف ایک ہی گناہ ہے مگر حقیقت
میں گناہوں کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو ملاوٹ کرتے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ

وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ○

درس ۹۶

یہ قرآنِ حکیم کے سورۂ مومنون کی چند آیات ہیں جن کا ترجمہ اور تشریح اس سے قبل کی جاچکی ہے۔ اب اس سلسلہ کی پہلی آیت کی بقیہ تفسیر بیان کی جاتی ہے۔ اس سے قبل یہ کہا جاچکا ہے کہ کائنات کی ہر چیز کا خالق اللہ ہے اور کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جو اُس کی قدرت اور علم و نگہبانی سے باہر ہو۔ اسی کے ساتھ آسمانوں اور زمین کی پیدائش کا بھی ذکر کردیا گیا اور قرآن کے بہت سے مقامات پر انسان کی پیدائش کے ذکر کے ساتھ آسمان و زمین کا تذکرہ موجود ہے۔ سورۃ المؤمن میں اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "آسمانوں اور زمین کا خلق کرنا انسانوں کو پیدا کرنے کی بہ نسبت زیادہ بڑا کام ہے مگر اکثر لوگ اسے نہیں جانتے ——— اندھا اور آنکھوں والا آپس میں برابر نہیں ہوتے۔ اور نہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کیے اور وہ جو بدکار ہیں آپس میں برابر ہوسکتے ہیں۔ یعنی یہ ایسی کھُلی ہوئی حقیقتیں ہیں جن سے کسی انسان کو بھی اندھا بننا جائز نہیں ہوسکتا بلکہ اسکو تو اندھے بھی جانتے ہیں کہ خدا کی نعمتیں ہر جگہ موجود ہیں اور اُس کی قدرت سے کوئی چیز بھی جدا نہیں قرار دیجاسکتی۔ اس بنا پر ہر سمجھ رکھنے والے کا فرض ہے کہ وہ اپنی پیدائش اور آسمان و زمین کی خلقت اور اُن میں جو صنعت اور کاریگری اور کمالات موجود ہیں اُن پر غور کرے اور خالقِ عالم کی شان و بزرگی کو معلوم کرنے کی کوشش کرے تو جسقدر وہ اپنے پروردگار کی معرفت حاصل کرتا جائے گا اُسیقدر وہ اُس کے سامنے اپنا سر اطاعت خم کرتا جائے گا قرآن پاک نے اُن لوگوں کی بڑی تعریف کی ہے جو کائنات پر غور و فکر سے کام لیتے ہیں چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے جس کا ترجمہ یہ ہے آسمانوں اور زمین کی پیدائش اور دن رات کے یکے بعد دیگرے آنے جانے میں عقلمندوں کے لئے نشانیاں ہیں جن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اُٹھتے بیٹھتے اور کروٹ لے بل (غرض ہر طرح اور ہر صورت میں اللہ کو یاد کرتے رہتے ہیں) نیز آسمانوں اور زمین کی بناوٹ پر غور کرتے ہیں اور بیساختہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ پروردگارا تونے ان تمام چیزوں کو بیکار نہیں پیدا کیا تو بیشک تمام برائیوں سے پاک و پاکیزہ ہے۔ تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے

بچائے۔ سورہ الٓم تنزیل میں انسانی پیدائش اور آسمان و زمین کی خلقت کا اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے۔ (ترجمہ)
وہ اللہ ہی تو ہے جس نے سارے آسمان و زمین کو اور جسقدر چیزیں ان دونوں کے درمیان ہیں چھ دن میں پیدا کیا پھر اُس کی قدرت عرش پہ ظاہر ہوئی۔ اُس کے سوا نہ تو تمہارا کوئی سرپرست ہے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا تو کیا تم اس سے بھی نصیحت اور عبرت نہیں حاصل کرتے۔ آسمان سے زمین تک ہر چیز کا وہی تدبیر کرنے والا اور منتظم ہے پھر ایک ایسا وقت آئے گا جب ہر امر اسی کی طرف لوٹ آئے گا اور آخری فیصلہ کے لئے پیش ہوگا اور جس دن یہ خدا کے سامنے پیش ہوگا وہ دن تمہارے شمار سے ہزار سال کے برابر ہوگا۔ وہی ہر پوشیدہ اور ظاہر چیز کا جاننے والا ہے وہی سب پر غالب و مہربان ہے۔ وہ قدرت والا خدا جس نے جو چیز بھی بنائی ہر طرح دُرست اور ٹھیک بنائی اور انسان کی ابتدائی خلقت مٹی سے کی پھر اُس کی نسل کو ایک مادہ یعنی ایک حقیر پانی سے خلق کیا پھر اُس کے پُتلے کو دُرست کیا اور اُس میں اپنی روح پھونکی اور تم لوگوں کے سُننے کے لئے کان اور دیکھنے کے لئے آنکھیں اور سمجھنے کے لئے دل بنا دئے۔ اس پر بھی تم لوگ بہت کم شکر کرتے ہو اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ جب ہم زمین میں ناپید ہو جائیں گے تو کیا پھر نئے سرے سے ہم کو جنم ملے گا؟ یہ کچھ نہیں۔ یہ لوگ اپنے پروردگار کے سامنے حضوری سے انکار کرتے ہیں۔ یقیناً موت کا جو فرشتہ تم پر مقرر ہے وہ تمہاری روحیں قبض کرے گا۔ اس کے بعد تم سب کے سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤ گے اور اے رسول تم دیکھو تو عجب حالت دیکھو گے جبکہ یہ مُجرم لوگ اپنے رب کے سامنے سر جُھکائے ہوں گے اور عرض کر رہے ہوں گے کہ پروردگارا! ہمنے اچھی طرح دیکھ لیا اور سُن لیا تو ہم کو دُنیا میں ایک دفعہ پھر لوٹا دے تاکہ ہم نیک کام کریں اور اب تو ہمیں قیامت کا پورا پورا یقین ہو گیا ہے اور خدا فرمائے گا کہ اگر ہم چاہتے تو دنیا ہی میں ہر شخص کو مجبور کر کے سیدھی راہ پر لے آتے مگر میری طرف سے روزِ ازل ہی سے یہ بات قرار پا چکی ہے کہ میں جہنم کو جنات اور آدمیوں سے بھر دونگا تو چونکہ تم آج کے دن کی حضوری کو بھولے ہوئے تھے۔ بس اب اس کا مزہ چکھو۔ اب ہم نے تمہیں بھلا دیا اور تمہارے جیسے اعمال تھے اُن کے بدلہ اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھو"۔

غرض آسمان و زمین کی ہر چیز بتاتی ہے کہ اُس کا کوئی بنانے والا ضرور ہے اور پھر اپنی مخلوق کی حفاظت و تربیت بھی وہی کرتا ہے۔ کون ہے اُس کے علاوہ جو آسمانوں اور اُن کے اندر کی

بستیوں کی حفاظت کرے اور اُن کی ضروریات مہیا کرے، کون ہے جو سمندروں اور اُن کے دامن
میں رہنے والی مخلوق کی نگہبانی کرے، کون ہے جو پہاڑوں اور جنگلوں کی آبادیوں کو جانتا ہو۔
وہ بس اللہ ہی کی ذات ہے .... جو اُن کا خالق ہے، انکا نگہبان ہے،
اور ان پر حکومت واقتدار رکھنے والا ہے۔ اللہ نے اپنے وسیع علم کی طرف سورۃ حدید میں اس طرح
ارشاد فرمایا ہے (ترجمہ) جو چیز زمین داخل ہوتی ہے اور جو اُس سے نکلتی ہے اور جو شئے
آسمان سے نازل ہوتی ہے اور جو اُس کی طرف چڑھتی ہے سب اُسے معلوم ہے۔
اُس نے یہ بھی فرمایا " ھو معکم اینما کنتم " تم جہاں کہیں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ
ساتھ ہی ہے۔ سورۃ انعام میں ایک مقام پر ہے (ترجمہ) اُس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنہیں
اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ بحر و بر اور خشکی اور سمندر میں ہے اُس سب کو بھی وہی جانتا
ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اُس کو ضرور جانتا ہے اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ ہے
اور نہ کوئی ہری اور نہ کوئی خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ روشن کتاب میں موجود ہے۔ اس پوری تفصیل کا
حاصل یہ نکلتا ہے کہ جس شخص کا بھی قرآنِ پاک پر ایمان ہے اور خدا کو حاضر و ناظر سمجھتا ہے اُسے گناہ
کرتے وقت یہ نہ بھولنا چاہیے کہ اُس کا کوئی عمل بھی ...... علم سے پوشیدہ خدا کے ہے پھر ایسی
حالت میں گناہ کا ارتکاب کرنے والا اللہ کی ذات پر اگر سچا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ کبھی گناہ کی جرأت نہیں
کر سکتا اس کے برخلاف اگر وہ اس قسم کی جرأت کرے گا تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ اُس کا خدا کی
قدرت وعلم پر سچا عقیدہ اور ایمان نہیں ہے۔ ایک آدمی اپنے غلام اور نوکر بلکہ اپنے چھوٹے بچے کی موجودگی
میں بھی برے عمل کی جسارت نہیں کرتا اور اگر کہیں کوئی ایسا شخص بھی موجود ہو جس کی سزا کا خوف
ہو تو وہ کسی حال میں بھی جرم کی کوشش نہیں کرے گا اس بنا پر یہ بات پوری طرح ہر شخص سمجھ
سکتا ہے کہ اللہ کے حکم کی خلاف ورزی اس کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ ایسے شخص کو اللہ کی ذات پر
اور اُس کے علم و قدرت و عظمت پر کوئی یقین حاصل نہیں ہے۔

وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ○

(درس ۹۷)

اب تک ان آیات کی تھوڑی تفسیر بیان کی گئی۔ اب اس سلسلہ کی باقی باتیں لکھی جاتی ہیں۔

"وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِى الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۭ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ۚ" اور ہم نے ایک اندازہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا پھر ہم نے اُس کو زمین میں ٹھہرا دیا اور ہم ہی اُس کے ہٹا دینے پر قدرت رکھنے والے ہیں۔

اب تک یہ بتایا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے ہمارے اوپر سات آسمان خلق فرمائے ہیں۔ قرآنِ پاک میں بہت سے مقامات پر آسمانوں کی تعداد سات ہی بیان کی گئی ہے۔

کہیں "سموات سبع" یعنی "سات آسمانوں" کا جملہ ہے اور کسی مقام پر "سات "راستوں" کا فقرہ بولا گیا ہے۔ مگر جدید ہیئت دانوں کے نظریات کے تحت اس زمانہ کے کچھ مفسروں نے ان آسمانوں یا راستوں سے سات سیّاروں کے مدار مُراد لیئے ہیں یعنی وہ فاصلے اور پہنائیاں جو سیّاروں کی گذرگاہیں مقرر کی گئی ہیں۔ غرض ایک جگہ قرآن میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔

"تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ" (سورۃ الاسراء)

سات آسمان اور (اُن کے ساتھ) زمین بھر جو مخلوقات ان کے اندر ہے وہ سب اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (سورۃ نوح)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ ہی وہ ہے کہ اُس نے یہ سات آسمان تہہ بہ تہہ کس طرح بنا دئے ہیں!

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ اللہ ہی ہے جس نے سات آسمانوں کو اور اتنی ہی زمینوں کو خلق کیا۔ يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ قَدِيْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَىْءٍ عِلْمًا۔ (سورۃ الطلاق) ان میں اللہ کا حکم نازل ہوتا ہے تاکہ تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اُس کا علم ہر شے پر محیط ہے۔ اس سلسلہ کی زیر بحث آیات میں آسمانوں کے ساتھ جو لفظ لایا گیا ہے وہ "طرائق" ہے۔ اس کے معنی کسی گذشتہ درس میں بیان کر دئے گئے ہیں۔ غرض "طریقۃ" ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے اوپر اُس جیسی کوئی

اور چیز ہو، جیسے چادر پر چادر کتاب پر کتاب یا ورق پر ورق ہو اور خود طویل اور لمبی چادر کو بھی "طریقہ" کہتے ہیں اور راستہ یا مذہب کو بھی جیساکہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے اسلئے یہاں مقصود یہ ہوگا کہ ہمنے تمہارے اوپر سات بلندیاں مقرر کی ہیں جو فرشتوں اور ستاروں کی گزرگاہ ہیں ان بلندیوں کے جسم اور وسعتیں اسقدر لطیف یعنی ہلکی اور ہلکی ہیں جو دیکھنے والوں کی نگاہوں پر ذرا بھی بار نہیں ہوتیں اور اُن میں کسی جگہ بھی نظر آگے بڑھنے سے نہیں رُکتی۔ اسی طرح ستاروں کی روشنی اُن سے آسانی سے گذر کر دیکھنے والوں تک پہنچتی ہے تو یہ سیاروں کی گذرگاہیں اور فرشتوں کی آمدورفت کی فضائیں ہیں جن کی سات حدیں مقرر ہیں اور ان ہی کو "سبع سماوات" کہا جاتا ہے۔ یہ بھی وہ تشریح جو بعض جدید مفسروں نے بیان کی ہے۔ قرآن وحدیث کی روشنی میں اس تشریح کے لئے پوری گنجائش موجود ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے: وانزلنا من السماء ماءً بقدرٍ اور ہمنے "سماء" سے پانی اتارا۔ "سماء" کے معنی بیان ہو چکے ہیں یعنی بلندی یا وہ وسیع فضا جو چاروں طرف سے زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے ایک معنی بادل کے بھی ہیں اس بنا پر اب یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے بلندی سے یا بادلوں سے پانی کو زمین پر نازل کیا اور برسایا پھر اُس میں اُس کو ٹھہرا دیا تاکہ وہ انسانوں، حیوانوں اور درختوں کے لئے کام آسکے۔ ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ جس طرح ہم پانی برسانے اور زمین میں اُس کو ٹھہرانے پر قادر ہیں اسی طرح اُس کو زمین سے ہٹا دینے پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔

کہیں خود پانی کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ " وجعلنا من الماء کل شیءٍ حیٍّ " (الانبیاء)، ہم ہی نے ہر جاندار چیز کو پانی سے خلق کیا ہے۔ یوں تو اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں اور اُس کی ہر نعمت بڑی ہے مگر یہاں پر چند خاص نعمتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ ان ہی میں سے پانی کا بلندی سے نازل کرنا بھی ہے کہ وہ بقدر حاجت اور ایک خاص اندازہ سے برسایا جاتا ہے تاکہ کھیتیاں سرسبز رہیں، باغ ہرے بھرے ہوں۔ یہ بھی اللہ کی قدرت ہے کہ زمین میں پانی کو چوس لینے کی صلاحیت موجود ہے اور اس طرح وہ زمین کے جگر میں پہنچکر ٹھہر جانے کے قابل بن جاتا ہے اور درختوں کی باریک سے باریک شاخوں اور پتیوں کی ننھی رگوں تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ بیشک یہ طاقت پانی میں اللہ ہی نے عطا کی ہے اور اگر وہ نہ چاہے تو یہ تمام طاقت ختم بھی ہو سکتی ہے۔

غرض اسی ایک چیز یعنی پانی سے لاکھوں کروڑوں رنگ اور ذائقوں کے میوے پیدا ہوتے ہیں اور ایک ایک پتی اور پھول میں طرح طرح کے رنگ ابھرتے رہتے ہیں۔ کسقدر مضبوط ہے نظم قدرت! اور کیسا کامل ہے یہ انتظامِ تخلیق و تربیت! کیا کوئی ہے دُنیا کی بڑی سے بڑی سلطنت جو اس طرح ایک چھوٹی سی پتی اور ننھا سا پھول بنا دے اور اللہ کے خلق کیے ہوئے پانی کی ایک بوند کے مقابلہ میں کوئی چھوٹے سے چھوٹا قطرہ پیدا کر سکے۔ دنیا کی پوری دولت اور حکومتوں کے سارے خزانے اور وسائل و ذرائع یقیناً ایک چھوٹے سے قطرہ اور ایک ننھی سی بوند بنانے پر بھی قدرت نہیں رکھتے یہی پانی ہے جو انسان و حیوان اور نباتات کی ضرورتوں کو بھی پورا کرتا ہے اور یہی سیپیوں کے شکم میں داخل ہو کر موتیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہی پھولوں کو رنگ اور خوشبو دیتا ہے۔ یہی دواؤں میں شریک ہو کر مریضوں کو شفا بخشتا ہے۔ کچھ غور و فکر تو کرو کہ اگر یہ پانی نہ ہوتا تو ہم سب کس طرح زندہ رہ سکتے مگر ہم ہیں کہ اللہ کی اس نعمت کی قدر نہیں کرتے اور اُس کی عبادت و اطاعت کر کے اُس کا شکر نہیں ادا کرتے کیونکہ بہر حال اللہ کا شکر فقط اس طرح نہیں ادا ہو سکتا کہ ہم لفظِ شکر کہکر سبکدوش ہو جائیں اور محض اتنا کہکے خاموش ہو بیٹھیں کہ اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے ہم کو یہ نعمت عطا کی بلکہ اُس کا حقیقی شکر تو یہ ہے کہ ہم اُس کی عبادت کریں، اُس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم رکھیں اور اُس کی نعمتوں کا غلط استعمال نہ کریں اور جہاں اُس کے استعمال کا صحیح مقام ہو وہاں اُسے استعمال کریں اور استعمال کے غلط طریقوں سے جن میں ملاوٹ اور آمیزش بھی داخل ہے اجتناب رکھیں۔

(درس ۹۸)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَآئِقَ ۖ وَمَا كُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غٰفِلِيْنَ ○ وَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ فَاَسْكَنّٰهُ فِي الْاَرْضِ ۖ وَاِنَّا عَلٰى ذَهَابٍۢ بِهٖ لَقٰدِرُوْنَ ج فَاَنْشَاْنَا لَكُمْ بِهٖ جَنّٰتٍ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّاَعْنَابٍ ۘ لَكُمْ فِيْهَا فَوَاكِهُ كَثِيْرَةٌ وَّمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۙ ○ وَشَجَرَةً تَخْرُجُ مِنْ طُوْرِ سَيْنَآءَ تَنْۢبُتُ بِالدُّهْنِ وَصِبْغٍ لِّلْاٰكِلِيْنَ ○

(پ ۱۸) رکوع (۱) کی درمیانی (۴) آیات - سورۃ المؤمنون) اور ہم نے تمہارے اوپر سات

آسمان بنائے ہیں اور ہم مخلوق سے بے خبر نہیں ہیں اور ہم نے ایک اندازہ کے ساتھ آسمان سے پانی برسایا پس ہم نے اُسے زمین میں ٹھہرایا اور ہم ہی اُس کے ہٹا دینے پر قدرت رکھنے والے ہیں پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے تمہارے لئے کھجوروں اور انگوروں کے باغ اُگائے اُن میں تمہارے لئے بکثرت میوے ہیں اور اُن میں سے تم کھاتے ہو اور ایک دوسرا درخت بھی جو طورِ سیناء میں پیدا ہوتا ہے وہ تیل لئے ہوئے اور کھانے والوں کے لئے سالن لئے ہوئے اُگتا ہے۔

تشریح وتفسیر:

"طرائق" "طَرِیْقَةٌ" کی جمع ہے جو راہ، طور، ڈھنگ، روش اور مذہب وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ زمانہ کے انقلابات کو بھی "طرائق الدهر" کہتے ہیں۔ طریقہ اُس چیز کو بھی کہا جاتا ہے جس کے اوپر اُس جیسی کوئی دوسری چیز ہو۔ خلیل، فرّاء اور زجاج نے کہا ہے "سمّیت طرائق لانّها طُورِق بعضها فوق بعض وكلّ مافوقه مثله فهو طريقة" آسمانوں کو اس مقام پر "طرائق" اس وجہ سے فرمایا گیا کہ وہ آپس میں تہہ بر تہہ تھے اور جس چیز کے اوپر اُس جیسی دوسری چیز ہوا کرتی ہے اُس کو "طریقہ" کہتے ہیں آسمانوں کو اس وجہ سے بھی "طرائق" کہا گیا ہے کہ وہ طریقے یعنی راستے ہیں فرشتوں کے یا ستاروں کے اور اُنکی حرکت کے لئے اُن میں راہیں موجود ہیں۔

"سَمَاءٌ" "سُمُوٌّ" سے بنا ہے۔ اس کے معنی بلندی کے ہیں اور "سماء" کا لفظ عام طور پر آسمان ہی کے لئے بولا جاتا ہے یعنی اُس خاص نیلے رنگ گھیرے کے لئے جو زمین کے چاروں طرف دکھائی دیتا ہے۔ خود اُس وسیع فضا کو بھی آسمان کہتے ہیں جو زمین کے گرد پھیلی ہوئی ہے اس کے علاوہ "سماء" کے اور بھی معنی ہیں جیسے مکان کی چھت، سائبان، گھوڑے کی پیٹھ، بادل اور بارش وغیرہ۔ "قَدَرٌ" اندازہ کو کہتے ہیں۔ "اَنْشَأْنَا" "نَشْأٌ" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ہیں پیدا کرنا اور خلق کرنا۔ "نَخِیْلٌ" "نَخْلَةٌ" کی جمع ہے۔ کھجور کا درخت مراد ہے۔ "اَعْنَاب" "عِنَب" کی جمع ہے۔ انگور کو کہتے ہیں۔

"طُورِ سَیْنَاء" میں دو لفظ ہیں۔ ایک "طُور" دوسرے "سَیْنَاء"۔ "طُور"

پہاڑ کو کہتے ہیں مگر خاص طور پر یہ اُس پہاڑ کا نام مشہور ہو گیا ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تجلّی ظاہر ہوئی تھی اور اُسے " طور سینار " بھی کہتے ہیں ۔ " طور " کے محل وقوع میں بہت سے قول ہیں ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ یہ " ایلہ " کے نزدیک ایک مخصوص پہاڑ کا نام ہے جو خلیج " عقبہ " کے شمال میں واقع ہے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ بیت المقدس کے ایک خاص پہاڑ کا نام ہے ۔ بیت المقدس فلسطین کا مرکزی مقام ہے ۔ خود فلسطین قدیم زمانہ میں شام کے ایک صوبہ کی حیثیت رکھتا تھا اور اس بنا پر یہ بھی کہنا درست ہے کہ " طور سینا " قدیم شام کے علاقہ میں واقع تھا ۔ " عَقبہ " مملکت اُردن کی مشہور بندرگاہ کا نام ہے جو بحراحمر کے شمال میں واقع ہے " سیناء " سین پر زبر اور زیر کے ساتھ دونوں طرح استعمال ہوا ہے ۔ یہ عربی لفظ نہیں ہے بلکہ سُریانی ہے ۔ بعض نے اسے حبشی یا نبطی بھی لکھا ہے " سَینار " کے معنی حسین وجمیل کے ہیں ۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ " سینار " اُس پہاڑ کو کہتے ہیں جو پھلدار درختوں سے بھرا ہوا ہو ۔ کبھی اسے " سِینین " بھی کہا جاتا ہے ۔ بعض نے لکھا ہے کہ یہ " سَنا " سے مشتق ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں اور مراد ہے بلند اور اونچا پہاڑ ۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ " سیناء " ایک پتھر کا نام ہے جو اُس پہاڑ میں پایا جاتا ہے اور اُسی کے نام پر اُسے بھی " سَینار " کہا جانے لگا ۔ " سَینار " ایک جزیرہ نما کا نام بھی ہے جسے شمال کی طرف سے بحر متوسط Mediteranean See — اور مغرب کی جانب سے نہر سوئز ۔ مشرق کی طرف سے فلسطین اور خلیج عقبہ گھیرے ہوئے ہے ۔

اس جزیرہ نُما کے جنوبی حصّہ کے ایک پہاڑ کو بھی " سَیناء " کہتے ہیں اسی خطّہ کی مناسبت سے ۔ مگر اس پہاڑ کا اصلی نام " حُوریب " ہے اور اسی پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لئے تجلّی کا ظہور ہوا تھا ۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ تشریح یہ بھی ہو گی کہ حکیم ابو علی حسین بن عبد اللہ سینا کا اس " سینار " یا " سِیناء " سے کوئی ربط نہیں ہے ۔ " سِینا " ابو علی کے دادا کا نام تھا اور " سَینار " ایک پہاڑ یا خطّہ کا نام ہے ۔ " تَنبُتُ " ، نَبات یا " نَبت " سے مشتق ہے

جس کے معنی اُگنے کے ہیں۔ "دُھن" تیل کو کہتے ہیں۔ یہاں اس سے زیتون کا تیل مراد ہے۔ "صِبْغ" رنگ کو کہتے ہیں جس سے کپڑے رنگے جاتے ہیں اور سالن یا اسی طرح کی کسی چیز کو بھی کہتے ہیں۔

غرض خلقتِ انسان کے تذکرہ کے بعد آسمانوں کی پیدائش کا ذکر کیا گیا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ انسان کے جیسے چھوٹے جسم کا بنانے والا عظیم خالق آسمانوں کا بھی خالق ہے جن کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں۔ اُس نے آسمانوں میں ستاروں کے لئے راستے بھی بنادئے یہ راستے اسقدر وسیع ہیں جنکا ہم تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔ ان لاتعداد ستاروں کے الگ الگ راستے اور مدار ہیں جن پر وہ گردش کرتے رہتے ہیں مگر نہ تو اُن کی گردش میں کبھی فرق آتا ہے اور نہ ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ یہ سب باتیں اس لئے بتائی جارہی ہیں کہ انسان کو اللہ کی عظیم قدرت و حکومت کا خوب اندازہ ہو سکے اور وہ اپنے غرور و تکبر کو بھول جائے غفلت دُور ہوجائے اور وہ اُس نشۂ دولت واقتدار سے چونک جائے جس میں وہ مبتلا ہے اور اُس کی سمجھ میں آجائے کہ میں خود بخود نہیں بن گیا ہوں اور یہ اعضاء و جوارح بھی بلا کسی بنانے والے کے نہیں بنے ہیں بلکہ کسی عظیم طاقت نے یہ سب کچھ مجھے عطا کیا ہے اور وہی آسمانوں اور ستاروں کا بھی خالق ہے۔ اُسی نے انکے لئے لاتعداد اقسام کی حرکتوں کا نظام بنایا ہے جس میں کبھی فرق پیدا نہیں ہوتا اور کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی وہ اُس نظام سے سرتابی نہیں کر سکتے پھر یہ سب کچھ اس لئے بھی کہا جارہا ہے کہ انسان کبھی اپنی نظر جھکا کر خود اپنے آپ کو بھی دیکھے اور اپنے جسم و اعضاء کی بناوٹ میں جو بے مثال صنعت رکھی گئی ہے اُس کو سمجھ کر اللہ کو یاد کرے اور کبھی نگاہ اونچی کر کے آسمانوں اور ستاروں کی عظیم الشان خلقت پر بھی غور کرے اور اُس خالق کے سامنے سرِ تسلیم خم کرے جس کی حکومت کے اندر وہ جی رہا ہے اور دل سے اُس کی عبادت کرے۔ "وَمَا کُنَّا عَنِ الْخَلْقِ غَافِلِیْنَ" اور ہم اپنی مخلوق سے غافل و بے خبر نہیں ہیں۔ ایک آقا اپنے نوکروں سے غفلت نہیں کرتا ایک مالک اپنے غلاموں سے بے خبر نہیں رہتا، ایک حاکم اپنی رعیّت کی طرف پوری توجہ رکھتا ہے اور اگر ذرا سی بھی غفلت سے کام لے تو تمام نظام مملکت درہم برہم ہو کر رہ جائے تو پھر وہ حاکم جس سے بڑا کوئی نہیں، جو ہر مخلوق کی زندگی کا مالک ہے کیونکر اُس سے غافل رہ سکتا ہے اور اُس کی

حاجتوں یا اعمال سے ناواقف ہو سکتا ہے۔ پھر تو یہ بات کس قدر صاف سی ہے کہ جب ہمارا خالق اور پروردگار ہم پر احسان میں کمی نہیں کرتا اور ہماری ہر ضرورت سے زیادہ ہمیں ہر چیز عطا فرماتا ہے تو ہم بھی اُس کو نہ بھولیں اور قدم قدم پر اُس کو یاد کرتے رہیں اور کسی طرح بھی اُس کی عبادت میں کوتاہی سے کام نہ لیں۔

(درس ۹۹)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ ــــــ

(پارہ ۱۸، رکوع ۱، سورۂ المؤمنون)

ــــــ تُبْعَثُوْنَ ○

یہ قرآنِ حکیم کے سورۂ مومنون کی ابتدائی آیات ہیں۔ ان آیاتِ کریمہ میں انسان کی پیدائش کے درجے اور کیفیتیں بتائی گئی ہیں اور یہ سمجھا کر کہ اُس کی خلقت مٹی سے ہوئی ہے یہ بھی ظاہر کر دیا گیا کہ آخر میں اُس کو مرنے کے بعد مٹی ہی کی طرف لوٹنا ہے اور جب قیامت آئے گی تو ایک مرتبہ پھر اُسے زندہ کیا جائیگا۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب وہ کچھ بھی نہ تھا پھر وہ وقت آیا کہ نظامِ فطرت کے ہاتھوں طرح طرح کے مادّوں اور شکلوں کو مرکزیت ملی اور ایک ایسی شکل میں آگئے جو انسان بنکر اشرف المخلوقات بن گئی پھر یہ مادّے منتشر ہونے لگے اور بالآخر وہ حسین صورت خاک کے پردہ میں پنہاں ہوگئی۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہوگئیں ؏ خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہوگئیں

جسمِ انسانی کے ذرّات مٹی میں مل گئے، غبارِ راہ کی چادر اوڑھ لی اور زمانہ کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئے مگر صانعِ ازل کے علم سے غائب نہ ہو سکے اور جب دوبارہ جی اُٹھنے کا وقت آئے گا تو کائنات کے ہر گوشہ سے اللہ کی یہ امانتیں واپس ہوں گی اور "ثُمَّ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ تُبْعَثُوْنَ" کی تفسیر اُن جیتی جاگتی صورتوں اور شکلوں سے وجود میں آجائیگی جو غیبت کے آغوش سے باہر نکل کر حیّ و قیّوم اللہ کی قدرت پر گواہی دیں گی اور اس بات کو عملاً ثابت کر دیں گی کہ اُس قادر و توانا ذاتِ الٰہی کے لئے یہ بات بہت آسان ہے کہ وہ مرنے کے بعد دوبارہ اُنھیں زندگی بخشدے جبکہ وہ اُنھیں اُس وقت پیدا کر چکا تھا جب وہ کچھ بھی

نہ تھے اور صفحۂ ہستی پر اُن کا کوئی ہلکا سا بھی نقش نہ تھا۔ لاکھوں کیفیتوں اور ہزاروں شکلوں کی باہم تبدیلیوں کے بعد وہ زمانہ آتا ہے جب یہ عدم کا مُسافر (انسان) دُنیا میں ظاہر ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد کس نے اس کی تربیت کی، کس نے اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچایا۔ بیشک وہ اللہ ہی ہے جس حکم سے اس کو وجود کا زیور دیکر دُنیا میں ظاہر کیا گیا۔ وہی ہے جس نے اسے سوچنے کے لئے ذہن عطا کیا، سمجھنے کے لئے عقل دی، چلنے کے لئے پیر دئے دیکھنے کے لئے آنکھیں، سُننے کے لئے کان، چکھنے کے لئے زبان عطا کی۔ بعض مفسروں نے "ثم انشاناہُ خلقاً اٰخر" سے وہ کیفیات مراد لی ہیں جو پیدائش کے بعد انسان پر طاری ہوتی ہیں۔ یعنی کبھی بچّہ ہے کبھی جوان ہے کبھی بوڑھا ہے کبھی کمزور ہے کبھی قوی ہے کبھی موٹا ہے اور کبھی دُبلا ہے۔ نیز وہ تمام ارتقائی منازلِ زندگی جو پیدائش کے بعد انسان کے جسم میں ظاہر ہوتی ہیں اور وہ تمام قوتیں جو نشوونما کے ساتھ ساتھ ظہور میں آتی رہتی ہیں اُن سب ہی کی طرف اس جملہ سے اشارہ ہے مگر اکثر مفسروں نے اس سے مُراد روح کو لیا ہے اور لکھا ہے کہ "خلقاً آخر" سے اس جگہ روح ہی مراد ہے یعنی جب خلقت کے تمام درجات اور شکلیں کامل طور پر وجود میں آ چکیں تو اللہ نے اپنے عالمِ امر سے اُسے روح عطا کردی جو پیکرِ خاکی سے متصل کردی گئی۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو یہ پیدا ہونے والا کسقدر بے بس تھا اور اب بھی ہے۔ نہ تو پیدائش کے راستے طے کرنے پر اُسے قدرت تھی، نہ اشکال اور صورتیں منتخب کرنے میں اس کی پسند کو کوئی دخل تھا اور اللہ کی عطا کی ہوئی شکل و صورت و اعضاء کو ناپسند کرنے اور اُنھیں ٹھکرا دینے کی قوت تھی، اس کا اپنا کوئی اختیار ہی نہ تھا اور نہ کوئی سمجھ اور عقل تھی کہ وہ سمجھ سکتا کہ کیا پسند کروں اور کیا طلب کروں اور کس چیز کو نہ طلب کروں اور ناپسند کروں۔ اس کے بعد جب نومولود کی شکل میں دُنیا میں ظاہر ہوا جب بھی عجیب بے بسی کا عالم تھا۔ نہ ہاتھ پیروں پر اختیار، نہ آنکھ پر بس اور اقتدار، نہ دل پر حکومت، نہ زبان پر قبضہ۔ پیر ہیں مگر چل نہیں سکتا، زبان ہے مگر بول نہیں سکتا، کان ہیں مگر سُن اور سمجھ نہیں سکتا۔ آتو گیا دُنیا میں مگر دوسروں کے بس میں ہے، نہ بیماری کی خبر، نہ صحت کا معیار معلوم، نہ دشمن کی پہچان نہ دوست کی شناخت، نہ مضر معلوم، نہ مفید کا اندازہ۔ عجب بے خبری کی

زندگی ہے ایک مسافر ہے جو بغیر ارادہ کے چل رہا ہے اور بغیر منزل کی پہچان کے زندگی کا راستہ طے کر رہا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ہوش میں پختگی آنے لگی، صورتیں اور شکلیں پہچاننے لگا دروودیوار کی شناخت شروع ہوئی۔ جب وہ خود اسقدر بے بس تھا تو دوسروں کے لئے کیا کرتا، جب خود اپنی ہی خبر نہ تھی تو دوسروں کی کس طرح خبر گیری کرتا مگر بس اُس کا بنانے والا اللہ ہی تھا جس نے اُس کی ہر منزل پر نگہبانی کی، ہر ہر قدم پر اس کی حفاظت کی، اُس کی راحت و آرام کا خیال کیا اور وہ تمام نعمتیں اور راحتیں مہیا کر دیں جنکی اُسے ضرورت تھی حالانکہ یہ اپنی ضرورتوں اور تکلیفوں کا اظہار کرنے کی بھی طاقت نہ رکھتا تھا۔ پھر اُس میں سمجھ آنے لگی اور فکر و خیال کی قوتیں اپنا کام کرنے لگیں مگر اُس وقت بھی قدم قدم پر اللہ نے اس کی حفاظت فرمائی اور اسے مہلکوں اور مصیبتوں سے بچایا اور اس کی مدد کی۔ پھر اس لئے کہ اُس کا دل نہ گھبرا جائے سال بھر میں طرح طرح کی فصلیں بنا دیں۔ کبھی گرمی ہے تو کبھی سردی اور کبھی بہار اور برسات تو کبھی خزاں کا زمانہ تاکہ اُس کا دل بہلتا رہے اور زندگی کی اس قید سے اُکتا نہ جائے۔

اللہ نے بہت سے بہتر نعمتیں عطا فرما دیں اور جس چیز کی انسان کو زیادہ ضرورت تھی اُسکو زیادہ عام اور آسان تر کر دیا۔ ہوا جو سب سے زیادہ ضروری تھی اور بغیر اُس کے زندہ رہنا ممکن ہی نہ تھا اُسے تو اسقدر عام کر دیا کہ اُسکی کوئی قیمت ہی نہ رہی۔ ہر جگہ موجود ہے اور ہر وقت حاضر ہے۔ جب تاریکی کی احتیاج ہوئی تو اُسے بھی بے دام دے دیا۔ جب روشنی درکار ہوئی تو سورج کی شمع جلا کر مفت روشنی مہیا فرمائی۔ گرمی کے وقت گرمی اور سردی کے وقت سردی کا انتظام کیا اور دن بھر کام کاج کرنے کے بعد اندیشہ تھا کہ تھکن سے انسان کا جسم کمزور نہ ہو جائے تو سورج کے چراغ کو ہٹا کر اندھیرا کر دیا اور بدن کو راحت دینے کے لئے رات بنائی۔ آسمان سے پانی برسا کر زمین کی صلاحیتیں اُجاگر کیں تاکہ زراعت میں آسانی ہو مٹی میں اس کی قوت و صلاحیت کس نے دی سوائے اللہ کے کہ وہ ایک چھوٹے سے دانہ کو اپنی گود میں پالکر اس قابل بنا دے کہ وہ انسان کے آذوقہ کا سبب بن جائے اور جو نعمت دی وہ بے میل تھی، خالص تھی اور ذرہ برابر بھی اُس میں آمیزش نہ تھی۔ ہاں اللہ نے تو ہر چیز بے میل عطا کی مگر انسان نے اُس میں آمیزش کر کے اُس کی شکل و صورت کو بدلنا شروع

کر دیا۔ اُس نے گیہوں خالص دیا تھا مگر انسان نے اُس میں میل کر دیا۔ اُس نے گنے اور انگور کے جگر میں خالص شکر پیدا کی تھی مگر اس نے اُس پر غلط تصرف کر کے کچھ کا کچھ کر ڈالا۔ اُس نے گائے کے تھنوں میں خالص دودھ کے چشمے جاری کئے تھے مگر اس انسان نے اُس الٰہی نعمت کو بدل دیا۔ اُس نے دودھ میں خالص روغن پیدا کیا تھا لیکن آدمی نے اُس میں تبدیلی کر دی اور اُسے خراب کر ڈالا۔ اُس نے ہر چیز کو خالص بنایا کیونکہ وہ ہمارا حقیقی پروردگار اور ہمارا اصلی رازق اور مالک ہے مگر انسان نے چند بے حقیقت ٹکوں کی خاطر اور تھوڑے سے معمولی نفع کے لئے ان نعمتوں کو خراب کر کے پیش کیا اور "بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا" کا مصداق بن گیا یعنی اللہ کے احسان اور اُسکی نعمت پر ناشکری کی۔ اگر تھوڑا سا بھی غور کیا جائے تو یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آ سکتی ہے کہ انسان کسقدر بے بس ہے اور حقیقی اختیار و قدرت کسی اور ہی کے ہاتھ میں ہے۔ جہاں تک اُس کی اپنی زندگی کا تعلق ہے ایک لمحہ کے لئے بھی اُس کو کوئی اقتدار نہیں۔ جو سانس بدن کے اندر جاتی ہے واپس نہ آئے تو یہ اُسے واپس نہیں لا سکتا اور جو باہر آتی ہے اُسے اندر نہیں لے جا سکتا۔ آنکھیں اگر دیکھنے سے معذور ہو جائیں تو پھر سے بصارت پیدا کرنے سے عاجز، اگر ہاتھ پیر شل ہو جائیں تو انہیں اپنی اطاعت اور اپنے حکم سے حرکت کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اللہ نے جو نظام بنا دیا ہے ہر حال میں اُس کا پابند ہے اور کتنا مستحکم ہے یہ نظامِ زندگی! کون عقل رکھنے والا شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ یہ زبردست نظام کسی لاشعور مادّہ نے بنا دیا ہے اور بغیر کسی مصلحت بینی کے خود بخود بن گیا ہے۔ یقیناً اس نظم و ضبط کی بہتری بتاتی ہے کہ کوئی قوی اور مدبّر ذات موجود ہے جو اس کی بنانے والی ہے اور اُسی نے خود انسان کو اور عالم کی ہر چیز کو خلق فرمایا ہے۔

بعض تفسیروں میں اس طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ " وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ " میں مٹی کے جوہر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اولادِ آدمؑ کو اُن غذاؤں سے بنایا جو مٹی ہی سے پیدا ہوتی ہیں یعنی تمام پھل، پھول اور ترکاریاں وغیرہ جو انسان استعمال کرتا ہے زمین ہی سے تو پیدا ہوتی ہیں اور یہی مٹی اُن کو اُگاتی ہے اس طرح یہ تمام پھول اور پھل وغیرہ سب ہی مٹی کا جوہر اور نچوڑ ہیں پھر یہی غذائیں اصل اور بنیاد ہیں اُس خون اور اُس مادہّ کی جس سے انسان کی پیدائش ہوا کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

یہی بات بعض مفسروں نے " سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ " کی تشریح میں لکھی ہے اور کہا ہے کہ " سُلٰلَة " آب و غذا کے جوہر اور ماحصل کو کہتے ہیں جو آخر میں نطفہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ غرض اللہ کے حکم کے بعد تمام فرشتوں نے حضرت آدمؑ کی طرف رخ کر کے فوراً سجدہ کیا البتہ اس حکم سے شیطان نے سرتابی کی اور اُس نے سجدہ سے انکار کر دیا۔ شیطان کے اس انکار سجود میں تین طرح کے گناہ تھے ایک یہ کہ اُس نے اللہ کے حکم کو نہ مانا دوسرے یہ کہ خلقت آدم علیہ السلام کو حقیر سمجھا، اپنی خلقت کو بڑا جانا اور تکبر و غرور کیا تیسرے یہ کہ وہ ملائکہ کے اجتماعی نظام سے اپنی سرکشی کی بنا پر خارج ہو گیا۔ ان تین گناہوں کی طرف اللہ نے قرآن میں اشارہ فرما دیا ہے: (سورۂ اعراف)

(ترجمہ) اللہ نے فرمایا او شیطان! تجھے سجدہ کرنے سے کس بات نے روکا جبکہ میں نے خود تجھے سجدہ کا حکم دیا تھا۔ پھر سورۂ صٓ میں ارشاد ہوا ہے: (ترجمہ) تمام

فرشتوں نے آدمؑ کو سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اُس نے غرور و تکبر کیا اور اپنے آپ کو آدمؑ سے بڑا سمجھا تو اللہ نے فرمایا کہ اے ابلیس اُسے سجدہ کرنے سے جس کو میں نے اپنی خاص قدرت سے بنایا ہے تجھے کس بات نے روک دیا تو نے تکبر کیا یا واقعی تو بڑے درجہ والوں میں سے ہے۔ تیسری بات کی طرف سورۂ حجر میں ارشاد ہے: (ترجمہ) اے ابلیس تجھے کیا ہو گیا کہ تو سجدہ کرنے والوں کے ساتھ شامل نہ ہوا اور ان کے ساتھ سے الگ ہو گیا۔

شیطان نے ہر بات کا یہی جواب دیا تھا کہ میں آدمؑ سے افضل ہوں۔ میں آگ سے بنا ہوں اور آدمؑ مٹی سے خلق ہوئے ہیں اس لئے میں انھیں سجدہ نہ کروں گا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اللہ نے خود اُسے اور حضرت آدمؑ دونوں ہی کو خلق فرمایا ہے اور وہ شیطان اور آدمؑ کی خلقت کے فرق کو پوری طرح جانتا ہے۔ یہ ایسی کھلی ہوئی جہالت و تعصب کی بات تھی کہ اس کا جواب اللہ کی طرف سے بس یہی ملنا چاہیے تھا کہ تو متکبر اور نافرمان ہے اور تکبر کرنے والوں اور نافرمانوں کی جگہ اُس کی بارگاہ میں نہیں ہے اور اب قیامت تک تیری گردن میں لعنت کا طوق پڑا رہے گا کیونکہ ایک ایسی قادرِ مطلق ذات کا حکم آجانے کے بعد جس کے متعلق اس بات کا یقین ہو کہ وہ کبھی حق کے خلاف کوئی حکم نہیں دے سکتا، ظلم نہیں کرتا، ہر چیز کا پورا اور کامل علم رکھتا ہے اور اُسے ہر بات پر قدرت حاصل ہے۔ اُس سے شیطان کا اس طرح جسارت کرنا اس کی واضح دلیل ہے کہ اس کا یہ اقدام صرف سرکشی اور تکبر و تعصب پر مبنی تھا۔ پھر ابلیس نے جو دعویٰ کیا وہ بھی سراسر غلط اور بے بنیاد تھا یعنی یہ کہ آگ افضل ہے مٹی سے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ خود مٹی ہی ہر طرح آگ پر فضیلت رکھتی ہے اس لئے کہ مٹی میں وزن ہے، سکون ہے، اُس کی بقا زیادہ ہے اور اُس میں نشوو نما دینے، تربیت کرنے، پھولوں اور پھلوں کو اگانے اور بڑھانے اور طرح طرح کے رنگ اور ذائقے پیدا کرنے اور اشرف المخلوقات انسان کی زندگی، ترقی اور بقا کے لئے ہر طرح کی سہولتیں اور اسباب و وسائل مہیا کرنے کی پوری صلاحیت موجود ہے جو آگ میں نہیں ہے اس کے مقابلہ میں آگ ہلکی ہے، مضطرب ہے، جلدی ختم

ہونے والی اور دوسری چیزوں کو جلا ڈالنے والی ہے پھر مٹی تو جنت میں بھی موجود ہے مگر آگ وہاں نہیں پائی جاتی غرض اسی طرح کی بہت سی اعلیٰ صفتیں ہیں جو مٹی میں تو پائی جاتی ہیں مگر آگ اُن سے محروم ہے۔ اس بنا پر ابلیس کی یہ دلیل قطعی طور پر غلط تھی۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ایک صاف سی بات تھی کہ فرشتوں کا عنصرِ نوری تو آگ سے ہر حال میں افضل ہی تھا پھر وہ کیوں مٹی کے سامنے جھک گیا۔ شیطان نے اس سے کیوں سبق نہ لیا۔ اس سے یہ نتیجہ واضح طور پر نکالا جا سکتا ہے کہ جوہرِ خلقت میں مقابلہ کوئی حقیقت اور قیمت نہیں رکھتا۔ اللہ کی بارگاہ میں جس چیز کی قدر و منزلت ہے وہ صرف نیّت و عمل اور کردار ہے کیونکہ دنیوی معیار کے مطابق اعلیٰ ترین نسل و خاندان کا کافر و مشرک ایک معمولی نسل کے مومن سے کسی طرح افضل نہیں ہو سکتا بلکہ وہ مومن ہی ہر طرح اُس کافر سے افضل ہے اور وہ کافر اُس کے سامنے ہر حیثیت سے ذلیل و حقیر ہے۔

ابلیس کی عبادت کام نہ آسکی کیونکہ اُس کی نیت میں کھوٹ تھا۔

(درس ۱۰۱)

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ ______

______

______ تُبْعَثُونَ ○

______

قرآن حکیم میں "خلق" کا لفظ بہت جگہ بولا گیا ہے اور کہیں اس کے ساتھ "الامر" کا لفظ بھی آیا ہے۔ ان دو لفظوں میں اس اعتبار سے بھی بڑا فرق ہے کہ "خلق" درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ بنانے کو کہتے ہیں اور اس کے مقابلہ میں "الامر" کہا جاتا ہے تو اس سے فوراً اور دفعتہً پیدا کرنا مراد ہوتا ہے۔ سورۂ اعراف میں اللہ نے فرمایا ہے:

"اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ" آگاہ ہو جاؤ کہ خلق کرنا بھی اُسی کا حق ہے اور

"امر" بھی اُسی کے اختیار میں ہے اسی طرح ایک فرق یہ ہے کہ "خلق"
کا تعلق، عالمِ جسم سے ہے اور "امر" کا تعلق عالمِ نور سے ہے چنانچہ "خلق"
سے متعلق ارشاد ہوتا ہے: اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ
وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ" (اعراف/۵۴) بیشک تمہارا پروردگار وہ ہے
جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق کیا ہے۔ جن آیات کی یہاں تفسیر بیان کی
جارہی ہے اُن میں بھی "خلق" کا لفظ بول کر انسانی خلقت کے درجے اور انسان
کا رفتہ رفتہ اور بتدریج پیدا ہونا ہی مُراد ہے مگر جہاں "الامر" کا ذکر آیا ہے
وہاں اس طرح ارشاد ہوا ہے:- اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا اَنْ يَّقُوْلَ
لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (یٰسٓ/۸۲)
یقیناً اللہ کا امر تو یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو کہدیتا ہے کہ
ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے۔ اس مقام پر نامناسب نہ ہوگا اگر حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام"
کے ایک مشہور خطبہ کا تھوڑا اقتباس پیش کیا جائے جس میں آپ نے حضرت آدمؑ کی
پیدائش کا ذکر فرمایا ہے۔ آپ فرماتے ہیں: ثُمَّ جَمَعَ سُبْحَانَهٗ مِنْ حَزْنِ
الْاَرْضِ وَ سَهْلِهَا وَعَذْبِهَا وَ سَبَخِهَا تُرْبَةً سَنَّهَا بِالْمَاءِ حَتّٰى
خَلَصَتْ وَ لَاطَهَا بِالْبَلَّةِ حَتّٰى لَزَبَتْ"
پھر اللہ نے سخت اور نرم، شیریں اور شور زمین سے مٹی کو (اپنے حکم سے) جمع کیا
پھر اُسے پانی سے تر کر دیا کہ وہ صاف ہو کر نتھر گئی اور پانی کی تری سے اس طرح گوندھا کہ
وہ لسدار ہو گئی۔ فَجَبَلَ مِنْهَا صُوْرَةً ذَاتَ اَحْنَاءٍ وَّوُصُوْلٍ وَ اَعْضَاءٍ وَ
فُصُوْلٍ" اس کے بعد اللہ نے اپنے حکم سے ایک ایسی شکل پیدا کی جو پہلوؤں والی
تھی اور اُس میں کچھ جوڑ پیوند اور اعضاء تھے۔ اَجْمَدَهَا حَتّٰى اسْتَمْسَكَتْ
وَاَصْلَدَهَا حَتّٰى صَلْصَلَتْ لِوَقْتٍ مَّعْدُوْدٍ وَ اَمَدٍ مَّعْلُوْمٍ"
اُس کو اس حد تک ٹھوس کر دیا کہ وہ خود ٹھہر سکی اور اتنا سخت کر دیا کہ وہ گھنگھنانے
لگی اور یہ عمل ایک وقت مقرر تک جاری رہا۔

ثُمَّ نَفَخَ فِیْھَا مِنْ رُوْحِہٖ" پھر اللہ نے اُس میں اپنی روح پھونک دی۔
فَمَثَلَتْ اِنْسَانًا ذَا اَذْھَانٍ یُجِیْلُھَا وَ فِکَرٍ یَتَصَرَّفُ بِھَا وَجَوَارِحَ
یَخْتَدِمُھَا وَاَدَوَاتٍ یُقَلِّبُھَا وَمَعْرِفَۃٍ یَفْرُقُ بِھَا بَیْنَ الْحَقِّ وَ
الْبَاطِلِ وَالْاَذْوَاقِ وَالْمَشَامِّ وَالْاَلْوَانِ وَالْاَجْنَاسِ
تو وہ صورت ایک ایسا انسان بنکر اُٹھ کھڑی ہوئی جو ذہنی قوتوں والا تھا، اُس کے پاس فکر کی طاقتیں تھیں اور ان سب سے وہ کام لینے والا تھا، اُس کے اعضاء و جوارح تھے جن سے وہ اپنی خدمت لیتا تھا اور ہاتھ پیر والا جنہیں وہ اپنی خواہش کے مطابق حرکت دیتا تھا۔ اُس میں اسقدر سمجھ تھی کہ وہ حق و باطل میں فرق کرنے والا تھا، خوشبوؤں رنگوں اور جنسوں میں تمیز کرتا تھا۔ پھر فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ رنگ رنگ کی مٹی اور ملتی جلتی ہوئی موافق چیزوں اور مخالف ضدوں اور ایک دوسرے سے متضاد خلطوں سے اُس کا خمیر ہوا ہے یعنی گرمی، سردی، تری اور خشکی ہر چیز اُس میں موجود ہے۔
وَاسْتَادَی اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ الْمَلٰٓئِکَۃَ وَدِیْعَتَہٗ لَدَیْھِمْ وَعَھْدَ
وَصِیَّتِہٖ اِلَیْھِمْ فِی الْاِذْعَانِ بِالسُّجُوْدِ لَہٗ وَالْخُشُوْعِ لِتَکْرِمَتِہٖ"
اس کے بعد اللہ نے فرشتوں سے چاہا کہ وہ اُس کی سونپی ہوئی امانت کو ادا کریں اور اُسکے عہدِ وصیّت کو پورا کریں جو آدمؑ کے سامنے سجدہ کرنے اور اُنکی بزرگی کے آگے اظہار فروتنی کے لئے تھا۔

فَقَالَ سُبْحَانَہٗ اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْا اِلَّآ اِبْلِیْسَ"
پس اللہ نے فرمایا کہ آدمؑ کو سجدہ کرو تو ابلیسؔ لعین کے سوا سب نے سجدہ کیا۔
اِعْتَرَتْہُ الْحَمِیَّۃُ وَغَلَبَتْ عَلَیْہِ الشِّقْوَۃُ" مگر اُس کو تعصب نے گھیر لیا اور بدبختی اُس پر غالب آگئی۔ وَتَعَزَّزَ بِخِلْقَۃِ النَّارِ وَاسْتَھْوَنَ خَلْقَ الصَّلْصَالِ" اُس نے آگ سے پیدا ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو بزرگ سمجھا اور کھنکھناتی ہوئی مٹی سے پیدا ہونے کو حقیر جانا۔
فَاَعْطَاہُ اللّٰہُ النَّظِرَۃَ اِسْتِحْقَاقًا لِلسُّخْطَۃِ وَاسْتِتْمَامًا لِلْبَلِیَّۃِ

وَ اِنْجَازًا لِلْعِدَةِ فَقَالَ اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ"

تو اللہ نے اُس کو مہلت دی تاکہ وہ پورے طور پر غضب وعذاب کا مستحق بن جائے اور اولادِ آدمؑ کی آزمائش وامتحان مکمل ہو جائے اور جو وعدہ ہوا تھا وہ پورا ہو جائے۔ پس اللہ نے اُس سے فرمایا کہ جا تجھے ایک مقرر دن تک کے لئے مہلت ہے۔ (ماخوذ از نہج البلاغہ)

یہ تھا ایک اقتباس حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام کے ایک مشہور خطبہ کا۔ اب ایک بات یہاں یہ بھی قابل ذکر ہے کہ جس مقام پر قرآن حکیم میں یہ فرمایا گیا ہے کہ ہم نے آدمؑ کے جسم میں اپنی روح پھونک دی وہاں نفخ روح سے اُس طرح کا پھونکنا مراد نہیں ہے جیسے ہم اپنے منہ سے پھونکتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے روح کو خلق فرما کر آدم علیہ السلام کے جسم بے روح سے اُس کا تعلق پیدا کر دیا اور وہ اس کے بعد فوراً زندہ ہو گئے۔ رہی اس روح کی اللہ کی ذات کی طرف نسبت تو اس کی تشریح ابھی ہم کر چکے ہیں اور یہ اسی طرح کی نسبت ہے جیسے ناقۃ اللہ اور بیت اللہ میں ناقہ اور بیت کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے حالانکہ اُس کا نہ تو کوئی مکان ہے اور نہ اُسے سواری کے لئے اونٹ کی ضرورت ہے۔ اس کی وجہ بھی وہی ہے جو "من روحی" کی تفسیر کے سلسلہ میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ اسی سلسلہ میں یہ بیان کرنا بھی ضروری ہے کہ فرشتوں کو جس سجدہ کا حکم ہوا تھا اُس سے مراد سجدۂ تعظیمی ہے نہ کہ حقیقی سجدہ کیونکہ وہ اللہ کے سوا کسی اور کے لئے جائز نہیں ہو سکتا اور حقیقت تو یہ ہے کہ سجدہ آدمؑ کے لئے تھا ہی نہیں بلکہ اللہ ہی کے لئے تھا اور آدمؑ محض قبلہ نما کی حیثیت رکھتے تھے اسی طرح جیسے کعبہ مکرمہ کی طرف رخ کر کے اللہ کو سجدہ کیا جاتا ہے پھر اس کا ایک رُخ یہ بھی ہے کہ یہ سجدہ بہر حال خود اللہ ہی کے حکم سے تھا اُس کے منشاء اور مرضی کے خلاف نہ تھا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ مِن سُلَالَةٍ مِّن طِينٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاهُ نُطْفَةً فِي قَرَارٍ مَّكِينٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظَامًا فَكَسَوْنَا الْعِظَامَ لَحْمًا ثُمَّ أَنشَأْنَاهُ خَلْقًا آخَرَ ۚ فَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُم بَعْدَ ذَٰلِكَ لَمَيِّتُونَ ۝ ثُمَّ إِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ تُبْعَثُونَ ۝

(پ۱۸ رکوع (۱) کی درمیانی (۵) آیات - سورۂ المؤمنون)

بلاشبہ ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اُسے نطفہ بنایا ایک محفوظ جگہ میں پھر ہم نے نطفہ کو خون کا لوتھڑا بنا دیا اس کے بعد ہم نے خون کے لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا بنایا پھر ہم نے اُس...... گوشت کے ٹکڑے کو ہڈیوں کی شکل دی پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا تو پھر ہم نے اُسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ پس کیسی شان والا ہے اللہ جو تمام صنّاعوں سے بڑھکر ہے پھر تم ان سب باتوں کے بعد ضرور مر جاؤ گے پھر یقیناً تم قیامت میں دوبارہ اُٹھائے جاؤ گے۔

تشریح و تفسیر :-

"خُلق" کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کا ایجاد کرنا یعنی بغیر مثال اور بغیر مادۂ کے جو پہلے سے موجود ہو اُسے پیدا کرنا مگر کبھی اس کے معنی شکل و صورت اور حالت کے بدل دینے، کسی چیز کا اندازہ کرنے اور جھوٹ بولنے کے بھی آتے ہیں۔ پہلے معنی کے لحاظ سے سوائے اللہ کے کوئی دوسرا خالق نہیں کہا جا سکتا اور بقیہ معنوں کے لحاظ سے (سوائے آخری معنی یعنی جھوٹ کے) خدا اور غیر خدا سب ہی کو خالق کہا جا سکتا ہے۔ البتہ آخری معنی کے لحاظ سے یہ لفظ خدا اور ملائکہ یا معصوم انسانوں کے لئے نہیں بولا جا سکتا۔

"سُلالۃ" (سَلّ) سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو دوسری چیز سے
کھینچ لینا اسی مناسبت سے کسی چیز کا جوہر اور خلاصہ جو اُس سے کھینچ لیا جائے اُسے
"سُلالۃ" کہتے ہیں۔ "طِین" گیلی مٹی۔ "قرار" ٹھہرنے کی جگہ "مَکین" سے
محفوظ مراد ہے۔ "عَلَقَۃ" خون کے لوتھڑے کو کہتے ہیں "مُضغۃ"
گوشت کی بوٹی اور ٹکڑے کے لئے بولتے ہیں۔ "عِظام" "عَظم" کی جمع ہے
جس کے معنی ہڈی کے ہیں۔ "کسونا" "کسو" سے بنا ہے۔ اس کے معنی
کپڑا پہنانے کے ہیں۔ "کِساوۃ" کپڑے اور چادر کو کہتے ہیں۔ "کِسوۃ" لباس
کے لئے بولا جاتا ہے۔ "تبارک" کے معنی ہیں وہ برکت والا ہے۔
"اَحسَنُ الخالقین" سے مقصود ہے کہ اللہ تمام اندازہ کرنے والوں اور
صورت و حالت بدلنے والوں سے اعلیٰ ہے لیکن جہاں تک خلق کے اصلی معنی کا
تعلّق ہے سوائے اللہ کے کوئی دوسرا خالق نہیں کہا جا سکتا۔

کچھ مفسروں نے یہاں انسان کے لفظ سے حضرت آدم علیہ السلام کو مراد لیا ہے اور
بعض نے مطلق انسان کو۔ جن لوگوں نے حضرت ابو البشر کو مراد لیا ہے وہ کہتے ہیں کہ
بعد کی آیت یعنی "ثم جعلناہ نطفۃ الخ" میں "جعلنا" کے بعد "نسلۃ" پوشیدہ
ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے انسان کی نسل کو نطفہ سے پیدا کیا ہے۔ ایک حدیث
میں سرورِ کائنات نے فرمایا ہے کہ اللہ نے حضرت آدمؑ کو ایسی خاک سے پیدا کیا جو اُس
کے حکم سے تمام روئے زمین کے ہر حصہ سے جمع ہوئی تھی اور اسی لئے اولادِ آدمؑ
کے رنگ روپ الگ الگ ہیں۔ حضرت آدمؑ پر قرآن حکیم میں جابجا لفظ
انسان کا اطلاق ہوا ہے۔ سورۂ حجر رکوع (۳) میں اللہ نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:
اور یقیناً ہم نے انسان کو لس دار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے خلق کیا ہے" اور
پھر کچھ آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے کہ اے رسولؐ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں
لس دار گارے کی کھنکھناتی ہوئی مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں پس جب میں
اُسے پوری طرح بنا چکوں اور اُس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اُس کے آگے سجدہ

میں گر پڑنا۔ پس فرشتے تو سب کے سب سربسجود ہو گئے مگر ابلیس نے سجدہ نہیں کیا اُس نے اس سے انکار کیا کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں شامل ہو۔

یہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ اللہ نے اُس روح کو جو حضرت آدمؑ کے جسم میں پھونکی گئی تھی اپنی روح فرمایا ہے اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ خود اللہ کی پوری روح یا اس کا کوئی حصہ تھا بلکہ ذاتِ الٰہی کی طرف یہ نسبت محض اُس روح کی عزّت اور شرف کو ظاہر کرنے کے لئے تھی۔ بعض علماء نے کہا ہے کہ اگر سورج کو قوتِ گویائی مل جائے اور وہ یہ کہے کہ میں نے اپنے نور کا فیض زمین تک پہنچایا تو کیا یہ جملہ یعنی (اپنا نور) کہنا غلط ہو گا ہرگز نہیں۔ تو جب یہ جملہ صحیح ہے حالانکہ نہ آفتاب زمین میں حلول کرتا ہے اور نہ اُس کا نور اُس سے جدا ہوتا ہے بلکہ زمین سے لاکھوں میل دور رہ کر بھی روشنی کی باگ اسی کے قبضہ میں ہے۔ زمین کا اس میں کوئی اختیار نہیں ہے سوائے اس کے بقدرِ اپنی استعداد کے وہ سورج سے فائدہ اُٹھائے۔ تو پھر اللہ جو ہر تشبیہ و اضافت سے مُبرّا ہے اُس کا یہ فرمانا کہ میں نے جسم آدمؑ میں روح پھونک دی کیونکر حلول و اتحاد وغیرہ کی دلیل بن سکتا ہے غرض روح کی یہ نسبت اللہ کی ذاتِ اقدس کی طرف محض اُس کی عزّت بڑھانے کے لئے تھی۔

(درس ۱۰۴)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۔۔ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَ ○

(پ ۱۸، رکوع (۱) کی ابتدائی ۱۱ آیات۔ سورۃ المؤمنون)

"اَلَّذِیْنَ" "اَلَّذِیْ" کی جمع ہے۔ یہ اسمِ موصول ہے جو عبارت کے اگلے اور بعد کے جملوں میں ربط پیدا کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ "زکوٰۃ" کے معنی ہیں نفیس اور خالص چیز یا پاکیزگی کے یا مال کا وہ حصہ جو قانون شرع کے مطابق راہِ خدا

یں نکالا جائے۔

"والذین ھم لفروجھم حافظون" سے مقصود یہ ہے کہ وہ اہل ایمان عفت و پاکدامنی کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔ "ازواج" زوج کی جمع ہے۔ یہ لفظ شوہر اور زوجہ دونوں ہی کے لئے بولتے ہیں مگر یہاں ازواج سے مراد بیویاں ہیں۔

"ایمان" "یمین" کی جمع ہے جو بہت سے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ یہاں اس سے داہنا ہاتھ مراد ہے۔

"ملک الیمین" اس چیز کو کہتے ہیں جس پر انسان کو پورا قبضہ و اختیار حاصل ہو۔

"ما ملکت ایمانھم" سے یہاں مراد وہ کنیزیں ہیں جو اہل ایمان کی ملکیت میں ہوں۔

"ملومین" "لوم" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں الزام دینا۔ جس پر کوئی الزام ہو اسے "ملوم" کہتے ہیں۔ اسی کی جمع یہاں "ملومین" آئی ہے۔ "ابتغی" "بغاء" سے بنا ہے۔ جس کے معنی طلب کے ہیں۔ "وراء" کے معنی پیچھے کے آتے ہیں اور کبھی اسے سامنے اور علاوہ کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں یہی مراد ہے۔

"عادون" حد سے بڑھ جانے والے اور "راعون" حفاظت اور نگہبانی کرنے والے۔

اس جگہ اہل ایمان کو جنت کا وارث کہا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا جنت پر حق ملکیت ویسا ہی ہے جیسا کسی وارث کا میراث اور اپنے مورث کے ترکہ پر ہوا کرتا ہے۔ "فردوس" کے متعلق کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے، علمائے لغت نے بہت سے قول لکھے ہیں مگر بہر حال اس سے مراد جنت کا درمیانی اور بلند ترین مقام ہے اصل معنی اس کے باغ کے ہیں۔

یہ سورہ مکہ میں اترا تھا اور اس میں ایک سو اٹھارہ آیات ہیں۔ ان آیتوں میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ حقیقی کامیابی اور نجات بغیر ایمان کے نہیں مل سکتی اور سچا ایمان ان ہی لوگوں کا ہے جن میں یہ صفتیں موجود ہوں جن کا یہاں ذکر ہے۔

سب سے پیشتر ایمانداروں کی جو صفت بیان ہوئی ہے وہ نماز کی حالت میں ان کا خضوع و خشوع ہے پھر فرمایا گیا ہے کہ وہ لغو اور بیہودہ باتوں سے اعراض کرتے ہیں اور اسکے

بعد یہ کہ وہ راہِ خدا میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ بعض مفسروں نے اس جگہ "زکوٰۃ" سے تطہیرِ نفس کے معنی مُراد لیے ہیں۔ اس دوسرے معنی میں ہر طرح کی تطہیر شامل ہے۔ پہلے معنی کے لحاظ سے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ زکوٰۃ کا حکم مکہ ہی میں آچکا تھا پھر نصاب وغیرہ کا تعین ہجرت کے بعد مدینہ میں ہوا۔ لیکن جو لوگ اس لفظ سے صرف تطہیرِ نفس مراد لیتے ہیں وہ اسی بات کے قائل ہیں کہ فرضیّتِ زکوٰۃِ مال کا تعلّق مدینہ ہی کی زندگی سے ہے۔

اب جہاں تک خود پاکیزگیٔ نفس کا تعلق ہے وہ تو اسلامی تعلیمات کی اہم ترین بنیاد ہے۔ چنانچہ سورۂ الشمس میں اللہ کا ارشاد ہے: "قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا"، جس شخص نے اپنے نفس کو برائیوں سے پاک کر لیا وہی درحقیقت کامیاب ہو گیا اور جس نے اُس کو گناہوں سے خراب کر لیا وہی نامراد ہوا۔ بلاشبہ تطہیر اور تزکیۂ نفس ایمان کی پہلی اور اہم ترین شرط ہے۔ اگر انسان کا نفس ہی پاک نہ ہو تو اُس کے کسی عمل کی کوئی بھی قیمت نہ ہوگی۔

اس بنا پر اگر ہمیں اللہ کی خوشنودی اور اُس کی بارگاہ میں عزّت حاصل کرنا ہے اور دُنیا و آخرت کی فلاح کا حقدار بننا ہے تو ہم سب باتوں سے پہلے اپنے نفس کی تطہیر کریں اور گناہوں کی آلودگی سے اُسے پاک کریں۔

(درس ۱۰۴)

قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ يَرِثُوْنَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

(پ۱۸ رکوع (۱) کی ابتدائی (۱۱) آیات۔ سورۂ المؤمنون)

یقیناً وہ اہلِ ایمان فلاح پا گئے جو اپنی نماز میں خضوع و خشوع رکھنے والے ہیں اور جو لغو باتوں سے کنارہ کش رہتے ہیں اور جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں (یا اپنے نفس کی تطہیر کرتے ہیں)، اور جو لوگ اپنی پاک دامنی کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی ازواج یا کنیزوں کے کیونکہ اس میں اُن پر کوئی الزام نہیں ہے۔ ہاں جو شخص اس کے علاوہ کسی اور طریقہ کا طلبگار ہو تو ایسے ہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھنے والے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی پوری حفاظت کرتے ہیں بس یہی لوگ تو وارث ہیں جو فردوس کے وارث ہوں گے اور وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔

تشریح و تفسیر:

" اَفْلَحَ "، ماضی کا صیغہ ہے۔ یہ " فَلاح " سے بنا ہے جس کے معنی دینوی اور اُخروی کامیابی کے ہیں۔ چونکہ نماز انسان کی ہر طرح کی کامیابی اور نجات کا ذریعہ ہے اسی وجہ سے اذان میں بھی " حَیَّ عَلَی الفَلَاح " کہا جاتا ہے یعنی نجات اور کامیابی حاصل کرنے کے لئے دوڑو۔

ماضی کا صیغہ اُن باتوں کے لئے لاتے ہیں جو گذشتہ زمانے میں ہو چکی ہوں۔ چونکہ اُن ایمانداروں کی فلاح یقینی ہے جن میں وہ صفتیں پائی جائیں جن کا اِن آیات میں ذکر ہے اُسی طرح جیسے گذری ہوئی بات یقینی ہو جاتی ہے اسی لئے یہاں ماضی کا صیغہ بولا گیا ہے تاکہ یہ ظاہر ہو جائے کہ اہلِ ایمان کی کامیابی زمانۂ ماضی کی طرح یقینی ہے ساتھ ہی " قَدْ " کا لفظ بول کر اُس کے یقینی ہونے میں اور زیادہ قوّت پیدا کر دی گئی ہے۔ " خَاشِعُوْن " خشوع سے بنا ہے جس کے معنی عاجزی اور فروتنی کے ہیں اور خوف و سکون کے بھی آتے ہیں۔ قرآنِ حکیم میں اس لفظ کو چہروں، نگاہوں اور آوازوں نیز دلوں کی صِفت کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔

درحقیقت خشوع کا مرکز تو دل ہی ہے اور دوسرے اعضائے بدن اُسی کے

تابع ہوتے ہیں یعنی اگر خوف الہٰی سے انسان کا دل متاثر ہو تو دوسرے اعضائے بدن پر اُس کا اثر ظاہر ہونا ضروری ہوگا اور اسی لئے یہ پورے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ اگر پورے خضوع و خشوع کے ساتھ نماز پڑھی جائے تو انسان کبھی برائیوں کے نزدیک نہیں جاسکتا۔ سورۂ الحمد کی ترتیب میں بھی معرفتِ الہٰی کے اسی رخ کا پورا لحاظ موجود ہے اور ایک غائب پروردگار کی حمد کرتے ہوئے دفعتًہ "ایّاکَ نعبدُ" اور "ایّاکَ نستعین" کہکر بندہ اُس کی جانب خطاب کرنے لگتا ہے جیسے وہ اپنے بندہ کے سامنے ہی موجود ہے اور وہ اُس کی بارگاہ میں اس طرح انتہائی عاجزی کے ساتھ عرض کر رہا ہے کہ میں بس تیری ہی عبادت کرتا ہوں حقیقت میں نماز کی شان تو یہی ہے کہ نمازی اس طرح اُسے ادا کرے گویا وہ اپنے اصلی پروردگار کے سامنے کھڑا ہے اور ایک ایسی جلیل ذات کے سامنے حاضر ہے جو اسکے ظاہر و باطن سے پوری طرح باخبر ہے اور دل کی گہرائیوں میں چھپے ہوئے خیالات اور وسوسوں سے بھی واقفیت رکھتا ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے کہ حضورؐ نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جو نماز کی حالت میں اپنی ڈاڑھی سے شغل کر رہا تھا، آپ نے فرمایا۔

"لَوْخشع قلبُ ھٰذا لَخَشَعَتْ جَوَارِحُہٗ"، اگر اس شخص کے دِل میں خشوع و خضوع ہوتا تو اس کے بدن پر بھی اثر ہوتا اور اس سے کبھی یہ حرکت ظاہر نہ ہوتی۔ ایک دوسری حدیث میں ہے کہ نماز کو تم اس طرح ادا کیا کرو گویا یہ تمہاری زندگی کی آخری نماز ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ ایک یہ بھی ہوگا کہ جب نماز میں اللہ کی عظمت و بزرگی کے تصوّر کی عادت پڑ جائے گی تو اس کا اثر مسلمان کی زندگی کے ہر شعبہ پر ظاہر ہونے لگے گا اور وہ اپنے کسی عمل میں بھی اللہ کی جلالت و قدرت کے تصوّر سے غافل نہ رہے گا۔ در اصل دنیا میں جو کچھ ظلم و جور، قتل و غارت، جھوٹ، رشوت ستانی، چوری، خیانت اور دوسرے جرائم کئے جاتے ہیں صرف اس سبب سے کہ ان کا ارتکاب کرنے والوں کے دلوں میں اللہ کا خوف نہیں ہوتا، اور خوف اس لئے نہیں ہوتا کہ انھیں اُس کے حاضر و ناظر اور علیم و خبیر

ہونے پر کامل یقین نہیں ہوتا ورنہ وہ ایسی حرکتیں اور گناہ دنا فرمانیاں کبھی نہ کرسکتے۔

وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ "میں "لغو" سے مراد فضول اور بے فائدہ و مہمل امور ہیں۔ ادبِ عربی کے مشہور محقق زجاج نے لکھا ہے:

اَللَّغْوُ هُوَ کُلُّ بَاطِلٍ وَلَهْوٍ وَهَزْلٍ وَمَعْصِیَةٍ وَمَا لَا یُجْمَلُ مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ " یعنی "لغو" سے مراد تمام باطل اور غلط باتیں، کھیل کود، بیہودہ کلام اور گناہ و سرکشی نیز ہر وہ قول و فعل ہے جو پسندیدہ نہ ہو۔ ضحاک کہتے ہیں کہ لغو کا ادنیٰ اور معمولی درجہ اگرچہ مباح و جائز ہو مگر اس کا بھی ترک کردینا بہرحال قابل تعریف ہوگا۔ مقصود یہ ہے کہ سچے مومن وہی ہیں جو بری باتوں سے ہمیشہ دور رہا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے مقام پر اہل ایمان کی اسی صفت کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے: وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا کِرَامًا" (فرقان/۷۲) جب وہ لوگ کسی لغو بات کی طرف سے گذرتے ہیں تو انتہائی وقار کے ساتھ گذر جاتے ہیں۔ وہ ایسے لوگ ہیں جنہیں عبودیت اور بندگی کا پورا احساس ہوتا ہے، وہ اپنے معبود کی عظمت و جلالت کو پوری طرح جانتے ہیں۔ باطل کی کوئی طاقت انھیں حق کے راستہ سے نہیں ہٹا سکتی اور دنیا کا حسن و جمال، دولت و ثروت، جاہ و حکومت خواہ کیسی ہی ہو اُن کو اپنے پروردگار کی اطاعت و فرمانبرداری سے غافل نہیں بنا سکتی کیونکہ دنیا کے فضول کاموں میں تو وہی مشغول اور مبتلا ہوسکتا ہے اور وہی اللہ کی حکومت کو بھول سکتا ہے جو اُس کی پوری معرفت نہ رکھتا ہو۔

چہ خوش گفت بہلول فرخندہ خو ٭ چو بگذشت بر عارفِ جنگجو
گر این مدّعی دوست بشناختے ٭ بہ پیکار دشمن نہ پرداختے

(درس ۱۰۵)

فَلَمَّا جَاۗءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْٓا اَبْنَاۗءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا
نِسَاۗءَهُمْ ۭ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ
مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي
الْاَرْضِ الْفَسَادَ ○ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّىْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ
لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ○ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ڰ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ
اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَاۗءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ
رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ
بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ○

(پارہ ۲۴ سورۃ المؤمن رکوع ۸ و ۹)

ترجمہ - غرض جب موسیٰ ان لوگوں کے پاس ہماری طرف سے سچا دین لے کر آئے تو وہ بولے
کہ جو لوگ اُن کے ساتھ ایمان لائے ہیں ان کے بیٹوں کو تو مار ڈالو اور ان کی عورتوں کو زندہ
رہنے دو اور کافروں کی تدبیریں تو بے اثر رہتی ہیں۔

اور فرعون نے کہا مجھے چھوڑ دو کہ میں موسیٰ کو قتل کر ڈالوں اور اُس کو چاہیے کہ وہ اپنی
مدد کے لئے اپنے پروردگار کو پکارے۔ مجھے اندیشہ ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ تمہارے دین کو
بدل ڈالے یا ملک میں فساد پیدا کر دے۔ اور موسیٰ نے کہا میں تو ہر غرور و تکبر کرنے والے سے
جو حساب کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ لے چکا ہوں۔ اور
فرعون کے لوگوں میں ایک ایماندار شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپائے رہتا تھا۔ کہا: کیا تم ایسے
شخص کو قتل کرنا چاہتے ہو جو کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے رب کی طرف
سے دلیلیں لیکر آیا ہے اور اگر بالفرض وہ شخص جھوٹا ہے تو اُس کے جھوٹ کا دیال اُسی پر پڑے گا
اور اگر کہیں یہ سچا ہوا تو جس عذاب کی یہ تمہیں دھمکی دیتا ہے اس میں سے کچھ تو تم پر ضرور پڑے گا۔ بیشک

خدا اُس شخص کی ہدایت نہیں کرتا جو حد سے گذرنے والا اور جھوٹا ہو۔

ترجمہ کے بعد اب ان آیات کریمہ کے بعض الفاظ کی تشریح سنئے۔

"اِستَحیُوا" امر ہے اور جمع کا صیغہ ہے حیوٰۃ سے بنا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ان کی عورتوں کو کنیزی اور خدمت کے لئے زندہ رکھو۔

"ذَرُوا" بھی امر ہے اور جمع کا صیغہ ہے اور "وَذَرَ" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ہیں ترک کرنا اور چھوڑ دینا۔ عُذتُ۔ عُوذ سے بنا ہے۔ جس سے مراد ہے پناہ لینا۔

آل کی اصل اھل ہے۔ دوسرے معنوں کے علاوہ آل کو زیادہ تر اھل و عیال کے معنی میں اور نزدیک کے رشتہ داروں کے لئے بولا جاتا ہے۔

یَکتُمُ۔ کتم سے بنا ہے یعنی چھپانا۔ مکتوم اُس چیز کو کہتے ہیں جو چھپا دی جائے۔

بَیِّنات۔ بَیِّنہ کی جمع ہے جو گواہی، نبوّت اور دلیل کے معنی میں بولا جاتا ہے یہاں مراد معجزات ہیں۔ یُصِبکُم۔ "صَوبٌ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بلندی سے پستی کی طرف پہونچنا یا واقع ہونا۔ یَعِدُکُم۔ وعد سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اقرار اور وعدہ کرنا خواہ اچھائی کا وعدہ ہو یا بُرائی کا وعدہ اور دھمکی دینا ہو، جو معنی محل اور موقع کے مطابق درست ہوں گے وہ مراد لئے جائیں گے۔

یَھدِی۔ ھِدَایۃ سے بنا ہے جس سے یہاں پر مراد مقصود تک پہونچانا ہے یعنی خدا ایسے شخص کو جو جھوٹا اور حد سے گذر جانے والا ہو اُس کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کا امتحان لینے کے لئے تھوڑی سی مہلت اس کو دے دی جائے اور چند روز تک اس کا کام چل جائے مگر آخر میں اس جھوٹے کا نتیجہ صرف محرومی و ناکامی ہوتا ہے۔ اور خدا اس جھوٹے کو اس کے مقصود تک نہیں پہونچاتا۔

مُسرِفٌ۔ سَرَف سے بنا ہے اس کے معنی ہیں اعتدال سے ہٹ جانا اور حد سے تجاوز کرنا۔

قرآن کریم نے گذشتہ قوموں کے واقعات اور اگلے رسولوں کے قصّے بیان کر کے اپنے آخری پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسکین دی ہے کہ جس طرح ان انبیاء و مرسلین کے ساتھ اللہ کی مدد رہی ہے اور نتیجہ میں اُن کی کامیابی اور فتح ہوئی اور وہ مقدس ہستیاں اپنے مقصد تبلیغ حق میں کبھی ناکام نہ رہیں بلکہ ہمیشہ کامیاب رہیں اور چاہے ظاہری حیثیت سے ان کو قتل کیا گیا ان کا مال لوٹا گیا ان کے گھر تباہ و برباد کیے گئے لیکن آخر کار ان ہی کو غلبہ حاصل ہوا اور جو غرض

وہ لے کر آئے تھے وہ پوری ہوئی اسی طرح آخری رسول کے ساتھ بھی اللہ کی نصرت و مدد ہے اور
دشمن کتنی ہی تکلیفیں پہونچائیں اور تبلیغ اسلام کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں لیکن نتیجہ میں اُن کی
کامیابی ہے۔

ان آیات میں حضرت موسیٰ بن عمران علیہما السلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام
حضرت آدم علیہ السلام سے ساڑھے پانچ ہزار سال کے بعد دنیا میں آئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی
حضرت ھارونؑ تھے یہ دونوں عمران بن یصہر کے فرزند تھے ان دونوں سے بڑی ان کی ایک
بہن بھی تھیں ان کا نام بھی مریم تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی والدۂ گرامی کا نام بھی مریم تھا۔ اور اُن کے
باپ کا نام بھی عمران تھا مگر یہ عمران بن ماثان تھے

ان دونوں عمرانوں کے زمانے الگ الگ گذرے ہیں اور ان کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو
(۱۸۰۰) سال کا وقفہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ کو قبطیوں کے بادشاہ فرعون کی طرف بھیجا گیا تھا جو مصر
کا بادشاہ تھا۔ ہامان اس فرعون کا وزیر تھا اور قارون اس کی سلطنت میں سب سے زیادہ
دولتمند تھا۔ ان سب لوگوں نے حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کی اور ان کی توہین و تذلیل میں کوئی دقیقہ
اٹھا نہ رکھا اور آخر کار کہدیا کہ یہ تو (معاذ اللہ) جادوگر ہیں۔ انسان کی ہدایت کے لئے ہمیشہ
انبیاء بھیجے گئے۔ حضرت موسیٰؑ سے قبل بھی نبی گذرے اور اُن کے بعد بھی یہ خدا کی برگزیدہ ہستیاں
انسانی فلاح و ہدایت کے لئے آتی رہیں تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ اللہ نے ہماری ہدایت اور رہبری
کا کوئی انتظام نہیں فرمایا اس لئے خدا نے انسان کی تخلیق کیساتھ ہی نبی بھیجنے کا سلسلہ شروع
فرما دیا اور ہر زمانہ میں کوئی نہ کوئی پیغمبر آتا رہا جو خدا کی مرضی اس کے بندوں تک پہونچاتا رہا اور
اُس کے دین کی تبلیغ کرتا رہا۔

انسان میں خود اتنا شعور اور اتنی عقل نہ تھی کہ وہ اپنی ہدایت و اصلاح کے لئے کوئی ایسا
نظام قانون بنا سکتا جس میں کوئی عیب اور کمزوری موجود نہ ہوتی اور ہم کو یہ معلوم ہو جاتا کہ اللہ
ہم سے کیا چاہتا ہے اور کیا نہیں چاہتا۔ انسانی افراد کی رائیں مختلف ہیں اور ان کے نقطہ ہائے نظر
باہمی جدا جدا ہیں ایک بات کو ہم برا کہتے ہیں تو دوسرے اُسی چیز کو اچھا کہتے اور سمجھتے ہیں ایک
ملک کے بسنے والے کسی طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں اور دوسرے ملک کے لوگ کسی اور طرح کی۔
راہیں الگ ہیں۔ خیال جدا ہیں، نظریے مختلف ہیں۔ عیب و ہنر کے معیار اور نیکی و بدی کی کسوٹی

اس انسانی معاشرے کی ہر فرد کے نزدیک علیحدہ ہے اور اس اختلاف کے باوجود ہر شخص حقیقت تک پہونچنے کی کوشش کرتا ہے اور وہاں تک رسائی کا دعویٰ بھی کرتا ہے مگر حقیقت تو لفظ نظر بدلنے سے بدل نہیں سکتی اور وہ ہر حال میں ایک ہی رہتی ہے اس لئے ضرورت تھی کہ ہماری ہدایت کے لئے کوئی ایسا انسان آئے جو حقیقت کا علم رکھتا ہو اُس کا علم تخیلات و قیاسات کا پابند نہ ہو بلکہ حقائق پر مبنی ہو اس لئے اُس کے بتائے ہوئے راستے میں کبھی کوئی گمراہی نہ ہوگی اور اس کے بنائے ہوئے قانونی نظام میں کبھی کوئی بے اعتدالی اور غلطی کا امکان نہ ہوگا۔ ایسے انسان رسول اور نبی کہلاتے ہیں جن کو اللہ حقائق کا علم دے کر بھیجتا ہے۔ جن کے قول و فعل میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ جن کا ہر عمل خدا کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ جن کا علم کامل ہوتا ہے۔ جن کا فہم بے عیب ہوتا ہے۔ جو رضائے الٰہی کے تابع ہوتے ہیں اور جن کی زندگی تمام مخلوقات کے لئے نمونہ عمل ہوتی ہے۔

یہ لوگ انسانوں کے سامنے اللہ کا پیغام لاتے ہیں اور انسانی معاشرے کی اصلاح کرتے ہیں ہر دور میں یہ مقدس ہستیاں آئیں۔ کسی نے ان کا پیغام سُنا اور کسی نے نہ سُنا۔ کسی نے ان کی بات مانی اور کسی نے نہ مانی لیکن یہ ہر قسم کی تکلیف اُٹھاتے رہے اور اصلاح و ہدایت کا کام انجام دیتے رہے جس نے ان سے ہدایت حاصل کی وہ کامیاب ہوا اور جس نے ان کو جھٹلایا اور ان کی مخالفت کی وہ خود برباد ہوگیا ان کو خدا نے عزت دی تھی اور نبوت کا مرتبہ عطا کیا تھا کسی کے ماننے اور نہ ماننے سے خدا کے دئے ہوئے مرتبوں میں فرق نہیں آیا۔ یونسؑ کو ان کی قوم نے نہ مانا تو کیا ان کی نبوت میں کوئی فرق ہوا۔ ہرگز نہیں۔ نوحؑ کی اُمت نے ان کی تکذیب کی تو کیا اس سے اُن کے رتبہ میں کوئی کمی ہوگئی۔ ہرگز نہیں۔ یہ خدا کے نیک بندے اس کی مرضی کے مطابق ہمیشہ کام کرتے ہیں نہ ان کو مالِ دُنیا کی طمع ہوتی ہے اور نہ خدا کے سوا کسی بڑی سے بڑی طاقت کا خوف ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ بھی ان ہی جلیل القدر ہستیوں میں ہیں جنہوں نے نسلِ انسانی کی اصلاح وارشاد کے لئے وہ کام کئے ہیں جو ابدالآباد تک تاریخ عالم میں زندہ رہیں گے ان کو جادوگر کہا گیا ان کو جھوٹا بنایا گیا مگر کبھی انھوں نے اس کی پروا نہ کی اور اپنے کام سے دست بردار نہ ہوئے۔ فَلَمَّا جَاءَهُم بِالْحَقِّ مِنْ عِندِنَا ـ جب ان لوگوں کے پاس دین حق لے کر جو ہماری طرف سے تھا۔ موسیٰ آئے قَالُوا اقْتُلُوا أَبْنَاءَ الَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ تو انہوں نے کہا کہ ان پر جو لوگ ایمان لے آئے ہیں ان کے بیٹوں کو مار ڈالو وَاسْتَحْيُوا نِسَاءَهُمْ اور ان کی عورتوں

کو زندہ رکھو وَمَا کَیۡدُ الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ اور کافروں کی حیلہ سازی، مکر اور تدبیر یا بے اثر رہتی ہیں وَقَالَ فِرۡعَوۡنُ ذَرُوۡنِیۡۤ اَقۡتُلۡ مُوۡسٰی وَلۡیَدۡعُ رَبَّہٗ ۔ اور فرعون کہنے لگا کہ مجھے چھوڑ دو تاکہ میں موسیٰؑ کو قتل کر ڈالوں اور اُس کو چاہیئے کہ وہ اپنی نصرت و امداد کے لئے اپنے رب کو بلائے۔

اِنِّیۡۤ اَخَافُ اَنۡ یُّبَدِّلَ دِیۡنَکُمۡ اَوۡ اَنۡ یُّظۡہِرَ فِی الۡاَرۡضِ الۡفَسَادَ میں ڈرتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو کہ موسیٰ تمہارا مذہب تبدیل کر دے یا ملک میں کوئی فساد پیدا کر دے۔ وَقَالَ مُوۡسٰۤی اِنِّیۡ عُذۡتُ بِرَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ مِّنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ اور موسیٰؑ نے کہا کہ میں پناہ لے چکا ہوں اپنے اور تمہارے پروردگار کی ہر متکبر و مغرور سے جو روز حساب پر ایمان نہیں رکھتا۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤۡمِنٌ مِّنۡ اٰلِ فِرۡعَوۡنَ یَکۡتُمُ اِیۡمَانَہٗۤ اَتَقۡتُلُوۡنَ رَجُلًا اَنۡ یَّقُوۡلَ رَبِّیَ اللّٰہُ وَقَدۡ جَآءَکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۔ اور ایک مومن شخص نے جو فرعون کے خاندان اور قریبی رشتہ داروں میں سے تھا اور اپنا ایمان چھپائے ہوئے تھا کہا۔ کیا تم ایک شخص کو صرف اس بات پر قتل کرتے ہو کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رب اللہ ہے اور وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے روشن دلیلیں اور معجزات لیکر آیا ہے وَاِنۡ یَّکُ کَاذِبًا فَعَلَیۡہِ کَذِبُہٗ وَاِنۡ یَّکُ صَادِقًا یُّصِبۡکُمۡ بَعۡضُ الَّذِیۡ یَعِدُکُمۡ ۔ اگر وہ جھوٹا ہے تو اُس کے جھوٹ کا وبال خود اُسی پر پڑے گا اور اگر وہ سچا ہے تو جو کچھ وہ پیشین گوئی کر رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو تم پر ضرور پڑے گا۔ اِنَّ اللّٰہَ لَا یَہۡدِیۡ مَنۡ ہُوَ مُسۡرِفٌ کَذَّابٌ ۔ اللہ اُس کی رہبری نہیں کرتا اور اسے مقصود تک نہیں پہونچاتا جو حد سے گذرنے والا جھوٹا ہو۔

اسی سلسلہ میں قرآن کا ارشاد ہے۔

وَکَذٰلِکَ زُیِّنَ لِفِرۡعَوۡنَ سُوۡٓءُ عَمَلِہٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِیۡلِ ۔ فرعون کی بدکاریاں اُس کی آنکھوں میں کھپی ہوئی تھیں اور سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق اپنے برے اعمال کی وجہ سے اُس کو حاصل نہ تھی۔ وَمَا کَیۡدُ فِرۡعَوۡنَ اِلَّا فِیۡ تَبَابٍ ۔ فرعون نے موسیٰؑ کے خلاف اہل مصر کو ابھارنے کی بڑی بڑی تدبیریں کیں اور ان کو ذلیل و رسوا کرنے اور ناکام بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا۔ مگر حق کی طاقت لازوال ہے! فرعون کی ہر تدبیر رائیگاں ہو گئی اور اُس کی ساری کوششیں ناکام بن گئیں۔ وہ موسیٰؑ کو مٹانا چاہتا تھا مگر خود مٹ گیا۔ وہ

حضرت کلیم اللہ کے دین کو فنا کرنا چاہتا تھا مگر خود اُس کا نام لیوا کوئی دنیا میں باقی نہ رہا اور وہ سطوت واقتدار سب خاک کی نذر ہو گیا۔

دوسری جگہ قرآن کی آواز ہے: وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُودُهُ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوا أَنَّهُمْ إِلَيْنَا لَا يُرْجَعُونَ فَأَخَذْنَاهُ وَجُنُودَهُ فَنَبَذْنَاهُمْ فِي الْيَمِّ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ۔ فرعون اور اُس کے لشکروں نے روئے زمین پر ناحق سر اٹھایا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ ہماری طرف وہ کبھی پلٹ کر نہ آئیں گے تو ہم نے فرعون اور اُس کے لشکروں کو پکڑ لیا۔ اور سب کو سمندر میں جھونک دیا۔ دیکھو! ظلم کرنے والوں کا انجام کتنا برا ہوتا۔

(درس ۱۰۶)

وَقَالَ رَجُلٌ مُؤْمِنٌ مِنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ وَإِنْ يَكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهُ وَإِنْ يَكُ صَادِقًا يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِي يَعِدُكُمْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ۝ يَا قَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظَاهِرِينَ فِي الْأَرْضِ فَمَنْ يَنْصُرُنَا مِنْ بَأْسِ اللَّهِ إِنْ جَاءَنَا قَالَ فِرْعَوْنُ مَا أُرِيكُمْ إِلَّا مَا أَرَىٰ وَمَا أَهْدِيكُمْ إِلَّا سَبِيلَ الرَّشَادِ ۝

(پارہ ۲۴۔ رکوع ۹ کی ابتدائی آیات۔ سورۃ المؤمن)

اور فرعون کے قرابت داروں میں سے ایک ایمان دار شخص نے جو اپنے ایمان کو چھپائے رہتا تھا (لوگوں سے) کہا۔ کیا تم لوگ ایسے شخص کے قتل کے درپے ہو جو صرف یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے حالانکہ وہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس دلیلیں اور معجزات لے کر آیا ہے اور اگر (بالفرض) یہ شخص جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا اور اگر کہیں یہ سچا ہوا تو جس عذاب کی یہ پیشین گوئی کرتا ہے اس میں سے کچھ تو تم پر ضرور واقع ہو کر رہے گا۔ بلاشبہ خدا اُس شخص کو مقصود تک نہیں پہنچاتا اور اُس کی رہبری نہیں کرتا جو حد سے گذرنے والا اور جھوٹا ہو۔ اے میری قوم آج تو

(بیشک) تمہاری بادشاہت ہے اور ملک میں تمہارا ہی بول بالا ہے لیکن (کل) اگر خدا کا عذاب ہم پر آجائے گا تو ہماری کون مدد کرے گا۔ فرعون نے کہا کہ میں تو وہی بات سمجھاتا ہوں جو میں خود سمجھا ہوں اور جو میں دیکھتا ہوں وہی تم کو بھی دکھاتا ہوں اور میں تو اسی راہ کی طرف تمہاری رہبری کرتا ہوں جس میں بھلائی ہے۔

ترجمہ کے بعد ان آیات کریمہ کے بعض کلمات کی تشریح کی جاتی ہے۔

آل کی اصل اھل ہے۔ کلام عرب میں آل کو مختلف معنوں میں بولا جاتا ہے۔ دوسرے معانی کے علاوہ اس لفظ کا زیادہ تر اہل وعیال اور نزدیک کے قرابنداروں ہی میں استعمال کیا گیا ہے۔ یکتم۔ کتم سے بنا ہے یعنی چھپانا۔ مکتوم اس چیز کو کہتے ہیں جو چھپادی جائے۔ بَیِّنَات۔ بَیِّنَۃٌ کی جمع ہے جو گواہی، ثبوت اور دلیل و معجزہ کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہاں معجزات ہی مراد ہیں۔

"یُصِبْکُمْ"۔ صوب سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بلندی سے پستی کی طرف پہونچنا یا واقع ہونا۔ یَعِدُکُمْ۔ وعد سے بنا ہے جس کے معنی اقرار اور وعدہ کرنے کے ہیں خواہ وہ اچھائی کا وعدہ ہو یا برائی کا۔ جو موقع اور محل کے مطابق معنی درست ہوں گے وہ مراد لئے جائیں گے۔

یَھْدِی۔ ھِدَایَۃ سے بنا ہے جس سے یہاں پر مراد مقصود تک پہونچانا ہے۔ یعنی خدا ایسے شخص کو جو جھوٹا اور حد سے گذر جانے والا ہو اس کے مطلوب و مقصود تک نہیں پہونچاتا۔ ہوسکتا ہے کہ جو جھوٹا اور حد سے گذر جانے والا ہو اس کو کچھ مہلت دیدی جائے تاکہ چندروز بعد اس کا جھوٹ کھل جائے اور اس کا نتیجہ صرف محرومی وناکامی

"مُسْرِفٌ"۔ سرف سے بنا ہے۔ اس کے معنی اعتدال اور میانہ روی سے دور ہوجانا اور حد سے تجاوز کرنا۔ "بَاْسٌ" کا استعمال بھی بہت سے معنوں میں ہوتا ہے۔ شجاعت، قوت، خوف، عذاب اور ضرر و حرج نیز جنگ کی شدت کے لئے اس لفظ کو بولتے ہیں۔ قرآن کریم میں بھی اس کو متعدد معنوں میں استعمال فرمایا گیا ہے۔

جیسے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْهِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ۔ ہم نے لوہے کو پیدا کیا

جس میں شدید ہیبت ہے ۔ نَحْنُ اُولُوْا قُوَّۃٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِیْدٍ ہم بڑے طاقت والے اور بڑے لڑنے والے ہیں ۔ اس مقام پر شدت جنگ مراد ہے ۔ کبھی یہ لفظ نقصان اور ضرر کے معنوں میں بولا جاتا ہے جیسے لا باس ۔ اس بات میں کوئی ضرر اور حرج نہیں ہے ۔

مگر جہاں کہیں قرآن کریم میں اس لفظ کو اللہ کے لئے استعمال کیا گیا ہے وہاں عذاب مراد ہے ۔ جیسے وَلَا یُرَدُّ بَاْسُہٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِیْنَ ۔ اس کا عذاب گناہگاروں سے ٹالا نہیں جاتا ۔ وَکَمْ مِّنْ قَرْیَۃٍ اَھْلَکْنٰھَا فَجَآءَھَا بَاْسُنَا بَیَاتًا اَوْ ھُمْ قَآئِلُوْنَ ۔ ایسی بہت سی بستیاں ہیں جنہیں ہم نے ہلاک و تباہ کر ڈالا تو ہمارا عذاب ایسے وقت آپہونچا جبکہ وہ لوگ یا تو رات کو گہری نیند سو رہے تھے یا دن کو ان کی آنکھ لگ گئی تھی اور آرام کر رہے ہیں ۔

ان آیات میں بھی جن کو ابتدا میں تلاوت کیا گیا ہے بَاْسُ اللہِ سے مراد عذاب خداوندی ہے ۔ "فرعون" سرکش انسان کو کہتے ہیں اس کی جمع فراعنہ آتی ہے مصر کے قدیم بادشاہوں کا لقب بھی فرعون تھا ۔ فراعنۂ مصر کی تیس[۳۰] نسلیں گذری ہیں ۔ اور مجموعی طور پر ان نسلوں کا سلسلہ (۲۸۵۸) دو ہزار آٹھ سو اٹھاون سال تک باقی رہا اور آخر میں تین سو بیس سال قبل مسیح ان خاندانوں کا خاتمہ ہو گیا تھا ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو فرعون تھا اس کا نام ولید بن مُصْعَب تھا جو اُس فرعون کا پوتا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں تھا اور اس کا نام ریان تھا ۔ حضرت یوسفؑ کے داخلۂ مصر اور حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کا درمیانی وقفہ چارسو[۴۰۰] سال ہے ۔ مصر کے اصلی باشندے قبطی کہلاتے تھے اور ان کی زبان جو حامی زبان سے نکلی تھی اصلی قبطی زبان کہلاتی تھی ۔ پھر سکندر کے حملہ کے بعد یہ زبان رفتہ رفتہ محو ہو گئی اور اس کی جگہ یونانی زبان نے لے لی ۔ فراعنۂ مصر ان ہی قبطیوں کے بادشاہ تھے ۔

مومن آل فرعون سے مراد حضرت حزقیلؑ ہیں جو فرعون کے ماموں زاد یا چچا زاد بھائی تھے اور اسی قبطی قوم سے تعلق رکھتے تھے انھوں نے حضرت موسیٰؑ کے ساتھ نجات پائی تھی ۔ آل

فرعون میں ایک تو یہ ایماندار شخص تھے۔ ان کے علاوہ زوجۂ فرعون بھی ایمان لا چکی تھی اور تیسرا وہ شخص تھا جس نے حضرت موسیٰؑ کو یہ خبر دی تھی کہ آپ کے قتل کی ترکیبیں کی تھیں۔ یہ تین اشخاص تھے جو قبطیوں میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکے تھے مگر جان و مال کے خوف سے اپنے ساتھیوں کو چھپائے رہا کرتے تھے۔

لیکن یہ خبر سُنکر کہ اب موسیٰؑ قتل کئے جائیں گے ان سے ضبط نہ ہو سکا اور فرعون کے جاہ وجلال کی پروا کئے بغیر حزقیل نے فرعون کی مخالفت کا آغاز کر دیا اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک بے یار و مددگار انسان جس کے سامنے موت کا اژدھا مُنھ کھولے کھڑا ہو اور جسے اس کا یقین کامل ہو کہ فرعون کے ادنیٰ اشارے میں وہ ہمیشہ کے لئے زندگی سے محروم کر دیا جائے گا اور جو جانتا ہو کہ حق گوئی کے جرم کی پاداش میں موت اور بربادی کے سوا کچھ نہ ملے گا جس کے کانوں میں تلواروں کی جھنکار گونج رہی ہو اور جس کی نگاہیں تختہ دار کو اپنے سامنے دیکھ رہی ہوں مگر اللہ رے جرأت و ہمّت اور جذبۂ حق پرستی اپنی قوم کے خلاف، اپنے رشتہ داروں کے خلاف اور اپنے قہار و جبار شہنشاہ کے خلاف اُس کے بھرے ہوئے دربار میں مومن آلِ فرعون نے جرأت مندی، ایمانی طاقت اور حق پرستی کی ایک لازوال مثال قائم کر دی جو رہتی دُنیا تک باقی رہے گی اور اپنے روشن کردار سے دُنیا کو یہ بتا دیا کہ جب تک جان و مال کی حفاظت کا سوال ہو تو باطل سے ایمان کو چھپانا ممکن ہے مگر جب حق و دیانت پر آنچ آ رہی ہو تو پھر سچا مومن اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر تلوار کی باڑھ کے نیچے اور سولی کے تختہ پر بھی حق کو ظاہر کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا جب تک عقیدے کو ظاہر کرنے میں صرف فرد کی زندگی کو خطرہ ہو تو اس کا ظاہر کر دینا جائز نہیں ہے مگر جب پورے معاشرہ کی حیات برباد ہو رہی ہو۔ جب ناموسِ حق کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو۔ جب دین اور دیانت کی عزت و حرمت پر حملہ ہو رہا ہو تو پھر انفرادی زندگی کے تحفظ و بقا کا سوال درمیان سے اٹھا دیا جاتا ہے اور افراد کو اپنے خون کا آخری قطرہ بھی پیش کرنے کے لئے سر سے کفن باندھ کر قوم و ملت اور معاشرہ کی عزت کی حفاظت کیلئے میدان میں اترنا ضروری ہو جاتا ہے۔

حضرت موسیٰؑ عہد قدیم کے ان عظیم مصلحین عالم میں سے تھے جن کارناموں کا تذکرہ ہر مقدس کتاب میں موجود ہے بلا شبہہ اگر کسی قوم کے مصلح اور اس کی بزرگ ترین شخصیت کے جسم اقدس کے ایک بال کی نہیں بلکہ اس کی پاک چادر کے ایک تار کی بے عزتی کی جائے تو اس کے تحفظ کے لئے بھی اس کی پوری قوم کی زندگی اور موت کا سوال پیدا ہو سکتا ہے۔

قرآنِ کریم میں بھی واقعات حضرت موسیٰؑ کو بڑی تفصیل و تشریح کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں تو تقریباً نصف پارہ تک حضرت موسیٰؑ واقعات کو بیان کیا گیا ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰؑ کے واقعات اس اُمت کے واقعات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اس وجہ سے قرآن کریم میں ان واقعات کو بار بار ذکر فرمایا گیا ہے اور ضمناً مومن آل فرعون کی زبانی اس حقیقت کا اعلان کیا گیا ہے کہ اگر کوئی غلط اقدام کیا جائے اور کوئی جھوٹا کام شروع کیا جائے تو اس کے نتیجہ میں ہمیشہ تباہی ونا کامی ہوا کرتی ہے اور کبھی اس کا انجام بخیر نہیں ہوتا اس لئے اگر موسیٰؑ بھی سچے نہ ہوتے تو کبھی ان کو اور ان کے ساتھیوں کو وہ کامیابی حاصل نہ ہو سکتی جو انہیں فرعون اور اس کی عظیم سلطنت کے مقابلہ میں ہوئی۔ کیونکہ خدا اس شخص کو مقصود تک نہیں پہونچاتا جو گمراہ ہو' ان اللہ لا یھدی من ھو مُسرِفٌ کَذَّابٌ۔ مومن آل فرعون نے دو باتیں کہی تھیں ایک تو یہ کہ اگر یہ شخص جھوٹا ہے تو خود ہی ناکام ہوگا اور یہ جھوٹ آگے چل نہیں سکتا۔ لہٰذا موسیٰؑ کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی ختم ہو جائیں گے اور اگر وہ سچے ہیں اور تم جھوٹے ہو تو تم کو کامیابی نہ ہوگی اور موسیٰؑ کو نہ قتل کر سکو گے اور ان کا مقابلہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکو گے اس لئے دونوں طرح موسیٰؑ کو قتل کرنا تمہارے لئے درست نہیں ہے۔ حزقیل کو حضرت موسیٰؑ کی سچائی کا پورا الیقین تھا مگر محض دوسروں کے سامنے اس طرح سے استدلال کیا جس کے بعد جواب کے لئے ان کو کوئی راستہ نہ مل سکے اور وہ یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ انہوں نے اس میں کوئی خاص جنبہ داری کا لحاظ کیا ہے۔

اب ہم ایک مرتبہ پھر ان آیات پر نظر کریں تاکہ ان کا مطلب پوری طرح ذہن نشین ہو جائے۔
وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ آلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ إِيمَانَهُ۔ اور فرعون کے خاندان کے ایک ایماندار شخص نے کہا جو اپنے ایمان کو چھپائے رکھتا تھا۔ أَتَقْتُلُونَ رَجُلًا أَنْ يَقُولَ رَبِّيَ اللَّهُ وَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْبَيِّنَاتِ مِنْ رَبِّكُمْ۔ کیا تم ایسے شخص کو قتل کرتے ہو جو فقط یہ کہتا ہے کہ میرا پروردگار اللہ ہے حالانکہ وہ

تمہارے رب کی طرف سے معجزے اور دلیلیں بھی لایا ہے وَ اِنْ یَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ وَ اِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِیْ يَعِدُكُمْ اور اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال خود اسی کو بھگتنا پڑے گا اور اگر وہ سچا ہے تو یقیناً پھر جس عذاب کی وہ دھمکی دے رہا ہے اس میں سے کچھ نہ کچھ تو ضرور تم پر پڑے گا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِیْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ۔

خدا کسی حد سے گذرنے والے اور جھوٹے کو مقصود تک نہیں پہونچاتا اور اس کے لئے مہلت صرف چند روز کی اس کے امتحان کے لئے ملا کرتی ہے۔ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا۔ اے میری قوم آج تمہاری سلطنت و حکومت ہے اور زمین پر تمہارا بول بالا ہے مگر کل کیا ہوگا جب خدا کا عذاب ہم پر نازل ہوگا، اس وقت کون ہماری مدد کرے گا۔ قَالَ فِرْعَوْنُ مَاۤ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَاۤ اَرٰى وَ مَاۤ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ۔

فرعون کو جب کوئی جواب نہ بن پڑا تو کہنے لگا کہ میں تو تمہیں دھوکا نہیں دے رہا ہوں اور جو بات خود سمجھا ہوں وہی تم کو بھی سمجھانے کی کوشش کرتا ہوں۔

واقعاتِ حضرت موسیٰؑ کے ذکر سے ایک طرف تو اللہ کو اپنے آخری رسولؐ کی تسکین مطلوب بھی اور ساتھ ہی اس حقیقت کو بھی آشکار کرنا تھا کہ اگر محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز میں سچائی اور حقیقت نہ ہوتی اور وہ خدا کے سچے رسولؐ نہ ہوتے تو کبھی اُن کو اللہ یہ کامیابی عطا نہ فرماتا بلکہ چند ہی دن کے بعد ان کی تحریک کا خاتمہ ہو جاتا اور جب فراعنۂ مصر کی عظیم سلطنتیں باقی نہ رہ سکیں اور اُن کے جاہ وجلال لاتعداد لشکروں اور زرد جواہر کے خزانوں کا نام ونشان نہ رہ سکا پھر مدینہ اور مکہ کے چند بھوکے غریب اور نادار مسلمانوں کا نام تو کب کا تاریخ کے اوراق سے مٹ چکا ہوتا جن کے پاس نہ حکومت تھی نہ دولت تھی نہ طبل وعلم تھا اور نہ جاہ وحشم مگر یہ رسولِ اسلام کی سچائی کی لازوال طاقت تھی جس نے اُن بے یار و مددگار مسلمانوں کو تاریخ عالم کے لئے سرمایۂ افتخار بنا دیا اور جن کی زندگی اور ان کا کردار ساری نسلِ آدم کے لئے قیامت تک کے لئے نمونۂ عمل بن گیا۔

وَ قَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ ۝ مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ وَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ ؕ وَ مَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ۝ وَ یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِ ۝ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ ۚ مَا لَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ ۚ وَ مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۝ وَ لَقَدْ جَآءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰٓی اِذَا هَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۝ ۣالَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ ؕ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَ عِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝

(پارہ ۲۴ سورۃ المؤمن رکوع ۹)

ترجمہ :- اور جو شخص (در پردہ) ایمان لا چکا تھا کہنے لگا۔ بھائیو مجھے تو تمہاری نسبت بھی اور امتوں کی طرح بُرے دن کا اندیشہ اور خوف ہے (کہیں تمہارا بھی وہی حال نہ ہو جائے) جیسا نوح کی قوم (کا)، عاد و ثمود اور اُن کے بعد والوں کا ہوا تھا اور خدا تو اپنے بندوں پر کسی طرح کا ظلم کرنا نہیں چاہتا۔ اور اے میری قوم مجھے تمہاری نسبت اس دن کا اندیشہ ہے جس میں کثرت سے ندائیں ہوں گی یعنی قیامت کا دن کا۔ جس روز تم پیٹھ پھیر کر بھاگو گے۔ تم کو خدا سے کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور جس کو خدا گمراہی میں چھوڑ دے تو اس کا کوئی ہدایت کرنے والا نہیں اور اس سے پہلے یوسف بھی تمہارے پاس معجزے لیکر آئے تھے۔ تو جو چیزیں وہ لائے تھے اُن میں تم برابر شک ہی کرتے رہے یہاں تک کہ جب اُن کی وفات ہو گئی۔ تو تم کہنے لگے کہ بس اب خدا کسی رسول کو نہ بھیجے گا۔ خدا اُن لوگوں کو یوں ہی گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے جو حد سے گذرنے والے اور شک کرنے والے ہوں۔ جو بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو خدا کی آیتوں میں (خواہ مخواہ) جھگڑے کیا کرتے ہیں تو یہ خدا اور ایمان والوں کے نزدیک بڑی نفرت اور بیزاری کی چیز ہے۔ اللہ اسی طرح ہر ایک مغرور سرکش کے دل پر مہر کر دیتا ہے۔

ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

حزب - دیگر معانی کے علاوہ زیادہ تر انسانوں کے فرقہ اور گروہ کے لئے بولا جاتا ہے

تاریخ بتاتی ہے کہ ہر زمانہ میں انسان کی عمر طبیعی بدلتی رہی ہے۔ ظاہر میں تو ہمیں یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ انسان کی عمر اسقدر طولانی ہو لیکن حقیقت میں خدا کی قدرتِ کاملہ کے سامنے یہ کوئی حیرت و تعجب کی بات نہیں ہے۔ اُسی نے انسان کو بنایا ہے اور اُس کے لئے عمر طبیعی کا تقرر کیا ہے۔ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ جس انسان کی عمر چاہے بڑھا دے اور چاہے گھٹا دے۔ اس میں ہم کو حیرت کرنے کا حق حاصل نہیں۔ خود حضرت آدمؑ کی عمر ایکہزار سال ہوئی۔ لقمان بن عاد کی عمر ساڑھے تین ہزار سال کی تھی۔ حضرت عیسیٰ بن مریم اور خضر والیاس علیہم السلام کی حیات ابتک باقی ہے۔ اصحاب کہف کی زندگی ابتک ثابت ہے۔ شہدا راہ خدا کی حیاتِ طیبہ کا قرآن کریم نے اس طرح اعلان فرمادیا۔ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ (آل عمران) جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیئے گئے ہیں اُن کو ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ جیتے جاگتے موجود ہیں اور اپنے پروردگار کے پاس روزی حاصل کرتے ہیں۔

دُنیا میں لمبی عمر پانے والوں کی فہرست بہت بڑی ہے جنہوں نے سیکڑوں اور ہزاروں برس کی عمریں پائی تھیں۔ اس لئے عمر کا طویل ہونا کوئی بھی حیرت کی بات نہیں۔ اللہ کی قدرت سے کوئی چیز دور نہیں۔ وہ جس کو باقی رکھنا چاہے اس کو لیل و نہار کی گردش اور زمانہ کی کروٹیں فنا نہیں کر سکتیں۔ ہر مذہب کی تاریخی کتابوں میں طویل عمر کے لوگوں کا تذکرہ موجود ہے۔
حضرت نوحؑ کو آدم ثانی کہا جاتا ہے اس لئے کہ اُن کے عہد میں جو طوفان آیا تھا اُس میں دنیا تمام آبادی فنا ہوگئی تھی۔ طوفان کے بعد انسانی آبادی کا سلسلہ نوحؑ کے بیٹوں سام، حام اور یافث سے قائم ہوا اور اس وقت کے سارے انسان ان ہی کی اولاد ہیں۔ حام اور یافث کے پاس کوئی خاص علم موجود نہ تھا البتہ سام حضرت نوحؑ کے جانشین قرار پائے۔ جب نوحؑ کی وفات کا وقت قریب آپہونچا تو اُس وقت وہ دھوپ میں کھڑے تھے۔ ملک الموت نے آکر کہا کہ میں آپ کی روح قبض کرنے آیا ہوں اب آپ تیار ہوجائیے۔ تو حضرت نوحؑ نے فرمایا تم مجھکو اِتنی مہلت دے دو کہ میں دھوپ سے سایہ میں چلا جاؤں، ملک نے کہا بہت اچھا۔ نوحؑ سایہ میں چلے گئے اور فرمایا۔ اے ملکِ مقرب میں نے اتنی طولانی عمر پائی مگر اب وہ مجھکو اتنی چھوٹی معلوم ہو رہی ہے جیسے میں اس وقت دھوپ سے سایہ میں آگیا ہوں۔ اچھا اب تم میری روح کو قبض کرلو۔

حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ میں تم کو عذاب الٰہی سے ڈرانے آیا ہوں۔ اگر تم غیر اللہ کی عبادت نہ چھوڑو گے تو عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ بُت پرستی چھوڑ دو اور صرف ایک خدا کی پرستش کرو۔

لوگوں نے جواب دیا کہ آپ تو ہماری طرح کے ایک انسان ہیں اور ایک غریب و مُفلس آدمی ہیں پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رؤساء اور امراء کو چھوڑ کر وحی آپ کے پاس آئے اور ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ .....

آپ کے پاس ایسے لوگ آتے ہیں جن کی کوئی بھی قیمت نہیں۔ کوئی بڑا آدمی آپ کے ساتھ نظر نہیں آتا صرف غریب و مفلس اور ادنیٰ درجہ کے لوگ آپ کے معتقد ہیں پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اس نئے دین سے آپ نے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہونچایا۔ لوگ جس طرح پہلے فقیر و غریب تھے اُسی طرح اب بھی ہیں اس دین کے ماننے کے بعد کسی کو بھی خوشحالی نصیب نہ ہو سکی، نہ تو روزیاں بڑھیں اور نہ کوئی برتری حاصل ہوئی اس لئے ہمارے نزدیک یہ سب جھوٹی باتیں ہیں۔

اُن کا کہنا یہ تھا کہ جبتک بڑے لوگ کسی نبی کی تصدیق نہ کریں چھوٹی حیثیت کے لوگوں کی تصدیق کرنا بیکار ہوتا ہے لیکن قوم نوحؑ کو یہ حقیقت معلوم نہ تھی کہ حق کی پیروی اور تصدیق کرنے والے ہی در اصل امیر اور بڑے اور ذی عزت لوگ ہوتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی مُفلس و نادار رہوں ان کا شرف صرف اس بات سے ہے کہ وہ حق کی تصدیق کریں انسان کی عزت و شرافت اُس کے عمل سے ہے۔ ظاہری شان و شوکت اور منصب و دولت سے نہیں ہے۔

حضرت نوح خود بھی مُفلس اور غریب تھے اور آپ کے ساتھی بھی نادار تھے مگر حق اُن ہی کے ساتھ تھا۔ حضرت سرورِ کائنات۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی یہی کہا گیا تھا: وَقَالُوا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ۔ (زخرف) ترجمہ: یہ قرآن مکّہ اور طائف میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نازل نہ کیا گیا۔ ایک غریب و مفلس اور یتیم انسان پر کیوں اُتارا گیا۔ اور پھر قومِ نوحؑ کی طرح یہ بھی چاہتے تھے کہ سرکارِ دو عالم اپنی بزم سے غریبوں اور مسکینوں کو نکال دیں اور صرف دولتمندوں کیساتھ بیٹھا اُٹھا کریں حالانکہ دینِ سب کے لئے برابر ہے۔ خواہ وہ رئیس ہو یا غریب اور عزت خدا کی بارگاہ میں صرف اُسی شخص کی ہے جس کا عمل

اچھا ہو اور جو اپنے اللہ سے زیادہ ڈرنے والا ہو۔ خدا کی بارگاہ میں سب برابر ہیں۔ اس کی بارگاہ میں امیر و غریب، حاکم و محکوم۔ بڑے اور چھوٹے ملک اور قوم کسی چیز کا امتیاز نہیں ہے۔ لیس لعربی علی عجمی فضل الا بالتقوی۔ کسی کو کسی پر شرف اور فضیلت اگر ہے تو صرف تقوی اور پرہیزگاری کی وجہ سے۔ جس کا عمل اچھا ہوگا وہ بڑا ہے۔ اور جس کا عمل برا ...... ہے وہ چھوٹا ہے۔

آپ کے اصحاب اخیار رضی اللہ عنہم اور اہلبیت اطہار علیہم السلام میں کثرت ان ہی لوگوں کی ملتی ہے جو نادار تھے اور خود سردار دو عالم کے پاس بھی مال دنیا نہ تھا، مگر ہاں سیرت و کردار اور انوار الہٰیہ کی وہ دولت موجود تھی جس کے سامنے زر و جواہر کے خزانے کوئی حقیقت نہیں رکھتے جس کے مقابلہ قیصر و کسریٰ اور فراعنہ مصر کی سلطنتیں حرف غلط سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

حضرت نوح نے نو سو سال سے زیادہ تبلیغ کی کوشش کی مگر چند گنے چنے آدمیوں کے سوا کوئی ایمان نہ لایا۔ لوگ اُن کا مذاق اُڑاتے تھے۔ ڈھیلے مارتے تھے۔ اور انہیں دیوانہ کہتے تھے۔ آخر حضرت نوح نے بددعا فرمائی اور طوفان آیا اور تکذیب کرنے والے غرق کر دئیے گئے۔

قرآن کریم میں ہے: وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمَ سَوْءٍ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۔ (انبیاء) جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا اُن کے مقابلہ میں ہم نے نوح کی امداد کی۔ بیشک یہ بھی برے لوگ تھے تو ہم نے اُن سب کو غرق کر دیا۔

زیر بحث آیات کریمہ میں دوسری قومیں جن کا ذکر کیا گیا ہے وہ عاد و ثمود ہیں۔ عاد، سام بن نوح کے فرزند عوص کا بیٹا تھا جس کی اولاد قوم عاد کہلاتی ہے اور اسی عاد کی نسل سے حضرت نوح کی آٹھویں پشت میں حضرت ہود نبی تھے جن کو خدا نے قوم عاد کی اصلاح و ہدایت کے لئے بھیجا تھا۔ حضرت ہود نے بہت کوشش کی کہ یہ قوم راہ راست پر آ جائے مگر کسی نے پیغمبر کے حکم کو نہ سنا اور اپنی گمراہی پر جمے رہے آخر ایک سیاہ بادل آسمان پر چھا گیا اور پھر ہوا کا ایک سخت طوفان آیا جس میں چنگاریاں تھیں۔ اور ساری قوم عاد ہلاک ہو گئی۔ ثمود بھی حضرت نوح کی اولاد میں تھا اور عامر بن سام کا بیٹا تھا اس کی اولاد قوم ثمود کہلاتی ہے اس کی ہدایت کے لئے حضرت صالح بھیجے گئے جو حضرت نوح کی نویں پشت میں تھے۔ جب نبوت کا عہدہ ملا تو سولہ ۱۶ سال کی عمر تھی۔ قوم کو سمجھاتے ہوئے کافی زمانہ گذر گیا اور آپ کا سن ایک سو بیس برس کا ہو گیا مگر اُن سرکشوں نے ایک نہ سُنی اور اپنی ضلالت و گمراہی پر اڑے رہے۔ آپ کے معجزات نبوت میں ناقہ کا ذکر آتا ہے۔ یہ اونٹنی مع بچہ کے ایک پتھر سے نکلی تھی۔ مگر ان کی قوم نے اس

اونٹنی کے پیر کاٹ ڈالے اور اُس کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ حضرت صالحؑ نے پھر بھی ان کو سمجھایا کہ وہ توبہ کرلیں مگر کسی نے بھی پروانہ کی اور نہ ماننا تھا نہ مانے۔ آخر ایک شدید چنگھاڑ پیدا ہوئی پھر زلزلہ آیا اور آسمان سے آگ برسی اور سب کے سب جل کر ہلاک ہو گئے۔

مومن آل فرعون۔ حزقیل نے ان ہی واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے اور اس طرح اپنی قوم کو اور فرعون کو سمجھانے کی کوشش کی تاکہ وہ موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب چھوڑ کر ایمان لے آئیں۔ قرآن مجید نے ان واقعات کو اس لئے دہرایا ہے تاکہ بعد میں آنے والی نسلیں بھی ان باتوں کو یاد رکھیں اور ان سے سبق لینے کی کوشش کریں اور اللہ کی طاقت اور اقتدار کو کسی وقت بھی نہ بھولیں۔

وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ۔ وہ شخص جو ایمان لا چکا تھا یعنی حزقیل اُس نے کہا۔ اے میری قوم مجھے تمہارے لئے بھی اور امتوں کی طرح بُرے دن کا خوف ہے۔ "مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ۔" جس طرح عاد و ثمود کی قوموں اور نوحؑ کی اُمت اور اُس کے بعد کی قوموں کا نتیجہ ہوا کہیں تمہارا بھی یہی حال نہ ہو۔ وَیٰقَوْمِ اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْکُمْ یَوْمَ التَّنَادِ۔" اے قوم مجھے تمہارے متعلق اس دن کا خوف ہے جس میں ایک دوسرے کو آواز دے جس میں ایک دوسرے سے فرار کرے گا یعنی قیامت کے دن کا۔ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ مَا لَکُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ عَاصِمٍ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ۔ تم کو اللہ کے مقابلہ میں کوئی بچانے والا نہ ہوگا اور جسے اللہ توفیق و ہدایت نہ دے اُس کا کوئی راہ دکھانے والا نہیں۔

(درس نمبر ۱۰)

وَلَقَدْ جَآءَکُمْ یُوْسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَیِّنٰتِ فَمَا زِلْتُمْ فِیْ شَکٍّ مِّمَّا جَآءَکُمْ بِهٖ ؕ حَتّٰۤی اِذَا هَلَکَ قُلْتُمْ لَنْ یَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا ؕ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ ۚ ۖ ۝ اَلَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ ؕ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ؕ کَذٰلِکَ یَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰی کُلِّ قَلْبِ مُتَکَبِّرٍ جَبَّارٍ ۝ وَقَالَ فِرْعَوْنُ یٰهَامٰنُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا لَّعَلِّیْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ لا اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ فَاَطَّلِعَ اِلٰۤی اِلٰهِ مُوْسٰی

وَاِنِّیْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا ؕ وَكَذٰلِكَ زُیِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَصُدَّ عَنِ السَّبِیْلِ ؕ وَمَا كَیْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِیْ تَبَابٍ ○

(پارہ ۲۴ - سورۃ المؤمن رکوع ۹)

ترجمہ - اور اس سے پیشتر یوسف بھی تمہارے پاس معجزے لیکر آئے تھے تو اُن باتوں میں بھی تم برابر شک ہی کرتے رہے جو انہوں نے تمہارے سامنے پیش کی تھیں یہاں تک کہ جب انھوں نے وفات پائی تو تم کہنے لگے کہ اب ان کے بعد خدا ہرگز کوئی رسول نہ بھیجے گا - جو حد سے گذر جانے والے اور شک وشبہہ میں گرفتار رہنے والے ہوں ان کو خدا یوں ہی گمراہی میں چھوڑ دیتا ہے جو بغیر اس بات کے کہ اُن کے پاس کوئی دلیل موجود ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑے کیا کرتے ہیں - اس سے اللہ کو بھی سخت نفرت ہے اور صاحبان ایمان کو بھی - اور اسی طرح خدا ہر مغرور سرکش کے دل پر مہر لگا دیتا ہے - اور فرعون نے کہا : اے ہامان میرے واسطے ایک محل بنوا دے شاید میں آسمانوں پر جانے کی راہوں تک پہونچ جاؤں پھر موسیٰ کے خدا کو دیکھ لوں اور میں تو موسیٰ کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں ، اور اسی طرح فرعون کے لئے اس کی بدکاری خوشنما کر دی گئی تھی اور وہ سیدھی راہ سے روک دیا گیا تھا - اور فرعون کی تدبیر تو غارت ہی گئی -

ترجمہ کے بعد بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے :-

مُرتَاب - ارتیاب سے بنایا گیا ہے جس کا مادّہ ریب ہے - ریب شک کو کہتے ہیں اور مُرتَاب شک کرنے والا - سلطان کے مشہور معنی بادشاہ کے ہیں لیکن قدرت اور دلیل کو بھی کہتے ہیں - یہاں دلیل مُراد ہے - مَقتُ کے معنی سخت نفرت و دشمنی کے ہیں - یطبعُ کا مصدر طبع ہے جب یہ عَلیٰ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی مہر لگانے کے ہوتے ہیں مگر جب یہ اسم کے طور پر بولا جائے تو اس کے معنی ہونگے ٹھپّا ، نقش ، مہر - فطرت و مزاج - صَرحُ - قصر یا بلند عمارت کو کہتے ہیں اس کی جمع صُروح ہے - اسباب - سبَب کی جمع ہے جس کے معنی ہیں :- رسّی ، ذریعہ ، راستہ ، رشتۂ قرابت اور وجہ یا علّت - یہاں پر الاسباب سے مراد راستے ہیں -

اَطّلِعُ متکلم کا صیغہ ہے اور اِطّلاع سے بنایا گیا ہے جس کے اصلی معنی ہیں

بلندی سے کسی چیز کے سامنے آنا لیکن عام طور پر اسے معرفت و علم کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں موسیٰؑ کے خدا کے سامنے پہونچکر اُس کو دیکھ لوں۔ صَدَّ کے معنی روکنے اور منع کرنے کے آتے ہیں۔ تباب۔ کھوٹ، نقصان، ہلاکت اور بربادی کو کہتے ہیں۔ یَبعَثُ۔ بَعثُ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ہیں بھیجنا یا عہدۂ نبوت عطا کرنا مبعوث وہ ہے جس کو یہ عہدہ دیا گیا ہو۔ مبعث مصدر میمی بھی ہے اور اسم زمان بھی۔

بَعث کے دوسرے معنی ہیں نیند سے اُٹھانا یا مرنے کے بعد دوبارہ زندگی دینا اسی آخری معنی کے لحاظ سے یوُم البعث قیامت کے دن کے لئے بولا جاتا ہے یعنی وہ دن جب مردے زندہ کئے جائیں گے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے تقریباً پانچ ہزار سال بعد کا ہے اور آپ حضرت نوحؑ کی تیرھویں پشت میں تھے۔ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے زمانوں میں دو ہزار دو سو چالیس (۲۲۴۰) سال کا وقفہ ہے جبکہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت موسیٰؑ میں سات سو (۷۰۰) برس کا فاصلہ تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ و حضرت یوسفؑ میں صرف تین سنوؑ سال کا وقفہ تھا۔ حضرت یوسفؑ۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ کے پوتے اور حضرت یعقوبؑ کے فرزند تھے۔ یعقوب علیہ السلام کا دوسرا نام اسرائیل تھا۔ ان کے بارہ بیٹے تھے جن کو "اسباطِ اسرائیل" کہا جاتا ہے۔

ان میں سے یہودا بن یعقوبؑ کی اولاد یہود کہلاتی ہے۔ ان لڑکوں سے حضرت یعقوبؑ کی اولاد مجموعی طور پر بنی اسرائیل کہی جاتی ہے۔ اس کو عبرانی قوم بھی کہتے ہیں اور اسی نام سے ان کی زبان بھی مشہور ہے۔ یہ نام ان کو اس لئے ملا کہ حضرت یعقوبؑ کے ایک دادا کا نام "عابر" تھا یا اس وجہ سے کہ اس قوم نے ہجرت کے وقت سمندر کو عبور یعنی پار کیا تھا۔ حضرت یوسفؑ نے (۱۲۰) سال کی عمر پائی۔ آپ کی وفات کے بعد لوگوں نے آپ کے جسم کو سنگ مرمر کے ایک محفوظ صندوق میں رکھکر دریائے نیل میں مصر کے پُرانے دار السلطنۃ "مَنفَ" کے قریب ڈالدیا تھا۔ یہ مقام "نیل" کے بائیں کنارے پر موجود قاہرہ کے نزدیک واقع تھا۔ مگر حضرت موسیٰؑ نے اپنے عہد میں صندوق کو نیل سے نکال کر بیت المقدس کے قریب لیجاکر دفن کر دیا جہاں حضرت ابراہیم و اسحٰق و یعقوب علیہم السلام کی قبریں تھیں۔

حضرت موسیٰؑ کی قوم بھی بنی اسرائیل تھی۔ آپ حضرت یعقوبؑ کی پانچویں پشت میں تھے اور حضرت یوسفؑ کے بھائی لاوی کی اولاد میں تھے۔

حضرت یوسفؑ کا حسن وجمال مشہور عالم ہے۔ آپ نے نو برس کی عمر میں خواب دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے اور چاند سورج سب اُن کے سامنے سجدہ کر رہے ہیں اس خواب کو سنکر بھائیوں کو حسد پیدا ہوا اور حضرت یوسفؑ کو ایک گہرے کنویں میں ڈال دیا۔ .... جہاں سے ایک قافلے کے لوگوں نے آپ کو نکالا اور مصر میں لیجا کر عزیز مصر کے ہاتھ بڑی بھاری قیمت پر فروخت کر دیا۔ عزیز مصر دراصل بادشاہ کا وزیر تھا اور مصر کے خزانوں پر حاکم تھا۔ اس کا نام قطفیر تھا۔ اس کی بیوی کا نام راعیل اور لقب زلیخا تھا۔ مملکت مصر کے بادشاہ کا نام جو فرعون کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ "ریان بن الولید" تھا۔

۱۳ برس عزیز مصر کے ساتھ رہنے کے بعد زلیخا کی سازش سے حضرت یوسفؑ قید میں ڈالے گئے اور سات سال تک قید خانہ میں رہے آخر شہنشاہ کے ایک خواب کی تعبیر بتانے کے انعام میں رہائی پائی۔ پھر اور عزت بڑھی تو پہلے عزیز مصر بنائے گئے اور بعد میں شہنشاہ کی جگہ پر مملکت کا تخت وتاج حاصل کیا۔ وہ ان کے حق میں حکومت سے دست بردار ہو گیا تھا اور آپ پر آخری عمر میں ایمان لے آیا اور پھر آپ کی حیات ہی میں مر گیا۔ سورۂ یوسفؑ میں بنی اسرائیل کے مصر میں آنے کا واقعہ تفصیل سے موجود ہے۔ یہ کل ۷۲ مرد و زن تھے جو حضرت یعقوبؑ کیساتھ مصر میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ اور جب چار سو سال کے بعد حضرت موسیٰؑ کا دور آیا اور یہ لوگ اس وقت کے فرعون کے ظلم وجور کی وجہ سے مصر سے ہجرت کر گئے تو ان کی تعداد چھ لاکھ سے زیادہ تھی۔

حضرت حزقیل نے طرح طرح سے اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ حضرت موسیٰؑ پر ظلم نہ کریں۔ اور اسی لئے انھوں نے حضرت یوسفؑ کا بھی ذکر کر دیا اور کہا کہ وہ تمہارے ہی باپ دادا تھے جو ان پر کبھی دل سے ایمان نہ لائے اور اُن کو صرف ایک دنیاوی بادشاہ ہی سمجھتے رہے مگر اُن کی وفات کے بعد اُن کی قدر ہوئی اور جب سارا ملک تباہ ہو گیا تو سمجھے کہ وہ خدا کے سچے پیغمبر تھے کہیں تمہیں بھی اُن کی طرح پچھتانا نہ پڑے۔ اس لئے بے عقلی نہ کرو اور نتیجہ کو سوچ لو۔ حزقیل کی گفتگو ختم ہوئی اب فرعون کے تکبّر کا تذکرہ ہے۔

قَالَ يٰهَامٰنُ ابْنِ لِيْ صَرْحًا لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ۔ فرعون نے اپنے وزیر ہامان سے کہا کہ میرے لئے ایک اونچا محل بنا دے تاکہ میں موسیٰؑ کے خدا تک پہونچ سکوں۔ ہامان نے محل

ہوایا۔ پچاس ہزار مزدوروں نے اس کی تعمیر میں کام کیا اور اتنا بلند محل بنایا کہ اس سے پہلے اس قدر اونچی کوئی عمارت نہ بنی تھی۔ فرعون اُس کی چھت پر گیا اور پہلے تو یہ سمجھا کہ اب آسمان سے قریب ہو جائے گا مگر جب اُس نے دیکھا تو آسمان اُتنا ہی دُور تھا جتنا زمین سے۔ تو بہت شرمندہ ہوا اور ایک تیر آسمان کی طرف پھینکا اور جب وہ تیر کسی جانور کے لگ کر خون آلودہ ہو کر زمین پر گرا تو خوش ہو کر بولا کہ اب میں نے موسیٰ کے خدا کو (معاذ اللہ) ہلاک کر دیا ہے۔ لیکن فرعون کی حیرت کی حد نہ رہی اور خوشی خاک میں مل گئی جب تھوڑی ہی دیر میں وہ آسمان سے باتیں کرنے والا محل تین ٹکڑے ہو کر زمین پر آ رہا اور سینکڑوں آدمی اس میں دب کر ہلاک ہو گئے اور فرعون نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ خدا کی طاقت کے سامنے کسی کی نہیں چلتی اور غرور و تکبر کا نتیجہ آخر میں بربادی و ناکامی اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

(درس ۱۰۹)

وَقَالَ الَّذِیْۤ اٰمَنَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِیْلَ الرَّشَادِ ۝ یٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا مَتَاعٌ٘ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِیَ دَارُ الْقَرَارِ ۝ مَنْ عَمِلَ سَیِّئَةً فَلَا یُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا٘ وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓىٕكَ یَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ یُرْزَقُوْنَ فِیْهَا بِغَیْرِ حِسَابٍ ۝ وَ یٰقَوْمِ مَا لِیْۤ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ وَ تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَى النَّارِ ؕ تَدْعُوْنَنِیْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَ اُشْرِكَ بِهٖ مَا لَیْسَ لِیْ بِهٖ عِلْمٌ٘ وَّ اَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِیْزِ الْغَفَّارِ ۝ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِیْۤ اِلَیْهِ لَیْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِی الدُّنْیَا وَ لَا فِی الْاٰخِرَةِ وَ اَنَّ مَرَدَّنَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَ اَنَّ الْمُسْرِفِیْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ٘ وَ اُفَوِّضُ اَمْرِیْۤ اِلَى اللّٰهِ٘ اِنَّ اللّٰهَ بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

(پارہ ۲۴ سورۃ المؤمن رکوع ۱۰)

ترجمہ: اور وہ شخص جو ایمان لا چکا تھا کہنے لگا۔ اے میری قوم میرا کہنا مانو۔ میں تم کو ہدایت کے راستے دکھاؤں گا۔ اے میری قوم۔ یہ دُنیا کی زندگی تو بس چند روز کا فائدہ ہے اور آخرت ہی ہمیشہ رہنے کا گھر ہے۔ جو بُرا کام کرے گا اُسے بدلہ بھی ویسا ہی ملے گا اور جو نیک کام کرے گا

مرد ہو یا عورت۔ مگر ایماندار ہو تو ایسے لوگ بہشت میں داخل ہوں گے وہاں انہیں بے حساب روزی ملے گی۔ اور اے میری قوم یہ کیا بات ہے کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف بلاتا ہوں اور تم مجھے دوزخ کی طرف بلاتے ہو کہ میں خدا سے کفر کروں اور اس چیز کو اس کا شریک بناؤں جس کا مجھے علم بھی نہیں اور میں تمہیں غالب اور بڑے بخشنے والے خدا کی طرف بلاتا ہوں، بیشک تم جس چیز کی طرف مجھے بلاتے ہو وہ نہ تو دنیا ہی میں پکارے جانے کے قابل ہے اور نہ آخرت میں اور آخر میں ہم سبکو خدا ہی کی لوٹ کر جانا ہے اور اس میں شک ہی نہیں کہ حد سے بڑھ جانے والے سب جہنمی ہیں۔ آگے چل کر تم میری بات کو یاد کرو گے اور میں اپنا معاملہ خدا ہی کو سونپے دیتا ہوں۔ اس میں شبہہ نہیں کہ خدا بندوں کے حال کو دیکھتا ہے۔

ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے :-

رَشَاد۔ مصدر ہے۔ رُشد، رَشاد اور رَشَد کے ایک ہی معنی ہیں یعنی ہدایت پر ہونا اور انہیں خود ہدایت کے معنی میں بھی بولا جاتا ہے۔ اسی سے ارشاد بنا ہے جس کے معنی ہیں ہدایت کرنا اور سیدھی راہ دکھانا۔ رشید اور راشد اس کو کہتے ہیں جو خود ہدایت پر ہو اور دوسروں کو ہدایت کرے۔ رشید خدا کے اسماء مبارکہ میں سے ایک اسم ہے۔ مُرشد بھی ہدایت کرنے والے کو کہتے ہیں۔ مَتَاعٌ۔ دنیاوی زندگی کے ساز و سامان میں سے ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس سے انسان کو فائدہ حاصل ہوتا ہو۔ کفر کے معنی چھپانے اور انکار کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح شرع میں کفر اسلام کے مقابلہ میں بولا جاتا ہے۔ خدا کی ہستی کا یا جن باتوں پر اعتقاد رکھنا مسلمان ہونے اور رہنے کے لئے ضروری ہے ان میں سے کسی کا بھی انکار کر دینا کفر ہے کفر ناشکری کو بھی کہتے ہیں اسی سے کُفران بنا ہے۔ ماہ رمضان کے دوران اور دیگر اعمال و احکام کے سلسلہ میں "کفّارہ" کا لفظ اکثر بولا جاتا ہے۔ یہ گناہ کے اس بدلہ کو کہتے ہیں جو شریعت نے اس گناہ کے اثر کو دور کرنے اور چھپانے کے لئے بتایا ہو۔ لاجَرَمَ اور لاجُرْمَ۔ اصطلاح ہے اور دونوں طرح بولتے ہیں، ان دونوں لفظوں کے اصلی معنی تو گناہ اور خطا کے ہیں لیکن جب ان کے ساتھ لا کا لفظ بولا جاتا ہے تو ان کے معنی "ضرور اور بیشک" کے ہو جاتے ہیں۔ رَدٌّ اور مَرَدٌّ۔ رَدَّ یَرُدُّ سے مصدر آتے ہیں جنکے معنی ہیں پھیر دینا اور پلٹا دینا۔

اَنَّ مَرَدَّنَا اِلَى اللّٰهِ، سے مراد یہ ہے کہ ہماری بازگشت اور ہمارا لوٹنا خدا ہی کی طرف

ہوگا۔ اُفَوِّضُ۔ فَوْض سے بنا ہے۔ تفویض اس کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں سپرد کرنا اور سونپ دینا۔ اُدْعُوْ متکلم کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر دُعَاءٌ ہے جس کے معنی ہیں پکارنا اور مدد کے لئے بلانا۔ دَعوۃٌ بھی اسی معنی میں اس کا مصدر ہے۔

دُعار کے مشہور معنی خدا سے مناجات کرنے کے ہیں۔ لیکن اس لفظ کے ساتھ اگر "لام" کا استعمال کیا جاتا ہے جیسے دَعَالَہ تو اس کے معنی دعائے خیر کے ہوا کرتے ہیں اور اگر اس کے بعد عَلیٰ ہوتا ہے۔ جیسے دَعَا علیہ تو پھر اس سے مُراد بد دعا ہوتی ہے۔

سَیِّئَۃٌ۔ گناہ، غلطی اور برے عمل کو کہتے ہیں۔ اَدْنیٰ تفضیل کا صیغہ ہے یہ دُنُوٌ سے بھی بنا ہے اور دَنَاءَۃٌ سے بھی۔ پہلے کے معنی نزدیکی اور قربت کے ہیں اور دوسرے کے معنی ذلت، پستی اور کم رتبہ ہونے کے اس لئے اَدْنیٰ اس کو کہیں گے جو زیادہ نزدیک یا زیادہ بے حیثیت اور پست مرتبہ ہو۔ دُنیا ان ہی معنوں میں اَدْنیٰ کا مونث ہے۔ اس جہان کو جس میں ہم زندگی گذار رہے ہیں۔ دُنیا اس وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ آخرت کے مقابلہ میں بہت پست اور حقیر ہے یا اس لئے کہ یہ ہم سے بہ نسبت آخرت کے بہت نزدیک ہے۔

شرک کے اصلی معنی ساجھے اور شرکت کے ہیں لیکن شریک کی طرح خود شرک ساجھے دار اور حصّہ دار کو بھی کہتے ہیں۔ اُشْرِکُ اسی سے بنا ہے۔ اس کا مصدر اشراک ہے یعنی کسی کو شریک بنانا۔ شرک کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے ساتھ اُس کے غیر کو شریک کرنا اس لئے مُشرک وہ ہے جو یہ عقیدہ رکھتا ہو اور موحّدوہ ہے جو خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائے۔ شرک کی یہ قسم شرکِ جلی" کہلاتی ہے یعنی واضح اور کھلا ہوا شرک' یہ کفر ہے اور دوسرے لفظوں میں خدا کی عظمت و اقتدار سے انکار۔

خدا کی ذات کی طرح اُس کے صفات میں دوسروں کو شریک سمجھنا اور اُنہیں اُس کے غیر کی طرف نسبت دینا شرک ہے۔ جیسے علم غیب کہ وہ خدا کی مخصوص صفت ہے اور کوئی دوسرا اُسے نہیں جانتا جب تک وہ اس کی تعلیم نہ دے۔

قرآنِ کریم کا ارشاد ہے:

قُلْ لَا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰہُ۔ (النمل ۲۷/۶۵)

اے رسُول کہدو کہ آسمانوں اور زمین کے رہنے والوں میں کوئی بھی سوائے اللہ کے

غیب کا علم نہیں رکھتا۔ اگر کسی دوسرے کو علم غیب ہو سکتا ہے تو صرف اُسی کو جسے خدا اسکی تعلیم دے:

عَالِمُ الْغَيْبِ فَلَا يُظْهِرُ عَلَىٰ غَيْبِهِ أَحَدًا إِلَّا مَنِ ارْتَضَىٰ مِن رَّسُولٍ ،

خدا ہی غیب کا جاننے والا ہے اور وہ اپنے غیب کو کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ ہاں مگر اپنے برگزیدہ پیغمبر پر۔ ہمیشہ ہر نبی اور رسول نے یہی کہا کہ اِنِّیْ لَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ، میں غیب کا ذاتی علم نہیں رکھتا۔ جبتک خدا اُسے نہ بتائے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ۔ میں تو صرف اُس وحی کا پابند ہوں جو خدا کی طرف سے میرے پاس آتی ہے۔ اس لئے اگر کوئی شخص اس کا دعویٰ کرے کہ وہ یا کوئی دوسرا غیب کی باتوں کا بغیر کسی واسطہ کے ذاتی علم رکھتا ہے تو وہ مشرک ہوگا اس کے ساتھ ہی شرک کی کچھ چھپی ہوئی صورتیں بھی ہیں جن کو "شرک خفی" کہتے ہیں اور ظاہر میں شرک نہیں معلوم ہوتیں لیکن نتیجہ میں اُس سے نزدیک ہیں۔ اور وہ خدا کا اقرار کرنے کے باوجود انسان کے اعمال و افکار میں اس لئے پیدا ہو جاتی ہیں کہ اسے خدا کی ذات اور اُس کے مرتبہ کی درست اور سچی معرفت نہیں ہوتی۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے اعمال و عبادتوں کو اس قسم کے شرکِ خفی سے پاک اور محفوظ رکھے اور نہ صرف یہ کہ اُس کے ایمان میں خرابی پیدا ہوگی اور اُس کی عبادتیں ناقص اور بیکار ہو جائیں گی بلکہ اُس کا شمار شیطان کی پیروی کرنیوالوں اور گناہگاروں میں ہوگا۔

شرک عبادتوں اور اعمال میں غیر محسوس طریقہ پر داخل ہو کر اُن کو تباہ و برباد کرتا ہے اور انسان کو خدا کے راستہ سے ہٹا کر شیطان کی راہ پر لگا دیتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ اِنَّ الشِّرْكَ اَخْفٰى مِنْ دَبِيْبِ النَّمْلِ۔ اس قسم کے شرک کی رفتار چیونٹی کی چال سے بھی زیادہ چھپی ہوئی اور غیر محسوس ہوا کرتی ہے اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس طرح اور کس شکل میں یہ اعمال اور عبادتوں میں داخل ہو گیا۔ اس لئے اس کے خطرے سے ہر مسلمان کو ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں مثلاً خدا کی عبادت میں ریاکاری کا جذبہ شامل ہو جانا اور اُسے دوسروں کو دکھانے یا ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے بجا لانا یا کسی خوف اور لالچ سے انجام دینا اور اسی طرح کی دوسری دنیاوی اغراض اس میں شامل کرنا۔ یہ سب شرک خفی ہے اور بدترین گناہ ہے۔ یا اسی طرح علم غیب کا بلاواسطہ

اور بغیر تعلیم الٰہی کے دعویٰ تو نہیں، بلکہ صرف غیب کی باتوں پر حکم لگانا اور اندازے قائم کرنا اور قسمت کے مخفی حالات پر قیاس آرائیاں کرنا اور اس کام کے لئے جانوروں، روحوں، جنات، ستاروں اور کائنات کی دوسری چیزوں کے سہارے تلاش کرنا اور اُن کے وسیلہ سے ان حالات پر حکم لگانے اور تخمینے کرنے کی کوشش کرنا یہ بھی "شرک خفی" ہے اور گناہ ہے اور اس کی علامت ہے کہ انسان کو خدا کی ذات و صفات اور اُس کے پیغمبروں کا سچا اعتقاد ہی نہیں ہے ورنہ وہ خدا کے بتائے ہوئے علم و معرفت کے راستے چھوڑ کر غلط راہیں اختیار نہ کرتا اور اس کے انبیا اور پاک بندوں سے پوچھنے اُن کی باتوں پر عمل کرنے اور اُن سے ہدایت حاصل کرنے کے بجائے پیشہ ور جاہلوں اور گمراہوں کی باتوں پر دھیان نہ دیتا اور ان کی دوکان قسمت فروشی پر بھولے پن سے اپنے ایمان و اعتقاد کی پونجی نذر نہ چڑھاتا۔ ایسی تمام باتیں "شرک خفی" میں داخل ہیں جن سے خدا کی ذات پر اعتماد اور بھروسے میں کمزوری پیدا ہوتی ہو اور غیرِ خدا پر اعتقاد و اعتماد کا لگاؤ ظاہر ہوتا ہو کسی طرح ایک سچے مسلمان اور مخلص مومن کے لئے زیبا نہیں ہے۔ اسی لئے جادو، ٹوٹکے، شگون وغیرہ یا غیب کی باتوں پر قیاس آرائیاں کرنا اور ان چیزوں کا اعتقاد رکھنا جائز نہیں ہے اور ان کی کمائی بھی حرام ہے البتہ ایسے تخمینے اور اندازے یا پیشین گوئیاں کرنا جن کی بنیاد ریاضی کے مضبوط قاعدوں اور کائنات کے نظم و ترتیب پر ہو یا اُن تاثیروں پر ہو جنہیں خدا نے زمین و آسمان کی مخلوقات میں پیدا کیا ہے۔ تو وہ اس شرکِ خفی کے مفہوم اور حکم سے الگ ہیں اور گناہ بھی نہیں ہیں۔

فرعون کی قوم کا مرد مومن جو اپنے ایمان و اعتقاد کو پوشیدہ کئے ہوئے تھا، سرکشوں اور مغرور متکبر لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تم میری بات مانو اور میری راہ پر چلو۔ اَهْدِكُمْ سَبِيلَ الرَّشَادِ ۔ میں تم کو سیدھی راہ دکھاؤں گا۔ فرعون اپنی قوم کو دھوکا دے رہا تھا مگر یہ مومن ان کی حقیقی خیر خواہی کر رہا تھا پھر اُن کی توجہ دُنیا کی طرف سے ہٹانے اور اُن کو آخرت کی جانب متوجہ کرنے کے لئے کہتا ہے کہ دُنیا تو ایک ڈھل جانے والا سایہ ہے لازوال اور قرار و ہمیشگی والی جگہ تو اس کے بعد آنے والی آخرت کی زندگی ہے جہاں کا رنج و راحت اور تکلیف و آرام ابدی اور غیر فانی ہے۔ جہاں بُرائی کا بدلہ تو اس کے برابر ہی دیا جائے گا مگر نیکی کا بدلہ بے حساب ہے خواہ وہ نیکی کرنے والا کوئی مرد ہو یا عورت ہو وہاں بس شرط صرف اتنی ہے کہ وہ باایمان ہو تو اسے نیکی کا ثواب اس قدر دیا جائے گا جس کا کوئی شخص حساب نہیں کر سکتا۔

فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ۚ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۗ اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا مِّنَ النَّارِ ۝ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ ۝

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۰ سورۃ المومن)

پھر خدا نے اُس مومن کو ان کی تدبیروں کی بُرائی سے بچا لیا اور فرعون کو بڑے عذاب نے گھیر لیا۔ وہ لوگ صبح و شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جس روز قیامت برپا ہوگی حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں ڈال دو اور جس وقت جہنم میں یہ لوگ باہم جھگڑیں گے تو کمزور لوگ تکبّر والوں سے کہیں گے کہ ہم تو تمہارے پیرو تھے تو کیا اب تم ہم سے اس آگ کا کوئی حصہ ہٹا سکتے ہو، وہ بڑے لوگ کہیں گے کہ ہم سب ہی دوزخ میں ہیں خدا تو بندوں کے درمیان فیصلہ کر چکا۔ اب ان آیات کے کچھ الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے:۔

وَقٰى۔ وَقْیٌ سے بنا ہے اس کے معنی ہیں بچانا اور محفوظ رکھنا۔ اسی سے "اِتِّقا" بھی بنا ہے جس کے معنی ہیں محفوظ رہنا۔ تقویٰ خدا کے خوف اور پرہیز گاری کو کہتے ہیں۔ حاق۔ "حُوْق اور حَيْق" دونوں سے آیا ہے۔ (ب) کے ساتھ (حاق بہ) گھیر لینے اور احاطہ کرنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔ يُعْرَضُوْنَ۔ عَرْض سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں ظاہر کرنا اور پیش کرنا یا دکھانا۔ غُدُوٌّ۔ مصدر بھی ہے جس کے معنی ہیں صبح کو آنا جانا اور غُدْوَة کی جمع بھی ہے جو فجر اور سورج نکلنے کے درمیانی وقت کا نام ہے "عَشِیٌّ" اور عَشِیَّة شام کے دھندلکے کو کہتے ہیں اور عشاء رات کے ابتدائی تیسرے حصہ کا نام ہے۔ ساعۃ۔ سے مراد قیامت ہے۔ "يَتَحَاجُّوْنَ" کا مصدر "تَحَاجّ" ہے یہ حج سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قصد کرنا یا دلیل کے ذریعے غلبہ حاصل کرنا۔ اصطلاح شرع میں حج سے مراد ہے مقررہ زمانہ میں تقرب خدا کے لئے خاص عبادتوں کے ساتھ خانہ کعبہ کا قصد کرنا۔ حُجَّة کے معنی دلیل کے ہیں۔ يَتَحَاجُّوْنَ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ آپس میں دلیلیں پیش کرتے ہیں جھگڑتے اور بحث کرتے ہیں۔ تَبَعٌ مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ جب یہ اسم ہو تو واحد اور جمع دونوں طرح بولا جاتا ہے۔

اگر جمع ہو تو اس کا واحد تابعؒ ہوگا اور اگر واحد مراد ہو تو اس کی جمع اتباعؒ ہوگی۔ مصدر
کی صورت میں اس کے معنی پیروی کرنا اور اسم کی شکل میں پیرو اور فرمانبردار ہوں گے۔ اغنی عنہ۔
کسی چیز کو ہٹانے اور دور کرنے کے موقع پر بولا جاتا ہے۔

مُغنُونَ۔ مُغنِی کی جمع ہے یعنی ہٹانے والے اور دور کرنے والے۔ نصیب کے مشہور
معنی تقدیر اور حصّہ کے ہیں۔ یہاں پر حصّہ اور جز مراد ہے۔ فوقٰہ اللہ میں بعض مفسرین
نے ضمیر غائب کو حضرت موسیٰؑ کی طرف پھیرا ہے اور بجائے مومن آل فرعون کے اُن کو مُراد لیا ہے۔

قوم فرعون کا مرد مومن جو خود فرعون کا چچازاد بھائی اور ولیعہد سلطنت تھا ابھی ابھی اہل مصر
کو نصیحت کرتے ہوئے کہہ رہا تھا کہ یہ کیا بات ہے کہ میں تم کو حق کی طرف بلا رہا ہوں تم سے
تمہارے فائدہ کی باتیں کر رہا ہوں، تمہیں خطروں سے آگاہ کر رہا ہوں تمہیں نجات اور بچاؤ کی
تدبیریں بتا رہا ہوں اور تم کو وحدہٗ لاشریک اللہ کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور تم مجھے شرک
اور کفر کی طرف بلاتے ہو غور تو کرو۔ تمہارے اور میرے راستہ میں کتنا فرق ہے۔ تم جنکی
عبادت کی طرف مجھے بلاتے ہو اُن کو دین و دنیا کا کوئی کوئی اختیار نہیں۔ اُنہیں
نفع اور نقصان پہ کوئی قابو نہیں جو نہ تو اپنے پکارنے والے کی آواز کو سُن سکتے ہیں اور اُسکی
دعا کو قبول کر سکتے ہیں۔ نہ اس دُنیا میں اور نہ آخرت کی زندگی میں۔ ہم سب کو خدا ہی کی طرف
پلٹ کے جانا ہے اور اُسی قہار و جبار شہنشاہ کی بارگاہ میں حاضری دینا ہے جس کی خدائی
اور حدود سلطنت سے کوئی باہر نہیں نکل سکتا، جس کے قبضۂ قدرت سے کوئی بچکر نہیں
جا سکتا اور جس کے قہر و عذاب کی بجلیوں سے کسی کو بھی نجات نہیں مل سکتی جبتک کہ خود نہ
چاہے۔ یہ نڈر اور بہادر مرد مومن موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے خدا کے لاکھوں
دشمنوں اور منکروں کے سامنے فرعون کی نخوت و غرور کی دھجیاں اُڑا رہا ہے اور اُس کی
بادشاہت کی بنیادیں ہلا رہا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ آج نہیں تو کل تم کو میری سچائی معلوم
ہو جائے گی اُس وقت تم میری بات کی قدر کرو گے اور تمہیں افسوس ہوگا کہ تم نے میری بات
کیوں نہ مانی اور میری نصیحت پر کیوں عمل نہ کیا۔ مگر پھر اُس وقت کی ندامت سے تم کو کوئی
فائدہ نہ ہوگا۔ اس اعلانِ توحید نے قصرِ فرعون میں زلزلہ پیدا کر دیا اور اُس کی عظمت و اقتدار
کی دیواریں گرنے لگیں۔ ساری قوم حزقیل کی دشمن بن گئی اور انہیں تکلیفیں پہنچانے اور ہلاک
کرنے کی تدبیریں ہونے لگیں مگر جسے اللہ بچائے اُسے کون نقصان پہونچا سکتا ہے۔ خدا نے اس

سچے مجاہد کو فرعون اور اُس کے ساتھیوں کے مکر و دغا سے بچا لیا اور فرعون والے سخت ترین عذاب میں گرفتار ہو گئے۔ حَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ۔

فرعون نے حضرت موسیٰؑ کو شکست دینے کے لئے کوئی کوشش اور کوئی تدبیر اُٹھا نہ رکھی، یہاں تک کہ بارہ ہزار جادوگر جمع کیے گئے تاکہ ان کا مقابلہ کریں اور انہیں ناکام بنا دیں۔ یہ مقابلہ اسکندریہ کی سرزمین پر ہوا۔ لاکھوں تماشائیوں کا مجمع تھا اور خود فرعون بھی تخت شاہی پر بیٹھا ہوا تماشا دیکھ رہا تھا مگر آخر میں جادوگروں کو شکست ہوئی اور حضرت موسیٰؑ کے عصا نے اژدھے کا بھیس بدل کر باطل کا قصہ پاک کر دیا وہ سب کے سب ہار کر سجدہ میں گر پڑے اور پکار اُٹھے کہ جو حضرت موسیٰؑ و ہارونؑ کا خدا ہے وہی ہمارا بھی پروردگار ہے۔

لیکن ان لوگوں کو اپنے اس ایمان کی بڑی قیمت ادا کرنا پڑی۔ فرعون نے ان کے ہاتھ پیر کاٹ ڈالے اور سب سولی پر چڑھا دیئے گئے۔ جب فرعون کے ظلم کی حد نہ رہی تو حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کے ساتھ شہر کے باہر چلے گئے اور جنگل میں خیمے ڈالکر رہنے لگے۔ حضرت موسیٰؑ کے شہر سے ہٹتے ہی ہوا کا ایک سخت طوفان آیا جس سے سارا شہر تباہ ہو گیا۔ اس کے بعد ٹڈیوں نے حملہ کیا اور ساری زراعت خراب ہو گئی پھر دریا کا پانی خون بن گیا اس کے بعد برف کا عذاب آیا چالیس سال اسی طرح گذر گئے اور بلاؤں پہ بلائیں آتی رہیں مگر اس کے بعد بھی ان بے شعور انسانوں کی آنکھیں نہ کھلیں۔ ادھر فرعون آسمانی قہر میں گرفتار تھا اور یہاں حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے روانہ ہو گئے۔ فرعون نے ایک بھاری لشکر لیکر ساتھ آپ کا پیچھا کیا آخر تمام بنی اسرائیل کو خدا نے بچا لیا اور فرعون اپنے لاکھوں سپاہیوں کے لشکر کے ساتھ سمندر میں غرق ہو گیا۔ جب موت فرعون کی آنکھوں کے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تو اُس وقت اُس نے خدا کا اقرار کیا مگر وقت گذر چکا تھا۔ فرعون کی لاش پانی کی چادر پر تیرنے لگی اور جو زبان اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى کا نعرہ لگایا کرتی تھی وہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی یہ وہی عذاب تھا جس نے قوم فرعون کو گھیرا تھا اور اُس کے سر غرور کو قیامت تک کے لئے جھکا دیا۔

فرعون والے اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے زندگی میں بھی عذاب خدا میں گرفتار رہے اور مرنے کے بعد بھی قیامت تک مبتلا رہیں گے اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا۔ وہ لوگ صبح و شام آگ کے سامنے لائے جاتے ہیں اور جس دن قیامت برپا ہوگی حکم ہوگا کہ فرعون والوں کو سخت ترین عذاب میں ڈالدو۔ یہ آیت عذاب قبر اور عالم برزخ کا ایک واضح ثبوت ہے۔

اور اس سے پتہ چلتا ہے کہ مرنے کے بعد روحیں فنا نہیں ہوئیں بلکہ باقی رہتی ہیں۔ دوسرے مقام پہ سورۃ المؤمنون میں اس کا صاف اعلان موجود ہے: وَمِنْ وَّرَآئِهِمْ بَرْزَخٌ اِلٰی يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ۔ اُن کے مرنے کے بعد عالم برزخ ہے جہاں اس روز تک جب وہ دوبارہ قبروں سے اٹھائے جائیں گے رہنا ہوگا۔ برزخ کے اصلی معنی ہیں حائل اور آڑ جو دو چیزوں کے درمیان ہو مگر اصطلاح میں یہ اس عالم کا نام ہے اور اس حالت کو کہتے ہیں جو موت اور قیامت کے درمیان ہوتی ہے اور جب سے اس جسم ظاہری سے روح نکلتی ہے اُس کا عالم برزخ شروع ہو جاتا ہے۔ اور اُس وقت تک رہے گا جب تک وہ روح قیامت میں اپنے اصلی جسم کی طرف نہ پلٹا دی جائے اور اسی اعتبار سے برزخ کا لفظ قبر کے لئے بھی استعمال کیا گیا ہے کیونکہ قبر کا تعلق بھی مرنے کے بعد کے حالات ہی سے ہے۔

قرآن کریم کی آیات اور حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی روشنی میں یہ بات اب پردے میں نہیں رہی ہے کہ روحیں چاہے مومنوں کی ہوں یا کافروں کی مرنے کے بعد باقی رہتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حقیقت میں انسان اس خاکی بدن کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک دوسری ہی مخلوق ہے جو مرنے کے بعد بھی فنا نہیں ہوتی جس کو دوسرے الفاظ میں نفس ناطقہ یا روحِ انسانی کہتے ہیں اور جس کا سب سے پہلا مظہر خود روحِ حیوانی ہے۔

مرنے کے بعد جب روحِ انسانی اس جسم سے نکل جاتی ہے تو خدا اُسے ایک دوسرا لطیف مثالی بدن عطا فرماتا ہے جس میں وہ قیامت تک رہے گی جو اُس کے دنیاوی جسم سے مشابہ ہوتا ہے لیکن مادّی اجسام کی طرح کثیف نہیں ہوتا۔ پھر جب قیامت آئے گی تو ان تمام روحوں کو ان کے اصلی بدنوں کی طرف لوٹا دیا جائے گا اور ابدی عذاب یا خُلدِ بریں میں داخل کیا جائے گا۔

قبر عالم برزخ کی ابتدائی منزل کا نام ہے جہاں پہونچکر مرنے والے کو اپنے اعمال کا نتیجہ نظر آنے لگتا ہے۔ حضرت سرورِ کائنات کی حدیث ہے۔

"اَنَّكُمْ تُفْتَنُوْنَ فِیْ قُبُوْرِكُمْ" قبروں میں تمہاری جانچ کی جاتی ہے۔ اور کہیں یوں فرمایا ہے:

اَيُّهَا النَّاسُ اِسْتَعِيْذُوْا بِاللّٰهِ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ۔ اے لوگو عذاب قبر سے خدا کی بارگاہ میں پناہ طلب کرو۔ اس دُنیا کی زندگی میں ہم کو ہوش نہیں آتا۔ کھانے پینے اور رہنے سہنے اور طرح طرح کے آرام و راحت کی طلب میں آخرت کا دھیان نہیں رہتا۔ دیکھنے میں ہماری آنکھیں کھلی ہوئی ہیں

مگر حقیقت میں بند ہیں۔ جب یہ نیند اُچاٹ ہو جائے گی اور موت آ جائے گی تو اُس وقت صحیح معنی میں ہماری آنکھ کھُل جائے گی۔

حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام فرماتے ہیں:
"اَلنَّاسُ نِیَامٌ اِذَا مَاتُوْا انْتَبَهُوْا" لوگ سو رہے ہیں جب مریں گے تو جاگ اُٹھیں گے مگر اُس وقت کی ندامت اور افسوس سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

خدا نے اس دُنیا کی زندگی میں عملِ خیر کا کتنا موقع عطا کیا ہے! کیسا بد قسمت ہے وہ انسان جو اس موقع کو ہاتھوں سے گنوا دے اور کوئی فائدہ نہ اُٹھائے۔

یُوں تو خدا کی بارگاہ سے ہر نیکی کا بہترین بدلہ ہر زمانہ میں ملتا ہے مگر رمضان کے مبارک مہینے میں تو ثواب کی کوئی حد ہی نہیں رکھی گئی۔ جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ اس مہینے میں خدا کا لطف وکرم اتنا ہے کہ روزہ دار کا روزہ اس کے دنوں اور راتوں سونا اور سانس لینا تک عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ فَاِنَّ الشَّقِیَّ مَنْ حُرِمَ غُفْرَانَ اللّٰهِ فِیْ هٰذَا الشَّهْرِ الْعَظِیْمِ۔ وہ بڑا بدنصیب انسان ہے جو اس بابرکت اور باعظمت مہینے میں بھی خدا کی مغفرت اور کرم سے محروم رہے۔ یہ دُنیا دارِ عمل ہے جو کچھ یہاں کی زندگی میں کیا جائیگا آخرت میں سامنے آئے گا۔ اس لئے ہمیں غفلت اور لاپروائی سے کام نہیں لینا چاہیے اور اپنی اُس اصلی زندگی اور ابدی آرامگاہ کے لئے جو کچھ بھی ممکن ہو ذخیرہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے تاکہ وہاں ہمیں شرمندگی اور افسوس نہ ہو۔ کیونکہ دوبارہ ہمیں عمل کرنے کے لئے یہ دُنیا کی زندگی پھر حاصل نہ ہوگی۔

"اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ الْعِبَادِ" (خدا کا فیصلہ ہو چکا ہے۔)

(درس) ۱۱۱

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ۝ قَالُوْا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝ۙ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ

سُوْٓءُ الدَّارِ ○ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ
الْكِتٰبَ ۙ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ○ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ○

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۰ کی آخری اور رکوع ۱۱ کی ابتدائی آیات - سورۃ المؤمن)

اور جو لوگ آگ میں ہوں گے - جہنم کے محافظ فرشتوں سے درخواست کریں گے کہ اپنے
پروردگار سے دعا کرو کسی دن تو ہمارے عذاب میں کمی کردے -
وہ جواب دیں گے - کیا تمہارے پاس تمہارے پیغمبر معجزے لیکر نہیں آئے تھے. دوزخی
کہیں گے ہاں آئے تو تھے - فرشتے کہیں گے کہ پھر تم ہی دعا کرو اور کافروں کی دُعا تو
بس بیکار رہی ہے - ہم اپنے پیغمبروں کی اور ایمان والوں کی دُنیا کی زندگی میں بھی ضرور
مدد کرتے ہیں اور اُس دن بھی جب گواہ کھڑے ہو جائیں گے - جس دن ظلم کرنے والوں
کی معذرت ان کو کچھ بھی فائدہ نہ دے گی اور اُن پر لعنت ہو گی اور ان کے لئے اُس
گھر کی خرابی ہو گی اور ہم موسیٰ کو ہدایت دے چکے ہیں اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب کا
وارث بنایا جو عقل والوں کے لئے ہدایت اور نصیحت تھی - تو تم صبر کرو، بیشک اللہ کا
وعدہ سچا ہے اور اپنے گناہ کی معافی مانگو اور صبح و شام اپنے پروردگار کی حمد وثنا کے ساتھ
تسبیح کرتے رہو -

ترجمہ کے بعد اب ان آیاتِ کریمہ کے بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے -

خَزَنَۃٌ خازن کی جمع ہے اس کے لفظی معنی ہیں جمع کرنے والا یا راز کو چھپانے والا
یہاں پر مراد وہ فرشتے ہیں جو اہلِ جہنم کے عذاب پر مقرر ہیں -
رُسُلٌ - رَسُوْلٌ کی جمع ہے - ضَلَال کے معنی تباہی و بربادی، گمراہی اور
ہلاکت کے ہیں - اَشْہَاد - شاہد کی جمع ہے جس کے معنی گواہ کے ہیں - اس سے
مراد یہاں انبیاء، ملائکہ، اور صاحبان ایمان ہیں - "یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْہَادُ" وہ دن جب گواہی
دینے والے کھڑے ہو جائیں گے -
اس سے مراد روز قیامت ہے - ھُدٰی مصدر ہے - اس کے معنی ہیں. سیدھی راہ

دکھانا اور بیان، رُشد، ہدایت اور رہبری کو بھی کہتے ہیں۔ کبھی اس سے آسمانی کتاب اور شریعت بھی مراد لی جاتی ہے۔

ھُدیٰ کے معنی توفیق اور تائید کے بھی آتے ہیں مگر یہ مخصوص ہیں اللہ کے لئے غیرِ خدا کے لئے اسکا استعمال نہیں ہوتا۔ ان آیاتِ کریمہ میں الھُدیٰ سے مراد وہ چیزیں ہیں جو دینی ہدایت کا ذریعہ ہوں یعنی صحیفے، شریعتیں اور معجزے۔ اور الکتاب سے مراد توراۃ ہے۔ ذِکریٰ (الف مقصورہ کیساتھ، تبلیہ) عبرت اور نصیحت کے لئے بولتے ہیں

لُبٌّ۔ عقل اور قلب کو کہتے ہیں اس کی جمع اَلْبَاب ہے۔ کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں مغز یا ہر چیز کا خالص اُس وقت اس کی جمع لُبُوب آتی ہے۔ اِبکار۔ "اَبکر" سے مصدر ہے جس کے معنی ہیں عجلت اور جلدی کرنا یا صبح سویرے آنا۔ جانا۔ یا کوئی دوسرا کام کرنا۔ مگر یہاں پر "اِبکار" سے مراد صبح کا ابتدائی وقت ہے جو عَشِیّ یعنی شام کے مقابلہ میں بولا گیا ہے۔

ذَنبٌ کے معنی جرم اور گناہ کے ہیں۔ اس کی جمع ذُنُوب ہے۔ اس سے مشابہ ایک دوسرا لفظ بھی ہے:۔ ذَنُوبٌ جو واحد ہے اور اُس کے معنی پانی سے بھرے ہوئے بڑے ڈول کے ہیں اور مجازاً نصیب اور حصہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں لفظ ذنب کا استعمال انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے لئے بھی ہوا ہے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایسی جگہ ذنب کے معنی گناہ اور خطا وجُرم کے کسی طرح نہیں ہوسکتے اس لئے کہ تمام نبی اور رسول ہر قسم کے گناہ سے پاک ہوا کرتے ہیں اور اُن کے لئے یہ بات پوری طرح ثابت ہے کہ وہ کسی وقت بھی خدا کے حکم اور اُس کی مرضی کے خلاف نہیں کرتے۔

اس بات کو سمجھنے کے لئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ہم اُس غرض کو معلوم کریں جس کے لئے پیغمبروں کو بھیجا جاتا ہے پھر اسے سمجھیں کہ نبی اور رسول کی کیا شان ہوا کرتی ہے اور وہ کس طرح کا انسان ہوتا ہے اس کے ساتھ یہ بھی دیکھیں کہ خود قرآن کریم نے انبیاءؑ و مرسلین کے لئے کیا صفات بیان کی ہیں اور ان کی منزلت اور مرتبہ کو کن الفاظ میں ظاہر کیا ہے اس کے بعد ہمیں اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ انبیاءؑ و مرسلین

کبھی گناہ نہیں کرتے اور کبھی کوئی ایسا عمل نہیں کرتے جو خدا کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف ہو۔ انبیاء کے آنے کی اصلی غرض یہ ہے کہ وہ دنیا والوں کو ہدایت کریں۔ انہیں خدا کی رضا اور پسند سے آگاہ کریں، دین حق کی تعلیم دیں، خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلائیں اور اطاعت و معصیت کا مفہوم اور اس کے حدود سمجھائیں۔ انبیاء کا قول و عمل اور ان کی شخصیت اور ان کی زندگی دوسروں کے لئے ہدایت کا ایک نمونہ اور ان کی پاک سیرت اور ان کا روشن کردار ایک مثال ہے اور یہ غرض اسی وقت ہی پوری ہو سکتی ہے جب وہ ہر طرح کے گناہ اور خطا سے پاک ہوں ورنہ خود گناہ کرنے والا دوسرے کو ہدایت نہیں کر سکتا اور جو خود سیدھی راہ پر نہ ہو وہ دوسرے کی رہبری کا حق نہیں رکھتا۔ ایسی حالت میں اُن کے قول و فعل پر اعتماد اور بھروسا بھی باقی نہیں رہ سکتا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ حق اور منشاء ایزدی کے مطابق ہے۔ اس لئے بعثت انبیاء کی غرض ہی جاتی رہے گی اگر اُن کی مقدس ہستیوں کے لئے گناہ اور خطا کو جائز سمجھا گیا۔

دوسرے عہدۂ نبوّت و رسالت پر انبیاء علیہم السلام کو خدا ہی نے مقرر فرمایا ہے اور یہ اسی کے چنے ہوئے اور منتخب کئے ہوئے ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ خدا گناہگار کا انتخاب نہیں کر سکتا۔ قرآن کریم میں صاف اعلان موجود ہے۔

وَ اِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ۔ یہ لوگ ہماری بارگاہ میں برگزیدہ اور نیک لوگوں میں ہیں۔ اللہ نے انبیاء کی پیروی نہ کرنے پر عذاب کا اعلان فرمایا ہے اور ان کی پیروی میں کوئی شرط اور قید نہیں لگائی ہے بلکہ مطلق اطاعت کا حکم دیا ہے اس لئے اگر نبی کا ہر حکم واجب العمل ہوگا اور اس کی ہر چیز میں پیروی ہوگی تو پھر گناہ اور گمراہی میں بھی اس کی اطاعت کرنا لازم ہوگا حالانکہ اللہ ایسی بات کا کبھی حکم نہیں دے سکتا بلکہ اُس کا تو یہ ارشاد موجود ہے: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ، حق کے خلاف کرنے والوں کی طرف نہ جھکو اور ان کی پیروی نہ کرو۔

وَقَالَ الَّذِينَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا
مِّنَ الْعَذَابِ ○ قَالُوا أَوَلَمْ تَكُ تَأْتِيكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
قَالُوا بَلٰى ۚ قَالُوا فَادْعُوا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِينَ إِلَّا فِي ضَلٰلٍ ○
إِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِينَ اٰمَنُوا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُومُ
الْأَشْهَادُ ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِينَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ
وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ ○ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوسَى الْهُدٰى وَأَوْرَثْنَا
بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ الْكِتٰبَ ○ هُدًى وَّذِكْرٰى لِأُولِي الْأَلْبَابِ ○
فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ○

(پارہ ۲۴، رکوع ۱۰ کی آخری اور رکوع ۱۱ کی ابتدائی آیات۔) (سورۃ المؤمن)

ان آیات کریمہ کا ترجمہ اور ان کے مشکل الفاظ کی تشریح اس سے قبل کے درس میں گذر
چکی ہے اس لئے اُسے یہاں ترک کیا جاتا ہے۔

انبیاءؑ اور مرسلینؑ کا ذکر تھا اور نبوّت و رسالت کے منصب عظیم کی تفصیل بیان
کی جا رہی تھی۔ اِس سلسلہ میں مقامِ نبوّت کی بلندی کو ہم یوں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ
نے کھلے ہوئے لفظوں میں انبیاءؑ کی پیروی کا مطلق حکم دیا ہے یعنی ایسا حکم جس میں
نہ تو کسی قسم کی قید ہے اور نہ شرط ہے اور مقصود یہ ہے کہ زندگی کا کوئی کام ایسا نہ
ہو جس میں ذرا سا بھی ...... اس اطاعت سے انحراف کیا جائے۔
کیونکہ ایسا کرنے کی وجہ سے انسان جہنّم کی آگ سے ہرگز نہ بچ سکے گا۔ اللہ کا فرمان
ہے: وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ فَإِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِينَ
فِيهَآ أَبَدًا۔ جو شخص بھی اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کرے گا اس کے لئے
جہنم کی ابدی آگ ہے۔ اس پیروی میں نہ کوئی شرط ہے اور نہ کوئی قید ہے۔ ایسی حالت
میں اگر کسی نبی سے گناہ کے ہونے کا امکان ہو یعنی وہ عملاً کسی گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے
تو ظاہر ہے کہ اُس میں بھی اُس کی پیروی کرنا ضروری ہو جائے گا حالانکہ یہ اسلام کے بنیادی
اصول کے خلاف اور اُس کی تعلیم کے قطعاً منافی ہے۔ یہ بات ممکن ہی نہیں ہو سکتی کہ اللہ
کسی ایسی بات کا حکم دے اور اپنے بندوں کو گناہ کرنے پر اس طرح مجبور کر دے اور پھر

انھیں اس گناہ پر سزا بھی دے۔ اس کے بجائے اُس نے تو یہ فرمایا: وَلَا تَرْكَنُوْا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ۔ یعنی حق کے خلاف عمل کرنے والوں کی طرف تم کبھی مائل نہ ہوجانا ورنہ تم جہنم میں ڈال دیئے جاؤ گے۔ اس کے ساتھ یہ بات بھی ہم سب جانتے ہی ہیں کہ انبیاء کرام کا مرتبہ فرشتوں سے بلند ہے اور ظاہر ہے کہ وہ گناہ نہیں کرتے سورۂ ھود میں اللہ نے فرمایا ہے: لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ۔ یعنی فرشتے کبھی اللہ کے حکم کے خلاف عمل نہیں کرتے اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے اور اللہ کی طرف سے جو کچھ بھی انھیں حکم ملتا ہے وہی کرتے ہیں۔ اللہ کے اس صاف اور صریح اعلان کے بعد پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جو لوگ فرشتوں سے افضل ہوں یعنی انبیاءؑ اور مرسلین وہ گناہ کریں۔ العیاذ باللہ العظیم۔ اور پھر ایسی ذاتِ اقدس جو سردارِ مرسلین ہو اُس سے یہ بات کس طرح ممکن ہو سکتی ہے! "ظلم" کے اصلی معنی ہیں۔ وَضْعُ الشَّيْئِ فِيْ غَيْرِ مَحَلِّهٖ "کسی چیز کو خواہ وہ کوئی فعل ہو یا قول ہو اس کی صحیح جگہ سے ہٹا دینا اس لیے ہر وہ بات جو حق کے خلاف ہو اور درست و صحیح نہ ہو یقیناً ظلم ہے اور اللہ کا اعلان موجود ہے کہ:

"لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ" میرا عطا کیا ہوا منصب نبوت و امامت ظالموں کو نہیں ملے گا۔ اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ انبیاء علیہم السلام ہر قسم کے گناہ اور غلطیوں سے پاک و پاکیزہ ہوں۔

یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ گناہ تسلطِ شیطانی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے اور قرآنِ حکیم میں صاف اعلان کر دیا گیا: اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ "۔ (اے شیطان!) میرے خاص بندوں پر تجھے کبھی کوئی غلبہ حاصل نہ ہو سکے گا۔ ساتھ ہی شیطان نے خود بھی اس کا اقرار کیا ہے: لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ"، میں ہر شخص کو گمراہ کروں گا لیکن (اے اللہ) تیرے مخلص بندوں کو گمراہ نہ کر سکوں گا" ان تصریحات کی روشنی اُس ذاتِ قدسی صفات کی منزلت کو کون بیان کر سکتا ہے جو خلقتِ کائنات کی اصلی غرض تھی۔ مشہور حدیث قدسی میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: لَوْلَاكَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ (اے رسولؐ) اگر تم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو نہ پیدا کرتا۔ کس میں طاقت و قوت ہے جو اُس ذات کی

ثنا و صفت بیان کر سکے جس کے نور کو اللہ نے اُس وقت بھی نبوت کے درجہ پر ممتاز رکھا
تھا جب حضرت آدمؑ کی تخلیق ہو رہی تھی خود حضورؐ اکرم کا ارشاد ہے:
"کُنْتُ نَبِیًّا وَّ اٰدَمُ بَیْنَ الْمَاءِ وَالطِّیْنِ" میں اُس وقت بھی نبی تھا جب آدم
علیہ السلام مٹی اور پانی کے درمیان تھے یعنی پیدا کیے جا رہے تھے۔

وہ بلند منزلت رسولؐ جس کی رسالت کی گواہی اللہ نے اپنی کتاب کی قسم کھا کر دی
اور اُس کے صراطِ مستقیم پر ہونے کا اعلان کیا ہے: "وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ اِنَّکَ لَمِنَ
الْمُرْسَلِیْنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ" جس کی اطاعت ۔ اطاعتِ خدا ہے۔
مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ (قرآن کریم) جس نے رسول کی اطاعت کی
(در حقیقت) اُس نے اللہ کی اطاعت کی۔ وہ رسول جو بشیر و نذیر تھا، سراج منیر تھا،
معلّم کتاب و حکمت تھا، ہادیِ عالم تھا، فخرِ دو عالم تھا، جو تمام رسولوں سے افضل،
جس کی رضا۔ رضائے الٰہی، جس کا ہر عمل مرضی خداوندی کے مطابق، جس کا نطق وحی
الٰہی، ہر مخلوق کو ہدایت کرنے والا، کائنات کی ہر چیز سے بہتر۔ اُس ذاتِ اقدس سے
گناہ کا صدور کیونکر ہو سکتا ہے بلکہ اس کی شان کے لئے لفظِ "ذنب" کے اصلی معنی
کا استعمال خود ہی بڑا گناہ ہے۔ اس بنا پر یہ صاف سی بات ہے کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام
کے لئے جہاں کہیں بھی قرآن پاک میں "ذنب" یا عصیان و غوایت اور گمراہی کے الفاظ بولے
گئے ہیں وہاں ان کے مشہور اور اصلی معنی مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ بات عقلی کلیات اور
قرآنی مسلّمات کے، قطعی طور پر خلاف ہے پس اسی نقطۂ نظر کے تحت یہاں بھی اس
لفظ یا اس سے مشابہہ لفظوں کا ترجمہ اور مفہوم ہم نہ تو اپنی سطح پر کر سکتے ہیں اور نہ اپنی
سطح پر اس کے مفہوم کو سوچ سکتے ہیں بلکہ ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس کے مفہوم
کو خود انبیاءؑ کرام کے منصب کی سطح پر سوچیں اور اُن کی بلند و برتر شان کو اپنے سامنے
رکھ کر اس پر غور کریں۔ بالکل اُسی طرح جیسے ہم جانتے ہیں کہ اللہ کا جسم نہیں ہو سکتا،
اُس کے ہاتھ پیر نہیں ہو سکتے اور وہ مادّیت سے پاک ہے لیکن خود قرآن پاک میں یہ
لفظ موجود ہیں: "یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ" جس کا لفظی ترجمہ یہی ہے
کہ اللہ کا ہاتھ اُن کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ تو اب ہمیں یہ خود ہی سمجھ لینا چاہیئے کہ
یہاں "یَد" کے لفظی معنی مُراد نہیں ہو سکتے اور اس سے مقصود کوئی مادّی

اور جسمانی ہاتھ نہیں ہو سکتا بلکہ اس سے مراد قدرت و طاقت اور اقتدارِ مطلق ہے یا پھر اس سے مقصود اللہ کا جود و کرم ہے۔ اسی طرح "بَلْ یَدَاہُ مَبْسُوْطَتَانِ" کے مفہوم کا بھی تعین کیا جائے گا جس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی مراد یہی ہے کہ اللہ کے اختیار و قدرت پر کوئی پابندی نہیں ہو سکتی۔

بس اسی صورت سے شانِ رسالت و نبوت کو بھی سمجھنا چاہیے کہ وہ اس بات سے بلند و برتر ہے کہ "ذَنْبٌ" کے اصلی معنی اس کی جانب منسوب ہوں جبکہ اللہ ان الفاظ کیساتھ اپنے نبی کی تعریف کر رہا ہے: مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى۔ یہ تمہارے ساتھ رہنے والے (محمدؐ) نہ کبھی راہ سے بھٹکے اور نہ بہکے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى۔ اور وہ تو اپنی نفسانی خواہش سے کچھ بولتے ہی نہیں یہ تو صرف وحی الٰہی ہے جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔ غرض اُن وجوہ کے پیشِ نظر پوری وضاحت کے ساتھ ہم یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ "اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ" اپنے گناہ کی معافی طلب کرو" کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اُمت کے گناہوں کے لئے استغفار کرتے رہو اور ساتھ ہی یہ طریقۂ استغفار کی تعلیم بھی ہے تاکہ لوگ یہ دیکھکر کہ جب ایسی مقدس ترین ہستیاں جن سے گناہ کا صدور نہیں ہو سکتا، اللہ کی بارگاہ کے سامنے اپنے کو گناہگار کہتی ہیں تو پھر دوسرے کس شمار و قطار میں ہیں۔ پیغمبروںؑ کی تو عادت ہی یہ رہی ہے کہ وہ ہمیشہ اللہ سے طلبِ مغفرت کیا کرتے تھے اور عرض کرتے تھے۔ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِيْٓ أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ" اے ہمارے پالنے والے ہمارے گناہ اور ہمارے کاموں میں ہماری زیادتیاں بخش دے اور ہمیں ثابت قدم رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری نصرت فرما۔ تو بہر حال یہ سب کچھ طلبِ تقربِ الٰہی کے طریقے ہیں، یہ اخلاص و محبت کی منزلیں ہیں، حبیب و محبوب کی باتیں ہیں، راز و نیاز کے لہجے ہیں، پردہ راز کے اسرار ہیں۔ گفتگو اور ہے حقیقت دوسری چیز ہے لفظیں اور ہیں، معنی کی منزل دوسری ہوتی ہے کہیں کسی جانب خطاب کیا جاتا ہے مگر حقیقت میں رخ ہوتا ہے کسی اور کی طرف، لفظیں کچھ بتاتی ہیں لیکن مراد ہوتی ہے کچھ اور۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اس لفظ "ذنب" سے مراد گناہانِ اُمت بھی ہیں، اظہار و طلبِ اخلاص و تقرب بھی ہے اور دوسروں کو استغفار کی تعلیم بھی تاکہ وہ بھی یہ دیکھکر کہ جب خود مرسلینِ اللہ کے سامنے اس طرح انکسار کیساتھ جھکے ہوئے ہیں تو پھر ہم کیا چیز ہیں اور یقیناً ہمیں بھی ایک لمحہ کے لئے اپنے

گناہوں، غلطیوں، زیادتیوں اور خطاؤں کو بھولنا نہیں چاہیے اور ہمیشہ اللہ کی عظمت کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے۔

(درس ۱۱۴۳)

وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ ○ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ؕ قَالُوْا بَلٰى ؕ قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ○ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۙ○ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ ۙ○ هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ○ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ○

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۰ کی آخری اور رکوع ۱۱ کی ابتدائی آیات۔ سورۃ المؤمن کی بقیہ تفسیر و تشریح)

پچھلے درس میں ان آیات کریمہ کی کچھ تشریح و تفسیر بیان کی جا چکی ہے ...... اب ہم ایک مرتبہ پھر ان پر اجمالی نظر ڈالیں تاکہ ہمارے ذہن میں ان کے مفہوم و مراد کی صحیح ترتیب قائم ہو جائے۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا مِّنَ الْعَذَابِ۔ اس گفتگو سے پہلے جہنم کے بڑے اور چھوٹے لوگوں کی آپس کی تکرار اور جھگڑے کا ذکر تھا۔ چھوٹے لوگ یعنی تابعداری اور پیروی کرنے یا دوسروں کا حکم ماننے والے جن لوگوں کی بڑائی اور بزرگی کے قائل تھے اور دنیا میں جن کے کہنے پر چلا کرتے تھے ان سے کہیں گے کہ ہم تو پچھلی زندگی میں تمہارے پیرو تھے۔ جو تم نے کہا وہ ہم نے کیا اور تمہاری ہر بات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ہر حکم کو مانا اب یہاں تم بھی ہماری کچھ امداد کرو اور اس عذاب میں کچھ کمی کرا دو۔ یہ تکبر والے لوگ انہیں جواب دیں گے کہ ہم بھی تو تمہارے ساتھ ہی اس آگ میں جھلس رہے ہیں اور اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے پھر تمہیں کیونکر بچائیں گے۔ اللہ کی طرف سے فیصلہ تو ہو چکا ہے اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق اچھی یا بری جزا مل کے رہے گی اور اب کوئی کمی نہیں

ہو سکتی۔ آخر یہ بڑے اور چھوٹے لوگ جو آگ میں ہوں گے جہنم کے خازنوں یعنی محافظ فرشتوں سے درخواست کریں گے کہ تم ہی اپنے پروردگار سے ہمارے لئے دعا کرو کہ وہ کسی دن تو ہمارے عذاب کو ہلکا کر دے۔

قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ وہ فرشتے جواب دینگے کہ کیا تمہارے پیغمبر تمہارے پاس معجزے لیکر نہیں آئے تھے اور کیا رسولوں کے ذریعے سے خدائی احکام تمہیں دنیا کی زندگی میں نہیں پہونچے تھے اور وہ تمہیں دوزخ سے بچنے کا طریقہ نہیں سکھا گئے۔ دوزخی جواب میں کہیں گے کہ وہاں وہ لوگ آتے رہے مگر ہم نے ان کا کہنا نہ مانا اور اُن کی نصیحتوں پر عمل نہ کیا۔

قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ فرشتے کہیں گے کہ پھر تم خود ہی دعا کرو اور خدا کی بارگاہ میں التجا کرو ہم تمہارے لئے دعا نہیں کر سکتے وَمَا دُعٰۗؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ مگر تمہاری دُعا کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا کیونکہ کافروں کی دُعا بیکار رہے۔ اس لئے کہ اُس کا اور اُس کی قبولیت کا موقع دُنیا ہی میں تھا جو دارالعمل ہے اور اب دارُالجزا میں اس کا موقع نہ رہا۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ ہم اپنے پیغمبروں اور ایمان والوں کی دنیوی زندگانی میں بھی ضرور مدد کرتے ہیں۔ وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ اور اُس دن بھی مدد کریں گے جب گواہی دینے والے اٹھ کھڑے ہوں گے اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ زید بن اسلم کہتے ہیں کہ گواہوں سے مُراد ملائکہؑ۔ انبیاء اور صاحبان ایمان ہیں اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ ان گواہوں سے مراد وہ فرشتے ہیں جو خدا تمام نبی آدمؑ کے اعمال کی نگرانی پر مقرر فرماتا ہے اور وہ قیامت کے دن اُن کے تمام اعمال کی گواہی دینگے اور بعض نے ان گواہوں میں انسان کے اعضاء و جوارح کو بھی داخل کیا ہے جو قیامت کے دن ہر شخص کے افعال و اعمال کی شہادت دینگے کہ ہمیں اس شخص نے ان باتوں کے لئے استعمال کیا تھا اور فلاں فلاں کام ہم سے لئے تھے۔

اس مقام پر خداوند عالم نے پیغمبروں اور ایمان والوں کی مدد کرنے کا وعدہ اور اعلان فرمایا ہے مگر اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ ان کو قتل کیا گیا، اُن کی تکذیب کی گئی اور

انہیں تکلیفیں پہونچائی گئیں اور بعض کو اپنا وطن چھوڑنا پڑا۔ حضرت یحییٰ، زکریاؑ، یونس، نوح،
ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام اور خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور
آپ کے اہلبیتؑ اطہار اور اصحابؓ اخیار کے واقعات ہر شخص جانتا ہے کہ ان برگزیدہ اور مقدس
ہستیوں کو کن مصیبتوں اور تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر کیا کسی کو اس کا حق ہے کہ یہ دریافت
کرے کہ ان ہستیوں کے لئے خدا کا وعدہ کیوں پورا نہ ہوا اس کا جواب یہ ہوگا کہ خدا کا
وعدہ ہمیشہ پورا ہوا اور ہوتا رہا۔ اور ہمیشہ وہ اپنے بندوں کی امداد کرتا رہا۔ نصرت کا مطلب
صرف یہی نہیں ہوتا کہ جان و مال کی حفاظت کی جائے۔ یہ تو دُنیا کی عارضی چیزیں ہیں۔ کبھی
اس طرح بھی نصرت ہوتی ہے لیکن سب سے بڑی مدد یہ تھی کہ اللہ نے اُس مقصد عظیم کی نصرت
اور حفاظت فرمائی جس کے لئے وہ اس دنیا میں تشریف لائے تھے۔ جو کچھ اُن پر مصیبتیں
تھیں اور ظلم ہوئے تھے وہ تو صرف ایک نشان اور علامت تھے ان کی شان اور قوت عمل
کی تاکہ ان کا حقیقی مقام ظاہر ہو جائے اور دوسروں کے لئے اُس کی زندگی صبر و تحمل اور
عزمِ محکم کا ایک نمونہ اور مثال بن سکے۔ اگر وہ ظلم نہ سہتے تو پھر مظلوم اور دکھیاری دنیا اور
ستم رسیدہ مخلوقات مصیبتوں کے سیلاب اور بربادیوں کے طوفانوں میں کس کی سیرت کو اپنے
لئے چراغ ہدایت اور شمع راہ بناتی اور کس کے صبر و عزم و ضبط کو اپنی زندگی کے لئے نمونۂ
عمل بنا سکتی۔ انبیاء علیہم السلام کی حیاتِ طیبہ نسلِ انسانی کے لئے ہر طرح ذریعہ ہدایت تھی۔
جہاں وہ زبان سے ہدایت فرماتے تھے ساتھ ہی ان کا عمل اور اُن کی سیرت پاک اور ساری
زندگی مخلوق خدا کے لئے سرچشمۂ رہبری تھی۔ اُن کی یہ مظلومیت اور ظاہری شکست ان کی
ابدی فتح تھی اور ان پر ظلم و جور کرنے والوں کی ظاہری فتح ان کی دائمی شکست تھی اسطرح
اس شکست کو اللہ نے اُن کے لئے ابدی فتح میں تبدیل کر دیا اور آج وہ مظلوم اور
بے گناہ خاصان خدا جن کے مقدس خون سے ہمیشہ زمین رنگین ہوتی رہی اور جن کی
تسبیح و تہلیل کی آوازوں سے قید خانوں کی تنگ و تاریک فضائیں گونجتی رہیں، انسانی نسل اور
اولاد آدم کے دل و دماغ پر بادشاہت کر رہے ہیں اور سارے عالم سے خراج تحسین حاصل
کر رہے ہیں۔ ظالموں پر ساری خدائی ہمیشہ لعنت کرتی رہے گی اور کل جہاں کی ذلت و رسوائی

اُن کے نصیب میں ہو گی ۔ مظلوم ہونا کوئی عیب کی بات نہیں جبکہ انسان حق پر ہو مگر ہاں ظالم ہونا عیب ہے کچھ لمحوں کے لئے چاہے یہ عیب ظاہر نہ ہو لیکن زمانہ کی چند ہی کروٹیں بتا دیتی ہیں کہ ظلم کو دنیا کس نگاہ سے دیکھتی ہے ۔ ظالم کو وقتی سکون، عارضی مسرت اور ناپائیدار فتح حاصل ہوتی ہے مگر مظلوم کو ابدی سکون اور دائمی فتح ملتی ہے ۔ اُس کی شکست ہی اُس کی فتح ہے ۔ اُس کی مظلومیت ہی اُس کی جیت ہے ۔ اور اُس کی اسیری اور قید و بند ہی اُس کی آزادی کی بنیاد ہے ۔ اُس کے گلے پر چلنے والے خنجر کی دھار میں اُس کی فتح کا ستارہ چمکتا ہے اُس کے پیروں کی بیڑیوں کی جھنکار اُس کے لئے فتح و کامرانی کا نغمہ ہے اور اُس کے خون کی بوندوں میں انسانی ضمیر کی آزادی کا راز پوشیدہ ہے جس کو دنیا فتح کہتی ہے وہ غلامی اور شکست ہے اور جسے مظلوم کی شکست سمجھا جاتا ہے وہ اُس کی ابدی فتح و ظفر کا نشان ہے ۔ اس لئے یہ خدا کی مدد ہے اپنے مرسلین اور عباد صالحین کے لئے کہ اُس نے اُن پر ظلم کرنے والوں کے مقابلہ میں انکو دائمی فتح عطا فرمائی اور ان کے نام کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سربلندی دی اور ان کے دشمنوں کو ذلّت و تباہی ملتی رہی اس عظیم امداد کے ساتھ ہی ان کے دشمنوں سے ہمیشہ انتقام بھی لیا گیا ۔ کوئی نبی و ولی ایسا نہیں گزرا جسے ایذا پہونچانے والوں سے خدا نے اسی دنیا میں انتقام نہ لیا ہو ۔ عاد و ثمود ۔ اصحاب الرّس ۔ آل فرعون ، اھل مدینؔ اور اُن تمام قوموں سے جنہوں نے رسولوں کو تکلیفیں دین ہمیشہ انتقام لیا گیا اور ان کے نصیب میں عبرتناک تباہی لکھدی گئی ۔ خود حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حالات زندگی دنیا والوں کے سامنے ہیں کہ خدا نے اسی وعدے کے مطابق آپ کی اور آپ کے اہلبیت اطہار علیہم السلام اور اصحاب اخیار رضوان اللہ علیہم کی ہمیشہ نصرت و امداد فرمائی اُن کو قتل کرنے والوں اور اُن کی توہین و تذلیل کرنے والوں سے قدرت نے شدید انتقام لیا ۔ اُن کی وقتی اور ظاہری شکست کو ابدی فتح میں بدل دیا اور ان کی ظاہری موت کو حیاتِ جاوداں کا خلعت پہنا دیا اور اُن کے کلمہ کو بلند کیا اور اُن کے دین کو بقا عطا کی ۔ وہ وقت کتنا نازک تھا جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے مکہ سے ہجرت فرمائی تھی مگر آخر میں کفار و مشرکین کی سازشیں پاش پاش ہو گئیں ان کی عظمت و اقتدار کے ستون گر گئے اور جو پیغمبر خدا کی توہین و تذلیل کے درپے تھے وہ دائمی رسوائی میں

مبتلا ہوگئے اور اُن کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ اور جس شہر سے آپ رات کے اندھیرے میں پا پیادہ
نکلے تھے وہاں کچھ ہی زمانہ کے بعد فاتحانہ داخل ہوئے اور آپ نے کفر و شرک کی نجاست سے اس زمین
کو ہمیشہ کے لئے پاک و صاف کر دیا۔ اہلبیتؑ اطہار اور اصحابؓ کرام کی قربانیاں رائیگاں نہ گئیں
بلکہ خدا نے دینِ محمدیؐ کو روئے زمین کے چپہ چپہ پر پہنچا دیا اور نعرۂ توحید اور کلمۂ لا الٰہ الا اللہ
سے بحر و بر اور عالم کی فضاؤں کو بھر دیا۔ یہ دعوتِ محمدیہ اُن کانوں تک بھی پہونچی جو بہرے تھے
اُن دلوں تک بھی گئی جن پر کفر و نفاق کے پہرے تھے اور اُن آنکھوں تک بھی آئی جو بے نور
اندھی تھیں اور آجتک یتیم عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پھیلا ہوا دین غالب و منصور ہے
آجتک دنیا کلامِ خدا کو محو نہ کر سکی اور قیامت تک اسی طرح یہ دین اور یہ کتابِ خدا مظفر و منصور
رہے گی۔ جو کبھی اس کے منہ پر آئے گا وہ منہ دکھانے کے قابل نہ رہے گا اور جو اس کی
عزت و حرمت کھونے کی کوشش کرے گا اُس کو اپنا سب کچھ کھو دینا پڑے گا۔

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُھُمْ وہ دن جب ظلم کرنے والوں کی
معذرت اُنہیں کچھ بھی فائدہ نہ دے گی۔ وَلَھُمُ اللَّعْنَةُ وَلَھُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ
اور اُن کے لئے لعنت ہو گی اور اُس گھر کی خرابی ہو گی۔ لعنت کہتے ہیں۔ رحمتِ خدا
سے دوری کو یعنی وہ خدا کی رحمت سے دور پھینک دیتے جاہیں گے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَی
الْھُدٰی وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْکِتٰبَ۔ اور ہم موسیٰ کو ہدایت دے چکے ہیں
یعنی ہم نے انہیں معجزے دیئے اور پچھلی شریعتوں کا علم دیا اور صحیفے عطا کئے اور توراۃ دی
وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ الْکِتٰبَ۔ اور بنی اسرائیل کو توراۃ کا وارث بنایا جس کتاب
کے یہ وارث ہوئے وہ لوگوں کے لئے ہدایت و عبرت تھی۔

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ (تو اے میرے نبی) تم صبر کرو اور تسلّی رکھو۔
جس طرح تمام انبیاءؑ و مرسلین کی نصرت کی گئی تمہاری بھی مدد ہوگی بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے۔
وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ اور اپنے ذنب پر استغفار کرو یعنی اپنی امت کے گناہوں کے لئے
استغفار کرتے رہو اور اپنے اس عمل سے دوسروں کو بھی استغفار کا طریقہ بتاؤ اور یہ بتا دو کہ
جب ہم خطا اور گناہ سے معصوم ہو کر استغفار سے غفلت نہیں کرتے تو تم بھی خدا کو کسی وقت بھی

نہ بھولو۔ تکبر و غرور نہ کرو اور آخرت کو یاد رکھو۔ جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی کتاب عقل والوں کی ہدایت کے لیے آئی تھی اسی طرح قرآن کریم بھی تقویٰ شعار اور خدا سے ڈرنے والوں کی رہبری کا سرچشمہ اور رشد و ہدایت کا خزانہ ہے اور جس طرح خدا نے بنی اسرائیل کو عزت عطا فرمائی تھی اسی طرح بلکہ اس سے بھی بہت بڑھ کر امت محمدی کو ہمیشہ کے لیے اس نے خیر الامم بنا دیا۔

وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ۔ صبح کے تڑکے اور شام کے دھندلکے میں خصوصیت کیساتھ خدا کی تسبیح و تہلیل اور اس کی حمد و ثنا کیا کرو۔ بعض مفسروں نے "عشی" اور "ابکار" کے متعلق اور باتیں بھی کہی ہیں اور اس تسبیح سے مراد پانچوں وقت کی نمازیں لی ہیں۔ اُن کے نزدیک عشی کا وقت زوال سے شروع ہو کر رات تک رہتا ہے اسلئے اس میں چار نمازیں ظہر و عصر، مغرب و عشاء داخل ہوں گی اور ابکار اُن کے خیال میں فجر سے زوال تک کے وقت کو کہتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ اس صبح و شام کی تسبیح سے مراد صبح کی دو رکعتیں اور شام کی دو رکعتیں ہیں۔ جو نماز ہائے پنجگانہ کے حکم سے پیشتر فرض قرار دی گئی تھیں۔

(درس ۱۱۴)

إِنَّ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۙ إِنْ فِي صُدُورِهِمْ إِلَّا كِبْرٌ مَا هُمْ بِبَالِغِيهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ ۖ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ ○ لَخَلْقُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ أَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ○ وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَىٰ وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ ۚ قَلِيلًا مَا تَتَذَكَّرُونَ ○ إِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ لَا رَيْبَ فِيهَا وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُونَ ○ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ○

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۱ کی آخری آیات ۔ سورۃ المومن)

جو لوگ بلا کسی سند کے جو اُن کے پاس آئی ہو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں ان کے دلوں میں بڑائی کے سوا کچھ نہیں کہ وہ اُس تک کبھی پہونچنے والے نہیں ہیں تو تم بس خدا کی پناہ مانگتے رہو بیشک وہی ہے سب کچھ سُننے والا اور سب کچھ دیکھنے والا یقیناً آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا آدمیوں کے پیدا کرنے سے زیادہ بڑا کام ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

آنکھ والا اور نابینا اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے اچھے کام کئے اور بدکار برابر نہیں ہوتے۔ تم لوگ بہت کم غور کرتے ہو۔ قیامت تو ضرور آنے والی ہے اس میں کسی طرح کا شک نہیں مگر اکثر لوگ ایمان نہیں رکھتے اور تمہارے پروردگار نے فرمادیا ہے کہ تم مجھکو پکارو میں تمہاری دعا کو قبول کرونگا بیشک جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ عنقریب ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

(ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے:-

جَدَل کے معنی ہیں جھگڑے کی شدّت یا شدید جھگڑالو ہونا اسی سے یُجَادِلُوْنَ بنا ہے جس کا مصدر جِدَال اور مُجَادَلۃ ہے یعنی کسی سے جھگڑا کرنا۔ سُلطان سے مراد دلیل، سند اور حجّت ہے۔ صُدُوْر۔ صدر کی جمع ہے جس کے لفظی معنی سینہ کے ہیں مگر یہاں صدور سے مراد قلوب ہیں۔ کِبْر سے مُراد ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، تکبّر و غرور کرنا۔ اسکے معنی خود بڑائی کے بھی آتے ہیں۔ یَسْتَوِیْ کا مصدر استواء ہے۔ اس کے معنی یہاں یکسانیت اور برابری کے ہیں۔ صالحات۔ صالحۃ کی جمع ہے جیسے کثیر نعمت اور بڑی نیکی اور بھلائی کے لئے بولتے ہیں۔ یہاں نیکیاں مُراد ہیں۔ المُسِیْئُ۔ اِسَاءَۃ سے بنا ہے۔ اس سے مراد بدکار اور بداعمال شخص ہے۔ سُوْء برائی اور خرابی کو کہتے ہیں۔ تَذَکَّر کے معنی ہیں سوچنا، غور کرنا اور دھیان دینا۔ اَسْتَجِبْ کا مصدر اِسْتِجَابَۃ ہے جو حاجت پوری کرنے اور دعا قبول کرنے کے لئے بولا جاتا ہے۔ یَسْتَکْبِرُوْنَ۔ اِسْتِکْبَار سے بنایا گیا ہے۔

جب یہ متعدی استعمال نہ ہو تو تکابُر اور تکبّر کی طرح اس کو مغرور ہونے اور اپنے آپ کو بڑا جاننے کے لئے بولتے ہیں۔ "عن عبادتی" میں عبادت سے مراد دعا ہے۔ دَاخِرِیْن "دَخر" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ذلت و خواری کے ہیں۔ سمیع صفت ہے اور اسے سَمْعٌ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ہیں سننا اور جیسے خود سماعت اور آلہ سماعت یعنی کان کو بھی کہتے ہیں۔ سَمْعٌ منظور اور قبول کرنے کو بھی کہتے ہیں جیسے ایک دعا کے یہ الفاظ ہیں: اَعُوْذُ بِكَ مِنْ دُعَاءٍ لَا یُسْمَعُ میں تیری پناہ مانگتا ہوں، ایسی دعا سے جو قبول نہ کی جائے۔

سِمْعٌ اور سُمْعَۃٌ اچھی شہرت کے لئے بولتے ہیں لیکن سُمْعَۃٌ کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ اپنے نیک کاموں کو خدا کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو سُنانے کے لئے کیا جائے۔ جو ریاء کی طرح شرک خفی ہے۔ سَمِیْعٌ مُبالغہ کا بھی صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بہت زیادہ سُننے والا اور یہ خدا کے اسمائے مُبارکہ میں سے ایک اسم بھی ہے جس سے مراد یہ ہے کہ اللہ بغیر کسی واسطہ اور ذریعہ کے سب کچھ سُنتا ہے۔ ہمیں سُننے کے لئے آلات اور وسیلوں کی حاجت ہوتی ہے مگر اُسے کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ اسی طرح بَصِیر بھی صفت ہے اور کبھی مبالغہ کے لئے آتا ہے یہ بھی اسمائے الٰہیہ میں سے ایک اسم ہے۔ "بَصَر" نگاہ کو بھی کہتے ہیں اور خود آنکھ کو بھی اور مصدر کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور علم کے لئے بھی۔ "بَصَارَۃٌ" دیکھنے کو اور بصیرۃٌ عقل، ذکاوت اور دانائی کو کہتے ہیں اللہ کے بصیر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خالقِ بصارت ہے اور بغیر وسیلہ کے ہر چیز کو دیکھتا ہے اور جانتا ہے۔

قرآن کریم کی اصطلاح میں خلق اور امر میں فرق ہے۔ خلق رفتہ رفتہ بنانے کا نام ہے اور امر فوراً پیدا کرنے کو کہتے ہیں۔ جہاں خلق کا ذکر ہے وہاں اس طرح ارشاد ہوا ہے، اِنَّ ربکم اللہ الذی خلق السّمٰوات والارض فی ستۃ ایام تمہارا پروردگار وہ ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن کی مدت میں بنایا۔ اسی طرح انسان کی تخلیق بھی درجہ بدرجہ ہوئی لیکن "امر" میں دیر نہیں ہوتی جیسا کہ اس آیت میں خدا نے ...

"اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَآ اَرَدْنٰہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ" ہمارا قول تو یہ ہے کہ
جب ہم کسی بات کا ارادہ کرتے ہیں تو کہتے ہیں ہو جا اور وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ (النحل)

ان آیاتِ کریمہ کی ابتدا گھمنڈ، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید کی مذمت سے ہوئی ہے اور
یہ ارشاد ہوتا ہے کہ: اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْ اٰیٰتِ اللّٰہِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰھُمْ
جو لوگ خدا کی آیتوں اور نشانیوں میں جھگڑے کرتے ہیں۔ باطل پر جمے رہتے ہیں اور
اس سے حق کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اپنی کٹھ حجتی، تعصب اور کج بحثی سے مضبوط
دلیلوں کا انکار کرتے ہیں اور ان میں شبہے پیدا کر کے ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں
اور یہ سب کچھ بغیر کسی سند کے کرتے ہیں جو ان کے پاس خدا کی طرف سے آئی ہو اور جس کی
بنیاد پر وہ اس قسم کے جھگڑے نکالتے ہوں۔ اِنْ فِیْ صُدُوْرِھِمْ اِلَّا کِبْرٌ مَّا ھُمْ بِبَالِغِیْہِ
اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دلوں میں بجز غرور و تکبر اور کچھ نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بڑائی کی فکر
میں پڑے رہتے ہیں۔ مگر وہ انہیں حاصل نہیں ہو سکتی، ان کے مطلوب باطل اور
اور ان کے مقاصد لا حاصل ہیں فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ
تو بس تم خدا کی پناہ طلب کرتے رہو وہی سب کچھ سننے والا اور بڑا دیکھنے اور
جاننے والا ہے یعنی ان کے [illegible] شرارت سے یا جو کچھ ان کا حال ہے اس سے خدا
پناہ مانگو۔ اسلام کی تو بنیادی تعلیم ہی یہ ہے کہ اللہ ہر بات کا علم رکھتا ہے اور کوئی چھوٹی
یا بڑی چیز اس سے پوشیدہ نہیں اور اس کی قدرت و علم سب پر محیط ہے اس لئے جب
کسی کو اس کا کامل یقین اور اعتقاد پیدا ہو جائے کہ اس کا ہر عمل خدا کے علم میں ہے
اور بندہ جو گناہ یا ثواب کا کام کرتا ہے وہ پروردگار عالم سے پوشیدہ نہیں رہ سکتا تو پھر کون
ہے جو گناہ کرنے کی جرأت کرے گا۔ یہ جو کچھ بھی ظلم و جور، قتل و غارت، جھوٹ بولنا،
رشوتیں لینا یا دینا، چوری ملاوٹ، خیانت اور دوسرے جرم اور گناہ کئے جاتے ہیں محض
اس وجہ سے کہ ان گناہوں کا ارتکاب کرنے والوں کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہوتا اور
خوف اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ انہیں اس کے سمیع و بصیر اور علیم و خبیر ہونے کا
یقین اور اس پر سچا ایمان نہیں ہوتا ورنہ وہ کبھی اس کی مرضی اور حکم کے خلاف نہ کرتے۔

ان کو کسی بیرونی نگرانی کی ضرورت نہ رہتی بلکہ اُن کے ضمیر میں خود احساس فرض کی قوت آجاتی جو اُن کی ہوس پرستیوں اور خود غرضی پر پہرے لگا دیتی۔ یہ سب کچھ معرفت کی کمی ہے۔ حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

اوّل الدِّین معرفتہ وکمالُ معرفتہ التصدیق بہ۔ دین کی بنیاد یہ ہے کہ خدا کو پہچانا جائے اور اُس کی معرفت کا کمال یہ ہے کہ اُس کی تصدیق کی جائے۔ اس لئے سچے مسلمان کی شان یہ ہونا چاہیئے کہ اس کا ہر قول اور ہر عمل اُس کی گواہی دے کہ وہ ایک حیّ وقیوّم اور سمیع وبصیر اللہ پر ایمان ویقین رکھتا ہے اور جو ایسا ہوگا وہ کبھی گناہ کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کبھی خیانت نہیں کرسکتا کبھی ظلم نہیں کرسکتا۔ بدکاریوں میں بتلا نہیں ہوسکتا، فرائض میں کوتاہی نہیں کرسکتا۔ یہ تمام گناہ اور عمل کی کمزوریاں اس لئے ہوتی ہیں کہ ایمان اور معرفت میں کمی ہوتی ہے۔

یہی معرفت اطاعتِ خدا کی بنیاد ہے۔ یہی تقویٰ کی روح ہے اور یہی ایمان کی سب سے بڑی اصل ہے جتنی معرفتِ خدا کامل ہوتی جائے گی قوّتِ عمل میں شدّت پیدا ہوگی اور ایمان میں تہذیبی ہوگی۔ اطاعتِ حق کی طرف طبیعت مائل ہوگی اور گناہ سے نفرت پیدا ہوگی۔

قرآن کریم نے خدائے واحد کے وجود اور اُس کے علیم وخبیر اور سمیع وبصیر ہونے کی جو تعلیم دی ہے اس میں بڑی اہمیت ہے اور جہاں یہ ناقابل انکار حقیقت ہے اس کے ساتھ ہی انسان کے کردار اور اُس کے ضمیر کی اصلاح کا اس نظریہ اور اس اعتقاد سے بہتر کوئی دوسرا علاج ممکن نہیں ہوسکتا۔ دُنیا کی کوئی طاقت، کوئی مادّی قوت اور بڑی سے بڑی سلطنت انسانی ضمیر اور اُس کے خیالات پر کوئی قابو نہیں رکھتی، دوست کے پہلو میں بیٹھکر اُس کے قتل کی تدبیریں ہوسکتی ہیں اور اُس کو خبر نہیں ہوتی، حاکم کے سامنے جرائم کے تخیلات اپنا کام کرتے ہیں اور وہ بے خبر ہوتا ہے اس لئے کہ انسان باطن کا علم نہیں رکھتا۔ دنیاوی طاقتوں اور حکومتوں کے وسائل صرف ظاہری جرموں کی پکڑ کرسکتے ہیں۔ دل کی گہرائیوں میں نہیں اُتر سکتے ہیں۔ ہاں ان گہرائیوں پر قابو اور محاسبہ صرف ایک ذریعہ سے ممکن ہے اور وہ خدائے علیم وخبیر پر ایمان ہے جتنا اُس کے حاضر وناظر ہونے پر ایمان پختہ ہوگا تو اسی قدر کردار اور عمل کی اصلاح

ہو گی اور پھر تاریکیوں کے پردوں میں بھی اور دل و دماغ کی گہرائیوں میں بھی گمراہیاں اور برائیاں داخل ہونے کی جرأت نہ کر سکیں گی اس لیئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ ہم مذہبی تعلیم اور دینی قدروں کی اہمیت کو ایک لمحہ کے لیئے بھی فراموش نہ کریں اور کردار انسانی کی اصلاح کے اس سب سے بڑے وسیلہ پر پوری توجہ دیں اس لیئے کہ مذہب کی امداد کے بغیر کسی فرد یا معاشرے کی جڑوں اور گہرائیوں سے برائیوں، گناہ اور معصیت کے جراثیم دور نہیں کیئے جا سکتے۔

(درس ۱۱۵)

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ○ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ○ كَذٰلِكَ یُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ یَجْحَدُوْنَ ○ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً وَّصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ۭ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ○ هُوَ الْحَیُّ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ ۭ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ قُلْ اِنِّیْ نُهِیْتُ اَنْ اَعْبُدَ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَمَّا جَآءَنِیَ الْبَیِّنٰتُ مِنْ رَّبِّیْ وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ○ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُوْنُوْا شُیُوْخًا وَمِنْكُمْ مَّنْ یُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ وَلِتَبْلُغُوْٓا اَجَلًا مُّسَمًّى وَّلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ○

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۲ کی ابتدائی اور درمیانی آیات - سورۃ المومن)

ترجمہ - اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لیئے رات بنائی تاکہ تم اس میں آرام کرو اور اسی نے دن کو روشن بنایا بیشک خدا لوگوں پر بڑا ہی فضل و کرم والا ہے لیکن اکثر آدمی شکر نہیں کرتے۔ یہی اللہ تمہارا پروردگار ہے جو ہر چیز کا پیدا کرنیوالا ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں - پھر تم کہاں پھرے جا رہے ہو۔ جو لوگ خدا کی نشانیوں کا انکار کیا کرتے تھے (اسی طرح (حق سے) پھیرے

جاتے رہے۔ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ اور آسمان کو چھت بنایا اور اسی نے تمہاری صورتیں بنائیں اور بہت اچھی بنائیں اور اسی نے تمہیں صاف ستھری چیزیں کھانے کو دیں۔ یہی اللہ تو تمہارا پروردگار ہے۔ تو اللہ بڑا عالیشان اور برکت والا ہے جو سارے جہان کا پرورش کرنے والا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ اس کے سوا کوئی لائق عبادت نہیں تو خالص اعتقاد و اطاعت کیساتھ تم اسے پکارا کرو۔ سب تعریف اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پالنے والا ہے۔

(اے رسول) تم کہدو کہ مجھے اس سے روک دیا گیا ہے کہ میں ان کی عبادت کروں جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو جبکہ میرے پاس خدا کی طرف سے دلیلیں آچکی ہیں اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں سارے جہان کے پروردگار کا تابعِ فرمان رہوں۔ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر نطفہ سے پھر جمے ہوئے خون کے ٹکڑے سے پھر تم کو بچہ بنا کر نکالتا ہے (پھر تمہیں بڑھاتا ہے) تاکہ تم اپنی پوری قوت کو پہنچ جاؤ (پھر اور زندہ رکھتا ہے) تاکہ تم بوڑھے ہو جاؤ اور تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو پہلے ہی مر جاتا ہے)

(وہ تم کو اس وقت تک زندہ رکھتا ہے) کہ تم مقررہ مدت تک پہنچ جاؤ تاکہ تم سوچ سمجھ لو

اب مذکورۂ بالا آیاتِ کریمہ کے بعض مشکل الفاظ کی تشریح کیجاتی ہے۔ جَعَلَ کے معنی ہیں۔ خلق کیا۔ پیدا کیا کبھی جَعَلَ کے معنی ایک چیز کو دوسری حالت میں تبدیل کرنے کے آتے ہیں مگر یہاں پیدا کرنا ہی مراد ہے۔ مُبصِر۔ ابصار سے بنا ہے اور اسم فاعل کا صیغہ ہے یہ لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ دیکھنا یا دکھانا۔ روشن یا واضح ہونا۔ یہاں مبصر سے مراد روشن اور واضح ہے۔ دکھانے والے کے معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ دن دیکھنے کا ذریعہ ہے۔ ایک دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: جَعَلْنَا آيَةَ النَّهَارِ مُبْصِرَةً - ہم نے دن کو جو آیت اور نشانی ہے روشن اور واضح بنایا۔ ایک اور مقام پر یہ لفظ "ناقہ" حضرت صالحؑ کے لئے بھی اسی معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ وَآتَيْنَا ثَمُودَ النَّاقَةَ مُبْصِرَةً - ہم نے قوم ثمود کے لئے اونٹنی کو ایک روشن معجزہ اور واضح نشانی بنا کر عطا کیا (یہ اونٹنی ایک پتھر سے نکلی تھی) تُؤْفَكُونَ مضارع مجہول کا صیغہ ہے اور اَفْكٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پھیر دینا جب کہ یہ

متعدی استعمال کیا جائے لیکن اگر لازم ہو یعنی بغیر کسی مفعول کے استعمال کیا گیا ہو تو اس کے معنی جھوٹ بولنے کے ہوں گے۔ اِفْکٌ۔ جھوٹ کو کہتے ہیں۔

تَبَارَکَ اللّٰہُ کے معنی ہیں خدا بابرکت ہے۔ عالیشان ہے اور اس کی رحمت و نعمت کثیر ہے۔ تَبَارَکَ ماضی کا صیغہ ہے۔ یہ برکت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ترقی، زیادتی اور خیر و نیکی۔ اَلدِّیْنُ سے مراد اطاعت و عبادت ہے۔ اُسْلِمُ کا مصدر اسلام ہے جو سِلْم اور سَلْم سے بنا ہے۔ سِلْم کے معنی ہیں صلح، اطاعت یا تابع ہونا۔ سَلَم کو بھی ان معنوں میں بولا جاتا ہے۔ اسلام اور ایمان میں فرق ہے۔ اسلام صرف زبانی اقرار اور ظاہری اطاعت کا نام ہے اور ایمان اِس اقرار ظاہری کے ساتھ تصدیقِ قلبی کا نام ہے۔ اس آیت میں اس فرق کو ظاہر فرمایا گیا ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۔ عرب کے دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم نے ایمان اختیار کیا (اے رسول کہدو) کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان کا تو ابھی تک تمہارے دلوں میں گذر تک نہیں ہوا ہے۔ یعنی تم نے ابھی دل سے تصدیق نہیں کی ہے۔"

لیکن کبھی اسلام بول کر ایمان مُراد لیا جاتا ہے اور مسلم کے لفظ سے مومن ہی مقصود ہوتا ہے۔ جیسے اسی جگہ = وَ اُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۔ سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا ہے کہ اس طرح کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں سارے جہان کے رب کا فرمانبردار رہوں۔ یہاں اسلام سے مُراد ایمان اور اقرار ظاہری کے ساتھ تصدیق قلبی مراد ہے۔

اَشُدَّكُمْ میں اَشُدّ سے مقصود قوت و کمال اور بلوغ کی عمر ہے۔

يُتَوَفّٰى۔ مضارع مجہول کا صیغہ ہے۔ تَوَفِّیْ اس کا مصدر ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کو پورا پورا حاصل کر لینا۔ تَوَفَّاہُ اللّٰہُ کے معنی ہیں خدا نے اُس کی روح کو قبض کر لیا اس لئے خداوند عالم کو مُتَوَفِّیْ کہا جائے گا اور جسے اُس کے حکم سے موت دی جاتی ہے اور اُس کی روح کو واپس لے لیا جاتا ہے اس کو مُتَوَفّٰی کہتے ہیں۔ مُسَمًّى سے یہاں مراد ہے معین و مقرر۔

ان آیات کریمہ کی ابتدا نعمتوں کے تذکرہ سے ہوئی ہے اور خدا نے اپنی بے حساب نعمتوں میں سے چند کو یاد دلایا ہے جن میں سے ایک بڑی نعمت (اور اُس کی تو ہر نعمت بڑی ہے) رات ہے جس کو اُس نے اپنی مخلوق کے آرام و راحت کے لئے خلق فرمایا ہے تاکہ دن بھر کے تھکے مارے

اُس میں سکون حاصل کر سکیں۔ اگر یہ نعمت نہ ہوتی تو ساری دُنیا تھک کر ہلاک ہو جاتی اور پھر خود دن بھی تو اُس کی عظیم نعمت ہے۔ جو ہزاروں فائدوں اور رحمتوں کا خزانہ ہے۔ ہمارے قابو میں نہ تو دن ہے اور نہ رات ہی ہے۔ نہ ہم چاند کی جگہ سورج لا سکتے ہیں اور نہ دن کی روشنی کے مقام پر رات کی تاریکی پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ سب خدا کے اختیار میں ہے۔ نہ ہم اس نظام کو بدل سکتے ہیں اور نہ اس میں کوئی خلل ڈال سکتے ہیں۔ ٹھیک اپنے وقت پر سورج کی کرنیں پھوٹتی ہیں اور پھر شام کو مقرر وقت پر نگاہوں سے چھپ جاتی ہیں اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا چھا جاتا ہے اور تھوڑی ہی دیر میں بڑے بڑے گنجان شہروں اور گھنی آبادیوں کے وہ مقامات جہاں ہر طرف کام کاج کی چہل پہل تھی اور وہ سڑکیں اور بازار میں جہاں کھوے سے کھوا چھلتا تھا اور جہاں کے شور و ہنگامے سے کانوں کے پردے پھٹا کرتے تھے۔ کچھ ایسا سناٹا چھا جاتا ہے کہ جیسے کبھی ان راستوں پر کوئی چلا ہی نہ تھا، کبھی ان بازاروں میں کوئی آیا ہی نہ تھا۔ ہر جگہ اُداسی ہے۔ ہر طرف خاموشی ہے۔ ساری فضا سُنسان اور ہر طرف ہُو کا عالم ہے یہ آبادیاں کچھ دیر کے لئے رات کے سناٹے میں قبرستان سی معلوم ہونے لگتی ہیں یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان کو کسی بے رحم دشمن فوج نے لوٹ لیا ہے۔ اور سورج کے نکلتے ہی ان میں پھر زندگی کی چہل پہل پیدا ہو جاتی ہے۔

یہ سب اللہ کی نشانیاں ہیں اور اس نظام میں ردّ و بدل انسان کی قوت و طاقت سے باہر ہے۔ اللہ نے انسان کے رہنے کے لئے اور اس کے فائدہ کے لئے زمین بنائی اور اُسے اپنی بے حساب نعمتوں سے بھر دیا وہ کونسا فائدہ ہے جو انسان اس زمین سے حاصل نہیں کرتا۔ اسی زمین میں لاتعداد میوے ہیں، لاکھوں رنگ کے پھول ہیں۔ بے حساب غذائیں ہیں اور اس کے ذرّہ ذرّہ میں قدرت کے خزانے پوشیدہ ہیں۔ مگر ان تمام نعمتوں کے بعد بھی بہت سے لوگ اُس کا شکر نہیں ادا کرتے اور اگر کوئی اس کا شکر ادا بھی کرے تو شکر سے کہہ دیا جائے کہ اللہ ہم تیرا شکر کرتے ہیں مگر ساتھ ہی اُس کے حکم کی خلاف ورزی بھی کریں اور اُس کی نافرمانی کے مرتکب ہوں۔ اُس کا شکر تو یہ ہے کہ ہم اُس کے حکم پر چلیں اس کی نعمتوں کا غلط استعمال اور اُس میں آمیزش نہ کریں۔ دھو دینے کی کوشش اور انہیں بدلنے کی سعی نہ کریں اور بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا کا مصداق نہ بنیں۔

ایسے انسان جو خدا کی نعمتوں میں آمیزش کرتے ہیں اور ان کو بدل دیتے ہیں۔ یقیناً ان سے

وہ جانور افضل ہیں جو خدا کی امانت میں کبھی خیانت نہیں کرتے اور جو نعمت اللہ نے انہیں عطا
کی ہے وہ بغیر کسی دھوکے اور فریب دہی کے اُس کی مخلوق کے سپرد کر دیتے ہیں۔ چوپائے دودھ
دیتے ہیں تو خالص ان کے دودھ سے گھی نکلتا ہے تو بے میل، کیڑے ریشم نکالتے ہیں تو
بغیر کسی آمیزش کے، مکھیاں شہد تیار کرتی ہیں تو خالص۔ بھیڑیں اور بکریاں اُون اتارتی ہیں تو
اصلی۔ انسان ان چیزوں میں دھوکا دیتا ہے جانور دھوکا نہیں دیتا۔ انسان خیانت کرتا ہے
جانور نہیں کرتا۔ انسان خدا کی نعمت کو بدلتا ہے جانور نہیں بدلتا۔ اس لئے ایسا انسان یقیناً
جانور سے بھی بدتر ہے اور مجرم ہے اور ساتھ ہی اُس کا یہ صرف ایک ہی جرم تو نہیں ہے بلکہ ایک
وقت میں وہ بہت سے گناہوں اور جرموں کا مرتکب ہوتا ہے۔ اُس نے یہ گناہ کیا کہ اللہ کی
پیدا کی ہوئی اصلی اور خالص چیز کو ملاوٹ سے خراب کر دیا اور اس کی اصلی خوبی اور حسن کو ضائع
کر دیا اُسے یہ بھی گناہ کیا کہ اپنے ایک انسانی بھائی کو دھوکا دیا اور اصلی چیز کے دام لے کر نقلی اور
ملاوٹ کا مال دیا۔ اسنے اُس جانور کا بھی جرم کیا کہ اُس بے زبان کی طرف ایسی چیز کی نسبت دی جو
اُس کی نہ تھی اور خیانت کی اور اُس کی بے زبانی سے ناجائز فائدہ حاصل کیا۔ اشیاء میں میل
کرنے سے جو نقصانات انسانوں اور دوسرے جانداروں کی صحت و تندرستی کو ہوتے ہیں اُن سب کا
عذاب اُس شخص پر ہوگا جو ان چیزوں میں آمیزش کرتا ہے اور جسقدر جانیں ضائع ہوں گی اور
مخلوقِ خدا کو تکلیف پہونچے گی، ان سب کی ذمہ داری اسی شخص کے سر ہوگی پھر اس دھوکے اور
فریب سے حاصل کی ہوئی دولت کا صرف کرنا بھی حرام ہے اور جو جو کام اس حرام کمائی سے کئے جائیں گے
وہ سب گناہ اور معصیت میں داخل ہوں گے اور چند ٹکوں کی حرص اور لالچ میں ایسے انسان
کی دُنیا و آخرت دونوں تباہ ہو جائیں گی۔ انسان کی بھلائی صرف اسی میں ہے کہ وہ احکام خداوندی
پر عمل کرے، اپنے حقیقی مالک اور پالنے والے کو پہچانے، اس کی نافرمانی نہ کرے اور اس کی
نعمتوں سے اُسکی مرضی کے مطابق فائدہ اٹھائے اور اپنے اصلی حاکم اور خالق کے مقرر کئے ہوئے
حدود سے کبھی آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرے۔

ان آیات کے آخر میں خدا نے انسان کی خلقت کا ذکر فرمایا ہے اور اس خلقت کے درجے اور کیفیتیں
بتائی ہیں۔ لاکھوں کیفیتوں اور ہزاروں شکلوں کی باہم تبدیلیوں کے بعد آخر وہ زمانہ آتا ہے جب یہ
عدم کا مسافر (انسان) ظاہر ہوتا ہے اس سے پیشتر کس نے اس کی تربیت کی کس نے اس کو حفاظت

کے ساتھ ایک منزل سے دوسری منزل تک پہونچایا یہ کچھ نہ تھا خدا نے اسے زندگی کی نعمت دی۔
سوچنے سمجھنے کے لیے عقل دی چلنے کے لیے پیر اور دیکھنے کے لیے آنکھیں سننے کے لیے کان اور
بولنے کے لیے زبان عطا کی۔ یہ پیدا ہونے والا کتنا بے بس تھا۔ نہ تو صورتیں اور شکلیں اختیار
کرنے میں اس کا کوئی قابو اور اختیار تھا اور نہ کوئی پسند تھی اور نہ انہیں ٹھکرا دینے کی کوئی طاقت
جو کچھ اللہ نے عطا کیا وہ سب اسے لینا تھا اور لیا اس کا اپنا کوئی اختیار ہی نہ تھا اور نہ کوئی سمجھ
اور عقل تھی پھر جب دنیا میں آیا اس وقت بھی عجب بے بسی تھی نہ ہاتھ پیروں پر اختیار نہ آنکھوں پر
قابو نہ دل پر حکومت نہ زبان پر قبضہ پیر ہیں مگر چل نہیں سکتا زبان ہے مگر بول نہیں سکتا۔ آتو گیا
دُنیا میں مگر دوسروں کے بس میں ہے نہ بیماری کی خبر نہ صحت کی پروا نہ دشمن کی پہچان نہ دوست کی
شناخت مسافر ہے مگر بغیر ارادہ کے چل رہا ہے اور بغیر منزل کی شناخت کے منزل کی طرف گذر رہا ہے
اس بے خبری کے عالم میں وہ کون تھا جس نے خبر گیری کی اس بے بسی کی حالت میں وہ کون تھا
جس نے ہر ضرورت کو مہیا کیا اور خطرہ سے بچایا وہ وہی رحیم و رحمان اور حی و قیوم اللہ ہے جس نے
انسان کو پیدا کیا ہے مگر اس کے بعد بھی وہ اپنے خالق و مالک کو نہیں پہچانتا اُس کا شکر نہیں
ادا کرتا، اُس کی دی ہوئی نعمتوں کو بدلتا ہے۔ اُس کی اطاعت نہیں کرتا اُس کی زمین میں فساد
پھیلاتا ہے اُس کی مخلوق پر ظلم کرتا ہے اور اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت اور اُس کے
گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔ یقیناً ایسے ہی لوگ عذاب خداوندی کے مستحق ہیں۔

درس ١١٦

هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝
أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي آيَاتِ اللَّهِ أَنَّىٰ يُصْرَفُونَ ۝ الَّذِينَ
كَذَّبُوا بِالْكِتَابِ وَبِمَا أَرْسَلْنَا بِهِ رُسُلَنَا ۖ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ۝
إِذِ الْأَغْلَالُ فِي أَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلَاسِلُ يُسْحَبُونَ ۝ فِي الْحَمِيمِ ثُمَّ فِي
النَّارِ يُسْجَرُونَ ۝ ثُمَّ قِيلَ لَهُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ تُشْرِكُونَ ۝ مِن
دُونِ اللَّهِ ۖ قَالُوا ضَلُّوا عَنَّا بَل لَّمْ نَكُن نَّدْعُو مِن قَبْلُ شَيْئًا ۚ
كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ الْكَافِرِينَ ۝ ذَٰلِكُم بِمَا كُنتُمْ تَفْرَحُونَ فِي
الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنتُمْ تَمْرَحُونَ ۝ ادْخُلُوا أَبْوَابَ

جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ ۝

(پارہ ۲۴ رکوع ۱۲ کی آخری اور رکوع ۱۳ کی ابتدائی اور درمیانی آیات سورۃ المومن)

وہی ہے جو جِلاتا ہے اور مار ڈالتا ہے پھر وہ جب کسی کام کا کرنا مقرر فرماتا ہے تو بس اُس کے لئے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

(اے رسول) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو خدا کی آیتوں میں جھگڑے نکالتے ہیں وہ کہاں پھیر دئے جاتے ہیں۔ جن لوگوں نے کتاب (خدا) کو جھٹلایا اور اُس چیز کو بھی جسے ہم نے اپنے رسولوں کے ساتھ بھیجا تو انھیں عنقریب حقیقت معلوم ہو جائے گی جبکہ اُن کی گردنوں میں لوہے کے طوق ہوں گے اور زنجیریں ہوں گی۔ وہ کھولتے ہوئے پانی میں گھسیٹے جائیں گے پھر آگ میں جھونک دئے جائیں گے پھر اُن سے کہا جائے گا کہ خدا کے سوا جن کو تم اُس کا شریک بناتے تھے وہ کہاں ہیں۔ وہ کہیں گے کہ وہ تو سب ہم سے غائب ہو گئے بلکہ (بات تو یہ ہے) کہ ہم پہلے ہی سے (خدا کے سوا) کسی اور کی پرستش نہیں کرتے تھے اسی طرح اللہ کافروں کو گمراہی میں پاتا ہے۔ یہ سب اس کے بدلہ میں ہے کہ تم ناحق دنیا میں خوشیاں مناتے تھے اور یہ اس کی سزا ہے کہ تم اترایا کرتے تھے۔ جہنم میں ہمیشہ رہنے کے لئے اُس کے دروازوں میں چلے جاؤ۔ تکبّر و غرور کرنے والوں کا بھی کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔

سورۃ المؤمن کی ان آیات کریمہ کے ترجمہ کے بعد اب ان کے بعض مشکل الفاظ کی تشریح کیجاتی ہے:- یُحیی۔ حیات سے اور یُمیت۔ موت سے بنایا گیا ہے۔ یُحیی کا مصدر اِحیاءٌ۔ زندگی دینا اور یُمیت کا مصدر اِماتۃٌ ہے جس کے معنی ہیں مار ڈالنا۔ "حیات"۔ حرکت اور زندگی کو کہتے ہیں۔ اور موت۔ سکون اور مرجانے کا نام ہے اسی طرح مَحیا اور مَمات میں پہلا ظرف مکان ہے یعنی جائے زندگی اور اسے خود زندگی اور حیات کے لئے بھی بولتے ہیں۔ دوسرا یعنی ممات ظرف زمان ہے یعنی زمانۂ موت اور خود موت کو بھی کہتے ہیں۔ حَیَوَان ہر اُس مخلوق کو کہتے ہیں جس میں زندگی ہو چاہے وہ انسان ہو یا کوئی دوسرا جاندار۔ البتہ انسان کو حَیوانِ ناطق کہا جاتا ہے یعنی عقل اور سمجھ رکھنے والا جاندار۔ موت کے اور بھی معنی ہیں۔ یہ کبھی سکون

کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے ماتت الرِّیحُ ہوا تھم گئی۔ اصل میں زندگی کی جس قدر قسمیں ہیں اُن میں سے ہر ایک کے مقابلہ میں اسی کے لحاظ سے موت کے لفظ کو بولا جاتا ہے۔ جس چیز میں نشو و نما اور پھل پھول دینے اور بڑھنے کی صفت زندگی کی علامت ہوتی ہے اُس کے لئے موت یہ ہے کہ یہ باتیں اُس میں باقی نہ رہیں۔ اللہ فرماتا ہے۔

یُحْیِی الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وہی زمین کو اُس کے مرجانے کے بعد پھر زندگی بخشدیتا ہے۔ عقل کی موت جہالت ہے اور شعور کی موت ناسمجھی ہے خداوند عالم کا ارشاد ہے:

اِنَّکَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰی (اے رسول) تم مُردوں کو اپنی بات نہیں سُنا سکتے یعنی جو لوگ بے عقل ہیں اور ان کا شعور مردہ ہو چکا ہے وہ تمہاری باتوں سے ہدایت نہیں حاصل کرسکتے اور کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔ کبھی خوف اور رنج کے لئے اس لفظ یعنی موت کو بولتے ہیں تو کبھی فقیری، ذلّت اور بڑھاپے کے لئے اور چونکہ موت عقل و شعور زائل ہو جانے کا بھی نام ہے اس لئے جن ہستیوں کا اس ظاہری اور مادّی موت کے بعد بھی شعور فنا نہیں ہوتا بلکہ اور بڑھ جاتا ہے اُن کو زندہ کہا گیا ہے۔ جیسے قرآن کریم کی اس آیت میں:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ

جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کئے گئے انھیں ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے پروردگار کی طرف سے وہ طرح طرح کی روزی پاتے ہیں۔ حقیقت میں موت فنا ہو جانے کا نام نہیں ہے بلکہ ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں تبدیلی کا نام ہے۔ جب یہ پردہ ہٹ جاتا ہے تو اصلی زندگی کا دور شروع ہو جاتا ہے اسی لئے تو صاحبانِ بصیرت اور اصحابِ شعور و ایمان کے لئے ہمیشہ موت ایک پیغام مسرت ہی رہی اور وہ کبھی اس سے نہ ڈرے اور نہ اس سے بھاگے۔ حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے دریافت کیا گیا کہ موت کیا ہے اور اُس کی کیا صفتیں ہیں تو آپ نے فرمایا: ھو للمؤمن کاطیب ریح یشمہ موت تو مومن کے لئے بہترین خوشبو کی طرح ہے جسے وہ سونگھے۔ یہودیوں کی بابت اپنے رسولؐ سے خطاب کرتے ہوئے اللہ کا ارشاد ہے: قُلْ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ هَادُوْۤا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّکُمْ اَوْلِیَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ۔

(اے رسول) کہدو کہ اے یہودیو ! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ صرف تم ہی خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں۔

تو اگر تم سچے ہو تو پھر موت کی تمنا کرو وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ۔ اور وہ لوگ ان اعمال کے سبب جو پہلے کر چکے ہیں کبھی موت کی آرزو نہ کریں گے۔ اس کا مطلب یہ ہو کہ جو خدا کے دوست ہوتے ہیں اور اس کے خالص اور سچے بندے ہیں وہ موت سے نہیں بھاگتے بلکہ اس کی آرزو اور تمنا کرتے ہیں۔ يُصْرَفُوْنَ۔ صرف سے بنایا گیا ہے۔ جس کے معنی ہیں پھیر دینا، پلٹا دینا۔ سوفَ اور سین دونوں آنے والے زمانہ کو ظاہر کرتے ہیں لیکن سین کی نسبت سوفَ میں کچھ تاخیر مراد ہوا کرتی ہے۔ اَغْلَالٌ۔ غُلٌّ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں لوہے کا طوق۔ یہ لفظ پیاس کی شدت کے لئے بھی بولتے ہیں مگر یہاں پر پہلے معنی ہی مراد ہیں۔

سَلَاسِلُ۔ بِسِلْسِلَةٌ کی جمع ہے۔ یہ زنجیر کے لئے بولتے ہیں خواہ وہ لوہے کی ہو یا کسی دوسری چیز کی۔ سِلْسِلَةُ الظَّهْرِ ریڑھ کی ہڈی کو کہتے ہیں۔ يُسْحَبُوْنَ سَحْب سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں زمین پر کسی کو گھسیٹنا۔ حَمِيْمٌ کے معنی ٹھنڈے پانی کے بھی ہیں اور گرم پانی کے بھی اس کے علاوہ اسے دوست اور قریبی رشتہ دار کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ جب یہ دوسرے معنی یعنی دوست یا رشتہ دار کے لئے بولا جائے تو اس کی جمع اَحِمَّاء ہوتی ہے اور اگر اس سے گرم یا ٹھنڈا پانی مراد ہو تو اس کی جمع حَمَائِمُ ہو گی۔ یہاں گرم کھولتا ہوا پانی مراد ہے جو اہل جہنم کو پلایا جائیگا یا اُن کے جسموں پر ڈالا جائے گا۔ حضرت ابن عباس رضؓ فرماتے ہیں: لَوْ سَقَطَتْ مِنْهُ نُقْطَةٌ عَلٰى جِبَالِ الدُّنْيَا لَاَذَابَتْهَا۔ اگر اس کی ایک بوند بھی دنیا کے پہاڑوں پر گر جائے تو انہیں پگھلا دے۔

يُسْجَرُوْنَ۔ سَجْر سے بنا ہے جس سے مراد یہاں ڈالنا اور بھر دینا۔ جمع غائب کا صیغہ ہے اس کا مصدر ضَلَالٌ اور ضَلَالَةٌ آتا ہے۔ جس کے معنی ہیں گمراہ ہو جانا، دینِ حق اور سیدھے راستے سے ہٹ جانا۔ کبھی یہ ضائع ہونے، تلف ہو جانے اور غائب ہونے کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ ضَلُّوْا عَنَّا کا مطلب

بھی یہی ہے کہ ہمیں گمراہ کرنے والے اب یہاں موجود نہیں ہیں بلکہ وہ کہیں غائب ہو گئے اسی سے یُضِلُّ بنا ہے جس کا مصدر اِضلال ہے۔ اس کے معنی ہیں ضائع اور ہلاک کرنا، باطل کر دینا یا دفن کرنا اور چھپا دینا اور مشہور معنی تو وہی ہیں یعنی گمراہ کر دینا اور سیدھے راستے سے ہٹا دینا لیکن کبھی اس کے معنی ہوتے ہیں کسی کو گمراہی میں پانا۔ کہتے ہیں اَضَلَّ الرَّجُلَ یعنی وَجَدَہٗ ضَالًّا اس نے فلاں شخص کو گمراہ پایا اور ضالٌّ کے معنی بھی ہر موقع کے لحاظ سے جدا ہیں کبھی اسے گمراہ کے لئے بولتے ہیں اور کبھی اس سے مراد کھویا ہوا یا پوشیدہ یا غائب لیا جاتا ہے۔ جن آیات کی ابھی تلاوت کی گئی ہے ان کے اس حصہ کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ الْکٰفِرِیْنَ۔ میں ظاہر ہے کہ اضلال کے مشہور معنی یعنی گمراہ کرنا اور سیدھی راہ سے ہٹانا ہرگز مراد نہیں ہیں کیونکہ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہو سکتا کہ خدا کسی کو گمراہ کرے اور صراطِ مستقیم سے ہٹا دے (العیاذ باللہ من ذٰلک) بلکہ اس کے دوسرے معنی مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ خدا اسی طرح کافروں کو گمراہی میں پاتا ہے کہ وہ آخر میں خدا کی نشانیاں دیکھ دیکھ کر بوکھلا جاتے ہیں اور گھبرا کر حق کا ظاہری اقرار کرنے لگتے ہیں جو ان کے لئے کسی طرح فائدہ بخش نہ ہو گا۔

قرآنِ کریم کا طرزِ بیان دنیاوی کتابوں سے بڑا الگ ہے۔ اس کتابِ مقدس میں ایک ہی لفظ کو طرح طرح سے اور مختلف موقعوں پر استعمال فرمایا گیا ہے اور ہر موقع پر اُسکے مطابق معنی مراد لئے گئے ہیں۔ یہ اس طرح کی کتاب نہیں ہے جیسے دنیا کے لوگ تصنیف کیا کرتے ہیں بلکہ یہ تو اُن وحیوں کا مجموعہ ہے جو اللہ نے اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختلف زمانوں اور مختلف وقتوں میں نازل فرمائی تھیں اور اس میں وہ سورے اور آیتیں جمع ہیں جو حالات اور مواقع کے مطابق پیغمبر اکرم کی ۲۳ سال کی حیاتِ طیبہ اور اُس مبارک دور میں اُترتی رہیں اسی لئے ایک ہی لفظ کے ایک آیت میں کچھ معنی ہیں تو دوسرے مقام پر کچھ اور مراد ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آیات کا صحیح مفہوم و مراد معلوم کرنے کے لئے صرف لغت کی کتاب سے مدد لینا کافی نہیں ہو سکتا بلکہ موقع و محل، کلیات مذہب، مسلمات اسلام

اور عقل کے اٹل فیصلوں کیساتھ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات بھی سامنے رکھنا ضروری ہے۔ اس صورت کے بغیر قرآن مجید کا سمجھنا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں ہے اور کسی لفظ کے محض ظاہری اور مشہور معنی دیکھکر قرآنی آیات کا مفہوم معین کرنا درست نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی کوئی سند بارگاہِ نبوت سے یا اقوال وارشادات اہلبیت اطہار علیہم السلام یا اصحاب کبار رضوان اللہ علیہم سے حاصل نہ کی جائے۔ اسی بنا پر تفسیر بالرائے یعنی اپنے دل سے اور اپنی ذاتی رائے سے تفسیر قرآن کرنا ممنوع ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کی مشہور حدیث ہے وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے :- من قال فی القرآن برأیہ بما لم یعلم فَلْيَتَبَوَّاْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ جو شخص اپنی ذاتی رائے سے تفسیر قرآن کرے اور وہ بات کہے جس کا اسے علم نہ ہو تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنا جہنم میں ٹھکانا بنالے اسی طرح کی اور حدیثیں بھی ہیں جن میں بغیر کسی معتبر سند کے قرآن کی تفسیر کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

(درس ۱۱۷)

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ ○ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ۗ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ○ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَيْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۗ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ ۖ فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ○

(پارہ ۲۴ - رکوع ۱۳ کی آخری اور رکوع ۱۴ کی ابتدائی آیات - (سورۃ المومن)

ترجمہ - تو (اے رسول)، تم صبر کرو۔ بلاشبہ اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ (تو اے رسول) جس عذاب کی ہم انھیں دھمکی دیتے ہیں اگر ہم اس میں سے تم کو کچھ دکھا دیں یا تم ہی

کو وفات دیدیں تو (بالآخر) وہ ہماری ہی طرف پلٹائے جائیں گے۔ اور ہم نے تم سے پیشتر بہت سے پیغمبر بھیجے اُن میں سے کچھ تو ایسے تھے جن کے حالات ہم نے تم سے بیان کردئے اور کچھ ایسے ہیں جن کے واقعات ہم نے تم سے نہیں ذکر کئے اور کسی رسول کا یہ مقدور نہ تھا کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ لاسکے۔ پھر جب اللہ کا حکم آپہونچا تو ٹھیک فیصلہ کردیا گیا اور اُس وقت باطل کی پیروی کرنے والے ہی گھاٹے میں رہے۔

خدا ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے خلق فرمائے تاکہ اُن میں سے بعض پر تم سواری کرو اور اُن میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ اور تمہارے لئے ان میں فائدے ہیں اور تاکہ تم اپنے سینوں میں چھپی ہوئی غرض اور اپنے دلی مقصود تک ان پر سوار ہوکر پہونچ جاؤ اور تم ان چوپایوں پر اور کشتیوں پر سوار کئے جاتے ہو۔ اور وہ تم کو اپنی نشانیاں دکھاتا ہے۔ تو تم خدا کی کون کونسی نشانیوں کا انکار کروگے۔

اِصْبِر۔ صَبْرٌ سے بنا ہے اور امر کا صیغہ ہے یعنی صبر کرو اور برداشت کرو۔ جو امور شریعت اور عقل کے نزدیک دُرست اور مناسب ہوں ان کے اختیار کرنے پر یا جو باتیں نامناسب ہوں ان کے ترک کردینے یا اختیار نہ کرنے پر اپنے نفس کو تیار کرنا اور اس کام میں جو دشواریاں ہوں اور جو تکلیفیں حائل ہوں ان کو برداشت کرنا اور ان پر تحمل کرنا، ضبط و جرأت سے کام لینا، جلدی نہ کرنا یا اپنے اقتدار اور اختیار و قوّت کو فوراً استعمال نہ کرنا "صبر" کہلاتا ہے جبتک یہ تحمل اور برداشت کرنے کی صفت مصائب یا بلاؤں اور تکلیفوں کے مقابلہ میں ظاہر ہوتی ہے تو اسے "صبر" کہا جاتا ہے مگر جب یہ سہار کرنے کی قوت جنگ کے میدان میں دشمن کی تلوار کے سامنے آتی ہے تو اس کا نام شجاعت اور بہادری ہوجاتا ہے لیکن یہ ہے "صبر" ہی کی بدلی ہوئی تصویر۔ قرآن کریم میں خدا نے ان تمام موقعوں کے لئے "صبر" ہی کے لفظ کو استعمال فرمایا ہے۔

وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ۔ نیک لوگ وہ ہیں جو سختی تکلیف اور لڑائی میں صبر کرتے ہیں، اور پھر دوسری جگہ فرمایا ہے۔ وَالصّٰبِرِیْنَ عَلٰی مَآ اَصَابَهُمْ

اور اُن پر جب کوئی مصیبت و بلا آپڑتی ہے تو صبر کرتے ہیں۔ اس طرح رنج، موت، پریشانی، غربت وافلاس، بیماری، لڑائیاں۔ ہر موقع پر تحمل کرنا اور ضبط سے کام لینا اور جرأت و برداشت کا مظاہرہ کرنا "صبر" ہے طاقت و قوت اور اختیار کے باوجود کسی سزا کے مستحق کو سزا دینے میں جلدی نہ کرنا اور اس کی عقوبت میں بے قراری سے کام نہ لینا بھی "صبر" کہلاتا ہے اور صبر کے اسی مفہوم کے لحاظ سے اللہ جل شانہ کے اسماء حسنیٰ میں سے ایک اسم مکرّم "الصّبور" بھی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنے گناہگار بندوں کے عذاب میں جلدی نہیں فرماتا کیونکہ جلدی وہی کرتا ہے جس کو اس کا خطرہ ہو کہ مجرم کہیں اُس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے اور ظاہر ہے کہ اللہ کے قبضۂ قدرت اور اس کے ملک اور حدود سلطنت سے کون نکل سکتا ہے۔ اس لئے وہ مجرموں اور خطا کاروں کے عذاب میں جلدی نہیں فرماتا اور انہیں اس کا پورا موقع عطا کیا جاتا ہے کہ وہ توبہ کر کے سیدھی راہ پر آسکیں اور اپنے حال کی اصلاح کرلیں۔

نَعِدُ کا مصدر وَعْد بھی ہے اور وَعِید بھی۔ پہلے کے معنی اچھائی اور نیکی کرنے کا اقرار اور دوسرے کے معنی دھمکی دینے کے آتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی یعنی عذاب کی دھمکی دینا مراد ہے۔ نَقُصُّ کا مصدر قَصٌّ اور قَصَصٌ ہے اس کے معنی ہیں حکایت کرنا اور بیان کرنا۔ قَصَصٌ اسم بھی ہے یعنی خود بیان اور حکایت کو بھی کہتے ہیں۔ قصص کے ایک معنی قدم بقدم چلنے اور نشاناتِ قدم کی پیروی اور متابعت کرنے بھی آتے ہیں۔ قرآنِ کریم میں ارشاد ہوا ہے:

فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِھِمَا قَصَصًا۔ حضرت موسیٰؑ اور آپ کے وصی حضرت یوشعؑ بن نون کا ذکر ہے کہ وہ دونوں اپنے پیروں کے نشانات پر پلٹ گئے یعنی ٹھیک اُسی راہ پر واپس گئے جدھر سے آئے تھے جہاں پر ان کی بھنی ہوئی مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی تھی۔

قِصّہ۔ حکایت اور سرگذشت کو کہتے ہیں اس کی جمع قِصَص ہے جبکہ قُصّۃ پیشانی کے بالوں کا نام ہے اور اُس کی جمع قُصَص آتی ہے۔ خَسِرَ۔ خُسر سے بنایا گیا ہے جس کے معنی ہیں گھاٹا ہونا، نقصان ہونا اور ہلاک و ضائع ہو جانا۔ خُسران اور خسارہ۔ گھاٹے اور نقصان کو کہتے ہیں۔ مُبطِلُون۔ مُبطِل کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں باطل کرنے والا جیسے کہتے ہیں کہ فلاں عمل۔ نماز یا روزہ کا مُبطِل ہے یعنی اس کے کرنے سے نماز یا روزہ باطل ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مُبطِل خود اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو باطل کی پیروی کرے اور برے اعمال

میں مبتلا ہو۔ یہاں پر ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔ اَنْعام۔ نَعَمٌ کی جمع ہے جس کے معنی "چوپائے اور مویشی" کے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اس لفظ کا استعمال بھیڑ بکری، گائے اور اونٹ کیلئے ہوا کرتا ہے۔ یہاں چوپائے مراد ہیں۔ یہ لفظ یعنی نَعَمٌ اگرچہ اپنے معنی کے اعتبار سے جمع ہے لیکن اس کا کوئی واحد نہیں آتا اور عموماً اس کو مذکر ہی بولا جاتا ہے اور لفظ اَنْعَام کا بھی جو نَعَمٌ کی جمع ہے کبھی مذکر اور کبھی مونث طریقہ پر استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن کریم میں انعام کے لئے ایک مقام پر "مِمَّا فِی بُطُونِہٖ" مذکر کی ضمیر کے ساتھ اور دوسری جگہ "مِمَّا فِی بُطُونِهَا" مونث کی ضمیر کیساتھ استعمال ہوا ہے۔ فُلْكٌ کشتی کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ واحد بھی استعمال کی جاتی ہے اور جمع بھی۔ قرآنِ مجید میں دونوں طرح ہے: اَلْفُلْكُ الْمَشْحُوْنُ۔ بھری ہوئی کشتی اور دوسری جگہ۔ "اَلْفُلْكُ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ" یعنی وہ کشتیاں جو سمندر میں چلتی ہیں۔ "بطونہ" میں ضمیرِ مذکر کی مزید تشریح یہ ہے کہ اس سے مراد "ماذکر فیما قبل" ہے۔

ان آیات کریمہ کی ابتدا صبر کی تعلیم سے ہوئی ہے اور اللہ اپنے رسولؐ کو حکم دے رہا ہے کہ تم صبر کرتے رہو۔ خدا کا وعدہ سچا ہے جو ہو کے رہے گا اور کوئی طاقت اُسے اپنا وعدہ پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔

قرآن کریم نے صبر کی صفت کو بڑی اہمیت دی ہے اور تقریباً ستر مقامات سے زیادہ پر اس کا ذکر فرمایا ہے۔ "صبر" کے تین پہلو ہیں۔ مصائب و شدائد کا مقابلہ کرنا اور ان کو برداشت کرنا دوسرے ان پر بے قراری کا اظہار نہ کرنا تیسرے نفس کی اُن خواہشوں کے خلاف عمل کرنا جو انسان کے لئے کسی طرح بھی نقصان اور ضرر کا سبب بن سکتی ہوں اور عقل و شریعت کے نزدیک مناسب و درست نہ ہوں۔ اس لئے ان باتوں میں صبر کرنا جو مرضی خدا کے خلاف اور عقل و شریعت کے نزدیک ناروا ہوں کسی طرح قابل تعریف نہیں ہو سکتا اسی طرح غیر ارادی طور پر صبر کرنا جیسے کوئی قہار ظالم و جابر کسی کمزور کو اس پر مجبور کر دے کہ وہ مصیبت کی شکایت نہ کرے اور وہ اس ظالم کی دہشت اور خوف کی وجہ سے نہ فریاد میں زبان کو جنبش دے اور نہ آنکھوں سے آنسو بہائے لیکن اگر وہ اس طرح مجبور اور بے بس نہ ہوتا تو ضرور بے قراری کا اظہار کرتا اور نالہ و فریاد کرتا مگر اب خوف ظالم سے مجبوراً خاموش ہے یا اسی طرح کی کوئی اور مجبوری ہو جس سے وہ اپنے رنج و غم اور اضطراب کا اظہار نہ کر سکے تو یہ مجبوری کا صبر بھی لائق ستائش نہیں ہے۔

صبر تو وہی ممدوح اور قابل تعریف ہے جو عقل و شریعت کے حکم کے مطابق ہو۔ رضائے خدا کے حصول کے لئے ہو، جس میں خدا پر بھروسا اور اعتماد کی شان ہو جو غیر ارادی اور کسی قہری سبب کی وجہ سے نہ ہو۔

صبر کے لئے ضروری ہے کہ مصیبت پر بے قراری اور بے چینی کا اظہار نہ کیا جائے۔ اور زبان پر حرفِ شکایت نہ آنے پائے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ بے چینی کا اظہار غیر خدا کے سامنے نہ ہو مگر اللہ کی بارگاہ میں تضرّع و زاری کرنا اور اُس سے مصیبت پر رحم کی درخواست کرنا اور نصرت کی التجا کرنا ہر طرح ممدوح اور قابلِ ستائش ہے۔ اسی کے ساتھ ہی وہ صبر بھی قابل تعریف نہیں جس میں صبر کرنیوالا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور صبر کا مطلب یہ سمجھے کہ مصیبتوں اور تکالیف کا کوئی علاج نہ کیا جائے اور ان کے دفع کرنے کی تدبیر نہ ہو۔ اس طرح کا صبر جو انسان کی فطرت میں ضعف پیدا کرے اور اس کو مایوس بنا دے کسی حال میں بھی ممدوح نہیں ہو سکتا۔ جن لوگوں کو خدا کی طاقت پر بھروسا نہ رہا وہ ہمیشہ شدائد کے سامنے بے بس بنے رہے اور آخر تباہ ہو گئے۔ اس لئے صبر وہی قابلِ تعریف ہے جس میں شدائد و آلام کا دفاع بھی کیا جائے اور اُن کا مقابلہ بھی اور اس مدافعت کی کوشش میں کسی بے قراری اور بے بسی کا اظہار نہ ہو، خدا پر اعتماد ہو اور اس کے حکم پر عمل اور اس کی رضا حاصل کرنا سب سے بڑی غرض ہو۔ اگر شکایت کی جائے تو صرف اُسی سے اور مدد طلب کی جائے تو صرف اسی کی بارگاہ سے۔ مصیبتوں کا مقابلہ اس یقین کیساتھ کیا جائے کہ وہ ہماری بہتری کا ذریعہ ہیں۔ اگر ہم اس امتحان میں کامیاب ہو گئے تو ہم زندگی کے بلند ترین مقام پر فائز ہوں گے۔ حقیقت میں جبتک مصیبتیں اور بلائیں نہ پڑیں انسان کا اصلی جوہر اور صحیح مقام سامنے نہیں آتا اس لئے مصائب سے گھبرانے کے بجائے خوش ہونا چاہئے اور دماغی توازن کو کسی وقت بھی کھونا نہیں چاہیئے۔ انسان کی عظمت و بزرگی کا راز مصائب کے ہولناک طوفان اور مشکلات کے کٹھن راستوں ہی میں کھلا کرتا ہے۔ پھولوں کی سیج پر کروٹیں بدلنے سے آدمی کا اصلی مرتبہ آشکار نہیں ہوتا جبتک کانٹوں سے بھی اُس کا واسطہ نہ پڑے۔ ساحل کی دلفریبیوں میں مست رہنے والے جبتک موجوں کے بے رحم تھپیڑوں کے سامنے نہ لائے جائیں اُن کا جوہر ظاہر نہیں ہوتا۔ سونے کے کھرے اور کھوٹے ہونے کا پتہ تو اسی وقت چلتا ہے جب اسے آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلوں میں ڈال دیا جائے۔ اسلام نے انسان کو صبر کی تعلیم دی ہے اور یہی وہ جلیل صفت

ہے جو انسانی کردار اور اس کے اعلیٰ صفات کے لئے ایک محور کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ امتیاز جو انسان کو انسان بناتا ہے اُس کی ابتدا صبر ہی سے ہوتی ہے۔ اسی صبر نے اُس کو کائنات کی سرداری کا شرف دیا ہے اور یہی صبر انسان کو امانت و رسالت کے منصب جلیل تک پہونچاتا ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا (قرآن کریم) اور ان میں سے جن لوگوں نے مصیبتوں پر صبر کیا ہم نے انہیں امامت کا منصب عطا کیا۔ اور کہیں یہ آواز ہے۔ وَاصْبِرْ عَلٰى مَا اَصَابَكَ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (قرآن مجید) اور جو مصیبت تم پر پڑے اُس پر صبر کرو۔ بیشک یہ بڑی ہمت کا نام ہے۔ کسی جگہ یہ الفاظ ہیں اِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ صبر کرنے والوں ہی کو اُنکا بھرپور بے حساب بدلہ دیا جائے گا۔

صبر کو جو ایمان سے نسبت ہے اس کے لئے حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام کا یہ ارشاد کافی ہے۔: اَلصَّبْرُ مِنَ الْاِيْمَانِ بِمَنْزِلَةِ الرَّاْسِ مِنَ الْجَسَدِ، صبر کی ایمان سے نسبت وہی ہے جو سر کو سارے بدن سے صبر زندگی کا ایک سہارا ہے۔ بے عملی مایوسی اور قنوطیت کا مظاہرہ کرنا صبر نہیں ہے بلکہ اس کا نام بزدلی ہے۔

دُنیا میں وہی قومیں اور افراد عزّت و عظمت کے مستحق ہیں اور ان ہی کو زندگی کی تمام بلندیاں حاصل ہوتی ہیں جو صبر کی عظمت کے راز سے واقف ہیں، جن کے قدم خطروں اور آفتوں کے طوفانوں میں پہاڑوں کی طرح تھمے اور جمے رہتے ہیں بلکہ طوفانوں کی ہر موج اُن کی راہ میں ایک سہارا بن جاتی ہے۔

موجوں کا تلاطم اُن کی کشتی کو ساحل امید تک پہونچنے سے روک نہیں سکتا۔ وہ اگر غرق بھی ہوتے ہیں تو نجات پاکر کنارے پر پہونچتے ہیں، آگ میں ڈالے جاتے ہیں تو اور نکھرتے اور سنورتے ہیں، بلاؤں کے بھنور انھیں جتنا ڈبوتے ہیں وہ ابھرتے ہی جاتے ہیں اور آخر اُن کے صبر کی طاقت لیل و نہار کی گردش اور تاریخ کے دھارے کا رخ بھی بدل دیتی ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصَّابِرِيْنَ۔ بیشک اللہ صبر کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝ وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ۝ وَتَبٰرَكَ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ ۚ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۳ سورۃ الزخرف)

ترجمہ

آسمانوں اور زمین کا رب جو عرش کا بھی پروردگار ہے اُن باتوں سے پاک ہے جو لوگ بیان کرتے ہیں تو تم ان کو چھوڑ دو کہ یہ بحث مباحثہ کرتے رہیں اور کھیلتے رہیں یہاں تک کہ وہ مل جائیں اس دن سے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے اور وہی ذات ہے جو آسمان میں بھی معبود ہے اور زمین میں بھی وہی قابل عبادت ہے اور وہی بڑی حکمت والا اور بڑے علم والا ہے اور وہ بہت برکت والا ہے جس کے پاس آسمانوں، زمین اور ان کے درمیان کی حکومت ہے اور اس کو قیامت کی خبر ہے اور تم لوگ اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اور جن لوگوں کو یہ خدا کے سوا پکارتے ہیں وہ سفارش کرنے کا اختیار نہیں رکھتے مگر جنھوں نے حق بات کا اقرار کیا اور ان کو علم بھی ہو اور اگر تم ان سے پوچھو کہ انھیں کس نے بنایا تو کہیں گے کہ اللہ نے پھر یہ کہاں الٹے جاتے ہیں اور اس کو رسول کے اس کہنے کی بھی خبر ہے کہ اے میرے رب یہ ایسے لوگ ہیں جو ایمان نہیں لاتے پس تم ان سے منہ پھیر لو اور کہہ دو کہ بس تم کو سلام ہو۔ تو انھیں عنقریب ہی (شرارت کا نتیجہ) معلوم ہو جائے گا۔

تشریح وتفسیر:۔ "سُبْحٰنَ" مصدر ہے جس کی تفصیل اہل لغت نے کئی طرح سے

بیان کی ہے مگر یہاں اس کے معنی پاکیزگی کے ہیں "تَبَارَكَ" کے معنی ہیں۔ خدا بابرکت ہے۔ اس کی شان بلند و برتر ہے اور اس کی رحمت و نعمت بہت زیادہ ہے "تَبَارَكَ" ماضی کا صیغہ ہے یہ "بَرَكَةٌ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خیر و نیکی اور ترقی و زیادتی ہے "ذَرْهُمْ" میں "ذَرْ" امر کا صیغہ ہے جس کا مادّہ "وَذْر" بمعنائے ترک ہے "يُؤْفَكُوْنَ" "اَفْكٌ" سے بنایا گیا ہے۔ جب "اَفَكَهُ" کہا جاتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں "اسے پھیر دیا یا پلٹ دیا" "يُؤْفَكُوْنَ" اسی سے مضارع مجہول ہے۔ "قِيْلِهٖ" میں لفظ "قِيْل" مصدر ہے جو ضمیر واحد کی طرف مضاف ہے جس طرح "قَال" اور "قَوْل" بھی مصدر ہیں۔ یہ تینوں لفظ گفتگو اور کلام کے معنی میں بھی بولے جاتے ہیں۔ یہ آیات مبارکہ سورۂ زخرف کے آخر میں ہیں۔ اس سورہ میں کل ۸۹ آیات اور سات رکوع ہیں اور یہ سورت مکہ میں اتری تھی۔ اس سورہ کی تلاوت میں بھی بڑا ثواب ہے اور اس کی بڑی تاکید ہے۔ اللہ نے اس میں قرآن حکیم کی حقیقت کو بیان فرمایا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی، حضرت ابراہیمؑ اور بنی اسرائیل کے واقعات کا ذکر کیا ہے۔ سزا اور جزا کے تذکرے ہیں جنت و نار کی تصویر کشی ہے اور طرح طرح سے انسانوں کو عمل بد سے بچانے اور اعمال خیر کی رغبت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ دنیا کی کسی کتاب نے خدا کی عظمت اور اس کے جلال و جبروت و شان و عزت کو اس خوبصورت انداز اور دلنشین طریقہ سے نہیں پیش کیا جس طرح قرآن کریم نے پیش کیا ہے۔ تصور الٰہ کے خشک موضوع کو اس طرح ذکر کرنا کہ دل کی گہرائیاں بھی اس سے متاثر ہو جائیں صرف قرآن مجید ہی کی خصوصیت ہے اور صرف ایک ہی صورت سے اس کا ذکر نہیں کیا گیا بلکہ جتنے طریقے بھی ممکن تھے جس قدر صورتیں بھی ہو سکتی تھیں، جو جو انداز بیان امکان میں تھے ہر طرح سمجھا دیا گیا اور ہر صورت سے واضح کر دیا گیا کہ خدا کی عظمت کیا ہے اور اللہ کی ذات و صفات کو کس طرح سمجھنا اور کس طرح اس پر اعتقاد رکھنا چاہیئے زیر نظر آیات کریمہ میں بھی سب سے پہلے جس آیت کا ذکر ہے اس میں اللہ کی بزرگی اور عظمت کا تذکرہ ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک خود اللہ کی ذات اور اس کے صفات ہماری سمجھ میں نہ آسکیں ہم دین کی دوسری باتیں کیونکر سمجھ سکتے ہیں۔ دین کے تصور و اعتقاد میں اور احکام دین پر عمل کرنے میں جو کچھ کمزوریاں انسان میں پیدا ہوتی ہیں وہ محض اس وجہ سے کہ وہ اللہ کی عظمت سے واقفیت نہیں رکھتا اور اس اصل ہی کو پوری طرح نہیں جانتا جس پر دین

و دیانت کی پوری عمارت قائم ہے وہ اگر اللہ کو "سَمِیْع" یعنی بڑا سننے والا سمجھتا تو کبھی ایک بات اپنے منہ سے نہ نکالتا جو خدا کی مرضی کے خلاف ہو اور اس کی بارگاہ میں ناپسندیدہ ہو۔ اگر وہ اللہ کو "بَصِیر" سمجھتا یعنی بڑا دیکھنے والا سمجھتا تو کبھی کوئی ایسا فعل نہ کرتا جو خدا کے حکم کے خلاف ہو اور جس سے اللہ نے منع فرما دیا ہو اگر وہ خدا کو "عَلَّامُ الْغُیُوْب" یعنی غیب کی باتوں کا بڑا جاننے والا سمجھتا تو کبھی اپنے دل و دماغ میں ایک بُرا خیال بھی نہ لاتا جو خدا کی ناراضی کا سبب بن سکتا ہو۔ انسان کے بُرے افعال خود بتاتے ہیں کہ وہ خدا کو صحیح معنی میں کس حد تک بَصِیر جاننے کی صلاحیت و قابلیت رکھتا ہے۔ اس کی بری گفتگو ظاہر کر دیتی ہے کہ وہ اللہ کو کس حد تک سَمِیْع جانتا ہے اور انسان کے گندے تخیلات بتاتے ہیں کہ وہ ذات خالق کو عَلَّامُ الْغُیُوْب" سمجھتا ہے یا نہیں۔

دینی اصلاح اور مذہبی تعلیم کی بنیاد اس بات پر قائم ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے متعلق ہمارا عقیدہ صحیح ہو۔ ہمارے تمام اعمال اور تمام اعتقادات کا بڑا گہرا تعلق اسی عقیدہ سے ہے۔ جب کسی کو بھی اللہ کا سچا اعتقاد ہوگا اور اس کے صفات پر پورا ایمان و یقین ہوگا اس کے اعمال و افعال اور قول و فکر میں گناہ اور بدی کا امکان پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔ جرائم کرنے والے اسی وقت ارتکاب جرم کرتے ہیں جب انھیں اس بات کا یقین ہو جائے کہ ان کو کوئی دیکھنے والا موجود نہیں ہے جو انھیں پکڑ سکے اور ان پر قانونِ سزا جاری کر سکے لیکن اگر انھیں اس کا یقین ہو کہ دیکھنے والا اور سزا دینے والا سامنے موجود ہے تو کبھی جرم کرنے کی جرأت نہیں کرتے چور اس وقت تک چوری نہیں کرتا جب تک تنہائی یا رات کا سناٹا اسے یقین نہ دلا دے کہ سزا سے بچنا آسان ہے لیکن جب سزا دینے والا سامنے ہو تو کوئی چوری نہیں کرتا کوئی گناہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا مگر یہ کیسا "ایمان باللہ" ہے اور یہ کیسا خدا کے سمیع و بصیر ہونے پر اعتقاد ہے کہ انسان زبان سے تو سب کچھ اقرار کرتا ہے مگر اپنے اعمال سے اپنے ہر اقرار کا انکار کرتا ہے اور پھر جب جہالت ہی ٹھہری تو یہی انسان نہ معلوم کیا کیا باتیں خدا کی ذات کی طرف منسوب کر دیتا ہے جن کا اس سے کوئی ربط و تعلق نہیں۔ اسی لئے ارشاد ہوتا ہے: "سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ عَمَّا یَصِفُوْنَ"۔ آسمان و زمین عرش اور تمام چیزوں کا خالق ان تمام امور سے پاک اور منزہ ہے جو جاہل انسان اس کی طرف منسوب کرتے ہیں نہ اس کی کوئی مثل و نظیر ہے نہ اس کا کوئی ہمسر ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے۔

اے نبی ان جاہلوں کو کھیل تماشوں میں مشغول رہنے دو اسی غفلت میں ان پر قیامت ٹوٹ
پڑے گی اُس وقت یہ اپنا انجام معلوم کر لیں گے اسی کے ساتھ ذات حق کی بزرگی اور
کبریاء و عظمت کا مزید بیان ہوتا ہے کہ زمین و آسمان کی تمام مخلوقات کا اصلی معبود وہی ہے
ہر ایک اس کی ذات کے سامنے پست و عاجز ہے اس کے علم کے سامنے کوئی شئی مخفی نہیں
وہ تمہارے ہر ہر عمل کو جانتا ہے وہ تمام عیبوں اور ہر نقصان سے پاک ہے اور تمام بلندیاں
اس کے لیے ثابت ہیں کوئی نہیں جو اس کے حکم کو ٹال سکے کوئی نہیں جو اس کی مرضی کو بدل سکے
ساری مخلوق اسی کی طرف پلٹائی جائے گی اور وہی ہر ایک کو اپنے اپنے اعمال کا بدلہ عطا کریگا
پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ان کافروں کے معبودانِ باطل جنہیں یہ اپنا سفارشی سمجھتے ہیں ان میں سے
ان کی سفارش کے لیے کوئی بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ہاں سفارش کرنے کا صرف ان ہی کو
حق ہے جو حق بات کا اقرار کریں اور دل سے اس کی تصدیق بھی کرتے ہوں وہ البتہ خدا کے حکم
اور اس کے اذن سے اہلِ ایمان کی سفارش کر سکیں گے۔ ان مشرکوں سے اگر کوئی پوچھے کہ ان
کا خالق کون ہے تو یہ اقرار کریں گے کہ اللہ کے سوا ہمارا کوئی خالق نہیں۔ مگر حیرت تو یہ ہے کہ اس
علم کے باوجود یہ اپنے اصلی معبود کو چھوڑ کر دوسروں کے سامنے اپنا سر جھکا دیتے ہیں جو محض مجبور
اور بالکل بے بس اور لاچار ہیں آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ اے نبی مشرکین سے منہ موڑ لو اور ان کی
بدکلامی کا سختی کے ساتھ جواب نہ دو بلکہ ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو اور کہدو کہ تمہاری باتوں پر
میرا سلام ہے۔ ان کو خود ہی حقیقتِ حال عنقریب معلوم ہو جائے گی اور خدا کا قہر و عذاب
ان کے غرور و تکبر کے قلعوں کو مسمار اور پاش پاش کر دے گا۔ (درس ۱۱)

حٰمٓ ۝ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۝ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا
كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ۝ فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۝ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ۭ
اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۝ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝
رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ۝ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَاۗىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ۝ بَلْ
هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ۝ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي السَّمَاۗءُ بِدُخَانٍ
مُّبِيْنٍ ۝ يَّغْشَى النَّاسَ ۭ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا
الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ۝ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَاۗءَهُمْ

رَسُوْلٌ مُّبِیْنٌ ○ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ○

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۴ ۱ سورۂ دخان)

حٰم۔ واضح و روشن کتاب کی قسم ہمنے اس کو ایک برکت والی رات میں اتارا ہے بیشک ہم آگاہ کرنے والے ہیں اسی رات میں ہر حکمت و مصلحت کا کام ہماری پیشی سے حکم ہو کر طے کیا جاتا ہے۔ بیشک ہم ہی پیغمبروں کے بھیجنے والے ہیں یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی ہے وہ ہے بہت بڑا سننے والا جاننے والا۔ جو آسمانوں اور زمین کا پروردگار ہے اور ان تمام چیزوں جو ان دونوں کے درمیان ہیں اگر تم یقین لانا چاہو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ وہی جان ڈالتا ہے وہی جان نکالتا ہے۔ وہ تمہارا بھی پروردگار ہے اور تمہارے اگلے باپ دادا سب ہی کا رب ہے۔ بلکہ یہ لوگ تو بڑے شک میں کھیل رہے ہیں تو تم اس دن کا انتظار کرو جب آسمان ایک نظر آنے والا دھواں لائے جو لوگوں کو گھیر لے گا۔ یہ ایک دردناک عذاب ہے۔ اے ہمارے پالنے والے ہم سے اس عذاب کو دور کر دے ہم ایمان قبول کرتے ہیں۔ بھلا ان کے لئے نصیحت کہاں ہے جب ان کے پاس صاف صاف بیان کرنے والا پیغمبر آ چکا اس پر بھی ان لوگوں نے اس سے منہ پھیرا اور یہی کہتے رہے کہ یہ سکھایا پڑھایا ہوا دیوانہ ہے۔

تشریح و تفسیر:- "حٰم" اس قسم کے حروف کا استعمال بعض سوروں کی ابتدا میں کیا گیا ہے جن کی تفسیر میں مفسرین نے مختلف اقوال نقل کئے ہیں۔ بعض نے لکھا ہے کہ ان حروف سے اسمائے خداوند تعالیٰ کی طرف اشارہ ہے مگر ان کی اصلی مراد سوائے خدا اور راسخون فی العلم کے کوئی نہیں جانتا۔

یہاں "الکتٰب" سے مراد قرآن کریم ہے "المبین" سے مراد یہ ہے کہ اس کتاب مقدس میں ان تمام باتوں کو واضح کر دیا گیا ہے جن کی لوگوں کو دین اور دنیا کے لئے ضرورت ہوتی ہے "لیلۃ مبارکۃ" سے مراد شب قدر ہے۔

"یُفرق۔ فرق" سے بنایا گیا ہے اس کے معنی ہیں جدا کرنا "الگ کرنا" فارق اسی سے اسم فاعل ہے اور فاروق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی حق و باطل میں بڑا فرق کرنے والا۔ "اِنذار" کے معنی ہیں خبردار کرنا ڈرانا اور نتائج سے آگاہ کرنا۔

"مُوقِنِین ایقان" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں یقین کر لینا اور تحقیق کر لینا۔
"ارتقب" امر کا صیغہ ہے اس کا مصدر "ارتقاب" ہے جس کے معنی ہیں انتظار کرنا۔
"رقیب" اسی لحاظ سے انتظار کرنے والے اور حفاظت کرنے والے، نگہبانی کرنے والے اور مدِّ مقابل کو کہتے ہیں۔

خدا فرماتا ہے کہ اس عظیم الشان اور بابرکت کتاب قرآنِ کریم کو اللہ نے ایک مبارک رات یعنی لیلۃ القدر میں نازل فرمایا ہے جس طرح دوسرے مقام پر نام لیکر صاف طور پر ارشاد ہوا ہے "اِنَّا انزلناہ فی لیلۃ القدر" ہم نے اسے لیلۃ القدر میں نازل کیا ہے۔ شب قدر کے متعلق مختلف روایات ہیں لیکن اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ یہ رات رمضان المبارک میں ہے اور اس کی تائید آیت کے اِن الفاظ سے بھی ہوتی ہے "شَہرُ رمضان الذی اُنزِلَ فیہ القرآن" رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن کریم اتارا گیا۔ زیرِ نظر آیات میں پھر ارشاد ہوتا ہے: "اِنَّا کُنَّا مُنذِرِین" ہم لوگوں کو آگاہ کر دینے والے ہیں یعنی ہم نے تمام لوگوں کو بتا دیا ہے کہ نیکی اور بدی میں کیا فرق ہے اور ان میں سے ہر ایک کے نتیجے کیا ہیں تاکہ تمام مخلوق پر ہماری طرف سے حجّت پوری ہو جائے اور کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہم کو فلاں بات معلوم نہ تھی۔ اللہ نے اپنی حجّت تمام کر دی ہے، اب مخلوق کا فرض ہے کہ وہ خدا کے احکام معلوم کرے اور اُن پر عمل کرے اور ان برائیوں سے بچے جن سے اللہ نے سب کو آگاہ فرما دیا ہے۔ اسی شب میں ہر محکم امر طے ہوتا ہے "حَکِیْم" سے یہاں مُراد مضبوط اور مستحکم ہے جو بدل نہ سکے۔ خدا فرماتا ہے کہ ہر فیصلہ ہمارے ہی حکم سے ہوا کرتا ہے ہم ہی رسولوں کے بھی بھیجنے والے ہیں تاکہ وہ ہماری آیتیں ہمارے بندوں تک پہنچا دیں یہ سب اس کی رحمت و کرم ہے وہی قرآن کریم کا اتارنے والا ہے وہی رسولوں کو عہدۂ رسالت عطا کرنے والا ہے اور وہی زمین و آسمان کی ہر شئی کا مالک ہے اور سب کا خالق و رازق ہے۔ مخلوق اگر یقین اور ایمان حاصل کرنا چاہے تو اُس کے لیئے کافی اسباب موجود ہیں اور اس عالم کی ہر چیز اللہ کی قدرت و طاقت اور بزرگی و عظمت کی نشانیاں ظاہر کر دے گی یہ اور بات ہے کہ کوئی جان بوجھ کر خدا کی نشانیوں سے منہ پھیر لے اور آنکھیں بند کر لے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا کہ معبودِ برحق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو صرف اللہ ہے جس کے سوا کوئی لائق پرستش نہیں۔ ہر ایک کی موت و زیست اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ پھر فرمایا ہے کہ "بل ھم فی شکٍّ یلعبون" یقیناً حق تو آچکا ہے اور حقیقت پوری طرح آشکار اور

ظاہر ہو گئی ہے مگر بہت سے لوگ اب بھی شک و شبہ اور لہو و لعب میں مشغول ہیں تو اے
رسول تم ان کو اس دن سے پوری طرح آگاہ کر دو جب آسمان سے سخت دھواں آئے گا۔ اس
دھویں کے متعلق دو قول ہیں۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ دھواں قرب قیامت کی
علامت ہے۔ جب قیامت آئے گی تو آسمان سے دھواں اٹھے گا اور ابن مسعودؓ فرماتے
ہیں کہ اس سے مراد قحط ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بد دعا سے قریش کی سرکشی
کی بدولت ان پر مسلط کر دیا گیا تھا حضرت علیؑ فرماتے ہیں کہ دخان گذر نہیں گیا بلکہ آئے گا۔
صحابہ اور تابعین کے بہت سے اقوال اور سرکار دو عالم کی دوسری احادیث سے بھی اس
امر کی تائید ہوتی ہے کہ اس دخان سے مراد وہ دھواں ہے جو علامات قیامت میں سے
ہے اور ظاہر الفاظِ آیت بھی اس کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ جب یہ دھواں ظاہر ہوگا اور
خدا کی نشانیوں کا انکار کرنے والے اور دوسرے تمام لوگ اس کو دیکھیں گے تو ان سے
کہا جائے گا کہ یہ خدا کا عذاب ہے تو گھبرا کر گنہگار دعائیں کریں گے کہ پروردگار ہمیں تھوڑے
سے وقت تک اور مہلت عطا فرما دے تاکہ ہم تیری پکار پر لبیک کہہ لیں اور تیرے رسولوں
کی فرماں برداری کر سکیں اس وقت ان کو یہ جواب ملیگا کہ اب نصیحت کا وقت باقی نہیں
ہے۔ مہلت کا زمانہ گذر چکا جب اتمام حجت کے لیئے سب کچھ موجود تھا اب بار بار مہلت
نہیں مل سکتی۔ ایک رسول نہیں ایک معجزہ نہیں ایک دلیل نہیں بلکہ آیات الٰہی کا ایک
سلسلہ تھا جو اتمام حجت کرتا رہا اور لوگوں کو حق کی راہیں دکھاتا رہا مگر پے در پے ہدایت کے
باوجود، ڈرانے کے باوجود، واضح و روشن آیتوں کے ظاہر ہو جانے کے باوجود ان منکرین حق نے
ایمان اختیار نہ کیا تو اب مہلت دینے سے کیا حاصل ہوگا اور اس وقت عذاب کی شدت
کو دیکھ کر ایمان کا وعدہ کرنا اور اطاعت کا اظہار کرنا بے سود ہے۔ انھوں نے پیغمبروں کو جھوٹا
کہا، ان کی تعلیم کو غلط کہا، رسولوں کو مجنون کہا، ان کی باتوں پر قہقہے لگائے اور ان کی تبلیغ کا
مذاق اڑایا۔ ان آیات سے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو رہی ہے کہ دنیا کی یہ زندگی انسان کے
لیئے ایک بڑا امتحان ہے اور اس کا ایک ایک لمحہ خدائے واحد کی قہاریت کے محاسبہ میں
ہے۔ اگر انسان اپنی ذمہ داری کو سمجھنے کی کوئی بھی کوشش کرے تو اسے ایک منٹ بھی یہ
غلط فہمی باقی نہیں رہ سکتی کہ وہ کسی قانونِ محکم کی نگرانی سے آزاد ہے اور اس کے افعال و
اعمال کا محاسبہ نہ ہوگا۔ مسلمان کا ایمان جزا و سزا کے نظریہ پر ہے اس کا اعتقاد ہے کہ

اس کا کوئی عمل اور کوئی فعل ایسا نہیں ہے جو خدا کے علم میں نہ ہو۔ ہماری بنائی ہوئی مادّی مشینیں ہماری آوازوں کو ریکارڈ کرتی ہیں مگر الٰہی قانون کے سامنے ہماری پوری زندگی کا ریکارڈ ہے جسے ہم نہ چھپا سکتے ہیں اور نہ مٹا سکتے ہیں۔ یہ زندگی ایک مہلت ہے ایک جانچ ہے۔ ایک امتحان ہے ہم ہر وقت اور ہر آن زیر محاسبہ ہیں دنیا کے ناقص قانون سے بہت زیادہ اہم خدائی حکومت کی گرفت میں ہیں اگر کبھی ہمیں فوری سزا نہیں دیجاتی تو اس سے غلط فہمی نہ ہونا چاہیئے۔ خدائی سزا بڑی سخت ہے اور الٰہی قانون کی گرفت بڑی شدید ہے۔ کتاب مقدس کی ان آیات نے خدا کی عظمت اور قیامت کے ہولناک منظر کی تصویر کشی کی ہے اور ماہ رمضان کی برکتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی ایک رات وہ تھی جس میں قرآن کریم کو لوح محفوظ سے بیت معمور پر اُتارا گیا تھا اور پھر ۲۳ سال میں بیت معمور سے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر مختلف آیات کی صورت میں نازل کیا گیا۔ یہ برکتوں اور رحمتوں والی رات ہے ایک ہزار راتوں سے افضل شب اسی مبارک مہینہ میں ہے۔ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ خدا اور رسول کے احکام پر عمل کرے۔ اللہ کی بندگی کا فرض ادا کرے۔ ہر ایک مسلمان خواہ وہ کسی قوم و قبیلہ سے تعلق رکھتا ہو، کسی ملک کا باشندہ ہو دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور ہم سب کے سب ایک ہی رشتہ اخوت میں منسلک ہیں ہم سب کو خدا کے سامنے اپنے ہر عمل کا جوابدہ ہونا ہے ہمیں انتہائی اتحاد و محبت کے ساتھ خدا کی بندگی و اطاعت کے فرائض کو پورا کرنا چاہیئے اور ہم میں وہ باتیں کبھی بھی نہیں پیدا ہونا چاہئیں جو ہمارے دین و مذہب کی بدنامی کا باعث ہوں۔

(درس ۱۲۰)

اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ ۝ يَوْمَ نَبْطِشُ
الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ
فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ ۝ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَيَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ
اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ وَّاَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّيْٓ
اٰتِيْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَاِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ اَنْ
تَرْجُمُوْنِ ۝ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِيْ فَاعْتَزِلُوْنِ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗٓ
اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ۝ فَاَسْرِ بِعِبَادِيْ لَيْلًا اِنَّكُمْ

مُتَّبَعُوْنَ ۝ وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ۭ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ۝

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۴ سورۂ دخان)

ہم عذاب کو کچھ دن کے لیئے دور کردیں گے تو پھر تم اپنی اسی حالت پر آجاؤ گے۔ جس روز ہم بڑی سخت گرفت کریں گے ہم بدلہ لے لیں گے۔ اور ان سے پہلے ہم نے قوم فرعون کی آزمائش کی جن کے پاس خدا کا ذی عزت پیغمبر آیا کہ ان اللہ کے بندوں کو میرے حوالہ کردو۔ میں خدا کی طرف سے تمہارے لیئے ایک امانت دار رسول ہوں۔ اور یہ کہ تم خدا سے سرکشی نہ کرو میں تمہارے پاس ایک واضح روشن دلیل لیکر آیا ہوں اور اس بات سے کہ تم مجھے سنگسار کرو میں اپنے اور تمہارے پروردگار کی پناہ مانگتا ہوں اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لائے تو تم مجھ سے الگ ہو جاؤ۔ پھر موسیٰ نے اپنے رب سے دعا کی کہ یہ سب گناہگار لوگ ہیں (تو خدا نے حکم دیا) کہ تم میرے بندوں کو راتوں رات لیکر چلے جاؤ اور تمہارا تعاقب بھی ضرور کیا جائیگا اور تم سمندر کو سکون کی حالت میں چھوڑ دینا ان کا سارا لشکر ڈبو دیا جائے گا۔

تشریح و تفسیر:۔ "بطش" کے معنی ہیں سخت و شدید گرفت کے۔ اس مقام پر "اَلْبَطْشَةُ الْكُبْرٰى" سے مراد اکثر مفسرین کے نزدیک روز قیامت کی شدت ہے اور بعض نے اس سے مراد معرکۂ بدر کو لیا ہے جس میں کافروں سے بدلہ لیا گیا تھا۔ غرض خدا کا عذاب ان حیلوں اور بہانوں سے دور نہیں ہوتا اور وہی ہوتا ہے جس کا اللہ فیصلہ فرما دیتا ہے "ولقد فتنا قبلھم قوم فرعون وَ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِيْمٌ"۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ان مشرکوں سے پہلے ہم قوم فرعون یعنی مصر کے قبطیوں کو بھی آزما چکے ہیں جن کے پاس خدا کا باعزت رسول آیا تھا یعنی حضرت موسیٰ کو ان کی ہدایت کی غرض سے مبعوث کیا گیا تھا تاکہ وہ انھیں خدا کا پیغام پہنچا دیں کہ بنی اسرائیل ان کے حوالہ کیئے جائیں اور انھیں دکھ نہ دیا جائے۔ "اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ" میں تمہارے لئے ایک با امانت پیغمبر ہوں اور اپنی نبوت پر گواہی دینے والے معجزے اپنے ساتھ لایا ہوں۔ میں تمہیں خدا کا پیغام سنانے آیا ہوں۔ تمہیں اس کا حکم ماننے سے سرکشی نہ کرنا چاہیئے اور اس کی مرضی کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا چاہیئے اس کی عبادتوں سے جی چرانے والے ذلیل و خوار ہو کر جہنم واصل ہوتے ہیں میں تو تمہارے سامنے کھلی ہوئی اور واضح سند اور دلیل لایا ہوں۔ میں تمہاری بدگوئی اور اتہام سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔ ابن عباسؓ اور ابو صالح کے نزدیک رجم اور سنگساری سے مراد یہی بدگوئی اور بہ

الزامات میں مگر قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے مراد پتھر مارنا ہی ہے بہر حال زبانی ایذا رسانی ہو
یا ہاتھ سے تکلیف پہنچانا ہو حضرت موسیٰ اس سے خدا کی پناہ طلب کرتے ہیں اس کے بعد
کہتے ہیں کہ اگر تم میری بات نہیں مانتے اور مجھ پر بھروسا نہیں کرتے، خدا پر ایمان نہیں لاتے
تو کم از کم میری تکلیف دہی اور ایذا رسانی سے تو باز رہو اور اس وقت کے منتظر رہو جب
خدا ہم میں اور تم میں فیصلہ کر دے گا۔ حضرت موسیٰ عرصہ دراز تک اپنی قوم میں تبلیغ کرتے
رہے اور انہیں راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے رہے اور جو کچھ بھی ممکن تھا اُن کی
ہدایت کے لیے سب کچھ کیا مگر وہ اپنے کفر و شرک میں آگے ہی بڑھتے رہے تو آخر انہوں نے
خدا سے دعا کی کہ انہیں سزا دی جائے قرآن مجید میں ایک دوسری جگہ بھی اسی طرح کے الفاظ
ہیں حضرت موسیٰؑ نے کہا "اے ہمارے رب تو نے فرعون اور اس کی حکومت کے امیروں
کو دنیا کی دولت اور مال و متاع دے رکھا ہے۔ خدایا یہ اس کے ذریعے دوسروں کو بھی تیری
راہ سے بھٹکا رہے ہیں۔ تو ان کا مال غارت کر دے اور ان کے دلوں کو اور سخت کر دے تاکہ
دردناک عذابوں کے معائنہ تک انھیں ایمان نصیب ہی نہ ہو" خدا کی طرف سے جواب ملا
اے موسیٰ اور اے ہارون میں نے تمہاری دعا قبول کر لی اب تم تیار ہو جاؤ اور استقامت
پر تل جاؤ" اس جگہ ارشاد ہو رہا ہے کہ ہم نے موسیٰ سے کہا کہ ہمارے بندوں یعنی بنی اسرائیل
کو راتوں رات فرعون اور اس کے ساتھیوں کی غفلت میں یہاں سے لیکر چلے جاؤ یقیناً
یہ کفار تمہارا پیچھا کریں گے مگر تم بغیر کسی خطرہ اور خوف کے آگے چلے جانا میں تمہارے
لیے سمندر کو خشک کر دوں گا۔ جب حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے
تو فرعون اپنے لشکر کے ہمراہ انہیں پکڑنے کے لیے نکلا۔ سامنے سمندر تھا۔ آپ
بنی اسرائیل کو لے کر سمندر میں اتر گئے۔ پانی سوکھ گیا اور آپ اپنے ساتھیوں سمیت
اُس کے پار ہو گئے "وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا" اور حکم ہوا کہ سمندر کو اسی طرح سکون کی حالت
میں خشک چھوڑ دیں اور خود چلے جائیں یہاں تک کہ قوم فرعون میں سے ایک ایک کر کے
اس کے اندر پہنچ جائے تاکہ ان سب کو غرق کر دیا جائے اور یہ پورا لشکر تو غرق ہونے
والا ہے۔ "وَلَقَدْ فَتَنَّا قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ" میں فتنہ سے مراد امتحان اور جانچ ہے۔
مقصد یہ ہے کہ ہم نے اس دور سے پہلے فرعون کی قوم کا امتحان لیا تھا "فتنہ" کے جہاں
اور معنی ہیں اس کو کلام عرب میں جانچ اور امتحان کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ کبھی کہا جاتا

ہے: "فَتَنْتُ الْفِضَّةَ اَوِالذَّهَبَ" یعنی میں نے سونے یا چاندی کی جانچ کی اور مطلب
یہ ہوتا ہے کہ اسے آگ میں تپایا گیا تاکہ اصلی سونا یا چاندی نقلی سے الگ ہوجائے اور
کھرے کھوٹے کا امتیاز ہوجائے اسی مناسبت سے "فتنہ" کی لفظ کا یہاں بھی
استعمال کیا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح ہر چیز کی جانچ کی جاتی ہے اور اس
کے کھرے کھوٹے کو الگ کرلیا جاتا ہے اسی طرح انسانوں کے ضمیر اور ان کے ایمان وکردار
کو بھی جانچا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے اس لفظ کو بار بار استعمال کیا ہے کہیں
فرمایا ہے "وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ" ہم نے بعض لوگوں کو دوسروں کے ذریعے
آزمایا۔ کسی مقام پر ارشاد ہوا ہے: "اِنَّمَا اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ" تمہارے
اموال اور اولاد سے تمہارا امتحان لیا جاتا ہے اور یہ سب تمہاری جانچ کا ذریعہ ہیں۔ اور کہیں
اس طرح فرمایا گیا ہے:- "اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ"
کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں یہ کہنے کے لیے چھوڑ دیا جائے گا کہ ہم ایمان لے آئے اور ان
کا امتحان نہ لیا جائے گا اور ان کی جانچ نہ ہوگی۔ ظاہر ہے کہ انسان کا اصلی مرتبہ اور
اصلی کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک اس جانچ کی منزل سے وہ
کامیابی کے ساتھ نہ گذر جائے اور اپنے کردار سے یہ ثابت نہ کردے کہ خدا نے جو مقام اس
کے لیے مقرر فرمایا ہے اس کا وہ اہل ہے اور محض زبان سے دعویٰ کرنا کافی نہیں ہے۔
انسان کی پوری زندگی ایک امتحان ہے اور اس کے ہر قول وعمل کا محاسبہ کیا جارہا
ہے اور خدائی نگہبان اس کے کردار کی نگرانی کررہے ہیں۔ بیشک انسان کو اللہ نے
فضیلت عطا فرمائی ہے اور اس کی منزلت دوسری مخلوق سے ممتاز ہے۔ اس میں بلندیوں
تک پہنچنے کی صلاحیت موجود ہے اس کی فطرت میں رفعتیں پوشیدہ ہیں۔ وہ ترقی کرکے ملک
سے بھی افضل بن سکتا ہے وہ افلاک کی بلندیوں میں پرواز کرسکتا ہے وہ چاند اور سورج
سے بلند ہوسکتا ہے بلکہ وہ تو ساری کائنات پر حکمرانی کرسکتا ہے۔ ہوائی موجیں اس کی
اطاعت کرتی ہیں۔ سمندر کی لہریں اس کی بات مانیں گی۔ آگ کے شعلے اس کے اشاروں
پر چلیں گے۔ پتھر کے بت اس کے حکم سے بولنے لگیں گے۔ ستارے اس کی مرضی پر
عمل کریں گے وہ ساری کائنات کا سردار ہے۔ بیشک افضل مخلوقات ہے لیکن ہر
ایک انسان نہیں ہر دعوائے انسانیت کرنے والا نہیں بلکہ یہ شرف وفضیلت صرف

اسی انسان کو حاصل ہے جو انسانیت کے اصلی کمال اور جوہر کا حامل ہے اور جو اپنے عمل اور کردار کے لحاظ سے انسان کہے جانے کا مستحق ہے۔ انسان میں رفعتیں ہیں مگر پستیاں بھی ہیں اگر وہ بلندیِ کردار اور اطاعت خدا و رسولؐ کے ذریعہ ملک سے افضل بن سکتا ہے تو اپنی بدعملی کی وجہ سے جانوروں سے پست تر بھی ہو سکتا ہے "اُولٰٓئِکَ کَالْاَنْعَامِ بَلْ ھُمْ اَضَلُّ" بدعمل انسان اور بدکردار آدمی چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ تو زیادہ بے راہ ہیں یہ بھی قرآنی ارشاد ہے اور اس حقیقت کے سمجھنے کے لیے کافی ہے کہ انسان کی فضیلت اور بزرگی کا معیار صرف اُس کا کردار ہے۔ اُس سے زیادہ طاقت جسمانی رکھنے والے جانور موجود ہیں اس لیے انسان کی فضیلت اس میں نہیں ہے کہ وہ طاقتور ہو اور پھر طاقت بھی تو ایک عارضی اور ناپائیدار چیز ہے معمولی سا مرض اور ذرا سی تکلیف طاقت و قوت کے گھمنڈ کو خاک میں ملا کر رکھ دیتی ہے اور ذرا دیر میں وہ طاقتور انسان جو اپنے کس بل پر ناز کیا کرتا تھا چلنے پھرنے میں بھی دوسروں کا محتاج ہو جاتا ہے بلکہ بغیر کسی سہارے کے کروٹ تک نہیں لے سکتا۔ انسان سے بہت زیادہ حسن و جمال رکھنے والی مخلوق بھی اس زمین پر موجود ہے اور وہ حُسن بھی کیا جو محض وقتی اور چند لمحوں میں ختم ہو کر رہ جائے اور اس جمال کا کیا بھروسا جو ہر لحہ بدلتا اور متغیر ہوتا رہے غرض ایک کردار ہی وہ شئی ہے جو انسان کے لیے باعث فخر و عزت اور ذریعہ بلندی ہے دوسری کوئی صفت ایسی نہیں ہے جو انسان کی بلندی و رفعت کا سبب بن سکے۔

(درس ۱۲۶) کَمْ تَرَکُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوْنٍ ○ وَّ زُرُوْعٍ وَّ مَقَامٍ کَرِیْمٍ ○ وَّ نَعْمَةٍ کَانُوْا فِیْهَا فٰکِهِیْنَ ○ کَذٰلِکَ قف وَ اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ○ فَمَا بَکَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ وَ مَا کَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ○ وَلَقَدْ نَجَّیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ ○ مِنْ فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ کَانَ عَالِیًا مِّنَ الْمُسْرِفِیْنَ ○ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰی عِلْمٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ ○ وَ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ ○

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۴ و ۱۵ سورہ دخان)

وہ لوگ کتنے ہی باغ اور چشمے، کھیتیاں اور نفیس مکانات اور آرام کے سامان جن میں وہ خوش رہا کرتے تھے چھوڑ گئے۔ اسی طرح ہوا۔ اور ہم نے ایک دوسری قوم کو اُن کا مالک بنا دیا۔ تو اُن لوگوں پر آسمان و زمین کو بھی رونا نہ آیا اور نہ انہیں مہلت ہی دی گئی اور ہم نے بنی اسرائیل کو سخت ذلت کے عذاب یعنی فرعون سے نجات دی واقعی وہ بڑا سرکش حد سے نکل جانے والوں میں سے تھا اور ہم نے بنی اسرائیل کو دانستہ طور پر دنیا جہان والوں پر فوقیت دی تھی اور ہم نے انہیں ایسی نشانیاں دیں جن میں صریح آزمائش تھی۔

تشریح و تفسیر:۔ قرآن کریم نے گزشتہ واقعات بیان کر کے انسانوں کی غفلت کو دور کرنے کی کوشش فرمائی ہے تاکہ وہ اپنی شان و شوکت اور عزت و آبرو اور مال و زر پر کسی وقت بھی نازاں نہ ہوں اور عذابِ خدا سے ڈرتے رہیں۔ ان آیات کریمہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا گیا ہے۔ حضرت موسیٰؑ حضرت آدم علیہ السلام سے ساڑھے پانچ ہزار سال کے بعد دنیا میں آئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی حضرت ھارون علیہ السلام تھے یہ دونوں عمران بن یصھر کے فرزند تھے ان دونوں سے بڑی ان کی ایک بہن بھی تھیں ان کا نام بھی مریم تھا حضرت عیسیٰ کی والدہ گرامی کا نام بھی مریم تھا اور ان کے باپ کا نام بھی عمران تھا مگر یہ عمران بن ماثان تھے ان دونوں عمرانوں کے زمانے الگ الگ گزرے ہیں اور ان کے درمیان ایک ہزار آٹھ سو (۱۸۰۰) سال کا وقفہ تھا حضرت موسیٰؑ کو قبطیوں کے بادشاہ فرعون کی طرف ہدایت کے لئے بھیجا گیا تھا جو مصر کا بادشاہ تھا۔ ہامان اس کا وزیر تھا اور قارون اس کی سلطنت میں سب سے زیادہ دولتمند تھا۔ ان سب نے حضرت موسیٰؑ کی توہین و تذلیل میں کوئی دقیقہ نہ چھوڑا اور جو کچھ بھی اذیتیں اور تکلیفیں ممکن تھیں وہ انہیں دیتے رہے حضرت موسیٰؑ اپنے دور کے سب سے بڑے مصلح تھے جنہوں نے انسانیت کی فلاح کے لیے ایسے روشن نقوش چھوڑے ہیں جو دنیا کی تاریخ میں ہمیشہ باقی رہیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کا نام بنی اسرائیل تھا۔ اسرائیل حضرتِ یعقوب علیہ السلام کا نام ہے۔ سریانی زبان میں "اسرا" کے معنی بندہ کے ہیں اور "ایل" کے معنی اللہ کے تو اس کا ترجمہ عبداللہ ہوگا۔ بنی اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہے۔

بنی اسرائیل کے مصر میں آباد ہونے کا باعث حضرت یوسف علیہ السلام تھے۔ جب انہیں

سلطنت ملی تو اولاد یعقوب وہاں بسائی گئی پھر جب کچھ دن گذر گئے تو ان کی شامت اعمال سے ان کی ساری عزت و عظمت جو حضرت یوسفؑ اور حضرت یعقوبؑ کی وجہ سے ان کو حاصل ہوئی تھی ختم ہو گئی اور ہمیشہ کے لیئے ذلیل و خوار ہو گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کارناموں کا ذکر ہر مقدس کتاب میں موجود ہے وہ عظیم مصلح اور جلیل القدر نبی تھے۔ انہوں نے انسانیت کی اصلاح اور تبلیغ حق میں بڑی جانفشانیاں اور مصیبتیں اٹھائیں خود قرآن کریم میں بھی واقعات حضرت موسیٰؑ کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ سورۂ اعراف میں تو تقریباً نصف پارہ تک آپ کے واقعات کا بیان ہے۔ چونکہ بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰؑ کے واقعات اس امت کے حالات سے بہت زیادہ مشابہت رکھتے ہیں اس وجہ سے قرآن کریم میں بار بار ان واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔

سورۂ یوسف میں بنی اسرائیل کے مصر میں آنے کا واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے۔ یہ حضرت یوسفؑ کے دور سلطنت میں اُن کے والد حضرت یعقوبؑ کے ساتھ مصر میں آکر آباد ہو گئے تھے اُس وقت ان کی کل تعداد ۷۲ تھی اور جب چار سو سال کے بعد حضرت موسیٰؑ کا دور آیا اور یہ لوگ مصر سے ہجرت کر کے نکلے تھے تو ان کی تعداد ۶ لاکھ سے زیادہ تھی حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ فرزند تھے جنہیں "اسباطِ اسرائیل" کہا جاتا ہے۔ ان بیٹوں میں سے یہودا ابن یعقوب کی اولاد یہود کہلاتی ہے اور ان تمام بیٹوں سے حضرت یعقوبؑ کی اولاد مجموعی طور پر بنی اسرائیل کہلاتی تھی۔ اسکو عبرانی قوم بھی کہتے ہیں اور اسی نام سے ان کی زبان بھی شہرت رکھتی ہے۔ فراعنہ مصر کی تیس ۳۰ نسلیں گذری ہیں اور مجموعی طور پر ان نسلوں کا سلسلہ تقریباً دو ہزار آٹھ سو سال تک باقی رہا۔ اور آخر میں تین سو بیالیس سال قبل حضرت مسیحؑ ان نسلوں کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں جو فرعون تھا اس کا نام ولید بن مصعب تھا جو اس فرعون کا پوتا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام کے دور میں تھا اور اس کا نام ریان تھا مصر کے اصلی باشندے قبطی کہلاتے تھے اور ان کی زبان جو حامی زبان سے نکلی تھی اصلی قبطی زبان کہی جاتی تھی اسکندر کے حملہ کے بعد یہ زبان بھی رفتہ رفتہ محو ہو گئی اور اس کی جگہ "یونانی" زبان لے لی۔ فراعنہ مصر ان ہی قبطیوں کے بادشاہ تھے۔

قوم فرعون کے جن باغات اور عالیشان مکانات کا ذکر آیت میں فرمایا گیا ہے وہ دریائے

نیل کے دونوں کناروں پر مسلسل چلے گئے تھے۔ شہر "اسوان" سے لیکر "الرشید" تک
ان کا سلسلہ تھا۔ دریائے نیل میں نو خلیجیں تھیں جن کے ذریعہ سے سارے ملک میں پانی
کی تقسیم ہوتی تھی۔ مسطح زمینوں اور پہاڑوں کے دامنوں میں ہر جگہ ان کی کھیتیاں
تھیں اور یہ لوگ بڑے امن اور چین سے زندگی بسر کرتے تھے مگر خدا کی ان نعمتوں کے باوجود
اور اس آرام وراحت کے باوجود جو ان کو حاصل تھا انہوں نے خدا کو فراموش کر دیا
اور اپنی اس ظاہری شان وشوکت پر مغرور ہو گئے اور اپنی ہستی کو بالکل بھول گئے۔
انبیاء ومرسلین کی تکذیب کرتے رہے اور زمین وآسمان کے حقیقی مالک اور اپنے اصلی
خالق کی ہستی کے احترام کو پس پشت ڈالتے رہے۔ آخر عذاب میں گرفتار ہو گئے اور
طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہونے لگیں پھر تو ساری نعمتیں اور راحتیں سلب ہو گئیں
اور سب کے سب تباہ کر دیئے گئے۔ مال واولاد جاہ وعزت، عالیشان محل، ہری بھری
کھیتیاں، دولت او سامان کے انبار، زر وجواہر کے خزانے سب ایک ہی رات میں
چھوٹ گئے اور گذرے ہوئے لمحات کی طرح بے نام ونشان بنا دیئے گئے اور سمندر کے
پانی کی چادروں میں اس طرح چھپائے گئے کہ آج تک ظاہر نہ ہو سکے۔ قوم فرعون
کی تمام دولت اور ہر قسم کا سرمایہ ان کے ڈوبنے کے بعد خدا نے بنی اسرائیل کو عطا
فرما دیا۔ اسی کی طرف ان الفاظ سے اشارہ کیا گیا ہے۔ "واورثنٰہا قوماً اٰخرین"
ہم نے اس تمام مال ودولت اور متاع زندگی کا وارث ایک دوسری قوم کو بنا دیا اور
دوسری جگہ نام لے کر ارشاد ہوا ہے "کذالک واورثنٰہا بنی اسرائیل" ان کی سزا
اسی طرح تھی اور آخر ہم نے ان کی املاک اور تمام دولت کا بنی اسرائیل کو مالک و
وارث بنا دیا۔ یہاں پھر ارشاد ہوتا ہے کہ ان پر زمین وآسمان نہ روئے کیونکہ ان پاپیوں
کے اعمال ایسے تھے ہی نہیں جن پر کسی کو ان کے مرنے کا افسوس ہوتا اور کوئی ان کے
ہلاک ہونے پر آنسو بہاتا نہ تو زمین میں ایسی جگہیں تھیں جہاں یہ بیٹھ کر خدا کو یاد کرتے
ہوں کہ وہ مقامات ان کے فراق کا غم کرتے اور نہ آسمان ہی میں ایسے راستے تھے جن سے
کبھی ان کی دعائیں اور اعمالِ خیر بلند ہو کر بارگاہ ایزدی میں جاتے ہوں اور جو ان کے
نہ ہونے کا غم مناتے کیونکہ حدیثوں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ہر بندے کے لئے آسمان
میں دو دروازے ہوتے ہیں ایک سے اس کی روزی اترتی ہے اور دوسرے در سے

اس کے اعمال خیر بلند ہوتے ہیں اور جب وہ بندہ مرجاتا ہے تو یہ دروازے اور یہ راہیں اس پر روتی ہیں اسی طرح وہ مقامات زمین کے جہاں وہ عبادت کیا کرتا تھا وہ بھی اس کی موت پر اظہارِ غم کرتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضور سرورِ دو عالم سے روایت کی ہے کہ مومن جب مرتا ہے تو اس پر آسمان و زمین روتے ہیں۔ مگر ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ رونا اس طرح کا نہیں ہے جیسے انسان رویا کرتا ہے بلکہ اس رونے سے مراد وہ انقلابی کیفیات ہیں جو مومن کی موت کے وقت کائنات کی چیزوں پر ظاہر ہوتی ہیں اور اسی وجہ سے یہ فرمایا گیا ہے کہ قوم فرعون کے عمل اچھے نہ تھے اس لیے ان پر نہ زمین روئی اور نہ آسمان نے ان کا غم کیا۔

(درس ۱۲۲) اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ ۝ اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ ۝ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ اَهُمْ خَيْرٌ اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ اَهْلَكْنٰهُمْ ۡ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ۝ وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ۝ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّ يَوْمَ الْفَصْلِ مِيْقَاتُهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝ يَوْمَ لَا يُغْنِيْ مَوْلًى عَنْ مَّوْلًى شَيْـًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الرَّحِيْمُ ۝

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۵ کی آخری آیات۔ سورۂ دخان)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ آخری چیز بس یہی دنیا سے ہمارا مرجانا ہے اور ہم پھر دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے تو اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ داداؤں کو لے آؤ۔ کیا یہ لوگ بہتر ہیں یا "تُبّع" کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے تھے۔ ہم نے ان سب کو ہلاک کر دیا۔ یقیناً وہ گناہگار تھے اور ہم نے آسمانوں اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے اسے اس طرح نہیں بنایا ہے کہ ہم فعل عبث کرنے والے ہوں۔ ہم نے ان دونوں کو حکمت ہی سے بنایا ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ بیشک فیصلہ کا دن ان سب کا مقرر ہے جس دن کوئی دوست کسی دوست کے کام نہ آئے گا اور نہ ان کی مدد کی جائے گی مگر جس پر خدا رحم فرمائے۔ بیشک وہ سب پر غالب بڑا رحم فرمانے والا ہے۔

تشریح وتفسیر:۔ قرآن کریم نے انسان کو طرح طرح سے آگاہ کیا ہے کہ قیامت ضرور آئیگی ایک دن ایسا یقیناً آنے والا ہے جب اعمال کی سزا یا جزا اس کو ملنا ہے اور یہ دنیا کی زندگی اس آنے والے دن کی تمہید اور پیش خیمہ ہے۔ اس موجودہ زندگی میں ہمیں عمل کرنے کا موقع دیا گیا ہے اور جب یہ حیات ختم ہو جائے گی اور عمل کا موقع جاتا رہے گا تو ہم پھر زندہ کیئے جائیں گے تاکہ ہمیں ہمارے اعمال کی سزا یا جزا عطا کی جائے۔

ان آیات میں اس بات کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ مشرکین و کفار قیامت کا کیوں انکار کرتے ہیں اور ان کو کیا غلط فہمی ہے اور وہ اپنے اس انکار پر کیا دلیل پیش کرتے ہیں۔ اُن کی دلیل بیان فرما کر خدا ان کی رد کرتا ہے وہ کہتے تھے کہ حشر و نشر صرف افسانہ ہے اس میں کوئی بھی حقیقت موجود نہیں ہے۔ اور دلیل یہ پیش کرتے تھے کہ ہمارے باپ دادا مر چکے ہیں وہ کیوں دوبارہ جی کر اب تک واپس نہ آسکے اور اب تک کوئی بھی مرنے والا واپس نہ ہوا اس لیئے دوبارہ زندہ ہونا اور قیامت کا عقیدہ محض عبث و بیکار ہے۔ اس تخیل کی طرف ان الفاظ سے اشارہ فرمایا گیا ہے:۔ "اِنْ هِيَ اِلَّا موتتنا الاولیٰ وما نحن بمنشرین فأتوا بآبائنا ان کُنْتُم صادقین۔ یہ ہماری پہلی موت جو اس دنیا میں ہم کو ملتی بس یہی ہے اس کے بعد ہم دوبارہ زندہ نہیں کیئے جائیں گے اور اگر دوسری بار زندگی ممکن ہے تو پھر ہمارے مرے ہوئے باپ دادا کیوں زندہ نہیں ہوتے اُن کو لے آؤ اگر تم سچے ہو۔

خداوند عالم پہلے تو یہ فرماتا ہے کہ ان لوگوں سے بدرجہا زیادہ طاقت و قوت و عزت رکھنے والی قومیں اُن سے پہلے گذر چکی ہیں جن کے مقابلہ میں ان کی کوئی حیثیت و وقعت نہیں ہے مگر وہ بھی اللہ کے اقتدار کے سامنے دم نہ مار سکیں اور ان میں سے ہر ایک کو حکم الٰہی اور قضائے خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا پڑا اور جب بھی کسی نے سرکشی کی اسے ہلاک کر دیا گیا اس لئے محض اپنی طاقت اور ظاہری شان و اقتدار پر گھمنڈ کرنا کسی مخلوق کے لیے زیبا نہیں ہے۔ غرور اور تکبر کا نتیجہ اور سرکشی کی سزا ہمیشہ تباہی و بربادی رہی ہے قوم عاد و ثمود، قوم حضرت نوح اور بادشاہانِ یمن کی قوی ترین سلطنتیں تباہ کر دی گئیں تو کفار مکہ کی کیا حیثیت تھی اس لئے صرف اپنی شان و شوکت اور عزت و اقتدار کے بل بوتے پر ایک غلط بات کہنا اور قیامت کا انکار کر دینا، نشر و حشر کا مذاق اڑانا اور پیغمبر کی تکذیب کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے ہم نے جس طرح ان قوموں کو جرمِ انکارِ حق میں تباہ کیا تم کو

بھی ہلاک و برباد کر سکتے ہیں۔ یہ تو اس لیئے فرمایا گیا کہ ان کافروں کا غرور توڑ دیا جائے اور پھر وہ اس کی جراءت نہ کر سکیں کہ بغیر پوری طرح سوچے سمجھے کوئی بات منہ سے نکالیں اور قیامت کا انکار کرنے اور حشر و نشر کا مذاق اڑانے سے قبل یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں اور کس بات کی اور کس شخص کی تکذیب کر رہے ہیں اس کے بعد پھر انہیں دلیل کے ساتھ سمجھایا جا رہا ہے: "وما خلقنا السموٰت والارض وما بینھما لاعبین" ہم نے آسمانوں اور زمین اور اس تمام مخلوق کو جو ان کے درمیان ہے بیکار اور عبث نہیں خلق کیا جس کی کوئی غرض اور کوئی حکمت نہ ہو۔ اس قرآنی ارشاد پر ہم جتنا غور کریں گے ہمارے سامنے یہ حقیقت ظاہر ہو جائے گی کہ اس کائنات کی کوئی چیز حکمت و مصلحت سے خالی نہیں ہے۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہم میں سے کوئی عقل رکھنے والا انسان کبھی کوئی کام بغیر کسی مقصد و غرض کے نہیں کرتا تو بالکل ظاہر ہے کہ خالق کائنات اور وہ ذات جو تمام کمالات کا مرکز ہے اس کا کوئی کام بغیر کسی حکمت و مصلحت کے کیسے ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے جہاں قیامت کے عقیدے پر دوسری دلیلیں پیش فرمائی ہیں خلقت کائنات کے عبث اور بیکار نہ ہونے کو بھی بہت زور دے کر بیان کیا ہے کیونکہ جب یہ حقیقت اپنے مقام پر ثابت ہے کہ تمام کائنات کی تخلیق کسی نہ کسی مصلحت سے وابستہ ہے تو یقیناً انسان کی خلقت بھی کسی خاص مقصد اور غرض کے لیئے کی گئی ہے جس کا انجام دینا انسان کی زندگی کا حاصل اور اس کا سب سے بڑا فرض ہے اور چونکہ انسان تمام مخلوقات سے افضل ہے اس لیے اس کی تخلیق کا مقصد بھی سب سے اعلیٰ اور بلند تر ہونا چاہیئے اور وہ صرف یہ ہے کہ وہ خالق کائنات کی مرضی اور اس کے احکام پر عمل کرے۔ اللہ نے اس کو عقل دی ہے، اچھے اور برے کی تمیز عطا کی ہے اور انبیاء و مرسلین بھیج کر، کتابیں نازل کر کے اور آیات و معجزات دکھا کر اسے اپنی مرضی سے آگاہ فرما دیا ہے۔ اب انسان کا فرض ہے کہ وہ برے اور اچھے راستوں کو اچھی طرح سمجھ لے اور وہ راہ اختیار کرے جو صحیح و درست ہو۔ اور اتنے اتمام حجت کے باوجود اور عقل و فہم حاصل ہونے کے ساتھ اگر وہ حق کا انکار کرے گا اور غلط راستہ اختیار کرے گا تو یقیناً وہ سزا کا مستحق ہوگا اور اگر صحیح راہ اختیار کرے گا تو جزا پائے گا۔ لیکن یہ سزا اور جزا اسی وقت ملنا چاہیئے جب عملی زندگی بالکل ختم ہو جائے اور پھر توبہ

استغفار کا بھی موقع باقی نہ رہے کیونکہ اس دنیا کی زندگی میں اگر گناہ سرزد ہو جائے تو استغفار کا بھی موقع اور توبہ کی بھی گنجائش باقی رہتی ہے اس لیئے آخری طور پر سزا اور جزا کا فیصلہ اس زندگی میں نہیں کیا جا سکتا ہو سکتا ہے جو آج گناہگار ہے وہ کل توبہ کر لے اور گناہ سے پاک ہو جائے۔ آج کفر و شرک میں مبتلا ہو اور کل ایمان کی بلند منزل پر فائز ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ دنیا کی پوری زندگی میں عمل اور فرائض کی انجام دہی کا سلسلہ باقی رہنا ہے اس لیے یقیناً جزا و سزا کا مقام اور زمانہ وہ ہونا چاہیے جو اس زمانہ اور اس دار العمل کے بعد ہو اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جب جزا و سزا اس دنیا میں نہیں مل سکتی بلکہ اس کے بعد ملیگی تو سوال پیدا ہوگا کہ جب عمل کرنے والے باقی ہی نہ رہے تو جزا و سزا کسے ملے گی اس لیئے اگر انسان کو دوبارہ نہ جلایا جائے اور حشر و نشر نہ ہو تو سزا و جزا کس کو دی جائے گی وہاں تو کوئی بھی موجود نہ ہوگا اس لیے جب نظریۂ جزا و سزا ایک ناقابل انکار بات ہے تو انسان کو دوبارہ زندگی ملنا، حشر و نشر اور قیامت کا آنا بھی برحق اور یقینی ہے اسی مضبوط دلیل کی طرف ان آیات میں اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کی خلقت ایک مستحکم قانون اور ایک بڑے مقصد اور ایک گہری حکمت کے تحت ہے اور اسے اس کے اعمال کا بدلہ دینے کے لیے قیامت کا آنا اور اسے دوبارہ زندگی ملنا ضروری ہے۔ ان آیات کریمہ میں جس بادشاہ "تُبَّع" کا ذکر ہے وہ یمن کا سلطان تھا۔ اس کا نام "اسعد ابو کرب" تھا اس زمانہ میں یمن کے بادشاہوں کو "تبع" کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ اس کی قوم مشرک تھی۔ یہ خود بھی پہلے مشرک ہی تھا مگر بعد میں دین حضرت موسیٰ علیہ السلام میں داخل ہوا اور اسی دین کی اپنے ملک میں تبلیغ کرتا رہا۔ اس کا زمانہ سلطنت حضور سرور دو عالم سے سات سو سال قبل تھا۔

(درس ۱۲۴) اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِیْمِ ۝ کَالْمُهْلِ ۚ یَغْلِیْ فِی الْبُطُوْنِ ۝ کَغَلْیِ الْحَمِیْمِ ۝ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰی سَوَآءِ الْجَحِیْمِ ۝ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ عَذَابِ الْحَمِیْمِ ۝ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْكَرِیْمُ ۝ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ ۝ اِنَّ

الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ۝ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ۝ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ۝ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ۝ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ۝

پارہ ۲۵ رکوع ۱۶ (۱۷ آیات) سورۂ دخان

بیشک زقوم کا درخت گنہگار کی غذا ہے۔ جیسے پگھلا ہوا تانبا وہ پیٹوں کے اندر اس طرح ابال کھائے گا جیسے سخت کھولتا ہوا پانی ابلتا ہے۔ اس کو گرفتار کر لو۔ پھر گھسیٹتے ہوئے دوزخ کے بیچوں بیچ لیجاؤ اور اس کے سر پر کھولتے ہوئے پانی کا عذاب ڈالدو۔ مزہ چکھ لے! تو بڑا عزت و اکرام والا تھا! یہ وہی چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے بے شک خدا سے ڈرنے والے امن کی جگہ میں ہوں گے۔ باغوں اور چشموں میں باریک اور دبیز ریشمی لباس پہنے آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہ بات اسی طرح ہے اور ہم بڑی بڑی آنکھوں والی حوروں سے ان کی تزویج کر دیں گے۔ وہاں وہ اطمینان سے ہر قسم کے میوے منگوائیں گے۔ وہ وہاں موت کا ذائقہ نہ چکھیں گے سوائے پہلی موت کے اور خدا انھیں دوزخ کے عذاب سے بچالے گا۔ یہ سب کچھ تمہارے پروردگار کا فضل ہے۔ یہی تو بڑی کامیابی ہے۔ تو ہم نے اس قرآن کو تمہاری زبان میں آسان کر دیا ہے تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں تو تم بھی انتظار کرو۔ یہ لوگ بھی منتظر ہیں۔

تشریح و تفسیر:۔ "زقوم" کے متعلق علامہ بیضاوی نے لکھا ہے کہ یہ ایک درخت کا نام ہے جو عربستان کے خطہ تھامہ میں بکثرت پیدا ہوتا ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں اس سے ملتا جلتا تھوہر کا درخت ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس کے پھلوں کی تشبیہ سانپوں کے پھنوں سے دی گئی ہے چنانچہ سورۂ "صافات" میں ارشاد ہوا ہے "اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ۝ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ" اسی طرح کا ایک درخت ہے جو جہنم کی تہہ میں اُگتا ہے اور آگ پر پرورش پاتا ہے اور اس

کے پھل ایسے ہیں جیسے سانپوں کے پھن ہوا کرتے ہیں۔ یہاں پر اذیت رسانی
اور خباثت کی وجہ سے سانپوں کو شیاطین فرمایا گیا ہے۔ اسی قسم کا ایک انتہائی
بدمزہ اور تکلیف دہ درخت جہنم میں ہوگا اور اسی کو جہنمیوں کی غذا قرار دیا جائے گا۔
"اَثِیْم" کے معنی گنہگار کے ہیں اور "مُھْل" تیل کی تلچھٹ، پیپ اور پگھلے
ہوئے تانبے اور رانگے کو کہا جاتا ہے۔ "حمیم" سے مراد سخت کھولتا ہوا پانی ہے۔
"اِسْتَبرق" موٹے ریشمی کپڑے کو اور "سُنْدُس" ریشمی کپڑے کی ایک لطیف
قسم کو کہتے ہیں۔

اِن آیات میں جہنم والوں کی حالتِ زار کا ذکر ہے اور ارشاد ہو رہا ہے کہ اِن کی غذا
"زَقُّوم" کا درخت ہوگی اور جب مجبور ہو کر اہلِ جہنم اس کو کھائیں گے تو وہ جسم میں
داخل ہو کر پیپ یا پگھلے ہوئے تانبے یا رانگے کی طرح ابلے گا جیسے سخت کھولتا ہوا پانی
اُبال کھاتا ہے پھر فرشتوں کو حکم ہوگا۔ اس گنہگار کو گرفتار کر لو! اور گھسیٹ کر
دوزخ کے بیچ میں لیجاؤ جہاں اس کے سر پر شدت سے کھولتا ہوا اور جوش کھاتا
ہوا پانی انڈیل دو اور پھر حقارت کے ساتھ خطاب ہوگا: "ذُقْ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ
الْكَرِيْمُ"۔ اس عذاب کا مزہ چکھ لے! تو بڑا عزت و عظمت والا ہے۔ دنیا کی زندگی میں
ہر طرح حجت تمام کر دی گئی تھی اور کھول کر بتا دیا گیا تھا کہ گناہ کرنے کی سزا یہ ملے گی
مگر اِن کی آنکھیں نہ کھلیں اور اس نے اللہ کے مقدس اور برگزیدہ رسولوں کی
باتوں اور ہدایتوں کا مذاق اڑایا اور ان کی تکذیب کرتا رہا۔ وہ سمجھتا تھا کہ دنیاوی زندگی
کے بعد پھر کوئی زندگی نہ آئے گی اور دوبارہ حیات ملنا ممکن نہیں ہے اس لئے جو چاہو
کرو کوئی نہ محاسبہ کرنے والا ہے اور نہ سزا دینے والا ہے۔ دل بھر کر گناہ کرو، ظلم و
جور کرو، فساد برپا کرو، دوسروں کی عزت و آبرو پر حملے کرو، بے گناہوں کو ستاؤ
لوٹ مار کرو۔ نہ تو کوئی دیکھنے اور سننے والا ہے اور نہ کسی کے سامنے کبھی باز پرس
کے لیے جانا ہے۔ اللہ نے قرآن کریم میں ہر بات واضح فرما دی ہے اور شک و شبہ
کے جتنے پہلو تھے اُن سب کو صاف فرما دیا ہے قرآن کریم کا اعلان ہے کہ جس قادرِ
مطلق میں اتنی طاقت ہے کہ وہ انسان کو اس وقت زندگی دیدے جب اُس کا دنیا

میں نام ونشان بھی نہ تھا تو پھر اس کے لئے ایک مرتبہ زندگی دینے کے بعد دوبارہ حیات عطا کرنا کیا مشکل ہوگا۔ انسان سمجھتا تھا کہ اس کے اعمال اور اس کی حرکتوں کا محاسبہ کرنے والا کوئی موجود نہیں ہے۔ خدا کا ارشاد ہے "ولقد خلقنا الانسان ونعلمُ ماتُوَسْوِسُ بہ نفسُہٗ ونحن اقربُ الیہ من حبل الورید" ہم نے انسان کو خلق کیا ہے اور جو خیالات اس کے دل میں گذرتے ہیں ہم ان سب کو جانتے ہیں اور ہم تو اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ نزدیک ہیں۔ جب وہ کوئی کام کرتا ہے تو دو لکھنے والے فرشتے جو اس کے داہنے بائیں ہیں بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔ کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اسکے پاس تیار رہتا ہے۔ جب موت کی بیہوشی طاری ہوگی تو ہم بتا دیں گے کہ یہی تو وہ وقت اور وہ امر ہے جس سے بھاگا کرتا تھا اور جب قیامت کا صور پھونکا جائیگا تو وہی عذاب کے وعدے کا دن ہوگا۔ "وَجَاءَ کُلُّ نفسٍ معہا سائقٌ وَّشہیدٌ" اور ہر شخص اللہ کے سامنے اس طرح حاضر کیا جائے گا کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ اس کو لیجانے والا ہوگا اور دوسرا فرشتہ وہ ہوگا جو اس کے اعمال کا گواہ ہوگا، سب فرشتوں کو حکم ہوگا کہ تم ہر سرکش ناشکرے کو دوزخ کی آگ میں ڈال دو جو نیکیوں کو روکتا تھا، اپنی حد سے گذر گیا تھا اور حق باتوں میں شک کیا کرتا تھا اور یہ وہ تھا جس نے خدائے واحد و قدوس کے ساتھ دوسرے معبود بنا رکھے تھے۔

قرآنِ کریم کے صریحی اعلانات کو دیکھ کر کسے اس میں شبہ باقی رہ سکتا ہے کہ انسان کا ہر فعل اور ہر قول بلکہ اس کے تخیلات تک اللہ کے علم میں ہیں۔ ابر سے کوئی قطرہ نہیں گرتا اور درخت کا کوئی پتا حرکت نہیں کرتا مگر خدا اس کو جانتا ہے۔ خلاق عالم خود بھی ہماری ہر چیز اور ہر بات سے واقف ہے اور اس نے ایسے فرشتے بھی مقرر فرما دیئے جو ہماری ہر بات لکھا کرتے ہیں اور پھر ہمارے اعضاء و جوارح کو بھی ہمارے اعمال کا گواہ مقرر فرما دیا گیا ہے جو قیامت میں ہماری پوشیدہ اور ظاہری تمام باتوں کی گواہی دیں گے جس کے لئے قرآن کا ارشاد ہے: "یَوْمَ تَشْہَدُ علیہم السنتُہم وایدیہم وَاَرْجُلُہم بما کانوا یعملون" جب مجرموں کے خلاف خود ان کی زبانیں اور ہاتھ پاؤں ان کے کرتوتوں اور اعمال کی گواہی دیں گے۔ غرض انسان کی یہ چند

روزہ زندگی صرف پیٹ بھرنے اور دوسرے قسم کی حیوانی حرکات کا اور مادی لذتوں کے حصول کا نام نہیں ہے۔ انسان اس مشینی زندگی سے اونچا ہے۔ اسکی زندگی نام ہے کچھ فرائض اور احساسات کا۔ کچھ ذمہ داریوں اور پابندیوں کا جو اللہ اور اس کی تمام مخلوق کی طرف سے اس پر عائد ہوتی ہیں اور اگر وہ اپنی ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کرے گا تو وہ کسی طرح انسان کہے جانے کا استحقاق نہیں رکھتا۔

(درس ۱۱۱) حٰمٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۝ اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ وَ فِيْ خَلْقِكُمْ وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ اٰيٰتٌ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ اٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَيْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ۝ يَّسْمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُتْلٰى عَلَيْهِ ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ يَسْمَعْهَا ۚ فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۷ (۸ آیات (سورۂ جاثیہ)

حٰمٓ۔ یہ کتاب غالب، حکمت والے اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ بیشک آسمان اور زمین میں ایمان والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں اور خود تمہاری خلقت میں اور جن جانداروں کو وہ زمین پر پھیلاتا رہتا ہے۔ یقین رکھنے والی قوم کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ اور رات دن کے بدلنے میں اور جو کچھ خدا نے آسمان سے رزق نازل فرما کر اس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی عطا کی ہے اور ہواؤں کے بدلنے میں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں دلیلیں ہیں۔ یہ خدا کی آیتیں ہیں جنکو ہم حق کے ساتھ تمہارے سامنے پڑھتے ہیں۔ تو خدا اور اس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔ افسوس ہے ہر ایک جھوٹے اور گنہگار پر۔ کہ وہ خدا کی آیتوں کو سنتا ہے جو اس کے سامنے پڑھی جاتی ہیں پھر بھی وہ غرور تکبر کرتا ہوا اس طرح اڑا دیتا ہے جیسے ان آیتوں کو اس نے سنا ہی نہیں تو ایسے شخص کو دردناک عذاب کی

خبر پہنچا دو۔

تشریح و تفسیر:۔ یہ سورۂ "جاثیہ" کی ابتدائی آیات ہیں اس سورہ میں قرآنِ کریم کا آسمانی کتاب ہونا۔ خدا کے وجود پر دلیلیں اور اس کی قدرت پر نشانیاں بنی اسرائیل کی حالت، قیامت کے مناظر جہنم میں گنہگاروں کی حالت زار۔ اِن تمام باتوں کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور سب سے پیشتر اس کا اعلان ہے کہ یہ کتاب یعنی قرآنِ کریم کسی مخلوق کی ایجاد اور تخلیق نہیں ہے بلکہ یہ خدائے عزیز و حکیم کی جانب سے نازل ہوئی ہے ایسا خدا جو کوئی کام بغیر مصلحت و حکمت کے نہیں کرتا اور جو عالمین کے اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہے۔ اس کے بعد انسان کی توجہ ان نشانیوں کی طرف کی گئی ہے جو خدائے قادر و عزیز کی لازوال طاقت و اقتدار پر آسمانوں اور زمین کے چپہ چپہ پر پھیلی ہوئی ہیں زمین و آسمان میں ہر جگہ یہ آیتیں اور نشانیاں موجود ہیں اور ہر صاحبِ بصیرت کی نظر میں روشن اور واضح ہیں اگر ذرا بھی غور کیا جائے اور دل کی آنکھ سے دیکھا جائے تو زمین کا ہر ذرہ اور پانی کا ہر قطرہ خدا کی عظمت اور خالق عالم کی قدرتوں کی گواہی دیتا ہوا معلوم ہوگا۔ انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنی عقل سے کام لے اور ان نشانیوں پر غور کرے جن میں سے ہر ایک خدائے واحد کے جلال و جبروت پر گواہ ہے۔ ایک طرف آسمان کی نیلی چادر پر خوبصورت ستاروں کا چھڑکاؤ، سورج اور چاند کی خلقت اور ان کے طلوع و غروب کا نظم۔ دن اور رات کا آنا جانا۔ فصلوں کی مناسبت اور ان کی صحیح وقت پر تبدیلی۔ جہاں جس چیز کی ضرورت تھی وہاں اس کا وجود، نعمتوں اور نشانیوں کا ایک بڑا دفتر ہے۔ ذرہ سے لیکر آفتاب تک اور ماہ سے لیکر ماہی تک اور ثریٰ سے لیکر ثریا تک کون سی چیز ایسی ہے جو خدا کی ہستی اور اس کی قدرت پر گواہی نہ دیتی ہو انسان تو ایک معمولی خاک کے ذرہ کی حقیقت اور گلی اور سڑی ہوئی پتی کی ماہیت و اصلیت کو نہیں جانتا اور جو کچھ بھی جانتا ہے وہ صرف کچھ صفتیں ہوتی ہیں جو کسی چیز میں پائی جاتی ہیں مگر وہ چیز اصل میں کیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا اور اس علمی فقر و سراسیمگی کے باوجود جبکہ انسان کا علم صرف چند سطحی باتوں میں محدود ہے اور وہ اس عالم کی بے شمار چیزوں کا کوئی علم نہیں رکھتا اس کا غرور و تکبر کوئی حقیقت اور وقعت نہیں رکھتا۔ قرآنِ کریم نے اجمالی طور پر اکثر و بیشتر مقامات پر کائنات کی تخلیق

اور زمین و آسمان میں پھیلی ہوئی اس کی نشانیوں کا تذکرہ فرمایا ہے تاکہ انسان کی آنکھ کھل جائے اور وہ یہ سمجھنے کی کوشش کرے کہ آیاتِ الٰہی کا یہ ایک لامحدود سمندر ہے جس کا نہ کوئی کنارہ ہے اور نہ اس کی تہہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ زمین و آسمان کی بے شمار مخلوقات ہیں جو اللہ کے کمالِ قدرت پر گواہی دے رہی ہیں اور انسان ان کے سمجھنے سے عاجز ہے صرف ایک چھوٹے سے پھول کو لے لیجئے یہ اس مٹی سے نکلا ہے جو بظاہر بے جان تھی دیکھئے اس کے ایک ایک ورق پر، اس کی ایک ایک پنکھڑی پر قلمِ قدرت نے وہ نقش بنائے ہیں جنہیں دیکھ کر عقلیں حیران رہ جاتی ہیں اس ایک پھول میں رنگ بھی دیا خوشبو بھی عطا کی نقش و نگار بھی بنائے ایک ایک پتی میں لاکھوں رگوں کے جال بچھا دیئے اور ہر ہر رگ سے اس ننھے سے پھول کی غذا پہنچا دی ایک ہی پانی تھا مگر اللہ نے اسے ہر پھول کی غذا بنایا اور اسی ایک پانی سے ہر پھول میں نیا رنگ اور نئی خوشبو بخشی۔ یہی مٹی اور پانی ہے جس سے اس قادرِ مطلق نے کروڑہا شکلیں اور صورتیں بنائیں جن میں ایک شکل دوسری سے نہیں ملتی۔ پھول کی پنکھڑی کتنی نازک ہے کہ اگر ہاتھ چھو جائے تو اس کا رنگ اتر جائے مگر اللہ رے نزاکتِ قلمِ قدرت جس نے کروڑوں خط کھینچے مگر کہیں بھی اس پھول کے دامن پر دھبّا تک نہ آیا۔ ایک خط دوسرے خط سے ٹکرا نہ سکا۔ کبھی ایک ورقِ گل پر طرح طرح کے رنگ پیدا کر دیئے نہ سفیدی سیاہی سے ملنے پاتی ہے نہ سرخی سبزی سے بدلتی ہے۔ نہ وہ رنگ پانی سے دھلتے ہیں نہ ہوا کے تھپیڑوں سے خراب ہوتے ہیں بلکہ جتنا پانی پڑتا ہے ان کا نکھار بڑھتا ہے۔ جس قدر اوس گرتی ہے انکی رنگینی میں اضافہ ہوتا ہے کائناتِ عالم کی ہر چیز بتاتی ہے کہ کوئی ہے قدرت و حکمت والا جس نے ان سب کو پیدا کیا اور ان کی زندگی میں عظیم ربط و تناسب عطا فرمایا ہے لیکن آیتیں اور نشانیاں کور باطنوں اور غفلت شعار حیوان نما انسانوں کو کچھ فائدہ نہیں دیتیں اس لئے کہ وہ خود ہی ان سے سبق نہیں لیتے ہاں جو ایمان رکھتے ہیں ان کی نگاہیں ان نشانیوں کو دیکھ کر حقیقت کی گہرائیوں تک اتر جاتی ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ شب و روز کی گردش یہ کائنات کا عظیم سلسلہ اور ان کا بے نظیر نظم و ترتیب یہ زمین کے بے جان ذرّوں کی اعجاز نمائیاں اور یہ پانی، ہوا

اور آگ کی حیرت انگیز کرشمہ سازیاں صاف صاف بتاتی ہیں کہ ان سب کا کوئی عظیم خالق ہے جس نے ہر چیز کو حکمت و مصلحت کے ساتھ خلق فرمایا ہے۔ زندگی اور موت اُسی کے دستِ قدرت میں ہے وہ سمیع و بصیر ہے وہ علیم و خبیر ہے اس کی ذات ہر کمال کا مرکز ہے وہی عذاب نازل کرنے والا ہے اور وہی اپنے بندوں پر رحم بھی کرتا ہے کون ہے جو اس کی طاقت کے سامنے اس کے جبروت و اقتدار کے سامنے سر اٹھا سکے اور اس کے حکم سے سرتابی کر سکے۔ یہ اس کی مرحمت ہے کہ اس نے ہمیں حیات دنیوی کے چند لمحے عطا کیے ہیں تاکہ ہمارے اعمال کی جانچ کی جائے اور ہمیں اللہ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کا موقع مل سکے اور ہم اطاعت کرکے اور اس کی بارگاہ قدس کے سامنے سر نیاز جھکا کر اس مقام تک پہنچنے کا اہل بن سکیں جو اس نے ہمارے لیے مقرر فرمایا ہے۔ عظمت و کبریائی اسی کی ذات کے لیے زیبا ہے ہماری اُس کے سامنے کیا حقیقت و عزت ہے۔ جو کچھ بھی ہمارے پاس ہے وہ سب اسی کا عطیہ ہے ورنہ ہم جانتے ہیں کہ ہم کس نجس شئے سے بنے ہیں اور ہمارے جسموں کے اندر کتنی نجاستوں کا انبار ہے اور مرنے کے بعد ہمارا نتیجہ کیا ہوگا کہ ہمارے عزیز ترین دوست اور قریب ترین رشتہ دار اور چاہنے والے بھی چند لمحوں کے لیے بھی ہمارے پاس بیٹھنا اور ہمیں ہمارے ہی گھر میں رکھنا گوارا نہ کریں گے اور اچھے یا برے طریقوں سے جو کچھ بھی ہم نے دولت جمع کی ہے اور جائدادیں حاصل کی ہیں ان میں سے کچھ بھی ہم اپنے ساتھ نہ لے جا سکیں گے اور وہ سب دوسروں کا ہو جائے گا اور ہم چند گز کفن لیکر قبر کی تاریکیوں میں روپوش ہو جائیں گے۔ اس زندگی، اس ناقص علم و فہم، اس حقیر ابتدا و انتہا اور اس افسوسناک اور عبرتناک نتیجہ کے باوجود انسان کا غرور و تکبر اور یہ شان و شوکت اور بڑائی۔ دوسروں کو اپنے مقابلہ میں حقیر و ذلیل جاننا اور ذرا سی عزت ملنے پر کسی سے سیدھے منہ بات تک نہ کرنا کسی طرح زیبا نہیں ہے۔ "وَيْلٌ لِّكُلِّ أَفَّاكٍ أَثِيمٍ" ہر گنہگار اور جھوٹے کے لئے افسوس اور بربادی ہے جو خدا کی آیتوں کو اپنے کانوں سے سنتا ہے "ثُمَّ يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَأَن لَّمْ يَسْمَعْهَا" مگر پھر بھی اپنے غرور و تکبر پر اڑا رہتا ہے جیسے اس نے ان آیتوں کو سنا ہی نہیں "فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ" اے پیغمبر ایسے ناشکرے اور بدقسمت انسان

کو دردناک عذاب کی خبر دیدو کیونکہ جب یہ لوگ ان کھلی ہوئی نشانیوں کو دیکھ کر خدا کی عظمت نہ سمجھ سکے تو پھر اس کے بعد وہ کس دلیل سے ایمان اختیار کریں گے " فَبِاَیِّ حَدِیۡثٍۭ بَعۡدَ اللّٰہِ وَ اٰیٰتِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ " اس لیے اب تو عذاب الیم کے سوا ان کی کوئی دوسری سزا نہیں ہے۔ ان کے لیے ویل ہے اور افسوس ہے اور بربادی وتباہی ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی جو زبان کے جھوٹے کام کے گنہگار اور دل کے کافر ہیں ان آیات میں تین لفظیں استعمال فرمائی گئی ہیں پہلے " للمؤمنین " پھر " یُوۡقِنُوۡنَ " اور آخر میں " یَعۡقِلُوۡنَ " یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جب انسان آسمانوں اور زمین کی مخلوقات پر نظر کرے گا اور سمجھنے کی کوشش کرے گا تو ایمان لانے پر مجبور ہوگا اور جب خود اپنے نفس کا مطالعہ کرے گا تو یقین کی منزل پر آئے گا اور جب تمام حوادث عالم اور لیل و نہار کی گردش اور انتظام عالم پر نگاہ ڈالے گا تو اس یقین میں استحکام پیدا ہوگا۔

(درس ۱۲۸) وَ اِذَا عَلِمَ مِنۡ اٰیٰتِنَا شَیۡـًٔاۨ اتَّخَذَہَا ہُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ عَذَابٌ مُّہِیۡنٌ ؕ﴿۹﴾ مِنۡ وَّرَآئِہِمۡ جَہَنَّمُ ۚ وَ لَا یُغۡنِیۡ عَنۡہُمۡ مَّا کَسَبُوۡا شَیۡئًا وَّ لَا مَا اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَوۡلِیَآءَ ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ؕ﴿۱۰﴾ ہٰذَا ہُدًی ۚ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا بِاٰیٰتِ رَبِّہِمۡ لَہُمۡ عَذَابٌ مِّنۡ رِّجۡزٍ اَلِیۡمٌ ﴿۱۱﴾ اَللّٰہُ الَّذِیۡ سَخَّرَ لَکُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِیَ الۡفُلۡکُ فِیۡہِ بِاَمۡرِہٖ وَ لِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِہٖ وَ لَعَلَّکُمۡ تَشۡکُرُوۡنَ ﴿ۚ۱۲﴾ وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّتَفَکَّرُوۡنَ ﴿۱۳﴾

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۷ کی آخری اور رکوع ۱۸ کی ابتدائی (۵) آیات) سورۂ جاثیہ

اور جب وہ ہماری آیتوں میں سے کسی آیت سے واقف ہوجاتا ہے تو اس کی ہنسی اڑاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ان کے پیچھے دوزخ ہے اور جو کچھ انہوں نے حاصل کیا تھا وہ انہیں کچھ بھی نفع نہ دے گا اور نہ وہ کچھ کام آئیں گے جن کو انہوں نے اللہ کے سوا اپنا سرپرست بنا رکھا

تھا اور ان کے لیئے تو بہت بڑا عذاب ہے یہ (قرآن) ہدایت ہے اور جن لوگوں نے
اپنے رب کی آیتوں کو نہ مانا ان کے لیئے بہت سخت دردناک عذاب ہے۔ خدا
ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا تاکہ اس کے حکم سے اس میں کشتیاں
چلیں اور تم اس کا فضل و کرم تلاش کرو اور شاید تم شکر بجا لاؤ اور جو کچھ
آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے اپنی جانب سے تمہارا مطیع
کر دیا۔ غور و فکر کرنے والی قوم کے لیئے یقیناً اس میں نشانیاں ہیں۔

تشریح و تفسیر:- ناسمجھ لوگ قرآن کریم کی آیتوں اور حکیمانہ ارشادات کا مذاق
اڑاتے رہے ہیں ان کو بتایا گیا ہے کہ آج جس طرح ان آیات پر استہزا کرتے ہیں
اور ان پر ہنستے ہیں کل ہم ان لوگوں کو اس اہانت و توہین کی سزا دیں گے اور انہیں
عذاب الیم میں گرفتار کریں گے اور وہ عذاب دوزخ کی آگ ہے جس سے ان کا
دنیاوی مال و متاع، قوت و طاقت، اقتدار اور حمایت کرنے والے۔ کوئی بھی
نہ بچا سکے گا۔ کوئی بھی شک و شبہ اس میں ممکن نہیں ہے کہ قرآن کریم سر تا سر ہدایت
ہے اور جو شخص اس کے ہدایت ہونے سے انکار کرے گا اس کی سزا نار جہنم ہے۔
اور یہ عذاب اس وجہ سے ہوگا کہ قرآن کریم نے جن حقائق کو نمایاں کیا ہے
اور کائنات کے جن رازوں کو بے نقاب کیا ہے وہ عقل سلیم کے لیئے ناقابل انکار
ہیں۔ قرآن مجید میں تاریخی مضبوط قدریں ہیں جن میں قوموں کے عروج و زوال کے
اسباب پر روشنی ڈالی گئی ہے اور اُن سے جو حقائق سامنے آتے ہیں ان میں انسانی
ارتقا و تمدن کے مسائل کا صحیح حل تلاش کیا جا سکتا ہے انسانی تاریخ کے جن
پہلوؤں کو قرآن کریم نے اجاگر کیا ہے وہ ہر دور کی انسانی نسل کے لیے اُن کی
تمدنی تربیت کی بہترین بنیادیں ہیں اسی طرح قرآن کریم نے انسانی زندگی کے مختلف
پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے، اس کی فلاح و بہبود کے راستے بتائے ہیں اس
کی کمزوریوں اور خوبیوں پر بحث کی ہے۔ کائنات عالم کی تخلیق کے تفصیلات بیان
کیئے ہیں۔ انسان کی سوئی ہوئی عملی طاقتوں کو ابھارا ہے اور اُسے اس کا صحیح مقام
اور اصلی منزلت سے آگاہ کیا گیا ہے اُسے اس کے فرائض بتائے ہیں، زندگی کے
عروج و زوال کے سربستہ رازوں سے روشناس کیا ہے اچھے کاموں اور نیکیوں
کی جزا بتائی ہے اور بُرے اعمال کی سزا سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ خدائی طاقتوں اور

اُس کے اقتدار و علم و حکمت کو اس واضح طریقہ پر سمجھایا گیا ہے جس کی مثال کسی دوسری کتاب میں نہیں ملتی۔ عقل رکھنے والوں کے لیے بلاشبہ قرآن کریم کی ایک ایک سطر معرفت و نصیحت، عبرت و حقائق کا ایک مرقع ہے اور ازلی اور ابدی حقیقتوں کا ایک عظیم شاہکار ہے۔ اتمام حجت کے ہر راستہ کو طے کرنے کے بعد، عقل و نبوت و ہدایت کی ہر منزل گذر جانے کے بعد اب قرآن حکیم کا یہ حق ہے کہ وہ ان بے بصیرت انسانوں کے لیے عذاب الیم کا کھلے الفاظ میں اعلان فرما دے جو اتنی روشن نشانیوں کے بعد بھی خدا پر ایمان نہ لائے اور خالق کائنات کے وجود کا یقین نہیں رکھتے۔ "اولٰئک لھم عذاب مھین" اُن کے لیے سخت ذلت کا عذاب ہے۔ "من ورآئھم جھنّم" ان کا نتیجہ جہنم ہے "وَرَآءِ" کا استعمال جس طرح سامنے کے معنی میں ہوتا ہے اسی طرح پیچھے کے معنی میں بھی۔ عربی زبان میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کا استعمال متضاد معانی میں ہوا کرتا ہے جیسے لفظ "جَوْن" جس کے معنی سفید کے بھی ہیں، سیاہ کے بھی ہیں اور سرخ کے بھی ہیں اب محض قرینوں اور اندازِ عبارت اور طریقۂ گفتگو یا طرز تحریر سے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ کس مقام پر اس کے کیا معنی ہیں اسی طرح لفظ "وَرَاءِ" بھی سامنے اور پیچھے دونوں معنوں کے لیے بولا جاتا ہے اور مراد یہ ہے کہ ایسے سیاہ کار انسانوں کے سامنے جہنم ہے یا یہ مطلب ہے کہ جہنم تو ان کے پیچھے ہی پیچھے ہے اور وہ کسی طرح اُس کی آگ اور اس کے عذاب سے جان نہیں بچا سکتے۔ اس عذاب سے اُن کو ان کی دولت بھی نہیں بچا سکتی اور نہ ان کی اولاد اور ان کے رشتہ دار بچا سکتے ہیں کیونکہ یہ ان کی بداعمالی کا نتیجہ ہے اور یہ عذاب اس عظیم ذات کے حکم سے ہے جس کی طاقت و قوت کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا اور نہ اس کے حکم کو ٹالا جا سکتا ہے اس کے بعد پھر خدا کی نعمتوں کا تذکرہ شروع کر دیا گیا ہے اور اس کی تکرار اس لیے کی گئی ہے تاکہ غفلت کے پردے ہٹ جائیں اور انسان یہ سمجھ لے کہ اس کائنات کی کوئی چیز اور کوئی مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جس کو اللہ نے نہ بنایا ہو اور جو کچھ بھی انسان کے پاس ہے اور جن جن چیزوں سے وہ فائدہ حاصل کرتا ہے وہ سب ہی تو خدا کی خلق کی ہوئی ہیں وہ فرماتا ہے "اللہ الذی سخر لکم البحر لتجری الفلک فیہ بامرہ ولتبتغوا من فضلہ ولعلکم تشکرون" خدا ہی تو ہے جس نے تمہارے لیے سمندر کو مسخر کر دیا ہے

تاکہ اس کے حکم سے اُس میں کشتیاں رواں ہوں اور تم جہاں مرضی ہو خدا کا رزق تلاش کرنے کے لیئے ان کشتیوں میں سفر کرو۔

دنیا میں سمندر پانی کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے۔ تمام سمندروں میں سب سے بڑا بحرالکاہل ہے جس کا رقبہ چھ کروڑ اڑتیس لاکھ ایک ہزار مربع میل ہے اور زیادہ سے زیادہ گہرائی ۳۵ ہزار چار سو فٹ ہے۔ بحراوقیانوس کا رقبہ چار کروڑ تیرہ لاکھ ۲۲ ہزار مربع میل ہے اور زیادہ سے زیادہ گہرائی ۲۷ ہزار نو سو ۶۲ فٹ ہے ان کے علاوہ اور بھی سمندر موجود ہیں پھر ان ہی سمندروں سے ندیاں نکلی ہیں ان سب کے علاوہ جھیلیں بھی موجود ہیں وکٹوریہ جھیل جو یوگنڈا (افریقہ) میں ہے دنیا کی عظیم ترین جھیل ہے جس سے دریائے نیل نکلا ہے یہ سب پانی کے ذخیرے ہیں۔ ہمارے سارے کرۂ ارض، کا کل رقبہ انیس کروڑ ستر لاکھ مربع میل ہے لیکن اُس کے ستر فی صد حصّہ میں پانی ہے اور باقی صرف تیس فیصد حصّہ میں خشکی ہے اس خشکی میں آبادیاں بھی ہیں اور ویرانے بھی ہیں بڑے بڑے لق ودق صحرا بھی ہیں اور جنگل بھی موجود ہیں۔ پانی کی عظیم مقدار کے علاوہ جو زمین میں پائی جاتی ہے اوسطاً ہر ایک مربع میل کے رقبہ کے اوپر فضا میں پچاس ہزار ٹن پانی بخارات کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ جو ہوا میں تحلیل ہے اور ہمیں نظر نہیں آتا۔

پانی کے یہ عظیم ذخیرے یعنی سمندر اللہ نے انسان کے اختیار میں دیدیئے ہیں وہ ان وسیع سمندروں کی سطح پر دوڑتا پھرتا ہے اور ان کی پرشکوہ اور بیباک موجوں کو چیرتا ہوا ہزارہا میل کا سفر کرتا ہے اور ایک ملک سے دوسرے ملک تک چلا جاتا ہے انسان کو عقل دے کر سمندروں کو عبور کرنے کے وسائل بتا دیئے گئے اور طوفان سے بچکر سفر کرنے کی صورتیں تعلیم دی گئیں۔ یہ تہار سمندر یہ ظالم موجیں سب انسان کی تابع ہیں اور اس میں اتنی قوت و عقل دیدی گئی کہ وہ اُن کو جس طرح چاہے استعمال کرے اور اُن سے جو چاہے کام لے۔ اور صرف یہی سمندر نہیں اللہ نے تو انسان کے لیئے زمین کی ہر چیز اور آسمان کی ہر مخلوق کو مسخر کر دیا ہے "وسخر لکم مَّا فی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الاَرضِ جمیعاً مِّنہُ" جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے یہ سب کا سب اُس نے اپنی جانب سے انسان کا مطیع بنایا ہے یہ سب کچھ اس لیئے کہ انسان اِن نشانیوں کو سمجھے اور اللہ کی قدرت کاملہ پر غور کر کے اس کی معرفت

حاصل کرے۔ کونسی چیز ہے جو انسان کو نہیں ملی اور وہ کونسی نعمت ہے جو اس کو عطا نہیں کی گئی۔ کہیں اعلان ہے: "وسخر لکم الفلک" ہم نے تمہارے لیے کشتیوں کو مسخر کر دیا۔ کہیں چاند اور سورج کی تسخیر کا بیان ہے "وَسخر لکم الشمس والقمر" کہیں دن اور رات کی اطاعت کا ذکر ہے "وسخّر لکم اللیل والنھار" اور کسی مقام پر انسان کی عظمت کا اس انداز میں تذکرہ فرمایا جا رہا ہے "الم تروا انّ اللہ سخّر لکم مّا فی السمٰوٰت وما فی الارض واسبغ علیکم نعمہٗ ظاھرۃً وّ باطنۃً" کیا تم نہیں دیکھتے کہ خدا نے تمہارے لیے آسمانوں اور زمین کی تمام چیزیں مسخر کر دی ہیں اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں عام کر دی ہیں۔ سب سے پہلی نعمت انسان کے لیے جو قدرت کی طرف سے ملی ہے وہ خود اس کی زندگی ہے اور پھر اس کی زندگی کو باقی رکھنے کے لیے جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ سب چیزیں عطا کر دیں۔ رہنے کے لیے اور کھیتیاں لگانے کے لیے زمین دی۔ پانی اور آگ کی ضرورت تھی اس کو بھی عطا فرمایا شمس و قمر کو گردش دیکر فصلوں کی تخلیق کی زمین کے بے جان ذرّوں میں بے پناہ نمو کی قوتیں بھریں لاکھوں قسم کی ترکاریاں، پھل اور میوے پیدا کئے اور اس کے بعد جس نعمت کی ضرورت انسان کے لئے زیادہ تھی اس کو اس کے لیے آسان تر بنا دیا مٹی اور پانی کی دوسری نعمتوں کی نسبت زیادہ ضرورت تھی تو وہ انسان کے لیے ہر جگہ موجود ہیں۔ ہوا کی ضرورت اس سے بھی زیادہ تھی تو اس کو اس طرح عطا کیا کہ اس کی کوئی قیمت ہی نہ رہی ایک انسان کے لیے اتنی نعمتیں "ان تعدّوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا" اگر تم خدا کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ مگر یہ سب اس لیے ہے کہ "لعلّکم تشکرون" تم اس نعمت دینے والے کا شکر ادا کرو اور شکر کا ادا کرنا اس طرح مقصود نہیں ہے کہ انسان صرف زبان سے شکر شکر کرتا رہے بلکہ اصلی شکر صرف یہ ہے کہ اپنی زندگی کو اللہ کے حکم کے مطابق ڈھال دے اور جو اُس کی مرضی ہو اس پر عمل کرے۔ چند ٹکے جس نوکر کو تنخواہ ملتی ہے اگر وہ اپنے مالک کے حکم کو ٹال دے یا اس کی مرضی کے خلاف عمل کرے تو اس کی سزا کیا ہوتی ہے؟ پھر اگر کوئی ایسے عظیم آقا اور اتنے بڑے احسان کرنے والے کی مرضی کے خلاف کرے اور اس کے حکم کی توہین کرے اور اس کی بات نہ مانے تو اس کی سزا کیا

ہونا چاہیئے اس کا فیصلہ تو ہماری عقل خود بہت آسانی کے ساتھ کر سکتی ہے اس لیئے انسان کا فرض ہے کہ وہ ناشکری کے گناہ عظیم سے بچے اور جس سے روز گڑ گڑا کر دعائیں کرتا ہے اور جس کی نعمتوں کے عظیم سمندر میں ڈوبا ہوا ہے اس قادر مطلق کی عبادت و اطاعت کے فرض کو کسی وقت بھی فراموش نہ کرے۔

(درس ۱۲۶) قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ لِيَجْزِيَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ۝ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۖ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ۝ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۸ اور سورۂ جاثیہ) کی درمیانی آیات)

(اے رسول) جو لوگ ایمان لا چکے ہیں ان سے کہدو کہ وہ ان لوگوں سے درگذر کریں جو اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے تاکہ وہ ایک قوم کو اس کے اعمال کا بدلہ دے۔ جو نیک عمل کرے گا تو وہ اپنی ذات کے لیئے اور جو برائی کرے گا تو اس کا وبال اسی پر ہوگا پھر تم سب اپنے پروردگار کی طرف لوٹائے جاؤگے اور ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب اور حکمت اور نبوت دی تھی اور ہم نے انہیں نفیس نفیس چیزیں کھانے کو دی تھیں اور ان کو سارے جہان پر فوقیت عطا کی تھی اور ہم نے انھیں دین کے بارے میں کھلی ہوئی دلیلیں عنایت کیں پھر انہوں نے اپنے پاس علم آجانے کے بعد آپس کی ضدمیں ایک دوسرے سے اختلاف کیا۔ یہ جن جن چیزوں میں اختلاف کر رہے ہیں ان کا فیصلہ قیامت کے دن ان کے درمیان خود اللہ کرے گا۔

تشریح و تفسیر:۔ ان آیات کریمہ سے پہلے خدا نے اپنی عطا کی ہوئی نعمتوں کا تذکرہ فرمایا ہے اور انسان کے لیئے زمین و آسمان کی ہر چیز کی تسخیر کا اعلان فرمایا ہے اور آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ ان تمام باتوں میں غور و فکر کرنے والوں کے لیئے نشانیاں

ہیں۔ یہ نشانیاں کس چیز کی ہیں اور یہ علامتیں اور دلائل کن حقیقتوں کو بتاتے ہیں اس کو وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جو اپنی فکری صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرتے ہیں ان نعمتوں کے تذکرہ کے بعد اب اپنے پیغمبر سے خطاب فرمایا جارہا ہے۔

" قل للذین امنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ " اے رسول اُن لوگوں سے کہدو جو ایمان لاچکے ہیں کہ وہ صبر و تحمل کی عادت ڈالیں اور منکرین قیامت کی تکلیف دہ باتوں کو برداشت کرلیا کریں اور ان لوگوں سے درگذر کریں جو اللہ کے دنوں کی توقع نہیں رکھتے۔ خدا کے دنوں کی تفسیر میں کئی باتیں کہی گئی ہیں ان " ایام اللہ " کا سورہٗ ابراہیم کی ابتدا میں بھی تذکرہ ہے خدا نے فرمایا ہے " ولقد ارسلنا موسیٰ بایاتنا ان اخرج قومك من الظلمات الی النور وذکرھم بایام اللہ ان فی ذلك لآیات لکل صبار شکور " ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں اور معجزات کے ساتھ بھیجا اور یہ کہا کہ تم اپنی قوم کو تاریکیوں سے روشنی کی طرف لے آؤ اور انہیں خدا کے دن یاد دلاؤ۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں ہر صبر و شکر کرنے والے کے لیئے نشانیاں ہیں۔ یہاں بھی " ایام اللہ " کا ذکر ہے۔ علمائے تفسیر نے اس میں چند باتیں لکھی ہیں، بعض اقوال سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے دنوں سے مراد وہ حوادث اور انقلابات ہیں جو گذشتہ قوموں پر گذرتے رہے اور کچھ مفسرین ان ایام سے خدا کی نعمتیں مراد لیتے ہیں اور بعض لوگ مجموعی طور پر دونوں چیزیں مراد لیتے ہیں یعنی انعام و اکرام بھی اور عذاب و انتقام بھی اور اس کی تعبیر " ایام " کے لفظ کے ساتھ اس وجہ سے کی گئی ہے کہ خدا کی نعمتیں بھی ان ہی ایام میں ملتی ہیں اور سزائیں اور انتقام اور عذاب بھی اسی لیل و نہار کی گردش اور ان ہی ایام میں حاصل ہوتا ہے۔ اور چونکہ شب و روز کی گردشوں میں سب ہی قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔ کبھی تکلیف ہے تو کبھی راحت اور کبھی آرام ہے تو کبھی غم و اندوہ اس لیئے فرمایا گیا کہ ان ایام میں اور ان حوادث اور نعمتوں میں صبر کرنے والوں کے لیئے بھی اور شکر کرنے والوں کے لئے بھی نشانیاں موجود ہیں۔ جو سچے مومن ہیں جب ان کو کسی بات کی تکلیف ہوتی ہے تو وہ اس پر صبر کرتے ہیں اور جب ان کو راحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے تو خدا کا شکر بجالاتے ہیں۔ " ایام " " یوم " کی جمع ہے اور یوم کبھی تو دن اور رات کے مجموعہ کے لیے بولا جاتا ہے لیکن اکثر اس لفظ کا استعمال طلوعِ صبحِ صادق سے غروب

آفتاب تک کے وقت کے لیئے کیا جاتا ہے اسی معنی میں اس کے لیئے دوسرا لفظ "النہار" ہے۔ خدا نے انسانی زندگی کے لیئے دن اور رات کی تخلیق فرمادی ہے اور انہیں اس کے زندہ رہنے کے لیئے بنیادی حیثیت سے ضروری بنا دیا تاکہ وہ دن کو کام کاج کرے اور رات کو آرام لے اور خدا کی ان دونوں عظیم نعمتوں کو اس کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔

انسانی زندگی کے لیے رات بھی نعمت ہے اور دن بھی نعمت ہے اور اس میں کسی شخص کو کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہے۔ خدا کی نعمتیں اس کی مخلوق میں سب کے لیئے برابر ہوا کرتی ہیں اور سب ہی ان سے فائدہ حاصل کرسکتے ہیں مگر انسان کا سب سے بڑا فرض اور سب سے بڑا شکریہ ہے کہ وہ خدا کی ان نعمتوں کو جن پر اس کی زندگی کا دارومدار ہے اُس کی مرضی کے مطابق صرف کرے۔ رات تھکاوٹ دور کرنے کے لیئے، آرام حاصل کرنے کے لیئے یا دعا و استغفار کرنے کے لیئے بنائی گئی ہے اس لیئے اس کو خدا کی مرضی اور اس کے حکم کے مطابق صرف کرنا ہی انسان کا فرض ہے اور اگر وہ اس طرح رات بسر کرے گا تو اس کا سونا بھی عبادت ہوگا اور جاگنا بھی عبادت میں شمار ہوگا۔ کیونکہ عبادت صرف نماز، روزہ ہی کا نام نہیں ہے بلکہ عبادت تو ہر وہ عمل ہے جو اللہ کی مرضی اور اس کی خوشنودی کے مطابق ہو اور گناہ ہر وہ کام ہے جو اس کی رضا کے خلاف ہو۔ اُس انسان سے بڑھ کر کوئی ناشکرا اور اُس سے بڑا کوئی شخص خدا کا باغی نہیں ہوسکتا جو خدا کی نعمتوں کے اصل مقصد و غرض کو بدل ڈالے اور انہیں ان اغراض کے لیئے استعمال کرے جو اللہ کے منشاء کے خلاف ہیں اس لیئے چوریاں کرنا، قتل و ظلم کرنا یا دوسری بُری باتوں میں رات کے لمحے گذارنا گناہ عظیم ہے، کفران نعمت ہے اور اللہ کے حکم اور اس کی مرضی سے بغاوت ہے۔ اسی طرح دن بھی اللہ کی عظیم نعمت ہے اور اُسے بھی اُسی طرح گذارنا چاہیئے جو خدا کی عین رضا کے مطابق ہو اس طرح نہ صرف نماز اور دوسری عبادتیں بلکہ کسب حلال اور دوسرے جائز کاموں کے لیئے ایک ایک قدم اُٹھانا بھی عبادت ہوگا۔ غرض دن اور رات انسان کے فائدے کے لیئے ہیں اور اس کے لیئے ضروری ہے کہ وہ ان نعمتوں سے اُس فائدے کو حاصل کرے جس کے لیئے خالق کائنات نے انہیں بنایا ہے اور یہی اصلی شکر ہے

ورنہ زبان سے شکر ادا کرنا اور عمل سے کفرانِ نعمت کرنا یہ صرف ناشکری ہی نہیں بلکہ فریب اور دھوکا ہے اور روحِ ایمان و اسلام سے بغاوت ہے۔ یہ دن اور یہ راتیں زمانہ کی تقسیم کے مختلف نام ہیں ان میں خود تو کوئی تاثیر ہو ہی نہیں سکتی بلکہ جو کچھ اثرات ظاہر ہوتے ہیں اور نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ ہمارے اعمال و افعال کے ہوتے ہیں جو ہم اس لیل و نہار میں کرتے ہیں۔ ان اثرات کو دنوں اور راتوں اور ساعتوں کی طرف منسوب کرنا اور انہیں ان اثرات کا اصلی موثر سمجھنا اسلام کی تعلیم کے خلاف اور شرک ہے۔

اس حد تک تو آیات و احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض دنوں، راتوں اور ساعتوں کو نسبتاً فضیلت حاصل ہے مثلاً ماہِ رمضان دوسرے مہینوں سے افضل ہے۔ شبِ قدر ایک ہزار مہینوں سے افضل ہے۔ اسی طرح جمعہ سید الایام ہے۔ ساعتوں میں بھی اسی طرح بعض زیادہ فضیلت رکھتی ہیں لیکن یہ فضیلت نیک اور جائز باتوں کے لیئے ہے۔ بری حرکتیں تو ہر حال میں بری ہیں بلکہ ان خصوصی فضیلت و برکت والی ساعتوں میں تو گناہ کی شدت اور سزا کی اہمیت میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔

روزمرہ زندگی کے عام کاموں کے لیئے دنوں کی نحوست اور نیکی کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لیئے بس اس حد تک کہنا صحیح ہو سکتا ہے کہ ان کی نحوست وغیرہ ان کاموں اور اعمال کے لحاظ سے ہے جو ان میں انجام دیئے جاتے ہیں یا ان لوگوں کے حالات کی مناسبت سے ہے جو ان میں اپنے اعمال کے نتائج اور مختلف حوادث میں مبتلا ہوتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس سعادت و نحوست کا مطلب یہ ہے کہ عمل کرنے والے انسانوں کے حالات اور ان کے خصوصی ماحول کے اثرات و نتائج کا دوسرا نام سعادت و نحوست رکھ لیا گیا ہے ورنہ اصل بات یہ ہے کہ دنوں اور راتوں میں کوئی بھی ذاتی طور پر نحس نہیں ہوتا۔ اللہ نے جو چیز بھی خلق فرمائی ہے وہ ہمارے فائدے کے لیئے ہے نحوست صرف یہ ہوگی کہ ہم اس کے اصلی فائدے سے محروم ہو جائیں اور اس فائدے کو حاصل کر لینا عین سعادت ہے قرآن کریم میں بعض مقامات پر دنوں کو نحس فرمایا گیا ہے وہ آیات یہ ہیں :- انا ارسلنا علیھم ریحًا صرصرًا فی یوم نحسٍ مستمرٍّ ہم نے قوم عاد پر ایک تیز ہوا بھیجی ایک دائمی نحوست کے دن میں۔ اس جگہ "یوم"

سے مراد "دن" نہیں بلکہ زمانہ ہے کیونکہ وہ عذاب صرف ایک دن میں ختم نہ ہوا تھا۔ اس سے قبل ایک دوسرے مقام پر اسی قوم عاد کے تذکرے میں ایک دن کے بجائے چند دنوں کا ذکر ہے۔ اللہ فرماتا ہے۔ "فارسلنا علیھم ریحاً صرصراً فی ایام نحسات" ہم نے اُن پر ایک تیز ہوا ایسے دنوں میں بھیجی جو منحوس تھے پھر تیسرے مقام پر تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوتا ہے: "سخرھا علیھم سبع لیال و ثمنیۃ ایام حسوما" خدا نے اس عذاب کو ان پر سات راتوں اور آٹھ دنوں تک مسلط رکھا اور پھر ہمیشہ کے لیئے انہیں تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جب عذاب الٰہی مسلسل سات راتوں اور آٹھ دنوں تک جاری رہا تو اب ہفتہ بھر میں کونسا دن باقی رہ گیا جو نحس نہ ہو۔ اس بنا پر یہ خیال کسی طرح درست نہیں ہے کہ کوئی دن ذاتی طور پر منحوس بنایا گیا ہے بلکہ دنوں اور ساعتوں کو ان میں بُرے اعمال کرنے والوں کے لحاظ سے اور ان اعمال کے نتیجوں کے اعتبار سے نحس کہدیا جاتا ہے ورنہ سب دن ہمارے فائدے ہی کے لیئے ہیں اور ان میں ذاتی طور پر کوئی نحوست نہیں ہو سکتی اسلام نے انسان کو عمل اور سعی پیہم کی دعوت دی ہے اُسے بدعملی، بیکاری اور تعطل کی تعلیم نہیں دی ہے اس لیئے یہ عقیدے اور ایمان کی کمزوری ہے کہ دنوں کی تاثیرات پر تو بھروسا کر لیا جائے اور خدا کی ذات پر بھروسا اور اعتماد نہ کیا جائے۔ جن حدیثوں میں ایام کو سعد و نحس کہا گیا ہے وہاں مراد وہی مفہوم ہے جس کو ابھی بیان کیا گیا۔ اہلبیت رسول علیہم السلام کی خدمت میں جب کبھی دنوں کی نحوست کا ذکر کیا گیا تو اس کے جواب میں یہ ارشاد ہوتا تھا کہ "ثق باللہ عزّ و جلّ و توجہ حیث شئت" خدا کی ذات پر بھروسا کرو اور جس نیک مقصد کا ارادہ کیا ہے اس کے لیئے جہاں چاہو چلے جاؤ۔ "لو سلکوا بھا فی لجۃ البحار الغامرۃ و سباسب البیداء الغائرۃ بین سباع و ذئاب و اعادی الجن والانس لآمنوا من مخاوفھم" اگر لوگ اللہ پر بھروسا کریں اور اس کا نام لیکر گہرے سمندروں کی موجوں میں سفر کریں اور وسیع و عریض صحراؤں میں داخل ہو جائیں جہاں قدم قدم پر بھیڑیوں اور دوسرے درندوں سے سابقہ پڑے یا دشمن انسانوں اور جنوں سے مقابلہ ہو جب بھی وہ اپنی ایمانی طاقت اور اللہ پر بھروسے کی قوت کے ذریعے ہر خطرے سے محفوظ رہیں گے۔

(درس ۱۲۶)

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَنْ يُّغْنُوْا عَنْكَ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝ اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ اجْتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ كَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ ؕ سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ۝

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۸ کی آخری آیات) سورۂ جاثیہ

پھر ہم نے تم کو دین کے ایک واضح راستہ پر قائم کر دیا تو اسی پر چلے جاؤ اور نادانوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو یہ لوگ خدا کے مقابلہ میں تمہارے کچھ بھی کام نہ آئیں گے اور ظالم لوگ ایک دوسرے کے مددگار اور دوست ہوتے ہیں اور خدا تو پرہیزگاروں کا مددگار اور دوست ہے یہ قرآن لوگوں کے لئے دانشمندیوں کا مجموعہ ہے اور اُس جماعت کے لئے جو یقین رکھتی ہے ہدایت و رحمت ہے۔ جو لوگ بُرے کام کیا کرتے ہیں کیا وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کو ان لوگوں کے برابر کر دیں گے جو ایمان لائے اور اچھے کام بھی کرتے رہے اور اُن سب کا جینا مرنا یکساں ہوگا۔ یہ لوگ کیا برے حکم لگاتے ہیں۔

تشریح و تفسیر:۔ اس سے قبل کی آیات میں اس کی ہدایت فرمائی گئی تھی کہ صاحبانِ ایمان خود کفار و مشرکین کو ان کی ایذا رسانی کی سزا نہ دیں بلکہ ان کی کڑوی باتوں کو برداشت کریں اور ان پر تحمل و صبر سے کام لیں خدا ایسے لوگوں کو جو حق کے خلاف کریں گے اور بُرے اعمال کا ارتکاب کریں گے خود سزا دیگا۔ کچھ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ حکم ابتدائے اسلام میں تھا مگر جب مخالفین اسلام کی ایذا رسانی اور سازشیں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں تو پھر یہ حکم منسوخ ہو گیا اور جہاد کا حکم دیدیا گیا۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت میں بھی اسی مطلب کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے مگر بعض مفسرین نے اسے منسوخ نہیں سمجھا ہے بلکہ اس سے مراد صرف یہی لی ہے کہ صاحبانِ ایمان کو تحمل و برداشت کا ایک دائمی حکم دیا گیا ہے تا کہ جھگڑے بازیوں اور فساد کرنے سے ہمیشہ وہ پرہیز کریں اور صبر سے کام لیں

اور تشدد کے مقابلہ میں خودداری، حلم، بردباری اور نظم وضبط کو ہاتھ سے نہ جانے دیں اس کے بعد ہی بنی اسرائیل کو جو جو نعمتیں عطا کی گئی تھیں اُن کی تفصیل تھی۔ اُن پر کتابیں اُتاری گئیں۔ اُن میں تبلیغ دین کے لیے کثرت سے پیغمبر بھیجے گئے۔ اُن کو حکومتیں ملیں مال و دولت عطا کی گئی اور پھر فرمایا گیا تھا " وفضلناھم علی العالمین " ہم نے بنی اسرائیل کو اُس عہد میں سب پر برتری اور فضیلت دی تھی مگر اتنی نعمتوں کے بعد بھی اور خدا کی روشن نشانیوں کو دیکھ لینے کے بعد بھی انہوں نے آپس میں پھوٹ ڈال دی اور مختلف ٹکڑیاں بنا کر اپنے اتحاد و اتفاق کو مٹا دیا جس کا باعث صرف یہ تھا کہ ہر شخص خودی اور نفسانیت کے پھندے میں گرفتار ہو گیا تھا۔ ہر فرد اقتدار کا بھوکا اور دولت و عزت کا صرف اپنی ذات کے لیے خواہشمند تھا اس افراتفری اور حرص وطمع اور دولت و اقتدار کی بھوک نے اُن کی آنکھیں بند کر دی تھیں اور وہ آپس ہی میں لڑ لڑ کر تباہ ہو گئے۔ پھر اپنے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب تھا کہ اے پیغمبر ان فسادات اور ان جھگڑے بازیوں اور آپس کی پھوٹ کی سزا اور اس شر پسندی اور اتفاق و اتحاد کو تباہ و برباد کرنے کا بدلہ ان شرارت پسندوں کو اللہ خود ہی دیدے گا۔ یہ سب باتیں اس لیے بیان کی گئی تھیں تاکہ امتِ محمدیؐ اُن واقعات سے سبق لے اور جن کرتوتوں نے بنی اسرائیل کی عظمت و اقتدار کے سر بفلک قلعے ڈھا دئے تھے اور جس ظلم و جور، خود غرضی، تخریب اور فرقہ بندیوں نے اُن کے شیرازے کو بکھرا دیا تھا اور انہیں بلندی کے آسمان سے ذلت و حقارت کے گہرے غار میں ڈال دیا تھا اُن باتوں سے امتِ محمدیؐ محفوظ رہے اور ان گناہوں میں مبتلا نہ ہو جن کی سزا کا بار بار اعلان کر دیا گیا ہے اور جن کے نتیجے اور تباہ کن انجام انسانوں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں اور اپنے کانوں سے سن لیے ہیں۔ اس سے پیشتر کی بحث میں " ایام اللہ " کا بھی ذکر کیا گیا تھا اور اس کی تشریح میں دنوں کے نحس و سعد ہونے اور اس کے اصلی معنی اور صحیح مقصد پر روشنی ڈالی گئی تھی اور یہ واضح کیا گیا تھا کہ دنوں میں ذاتی طور پر کوئی نحوست اور برائی نہیں ہوتی ہے اُن کی بُرائی اور نحوست صرف ایک عارضی امر ہے جس کا تعلق ہماری ذات اور اس کے اعمال اور حالات کی مناسبت سے ہے مثلاً صبح کا ابتدائی وقت تفریح کے لیے مناسبت رکھتا ہے اور گرمی کے زمانہ میں دوپہر کا وقت چہل قدمی کے لیے موزوں نہیں ہے مگر اس کا مطلب یہ نہ ہو گا کہ وہ گرم وقت کسی دوسرے کام کے لیے بھی موزوں نہیں ہے

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اللہ نے جس زمانہ اور جس وقت کو جس فائدے کے لیۓ مخصوص فرما دیا ہے اور جن لوگوں کے حالات کی مناسبت سے اس وقت میں خاص نقصان یا مخصوص طور پر فائدہ ظاہر ہوتا ہے اس کے لحاظ سے وہ سعید یا منحوس کہا جاسکیگا نہ اس وجہ سے کہ وہ اصلی طور پر اور ذاتی حیثیت سے اس طرح بنا دیا گیا ہے۔ ہر دن ہمارے فائدے کے لیۓ ہے اور ہر رات ہمارے اپنے نفع کے لیۓ بنائی گئی ہے اگر ہم ان لمحوں سے اُن کا فائدہ حاصل نہیں کرتے تو یہ کفرانِ نعمت الٰہی ہے اس لیۓ کسی وقت کو بیکار نہیں سمجھنا چاہیۓ بلکہ اس کے اصلی فائدے کو تلاش کرنے اور معلوم کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اس کے بعد اب ارشاد ہو رہا ہے کہ "ثم جعلنٰك علی شریعۃٍ من الامر فا تبعھا ولا تتبع اھوآء الذین لا یعلمون" "شریعۃ" پانی کے اُس ذخیرے کو کہتے ہیں جہاں لوگ پانی پیا کرتے ہوں اس لفظ کا اطلاق دین و مذہب کے لیۓ بھی کیا جاتا ہے اسی مناسبت کی بنا پر کہ جس طرح پانی کے گھاٹ سے لوگوں کی پیاس بجھتی ہے اسی طرح دین و مذہب کے احکام سے اور کی تعلیمات سے بھی لوگوں کی روحانی پیاس بجھا کرتی ہے۔ شارع۔ شریعت لانے والے کو بھی کہتے ہیں اور یہ لفظ بڑے کھلے ہوۓ راستہ کے لیۓ بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ ہم نے تم کو ایک خاص دین اور خاص نظام زندگی کی تعلیم دیدی ہے اور تم اسی طریقہ اور اسی راستہ پر سختی کے ساتھ قائم رہو اور اپنی امت کو اسی پر قائم رکھو اور جو لوگ خدا پر یقین نہیں رکھتے ان کی خواہشات پر عمل نہ کرو جو خود اللہ اور اس کے احکام سے ناواقف ہیں کیونکہ صورت میں خدا کے مقابلہ میں وہ لوگ تمہاری مدد نہ کرسکیں گے۔

"وان الظالمین بعضھم اولیآء بعض"۔ بیشک یہ تمام کفر و شرک کرنے والے اپنے باطل میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں "واللہ ولی المتقین" اور خدا صاحبانِ تقویٰ کا مددگار ہے "ھذا بصآئر للناس وھدی ورحمۃ لقوم یوقنون" یہ قرآن لوگوں کے لیے دلیلوں کا مجموعہ ہے "بصائر" "بصیرۃ" کی جمع ہے یہ لفظ عقل و فہم کے لیۓ بھی بولا جاتا ہے اور شواہد و دلائل کے لیۓ بھی۔ یہاں مراد دوسرے معنی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن میں خدا کے وجود، اس کی عظمت اور راہ حق پہچاننے کی اتنی دلیلیں موجود ہیں جنکو غور سے سمجھنے کے بعد کوئی عقل رکھنے والا انسان ان سے انکار کی جرأت نہیں کرسکتا مگر یہ سب دلیلیں اور نشانیاں صرف ان ہی لوگوں کو فائدہ دے سکتی ہیں جو یقین رکھتے ہیں اور حق کی راہ

تلاش کرنے کی سچے دل سے کوشش کرتے ہیں اور ہٹ دھرمی نہیں کرتے۔
" اَمْ حَسِبَ الَّذِیْنَ اجْتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ اَنْ نَّجْعَلَهُمْ کَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ " اجتراح کے معنی ہیں ارتکاب کرنا یا حاصل کرنا یعنی جو لوگ گناہوں کا ارتکاب کرتے اور بُرے بُرے کام انجام دیتے ہیں کیا ہم ان کو ان لوگوں جیسا کر دیں گے جو نیک اعمال ہوں اور سچے دل سے ایمان لائے ہوں کیا اُن کا مرنا جینا ایک طرح کا ہو جائیگا؟
اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مومن و کافر کی زندگیاں اور موت ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور خدا کے نزدیک ان کے درجوں اور اُن کے مرتبوں میں بڑا فرق ہے۔ خدا کے نزدیک یہ ظاہری دنیاوی شان و شوکت یہ مال و متاع یہ دولت و اقتدار کوئی حیثیت نہیں رکھتا اس کی نظر میں جس چیز کی حیثیت و وقعت ہے وہ انسان کا صرف کردار ہے اس کا عمل ہے اور وہی باقی رہنے والی چیز ہے۔ دولتیں، حکومتیں اقتدار کی کرسیاں۔ جوانی کے لیل و نہار شباب کے دَور، حسن و جمال کی رنگین ساعتیں، مسرتوں کے دلکش لمحے یہ سب چیزیں ناپائیدار اور محض فنا ہو جانے والی ہیں۔ جو آج جوان ہے وہ کل بوڑھا ہوگا جو آج حسین ہے وہ کچھ روز میں اِس حسن و جمال کے لئے ترسے گا جو آج تخت پر ہے وہ ہو سکتا ہے کل اس سے محروم ہو جو آج زندہ ہے وہ ہو سکتا ہے کہ کل اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے یہ دنیا ایک ایسی جگہ ہے جہاں کی ہر چیز بے ثبات ہے جہاں کے کسی لمحے پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا اور نہ ان ناپائیدار چیزوں پر اعتماد و اعتبار کرنا عقل کے مطابق ہے یہ تمام دنیاوی چیزیں بالکل سایہ کی طرح ہیں۔ کبھی یہاں ہیں، کبھی وہاں ہیں اور کبھی موجود ہیں اور کبھی نظروں سے غائب ہو گئیں۔ عقل رکھنے والے اور سچے دل سے خدا پر ایمان لانے والے کبھی ان باتوں پر بھروسا نہیں کرتے اور کبھی وہ نفس کی اصلاح اور کردار کی صحیح تعمیر سے غفلت نہیں کرتے اور خدا کی بارگاہ میں بھی اگر عزت ہے تو صرف اُن ہی کی جن کا کردار اچھا ہو اور جن کا باطن درست ہو " اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ " قرآن کریم کا اعلان ہے کہ خدا کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ شخص ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی و پرہیزگار ہو اور جو سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہو اور اُس کے احکام پر عمل کرتا ہو۔ حضرت ابو ذر صحابی رسولؐ فرماتے ہیں کہ ... نے چار چیزوں پر اپنے دین کی بنیاد رکھی ہے۔ جو شخص ان چار باتوں پر عامل نہ ہو وہ مومن

نہیں ہے وہ چار امر یہ ہیں کہ انسان اس کا عقیدہ رکھے کہ حلال اور حرام بتانے اور حکم دینے اور منع کرنے کا اختیار صرف اللہ کو ہے اس کے سوا کسی دوسرے کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے اُس کے بتائے ہوئے حلال کو حلال اور حرام کو حرام جاننا اُس کے حکم کو لائق تعظیم و تعمیل سمجھنا اور اُس کے منع کیے ہوئے کاموں سے باز رہنا یہی دین کی بنیاد اور اصل ہے اور یہی تقوٰی کی بھی بنیاد ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ تم برائیاں کرتے ہوئے نیکیوں کی امید رکھتے ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ بُرے اعمال کا نتیجہ نیک ہو یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ کوئی خاردار درخت میں سے انگور توڑنا چاہتا ہو۔ آگ جلاتی ہے اور گرمی پہنچاتی ہے اور برف ٹھنڈک پہنچاتی ہے۔ بُرے کام کا نتیجہ بھی بُرا ہے اور اچھے کام کا نتیجہ بھی اچھا ہوتا ہے لیکن کبھی بُرائی۔ اچھائی کے روپ میں ظاہر ہو کر انسان کی نگاہوں کو دھوکا دیتی ہے اور وہ اسی سے خوش ہو جاتا ہے حالانکہ وہ اس کے لیے زہر سے زیادہ قاتل ہے۔ اسلامی تعلیمات کی سب سے بڑی بنیاد الٰہی اقتدار کے سچے عقیدے پر ہے۔ اور جس کسی کو یہ نعمت ملے گی وہ کبھی برائی کے قریب نہیں جا سکتا۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ۭ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ○ وَقَالُوْا مَا هِىَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۚ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ○ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتُوْا بِاٰبَاۗىِٕنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ قُلِ اللّٰهُ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (درس ۱۲۸)

(پارہ ۲۵ رکوع ۱۹ سورہ الجاثیہ)

اور خدا نے سارے آسمانوں اور زمین کو حکمت کے ساتھ پیدا کیا اور تاکہ ہر شخص کو اس کے کیئے کا بدلہ دیا جائے اور ان پر کسی طرح کا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ کیا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا ہے جس نے اپنی خواہش نفس کو اپنا معبود بنا رکھا ہے اور اُس کی حالت سمجھ بوجھ کر خدا نے اُسے گمراہی میں چھوڑ دیا ہے اور اس کے کان اور دل پر مہر لگا دی ہے اور اس کی آنکھ پر پردہ ڈال دیا ہے پھر خدا کے بعد اُس کی ہدایت کون کر سکتا ہے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔ اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو بس یہی دنیا کی ہے ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں تو صرف زمانہ ہی ہلاک کرتا ہے اور اُن کو اس کی کچھ خبر تو ہے نہیں یہ لوگ تو بس اٹکل کی باتیں کرتے ہیں اور جب ان کے سامنے ہماری کھلی کھلی آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو اُن کا سوائے اس کے کوئی جواب نہیں ہوتا کہ وہ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو ہمارے داداؤں کو لے آؤ، (اے رسولؐ) تم کہدو کہ خدا ہی تم کو زندہ کرتا ہے اور وہی تم کو مارتا ہے پھر وہی تم کو قیامت کے دن جس کے ہونے میں کسی طرح کا بھی شک نہیں ہے۔ جمع کریگا مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔

تشریح وتفسیر:- ان آیات کریمہ میں سب سے پہلے اس کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی خلقت عبث اور بے فائدہ نہیں کی ہے بلکہ یہ سب چیزیں مصلحت اور حکمت کے ساتھ بنائی گئی ہیں اور یہ تمام تخلیق کا کام حق اور عدل پر مبنی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ کائنات عالم کی ہر شئی ایک خاص غرض اور مقصد وحکمت کے ساتھ بنی ہے اور وہ مقصد اور غرض اُس کی تخلیق سے پورا ہونا ضروری ہے۔

جبکہ کائنات کا کوئی ایک ذرّہ بھی بیکار نہیں بنایا گیا تو یقیناً یہ حقیقت بھی تسلیم کرنا پڑے گی کہ انسان جو تمام کائنات سے افضل واشرف قرار دیا گیا ہے کسی خاص غرض اور مقصد کو پورا کرنے کے لیئے بنا ہے اور اگر وہ مقصد پورا نہیں ہوتا تو پھر اُس کی تخلیق کی غرض ہی ختم ہو جائے گی۔ زمین اس لیئے بنی ہے کہ اس میں کھیتیاں لگیں اور اسے رہائش کے لیئے استعمال کیا جائے یا اس کے جو دوسرے فائدے ہیں وہ حاصل کیئے جائیں اور اگر زمین کو ان فائدوں اور ضرورتوں میں استعمال نہ کیا جائے جن کے لیئے اس کی تخلیق ہوئی ہے تو اس کا وجود بیکار ہو جائیگا جو عقل کے خلاف ہے۔ اسی طرح پانی۔

ہوا، آگ سب ہی کے فائدے ہیں اور ان کی تخلیق کی مخصوص اغراض و مقاصد ہیں جن میں ان کا استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ ان کی غرض خلقت ہی باقی نہیں رہ سکتی اس کا مطلب یہی ہوا کہ کائنات کا کوئی ذرہ بھی بیکار نہیں ہے اور ہر چیز کی ایک خاص غرض ہے تو یقیناً انسان کی خلقت کی بھی غرض ہوگی جس کو پورا کرنے کے لیئے اس کی تخلیق ہوئی ہے اور چونکہ انسان کائنات عالم کی اہم ترین مخلوق ہے جسے عقل و فہم اور ادراک سے بھی نوازا گیا ہے اس لیئے اس کی کوئی غرض خلقت نہ ہو اور اس کا کوئی خاص مقصد نہ ہو۔ یہ ممکن نہیں ہو سکتا۔ اب انسان کا فرض ہے کہ اس مقصد اور غرض کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرے جس کے لیئے اس کی تخلیق ہوئی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی باعظمت مخلوق محض اس کام کے لیئے تو نہیں بنائی جا سکتی کہ وہ صرف اپنا پیٹ بھرلے اور بدن ڈھانک لے یا اپنی حیوانی خواہشات کی تکمیل کرلے۔ اُس کی غرض ان باتوں سے یقیناً اونچی ہے اس کو عقل و ادراک اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ نیک و بد کی تمیز کرے، اچھے اور برے کو پرکھ سکے اور وہ کام کرے جو اُس کے لیے اور دوسری مخلوق کے لیے مناسب و موزوں ہو اور کوئی عمل ایسا نہ کرے جو عقل و مصلحت کے خلاف ہو۔ تلوار کا استعمال دونوں طرح ہوتا ہے۔ اسے ڈاکہ زنی اور لوٹ مار میں بھی استعمال کیا جاتا ہے، اس سے بیگناہوں کے گلے بھی کاٹے جاتے ہیں اور اپنی حفاظت اور دوسروں کی حمایت بھی کی جا سکتی ہے لیکن تلوار کا صحیح استعمال اور اس کی غرض تو یہی ہے کہ اس کو حفاظت کے لیئے استعمال کیا جائے اور اس سے ظلم و جور کا کام نہ لیا جائے اسی طرح دنیا کی ہر چیز غلط اور صحیح دونوں باتوں میں استعمال ہو سکتی ہے مگر اُس کی تخلیق کی غرض تو صرف یہی ہے کہ اُسے صحیح مقصد کے لیئے استعمال کیا جائے۔

انسان کے اعضائے بدن اور اس کی قوت ارادی کو باطل اور حق، غلط اور صحیح دونوں راستوں پر استعمال کیا جا سکتا ہے مگر خالق کائنات نے انسان کو جس خاص مقصد کے لیئے زیور ہستی سے آراستہ کیا ہے اس کی زندگی کو اُسی کے لیئے صرف ہونا چاہیئے اور یہ با اختیار ہستی اور عقل و ہوش رکھنے والی مخلوق اُن نعمتوں کو جو اسے ملی ہیں۔ خواہ اس کی اپنی تخلیق سے متعلق ہوں یا اس کے وجود کو باقی رکھنے کے لیئے ہوں)۔ ان ہی اغراض پر صرف کرے جو خدا کے نزدیک درست

ہوں جب تو اس کے وجود کا اصلی مقصد پورا ہوگا ورنہ نہیں۔

قرآنِ کریم نے انسانی خلقت کی غرض اس طرح تعلیم دی ہے۔ "وما خلقت الجنّ والانس الا لیعبدون" میں نے جنوں اور آدمیوں کو صرف اسی غرض سے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ اس عبادت سے مراد اختیاری عبادت ہے ورنہ اضطراری تسبیح و عبادت تو کائنات کی ہر چیز کرتی ہے یعنی فطری طور پر وہ خالق عالم کے بنائے ہوئے نظام زندگی کی تابع ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ "تسبّح له السموات السّبع والارض ومن فیهنّ وان من شیٍ الا یسبّح بحمده ولکن لا تفقهون تسبیحهم" ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں سب اس کی تسبیح کرتے ہیں اور سارے جہان میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو اس کی تسبیح اور حمد و ثنا نہ کرتی ہو۔ مگر تم لوگ اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے اس تسبیح سے غیرارادی اور زبانِ حال کی تسبیح مراد ہے مگر انسان کو چونکہ عقل و فہم عطا ہوا ہے اس لیئے وہ اس غیرارادی تسبیح کے ساتھ اختیاری عبادت پر بھی مامور کیا گیا ہے اور اسی طرف ان الفاظ سے اشارہ ہے کہ "ہم نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے بنایا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں"۔ عبادت کے معنی ہیں انتہائی اطاعت اور فرمابرداری۔ اور یہ اللہ کی ذات سے متعلق تین صورتوں سے ممکن ہے۔ پہلی قسم وہ ہے جس کا تعلق انسان کی جسمانی زندگی اور اس کے اعضاء و جوارح سے ہوتا ہے جیسے نماز، روزہ، حج وغیرہ۔ عبادت کی دوسری قسم وہ ہے جس کا تعلق دل و دماغ اور شعور و احساس و ادراک سے ہوتا ہے اور یہ عبادت کی قسم وہ اعتقادات ہیں جن کی پابندی ضروری ہے اور یہی ایمان کی اصل اور بنیاد ہے اس لیئے کہ عمل کی قیمت جو کچھ بھی ہے وہ اُس نیت اور اس عقیدے پر مبنی ہے جس کے مطابق وہ عمل کیا جاتا ہے اگر اس کی بنیاد صحیح عقیدے پر ہوگی تو وہ عمل بھی درست ہوگا ورنہ اس کا کوئی حاصل نہیں ہوسکتا اس لئے عبادت کی یہ دوسری قسم بڑی اہمیت رکھتی ہے یعنی اس کا سچے دل سے اعتقاد رکھنا کہ خدا کی ذات سے بڑھ کر کوئی دوسرا نہیں ہے اور اس کا ہر حکم واجب العمل ہے اسی طرح جن جن باتوں کا عقیدہ رکھنا ضروری ہے اس کا اعتقاد رکھنا یہ نفس و عقل کی عبادت ہے اس کے بعد تیسری قسم یہ ہے کہ انسان اپنی معاشرتی

زندگی کے فرائض کو پورا کرے جو اللہ کی جانب سے مقرر کر دیئے گئے ہیں یعنی حقوقِ عباد کو پورا کرنا بھی عبادت میں داخل ہے۔ زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو جن جن باتوں کا تعلق آپس میں ایک دوسرے سے ہو خواہ وہ ازدواجی معاملات ہوں یا خاندانی اور نسبی امور ہوں۔ تجارت کے مسئلے ہوں یا ملکی وغیرملکی باتیں ہوں۔ ان تمام امور میں خدا کے بنائے ہوئے راستہ پر چلنا اور ان احکام پر عمل کرنا جو اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے ہمیں بتائے ہیں یہ تمام باتیں عبادت ہوں گی۔

اس لیے عبادت کا مفہوم بہت وسیع ہے جس سے زندگی کا کوئی شعبہ اور حیات کا کوئی گوشہ الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اب جب انسانوں کی خلقت کی غرض عبادت خدا ہے تو یہ اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب وہ اپنی روح وجسم، عقل وادراک اور اپنی ظاہری و باطنی زندگی کو خدا کے وجود اور اس کی عظمت کے سچے عقیدے اور اس کے حکم پر عمل کرنے میں وقف کر دے۔ اور اللہ کا تصور اس کے اقتدار و عظمت کا عقیدہ ہماری زندگی پر چھایا ہوا ہو، ایسی حالت میں ہماری جسمانی اور مادی زندگی میں ہمارا ہر سکون اور ہر حرکت عبادت ہوگی اور ساتھ ہی ہمارا ہر تصور اور شعور وادراک بھی عبادت کے مفہوم میں داخل ہوگا۔ اور وہ غرض پوری ہو جائے گی جس کے لیے کائنات کے خالق نے ہماری تخلیق فرمائی تھی اور اگر ہم اس غرض کو پورا کرنے میں کوتاہی کریں گے تو سزا کے مستحق ہوں گے۔ بعض سزائیں اور جزائیں تو اسی دنیاوی زندگی ہی میں دیدی جاتی ہیں لیکن آخری فیصلہ قیامت میں ہوگا جو اس مادی زندگی کے بالکل ختم ہو جانے کے بعد آنے والی ہے اور جس کا اعلان قرآن کریم نے فرما دیا ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ ہمیں اُس دن کی خبر نہ تھی ورنہ ہم گناہ نہ کرتے۔

کائنات کی تخلیق چونکہ خاص اغراض و مقاصد کے لیے ہوئی ہے جن کی بنیاد عدل وانصاف پر ہے اور ان اغراض کو پورا کرنے یا نہ کرنے پر جزا وسزا کے مسئلہ کا انحصار ہے اسی وجہ سے یہ فرمایا گیا ہے کہ "وَلِتُجْزٰی كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ" یہ سب کچھ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ ہر شخص کو اُس کے کیے کا بدلہ دیا جا سکے اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ سزا ہو یا جزا ہر چیز میں عدالت وانصاف پر نظر رہے گی۔ اس ساری بحث کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ مادی زندگی دار العمل ہے۔ انسان کو

اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک اس کا موقع ہے کہ وہ اچھی راہ کو تلاش کرلے اس لیئے جزا و سزا کا آخری فیصلہ اصولی طور پر اس زندگی میں نہیں بلکہ اس کے بعد ہی ہونا چاہیئے اور وہی قیامت کا دن ہوگا جہاں یہاں کے اعمال کا آخری فیصلہ کیا جائے گا۔ آخر میں منکرین روزِ قیامت کا عقیدہ بیان ہوا ہے "وقالوا ما ھی الّا حیاتنا الدّنیا نموت ونحیا وما یھلکنا الا الدّھر" زمانہ کی گردش اور دن رات کا چکر ہی ہماری موت اور زندگی کا سبب ہے اور اگر زمانہ کے علاوہ کوئی اور مارنے اور جلانے والا ہے تو پھر ہمارے آباؤ اجداد جو مر چکے ہیں وہ زندہ ہو کر کیوں نہیں آتے۔ ان آیات کریمہ میں اس عقیدے کا مکمل جواب دے دیا گیا ہے کہ اس وقت ان کے آباؤ اجداد کا زندہ کیا جانا قیامت میں دوبارہ زندگی دیئے جانے کے لئے ضروری نہیں ہے کیونکہ وہاں تو سزا و جزا کے آخری فیصلہ کے لیئے ان کا زندہ کرنا ضروری ہوگا اور اس دنیا میں آخری فیصلہ نہیں ہو سکتا اس لیئے اس میں اُن کا دوبارہ زندہ ہونا فضول ہے۔ پھر فرمایا گیا ہے "قل اللہ یحییکم ثم یمیتکم" اے رسول کہدو کہ پہلی مرتبہ جب تم کچھ نہ تھے تم کو زندگی کس نے دی تھی یہ اللہ ہی ہے جو تم کو زندگی عطا فرماتا ہے اور پھر جب ضروری ہوتا ہے تو تمہیں موت دی جاتی ہے تو اب اتنی قدرت والے اللہ کے لیئے کیا مشکل ہے کہ وہ تمہیں دوبارہ حیات دیدے "ثم یجمعکم الی یوم القیمۃ لا ریب فیہ" ۔ اس مادی موت کے بعد پھر تمہیں اللہ قیامت میں دوبارہ زندہ کر کے جمع کرے گا۔ یہ یاد رکھو کہ قیامت کے آنے میں کوئی بھی شک کی گنجائش نہیں ہے وہ ضرور آئے گی۔ اسلام کی بنیادی تعلیمات میں قیامت کا اعتقاد بڑی اہمیت رکھتا ہے جو شخص قیامت کا عقیدہ نہیں رکھتا وہ مسلمان نہیں ہے اور جو سچے دل سے قیامت کے آنے پر یقین رکھے گا یقیناً اس کی یہ دنیاوی زندگی گناہوں سے پاک ہوگی اُس کے دل میں خدا کا خوف ہوگا اور وہ کبھی ظلم و جور فساد اور بد دیانتی کا ارتکاب نہیں کر سکتا۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ۝ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۫ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ؕ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ

تَعْمَلُوْنَ ۝ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّا كُنَّا
نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا
الصّٰلِحٰتِ فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ
الْمُبِيْنُ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۫ اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى
عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ وَاِذَا
قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا
نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ۝
وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ
يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ لِقَآءَ
يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝
ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝
فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ سورۂ جاثیہ

(پارہ ۲۵ رکوع ۲۰)

اور سارے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت خاص خدا ہی کے لیئے ہے اور جس روز
قیامت برپا ہوگی اس دن اہل باطل بڑے گھاٹے میں رہیں گے اور (اے رسولؐ)
تم ہر امت کو دیکھو گے کہ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھی ہوگی اور ہر امت اپنے نامۂ اعمال
کی طرف بلائی جائے گی۔ آج کے دن اس کا بدلہ دیا جائے گا جو تم لوگ کیا کرتے
تھے۔ ہماری کتاب تمہارے مقابلہ میں ٹھیک ٹھیک بول رہی ہے۔ ہم تمہارے
اعمال کو لکھواتے جاتے تھے۔ غرض جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کیئے
تو ان کو ان کا پروردگار اپنی رحمت میں داخل کرے گا یہی تو کھلی ہوئی کامیابی ہے
اور جنہوں نے کفر اختیار کیا (ان سے کہا جائے گا) کیا تمہارے سامنے ہماری آیتیں
پڑھی نہیں جاتی تھیں۔ تو تم نے تکبر کیا اور تم لوگ گنہگار ہو گئے اور جب کہا جاتا تھا کہ
بیشک خدا کا وعدہ سچا ہے اور قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں تو تم کہا کرتے

تھے کہ ہم نہیں جانتے قیامت کیا چیز ہوتی ہے ہم تو اسے بس ایک خیالی بات سمجھتے ہیں اور ہم اس کا یقین نہیں رکھتے اور ان پر ان کے اعمال کی برائیاں ظاہر ہو جائیں گی اور جس عذاب کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے وہ انہیں ہر طرف سے گھیر لیگا اور (ان سے) کہا جائے گا کہ جس طرح تم نے اس دن کے آنے کو بھلا دیا تھا اسی طرح آج ہم تم کو بھلا دینگے اور تمہارا ٹھکانا دوزخ ہے اور کوئی تمہارا مددگار نہیں۔

یہ اس سبب سے کہ تم لوگوں نے خدا کی آیتوں کو ہنسی ٹھٹھا بنا رکھا تھا اور دنیا کی زندگی نے تم کو دھوکے میں ڈال دیا تھا۔ غرض یہ لوگ نہ تو آج دوزخ سے نکالے جائیں گے اور نہ ان سے خدا کی خفگی کی تلافی چاہی جائے گی۔ تو سب تعریف و حمد خدا ہی کے لیئے سزاوار ہے جو سارے آسمانوں کا رب ہے، زمین کا بھی مالک ہے اور سارے جہان کا وہی پروردگار ہے اور تمام آسمانوں اور زمین میں اسی کے لیئے بڑائی ہے اور وہی (سب پر) غالب حکمت والا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ ان آیات کریمہ میں خدا کی عظمت اور اس کی بادشاہت کا اعلان ہے اور جو لوگ اُس کے حکم سے سرکشی کرنے والے ہیں اُن کی سزا کا تذکرہ ہے۔ قیامت کے ہولناک دن کو یاد دلایا گیا ہے اور ایمان لانے والوں اور کفر اختیار کرنے والوں کے نتیجوں سے آگاہ فرمایا گیا ہے۔ سب سے پیشتر ارشاد ہوا ہے:

" وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ " آسمانوں اور زمین میں بادشاہت خدا کی ہے۔ اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا ان کا مالک نہیں ہے۔

قرآن کریم اس کا بار بار اعلان فرماتا ہے کہ زمین و آسمان اور ان کی ہر چیز کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے۔ یہی اسلام کا بنیادی نظریہ ہے اور اسی پر اس کی تمام تر تعلیم کا انحصار ہے۔ اگر ہم خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہیں تو مسلمان ہیں ورنہ ہمارا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہوگا اور جب بنیادی حیثیت سے ہم خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرلیں گے تو پھر ہمارا کوئی اقدام اور کوئی عمل اصولی طور پر اُس کی مرضی اور حکم کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے۔

بلاشبہ ہر شی کا اصلی مالک صرف خدا ہے اور ہر چیز اسی کی مشیت کی تابع ہے۔ انسان کو تو صرف اس قدر حق دیدیا گیا ہے کہ وہ جائز حدود میں کائنات

کی چیزوں پر تصرف کر سکے بالکل اسی طرح جیسے کوئی نوکر یا غلام اپنے مالک اور آقا کی اجازت حاصل کر کے ان چیزوں پر تصرف کرتا ہے جو اس کے آقا کی ملکیت میں ہوں اس لیئے یہ ضروری ہے کہ اس نوکر اور ملازم کا عمل ان چیزوں کے اصلی مالک کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور وہ جو کچھ بھی کرے اس میں اپنے آقا کی اجازت حاصل کر لے اور اس کا یقین رکھے کہ اسے اپنے مالک کے سامنے اپنے عمل کا جوابدہ ہونا پڑے گا اور جو مال و دولت اور دوسری چیزیں اس کے سپرد کی گئی ہیں اس کی ایک ایک پائی اور ایک ایک شئی کا حساب اس کو دینا ہو گا کیونکہ وہ تو صرف تصرف کرنے کا اور وہ بھی جائز طریقہ اور جائز حدود کے اندر رہ کر حق رکھتا ہے اس کے آگے اس کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ اس نظریہ کا اعلان قرآن کریم نے ان الفاظ کے ساتھ بھی فرمایا ہے: "اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ" خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اس نے تم کو اپنا نائب بنا دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ انسان جس مال و دولت اور جائداد کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے وہ سب درحقیقت خدا ہی کا مال ہے اور انسان کو کچھ مخصوص شرطوں کے ساتھ اسے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے جن میں سے سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ اس تصرف اور استعمال میں خدا کی مرضی اور خوشنودی کی قطعی طور پر پابندی کی جائے ایسی صورت میں جب انسان اپنی ذات کو خدا کی صرف نیابت کے جائز حدود میں محدود رکھے کبھی وہ بے انصافی اور بے اعتدالی کا مرتکب نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے ہر وقت اس بات کا خیال اور خوف رہیگا کہ میرا کوئی کام خدا کی رضا کے خلاف نہ ہونے پائے یہاں تک کہ اسے اپنے بدن اور اعضاؤ جوارح اور اپنی جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کے استعمال میں بھی ان حدود کا پابند رہنا پڑے گا جو اللہ نے مقرر اور معین فرما دی ہیں۔ اس طرح اگر کوئی انسان اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا عقیدہ رکھتا ہے تو وہ اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی ایسا کام کرنے کی جرأت نہیں کرے گا جو اس ایمان اور عقیدے سے ٹکرا سکتا ہو اور جو لوگ اس ظاہری مادی زندگی کے فریب سے دھوکا کھا کر حقیقت سے منہ موڑ لیتے ہیں اور جو کچھ مال و

متاع اس زندگی میں اُن کو حاصل ہو گیا ہے اس کا حقیقی مالک اپنی ذات ہی کو سمجھنے لگتے ہیں اور یہ نہیں خیال کرتے کہ اس کا اصلی مالک کوئی دوسرا ہے وہ ہمیشہ اپنی ہی خواہش کو ہر کام میں مقدم رکھیں گے اور چونکہ ان کو باز پرس اور جوابدہی کا بالکل ہی خوف نہ ہو گا۔ اس لیئے ان کے عمل میں ہر لحہ اور ہر قدم پر ناانصافی اور بے اعتدالی کا امکان پیدا ہو جائے گا جو کسی سچے مومن اور خدا پرست کے یہاں ممکن نہیں ہے۔

خدا کے مقابلہ میں انسان کی حیثیت ایک معمولی غلام کی سی ہے اور وہ بھی ایسا غلام جس کو زندگی بھی اس کے آقا ہی نے بخشی ہو اور پھر اس زندگی کو باقی رکھنے کے لیئے سارے سامان بھی دیئے ہوں۔

اس تمام کائنات میں کونسی ایسی چیز ہے جس کو ہم نے خلق کیا ہو۔ نہ ہوا ہم نے پیدا کی، نہ پانی کو ہم نے خلق کیا، نہ یہ آگ ہماری بنائی ہوئی ہے اور یہ مٹی ہماری پیدا کی ہوئی ہے۔ ہم نے بڑے بڑے جہاز بنائے مگر جن دھاتوں اور جن چیزوں سے بناتے ان میں سے کوئی بھی ہماری خلق کی ہوئی نہ تھی ہم نے بڑے بڑے کارخانے تعمیر کیئے مگر یہ مشینیں اور یہ دیو ہیکل آلات جن چیزوں سے تیار کیئے گئے ان میں سے کوئی چیز بھی ہماری خلق کی ہوئی نہ تھی۔ ہم نے سواریاں بنائیں مکانات تعمیر کیئے۔ آواز پھیلانے کے آلات بنائے اور ہزاروں حیرت انگیز ایجادیں کیں مگر جن مادّوں اور جن اشیا سے ہم نے یہ ایجادات کیں ان میں اثر دینے والے اور ان کو ابتدائی خلقت دینے والے ہم نہ تھے اور نہ کوئی دوسرا انسان تھا بلکہ ان کا بنانے اور خلق کرنے والا اللہ ہے۔ ہم نے اعلیٰ ترین لباس تیار کیئے مگر روئی، ریشم اور اون جس سے ہم نے یہ لباس بنائے تھے ان کے خالق خود ہم نہ تھے ہم نے صرف ان کی تاثیریں اور ان کے فائدے حاصل کیئے۔ کبھی ایک کو دوسرے سے ملا کر اور کبھی بغیر ملائے اور بغیر آپس میں ربط قائم کیئے۔ لیکن اس پورے تصرف میں خدا کی طرف سے ہمارے لیئے حدیں مقرر ہیں جن کی پابندی ایک محکوم کی حیثیت سے ہمارے ضروری ہے۔

خدا نے اپنی نعمتوں کو ہم تک پہنچانے کے لیئے جو وسیلے اور ذرائع معین فرمائے

ہیں انہوں نے وہ نعمتیں بڑی امانت داری کے ساتھ ہم تک پہنچائی ہیں ورنہ اگر راستہ میں کہیں بھی خدا کی ان امانتوں میں خیانت کی جاتی اور امانتداری کے فرض کو پورا نہ کیا جاتا تو ہم یہ تاثیریں حاصل نہ کر سکتے اور یہ فائدے جو آج کائنات سے ہمیں یقین کے ساتھ حاصل ہو رہے ہیں ہرگز حاصل نہ ہو سکتے۔ یہاں تک کہ اگر خدا نے جانوروں اور کیڑوں کے ذریعہ بھی ہمیں نعمتیں عطا فرمائی ہیں تو ان جانوروں اور حشرات الارض نے بھی فریضۂ امانت کو پورا کرنے میں کوئی کمی نہیں کی۔

انسان آمیزش کرتا ہے مگر جانور نہیں کرتا۔ گائے ہمیشہ خالص دودھ دیگی مکھیاں خالص شہد تیار کریں گی، بھیڑیں خالص اون اتاریں گی۔ جہاں انسانی ہاتھ نہ ہو اور قدرتی وسائل موجود ہوں وہاں دھوکا، فریب، غلطی، تخریب اور نقصان رسانی کا کوئی امکان نہیں ہوتا مگر جب اُن چیزوں میں انسان کا دخل شروع ہو جاتا ہے تو ہر قسم کے امکانات پیدا ہو جاتے ہیں جبکہ وہ خدا کی مقرر کردہ حدوں کی پابندی نہ کرے۔

انسان کائنات کی جن چیزوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے جہاں اُن میں سے کوئی چیز بھی اس کی خلق کی ہوئی نہیں ہے اس کے ساتھ ہی وہ جسمانی قوت و اعضاء و جوارح اور وہ عقل و ادراک جس سے وہ مختلف ایجادات کرتا ہے۔ ان سب کو کس نے خلق کیا ہے اور انسان کو کس نے اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ ایسی ایسی ایجادیں کر سکے اس کا جواب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ وہ خلق کرنے والا وحدہ لاشریک اللہ ہے اُس کے سوا کوئی بھی ان چیزوں کو خلق نہیں کر سکتا۔ یقیناً وہی کائنات کی ہر شئے کا مالک و مختار ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے ہر قدم پر اُس کی خوشنودی کو مقدم رکھے اور سارے جہان کے اصلی مالک اور بادشاہ کے حکم سے سرتابی اور سرکشی کرنے کی جرأت اور اس سے بغاوت نہ کرے۔ اس کی نشانیوں کا مذاق اڑانے والے اور اس کے حکم سے سرکشی کرنے والے اس کے عذاب کے مستحق ہوں گے اور اُس پر ایمان لانے والے اور نیک اعمال کرنے والے ابدی رحمت و جنت کی جزا حاصل کریں گے۔

"فَلِلّٰہِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَلَہُ الْکِبْرِیَآءُ فِی السَّمٰوٰتِ

وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْم "

تمام حمد و ثنا اللہ کے لیئے سزاوار ہے جو سارے آسمانوں اور زمین کا رب ہے اور وہی کُل جہان کا پروردگار ہے اور تمام آسمانوں اور زمین میں اُسی کے لیئے بڑائی اور بزرگی ہے اور وہی سب پر غالب اور حکمت والا ہے۔

وَالنَّجْمِ اِذَا ھَوٰی ۝ مَا ضَلَّ صَاحِبُکُمْ وَمَا غَوٰی ۝ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝ عَلَّمَهٗ شَدِیْدُ الْقُوٰی ۝ ذُوْ مِرَّةٍ ط فَاسْتَوٰی ۝ وَھُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ۝ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ۝ فَکَانَ قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی ۝ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰی ۝ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ۝

(مدیس) ۱۱۰

(پارہ ۲۷ رکوع ۵ سورۂ النجم)

ستارے کی قسم جب وہ گرا، تمہارا رفیق نہ بہکا اور نہ بے راہ چلا اور نہ وہ اپنی نفسانی خواہش سے بولتا ہے یہ تو بس وحی ہے جو اُس پر بھیجی جاتی ہے، اسے سخت قوتوں والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا زبردست ہے پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور وہ اونچے کنارے پر (آسمان کے) تھا پھر وہ نزدیک آیا پھر اور اتر آیا پھر دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے کم پھر اللہ نے اپنے بندہ پر جو کچھ وحی نازل فرمانا تھی نازل کی جو دیکھا اس میں پیغمبر کے دل نے جھوٹ نہیں کہا۔

تشریح و تفسیر: بعض مفسّروں نے "النّجم" ستارے کی جنس کو مراد لیا ہے یعنی سب ستارے اور بعض نے ستارۂ زہرہ اور کسی نے ثریّا کو مراد لیا ہے۔ کسی مفسّر نے خود حضرت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور کسی نے قرآنِ کریم کو مراد لیا ہے لیکن طرزِ عبارت بتاتا ہے کہ اس ستارے سے مراد کوئی خاص ستارہ ہے عام نہیں اور اُس کے جھکنے اور گرنے میں کوئی ایسی خصوصیت اور شرف ہے جس کی وجہ سے اللہ نے اُس کی قسم کھا کر اُس کی اہمیت کو ظاہر فرمایا ہے اور اس قسم کے ساتھ جو بات فرمائی گئی ہے وہ یہ کہ نبی کریم جن کی ذات کی طرف لفظ "صاحبکم" سے اشارہ ہے نہ کبھی بہک سکتے ہیں اور نہ کبھی غلطی کر سکتے ہیں اور اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ جس طرح آسمان کا ستارہ طلوع سے لیکر غروب تک ایک معین چال سے

اپنے راستہ پر چلتا ہے اور کبھی اِدھر اُدھر ہٹنے اور بہکنے کا نام نہیں جانتا اسی طرح
نبوت کا سورج بھی اللہ کے مقرر اور معین کئے ہوئے راستہ پر چلتا ہے اور اُسی پر
قائم رہتا ہے اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے کہ اُس کا ایک قدم بھی صراطِ مستقیم سے
ہٹ جائے۔ کیونکہ اگر ایسا ممکن ہو تو نبی کی بعثت اور ان کے آنے اور ہدایت کے لئے
مقرر ہونے کی جو غرض ہے وہ حاصل نہیں ہو سکتی۔ بلاشبہ انبیاء و مرسلینؑ آسمانِ
ہدایت وارشاد کے ستارے ہیں جن کی روشنی اور رفتار سے دنیا کی رہنمائی ہوتی ہے اور
جس طرح تمام ستاروں کے غروب ہو جانے کے بعد سورج نکلتا ہے اور اُس کی روشنی
اور نورانی کرنوں کے سامنے کوئی دوسرا ستارہ نظر نہیں آتا اسی طرح تمام انبیاءؑ و
مرسلینؑ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد آفتاب محمدی اُفقِ عرب سے طالع ہوا جس کی روشنی
کے سامنے پچھلے ستاروں کی چمک ماند پڑ گئی اور اس سورج کا نور زمین سے عرش تک
پھیل گیا۔ تو پھر جب اللہ نے ان ظاہری ستاروں کا نظام اس قدر مضبوط بنا دیا ہے
کہ اُس میں کسی طرح کا بھی فرق پیدا نہیں ہوتا اور کوئی طاقت اُس میں ایک لمحہ کے لئے
بھی خلل اور ... نہیں ... کر سکتی تو بالکل اسی طرح ان باطنی ستاروں اور روحانی نظام شمسی
یعنی نبوت و رسالت کی رفتار اور اعمال و افکار میں بھی کوئی غلطی اور کوئی گمراہی نہیں پیدا
ہو سکتی جس کے وجود سے اس پوری کائنات کی سعادت اور فلاح قائم ہے۔ "وَمَا
يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى" وہ اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہیں کہتا بلکہ یہ
قرآن اور جو کچھ بھی پیغمبر کہتا ہے وہ وحی ہوتی ہے جو اُس پر نازل کی جاتی ہے۔

یہ آیاتِ مبارکہ اس قدر وضاحت کے ساتھ اِس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہیں
کہ انبیاء و مرسلین گناہ اور خطا نہیں کرتے اور جو کچھ بھی کہتے اور کرتے ہیں وہ سب منشاءِ
الٰہی اور حکم خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اس سے زیادہ واضح اور کھلے ہوئے الفاظ
ممکن نہیں ہیں۔ جن کے پڑھنے اور دیکھنے کے بعد ہر شخص نبی و رسول کے بلند مقام و منزلت
سے پوری طرح باخبر ہو سکتا ہے اور اُسے اُن کی شانِ عصمت میں کسی قسم کی الجھن اور
شک و شبہہ باقی نہیں رہ سکتا۔

لیکن اسی کے ساتھ ہی قرآن کریم میں بعض مقامات پر انبیاء کی طرف "ذنب"
"عِصیان" اور "غوایت" کی نسبت دی گئی ہے جس کے معنی بظاہر گمراہی، گناہ اور

راہِ حق سے دور ہو جانے کے ہیں ۔ ان الفاظ سے اُن لوگوں کو جن کی نظر میں انبیاء و مرسلین کا وہ معیار پوری طرح نہیں ہے جسے قرآن کریم نے بار بار بیان فرمایا اور ظاہر کیا ہے کسی قدر الجھن ہو سکتی ہے ۔ مگر یہ پوری طرح ظاہر ہے کہ ایسے تمام مقامات پر اس قسم کے الفاظ سے جرم و خطا اور گناہ کو مراد نہیں لیا جا سکتا اس حقیقت کو سمجھنے کے لیئے ضرورت ہے کہ سب سے پہلے ہم اُس غرض کو سمجھ لیں جس کے لیے پیغمبروں کو دنیا میں بھیجا جاتا ہے پھر اس پر غور کریں کہ نبی و رسول کی کیا شان ہوا کرتی ہے اور وہ کس طرح کا انسان ہوتا ہے اس کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کا بغور مطالعہ بھی کریں کہ خود قرآن کریم نے انبیاء و مرسلین کے لیئے کیا کیا صفات بیان کی ہیں اور ان کی منزلت اور مرتبہ کو کن الفاظ میں بیان کیا ہے اس کے بعد ہمیں اس کے سمجھنے میں کوئی بھی دشواری نہ ہوگی کہ نبی اور رسول کبھی گناہ نہیں کر سکتے ، اور کبھی کوئی ایسا کام نہیں کر سکتے جو خدا کی رضا اور حکم کے خلاف ہو بلا شبہ نبی کے آنے کی غرض یہ ہے کہ وہ دنیا والوں کو ہدایت کرے ، انہیں خدا کے حکم اور اُس کی مشیت سے آگاہ کرے ، دینِ حق کی تعلیم دے ، خدا کے بتائے ہوئے راستہ پر چلائے اور عبادت و معصیت ، گناہ اور اطاعت کا فرق سمجھائے اور ان سب باتوں کے حدود واضح کر دے ۔ انبیا اور مرسلین کا قول و عمل ، اُن کی شخصیت اور ان کی زندگی الٰہی ہدایت کا سب سے بڑا سرچشمہ ہوتا ہے ، اُن کی پاک سیرت اور اُن کا روشن کردار ایک مثال اور نمونہ ہوتا ہے جس کو آنکھ بند کر کے مشعلِ راہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ بس ہدایت ہی ہدایت ہے اُس میں ضلالت و گمراہی ، بھول چوک ، غلطی اور دھوکے کا امکان ہی نہیں ہوتا ، وہ اللہ کی مشیت اور حکم کی سچی تصویر اور اُس کی رضامندی اور پسند کا شفاف آئینہ ہوتا ہے جس میں شک و شبہہ کا کوئی دھبا نہیں آ سکتا اور یہ غرض ہدایت صرف اُسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب انبیاء ہر قسم کی کردار کی کمزوری اور گناہ وغیرہ سے پاک ہوں ورنہ خود گناہ کرنے والا دوسرے کو ہدایت کیسے کر سکتا ہے ۔ اور جو خود سیدھی راہ پر نہ ہو وہ دوسرے کی رہبری کا حق کس طرح حاصل کر سکتا ہے پھر اگر وہ بھول بھی جایا کریں ۔ کچھ کا کچھ بتا دیں حکم خدا کچھ ہو اور وہ سمجھیں کچھ اور آج کچھ کہیں اور کل کچھ کہیں ۔ ایسی حالت میں ان کے قول و فعل پر کسے بھروسا اور اعتماد ہو سکے گا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ حق اور منشاءِ

الٰہی کے مطابق ہے اس لیئے اگر اس بنیادی نظریہ میں ذراسی بے احتیاطی سے کام لیا گیا اور پورے طور پر انبیاء کی غرض بعثت اور ان کی اصلی شان اور مقام کو سمجھنے میں کمی کی گئی تو پھر نبیوں کے آنے کی غرض اور ان کی بعثت کا اصلی مقصد ہی ختم ہو جائیگا دوسرے یہ کہ عہدۂ نبوت و رسالت پر انبیاء و مرسلین کو خدا ہی نے مقرر فرمایا ہے اور یہ مقدس ہستیاں اُسی کی چُنی ہوئی اور منتخب کی ہوئی ہوتی ہیں اور یہ بات عقل کے خلاف ہے کہ خدا ہدایت کے عظیم کام کے لیئے کسی گناہگار کو یا ایسے شخص کو چنے جس کے قول و فعل پر اُسے کوئی بھروسا اور اعتماد نہ ہو اور جو غلطی اور خطا کر سکتا ہو۔ قرآن کریم میں اس کا صاف اعلان موجود ہے "وَاِنَّھُم عِندَنَا لَمِنَ المُصطَفَینَ الاَخیَار" یہ لوگ ہماری بارگاہ میں چُنے ہوئے اور نیک لوگ ہیں۔ اس بات کو ہم یوں بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اللہ نے انبیاء کی پیروی نہ کرنے پر عذاب جہنم کا اعلان کیا ہے "ومن یعص اللہ ورسولہٗ فَاِنَّ لَہٗ نَارَ جَھَنَّمَ خَالِدِینَ فِیھَا اَبَدًا" جو شخص خدا اور اُس کے رسول کی نافرمانی کرتا ہے اُس کے لیئے جہنم کی ابدی آگ ہے۔ اِس پیروی میں اور اِس اطاعت خدا اور رسول میں نہ کوئی شرط ہے اور نہ کوئی قید ہے اس بنا پر اگر نبی سے گناہ اور خطا ہو سکے تو اُس میں بھی ...... اُس کی پیروی اِس حکم خدا کی بنا پر ضروری ہو جائے گی حالانکہ یہ تعلیمات اسلام کے خلاف ہے اور عقل کے بھی منافی ہے اس لئے یہ اعتقاد لازمی ہے کہ انبیاءؑ و مرسلینؑ معصوم اور جرم و خطا سے پاک ہیں تاکہ غرض بعثت اور مقصد تبلیغ دین الٰہی بے حقیقت ہو کر نہ رہ جائے۔ ان آیات کی شان نزول میں حضرت فاطمہ زہرا کے گھر میں ستارہ زہرہ کے نذدں کا ذکر مناقب ابن شہر آشوب ج ۲ ص ۱۹۵ پر تفصیل سے موجود ہے۔

درس ۱۳

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰی ○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰی ○
وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰی ○
عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰی ○ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰی ○
وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰی ؕ ○ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰی ○
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰی ○ فَاَوْحٰی اِلٰی عَبْدِهٖ
مَا اَوْحٰی ○ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ○
(پارہ ۲۷ رکوع ۵ سورۃ النجم)

ستارے کی قسم جب وہ گرا، تمہارا ساتھی نہ بہکا اور نہ بے راہ چلا اور نہ وہ اپنی نفسانی خواہش سے کلام کرتا ہے۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وہ وحی ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے اسے شدید طاقتوں والے نے تعلیم دی ہے جو بڑا زور آور ہے۔ پھر وہ سیدھا کھڑا ہوا اور وہ آسمان کے اونچے کنارے پر تھا پھر وہ نزدیک آیا پھر اور نزدیک آیا پھر دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا بلکہ اس سے بھی کم پھر اللہ نے اپنے بندے پر جو کچھ وحی بھیجنا تھی بھیجی۔ جو کچھ دیکھا اس میں پیغمبر کے دل نے جھوٹ نہیں کہا۔ گذشتہ درس میں یہ کہا گیا تھا کہ انبیاء و مرسلین گناہ اور عصیاں سے پاک ہوتے ہیں اس درس میں بھی اسی موضوع پر کچھ مزید روشنی ڈالی جاتی ہے۔

تشریح و تفسیر:- قرآن کریم میں اللہ کا ارشاد ہے: "ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار" حق کے خلاف عمل کرنے والوں کی طرف مائل نہ ہونا ورنہ جہنم کی آگ تمکو اپنی لپیٹ میں لے لیگی۔ "ظلم" ہر اس کام کو کہتے ہیں جو حق کے خلاف ہو اس لیئے اگر نبی کا قدم ذرا بھی حق سے جدا ہوگا تو اس کے حکم پر عمل کرنا اور اس کا اتباع کرنا ہمارے لیئے جائز نہ ہوگا اور اگر ہم ایسا کریں گے تو عذاب جہنم کے مستحق بن جائیں گے اور دوسرے مقام پر یہ فرمایا گیا ہے کہ جو نبی کا کہنا نہ مانے گا وہ جہنم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ڈال دیا جائے گا۔ یہ دونوں باتیں اسی وقت جمع ہو سکتی ہیں جب ہم نبی کے لیئے یہ تسلیم کرلیں کہ اس سے کسی قسم کا بھی گناہ اور عصیان نہیں ہوسکتا ابھی ابھی عرض کیا گیا کہ "ظلم" ہر اس عمل کا نام ہے جو حق کے خلاف ہو پھر قرآن کا بھی تو یہ فرمان ہے کہ "ولا ینال عہدی الظالمین" اے ابراہیم، میرا یہ منصب یعنی نبوت ورسالت وامامت ظالموں کو نہیں ملے گا اور جو گناہگار ہوتا ہے وہ یقیناً ظالم کہا جائیگا اس لیئے وہ عہدۂ نبوت ورسالت نہیں پاسکتا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی مسلم ہے کہ گناہ، بھول چوک، غلطیاں یہ سب کچھ شیطان کے تسلط سے ہوا کرتا ہے اور اللہ کا اعلان موجود ہے "ان عبادی لیس لک علیہم سلطان" اے ابلیس میرے خاص بندوں پر تجھ کو کوئی غلبہ حاصل نہ ہوگا اور شیطان نے خود بھی اس بات کا اقرار کرلیا ہے کہ: "لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین" میں سب کو گمراہ کروں گا لیکن اے اللہ تیرے

مخلص بندوں کو میں گمراہ نہیں کر سکتا۔ انبیاء و مرسلین اللہ کے مخلص بندے ہوتے ہیں۔ وہ "مُصطفَین" اور "اخیار" یعنی چنے ہوئے اور اللہ کے منتخب کیے ہوئے اور پسند کیے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ اُن سے زیادہ خدا کا مخلص اور اطاعت گذار کون ہوگا۔ اسی وجہ سے اُن کو دنیا والوں کی ہدایت کا عظیم منصب عطا کیا جاتا ہے جو ان کے سوا کوئی دوسرا نہیں کر سکتا اس لیئے وہ شیطان کے غلبہ سے پاک ہیں اُن پر ابلیس کسی حال میں بھی قابو حاصل نہیں کر سکتا اور اسی بنا پر وہ گناہ کبھی نہیں کرتے اور جب عام طور پر ہر نبی کی یہ شان ہے تو پھر اُس ذات کی شان و منزلت کون بیان کر سکتا ہے جو سبب اور غرضِ پیدائش عالم ہو۔ خدا فرماتا ہے حدیث قدسی میں "لولاک لما خلقت الافلاک" اے رسولؐ اکرم نہ ہوتے تو میں آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔ جو پیغمبر عالی مرتبت اُس وقت بھی نبی تھا جب حضرت آدم علیہ السلام مٹی اور پانی کی درمیانی منزل میں تھے: "کنت نبیًّا و آدمُ بین الماء و الطین" وہ رسولِ کریم جسکی رسالت کی گواہی اللہ نے اپنی کتاب کی قسم کھا کے دی ہے: "والقرآن الحکیم انک لمن المرسلین علی صراطٍ مُستقیم" قرآن حکیم کی قسم تم یقیناً رسول ہو، تمہارے قدم بالکل سیدھی راہ پر ہیں۔ جس کی اطاعت عین اطاعت خدا ہو: "من یطع الرَّسُولَ فقد اطاع اللہ" جس نے رسول کی پیروی کی اس نے خدا کی پیروی کی۔ جو بشیر و نذیر تھا جو نور تھا جو سراج منیر تھا جو معلم کتاب و حکمت تھا جو زمین و آسمان کی پیدائش کا سبب تھا جو عالمین کا ہدایت کرنے والا تھا جس کی اطاعت۔ اطاعت خدا تھی جس کا کلام وحی و الہام تھا اس لیئے یہ واضح بات ہے کہ انبیاء و مرسلین کے لیے جہاں کہیں قرآن کریم میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں وہاں ان کے مشہور معنی مراد نہیں ہیں اور نہ ہم ان کا ترجمہ اور مطلب اپنی سطح اور اپنے معیار پر مراد لے سکتے ہیں بلکہ ہمیں ان کا مفہوم خود انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی شان اور اعلیٰ مقام کے مطابق سوچنا ہوگا اور ان کے منصب جلیل کو سامنے رکھ کر ان الفاظ پر غور کرنا چاہیئے۔ جیسے ہم جانتے ہیں کہ اللہ کا جسم نہیں ہو سکتا اور اس کے ہاتھ پیر ممکن نہیں، وہ جسم اور مادے سے الگ ہے مگر ساتھ ہی قرآن کریم میں یہ الفاظ بھی موجود ہیں "ید اللہ فوق ایدیھم"

خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے۔ اس لیے ہمیں یہ سمجھنا پڑے گا کہ یہاں "ید" سے مراد یہ مادّی اور جسمانی ہاتھ نہیں ہے بلکہ اس سے مراد قدرت و طاقت و اقتدار ہے۔ اسی طرح دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے "بل یداہ مبسوطتان" اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوئے ہیں۔ یہاں بھی مادّی ہاتھ مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جسم میں ترکیب ہوتی ہے اور اللہ وحدہ لاشریک ہے لہٰذا وہ جسم نہیں رکھتا جسم قدیم نہیں ہوتا بلکہ حادث یعنی پیدا ہوتا ہے۔ پہلے کچھ نہ تھا پھر وجود میں آیا ہے اور خدا تو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا لہٰذا وہ جسم نہیں، جسم محتاج ہوتا ہے اور خدا نہ اپنے وجود میں نہ اپنے کسی کام میں کسی کا بھی محتاج ہے لہٰذا وہ جسم نہیں ہو سکتا اس لیے ان الفاظ قرآنی کا مطلب بھی یہی ہوگا کہ اللہ کے اختیار و اقتدار پر کوئی پابندی اور کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور جو اُس کی مشیت ہوتی ہے وہی ہوا کرتا ہے۔ اسی طرح شانِ نبیؐ و رسول بھی اس سے دور ہے کہ "ضلالت" اور "ذنب" کے لغوی معنی یہاں مراد لیے جائیں۔ اللہ نے خود اپنی ذات کے لیے بھی لفظ "اضلال" فرمایا ہے جس کے اصلی معنی تو گمراہ کرنے ہی کے ہیں مگر یہ معنی ہرگز مراد نہیں ہو سکتے۔ جیسے یہ ارشاد ہوا ہے۔ "قل ان اللہ یُضِلُّ من یشآء" (رعد - ۳) کیونکہ اگر خدا ہی (خاکم بدہن) گمراہ کرتا ہو تو پھر ہدایت کون کرے گا اس لیے ماننا پڑے گا کہ اس کا مطلب کچھ اور ہے اور وہ یہ ہے کہ خدا گمراہوں کی مدد نہیں فرماتا اور اپنی توفیقات کو اُن سے جدا کر لیتا ہے۔

اسی طرح خود حضرت سرورِ کائنات کے لیے سورۂ "الضحیٰ" میں اللہ فرماتا ہے "وَوَجَدَکَ ضَآلًّا فَهَدٰی" "ضال" کے معنی گمراہ کے مشہور ہیں مگر یہاں کیونکر مراد لیے جا سکتے ہیں جبکہ عقلی دلیلوں سے اور قرآنی اعلان سے حضور خاتم الانبیاء کی ارفع و اعلیٰ شانِ عصمت معلوم ہو چکی ہے اور خدا کا فرمان صاف الفاظ میں موجود ہے "ما ضل صاحبکم وما غوی وما ینطق عن الھوی اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ" تو اب یہ بات خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس "ضالّ" سے گمراہ نہیں بلکہ یقیناً کوئی اور معنی مراد ہیں چنانچہ ائمہ اہلبیت علیہم السلام کی احادیث سے یہ ثابت ہے کہ اس کے معنی گمراہ کے نہیں بلکہ پوشیدہ اور چھپے ہوئے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اے رسول تمکو پوشیدہ پایا لوگ

تم کو جانتے نہ تھے اور تمہارے فضل و شرف سے واقف نہ تھے تو اُس نے تمہاری شخصیت کو پہچنوایا اور تمہارے ستارۂ شرف کی چمک کو عالم بھر میں پھیلا دیا اس لئے اس پوری بحث کا نتیجہ یہ نکلا کہ الفاظ قرآنی کہیں تو اپنے اصلی معنی ظاہر کرتے ہیں اور کسی جگہ موقع اور محل کے لحاظ سے انداز کلام کچھ اور ہو جاتا ہے۔ محلِّ کلام بدلنے سے معنی بدلتے ہیں لہجہ بدلنے سے مفہوم بدلتا ہے اور صرف عربی زبان ہی میں نہیں بلکہ ہر زبان میں یہ چیز موجود ہے۔ ہماری اپنی زبان میں بھی ایک ہی لفظ محل اور موقع اور لہجہ کے بدلنے سے بالکل ایک دوسرے کے مخالف مفہوموں میں بولا اور سمجھا جاتا ہے قرآنِ کریم میں ایک دوسرے مقام پر حضرت خاتم الانبیاء سے خطاب الٰہی ہو رہا ہے: "واستغفر لذ بنك" جس کا ظاہری ترجمہ تو یہی ہے کہ اپنے گناہ سے استغفار کرو مگر اصلی مراد یہ نہیں ہو سکتی بلکہ اس کا اعلانِ عام موجود ہے: "ما ضلّ صاحبکم وما غوی" ۔ تو اب ہمیں سمجھنا چاہیئے کہ یہاں امت کے گناہوں کے لیئے استغفار مراد ہے یا خود استغفار کر کے دوسروں کو استغفار کرنے کا طریقہ سکھانا مقصود ہے۔ اسلامی عقائد کے کچھ بنیادی اصول ہیں جن کو خوب سمجھ کر احادیث و آیاتِ کتاب الٰہی کے مطالعہ کی ضرورت ہے کیونکہ ہر کلام کے مختلف گوشے ہوتے ہیں اور محلِ استعمال اور محلِّ کلام اور اندازِ گفتگو سے مفہوم و معنی بدل جاتے ہیں جیسے کافر و ظالم پیار سے دوست کو بھی کہا جاتا ہے اور کبھی دشمن اور منکر حق کے لیئے بھی بولا جاتا ہے اس لیئے کلام الٰہی کو صرف لغت کی کتاب سے نہیں بلکہ اسلامی اصول اور بنیادی مسلّمات کو پیش نظر رکھ کر احادیث اہلبیت طاہرین علیہم السلام اور اصحاب کرام رضوان اللہ علیہم کی روشنی ہی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ نزول آیات کے محل اور موقع کو جانتے تھے اور وحی کے انداز گفتگو سے واقف تھے۔

(درس ۲۳۲) وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۝ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ۝ عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى ۝ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۝ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ۝ لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۵ کی درمیانی چند آیات سورۃ النجم)

اور انہوں نے اسے ایک بار اور بھی دیکھا ہے اترتے ہوئے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس۔ اس کے پاس آرام سے رہنے کی بہشت ہے جب چھا رہا تھا سدرہ پر جو چھا رہا تھا نہ نگاہ بہکی اور نہ حد سے بڑھی انھوں نے یقیناً اپنے پروردگار کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں۔

تشریح و تفسیر:۔ "نَزْلَةً" نزول بنا ہے جس کے معنی ہیں ایک مرتبہ اترتے ہوئے اور بغیر اس قید کے صرف ایک مرتبہ اور ایک بار کے بھی آتے ہیں "سدرۃ المنتہیٰ" "سدرۃ" کے اصل معنی بیری کے درخت کے ہیں اور "المنتہیٰ" کے معنی وہ جگہ جہاں پر کسی چیز کی انتہا ہو اور خود انتہا کو بھی کہتے ہیں۔ "سدرۃ المنتہیٰ" سے مراد کوئی ایسا بیری کا درخت نہیں ہے جیسا اس دنیا میں ہوتا ہے یہ تو اشارہ اور تشبیہ ہے اور مراد اس سے وہ انتہائی مقام ہے جہاں فرشتوں کی پرواز اور اُن کے علم کی آخری حد ہے۔ مخلوقات کے اعمال بھی بس یہیں تک جاتے ہیں اور اسی طرح الٰہی احکام بھی اسی مقام تک آتے ہیں اور یہیں سے کائناتِ عالم پر ان احکام خداوندی کا نفاذ عمل میں آتا ہے۔

اُس عظیم مقام کو "سدرۃ المنتہیٰ" کہا جاتا ہے اس کے بعد جو کچھ ہے اُسے سوائے خدا کے دوسرا نہیں جانتا۔ ابوالحسین مقاتل بلخی نے اپنی تفسیر میں سدرۃ المنتہیٰ اور درخت طوبیٰ کو ایک ہی بتایا ہے مگر دوسرے مفسروں نے ان کو الگ الگ دو درخت ظاہر کیا ہے۔

بہرحال سدرۃُ المنتہیٰ سے مراد ایک نورانی درخت ہے جس کی شاخیں تمام کائنات پر پھیلی ہوئی ہیں اور وہ عرشِ الٰہی کے داہنی طرف ساتویں آسمان کے اوپر ہے۔ مقاتل لکھتے ہیں کہ اس درخت کا ایک پتہ اگر زمین پر آجائے تو پوری زمین اُس کے نور سے چمکنے لگے۔ "جنۃُ الماویٰ" بھی عرش کے داہنی طرف ہے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ اسی جنّت میں حضرت آدم علیہ السلام بھی تھے زمین پر اترنے سے پہلے۔ یہی جنّت تمام صاحبانِ تقویٰ اور مومنوں اور شہیدوں کی روحوں کی آرامگاہ ہے۔ "یغشیٰ" "غشیٌ" سے بنا ہے اس کے معنی ہیں چھپا

لینا "زاغ" "زیغ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اپنی جگہ سے ہٹ جانا۔ بھٹک جانا اور مُڑ جانا۔ اسی طرح "طغیٰ" "طغیان" سے نکلا ہے جس کے ایک معنی حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ رسول کی نگاہ نے جو کچھ دیکھا تھا اُس میں اصلیت اور حقیقت سے ذرا سا بھی فرق نہ تھا بلکہ وہ سب خلقت کے اصلی راز اور کائنات کے حقیقی بھید تھے جو پیغمبرؐ نے دیکھے اور بغیر کسی شک و شبہ کے خدا کی عظیم نشانیوں کا حضورؐ نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ فرمایا۔ شجرۂ سدرہ خود ہی نور سے بنا ہے پھر اُس پر حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشتیاق دیدار میں اس عظیم مقام پر اور اس درختِ نور کے گرد ملائکہ سمٰوات کا ہجوم تھا جو بے شمار سنہری اور نورانی پروانوں کی طرح اس درختِ سدرہ پر چھائے ہوئے تھے اور افضل المرسلین حضرت محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری کے آنے کا انتظار کر رہے تھے۔

"لقد راٰہ" کی ضمیر غائب میں پھر مفسّرین نے اختلاف کیا ہے۔ زیادہ لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ جس کو پیغمبر اکرمؐ نے دوبارہ اصلی حالت میں دیکھا اُس سے مراد حضرت جبرائیلؑ ہیں اور کچھ مفسّرین نے اس دیکھنے سے اللہ کو دیکھنا مراد لیا ہے۔ چنانچہ اس مقام پر مختلف الفاظ کے ساتھ حدیثیں ملتی ہیں اور اگر تھوڑا غور کر لیا جائے تو اُن کا ظاہری اور لفظی اختلاف آسانی سے دور ہو سکتا ہے۔

جن لوگوں نے اس دیکھنے سے حضرت جبرئیلؑ کو دیکھنا مراد لیا ہے اُن کے اس بیان میں تو کسی وضاحت اور تاویل کی ضرورت نہیں ہے البتہ جن بعض حدیثوں میں خدا کو دیکھنے کا ذکر آگیا ہے اُن کے مفہوم پر غور کرنے کی ضرورت ہے تاکہ حدیثوں کا صحیح مفہوم ہمارے سامنے آسکے۔ صاحب تفسیر فتح البیان لکھتے ہیں "عن ابن عباس قال راٰی محمد صلے اللہ علیہ واٰلہ وسلم ربہ بقلبہ مرّتین" "حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: سرورِ انبیاء نے اپنے قلب مبارک سے اللہ کو دوبار دیکھا اور دوسری حدیث میں آپ نے فرمایا ہے "راٰی ربہ مرّۃ بفوادہ" حضورؐ نے اپنے رب کو ایک مرتبہ آنکھ سے اور ایک مرتبہ قلب سے دیکھا ہے۔ کسی نے کہا اے صحابیٔ رسولؐ قرآن کریم میں ہے "لا تدرکہ الابصار"

اللہ کو آنکھیں نہیں دیکھتیں تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد اس کی اصلی تجلی ہے جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا اس سے ظاہر ہو گیا کہ حضرت ابن عباسؓ کی مراد یہ تھی کہ رسولؐ اللہ کی ذات کو نہیں بلکہ اس کی عظیم نشانیوں کو دیکھا۔ مسلم و ترمذی نے حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے وہ فرماتے ہیں میں نے خود حضورؐ سے دریافت کیا: "هل رأيت ربك قال نورٌ أنّى أراه" آیا حضورؐ نے اپنے رب کو دیکھا تھا تو ارشاد ہوا وہ نور ہے اُسے میں کہاں دیکھ سکتا ہوں۔ نسائی اور ابن منذر نے بھی حضرت ابوذرؓ سے روایت کی ہے فرماتے ہیں: "رأى رسول الله ربه بقلبه ولم يره ببصره" رسولِ اکرم نے اپنے رب کو اپنے دل سے دیکھا ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا۔ کیونکہ اللہ کو بہ ظاہری آنکھیں نہیں دیکھتیں حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام نے ایک مشہور حدیث میں ہمیں اس باریکی کو اِس طرح سمجھایا ہے: "رأيته فعبدته لم اعبد ربًّا لم اره" میں نے اللہ کو دیکھا ہے جب ہی تو اُس کی عبادت کی اور میں نے ایسے خدا کی عبادت نہیں کی جسے دیکھا نہ ہو۔ کسی نے دریافت کیا یا امیر المؤمنین آپ نے خدا کو کس طرح دیکھا، وہ کیسا ہے، اُس کی شکل و صورت کس قسم کی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا "ما رأيته بهذه الباصرة بل رأيته بعين العقل" میں نے اُس کو اِس ظاہری آنکھ سے نہیں دیکھا بلکہ اپنی عقل کی آنکھ سے دیکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُس کی معرفت اتنی حاصل کی ہے گویا میں نے اُس کو دیکھ لیا ہے۔

اسی بات کی طرف دوسرے طرز میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے حضرت ابوذر سے اپنے ایک ارشاد میں اشارہ کیا ہے آپ فرماتے ہیں اے ابوذرؓ "اُعبُدِ اللهَ كأنّك تراه" تم خدا کی اس طرح عبادت کیا کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو۔ مطلب یہ تھا کہ تم ایسا خلوص اور یقین پیدا کرو اور تمہاری ایمانی طاقت اور معرفتِ خدا اس درجہ پر ہو کہ جب تم عبادت کرو اور بارگاہِ خداوندی میں حاضری دو تو تمہاری ایسی حالت ہو جائے جیسے تم اللہ کو اپنے سامنے اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہو۔ یہ منزلِ یقین محکم کو ظاہر کرنے کا ایک خاص انداز تھا جس کی ان لفظوں کے ساتھ تعلیم دی گئی تھی ورنہ اس ظاہری آنکھ سے تو صرف وہی چیز دکھائی دے سکتی ہے جو جسم رکھتی ہو اور قابلِ تقسیم ہو اور اللہ اس نقص اور عیب سے پاک ہے حافظ ابن کثیر اور دوسرے مفسرین نے حضرت عائشہؓ اور اکثر و بیشتر اصحاب کرام سے حدیثیں نقل کی ہیں اُن سب میں اِس آیت میں جس دیکھنے کا ذکر ہے اُس سے حضرت رسالت مآب

کا جبرئیلؑ امین کو دیکھنا مراد لیا گیا ہے اور اللہ کی ذات کو دیکھنا مراد نہیں ہے اور اگر کسی حدیث
میں خدا کو دیکھنے کا ذکر ہے تو حضرت ابوذرؓ اور خود حضرت ابن عباسؓ نے اس کی تشریح یہ
کردی ہے کہ اس سے مراد شدت نور اور خدا کی عظیم نشانیاں ہیں جو سوائے حضور اقدس کے
نہ کسی نبی نے دیکھیں اور نہ کسی ملک نے مشاہدہ کیں۔ ان آیات کریمہ میں معراج کے واقعہ کا ذکر
ہے جو حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک عظیم معجزہ اور آپ کی تمام انبیاء و
مرسلین اور کل کائنات عالم پر فضیلت کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے۔

(درس ۳۴)

أَفَرَءَيْتُمُ اللَّٰتَ وَالْعُزَّىٰ ۝ وَمَنَوٰةَ الثَّالِثَةَ الْأُخْرَىٰ ۝
أَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنثَىٰ ۝ تِلْكَ إِذًا قِسْمَةٌ ضِيزَىٰ ۝
إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّهُ
بِهَا مِن سُلْطَانٍ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ ۖ
وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ ۝ أَمْ لِلْإِنسَانِ مَا تَمَنَّىٰ ۝
فَلِلَّهِ الْآخِرَةُ وَالْأُولَىٰ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع پانچ کی آخری آیات سورۃ النجم)

تو کیا تم نے لات و عزیٰ اور تیسرے پچھلے مناۃ کو دیکھا ہے۔ کیا تمہارے لئے لڑکے اور اللہ
کے لئے لڑکیاں ہیں۔ یہ تو بہت بے ڈھنگی تقسیم ہے۔ یہ نرے نام ہی نام ہیں جو تم نے رکھ
لئے ہیں اور تمہارے باپ داداؤں نے۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نہیں اتاری یہ لوگ
تو صرف اٹکل اور اپنی نفسانی خواہشات پر چل رہے ہیں۔ اور یقیناً ان کے پروردگار کی طرف
سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔ کیا جس چیز کی انسان آرزو کرے وہ اسے مل جاتی ہے
آخرت اور دنیا تو صرف خدا کے اختیار میں ہے۔

تشریح و تفسیر:- "لات" "عزیٰ" اور "مناۃ"۔ یہ تینوں بتوں کے نام ہیں جن کی
مشرک عرب پرستش کیا کرتے تھے۔ "طائف" کے لوگ لات کی بہت تعظیم کرتے تھے۔
اوس، خزرج اور خزاعہ کے باشندے "مناۃ" بت کی بڑی عزت کرتے تھے اور
"عزیٰ" کو قریش اور قبیلہ کنانہ کے لوگ بڑا سمجھتے تھے عربوں کے نزدیک پہلا مرتبہ

عُزّیٰ" کو حاصل تھا جو مکّہ کے قریب مقام "نخلہ" میں تھا دوسرا "لات" کو جو طائف میں تھا اور سب کے بعد تیسرا درجہ "منٰوۃ" کو حاصل تھا جو مکّہ سے بہت دور مدینہ کے نزدیک واقع تھا " معجم البلدان" میں یاقوتِ رومی نے لکھا ہے کہ کفار ان بتوں کو خدا کی بیٹیاں کہا کرتے تھے۔ لیکن اکثر مفسّرین کہتے ہیں کہ یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ مشرک لوگ کہا کرتے تھے کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور یہ بت اُن فرشتوں کی ظاہری شکلیں ہیں جن میں وہ سمائے ہوئے ہیں۔ "ضِیزیٰ" "ضَیز" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ٹیڑھا پن، بے اعتدالی، ناانصافی، ضیزیٰ کے معنی ہیں وہ چیز یا وہ بات جس میں ناانصافی، عیب اور بے اعتدالی ہو۔

ان آیاتِ کریمہ میں صرف تین بتوں کا ذکر ہے اس لیئے کہ ان کی شہرت اور عزت بہت زیادہ تھی ورنہ مشرکین جن بتوں کی پرستش کرتے تھے اُن کی تعداد بہت تھی۔

پھر اللہ فرماتا ہے کہ تم خدا کی طرف بیٹیاں منسوب کرتے ہو اور اپنے لیئے بیٹے محض ایسا خیال سے کہ بیٹیوں کو تم اچھا نہیں جانتے اور بیٹوں کو اچھا سمجھتے ہو۔ یہ عجیب قسم کی باتیں ہیں اور بڑی بے ڈھنگی تقسیم کرتے ہو اور یہ محض تمہاری خام خیالی ہے ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ خدا کے نہ کوئی بیٹا ہے اور نہ کوئی بیٹی اور نہ وہ خود کسی دوسرے کی اولاد ہے یہ نسل اور اولاد کا سلسلہ تو مخلوقات میں ہوتا ہے خالق کی ذات ان باتوں سے پاک ہے مگر یہ مشرکوں کی پست ترین ذہنیت تھی کہ وہ ہر بُری چیز خدا کی ذات کی طرف منسوب کیا کرتے تھے اور ساری اچھی اچھی چیزیں اپنی طرف۔ ان آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ مشرکوں اور کافروں نے طرح طرح کے بت بنا رکھے تھے اور انہیں ملائکہ اور جنوں کا مظہر یا اُن کے رہنے کی جگہ سمجھتے تھے اور اُن کو اپنی زندگی و موت کا مالک جانتے تھے۔ انہوں نے اُن کی جگہوں پر بتکدے بنا رکھے تھے اور وہاں طواف کیا کرتے تھے اور قربانیاں چڑھاتے تھے بڑی بڑی جنگوں میں ان بتوں میں سے بعض کو اپنے ہمراہ بھی لیجاتے تھے اور اُن کے نام کے نعرے لگایا کرتے تھے اور ساتھ ساتھ کعبہ کی عزت و حرمت کے بھی قائل تھے۔

پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے یہ سارے بت اصحاب کرام رضوان

اللہ علیہم نے توڑ دیئے اور ان کی عظمت کو خاک میں ملا دیا اور یہ ظاہر کر دیا کہ ان پتھروں میں کوئی ایسی بزرگی موجود نہیں ہے جس کے سامنے اشرف المخلوقات۔ انسان۔ اپنا سر عبادت کے لیئے جھکا دے۔ یہ پتھر تو سب اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور انسان کے فائدے اور اس کی خدمت کے لیئے بنائے گئے ہیں نہ یہ خدا کا مظہر اور نہ یہ فرشتوں اور جنوں کے رہنے کی جگہیں ہیں اور نہ ان میں کوئی سمجھ ہے نہ حس ہے نہ اختیار اور قدرت ہے انسان خود ان کو کاٹتا ہے، سنوارتا ہے اور جہاں چاہتا ہے رکھ دیتا ہے۔ یہ انسان کی جہالت ہے کہ وہ ایسی بے حس اور بے بس مخلوق کے سامنے اپنا سر جھکا دے اور اُن کو خدائی کا مرتبہ دے جن سے ہر طرح وہ خود افضل ہے۔ اس موجودہ دنیا اور آنے والے جہان کا اصلی رب تو صرف اللہ ہے جو کائنات عالم کے ہر ذرہ کا مالک اور خالق ہے۔ یہ پتھر کی مورتیں اُس جبار، وقہار اور عظیم ذات سے کیا نسبت رکھتی ہیں جو عالمین کا پروردگار اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ زمین اُس کی ہے زمانہ اُس کا ہے، عرش اُس کا ہے ستارے بھی اُسی کے اختیار میں ہیں وہی لامحدود فضاؤں پر اقتدار رکھتا ہے۔ وہی تصورات سے اونچی بلندیوں سے بھی بلند ہے اس نے اپنی ساری کائنات میں انسان کو سب سے اشرف اور افضل بنایا اور اس کا اعلان فرما دیا کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب میں نے تیرے لیئے مسخر کر دیا ہے تو جو چاہے اُن سے کام لے وہ سب تیری اطاعت کریں گے۔ سورج بھی تیرے لیئے چاند بھی تیرے فائدے کے لیئے، زمین بھی اپنی کل صلاحیتوں کے ساتھ تیرے فائدے کے لیئے بنی ہے ۵

نہ تو زمیں کے لیئے ہے نہ آسماں کے لیئے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کے لیئے

مگر اس کے بعد بھی نا سمجھ انسان اللہ کی عظمت کو نہیں سمجھتا اور اُس کی ادنیٰ مخلوق کے سامنے اپنا سر جھکا دیتا ہے۔ وہ فرماتا ہے "لقد جاءھم من ربھم الھدیٰ" بے شک اُن کے رب کی طرف سے اُن کے لیئے ہدایت آ چکی ہے اور اللہ کی ذمہ داری ختم ہو چکی ہے اب اگر وہ اُس ہدایت پر عمل نہ کریں گے تو اس میں خود اُن ہی کا قصور ہوگا۔ سب کے آخر میں اللہ نے ہدایت کے لیئے اُس کامل ترین ہستی کو بھیجا جو تمام کائنات کی جان اور تمام عالمین سے افضل و اشرف تھا اور جس کے قدم شب معراج اُس جگہ پر آئے جہاں نہ کوئی بشر کبھی پہنچ سکا تھا اور نہ کوئی ملک اور جہاں فرشتہ وحی حضرت جبرئیل

علیہ السلام نے افضل کائنات سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا تھا کہ اب اس مقام سے آپ خود آگے بڑھ جائیں میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکوں گا اس لیئے کہ "لو دنوت انملۃ لاحترقت" یہ وہ مقام ہے جہاں کی شدت نور کا تحمل میں نہیں کر سکتا اور اگر ایک انگشت کے برابر بھی آگے بڑھوں گا تو اس نور کی تیزی سے جل جاؤں گا۔ یہ منزل حضور کے لیئے مخصوص ہے دوسری کوئی مخلوق نور کی ان تجلیوں کا تحمل کرنے پر قدرت نہیں رکھتی۔ زیر بحث آیات سے قبل جن آیات کریمہ کا ذکر ہوا تھا ان میں معراج کا صاف طور پر تذکرہ فرمایا گیا ہے اور جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا تھا معراجِ جسمانی حضور اکرم کا ایک عظیم معجزہ تھا جس سے تمام کائنات پر آپ کی افضلیت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی تعجب خیز معلوم ہوتی ہے کہ ایک بشری جسم پلک جھپکتے ہی افلاک کی بلندیوں میں جلا جائے اور عرشِ الٰہی تک جا کے پھر واپس آجائے اور کچھ دیر نہ لگے اس مسئلے کے دو پہلو ہیں ایک خالص مذہبی اور دوسرا فکری اور تجرباتی جہانتک مذہبی پہلو کا تعلق ہے وہ تو بالکل واضح ہے قرآن کریم میں اس کا صاف طور پر ذکر موجود ہے احادیث میں اس کا تفصیل کے ساتھ بیان ہے اور بقول علامہ زرقانی ۴۵ مشہور صحابیوں نے اس واقعہ کی روایت کی ہے جس کے بعد مذہبی حیثیت سے اس کے متعلق کسی قسم کا کوئی شک باقی ہی نہیں رہ سکتا۔ رہا فکری اور تجرباتی پہلو تو اس کے لیئے بس اتنا کہدینا کافی ہے کہ جس قادر مطلق اللہ نے بے جان ایٹمی ذروں میں اس قدر طاقت بخشی ہے کہ وہ چند سکنڈ میں ہزاروں میل خلا کی مسافت طے کر کے واپس آجائیں اور جبکہ ابھی تک زمین سے نکلے ہوئے ان ایٹمی ذروں کی تیزی رفتار کی آخری حد کا بھی کسی کو پتہ نہیں چلا ہے کہ یہ کہاں تک پہنچے گی تو کیا وہی قادر مطلق اللہ سردار مرسلین نور یزدانی اور اپنے حبیب خاص کو سرعتِ رفتار کا ایسا معجزہ نہیں دے سکتا تھا کہ دنیا قیامت تک اس کا مقابلہ نہ کر سکے کیونکہ اس نے ہر نبی کو ایسے ہی معجزات عطا فرمائے تھے جو بشری فکر اور مخلوقات کی کوشش کی رسائی سے اونچے ہوں اور جو یہ ثابت کر دیں کہ غیر خدا کی طاقت کہاں پر ختم ہو جاتی ہے اور خالق عالم کا وہ اقتدار کہاں سے شروع ہوتا ہے جس پر اس کی ذات کے سوا کوئی دوسرا قابو نہیں رکھتا۔

(۳۴) وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ○ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ○ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا ○ ۚ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ○ ؕ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ○

(پارہ ۲۷ رکوع ۶ کی ابتدائی آیات سورۂ النجم)

اور آسمانوں میں بہت سے فرشتے ہیں جن کی سفارش کچھ بھی کام نہیں آتی مگر خدا جس کے لئے چاہے اجازت دے اور پسند کرے جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے لیئے عورتوں کے سے نام رکھتے ہیں حالانکہ انھیں اس کا کوئی علم نہیں وہ لوگ تو بس گمان کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ گمان یقین کے مقابلہ میں کچھ بھی کام نہیں آتا تو جو ہماری یاد سے منہ موڑے اور صرف دنیاوی زندگی ہی کا طلبگار ہو تم بھی اُس سے منہ پھیر لو اُن کے علم کی یہی انتہا ہے۔ بیشک تیرا پروردگار اُس سے خوب واقف ہے جو اُس کی راہ سے بھٹک گیا ہے۔ اور جس نے ہدایت حاصل کی ہے اُس سے بھی خوب واقف ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ ان آیاتِ کریمہ سے پہلے اس کا اعلان فرمایا گیا تھا کہ دنیا و آخرت کا مالکِ حقیقی صرف اللہ ہے۔ انسان یا کسی دوسری مخلوق کی کیا مجال ہے کہ وہ اُس کے اقتدار اور حکومت میں مداخلت کر سکے۔ اصل میں مشرکین اس کا اعتقاد رکھتے تھے کہ یہ بت خدا کی بارگاہ میں ہماری سفارش کریں گے اور ہمیں بخشوائیں گے۔ اس کی طرف اشارہ ہے کہ یہ پتھر کے بت کیا حقیقت۔ کہتے ہیں جبکہ کسی بڑے سے بڑے فرشتہ کی یہ جرأت نہیں کہ وہ خدا سے کسی کی سفارش کر سکے جبتک اُسے اس کی خدا کی طرف سے اجازت نہ ملے اور وہ اس سفارش سے راضی بھی ہو تو پھر ان بتوں کی کیا حیثیت ہے جن میں نہ کوئی شعور ہے نہ کوئی کمال پایا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس عقیدے کے کفر ہونے کا بھی اعلان

فرما دیا گیا۔ اِن الفاظ کے ساتھ کہ جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کو خدا کی بیٹیوں کے نام سے پکارتے ہیں اس کا صریحی مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ فرشتوں کو خدا کی اولاد کہتے ہیں وہ وہی ہیں جن کا آخرت پر ایمان نہیں ہے اور یہی کفر ہے۔ ظاہر ہے کہ فرشتوں کی نسبت یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں یا ان کو بغیر اذن خدا شفاعت اور سفارش کرنے کا حق ہے کفر ہے تو پھر بتوں کو یہ مرتبہ دینا اور انھیں اقتدار خداوندی میں شریک سمجھنا بدرجۂ اولیٰ کفر و شرک ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ فرشتوں کے متعلق اس طرح یہ سب کچھ بے اصل تخیلات ہیں جن کی یقین اور حق کے مقابلہ میں کوئی بھی وقعت نہیں ہے یہ تمام اعتقادات صرف اس لیے ہیں کہ ان لوگوں کو آخرت کا یقین نہیں اور یہ سزا کی طرف سے بے فکر ہو کر اس قسم کی گستاخیاں کرتے ہیں بھلا فرشتوں کو مرد اور عورت ہونے سے کیا واسطہ اور خدا کے لیئے اولاد کیسی۔ یہ اٹکل کی باتیں یہ وہم و گمان ثابت حقیقتوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ اُن کا اوڑھنا بچھونا یہی دنیا کی چند روزہ زندگی ہو اور ہر وقت وہ اسی میں پڑے رہیں اور آخرت کا خیال تک اُن کے دل میں نہ آئے اور خدا کو بھولے ہوئے ہوں تم بھی ان سے اپنا رخ پھیر لو۔ وہ خدا اور آخرت سے منہ موڑتے ہیں تم ان کی طرف سے اپنا منہ موڑ لو اور اُن کی پروانہ کرو۔ ایسے لوگوں کی فکر کرنا بیکار ہے جنکی عقلوں پر پتھر پڑے ہوئے ہیں اور اُن کے تخیلات کی دوڑ تو بس اسی دنیا کے فوری نفع نقصان ہی تک ہے اس سے آگے کا اُن کے ذہن میں کوئی تصور نہیں ہوتا کہ اس زندگی کے بعد اور اس دنیا کے بعد بھی کوئی اور زندگی ہے۔ وہ نہیں سمجھتے کہ مرنے کے بعد مالک حقیقی کے سامنے ذرہ ذرہ کا حساب دینا ہوگا، اُن کی تمام تر کوششیں بس جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھرنے اور نفسانی خواہشوں کو پورا کر لینے تک محدود رہتی ہیں اس لیئے ایسے لوگوں کی اللہ کے نزدیک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے لہٰذا

پیغمبر اکرم کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ بھی ایسے لوگوں سے اپنا رخ پھیر لیں اور اُن کی کوئی پروانہ کریں۔ یہاں پر غور و فکر کا ایک خاص رخ یہ بھی ہے کہ "اعراض" یعنی رخ پھیرنے کا حکم صرف اُن ہی لوگوں کے لیئے دیا گیا ہے جو خدا کی یاد سے غافل ہیں۔ آخرت کو بھولے

ہوئے ہیں اور اپنی تمام تر توجہ اور کوشش اور ساری قوت عمل صرف دنیاوی زندگی میں لگائے ہوئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اسلام کے نزدیک دنیاوی زندگی کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ جو شخص دنیا کو آخرت کے لیئے چھوڑ دے یا آخرت کو دنیا کے لیئے ترک کر دے وہ ہم میں سے نہیں ہے ایک دوسری حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے جو یہاں بو یا جائے گا وہ آخرت میں ملے گا۔ اصل میں روگردانی کرنے کا حکم صرف اُن ہی لوگوں سے متعلق ہے جو آخرت کو دنیا کے لیے ترک کر دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ انھیں اس دنیا کے بعد کسی دوسری جگہ جانا نہیں ہے اور نہ یہاں کے اعمال و افعال کی کبھی کہیں پوچھ کچھ ہوگی اور صبح سے شام تک جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھرنے اور مادی لذتوں کی تحصیل میں ساری عمر گنوا دیتے ہیں انھیں اس کا علم نہیں کہ انسان کا اصلی مقام کیا ہے اور اس کے فرائض میں کیا کیا باتیں داخل ہیں اُن کے نزدیک اچھی اچھی غذائیں کھانا بہتر سے بہتر لباس پہننا اور جنسی خواہشات کی تکمیل کر لینا اور اپنے دنیاوی مقصد کو کسی نہ کسی طرح حاصل کر لینا ہی انسانی حیات کا کمال ہے اور یہ جو کچھ ہے سب اسی دنیا میں ہے اور جب ان کے ذہن میں کسی ایسے جہان کا تصور ہی نہیں ہے جہاں یہاں کے اعمال و افعال کا جائزہ لیا جائے گا اور انھیں اس کی خبر بھی نہیں کہ وہ کسی قہار و جبار کی سخت نگرانی میں ہیں جو اُن کی تمام حرکتوں اور تمام باتوں سے پوری واقفیت رکھتا ہے اور اُس کے علم سے ہمارے دلوں کے بھید اور دماغ کے تصورات بھی چھپے نہیں رہتے اور وہ ہر باطن اور ہر ظاہر کو جانتا ہے ایسا انسان جو اس حقیقت سے غافل ہو اس کا یقیناً آخرت پر ایمان نہ ہوگا وہ اللہ کے اقتدار سے بے خبر ہوگا اور جو چاہے گا کہے گا اور جو مرضی ہوگی وہ کرے گا اس بنا پر ایسے بے شعور لوگ بس اسی قابل ہیں کہ اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑ دیا جائے کیونکہ حق پوری طرح واضح کر دیا گیا ہے ہدایتیں آچکی ہیں۔ آسمانی کتابوں نے خدائی پیغام پہنچانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی اور پیغمبروں نے تبلیغ دین حق کے تمام فرائض کو پورا کر دیا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی خدا کو نہ پہچانے اور دنیا کی چند روزہ زندگی ہی کو سب کچھ سمجھے تو اس میں صرف اسی کا قصور ہوگا اور وہ اسی قابل ہوگا کہ اُس سے اللہ اپنے رسول کریم کو رخ پھیر لینے کا حکم دے اور یہ پوری

طرح ظاہر ہے کہ جس سے رسول منہ پھیر لیگا اُس کا ٹھکانا سوائے جہنم کے اور کہیں نہ ہوگا اور اس کی دنیا و آخرت دونوں ہی برباد ہوں گی "فاعرض عن من تولیٰ عن ذکرنا ولم یُرِد الا الحیوۃ الدنیا" اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے اب اس بات میں کوئی غلط فہمی نہیں رہ سکتی کہ اسلام کے نزدیک قابل مذمت صرف وہی لوگ ہوتے ہیں جو صرف دنیا کے ہو رہیں اور خدا و آخرت کو بھول جائیں۔ دنیا و آخرت سے کیا مراد ہے اور کونسی دنیا قابل تعریف ہے اور کس قسم کی دنیا لائق مذمت ہے اور آخرت کا دنیا سے کیا اور کس قسم کی دنیا سے لگاؤ ہے اس کے متعلق احادیث و قرآن کریم میں کثرت کے ساتھ تعلیمات موجود ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا خود بری نہیں ہے بلکہ دنیا کی وہ محبت قابل مذمت اور لگاؤ برا ہے جس سے آدمی خدا اور روز آخرت کو بھول جائے اور دنیا کو بس صرف دنیا ہی کے لیئے حاصل کرنے کی کوشش کرے امیر المؤمنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: "من ابصر بها بصرته و من ابصر الیها اعمته" جس شخص نے دنیا کے وسیلہ سے اصلی بصیرت اور سچی حقیقت کو دیکھنے کی کوشش کی تو یہی دنیا اُس کے لیئے اُس اصلی منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ بن جائے گی اور اس کی بصیرت بڑھ جائیگی اور کائنات کے سارے بھید اس کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے اور ظاہر ہو جائیں گے اور اگر اُس نے صرف دنیا ہی کو دیکھنا چاہا اور اسے اصلی حقیقتوں کے سمجھنے کا ذریعہ نہ بنایا تو یہی دنیا اُس کی بصیرت کو تیز کرنے اور اُس میں بے پناہ طاقت و قوت پیدا کرنے کے بجائے اس کی باطنی آنکھوں کو اندھا کر دے گی۔ ایک دوسری حدیث میں آپ فرماتے ہیں کہ زہد اور پرہیزگاری ایمان اور ہر نیکی کی کنجی ہے مگر اس زہد کی تحصیل کے دو پہلو ہیں "لو انّ رجلاً اخذ جمیع ما فی الارض و اراد به وجه الله فهو زاهد ولو انه ترک الجمیع ولم یُرِد وجه الله فلیس بزاهد"۔ اگر کسی شخص کو اس پوری زمین کی ہر چیز مل جائے اور وہ تمام دنیا کا مالک ہو جائے مگر خدا کو نہ بھولے اور اس کی مرضی کے خلاف کوئی بات نہ کرے تو وہ زاہد ہے اور اُس کے پاک دل میں ایمان کا خزانہ ہے اور اگر ساری دنیا چھوڑ کر بھی خدا کو یاد نہ کرے اور اسے بھول جائے تو وہ تارک الدنیا زاہد نہیں بلکہ کافر ہے اور ایمان سے اُس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ

مومن کی دنیا بھی اُس کی آخرت ہی کا ایک ضروری حصّہ ہے جس کو ترک کر دینا گویا آخرت کو ترک کر دینا ہے اور قابل نفرت صرف وہ دنیا ہے جو اقتدار خداوندی کے خیال کو دل سے نکال دے اور حق و دیانت کی قدروں کو بے حقیقت بنا دے۔

(درس ۱۳۵) وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ لِيَجْزِيَ الَّذِينَ أَسَاءُوا بِمَا عَمِلُوا وَيَجْزِيَ الَّذِينَ أَحْسَنُوا بِالْحُسْنَى ۝ الَّذِينَ يَجْتَنِبُونَ كَبَائِرَ الْإِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ إِلَّا اللَّمَمَ إِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ هُوَ أَعْلَمُ بِكُمْ إِذْ أَنْشَأَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَإِذْ أَنْتُمْ أَجِنَّةٌ فِي بُطُونِ أُمَّهَاتِكُمْ فَلَا تُزَكُّوا أَنْفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَى ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۶ کی آخری آیات سورۃ النجم)

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے وہ سب اللہ ہی کا ہے تاکہ وہ بُرے عمل کرنے والوں کو سزا دے اور اچھے کام کرنے والوں کو اُن کی نیکی کا بدلہ دے وہ لوگ ایسے ہیں کہ معمولی لغزشوں کے سوا کبیرہ گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے بچتے ہیں بے شک تمہارے پروردگار کی مغفرت بہت وسیع ہے۔ وہ تم کو خوب جانتا ہے۔ جب اُس نے تمہیں زمین سے پیدا کیا تھا اور جب تم اپنی ماؤں کے پیٹ میں بچّے تھے تو پھر تم اپنے نفسوں کی پاکیزگی نہ جتایا کرو جو شخص پرہیزگار ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ "لَمَم" اس کے معنی کی تفصیل مختلف صورتوں سے کی گئی ہے لیکن اکثر مفسرین کے نزدیک "لَمَم" سے مراد گناہان صغیرہ اور معمولی لغزشیں ہیں "اَجِنَّۃ"۔ "جَنِین" کی جمع ہے جس کے معنی ہیں اُس بچّہ کے جو ماں کے پیٹ میں ہو کچھ لوگ غلطی سے "اجنّہ" جنّات کے لئے بولتے ہیں اور اس لفظ کو "جِنّ" کی جمع سمجھتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ جنّات جس مخلوق کا نام ہے اس کے لئے صحیح لفظ "جِنَّۃ" ہے جس کا واحد جنّی آتا ہے جیسا کہ قرآن کریم کے سورۃ "النّاس" میں ارشاد ہوا ہے "من الجنّة والنّاس"۔ ان آیات کی ابتدا میں اللہ نے اپنی قدرت کی وسعت اور اپنے

عظیم اقتدار کو بیان فرمایا ہے کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب صرف اللہ کا ہے اور وہی ہر چیز کا حقیقی مالک ہے اُس کے اس اقتدار اور حکومت واختیار میں کوئی دوسرا اُس کا شریک نہیں ہے اس لئے اُس کی مخلوق میں سے جو بھی اُس کے حکم کے خلاف کریگا اور اُس سے بُرے اعمال ظاہر ہوں گے تو ان کی سزا پانے سے کوئی قوت اللہ کے مقابلہ میں اس کو بچا نہ سکے گی کیونکہ الٰہی جلال وعظمت کے سامنے کسی کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کسی کی کیا مجال کہ وہ اللہ کی عطا کو روک دے یا اس کی سزا سے کسی کو بچا سکے کیونکہ کائنات کی ہر چیز اسی کے اختیار وقدرت میں ہے۔ اس اقتدار کا نتیجہ یہ ہے کہ بدی کرنے والے چاہے جتنے ہی صاحب قوت وطاقت ہوں اس کے قبضے سے نہیں نکل سکتے اور وہ اُن کے بُرے اعمال کی پوری پوری سزا دیگا اور اسی طرح نیک عمل کرنے والے لوگ بھی اُس کی بارگاہ سے انعام واکرام پائیں گے۔ اور یہ سب اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے کہ جب اللہ اپنے بندوں کے بُرے اور اچھے تمام افعال واعمال سے باخبر ہو اور ہر بات کو جانتا ہو اس لئے کہ اگر اس کے علم سے بُرے اور اچھے کام چھپے رہیں گے تو وہ سزا یا جزا کس طرح دے گا اس بنا پر یہ ضروری ہے کہ اللہ بندوں کے ہر عمل سے باخبر ہو چاہے وہ چھپ کے کریں اور چاہے ظاہر بظاہر کریں لیکن وہ سمیع وبصیر خدا ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور ہر بات سے واقف ہے اس نے قرآن کریم میں اس کا اعلان فرمایا ہے "یعلم خائنۃ الاعین وما تخفی الصدور" (پارہ ۲۴ رکوع ۷ سورۃ المومن) وہ آنکھوں کی چوری بھی جانتا ہے اور دلوں کے بھیدوں سے بھی واقف ہے جو اُن کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ پھر دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے: "ولقد خلقنا الانسان ونعلم ما توسوس بہ نفسہ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید" بیشک ہم نے انسان کو بنایا ہے اور جو خیالات اس کے دل میں گذرتے ہیں ہم اُن سب کو جانتے ہیں اور ہم تو اس سے اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں "اذ یتلقی المتلقیان عن الیمین وعن الشمال قعید ○ ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید" جب کوئی شخص کوئی کام کرتا ہے تو دو فرشتے جو اُس کے داہنے بائیں بیٹھے ہیں لکھتے رہتے ہیں اور کوئی بات اُس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگرانی کرنے والا اُس کے پاس تیار رہتا ہے۔

بیشک اللہ کے علم کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں زمین وآسمان کی کوئی چیز اس کے

علم سے چھپی ہوئی نہیں ہے "وعندہٗ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو و یعلم ما فی البر والبحر و ما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ولا حبۃ فی ظلمٰت الارض ولا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین" (پارہ ۷، رکوع ۱۳) اُس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو اُسکے سوا کوئی دوسرا نہیں جانتا اور جو کچھ دریاؤں میں ہے اور جو کچھ خشکی میں ہے اسکو بھی وہی جانتا ہے اور درخت کا کوئی پتّا تک نہیں گرتا مگر اللہ اس کو بھی جانتا ہے، زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں ہے اور نہ کوئی ہری اور سوکھی چیز ہے جسے وہ قادرِ مطلق اللہ جانتا نہ ہو اور وہ اس کی نورانی کتاب "لوحِ محفوظ" میں موجود نہ ہو۔ وہ ہمارے ہر عمل سے واقف ہے۔ ہر قول سے باخبر ہے۔ ہر حرکت کو جانتا ہے۔ ہر سکون کو پہچانتا ہے۔ نگاہوں کے رخ کو جانتا ہے دلوں کے راز کی خبر رکھتا ہے جب ہی تو اُس نے اس کا اعلان بھی کیا کہ وہ اعمال کی جزا و سزا دے گا اور یہ اعلان بلا قید و شرط ہے نہ اس میں جگہ کی شرط ہے نہ وقت کی شرط ہے۔ جب بھی کوئی بُرا کام کرے گا اور جو شخص بھی کرے گا خواہ کسی حیثیت کا انسان ہو فقیر ہو یا امیر ہو محکوم ہو یا تختِ سلطنت پر ہو۔ وہ الٰہی سزا سے بچ نہیں سکتا وہ مالک الملوک اور سلطان السلاطین جسکے قبضۂ قدرت میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہے اُس بدکار ان کا جائزہ لے کر جو کچھ عدل و انصاف کے مطابق ہوگا اُس کا اُس کو بدلہ دے گا۔ اور خدائے جبّار و قہّار کے عذاب سے کوئی طاقت اُسے بچا نہ سکے گی۔ اسی طرح نیک عمل کرنے والوں کو بھی وہ نعمتیں عطا فرمائے گا اور ان کے عمل کی بہترین جزا دے گا۔ اُس کی بارگاہ میں ایک ایک عمل اور ایک ایک چیز کا حساب ہوگا نہ تو اُس کے محاسبہ سے کوئی بچے گا اور نہ اس کے انصاف اور عدل و کرم سے کوئی کبھی محروم رہے گا: "فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہٗ ۝ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہٗ" جس شخص نے ذرّہ برابر بھی نیکی کی وہ اس کا نتیجہ ضرور دیکھے گا اور اسی طرح جسنے ذرّہ برابر بدی کی وہ بھی اس برائی کا نتیجہ پائے گا مگر اسی کے ساتھ یہ اس کا کرم ہے کہ وہ "الا اللمم" کہہ کر اس کا بھی اعلان فرما رہا ہے کہ میں اپنے بندوں کی معمولی لغزشوں پر احتساب نہیں کروں گا اور اُنہیں اُن لغزشوں کی سزا نہ دوں گا ان معمولی لغزشوں اور گناہانِ صغیرہ سے مراد یہ ہے کہ اتفاق سے بغیر کسی سرکشی کے جذبہ کے کوئی معمولی سی خطا اور لغزش کسی سے ہو جائے بشرطیکہ اس خطا کی تکرار نہ ہو

اور اُس لغزش پر ندامت اور افسوس بھی ہو کیونکہ اگر اُس اتفاقی معمولی سی غلطی پر ندامت نہیں ہے اور بار بار اُس غلطی کو دہرایا جائے گا تو معمولی سی لغزش ایک بڑا گناہ بن جائے گی اور قابل سزا ہوگی آخر میں "ھو اعلم بمن اتقیٰ" کہکر اللہ نے تقوے کی اہمیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

انسان کی نگاہ میں بڑائی اور بلندی کا معیار دولت واقتدار اور مادی قوت و طاقت ہے مگر اللہ کی بارگاہ میں بڑائی کی بنیاد صرف تقوے پر ہی ہوتی ہے اُس کے سامنے شاہ و گدا سب برابر ہیں اور ان میں اگر کوئی فرق ہے تو صرف پرہیزگاری اور تقوے کے معیار پر اور اس تقوے کا سب سے بڑا تعلق دل اور ضمیر کی گہرائیوں سے ہوتا ہے اور اس حقیقت کا سب سے بڑا جاننے والا اگر کوئی ہے تو صرف اللہ ہے "ھو اعلم بمن اتقیٰ" وہی صاحبان تقویٰ کو خوب جانتا ہے اور اُس کی بارگاہ میں اُن ہی لوگوں کی زیادہ عزت ہے جن کے دلوں میں اللہ کا خوف اور اُس کی فرمانبرداری کا جذبہ سب سے زیادہ پایا جاتا ہے۔

(آیت ۱۳۶)

أَفَرَءَيْتَ الَّذِي تَوَلَّىٰ ۝ وَأَعْطَىٰ قَلِيلًا وَأَكْدَىٰ ۝ أَعِندَهُ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرَىٰ ۝ أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَٰهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۝ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۝ ثُمَّ يُجْزَىٰهُ الْجَزَآءَ الْأَوْفَىٰ ۝ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۷ کی ابتدائی آیات سورۃ النجم)

بھلا تم نے ایسے شخص کو بھی دیکھا جس نے منہ موڑ لیا اور تھوڑا سا مال دیا اور بند کر دیا۔ کیا اُس کے پاس علم غیب ہے کہ وہ دیکھ رہا ہے کیا اُس کو اُس بات کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور (اُن) ابراہیم کے صحیفوں میں جو احکام خداوندی کو پوری طرح بجالائے یہ کہ کوئی شخص دوسرے (کے گناہ) کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا اور یہ کہ انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اُس کی کوشش عنقریب ہی دیکھی جائے گی پھر اُس کو اُس کا بدلہ دیا جائیگا اور یہ کہ تمہارے پروردگار تک سب کو پہنچنا ہے۔

تشریح و تفسیر:- ان آیات کریمہ میں "تولّٰی" صیغۂ ماضی استعمال ہوا ہے جس کا مصدر "تولّی" ہے۔ طریقۂ استعمال کے لحاظ سے اس کے معنی کبھی "دوست بنانے" کے آتے ہیں اور کبھی روگردانی کرنے اور منہ پھیرنے کے یہاں پر دوسرے معنی مراد ہیں "اکدیٰ" "کدیٰ" سے بنا ہے یہاں پر اس کے معنی ہیں منع کرنا، روکنا یا کنجوسی کرنا عرب "اکدیٰ" صیغۂ ماضی اور دوسرے صیغے اسی مصدر سے اُس وقت بولتے ہیں جب کسی رکاوٹ کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً کچھ لوگ کنواں کھود رہے ہوں پھر بیچ میں کوئی چٹان آجائے اور وہ کام چھوڑ بیٹھیں اُس وقت وہ کہتے ہیں "اکدینا" ہم نے اب اس کام سے منہ موڑ لیا ہے۔

اللہ ان لوگوں کی مذمت فرماتا ہے جو اس کی اطاعت سے اپنا منہ موڑ لیں، اُس کی نافرمانی کریں، اُس کے پیغمبروں کی لائی ہوئی ہدایتوں پر عمل نہ کریں اور انھیں جھٹلائیں اس آیۂ مبارکہ میں لفظ "تولّی" کا مفہوم یعنی اعراض کرنا، روگردانی کرنا اور منہ موڑ لینا شامل ہے ان تمام باتوں کو جن سے اللہ کی نافرمانی ظاہر ہوتی ہو اور اس کی فرماں برداری کے خلاف کسی عمل کا ثبوت ملتا ہو۔ اس لیئے خدائے قدوس و عظیم کی بارگاہ میں وہ لوگ قابل نفرت و مذمت ہیں جو اُس کی اطاعت و فرماں برداری سے روگردانی کریں خواہ وہ کسی طرح سے بھی ہو اور کسی صورت سے بھی کی جائے کیونکہ لفظ "تولّی" کے وسیع معنی میں ہر وہ بات شامل ہے جو حق سے منہ موڑنے اور حکم الٰہی کی مخالفت کرنے کو ظاہر کرتی ہو۔ اس کے ساتھ ہی اللہ ان لوگوں کی مذمت فرماتا ہے جو اس کی راہ میں اپنے مال کو اس خوف سے صرف نہیں کرتے کہ کہیں ایسا نہ ہو ان کی دولت ختم ہو جائے اور وہ خالی ہاتھ رہ جائیں اور فقیر ہو جائیں اس لیئے ارشاد ہوتا ہے کہ ایسے شخص کے پاس کیا غیب کا علم ہے جس سے اس کو یہ معلوم ہو گیا ہو کہ اگر میں خدا کی راہ میں اپنی دولت خرچ کروں گا تو یہ ختم ہو جائے گی اور پھر مجھ کو کہیں سے نہ حاصل ہو سکے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگ جو نیکیوں، بھلائیوں اور خدا کی راہ میں اموال کو خرچ کرنے سے رکتے ہیں اُن کے پاس یقیناً اس کا علم غیب نہیں ہے کہ اس خرچہ کی وجہ سے وہ فقیر بن جائیں گے اور پھر ان کی کہیں سے آمدنی نہ ہو گی بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس کا سبب اُن کی خود غرضی، لالچ، کنجوسی اور ایمان کی کمزوری ہے اور وہ یہ نہیں جانتے

کہ یہ ساری دولت جس قادرِ مطلق اللہ نے اُن کو عطا فرمائی ہے وہ اس سے ہزار گنا زیادہ مال و دولت دے سکتا ہے اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا کی راہ میں دل کھول کر خرچ کرو اور اس سے خوف نہ کرو کہ تم فقیر بن جاؤ گے اور اللہ تم کو اپنی عطا سے محروم کردے گا خود قرآن کریم میں ہے "وَمَآ اَنفَقتم مِّن شیءٍ فھو یُخلِفُہٗ وھو خیر الرّازقین" (السبا) تم جو کچھ بھی خدا کی راہ میں خرچ کرو گے وہ اُس کا تم کو عوض عطا فرمائے گا اور وہی بہترین روزی دینے والا ہے۔

"وفّٰی" کے معنی ایک تو یہ کئے گئے ہیں کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کو اللہ نے جو احکام دیئے تھے وہ سب انہوں نے دوسروں تک پہنچا دیئے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ اُن کو خود جو بھی حکم ملا اُس کو وہ بجالائے اور یہ دونوں ہی معنی درست و صحیح ہیں حضرت خلیل اللہ علیہ السّلام نے تبلیغ حق میں کوئی کسر نہیں چھوڑی اور اطاعت خدا میں بھی کوئی کمی نہ کی اور پوری وفاداری کے ساتھ مشیت خداوندی کے مطابق اپنے فرائض کو انجام دیا۔ اس مقام پر اُن باتوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت ابراھیم علیہما السّلام کے صحیفوں میں لکھی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے ایک بات تو یہ تھی کہ ایک شخص کا گناہ دوسرے سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس کی سزا صرف اسی کو ملے گی جو اُس گناہ کا ارتکاب کرے گا۔

اس "وِزر" یعنی وبال سے مراد اخروی سزا ہے۔ سورۂ فاطر میں ارشاد ہوا ہے "وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزرَ اُخرٰی ط وَاِن تَدعُ مُثقَلَۃٌ اِلٰی حِملِھَا لَا یُحمَل مِنہُ شَیءٌ وَّلَو کَانَ ذَا قُربٰی"۔ (فاطر) (قیامت میں) کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی اپنے گناہوں کے بھاری بوجھ والا کسی کو اپنا بوجھ اٹھانے کے لئے بلائے گا تو اُس کے اس بوجھ سے کچھ بھی اٹھایا نہ جائے گا اگرچہ کوئی کسی کا رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو" اس طرح جو اس دنیا میں کفر اختیار کرے گا اور دین حق سے روگردانی کریگا اس کی سزا کا استحقاق بھی قیامت میں پیش خدا اُسی گناہ گار کو ہوگا۔ وہاں تو نفسی نفسی کی آواز ہوگی، ہر ایک کے اعمال اچھے ہوں یا بُرے اس کے ساتھ ہوں گے اور جو کچھ اس دنیا میں اُس نے کیا تھا اس کا اسے انعام دیا جائے گا یا اس کی سزا ملے گی۔ نہ وہاں رشوت کام دے گی نہ بغیر اذنِ خدا کسی کی سفارش سے فائدہ ہوگا نہ رشتہ دار کام آئیں گے

اور نہ دنیاوی اقتدار و عزت کا وہاں کوئی ذکر ہوگا۔ وہاں تو صرف عمل کرنے والا ہوگا اور اُس کے اعمال ہوں گے۔ اور جزا و سزا دینے والا وہ ہوگا جو ہمارے ہر ظاہر و باطن کو جاننے والا ہے اور ہماری کوئی بات اُس کے علم سے چھپی ہوئی نہیں ہے، ہم اپنے منہ سے اقرار کریں یا انکار، وہ خود ہی ہر بات کو جانتا ہے۔

دنیا اور آخرت کے عذابوں میں فرق ہے۔ آخرت کا عذاب اُن ہی لوگوں پر ہوگا جو اصلی گناہگار ہوں گے لیکن دنیا میں کچھ ایسے بھی گناہ ہوتے ہیں جن کے نتیجے کی لپیٹ میں گناہ کرنے والوں کے ساتھ وہ لوگ بھی آجاتے ہیں جو خود اُس گناہ کا ارتکاب نہیں کرتے سورہٴ انفال میں ہے: وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنكُمْ خَاصَّةً اُس فساد اور وبال سے بچو جس کا اثر گناہ کرنے والے کی ذات سے آگے بڑھ کر دوسروں تک بھی پہنچتا ہے اور وہ بھی اُس گناہ کے وبال کی لپیٹ میں آجاتے ہیں جیسے کشتی میں کوئی ایک شخص سوراخ کر دے تو صرف وہی نہیں ڈوبے گا بلکہ وہ سب ڈوبیں گے جو اس کشتی پر سوار ہیں حالانکہ وہ اس غلطی میں شریک نہ تھے۔ میدانِ جنگ سے بھاگنے والے پورے ملک اور پوری قوم کی تباہی کا سبب بنتے ہیں اور وہ لوگ بھی اس تباہی کا شکار ہو جاتے ہیں جو اس عمل میں شریک نہ تھے اسی طرح صرف ایک فرد یا چند محدود افراد کی وجہ سے سارے معاشرے میں وبائیں پھیل سکتی ہیں، قحط آسکتا ہے، قتلِ عام ہو سکتا ہے اور ان بلاؤں میں وہ لوگ بھی مبتلا ہو جاتے ہیں جن کا دور کا بھی تعلق اُس گناہ سے نہیں ہوتا۔ یہ دنیاوی عذاب اور یہاں کے بُرے نتائج دو طرح کے ہوتے ہیں ایک تو وہ فطری اثرات جو کسی بُرے عمل سے پیدا ہو سکتے ہوں جیسے گندگی پھیلانے سے وباؤں کا پھوٹ نکلنا یا اشتعال پھیلانے سے اور ایک کو دوسرے کے خلاف ابھارنے سے آپس کی پھوٹ اور جھگڑے، فسادات اور قتل و غارت کی شکل میں اس کے نتیجہ کا ظاہر ہونا اس کے علاوہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہزاروں ایسی مثالیں موجود ہیں جہاں ایک فرد کے گناہ اور غلطی کے نتائج نہ صرف ایک معاشرے کو بلکہ بعض وقت پوری دنیا اور پوری انسانیت کو بھگتنا پڑتے ہیں اور دوسری چیز ہے اس دنیا میں عذابِ خداوندی کا آنا جو بعض اوقات اپنی لپیٹ میں اُن لوگوں کو بھی لے لیتا ہے جو خود گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے مگر گناہگاروں کی صف میں شامل رہتے ہیں۔

پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے : جب ایسے لوگ جو خود تو گنہگار نہیں ہیں برائیوں کو لوگوں میں پھیلا ہوا دیکھتے ہیں اور اُن کو روکنے پر قدرت بھی رکھتے ہیں مگر پھر بھی اُن برائیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کرتے تو پھر عمومی عذاب آجاتا ہے اور اس میں خاص و عام سب گرفتارِ بلا ہو جاتے ہیں۔ علامہ ابن کثیرؒ نے اُم المومنین حضرت ام سلمہؓ سے یہ روایت نقل کی ہے۔ وہ فرماتی ہیں: پیغمبرِ اکرمؐ نے ارشاد کیا جب میری امت میں گناہ عام ہو جائیں گے تو اللہ اپنے قہر و عذاب کو بھی عام کر دے گا آپ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہؐ ان میں نیک لوگ بھی تو شامل ہوں گے تو آپ نے فرمایا ہاں وہ بھی عذاب کے اثرات میں مبتلا ہوں گے اور بچ نہ سکیں گے لیکن مرنے پر اللہ کی مغفرت انھیں حاصل رہے گی۔

(درس ۱۴۷)

أَمْ لَمْ يُنَبَّأْ بِمَا فِي صُحُفِ مُوسَىٰ ۝ وَإِبْرَاهِيمَ الَّذِي وَفَّىٰ ۝ أَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ ۝ وَأَن لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ۝ وَأَنَّ سَعْيَهُ سَوْفَ يُرَىٰ ۝ ثُمَّ يُجْزَاهُ الْجَزَاءَ الْأَوْفَىٰ ۝ وَأَنَّ إِلَىٰ رَبِّكَ الْمُنتَهَىٰ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۷ کی ابتدائی آیات سورۃ النجم)

کیا اس کو اس بات کی خبر نہیں دی گئی جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہے اور اُن ابراہیم کے صحیفوں میں جو احکام خداوندی کو پوری طرح بجالائے (وہ بات یہ ہے) کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور یہ کہ اُس کی کوشش عنقریب ہی دیکھی جائے گی پھر اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ تمہارے پروردگار ہی طرف سب کو پہنچنا ہے۔

تشریح و تفسیر:- گذشتہ درس میں ان آیاتِ کریمہ کی جو وضاحت کی گئی تھی اس کا باقی حصہ بیان کیا جاتا ہے تاکہ غور و فکر کے مختلف گوشے جو ان الفاظِ قرآنی سے پیدا ہو سکتے ہیں وہ ہماری نظروں کے سامنے آجائیں۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں جن باتوں کا ذکر تھا ان میں سے پہلی بات جسے قرآن کریم نے بیان کیا ہے یہ تھی کہ ایک شخص کے گناہ کا بوجھ دوسرا شخص نہیں اٹھائے گا۔ گذشتہ درس میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ یہ بات

اُسی وقت تک ہے جب تک وہ دوسرا اس پہلے شخص کے گناہ میں کسی طرح کی شرکت اعانت یا رضامندی اور کسی بھی صورت سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو لیکن اگر وہ دوسرا شخص بھی اس گناہ پر راضی ہے اور شریک ہے یا اس گناہ کے وجود میں آنے کا کسی حیثیت سے بھی سبب بن گیا ہے تو یقیناً اس کے نتیجے اور اس کی سزا میں بھی شریک رہے گا مثلاً ایک شخص نے چوری خود تو نہیں کی لیکن چور کو چوری کرنے کے طریقے سکھائے، راستہ بتایا، اُس کو چھڑانے کے لیئے گواہی دی یا کسی اور طرح سے اُس چور کی اس گناہ میں مدد کی تو وہ دوسرا شخص بھی اسی طرح مجرم سمجھا جائے گا قرآن کریم کا صاف اعلان موجود ہے: "وتعاونوا علی البرّ والتقوٰی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان" (المائدہ) نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ و ظلم و زیادتی میں باہم ایک دوسرے کی مدد نہ کرنا۔ اس لیئے ایسے لوگ جو مجرموں کی مدد کریں خواہ وہ کسی صورت سے بھی ہو انکا یہ فعل اُسی طرح جرم ہے جس طرح خود پہلے شخص کا فعل جرم تھا اور جس جرم کی سزا کا وہ مستحق تھا اسی طرح یہ دوسرا اُس کا شریک بھی سزا پانے کا استحقاق رکھتا ہے۔ تو اب آیۂ کریمہ کا مفہوم یہ ہوگا کہ ایک وہ شخص جس کا دوسرے کے گناہ سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے وہ اس گناہ کے نتیجے اور سزا سے بالکل بے تعلق ہے اور جو شخص گناہ کرے گا وہی خود سزا بھی پائے گا۔ گذشتہ درس میں یہ بھی بیان کیا گیا تھا کہ اس "وزر" یعنی گناہ کے بوجھ کا تعلق آخرت سے ہے مگر اس دنیاوی زندگی میں کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باوجود گناہ نہ کرنے اور اس میں شریک نہ ہونے کے بروں کے ساتھ اچھے بھی عذاب کے شعلوں کی لپیٹ میں آجاتے ہیں چنانچہ اس سلسلہ میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضؓ کی روایت ذکر کی گئی تھی جس میں حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ارشاد کو آپ نے نقل فرمایا ہے کہ میری امت میں جب گناہ عام ہو جائینگے تو اللہ اپنے قہر و غذاب کو بھی عام فرما دے گا اور حضرت ام المومنین رضؓ کے دریافت کرنے پر ارشاد ہوا تھا کہ اس عذاب میں اچھے بھی بروں کے ساتھ شامل ہو جائیں گے مگر آخرت میں ان نیکوں کے لیئے خدا کی مغفرت حاصل رہے گی۔ یہاں پر بعض باتوں کا صاف کرنا ضروری ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ رسول اکرم کے اس ارشاد میں "عذاب" سے مراد کونسا عذاب ہے دوسرے لفظ "امت" سے کیا مراد ہے اور تیسری چیز یہ ہے کہ

امت محمدیہ اور پیشتر کی امتوں میں عذاب الٰہی کے سلسلہ میں کیا فرق ہے ۔

اس دنیا کی زندگی میں بھی خدائی عذاب دو طرح سے آتا رہا ہے۔ کبھی تو وہ پوری قوم تباہ کردی گئی جس کی ہدایت کے لئے کسی نبی کو بھیجا گیا تھا اور اس نے ہدایت کو قبول نہ کیا اور اپنی ضلالت دگمراہی پر اڑی رہی اور کبھی قوم تباہ تو نہیں کی گئی لیکن اُس کو طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کیا گیا جیسے قحط ہے، بیماریاں ہیں، ظالموں اور جابروں کا اُن پر تسلط ہے یا اسی طرح کی اور سزائیں ہیں جو اُن کو اُن کے برے اعمال کی وجہ سے اٹھانا پڑیں۔ جہاں تک اس حدیث میں ارشاد نبوی کا تعلق ہے لفظ "عذاب" سے مراد عذاب استیصال یعنی ایسا عذاب مراد نہیں ہے جس میں پوری قوم تباہ کردی جاتی ہے جس طرح قوم عاد و ثمود اور قوم فرعون پچھلے نبیوں کے زمانہ میں مسمار و تباہ کردی گئی تھیں کہ آج ان کا نشان بھی دنیا میں باقی نہ رہ سکا اور یہ اس لیے کہ اللہ نے اس کا وعدہ فرمایا ہے "وما کان اللّٰہ لیعذّبھم وانت فیھم وما کان اللّٰہ معذّبھم وھم یستغفرون" (سورۂ انفال) اور اللہ ایسا نہیں کرے گا کہ (اے رسول) تمہارے ہوتے ہوئے اُن پر عذاب نازل کرے اور اللہ ایسا بھی نہیں کہ لوگ تو اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہے ہوں اور وہ اُن پر عذاب کرے۔ دوسری جگہ فرماتا ہے:۔ "وما ارسلنٰک الّا رحمۃً للعالمین" اے پیغمبر ہم نے تم کو تمام عالمین کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے اب عالمین سے مراد خواہ تمام جن و بشر لیے جائیں یا اس سے بھی اس لفظ کے دائرے کو وسیع تر قرار دیا جائے جو بھی اس لفظ "عالمین" کے اندر شامل ہوگا وہ حضور سرور انبیاء صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کے سایۂ رحمت میں ہوگا کیونکہ آپ کی ذاتِ اقدس رحمت خداوندی کا بہترین مظہر تھی اور اسی رحمت کے طفیل میں یہ امت ان عذابوں سے محفوظ ہے جو دوسری امتوں کو فنا کرتے رہے۔ حضرت ابن عباس رضؓ آیۂ "وما ارسلنٰک الّا رحمۃً للعالمین" کے سلسلہ میں فرماتے ہیں:۔ من امن بہ تمت لہ الرحمۃ فی الدنیا والاٰخرۃ ومن لم یؤمن عوفی ممّا کان یصیب الامم فی عاجل الدنیا من العذاب من المسخ والخسف والقذف" جو شخص رسولِ اکرم پر ایمان لے آیا وہ تو دنیا و آخرت میں رحمت کا مستحق بن گیا لیکن جو ایمان نہ لایا وہ اس کے باوجود کم از کم آپ کے وجود مبارک کے طفیل میں اُن عذابوں سے محفوظ ہے جو دوسری امتوں پر آتے رہے

جیسے انسانی صورتوں کو جانوروں کی شکل میں بدل دینا یا زمین کے اندر پوری قوموں کو دھنسا دینا یا آسمان سے پتھروں کی بارش ہونا اور اسی طرح کے دوسرے سخت ترین عذاب۔ صحیح مسلم میں ہے کسی نے عرض کی یارسول اللہ مشرکین کے لیئے بددعا فرما دیجئے آپ نے جواب میں فرمایا: "انی لم اُبعث لعاناً و انما بعثت رحمۃ" میں بددعا کرنے کے لیئے مبعوث نہیں ہوا ہوں بلکہ رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ حدیث حضرت ام سلمہؓ میں جس عذاب عام کا ذکر ہے یا جہاں کہیں امت محمدیہ پر عذاب آنے کا تذکرہ ہے مراد وہ معمولی عذاب ہیں جو وبائیں، قحط سالی، گرانی، جنگ اور اسی طرح کی دوسری سزاؤں کی صورتوں سے آتے ہیں اور ساری امت کو نیست و نابود کرنا مراد نہیں ہوتا۔ جہاں تک مفہوم امت کا تعلق ہے یہ لفظ خود قرآن کریم میں بھی کثیر معانی میں بولا گیا ہے مگر نبی کی امت سے مراد وہ جماعت ہوتی ہے جس کی ہدایت کے لیئے اسے اللہ مبعوث فرماتا ہے۔ پچھلی امتوں کی تعداد بھی محدود تھی اور زمانہ بھی معین تھا مگر سرکار خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت میں قیامت تک اولین اور آخرین سب شامل ہیں اور آپ تمام عالمین کے لیئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجے گئے تھے آپ کی نورانی اور رحمت مجسم ہستی کی برکت کی وجہ سے آپ کی ساری امت اُن سخت ترین عذابوں سے محفوظ ہے سوائے قرب قیامت کے اس عذاب کے جس میں ساری کائنات فنا کر دی جائے گی اور جس کی طرف قرآن کریم نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اِلَّا نَحْنُ مُهْلِكُوْهَا قَبْلَ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ اَوْ مُعَذِّبُوْهَا عَذَابًا شَدِيْدًا

کوئی ایسی بستی نہیں ہے جسے ہم روز قیامت سے پہلے برباد نہ کر دیں یا ہم اس کی نافرمانی کی سزا میں اس پر سخت ترین عذاب نازل نہ کریں۔ زیر بحث آیات کریمہ میں پورے قرآن کریم کے ہر حصہ اور ہر جزو کی طرح بڑی اہمیت کی باتیں پوشیدہ ہیں اور ان پر جس قدر بھی غور کیا جائے گا ان میں اسلام اور دعوت محمدیہ کے اصلی تصور کی بنیادیں ملیں گی اور اس لیئے ضروری ہے کہ ان کے معانی و مطالب پر بھی گہری نظر ڈالی جائے تاکہ ہم اُن بنیادوں کو سمجھ سکیں جن پر اسلامی پیغام قائم ہے۔

ان آیات کی تشریح و تفسیر میں ابھی بعض اہم باتیں اور بھی باقی رہ گئی ہیں جنہیں اگلے درس میں پیش کیا جا رہا ہے۔

(درس ۱۳۸) اَمۡ لَمۡ یُنَبَّاۡ بِمَا فِیۡ صُحُفِ مُوۡسٰی ۙ وَ اِبۡرٰہِیۡمَ الَّذِیۡ وَفّٰۤی ۙ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۙ وَ اَنۡ لَّیۡسَ لِلۡاِنۡسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی ۙ وَ اَنَّ سَعۡیَہٗ سَوۡفَ یُرٰی ۪ ثُمَّ یُجۡزٰىہُ الۡجَزَآءَ الۡاَوۡفٰی ۙ وَ اَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الۡمُنۡتَہٰی ۙ

(پارہ ۲۷ رکوع ۷ کی ابتدائی آیات سورۃ النجم)

کیا اُس کو اُن باتوں کی خبر نہیں ہے جو موسیٰ کے صحیفوں میں ہیں اور اُن ابراہیم کے صحیفوں میں جو احکام خداوندی کو بجا لائے (وہ باتیں یہ ہیں) کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور اُس کی کوشش عنقریب ہی دیکھی جائے گی پھر اُس کا اسے پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور یہ کہ تمہارے پروردگار کی طرف سب کو پہنچنا ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ گذشتہ درس میں ان آیات کریمہ کے اس جملہ "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی" کی تشریح کی گئی تھی اب ان آیات کے باقی حصوں کو بیان کیا جائے گا۔ حضرت موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں جو باتیں لکھی ہوئی تھیں اُن میں سے دوسری بات جو قرآن کریم نے بیان فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ انسان کو صرف وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے اور وہ سعی بیکار نہ جائے گی بلکہ اس کا نتیجہ عنقریب ہی اُس کے سامنے آجائے گا پھر اُسے اُس کوشش کا پورا پورا بدلہ ملیگا۔ اب ہمیں اِس سلسلہ میں اس پر غور کرنا ہے کہ "اِلَّا مَا سَعٰی" میں سعی اور کوشش سے کیا مراد ہے اور آیا اس سعی کا تعلق صرف اس موجودہ دنیا ہی سے ہے یا اس کے بعد کے جہان سے بھی ہے۔ سعی کے لفظی معنی کوشش کے ہیں اور یہاں پر اس میں ہر قسم کی نیک کوشش شامل ہے خواہ اس کوشش کا اثر انسان کی اپنی دنیاوی زندگی تک محدود رہے یا اس کے مرنے کے بعد بھی باقی رہ جائے اس طرح جب تک اس سعی کا اثر باقی رہیگا ثواب کا سلسلہ بھی باقی رہے گا اور نیک عمل کرنے والے کے مرجانے سے وہ سلسلہ بند نہ ہوگا۔

اس سے پہلے اللہ نے اس کا اعلان فرمایا تھا کہ "اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی" اور پچھلے درس میں اسے واضح کردیا گیا تھا کہ ایک شخص دوسرے کے گناہ کو صرف اس وقت تک نہیں اٹھائیگا جب تک اس کا اس کے عمل سے کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہ ہو لیکن اگر ایک شخص دوسرے

کے گناہ کا سبب بن گیا ہے تو باوجود خود گناہ نہ کرنے کے گمراہ کرنے اور غلط راستہ پر لگانے یا گمراہ کو باوجود قدرت کے گمراہی سے نہ روکنے یا اس کے گناہ پر راضی رہنے کی وجہ سے اس دوسرے شخص کے تمام گناہوں کا جو اس سے پہلے شخص کی وجہ سے ہوئے ہیں اس کو بھی حصہ دار بننا پڑے گا۔ اسی طرح وہ نیکیاں بھی اس کے حق میں لکھی جائیں گی جن کا یہ کسی نہ کسی طرح سبب بنا ہے اس طرح یہ سلسلہ مرنے کے بعد بھی باقی رہے گا اور مرنے والے کی فردِ عمل میں عذاب یا ثواب کا اضافہ ہوتا چلا جائیگا اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سورۂ عنکبوت میں ارشاد ہوا ہے: "وَلَيَحْمِلُنَّ أَثْقَالَهُمْ وَأَثْقَالًا مَّعَ أَثْقَالِهِمْ" یہ لوگ اپنے گناہ کے بوجھ تو اٹھائیں گے مگر ساتھ ہی جنہیں گمراہ کیا ہے اُن کے گناہوں کا بوجھ بھی اٹھائیں گے کیونکہ یہ ان کی گمراہی کا سبب تھے مگر یہ بات واضح رہے کہ خود اُن گناہ کرنے والوں کا عذاب اس کی وجہ سے کم نہ ہوگا۔ حدیث میں ارشاد ہوا ہے: "مَنْ دَعَا إِلَى ضَلَالَةٍ كَانَ عَلَيْهِ مِنَ الْإِثْمِ مِثْلُ آثَامِ مَنِ اتَّبَعَهُ لَا يَنْقُصُ ذَلِكَ مِنْ آثَامِهِمْ شَيْئًا" جو شخص گمراہی کے راستے پر کسی کو لگائے تو اس گمراہ کرنے والے پر خود اپنے گناہوں کے ساتھ اُس شخص یا اُن لوگوں کے گناہ بھی ہوں گے جن کو اُس نے گمراہ کیا ہے اور اس وجہ سے اُن کے ان گناہوں میں کمی نہ ہوگی۔

اسی طرح سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے: "لِيَحْمِلُوا أَوْزَارَهُمْ كَامِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَمِنْ أَوْزَارِ الَّذِينَ يُضِلُّونَهُمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ أَلَا سَاءَ مَا يَزِرُونَ" ان لوگوں کو قیامت کے دن اپنے گناہوں کے بوجھ تو اٹھانا ہی پڑیں گے اور ساتھ ہی جن لوگوں کو انہوں نے بے سمجھے بوجھے گمراہ کیا ہے اُن کے گناہوں کے بوجھ بھی ان کو اٹھانا پڑیں گے ذرا دیکھو تو یہ لوگ کیسا بُرا بوجھ اپنے اوپر لادے چلے جا رہے ہیں۔ علامہ ابن کثیر رح نے اس سلسلہ میں اس حدیث کو بھی لکھا ہے: جس شخص نے کسی کو ہدایت کی تو اُسے خود بھی اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا خود اُس ہدایت یافتہ شخص کو ملیگا اور یہی حالت گمراہ کرنے میں عذاب کی بھی ہوگی۔

اسی آیت کے ذیل میں علامہ موصوف نے ایک دوسری حدیث بھی لکھی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب قیامت میں ظالم و مظلوم جمع ہوں گے تو ظالموں کی ساری نیکیاں مظلوموں کے نامۂ عمل میں لکھدی جائیں گی اور مظلوموں کے گناہ ظالموں کی فردِ عمل میں شامل کر دیئے جائیں گے اس طرح وہ ظلم جو کسی نے دوسرے بے گناہ پر کیا ہے ظالم کی تمام نیکیاں ختم

کردیتا ہے اور اس ظلم کے بُرے نتائج کا سلسلہ صرف دنیاوی زندگی ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ مرنے کے بعد بھی اس وقت تک باقی رہتا ہے جب تک کسی نہ کسی طرح اس ظلم کا وجود باقی رہے اور اس کی بنیادیں قائم رہیں اس کے بعد اب نیک باتوں کے لیے سعی و کوشش کی اہمیت بتائی جاتی ہے۔

قرآن کریم کے اس واضح اعلان نے کہ "انسان وہی پائے گا جس کی وہ سعی و کوشش کریگا" جہاں ہمارے سوئے ہوئے ضمیر میں تصورِ آخرت کو بیدار کیا ہے اس کے ساتھ ہی بلاشبہ ہمیں اپنے زندہ رہنے اور دوسروں کو زندہ رکھنے کی ایک اہم ترین بنیاد بھی بتائی ہے اور خود ترقی کرنے نیز دوسروں کو ترقی حاصل کرنے کا موقع دینے کا راستہ بتایا ہے۔ اس جملہ نے بیکاری اور مایوسی کی لعنت کو انسانی تصور سے دور کیا ہے اور اسے ایک متحرک اور باکار زندگی کی تعلیم دی ہے۔ بہت سے لوگ سعی و کوشش کو چھوڑ کر تقدیر کے آسرے ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے رہتے ہیں۔ ایسے لوگ حقیقت میں تقدیر کے صحیح مفہوم ہی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ تقدیر۔ بیکاری اور بے عملی کا نام نہیں ہے۔ تقدیر مایوسی نہیں سکھاتی۔ تقدیر و توکل دونوں ایک ہی تصویر کے دو رخ ہیں اور ان دونوں کی اصلی روح انسانی سعی و کوشش کے اندر پوشیدہ ہے۔ اس سعی کا سلسلہ زندگی میں تو رہتا ہی ہے مگر مرنے کے بعد بھی یہ ختم نہیں ہوتا اور اس کے باوجود کہ موت مادی رشتوں کو توڑ دیتی ہے مگر سعی و کوشش کے رشتے اس کے بعد بھی نہیں ٹوٹتے اور باقی رہتے ہیں۔ بعض حدیثوں میں اس کا اس طرح ذکر فرمایا گیا ہے: "اذا مات الانسان یقطع عمله الا من ثلث من ولدٍ صالح یدعولہ او صدقةٍ جاریةٍ من بعدہ او علمٍ ینتفعُ بہ" مرنے کے بعد انسان کا عمل تین چیزوں سے جاری رہتا ہے۔ نیک اولاد سے جو اس مرنے والے کے لیے دعائے خیر کرتی رہے، دوسرے وہ صدقہ اور خیرات جو اس کی موت کے بعد بھی جاری رہے اور وہ علم جس سے لوگ نفع حاصل کریں۔ کہیں ان الفاظ کے ساتھ فرمایا گیا ہے: "من سنَّ سنةً حسنةً فلہ اجرھا و اجر من عَمِل بھا و من سنّ سنةً سیئةً فعلیہ وزرھا و وزر من عَمِل بھا" یعنی جو شخص کوئی اچھی بنیاد اور نیک طریقہ قائم کرے تو اس کا ثواب اس کے لئے برابر جاری رہے گا اور اسی طرح بُرے کاموں کا گناہ بھی جاری اور باقی رہے گا۔ یہ سب چیزیں انسان کی اپنی سعی اور کوشش ہی سے متعلق ہیں جس کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں بھی صاف

طور پر ہدایت موجود ہے۔

" اِنَّا نَحۡنُ نُحۡیِ الۡمَوۡتٰی وَ نَکۡتُبُ مَا قَدَّمُوۡا وَ اٰثَارَهُمۡ " (یٰس) بیشک ہم مُردوں کو زندہ کریں گے اور ہم ان اعمال کو لکھتے جاتے ہیں جنہیں لوگ آگے پہلے سے بھیجتے ہیں اور اُن اعمال کو بھی جن کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اس طرح انسانی سعی کا سلسلہ مرنے سے ٹوٹتا نہیں بلکہ مختلف صورتوں سے باقی رہتا ہے۔ اسلامی زندگی اور اسلامی موت دونوں حق و دیانت کی راہ میں سعیِ پیہم کا دوسرا نام ہے۔ پھر اس سعی کی قوت اور اس کوشش کے خلوص کی بلندی کا کون اندازہ کر سکتا ہے جو اس یقین محکم کی بنیاد پر قائم ہو کہ ہم کو آخر میں خدا ہی کی طرف پہنچنا ہے اور وہی ہمیں ہمارے اعمال کا بھرپور بدلہ عطا فرمائے گا اور کسی طرح بھی ہم اُس کے سخت مگر انتہائی منصفانہ محاسبہ سے بچ کر نہیں نکل سکتے۔ علمائے کرام نے اس سلسلہ میں کافی طویل بحثیں فرمائی ہیں مگر مختصر طور پر اس سے زیادہ بیان کرنا ممکن نہیں ہے۔

(۱۳۹ درس) وَ اَنَّهٗ هُوَ اَضۡحَكَ وَ اَبۡكٰی ۙ﴿﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ اَحۡیَا ۙ﴿﴾ وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوۡجَیۡنِ الذَّكَرَ وَ الۡاُنۡثٰی ۙ﴿﴾ مِنۡ نُّطۡفَةٍ اِذَا تُمۡنٰی ۪﴿﴾ وَ اَنَّ عَلَیۡهِ النَّشۡاَةَ الۡاُخۡرٰی ۙ﴿﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ اَغۡنٰی وَ اَقۡنٰی ۙ﴿﴾ وَ اَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعۡرٰی ۙ﴿﴾

(پارہ ۲۷ رکوع ۷ کی درمیانی آیات سورۃ النجم)

اور یہ کہ وہی ہنساتا اور رلاتا ہے اور وہی مارتا اور جلاتا ہے اور وہی دونوں قسموں یعنی نر اور مادہ کو نطفہ سے پیدا کرتا ہے اور قیامت میں دوبارہ اٹھانا اسی کے ذمہ ہے اور یہ کہ وہی غنی بناتا ہے اور سرمایہ عطا کرتا ہے اور وہی مالک ہے ستارۂ شعریٰ کا بھی۔

تشریح و تفسیر:- " شعریٰ " ایک بڑا ستارہ ہے جس کو بعض لوگ پوجتے تھے اور اس کا اعتقاد رکھتے تھے کہ عالم کے تمام حالات اور انقلابات میں اس کو بڑا دخل ہے۔

حضرت موسیٰ و ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں جن باتوں کا ذکر تھا اُن میں سے بعض کا ذکر اس سے قبل کی آیتوں میں آچکا ہے اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ اُن صحیفوں میں اس کا بھی تذکرہ تھا کہ اللہ ہی ہنساتا ہے اور وہی رلاتا بھی ہے مطلب

یہ ہے کہ ہنسنے اور رونے کی قوتیں یا دہ اسباب جو انسان اپنے اختیار سے حاصل کرتا ہے خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں چاہے تو انسان ایسی صورتیں مہیا کرلے جو اس کے رونے کا سبب بن جائیں اور چاہے تو ایسے اسباب اختیار کرے جو سرور اور خوشی کا ذریعہ ثابت ہوں مگر یہ ذرائع اور اسباب جن کے نتیجہ میں انسان کو خوشی حاصل ہوتی ہے یا رنج پیدا ہوتا ہے یہ سب اللہ ہی کے خلق کیے ہوئے ہیں یعنی انسان ہنستا اور روتا تو خود اپنے اختیار سے ہے اور اپنے عمل کے نتیجہ میں یا ایسے اثرات سے متاثر ہو کر جو کسی دوسری مخلوق کے عمل اور اختیار یا اثر سے متعلق ہوں مگر یہ رونے اور ہنسنے کی قوت دینا اور وہ اسباب جنکی وجہ سے اس رونے اور ہنسنے کے عمل کی تخلیق ہوئی اور یہ وجود میں آسکا وہ سب ذریعے خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ اُن کی تخلیق سے انسان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً خدا نے انسان کو عقل عطا فرمائی، ہاتھ پیر دیئے، راستہ کی اونچ نیچ دیکھنے کے لیے آنکھیں بھی دیں، سورج کی روشنی بھی خلق فرمائی اور رات کی تاریکی میں چلنے کے لیئے نور کے شعلے بھی پیدا کیئے اور پھر راستوں پر چلنے والی سواریوں کو جن چیزوں سے بنایا گیا ہے وہ سب خدا ہی کی خلق کی ہوئی ہیں۔ لوہا، لکڑی، بجلی، بھاپ، حرارت اور ٹھنڈک ساری چیزیں اللہ نے پیدا کی ہیں لیکن انسان اپنی عقل سے صحیح کام نہیں لیتا، اپنے اعضاء کا غلط استعمال کرتا ہے۔ صحیح راہ نہیں اختیار کرتا۔ گاڑیوں کا تصادم ہوتا ہے اور جب زخم لگتے ہیں، ہاتھ پیر ٹوٹتے ہیں تو روتا ہے اس یہ رونا تو خود انسان ہی کا کام ہے مگر جن اسباب کی وجہ سے رونے کی نوبت آئی وہ اصل میں خدا کے خلق کیے ہوئے تھے جن کا غلط استعمال اور مقصود فطرت کے خلاف ان کو کام میں لانے کی وجہ سے اس رونے کا وجود ہوا جو انسان کا اپنا فعل تھا اس کا یہ مطلب تو کسی طرح بھی نہیں ہو سکتا کہ ضحک و بکا یعنی ہنسنا اور رونا خود انسان کا فعل نہیں ہے بلکہ خدا ہی جب چاہتا ہے تو انسان کو ہنسانے لگتا ہے اور جب چاہتا ہے تو رلا دیتا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ قرآن کریم میں پھر یہ نہ فرماتا "فَلْيَضْحَكُوا قَلِيلًا وَّلْيَبْكُوا كَثِيرًا جَزَاءً بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ" جو کچھ وہ لوگ کیا کرتے تھے اُس کے بدلہ میں انھیں چاہیئے کہ وہ بہت کم ہنسیں اور روئیں زیادہ (توبہ) اور یہ بھی نہ کہتا: "وَتَضْحَكُونَ وَلَا تَبْكُونَ" تم لوگ ہنستے تو ہو اور روتے نہیں ہو (النجم) اگر یہ افعال صرف خدا ہی کی جانب سے ہوتے تو ان آیات میں انسانوں سے خطاب نہ فرمایا جاتا اس لیئے یہ بات پوری

طرح ظاہر ہو جاتی ہے کہ رونے اور ہنسنے کا فعل خود انسان ہی کا ہوتا ہے مگر ان افعال کی طاقت و قوت خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور ان کے تمام اسباب کی تخلیق خالق عالم کی طرف سے ہے جن میں آنکھوں میں رونے کی صلاحیت دینا اور آنسوؤں کی پیدائش اور غم کا احساس دینا اسی طرح سرور کے جذبہ کی پیدائش عالم مسرت میں چہرے کی ساخت کا بدلنا اور خوشی کا احساس یہ تمام چیزیں خدا ہی کی عطا کی ہوئی ہیں اس آیہ کریمہ میں "اَضْحَکَ" اور "اَبْکٰی" کے ایک معنی تو یہی ہیں جو ابھی بیان کیے گئے مگر مفسرین نے ان دو الفاظ کے اور بھی معنی بیان فرمائے ہیں۔ کسی نے اس "ضحک" سے مراد اہل جنت کی خوشی اور "بکا" سے مراد اہل جہنم کا رونا لیا ہے اور کسی نے اس ہنسی سے زمین کی ہنسی مراد لی ہے اور رونے سے بارش کی طرف اشارہ قرار دیا ہے اور مفہوم یہ بتایا ہے کہ اللہ زمین کو ہنساتا ہے یعنی اس میں قسم قسم کے بوٹے اور درخت پیدا کرتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں، پھل پیدا ہوتے ہیں اور طرح طرح کے پھولوں اور سبزے سے زمین کو زینت بخشی گئی ہے اور اس کو آیہ کریمہ نے "ضحک" یعنی ہنسنے سے تعبیر کیا ہے اور آنسوؤں سے مراد وہ پانی کے قطرے ہیں جو بادلوں کے سینوں میں خدا کی امانت ہیں اور جب وہ برستے ہیں تو زمین کو پھولوں اور پھلوں کی دولت سے مالا مال کر دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ "ضحک" عام طور پر خوشی کی علامت ہے اور گریہ رنج کی نشانی ہوتا ہے اس لیے جس قدر بھی پہلو مسرت و شادمانی کے ممکن ہیں خواہ وہ خوشی انسان کی ہو یا کسی دوسری مخلوق کی ہو اس کے تمام اسباب اور قوتیں اللہ کی خلق کی ہوئی ہیں۔ اور اسی طرح رنج کے اسباب اور قوتیں بھی۔ صرف ان پر تصرف انسان کرتا ہے۔

"وانّه هو امات واحيى" وہی اللہ موت بھی دیتا ہے اور زندگی بھی عطا فرماتا ہے یہاں بھی مطلب یہی ہے کہ موت و حیات کے اصلی اسباب کی تخلیق خدا ہی کے دست قدرت میں ہے صرف ان میں تصرف انسان کا ہے جس کے نتیجہ میں موت و حیات ان قوانین فطرت کے مطابق ظہور میں آتی ہے جنھیں اللہ ہی نے مقرر فرما دیا ہے۔ ڈاکٹر علاج کر کے مریض کی جان بچاتا ہے۔ قاتل ایک صحت مند مخلوق کی زندگی ختم کر دیتا ہے مگر ان ہی آلات سے جو خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں سے بنے ہیں اور اسی قوت اور ان ہی اعضا سے جو اس کے عطا کیے ہوئے ہیں تصرف صرف انسان کا ہوتا ہے۔

اس مقام پر موت وحیات سے مراد ان الفاظ کے وسیع تر مفہوم کو لیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ حیات سے مراد ایمان ہے اور موت سے مراد کفر ہے یا موت سے مراد جہالت ہے اور زندگی سے مراد علم و معرفت ہے اِس طرح مفہوم موت کے جس قدر بھی گوشے ہوں اور اسی طرح معنائے حیات کے جتنے بھی رخ ہوں اُن کے اسباب کی پیدائش خدا ہی کے ہاتھ میں ہے دوسرا اُن کے پیدا کرنے پر اور اُن کے اندر اثرات کی تخلیق پر قدرت نہیں رکھتا۔ ” وَ اَنَّہٗ خلق الزوجین الذکر والانثٰی من نطفۃ اذا تمنٰی “ حضرت موسٰی و ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں یہ بھی مذکور ہے کہ ایک ہی چیز سے دو قسم کے جاندار کبھی نر اور کبھی مادہ پیدا کرنے پر اللہ کے سوا کسی کو قدرت حاصل نہیں ہے۔ نہ کوئی اس نظام کو جانتا ہے اور نہ کوئی اس پر قابو رکھتا ہے۔ یہاں بھی انسان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ خدا کے خلق کیئے ہوئے اسباب پر تصرف کر سکے اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اور یہ بھی اُن کتابوں میں گذر چکا ہے کہ ” وَاَنَّ علیہ النَّشْاَۃَ الاُخْرٰی “ اور اس دنیاوی موت کے بعد قیامت کے روز دوبارہ زندہ کرنا بھی خدا ہی کے ذمہ ہے۔ انسان کو اُس کی تخلیق کے ابتدائی مرحلے خدا نے بار بار قرآن کریم میں یاد دلائے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ پہلے کن کن حالتوں سے گذر کر اس مقام پر آیا ہے جہاں وہ اب ہے اور پھر یہ بھی اسے یاد دلایا ہے کہ جب اللہ میں اتنی قدرت ہے کہ اُس نے انسان کو ایسی حالت میں خلق کر دیا جب وہ کچھ بھی نہ تھا تو پیدا کرنے کے بعد دوبارہ حیات عطا کرنا اس کے لیے کیا مشکل ہے اور جس طرح ابتدائی تخلیق بھی اُسی نے کی تھی قیامت میں دوبارہ زندگی دینا بھی اُسی کا کام ہے۔ ” وَاَنَّہٗ ھُوَ اَغْنٰی وَاَقْنٰی “ واقعی وہی ہے جو مال و دولت عطا کرتا ہے اور اس مال کو باقی رکھتا ہے اور وہی ستارۂ شعریٰ کا بھی پروردگار ہے۔ یہ تمام باتیں حضرت موسٰی اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کے صحیفوں میں تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ہمیشہ انسان کو اُس کا فرض یاد دلایا ہے پہلے بھی اور آج بھی ان باتوں کو دہرایا جا رہا ہے اور اُس کے شعور اور ضمیر کو جگایا جا رہا ہے تاکہ وہ کائناتِ عالم کا مطالعہ کرے، خدا کی نشانیوں کو دیکھے اور اُن سے عبرت حاصل کرے دنیا کی اس چند روزہ زندگی کی رنگینیوں سے فریب میں نہ آئے اور اللہ کی عظمت و کبریائی کو کسی وقت نہ بھولے۔

وَأَنَّهُ أَهْلَكَ عَادًا الْأُولَىٰ ۝ وَثَمُودَ فَمَا أَبْقَىٰ ۝ وَقَوْمَ نُوحٍ مِّن قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوا هُمْ أَظْلَمَ وَأَطْغَىٰ ۝ وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوَىٰ ۝ فَغَشَّاهَا مَا غَشَّىٰ ۝ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكَ تَتَمَارَىٰ ۝

(درس) ۱۴۰

(پارہ ۲۷ رکوع ۷ کی درمیانی آیات سورہ النجم)

اور یہ کہ اس نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کر دیا اور قوم ثمود کو بھی (غرض) کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور اس سے پہلے قوم نوح کو۔ بیشک یہ لوگ بڑے ظالم اور بڑے ہی سرکش تھے۔ اور الٹی ہوئی بستیوں کو بھی پھینک مارا تھا پھر ان بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے گھیر لیا تو اے انسان تو اپنے رب کی کس کس نعمت میں شک کرتا رہے گا۔

تشریح و تفسیر:- پہلی قوم "عاد" سے مراد حضرت ھود علیہ السلام کی قوم ہے جو سخت آندھی کے عذاب سے ہلاک ہوئی تھی اور دوسری قوم "عاد" والے "عاد ارم" کہلاتے ہیں جن کا ذکر سورہ "والفجر" میں ہے۔ یہ لوگ اس "عاد" کی اولاد تھے جو حضرت نوح علیہ السلام کی پانچویں پشت میں تھا اور جس کا سلسلہ نسب ارم بن سام بن نوح سے ملتا تھا اس کے دو بیٹے تھے جن کا نام شداد و شدید تھا اور دونوں بادشاہ تھے۔ جب شدید مر گیا تو سب ملکوں کا تنہا بادشاہ شداد بن گیا اسی کے نام سے جنت شداد مشہور ہے جس کو اس نے اپنے خیال ناقص میں خدا کی جنت کے مقابلہ میں بنوایا تھا اور اس وقت کے انبیاء علیہم السلام سے کہتا تھا کہ جس جنت کا آپ ذکر کرتے ہیں ویسی تو میں خود بنوا سکتا ہوں اس باغ کے بنوانے کی کوشش میں اس نے اپنی سلطنت کی کثیر دولت لگا دی اور ایک بڑا عالی شان باغ تیار کرایا جس میں ایک سو برس کی مدت صرف ہوئی۔ اس باغ کی دیواریں سونے اور چاندی کی تھیں جن میں موتی اور ہیرے جڑے ہوئے تھے، اس کی زمین عنبر و مشک کی تھی، اس میں ہزارہا محل اور اعلیٰ ترین مکانات تھے۔ ہر مکان کے سامنے ایک درخت تھا جس کی شاخیں سونے کی، پتے زمرد کے اور خوشے موتیوں کے تھے جب یہ عالی شان باغ تیار ہو گیا تو شداد اپنے درباریوں کے ساتھ اس کے دیکھنے کو گیا لیکن ابھی اس نے ایک قدم اس باغ کے اندر رکھا ہی تھا کہ ایک چیخ کی آواز سنائی دی اور اس کا دم نکل گیا اس حالت میں کہ اس کا ایک قدم باغ کے اندر تھا اور دوسرا قدم باغ کے باہر تھا اور اسی وقت وہ باغ بھی نگاہوں سے

غائب ہوگیا۔

اس آیۂ کریمہ میں جس قومِ عاد کا ذکر ہے وہ یہ قوم عاد نہیں بلکہ حضرت ھود علیہ السلام کی قوم تھی۔ آپ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں تھے اور اس قوم کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے۔ زمانہ موافق تھا اس قوم کے برابر دنیا بھر میں کوئی دوسری قوم نہ تھی اور یہ لوگ بہت لمبے قد کے، طاقتور اور بڑی عمر والے ہوا کرتے تھے۔ بتوں کی عبادت کرتے تھے۔ حضرتِ ھود علیہ السلام نے بہت کچھ سمجھایا مگر نہ مانے اور اپنی بات پر اڑے رہے اور جب ان کی شرارت حد سے زیادہ بڑھ گئی تو پہلے بارش بند ہوئی اور تین سال تک ایک قطرہ بھی نہ برسا، جب اس عذاب پر بھی ان لوگوں نے پیغمبرِ خدا کی اطاعت قبول نہ کی اور اپنی گمراہی پر جمے رہے تو ایک سیاہ بادل آسمان پر چھا گیا اور یہ لوگ یہ سمجھ کر کہ اب اس سے پانی برسے گا سب کے سب ایک جگہ جمع ہوگئے۔ کچھ ہی دیر میں ایک سخت آندھی چلی جس میں چنگاریاں بھری ہوئی تھیں اور آٹھ روز تک یہ آندھی برابر چلتی رہی اور اتنی شدت کے ساتھ کہ بوجھ سے لدے ہوئے اونٹوں کو اڑا دیتی تھی اور پھر زمین پر دے مارتی تھی یہاں تک کہ پوری قوم "عاد" تباہ ہوگئی اور ایک فرد بھی اس عذاب الٰہی سے نہ بچ سکا۔ حضرتِ ھود علیہ السلام اپنے ساتھیوں اور مخلصین کو اپنے ساتھ لیکر پہلے ہی اس قوم سے الگ ہو کر چلے گئے تھے۔

اس قوم کو قدیم عاد اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ قوم ثمود سے پہلے تھی یا اس وجہ سے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو قوم سب سے پیشتر ہلاک کی گئی تھی وہ یہی قوم تھی۔

اِن آیاتِ کریمہ میں قوم عاد کے بعد قوم ثمود کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ یہ حضرتِ صالح علیہ السلام کی قوم تھی، آپ بھی حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد میں اور ان کی نویں پشت میں تھے۔ حضرت صالح کے اجداد میں ایک شخص کا نام ثمود تھا جس کی طرف قوم ثمود منسوب ہے۔ یہ لوگ بھی قوم عاد کی طرح بہت مالدار تھے حضرتِ صالح ان کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے تھے تو اس وقت آپ کی عمر سولہ سال کی تھی۔ آپ برابر خدا کے احکام کی تبلیغ کرتے رہے اور اپنی قوم کو گمراہی سے بچانے اور ہدایت کرنے کی کوشش میں مصروف رہے یہاں تک کہ آپ کی عمر ایک سو بیس برس کی ہوگئی مگر قوم نے نہ مانا اور ایک نہ سُنی۔ یہ قوم ثمود پہاڑ کے ایک ٹکڑے کی پرستش کیا کرتی تھی اور اس پر قربانیاں چڑھاتی تھی، جب آپ نے ان لوگوں کو روکا اور سمجھایا کہ وہ اس کی عبادت نہ کریں بلکہ خدائے واحد کی پرستش کریں تو انھوں نے کہا کہ اگر اسی پہاڑ سے آپ

ایک اونٹنی مع بچے کے ظاہر کر دیں تو ہم سمجھیں کہ آپ نبی ہیں اور حق پر ہیں۔ آپ نے دعا کی اور ایک اونٹنی مع بچہ کے پہاڑ سے ظاہر ہوئی اسی کو ناقہ حضرت صالح کہا جاتا ہے لیکن اس معجزے کے بعد بھی یہ لوگ ایمان نہ لائے اور بدستور اپنی گمراہی اور ضد پر اڑے رہے اُس وقت خدا کا حکم ہوا کہ اس شہر کا کل پانی ایک روز وہ اونٹنی پیا کرے اور ایک روز قوم اسے استعمال کرے غرض یہی قاعدہ مقرر کر دیا گیا اور جس روز وہ اونٹنی پانی پیتی تھی تو اس قدر دودھ دیتی تھی کہ وہ سب کے سب سیراب ہو جاتے تھے اس معجزے کو دیکھ کر بھی اُن لوگوں کی آنکھیں نہ کھلیں بلکہ پیغمبر خدا کی مخالفت اور حسد کی آگ اور تیز ہو گئی اور آخر آپس میں مشورہ کر کے ایک دن اُن میں سے ایک شخص نے جس کا نام "قدار بن سالف" تھا اس اونٹنی کے پاؤں کاٹ ڈالے اور پھر سب نے مل کر اس کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور چھوٹے بڑے سب نے ملکر اس کا گوشت کھالیا اُس اونٹنی کے مرنے کے بعد اس کا بچہ پہاڑ پر چلا گیا اور تین مرتبہ اس نے آسمان کی طرف اپنا سر بلند کر کے خدا کی بارگاہ میں فریاد کی اور پھر پہاڑ میں غائب ہو گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اس سرکشی پر ان کو پھر نصیحت فرمائی اور کہا کہ اگر تین روز کے اندر تم لوگ توبہ کر لو گے تو تمہاری نجات ہو جائے گی مگر اُن لوگوں نے کچھ نہ سنا اور پیغمبر کی باتوں کو مذاق سمجھتے رہے اور برابر ان کی توہین کرتے رہے آخر چوتھے دن کے گزرنے کے بعد رات کو ایک شدید چنگھاڑ کی آواز پیدا ہوئی جس سے سب کے کان پھٹ گئے اور پھر بے انتہا سخت زلزلہ آیا جس سے ان لوگوں کے دل و جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور وہ سب مر گئے پھر آسمان سے آگ برسی اور اُن کی لاشیں جل کر خاک ہو گئیں۔ اس کے بعد ان آیات کریمہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے۔

حضرت نوح حضرت ادریس کے بعد مبعوث ہوئے تھے اور دنیا سے بت پرستی کو مٹانے کی غرض سے آپ کو بھیجا گیا تھا۔ سیکڑوں سال تک حضرت نوح نے اپنی قوم کو ہدایت کرنے کی کوشش فرمائی مگر ہدایت حاصل کرنے کے بجائے لوگ آپ کا مذاق اڑاتے تھے جھٹلاتے تھے، پتھر مارتے تھے اور آپ کو معاذ اللہ دیوانہ کہتے تھے۔ آخر عذاب آیا اور ساری قوم نوح کو پانی میں ڈبو دیا گیا۔

قرآن کریم نے ان واقعات کو بیان فرما کر ہمیں عبرت دلائی ہے۔ ہمارے سوئے ہوئے ضمیر کو جگایا ہے اور ہمیں اس طریقہ پر یہ سمجھایا گیا ہے کہ اگر ہم نے بھی خدا کے پیغام کے سامنے

سرکشی کی اور احکام الٰہی پر عمل کرنے میں کوتاہی اور غفلت کی تو آخر کسی وقت ہمیں بھی قہر خداوندی کا سامنا کرنا ہوگا۔ اور جس طرح اُس نے پچھلی قوموں کو اُن کے ظلم و فساد کی عبرت ناک سزائیں دیں وہ ہم کو بھی ہماری سرکشی اور ظلم اور بداعمالیوں کی سزا ہر وقت دے سکتا ہے۔

(درس ۱۳۱) وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا ِۨالْاُوْلٰى ۝ وَثَمُوْدَاۡ فَمَاۤ اَبْقٰى ۝ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ۝ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ۝ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۝ فَبِاَىِّ اٰلَاۤءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۝

(پارہ ۲۷، رکوع ۷ کی درمیانی آیات سورۃ النجم)

اور یہ کہ اللہ نے قدیم قوم عاد کو ہلاک کر دیا اور قوم ثمود کو بھی پس کسی کو بھی باقی نہ چھوڑا اور اس سے قبل قوم نوح کو۔ بیشک یہ لوگ بڑے ہی سرکش اور ظالم تھے اور الٹی ہوئی بستیوں کو اسی نے پھینک مارا تھا پھر اُن آبادیوں کو گھیر لیا جس چیز نے کہ گھیر لیا تو (اے انسان) اپنے رب کی کس کس نعمت میں تو شک کرے گا۔

تشریح و تفسیر:۔ پچھلے درس میں حضرت نوح علیہ السلام کے واقعات کی طرف اشارہ کیا گیا تھا یہاں اُس کی کچھ تفصیل بیان کی جاتی۔ تاریخی واقعات قوموں کے لیئے بڑا سرمایہ ہوتے ہیں، ان کو پڑھنے اور یاد کرنے سے اور اُن کی رفتار اور اُن کے نتیجوں پر غور کرنے سے قوموں کو اپنی زندگی سدھارنے اور ترقی کرنے میں بڑی مدد ملتی ہے، یہ تاریخی واقعات آئندہ آنے والی نسلوں کی زندگیوں کی بڑی اہم بنیادیں ثابت ہوتے ہیں اس لیئے قرآن کریم نے بھی دوسری ہدایات اور احکام کے ساتھ پچھلے واقعات اور مختلف قوموں کے کردار اور ان کی تاریخ کو بھی بیان کیا ہے۔ زندگی کا نقشہ بنانے میں نظریات کے ساتھ تجربوں کی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے اور یہ پہلو تاریخی واقعات ہی کو سامنے رکھ کر بڑی حد تک مکمل کیا جا سکتا ہے۔ اس لیئے ان واقعات کو محض کہانی اور قصہ نہیں سمجھنا چاہیئے بلکہ یہ بعد کی نسلوں کی زندگی پر بڑا گہرا اثر ڈالتے ہیں اور ان میں عملی زندگی کے وہ سبق ہیں جو صرف فلسفیانہ نظریات معلوم کرنے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ علم تاریخ کے پڑھنے کا ہم کو اسی وقت صحیح فائدہ حاصل ہو سکتا ہے جب ہم اُس کو بھی کیمسٹری، بیالوجی اور دوسرے تجرباتی علوم کی طرح پڑھیں اور اس کے نتیجوں کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی کی تشکیل کریں۔

حضرت نوح علیہ السلام اولوالعزم پیغمبروں میں سب سے پہلے تھے جن کی تعداد پانچ ہے
پہلے حضرت نوح پھر حضرت ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ علیہم السلام اور پانچویں حضرت سرورِ
انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ حضرت آدم علیہ السلام سے ڈیڑھ ہزار سال کے بعد
حضرت نوحؑ کو نبوت عطا ہوئی تھی اور حضرت ادریسؑ کے بعد بت پرستی مٹانے کیلئے
آپ پہلے نبی تھے جو صاحبِ شریعت رسول کی حیثیت سے مبعوث ہوئے تھے۔ حضرت آدم
علیہ السلام اور طوفانِ نوحؑ کا درمیانی وقفہ دو ہزار سال سے کچھ زیادہ ہے۔ علامہ
ابن قتیبہ نے المعارف میں لکھا ہے کہ طوفان کے بعد بھی حضرت نوحؑ کی زندگی باقی رہی
اور تقریباً تین سو پچاس سال بعد تک زندہ رہے۔

حضرت نوح علیہ السلام نجاری یعنی لکڑی کی چیزیں بنانے کا کام کرتے تھے۔ اور
محنت مزدوری کر کے زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ آپ کی عمر دو ہزار برس سے زیادہ ہوئی
جس میں سے قرآن کریم کے ارشاد کے مطابق ساڑھے نو سو برس کی تو وہ مدت ہے
جس میں آپ نے پیغمبری کے فرائض انجام دیئے اور اپنی امت کو خدا کا پیغام پہنچاتے رہے
اس پر ہم کو حیرت اور تعجب کرنے کا کیا حق ہو سکتا ہے، جس قادرِ مطلق اللہ نے
انسان کو پیدا کیا اسی کو اختیار ہے کہ وہ چاہے تو اُسکی عمر گھٹا دے اور چاہے تو بڑھا دے
خود حضرت آدم کی عمر ایک ہزار سال کی ہوئی۔ لقمان بن عاد کی عمر تین ہزار برس سے زیادہ
ہوئی۔ حضرت عیسیٰ، خضر و الیاس علیہم السلام اب تک زندہ ہیں۔ اصحاب کہف کی حیات
بھی اب تک ثابت ہے۔ شہداء راہ خدا کی زندگی باقی رہنے کا ثبوت قرآن کریم کی آیات
سے ملتا ہے۔ چنانچہ سورۂ آل عمران میں ہے: جو لوگ خدا کی راہ میں شہید کیئے گئے ہیں ان
کو ہرگز مردہ نہ سمجھنا بلکہ وہ لوگ زندہ ہیں۔ خدا جس کسی کو اپنی مخلوق میں سے باقی رکھنا
چاہے اُسے دن اور رات کی گردش اور زمانہ کے انقلابات فنا نہیں کر سکتے ہر مذہب
کی تاریخی کتابوں میں لمبی عمروں کے لوگوں کا ذکر موجود ہے!

حضرتِ نوح کو آدم ثانی بھی کہا جاتا ہے اس لیے کہ اُن کے زمانہ میں جو زبردست
طوفان آیا تھا اس میں دنیا بھر کی تمام آبادی فنا ہو گئی تھی۔ اس طوفان کے بعد انسانی
آبادی کا سلسلہ حضرت نوحؑ کے بیٹوں سام، حام اور یافث سے قائم ہوا اور آج
کے سارے بنی انسان ان کی اولاد ہیں۔ اپنے بیٹوں میں حضرت نوحؑ نے حکم خدا سے

سام کو اپنا جانشین بنایا جب آپ کی وفات کا وقت آگیا تو آپ اس وقت دھوپ میں
کھڑے ہوئے تھے۔ ملک الموت نے آکر آپ کو سلام کیا آپ نے جواب سلام دیا اور
دریافت کیا کہ تم کیوں آئے ہو۔ فرشتہ نے عرض کی اے پیغمبرِ خدا میں آپ کی روح نکالنے
کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ یہ سن کر آپ نے فرمایا بیشک تم اپنے فرض کو انجام دو لیکن کیا تم مجھے
اتنی مہلت دوگے کہ میں دھوپ سے سایہ میں چلا جاؤں۔ ملک نے کہا بے شک۔ نوحؑ سایہ
میں آگئے اور فرمانے لگے میں نے اتنی لمبی عمر پائی مگر اس وقت تو وہ مجھ کو اتنی مختصر نظر آتی
ہے جیسے میں دھوپ سے سایہ میں آگیا۔ اب تم میری روح کو قبض کر لو۔ حضرت نوحؑ نے
موت سے ڈر کر یہ مہلت طلب نہیں کی تھی بلکہ یہ بھی ایک انداز تھا دنیا کی بے ثباتی بتانے کا اور
آخرت کی طرف رغبت دلانے کا۔

حضرت نوحؑ نے سیکڑوں سال تک قوم کو ہدایت کرنے کی کوشش فرمائی مگر لوگ
نہ مانے اور انھیں جواب یہ دیتے تھے کہ آپ بھی تو ہماری طرح کے آدمی ہیں اور پھر غریب و
مفلس بھی ہیں نہ آپ کی کوئی شان و شوکت ہے اور نہ آپ کے پاس کوئی بڑا عہدہ اور
منصب ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ ہمارے بڑے بڑے رؤسا اور امیروں کو چھوڑ کر وحی
آپ کے پاس آئے۔ اور ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ آپ کے ساتھ صرف ادنیٰ درجہ کے غریب لوگ
ہیں۔ بڑے آدمیوں میں سے تو آپ کے ساتھ کوئی بھی نہیں ہے۔ کاش قوم نوحؑ کو یہ
حقیقت معلوم ہوتی کہ حق کی پیروی اور تصدیق کرنے والے ہی در اصل بڑے اور ذی عزت
لوگ ہوا کرتے ہیں خواہ وہ کتنے ہی نادار اور کتنے ہی غریب ہوں۔ انسان کی شرافت و
عزت اُس کے کردار اور ایمان و تقویٰ سے ہوتی ہے ظاہری شان و شوکت اور دولت
سے نہیں ہوتی۔ اسلام نے قرآن کریم کے ذریعہ کردار کی اہمیت پر ان الفاظ کے ساتھ
دنیا کو توجہ دلائی ہے "اِنَّ اَکرمکم عند اللہ اتقاکم" خدا کے نزدیک سب سے زیادہ عزت
والا صرف وہ ہے جو خدا سے زیادہ ڈرنے والا ہو اور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے اپنے اس ارشاد سے انسانی شرافت و عزت کے اصلی معیار کو ظاہر فرما دیا ہے:
"لیس لعربیٍّ علی عجمیٍّ فضلٌ الا بالتقویٰ" عرب کو عجم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے اگر
ہو سکتی ہے تو صرف تقویٰ اور ایمان کی وجہ سے۔ جس کی ایمانی قوت اور تقویٰ زیادہ
ہوگا وہی خدا کے نزدیک زیادہ عزت والا ہوگا۔ اور اگر ایمان اور عمل صالح ہی غائب

ہے تو ایسے انسان کا وہی حشر ہوگا جو حضرت آدمؑ کے بیٹے قابیل کا اور حضرت نوحؑ کے فرزند "یام" کا ہوا تھا اس لیے کہ خدا کی بارگاہ میں سب سے بیشتر جس چیز پر محاسبہ ہوگا وہ انسان کا عمل اور کردار ہی ہے۔ اس کے بعد ان آیات میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا ذکر کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْتَفِكَةَ أَهْوٰى ۝ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ۝ فَبِأَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ۝ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ۝ اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ۝ (درس ۱۴۲)

(پارہ ۲۷ رکوع ۷ کی چند آیات سورۃ النجم)

اور اُسی نے قوم لوطؑ کی اُلٹی ہوئی بستیوں کو (زمین پر) دے مارا تھا پھر اُن بستیوں کو گھیر لیا جس چیز نے کہ گھیر لیا (تو اے انسان آخر) تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت پر شک کیا کرے گا۔ یہ محمدؐ بھی اگلے ڈرانے والوں کی طرح ایک ڈرانے والے (پیغمبر) ہیں۔ قیامت قریب آگئی ہے۔ خدا کے سوا کوئی اسے ٹال نہیں سکتا۔

تشریح و تفسیر:۔ "المؤتفکۃ" "أفک" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پھیر دینا اور پلٹ دینا جبکہ یہ کسی دوسرے کے متعلق بولا جائے ورنہ اس کے معنی جھوٹ بولنے کے آتے ہیں۔ سورۂ "احقاف" میں ارشاد ہوتا ہے جب حضرت ھود علیہ السلام نے اپنی قوم کو نصیحت فرمائی اور انھیں ہدایت کرنے کی اور سیدھے راستہ پر لانے کی کوشش کی تو انہوں نے جواب دیا تھا: "أَجِئْتَنَا لِتَأْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا" کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم کو ہمارے معبودوں سے پھیر دو "أفک" مصدر ہے جس کے معنی پھیرنے اور پلٹنے کے ہیں یا استعمالِ لازم کی صورت میں جھوٹ بولنے کے ہیں اور "ائتفاک" کے معنی پھر جانے اور پلٹ جانے کے آتے ہیں اسی سے مشابہ لفظ "إفک" ہے جس میں الف کو زیر کے ساتھ پڑھتے ہیں مگر اس کے معنی جھوٹ کے آتے ہیں سورۂ "توبہ" اور سورۂ "الحاقہ" میں بھی قوم حضرت لوطؑ کی بستیوں کا ذکر ہے لیکن وہاں بجائے "مؤتفکۃ" کے "مؤتفکات" جمع کا صیغہ استعمال فرمایا گیا ہے لیکن مراد ہر مقام پر ایک ہی ہے یعنی قوم لوطؑ کی مختلف بستیاں جن کو ان کے گناہوں کی سزا میں الٹ دیا گیا تھا اور وہ سب کے سب

ہلاک ہو گئے تھے۔

"مؤتفکات" تباہ کن طوفانی ہواؤں کو بھی کہتے ہیں مگر یہاں پہلے معنی ہی مقصود ہیں "ھُوِیٌّ" کے معنی بلندی سے گرنے کے ہیں اس سے "اَھْوٰی" فعل ماضی بنا ہے مگر جب یہ متعدی یعنی کسی دوسری چیز کے متعلق بولا جاتا ہے تو اس کے معنی گرانے کے آتے ہیں اور جب یہ لازم ہوتا ہے یعنی خود کسی چیز کے لئے بولتے ہیں تو اس سے گر جانے کے معنی ظاہر ہوتے ہیں۔ یہاں مراد پہلے معنی ہیں یعنی اللہ نے ان بستیوں کو بلندی پر سے زمین پر الٹ الٹ دیا اور گرا دیا۔ "غِشَاءٌ" پردے کو کہتے ہیں اسی سے "غَشّٰی" بنا ہے جس کے معنی ہیں چھپا لیا "اٰلاء" جمع ہے جس کے معنی ہیں نعمتیں اس کا واحد "اِلیٌ" ایک نعمت کے لیے بولتے ہیں یہ لفظ کئی طرح سے پڑھا جاتا ہے "مِرْیَۃٌ" کے معنی شک و شبہ کے ہیں اسی سے "تَتَمَارٰی" صیغہ خطاب بنا ہے۔ بقیہ الفاظ کی تشریح آئندہ درس میں آئے گی۔

اِن آیاتِ کریمہ میں سب سے پہلے قوم حضرت لوط علیہ السلام کی ان بستیوں کا ذکر ہے جن پر عذاب نازل ہوا تھا۔ ان واقعات کی کچھ تفصیل معلوم کرنا ہمارے لیے بھی ضروری ہے تاکہ ہمیں ان سے عبرت حاصل ہو اور ہم خود اپنے کردار اور افعال کا جائزہ لے سکیں حضرت لوطؑ حضرت ابراہیمؑ کے بھتیجے تھے اور بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے خالہ زاد بھائی تھے اور آپ کی پہلی زوجہ حضرت سارہؓ کے حقیقی بھائی تھے۔ حضرت لوطؑ جس قوم کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے اُن سے پانچ شہر آباد تھے جن میں سب سے بڑے شہر کا نام سدوم تھا۔ یہ لوگ مصر و شام کے درمیان آباد تھے۔ حد درجہ کے کنجوس اور مسافروں کے آنے جانے سے بہت گھبراتے تھے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت لوط علیہما السلام کا پہلے قیام عراق میں تھا پھر نمرود کے ظلم کے سبب سے آپ وہاں سے ہجرت کر کے شام کی طرف چلے آئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام فلسطین میں مقیم ہو گئے اور حضرت لوطؑ کو سدوم میں رہنے کا اور اس شہر اور اس کے گرد و پیش کی بستیوں کی آبادی کی ہدایت کرنے کا حکم ہوا تاکہ اُن کافروں کی آپ اصلاح کریں اور اُن کے انتہائی گندے، خلاف فطرت اور بے حیائی اور بے شرمی کے کاموں اور اعمال بد سے اُن کو باز رکھیں جن میں وہ مبتلا تھے بلکہ اُن بے حیائیوں کے اصلی بانی تھے۔ اُن سے

پیشتر اس قسم کی بداعمالیوں اور شرمناک گناہوں سے کوئی واقف بھی نہ تھا۔ اہل سُدوم
کو شیطان نے گمراہ کیا اور ان شرمناک بداعمالیوں کی ابتدا اُن سے ہوئی پھر ان سخت ترین
اعمال بد کی بیماری دوسرے شہروں میں بھی پہنچی یہانتک کہ یہ پانچوں شہر جن کی ہدایت کا کام
حضرت لوط علیہ السلام کے سپرد تھا بداعمالیوں اور گندے افعال کا مرکز بن گئے۔ حضرتِ
لوطؑ نے احکام الٰہی پہنچانے میں کوئی کمی نہیں فرمائی اور جو کچھ اُن کے امکان میں تھا وہ
سب کیا مگر قوم اپنی ضد اور گمراہی سے باز نہ آئی اور یہی کہتی تھی کہ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ
اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ " لوطؑ اور ان کے ساتھیوں کو اپنے شہر سے نکال دو۔ یہ بڑے
پاک وصاف رہنا چاہتے ہیں! (پارہ ۹ رکوع ۱۷) بعض غیر مسلم حلقوں کی مذہبی کتابوں
میں ایسے پاکباز " ایسے عظیم اور معصوم پیغمبر کی شان میں جو باتیں
لکھی ہوئی ہیں وہ بالکل بے اصل اور غلط ہیں۔ حضرت لوطؑ دنیا سے ناپاکی اور گندگی
کو دور کرنے آئے تھے۔ اُن کی ساری زندگی تبلیغ احکام خداوندی میں گذری تھی اُن
کی طرف ناپاک حرکات کو منسوب کرنا محض اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ کسی کو تاریخی واقعات
کا صحیح علم نہ ہو، وہ ایک نبی اور رسول کی اصلی شان و منزلت سے واقف نہ ہو اور وہ یہ
نہ جانتا ہو کہ یہ الٰہی منصب کس قسم کے انسان کو مل سکتا ہے اور آیا ایسا بشر جو اس
عہدے پر فائز ہو اُس سے خلاف منشاء خداوندی اور عقل وحکمت کے مخالف کوئی عمل
ظاہر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جو لوگ پیغمبروں اور رسولوں کو محض سیاسی رہنماؤں کی
حیثیت سے دیکھتے ہیں وہ اُن سے اس کی توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ بھی عام انسانوں
کی طرح غلط کاریوں میں اور گناہوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں حالانکہ ایسے لوگ جو نبوت و
رسالت کے عہدے کے اہل ہوں اُن میں اور عام سیاسی رہنماؤں اور مصلحین میں بڑا فرق
ہے۔ سیاسی رہنما وقتی مصلحتوں کا تابع ہوتا ہے جبکہ نبی وہ ہے جو دنیا والوں کو خدا کے
احکام اور اُس کی مشیت بتانے کے لیے آتا ہے اس کی غرض دین حق کی تعلیم دینا ہوتی ہے
گناہ اور اطاعت کا فرق سمجھانا ہوتا ہے۔ انبیاء و مرسلین کا قول وعمل اور اُن کی زندگی الٰہی
ہدایات کا سب سے بڑا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اُن کی پاک سیرت اور اُن کا روشن کردار دوسروں کے
لیے ایک مثال اور نمونہ ہوا کرتا ہے جسے آنکھ بند کر کے مشعل راہ بنایا جا سکتا ہے کیونکہ وہ
تو بس ہدایت ہی ہدایت ہے اُس میں گمراہی، بھول چوک، غلطی اور دھوکے کا امکان ہی نہیں

ہونا، ناپاکی اور گندگی کا اس میں تصور تک نہیں ہو سکتا۔ اصلاح کردار اور حق و دیانت کی تعلیم کا عظیم مقصد صرف اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب انبیاؑ ہر قسم کی کردار کی کمزوری اور گناہ سے پاک و صاف ہوں ورنہ خود گناہگار دوسرے کو ہدایت کیسے کرے گا اور اس کی تبلیغ کا کیا اثر ہوگا اور جو خود سیدھی راہ پر نہ ہو وہ دوسرے انسانوں کی رہبری کا فرض کس طرح انجام دے سکتا ہے۔ قرآنِ کریم کا نظریہ اس منصبِ خداوندی رکھنے والے کے لیے یہ ہے: "لاینال عھدی الظالمین" میرا دیا ہوا منصب رسالت و نبوت ظالموں کو نہیں ملسکتا اور ظاہر ہے "ظلم" کہتے ہیں ہر اس کام کو اور ہر اس عمل کو جو عدل و انصاف اور حق و دیانت کے خلاف ہو اس لیئے نبی خلاف حق کوئی کام کر ہی نہیں سکتا۔ دوسری جگہ قرآن مجید میں ہے: "اِنَّ عبادی لیس لکَ علیھم سلطانٌ" اے شیطان میرے خاص بندوں پر تجھ کو کوئی اقتدار اور غلبہ حاصل نہ ہوگا اور تو اُن کو حق کی راہ سے ہٹا نہ سکے گا اور پھر شیطان نے خود بھی اس کا اقرار کر لیا تھا جسے قرآنِ کریم نے بیان فرمایا ہے: "لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ" اے اللہ میں سب کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے مخلص بندوں کے کہ انھیں میں گمراہ نہیں کر سکتا۔

ایک اور مقام پر قرآن کریم کا ارشاد ہے: "من یُّطِعِ الرَّسولَ فقد اطاع اللّٰہ" جو رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ دراصل خدا کی اطاعت کرتا ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام بھی نبی تھے اس لیئے اُن کا عمل دوسروں کے لیئے رضائے خدا تک پہنچنے کا ذریعہ اور مثال تھا ان کی طرف ناپاک افعال و اعمال کو منسوب کرنا بڑی جسارت اور بے ادبی ہے۔ اس بحث کا باقی حصہ آئندہ درس میں انشاء اللہ بیان کیا جائے گا۔

درس ۱۴۲

فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۙ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ○ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ فَرَوْحٌ وَّ رَيْحَانٌ ۙ۵ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ○ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۙ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۭ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّاۗلِّيْنَ ۙ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۙ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ○ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۚ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ○

(پارہ ۲۷، رکوع ۱۶ کی آخری چند آیات، سورۃ الواقعہ)

ترجمہ۔ تو اگر تم کسی کے زیرِ اختیار نہیں ہو اور سچے ہو تو روح کو پھر کیوں نہیں دیتے۔ پھر اگر

وہ (مرنے والا) خدا کے مقربین میں سے ہوگا تو اُس کے لئے آرام و آسائش ہے غذائیں ہیں اور عیش کی جنت ہے۔ اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے (تو اُس سے کہا جائے گا) تیرے لئے امن و امان ہے کہ تو داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو (اُس کی مہمانی) کھولتا ہوا پانی ہے اور دوزخ میں جانا۔ یہ خبر سراسر حق اور یقینی ہے تو اسے رسول تم اپنے عظیم الشان پروردگار کی تسبیح کرو۔

ترجمہ کے بعد اب کچھ مشکل الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔ "مَدِيْنِيْنَ" دَانَ يَدِيْنُ سے اسم مفعول کا صیغہ ہے اور "دِيْن" سے بنا ہے۔

اس کے معنی ہیں۔ حساب، جزا، حکم و اقتدار، تدبیر و اطاعت۔ اس لحاظ سے "مَدِين" اُس کو کہا جائے گا جس کا حساب و کتاب کیا جائے یا اُسے جزا دی جائے۔ یا وہ محکوم اور زیر فرمان ہو۔ "مَدِين" جب "دَيْنٌ" سے بنایا جائے تو اس کے معنی مقروض یعنی جس پر کسی شخص کا قرضہ ہو اس کے آتے ہیں۔

"رَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ" اکثر و بیشتر مفسرین نے لفظ "روح" کو "ر" پر زبر ہی کے ساتھ پڑھا ہے جس کے معنی ہیں راحت و مسرت کے اور کچھ مفسرین نے "روح" پر پیش کے ساتھ قرائت کی ہے اس صورت میں اس کے معنی رحمت اور دائمی زندگی کے ہوں گے۔ "ریحان" سے مراد بھی بیشتر مفسرین نے رزق جنت یا خود جنت کو لیا ہے اور بعض نے خوشبودار پھولوں کو۔ "نعیم" سے مراد لذت و آرام ہے حضرت ابن عباسؓ نے اس سے مراد مغفرت و رحمت لی ہے۔

"اصحاب الیمین" سے مراد وہ لوگ ہیں جو نیک اعمال ہوں گے اور اپنے نامہ عمل کو داہنے ہاتھ میں لیں گے۔ "یمین" سے مراد داہنا ہاتھ ہے قرآن کریم میں اس کا ذکر کئی مقام پر ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے۔ فَمَنْ اُوْتِيَ كِتَابَهٗ بِيَمِيْنِهٖ فَاُولٰٓئِكَ يَقْرَءُوْنَ كِتَابَهُمْ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا (بنی اسرائیل رکوع ۸) جن لوگوں کا نامہ عمل اُن کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا وہ خوش خوش اُسے پڑھنے لگیں گے اور ان پر ریشہ برابر بھی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ اسی سورہ واقعہ کے پہلے رکوع میں اصحاب المیمنہ داہنے ہاتھ میں نامہ عمل لینے والے اور اصحاب الشمال بائیں ہاتھ میں اپنا نامہ عمل لینے والوں کا تفصیل سے ذکر موجود ہے

ان کو اصحابُ المیمنۃ۔ اور اصحاب المشئمۃ بھی کہتے ہیں۔ اس سورۂ کریمہ میں تفصیل کے ساتھ ان نیک اعمال لوگوں کے مرتبہ کا تذکرہ فرمایا گیا ہے جن کو ان کا اعمال نامہ ان کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اور ساتھ ہی اصحاب شمال یعنی بائیں ہاتھ میں نامۂ اعمال پانے والوں کی مذمت بھی فرمائی گئی ہے کہ وہ بہت برے لوگ ہوں گے اور خدا کی تمام نعمتوں سے محروم رہیں گے یہ لوگ عذاب جہنم میں گرفتار رہیں گے یہ اس کی سزا ہوگی کہ یہ لوگ دنیا کی زندگی میں اپنے شرک اور گناہوں پر اڑے رہتے تھے اور یہ خدا کی نشانیوں اور اس کی قدرت کا مذاق اڑایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ " اَئِذَا مِتْنَا وَکُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ○ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ۔ جب ہم مرجائیں گے اور ہماری صرف مٹی اور ہڈیاں رہ جائیں گی تو کیا اس کے بعد بھی ہم دوبارہ اٹھائے جائیں گے یا ہمارے اگلے باپ داداؤں کو پھر اٹھنا ہے۔

اے رسول ان سے کہدو کہ اگلے اور پچھلے سب کے سب لوگ روزِ معین پر زندہ کئے جائیں گے۔

" فَسَلٰمٌ لَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ " کی بہت سی تفسیریں کی گئی ہیں مگر زیادہ شہرت اسی مطلب کی ہے جیسے اکابر مفسرین نے لکھا ہے کہ اُس مرنے والے سے جو اصحاب یمینؑ میں سے ہوگا کہا جائیگا کہ تیرے لئے راحت ہی راحت ہے اور ہر آفت اور ہر خطرہ سے امن و امان ہے اس لئے کہ تو داہنے ہاتھ میں نامۂ اعمال لینے والوں میں سے ہے۔

" نُزُلٌ " کے معنی خود منزل کے بھی آتے ہیں اور مہمانی کے سامان کے بھی۔

" حَمِیْمٌ " نسبی رشتہ میں قربت رکھنے والے یعنی نزدیک کے رشتہ دار کو کہتے ہیں اس کے دوسرے معنی شدید گرم اور کھولتے ہوئے پانی کے بھی ہیں قرآن کریم میں یہ لفظ دونوں معانی میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں پر دوسرے معنی یعنی کھولتا ہوا پانی مراد ہے۔ تصلیۃ۔ صَلّیٌ سے بنایا گیا ہے اس کے معنی ہیں آگ میں ڈالنا، یہ مختصر تشریح تھی ان آیات مبارکہ کے الفاظ کی۔

ان آیتوں میں اُس سخت وقت کا ذکر ہے جو دنیا کی زندگی کی آخری ساعت میں انسان کے سامنے آتا ہے اور جو حالات اس کے ہوتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے کہ یا تو وہ خدا کا اطاعت گذار بندہ ہے اور مقرب بارگاہِ خداوندی ہے یا اُس سے کم درجہ کا اطاعت گذار ہے جس کے داہنے ہاتھ میں نامہ عمل دیا جائے گا یا وہ ان لوگوں میں ہوگا جو اپنی کم نصیبی سے معرفت خدا سے محروم تھے اور راہ حق سے غفلت میں رہے۔ اطاعت گذاروں اور مقرب بندوں کو رحمت کے فرشتے جنت کی خوشخبریاں سناتے

ہیں اور اگر مرنے والا حق کا منکر ہے اور اللہ کا نافرمان بندہ ہے تو اُس کی مہمانی جہنم کی آگ کے شعلوں سے ہوگی جن میں وہ جلتا رہے گا اور اُس کھولتے ہوئے جہنم کے پانی سے جس کے بارے میں حضرت ابن عباسؓ کی روایت کے یہ الفاظ ہیں " لو سقطت منہ نقطۃ علی جبال الدنیا لاذابتھا " اگر اُس کھولتے ہوئے پانی کا معمولی حصہ بھی دُنیا کے پہاڑوں پر گر جائے تو ان کو پگھلا ڈالے ۔ محمد بن کعب کہتے ہیں کہ مرنے والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ جنتی ہے یا جہنمی ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں دنیاوی زندگی اور آخرت کی حیات اور اس کے ساتھ ہی موت کے فلسفہ پر گہرے اشارے ہیں جن کو پوری تحقیق کے ساتھ سمجھنے کی ضرورت ہے

---

۱۴۱) فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۙ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ۙ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ۙ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ؕ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ ۙ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۙ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ ۝ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۶ کی آخری آیات ، سورۃ الواقعہ۔

ترجمہ ۔ پس اگر تم کسی کے زیر فرمان نہیں ہو اور سچے ہو تو روح کو پلٹا کیوں نہیں دیتے۔ پھر اگر وہ (مرنے والا) خدا کے مقربین میں سے ہوگا تو اُس کے لئے آرام ہے ، غذائیں ہیں اور چین کی جنت ہے۔ اور اگر وہ داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے (تو اُس سے کہا جائے گا) تیرے لئے امن و سلامتی ہے کہ تو داہنے ہاتھ والوں میں سے ہے اور اگر وہ جھٹلانے والے گمراہوں میں سے ہے تو اُس کی مہمانی کھولتا ہوا پانی اور دوزخ میں جانا ہے ۔ یہ بات بالکل حق اور یقینی ہے ۔ تو اے رسول تم اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کرو۔

یہاں سب سے پہلی بات جو خدا نے فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اگر تم کسی قادر مطلق اللہ کے زیرِ حکومت اور زیرِ فرمان نہیں ہو اور تمہیں ہر چیز اور ہر امر پہ اختیار و قدرت حاصل ہے تو پھر تم جسم سے نکلی ہوئی روح کو پلٹا دو۔ اگر اپنے دعوے میں سچے ہو۔ لیکن تم ایسا نہیں کر سکتے ورنہ پھر دنیا میں کوئی بھی نہ مرتا اور سب کے سب زندہ رہتے ۔ بلاشبہ کوئی موت کو نہیں روک

سکتا۔ کوئی روح کو نہیں پلٹا سکتا۔ جب موت کا وقت آجاتا ہے تو بے بسی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا بڑے بڑے اقتدار والے بادشاہ جن کے ایک اشارہ میں دُنیا زیروزبر ہو جاتی ہے۔ ملکوں اور قوموں کی قسمتیں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ موت کے وقت حسرت بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھتے ہیں مگر کوئی اُن کا ساتھ نہیں دیتا، کوئی انہیں موت کے ظالم پنجوں سے بچا نہیں سکتا، نہ تو کوئی اُنہیں مرجانے سے روک سکتا ہے اور نہ ان کی روح کو واپس کر کے اُنہیں زندہ کر سکتا ہے۔ دُنیا کے عظیم ترین بہادر اور دیو ہیکل اور طاقتور پہلوان جن کی بہادری اور قوت کے سکے جمے ہوئے تھے۔ اور جن کی ضرب شمشیر اور نعرہ جنگ کی کوئی شخص تاب نہ لاسکتا تھا۔ موت سے اُن کا بھی بس نہ چلا اور اُن کی روحیں بھی ان کے جسموں میں پلٹائی نہ جاسکیں۔ اگر وہ بااختیار نہ ہوتے اور کسی دوسری طاقت کے محکوم نہ ہوتے تو ہمیشہ زندہ رہتے اور نہ مرتے لیکن ایسا نہیں ہوسکا یہ اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ کوئی بااقتدار ہستی ایسی ضرور موجود ہے۔ جس کے سب ہی محکوم ہیں اور اُسی کے حکم اور مشیت سے روحیں جسموں میں ڈالی جاتی ہیں اور نکالی جاتی ہیں۔ کسی دوسرے میں یہ قدرت نہیں ہے کہ وہ جسموں میں روح ڈال سکے یا نکلی ہوئی روح کو واپس لاسکے۔

موت اسی کا نام ہے کہ جسم سے اُس کی روح جُدا ہو جائے اور جب روح الگ ہو جاتی ہے تو پھر جسم کے اندر وہ تنظیم باقی نہیں رہتی جو روح کی وجہ سے تھی اور جن اجزاء سے وہ جسم بنا تھا وہ سب آپس میں علیحدہ ہو کر منتشر ہو جاتے ہیں اور جسم کی مجموعی صورت فنا ہو جاتی ہے مگر خود روح فنا نہیں ہوتی اور باقی رہتی ہے اس لئے کہ جسم جس طرح مختلف قسم کے اجزاء سے بنتا ہے روح نہیں بنتی بلکہ وہ مجرّد ہوتی ہے یعنی اُس میں ترکیب اور اجزاء کا وجود نہیں ہوتا کیونکہ وہ ایک قوت ہے اور قوت مرکب نہیں ہوا کرتی اور جب وہ اجزاء سے ملکر نہیں بنتی تو پھر اُس میں اجزاء کے الگ الگ ہونے کا امکان ہی نہیں ہوسکتا۔ جس کو موت یا فنا کہتے ہیں۔ اس لئے روح کو فنا نہیں ہے بلکہ وہ جسم سے نکل جانے کے بعد باقی رہتی ہے سوائے ایسی صورت کے کہ خود خالق عالم اُسے اپنی قدرتِ کاملہ سے فنا کردے۔ یہ روح جب جسم سے نکلتی ہے تو اُن مخصوص صفتوں اور قوت و طاقت و علم و معرفت یا اچھے اور برے جیسے بھی صفات اُس نے مادی زندگی کی حالت میں حاصل کر لئے تھے۔ ان کو لیکر نکلتی ہے۔ اسلامی نظریہ اس سلسلہ میں یہ ہے کہ اس روح کے جسم سے نکلنے کے بعد آنے والی قیامت تک اُسے ایسے عالم میں رہنا ہوتا ہے

جو موت اور قیامت کے درمیان ہوتا ہے اور اُسے " برزخ " کہتے ہیں ۔ اس عالم میں اس روح کے اُن صفات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے جو اُس نے اپنی دنیاوی زندگی میں حاصل کئے تھے کیونکہ اس " برزخ " کی زندگی میں ان اچھی اور بری بنیادوں سے بھی وہ ضرور متاثر ہوتی رہتی ہے جو اُس نے اس دنیا میں چھوڑی ہیں جن کا ثواب یا عذاب اُس کو ملتا رہتا ہے ۔ قرآن کریم میں ان ہی نیک و بد ہر طرح کی بنیادوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے :

اِنَّا نَحْنُ نُحْیِی الْمَوْتٰی وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ (سورۃ یٰسین)

یقیناً ہم ہی ہیں جو مردوں کو زندہ کریں گے اور ہم لکھتے جاتے ہیں وہ اعمال بھی جو پہلے سے لوگ بھیجتے ہیں اور وہ اعمال بھی جو مرنے کے بعد وہ اپنے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ۔ مثلاً کسی نے کوئی مسجد بنوائی تو جب تک لوگ اس میں عبادت کریں گے اس مرنے والے کو بھی جس نے اُسے بنوایا تھا ثواب ملتا رہے گا ۔ کوئی مدرسہ قائم کیا ، کوئی کنواں بنوایا یا اسی طرح کے اور نیک آثار چھوڑے تو اس کا ثواب اگر اچھی بنیاد ہے اور عقاب اگر وہ کوئی بری بنیاد ہے اُس کے نامہ عمل میں لکھا جائے گا ۔ اس طرح عالم برزخ میں اس روح کے صفات میں فرق ہوتا رہے گا لیکن خود روح ہر حال میں باقی رہے گی مادی جسم سے الگ ہونے کے بعد ان روحوں میں کائنات کے اندر نقل و حرکت کی پوری قوت و صلاحیت ہوتی ہے ۔ اس کا ثبوت احادیث میں تفصیل سے موجود کائنات عالم میں ان روحوں کی قوت پرواز اور نقل و حرکت پر قدرت ہونا اس طرح آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ مختلف جسامتوں کی شعاعی لہریں ہم برابر دیکھتے ہیں کہ رات دن کائنات کی فضا میں پرواز کرتی ہیں اور وہ اپنی اسی مقدار اور اسی جسامت کے ساتھ خلا کی غیر محدود وسعت میں نقل و حرکت کرتی رہتی ہیں اگر یہ لہریں اپنے مرکز سے نکل کر بکھر جائیں اور فنا ہو جائیں تو ان کی کبھی گرفت نہ کی جا سکے ، اور ان سے کوئی کام نہ لیا جا سکے ۔ روح بھی ایک قوت و طاقت کا پیکر اور مجموعہ ہے ۔ اور وہ بھی اپنے مرکز یعنی مادی جسم سے نکل کر کائنات عالم میں پرواز کرتی ہے اور اس کی وسعت میں نقل و حرکت کرنے پر اُسے اللہ نے پوری قدرت عطا فرما دی ہے ۔ روحوں کی بقا پر احادیث میں بھی تفصیلات موجود ہیں اور قرآن کریم میں بھی مختلف صورتوں سے اس کو بتایا گیا ۔ اس کے لئے ایک خاص لفظ " خلود " یعنی دوام اور ہمیشگی قرآن مجید میں کثرت کیساتھ بولا گیا ہے جو جنت میں جانے والوں اور جہنم والوں سب کے لئے

استعمال ہوا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحیں فنا نہوں گی، سوائے اس وقت کے جب صورِ قیامت پھونکا جائے گا اور چند مخصوص ہستیوں کے علاوہ ساری کائنات کو فنا کردیا جائے گا اور دوسری مرتبہ پھر صور پھونکا جائے گا اور سب کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ نیک روحوں کی بقا اور اُن کا مرتبہ کتاب اللہ کے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے۔

"بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّھِمْ یُرْزَقُوْنَ فَرِحِیْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ" وہ فنا نہیں ہوتے بلکہ زندہ رہتے ہیں اور اللہ کی بارگاہ سے ان کو رزق ملتا رہتا ہے اور جو کچھ خدا نے ان پر اپنا فضل فرمایا ہے اس سے وہ بہت خوش ہیں۔

اور بری روحوں کی بقا اور انکی حالت آیت کے یہ الفاظ بتاتے ہیں۔ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا (المؤمن) وہ مرنے کے بعد ہر صبح و شام آگ کے سامنے پیش کئے جاتے ہیں

پیغمبر اکرمؐ اور اہلبیت کرام علیہم السلام کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب روحیں اپنے دُنیاوی جسموں کے مشابہ اور ملتے جلتے بدنوں میں رکھی جاتی ہیں جو حقیقت میں مادی جسم نہیں ہوتے اور فقط ظاہری حیثیت میں جسم نظر آتے ہیں۔ ان ہی کو "اجسام مثالیہ" کہا جاتا ہے، روح و نفس اور موت و حیات کے مسائل جہاں بہت گہرے ہیں وہاں ان کا سمجھنا بھی بے حد ضروری ہے اس لئے ان مسائل کو مختلف درسوں میں حسب موقع بیان کیا جاتا رہے گا تاکہ ان کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاسکے۔

(درس ۱۴۵)

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَھُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ○ لَہٗ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاھِرُ وَالْبَاطِنُ وَھُوَ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۰ کی ابتدائی چند آیات) (سورۃ الحدید)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو سارے آسمانوں اور زمین میں ہے خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اُسی کی ہے وہی جلاتا ہے اور وہی موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پہ قادر ہے وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی ہے اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

یہ سورۂ حدید کی ابتدائی چند آیات کا ترجمہ تھا اب ان کے بعض الفاظ کی تشریح سُنئے۔

"سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں وہ سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ تسبیح کے اصلی معنی ہیں۔ تمام برائیوں اور ہر نقص و عیب سے پاک ہونے کا اقرار کرنا پھر اس معنی میں اور وسعت ہو گئی اور تسبیح کا لفظ حمد و ثنا اور تعریف و توصیف میں استعمال ہونے لگا۔ مطلب یہ ہے کہ کائنات عالم کی ہر چیز خواہ وہ آسمانوں میں ہو یا زمین میں ہو اس کا اقرار کرتی ہے کہ اللہ ہر عیب اور برائی سے پاک و پاکیزہ ہے یہ اقرار کبھی اس ظاہری زبان سے ہوتا ہے اور کبھی زبانِ حال سے۔ اس طرح مخلوقات کی وہ چیزیں جو زبان رکھتی ہیں اپنی زبان سے اللہ کی تقدیس و تسبیح کرتی ہیں اور جو زبان نہیں رکھتیں اُن کا وجود اور اُن کی حالت خود اللہ کی جلالت و عظمت کا اظہار کرتی ہے۔ اور یہی اُن کی تسبیح ہے۔ اس "تسبیح" کے مفہوم میں مفسرین اور علماء نے بہت سی باتیں کہی ہیں لیکن اُن کی اکثریت اس پر اتفاق رکھتی ہے کہ یہاں اس سے مراد تسبیح کے اصلی معنی ہیں یعنی اپنی اپنی فطرت کے مطابق اور اپنی اپنی زبان میں ہر مخلوق خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ مخلوقات کی اسی اصلی تسبیح کا ذکر قرآن کریم کی دوسری آیتوں میں صاف طریقہ پر موجود ہے۔ سورۂ نور میں ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰہَ یُسَبِّحُ لَہٗ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَالطَّیْرُ صٰٓفّٰتٍ ط کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (الآیۃ)

(پارہ ۱۸ رکوع ۱۲) کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو آسمان اور زمین میں ہیں سب خدا کی تسبیح کرتے ہیں اور اُڑنے والے جانور پر پھیلائے ہوئے اُسی کی تسبیح کرتے ہیں۔ سب کو اپنی اپنی دعا اور اپنی تسبیح معلوم ہے۔

سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے۔ تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ

(پارہ ۱۵ رکوع ۵) ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ ان میں ہیں وہ سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ لیکن تم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کے ذکر میں پہاڑوں اور پرندوں کی تسبیح کو اس طرح بیان فرمایا گیا ہے:

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَہٗ یُسَبِّحْنَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِشْرَاقِ وَالطَّیْرَ مَحْشُوْرَۃً ط

ہم نے پہاڑوں کو بھی تابعدار بنا دیا تھا کہ وہ داؤدؑ کے ساتھ صبح و شام خدا کی تسبیح کرتے تھے اور تمام پرند بھی یاد خدا کے وقت سمٹ آتے تھے (پارہ ۲۳ رکوع ۱۱)
ان الفاظ سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تسبیح اپنے اصلی اور حقیقی معنی میں بولی گئی ہے اور زبانِ حال کی تسبیح اس سے مراد نہیں ہے۔

یہ امر سب جانتے ہیں کہ کسی چیز کا ہمارے علم میں نہ ہونا اس کی دلیل نہیں ہے کہ وہ چیز موجود ہی نہیں ہے۔ اس حقیقت کو سامنے رکھکر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ عالم کی وہ مخلوق جو ہماری طرح کلام کر سکتی ہے وہی اصلی معنی میں تسبیح کرتی ہے اور جو مخلوق بظاہر خاموش ہے وہ صرف زبانِ حال ہی سے تسبیح کرتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ خالق عالم نے ان چیزوں کو ایسی قوتیں عطا کی ہوں جن سے وہ اپنے اپنے انداز میں اور اپنی اپنی فطرت کے مطابق تسبیح کرتی ہوں اور ہم اُس تسبیح کو نہ سمجھتے ہوں چنانچہ ابھی ایک آیت تلاوت کی گئی تھی جس کا یہ جملہ " وَلٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ " مگر تم اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ بتاتا ہے کہ وہ تو حقیقی معنی میں تسبیح کرتے ہیں۔ لیکن دوسرے اُن کی تسبیح کو اپنی معرفت کی کمزوری اور فہم کی کمزوری اور علم کی کمی کی وجہ سے نہیں سمجھ سکتے۔

جہاں تک زبانِ حال کی تسبیح کا تعلق ہے اگر اُسے سمجھنے کی کوشش کی جائے تو ہر صاحبِ عقل اُسے سمجھ سکتا ہے۔ اور یہ بات ایسی تو نہیں ہے جو غور و فکر کے بعد سمجھ میں نہ آسکے اس لئے اس کے متعلق "وَلٰكِن لَّا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے " کا جملہ کہنا مشکل ہوگا البتہ یہ زیادہ واضح اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب تسبیح کے اصلی معنی مراد لئے جائیں کیونکہ اسے بے شک عام لوگ نہیں سمجھتے اور صرف وہی سمجھ سکتے ہیں جو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز ہوں یا علم و معرفت کا بلند ترین درجہ رکھتے ہوں۔

سورۂ نور میں انسانی بدن کے اعضاء کی گواہی کا ذکر موجود ہے: يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ قیامت کا وہ دن جب بدکاروں کے خلاف خود اُن کی زبانیں اُن کے ہاتھ اور پاؤں اُن کے بُرے افعال و اعمال کی گواہی دینگے۔ یہ بھی اسی سلسلہ کی ایک حقیقت ہے یعنی ہم بالکل نہیں سمجھ سکتے کہ ہمارے بے زبان اعضائے بدن ہمارے سارے اعمال کا جائزہ لینے میں ہر وقت مشغول ہیں اور جب قیامت آئے گی تو یہ بظاہر خاموش اعضاء بول بول کر ہر بات کی گواہی دینے لگیں گے۔

اسی طرح یہ بالکل ممکن ہے کہ ہم زمین و آسمان کی بے زبان مخلوق کی عبادتوں اور تسبیح و تہلیل کو نہ سمجھ سکیں اور وہ اپنے فرضِ عبادت کو پورا کر رہے ہوں۔

قرآنِ کریم کی واضح آیات کے علاوہ کثرت کے ساتھ حدیثوں میں پتھروں، درختوں اور ستاروں اور کائنات کی دوسری چیزوں کی تسبیح و عبادت کا بیان پایا جاتا ہے۔ حضرت پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معجزات میں پتھروں کا آپ کو سلام کرنا۔ سنگریزوں کا آپ کے دستِ مبارک پر آ کے تسبیح پڑھنا صحیح ترین روایات و احادیث میں موجود ہے اس لئے ہم صرف اپنے نہ جاننے اور معرفت نہ رکھنے کی وجہ سے اس حقیقت سے انکار کرنے کا حق نہیں رکھتے جب کہ کتاب اللہ کے اعلان کے ساتھ اقوال پیغمبر اکرمؐ نے اُس کی تائید بھی کی ہے اور محدثین اور مفسرینِ اسلام کی اکثریت اس کی تصدیق کرتی ہے۔ لیکن تسبیح کے اصلی معنی کے ساتھ ساتھ ظاہر ہے کہ زبانِ حال کی تسبیح بھی موجود ہے اور اس میں بولنے والے اور نہ بولنے والے سب ہی شریک ہیں۔ جس طرح ایک پتھر زبانِ حال سے وجود خدا اور اُس کی ذات کے کمال و عظمت پر گواہی دیتا ہے اسی طرح ایک انسان بھی بحیثیت ایک مخلوق ہونے کے اپنے خالق کا پتہ بتا رہا ہے چاہے وہ انسان اپنے مُنہ سے کچھ نہ کہے لیکن اُس کی ہستی، اسکی خلقت، اسکے اعضاء و جوارح میں باہمی مناسبت اور اُن کا ہر طرح دُرست اور برمحل، مناسب اور معتدل ہونا یہ سب چیزیں زبان حال سے ایک کامل خالق کی ہستی کا نشان بتاتی ہیں جس نے اُنہیں اپنی بے نظیر حکمت و تدبیر سے پیدا کیا ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سرکش انسان جو اپنی عقل سے صحیح طور پر کام نہیں لیتے خدا کے سامنے سر نہ جھکائیں اور اُس کی تسبیح و عبادت سے غافل رہیں اور اُس کی ذات کو نہ پہچانیں تو اس سے اللہ کی عظمت میں کیا فرق ہو سکتا ہے! یہ اُن کا ذاتی فعل اور فرض ناشناسی ہے جس کی انہیں سزا ملے گی۔ جبکہ کائنات عالم کی غیر محدود اور بے شمار مخلوق اُس ذات ذوالجلال والاکرام کے سامنے سرِ نیاز جھکائے ہوئے اپنا حق بندگی ادا کرنے کی کوشش میں مشغول ہے۔

(درس ۱۴۶)

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ○ هُوَ الْاَوَّلُ وَ الْاٰخِرُ وَ الظَّاهِرُ وَ الْبَاطِنُ وَ هُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ○

(پارہ ۲۷، رکوع ۱۷ کی ابتدائی چند آیات۔ سورۃ الحدید)

ہر وہ چیز جو سارے آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے وہی زندہ کرتا ہے اور وہی موت دیتا ہے، اور وہی ہر چیز پر قادر ہے وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

گذشتہ درس میں لفظ "تسبیح" کے مفہوم کو بیان کیا جا چکا ہے آج ان آیات مبارکہ کے دوسرے الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

"سماوات" "سماء" کی جمع ہے اور یہ لفظ "سُمُوّ" سے بنا ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں۔ اس لئے عربی زبان میں "سماء" ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو ہم پر سایہ کئے ہوئے ہو لیکن قرآن کریم اور حدیثوں میں جہاں کہیں اس لفظ کو بولا گیا ہے وہاں زیادہ تر وہ عظیم کُرّہ یعنی گول نیلی چھت مراد لی گئی ہے جو چاروں طرف سے ہماری زمین اور دوسرے سیاروں کو گھیرے ہوئے ہے۔ قرآنِ مجید نے اس نیلی چھت کو "دخان" فرمایا ہے۔ جس سے مراد بخارات ہیں، سورہ سجدہ میں ارشاد ہوا ہے: ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ هِیَ دُخَانٌ پھر اللہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں یعنی بخارات کا مجموعہ تھا۔ "ارض" کے لفظی معنی ہر اس چیز کے ہیں جس پر قدم ٹکتے ہوں مگر قرآن کریم اور احادیث میں اس لفظ کا استعمال خود ہماری اس زمین کے لئے بھی ہوا ہے اور دوسرے سیاروں کے لئے بھی چنانچہ سورۂ طلاق میں سات زمینوں کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّ مِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ" وہ خدا ہی تو ہے جس نے سات آسمان پیدا کئے اور ان ہی کے برابر یعنی سات زمینیں بھی پیدا کیں۔

احادیث میں ان سات آسمانوں اور زمینوں کی [illegible]ود ہے اور ان کے علاوہ دوسری بکثرت زمینوں کا بھی ذکر ہے۔

امام جعفر صادق علیہ السلام سے آسمانوں اور زمینوں کے متعلق دریافت کیا گیا۔

تو آپ نے فرمایا: "سبع سمٰوات لیس منھا سماء الا و فیھا خلق و بینھا و بین الاخریٰ خلق" ان سات آسمانوں میں سے کوئی آسمان ایسا نہیں ہے جس میں اللہ کی پیدا کی ہوئی مخلوق نہ ہو اور اس کے اور دوسرے آسمان کے درمیان بھی خدا کی مخلوق ہے۔

زمین کے متعلق پوچھا گیا تو فرمایا "سبع منھن خمس فیھن خلق من خلق الرب و اثنتان ھواء لیس فیھن شیء" ان سات زمینوں میں سے پانچ زمینوں میں پروردگار عالم کی پیدا کی ہوئی مخلوق موجود ہے اور ان میں سے دو زمینیں خالی ہیں

حضرت امیر المومنین علی بن ابیطالب علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے:

"ھٰذہ النجوم التی فی السماء مدائن مثل المدائن التی فی الارض" یہ ستارے جو آسمان میں نظر آتے ہیں ان میں ویسی ہی آبادیاں ہیں جیسی اس زمین میں موجود ہیں۔ قرآن کریم میں بھی آسمانوں اور زمین کی خلقت کا مختلف انداز میں کثرت کے ساتھ تذکرہ پایا جاتا ہے۔ چنانچہ زیر نظر آیات میں پھر فرمایا گیا ہے۔ "لہ ملک السمٰوات والارض" زمین اور آسمانوں میں اقتدار اور حقیقی بادشاہت صرف اللہ کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہم سچے مسلمان صرف اسی وقت ہو سکتے ہیں جب ہم پورے یقین کے ساتھ خدا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر لیں ورنہ ہمارا اسلام سے کوئی بھی تعلق نہ ہوگا اور جب اللہ کی بادشاہت کو دل سے مان لیں گے تو پھر ہمارا کوئی عمل اس کی مرضی اور اس کے حکم کے خلاف نہ ہو سکے گا۔ بے شک عالمین کی ہر چیز کا اصلی مالک صرف اللہ ہے اور آسمان و زمین کا ملک اسی کے لئے ہے۔

اسے صرف اتنا حق دیا گیا ہے کہ وہ جائز حدوں میں رہ کر کائنات کی چیزوں پر تصرف کر سکے جیسے کوئی نوکر یا غلام اپنے آقا کی اجازت حاصل کر کے ان چیزوں پر تصرف کرتا ہے جو اس کے آقا کی ملکیت ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ نوکر کا عمل ان چیزوں کے اصلی مالک کی مرضی کے خلاف نہ ہو اور وہ جو کچھ بھی کرے اس یقین کے ساتھ کرے کہ اسے اپنے مالک کے سامنے ہر بات کی جواب دہی کرنا ہوگی اور جو مال و دولت اس کے سپرد ہے اس کی ایک ایک پائی کا حساب پیش کرنا ہوگا۔

اس حقیقت کو دوسرے انداز میں یوں بھی فرمایا گیا ہے:

"اٰمنوا باللہ و رسولہ و انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ" اللہ اور اسکے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال و دولت میں اس نے تمہیں اپنا نائب بنا دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ انسان جن چیزوں کو اپنی ذاتی ملکیت سمجھتا ہے وہ درحقیقت

خدا ہی کی ملکیت ہے اور انسان کو کچھ شرطوں کے ساتھ اُسے استعمال کرنے کی اجازت دی گئی ہے جن میں سب سے بڑی شرط تو یہی ہے کہ اس تصرف میں خدا کی خوشنودی کا قطعی طور پر خیال رکھا جائے۔ اگر ہمیشہ ہمارے سامنے قرآن کریم کا یہ ارشاد ہے۔ تو ہم کبھی ناانصافی اور بے اعتدالی کے جرم کا ارتکاب نہیں کر سکتے۔ ہمارا یہ عقیدہ کہ ہم ایک علیم و خبیر بادشاہ کی نگرانی میں ہیں۔ ایک ایسے حاکم کے محکوم اور رعیت ہیں جو ہمارے ہر ظاہر و باطن کو جانتا ہے اور ہمارا کوئی عمل اُس سے چھپا ہوا نہیں ہے۔ ہم کو سیدھے راستہ سے بھٹکنے نہ دیگا اور ہمیں اپنی حد سے بڑھنے سے روکے گا۔ بے شک ہم خدا کے محکوم ہیں۔ اُس کے تابع فرماں ہیں اور وہ ہمارا حاکم ہے اسی نے ہمیں ہر چیز عطا فرمائی ہے یہاں تک کہ زندگی اور موت دینے والا بھی وہی ہے۔ "یحیی و یمیت" وہی موت دیتا ہے اور وہی پیدا کرتا ہے اور اس زندگی اور موت کی غرض بھی یہی ہے تاکہ ہمارے اعمال کی جانچ کی جائے۔ سورۂ "ملک" میں اسی کی طرف ان الفاظ میں اشارہ ہے:

الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوةَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا - اللہ نے موت اور زندگی دونوں ہی کو صرف اس غرض سے خلق فرمایا ہے تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں عمل کے لحاظ سے سب سے اچھا کون ہے۔ وہ قادرِ مطلق جسے زندگی عطا کرتا ہے اُسے عالم کی کوئی طاقت اُس سے محروم نہیں کر سکتی اور جس کی موت کا وقت آجاتا ہے اُسے کوئی ٹال نہیں سکتا۔

"ھُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ" وہ سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے جب کوئی بھی نہ تھا اُس وقت بھی وہی تھا اور جب کوئی نہ رہے گا جب بھی اسی کی ذات ہوگی اور وہ ظاہر بھی ہے، پوشیدہ بھی ہے۔ "ظاہر و باطن" دو مختلف معنی رکھنے والی لفظیں ہیں، جو ایک دوسرے کی ضد ہیں، یعنی جو ظاہر ہو وہ پوشیدہ نہیں ہو سکتا اور جو مخفی ہو وہ ظاہر نہیں ہو سکتا مگر اللہ کی ذات کے لئے جب ان لفظوں کو بولا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ وہ ہر اُس چیز کو جانتا ہے جو ظاہر ہے اور اسی طرح ہر اُس بات سے بھی واقف ہے جو پوشیدہ ہے۔ دوسرا مطلب اس کا یہ ہے کہ عالم کی ہر شئی اُس کے وجود کی دلیل ہے۔ عرش سے فرش تک اور ذرّہ سے دمکتے ہوئے سورج تک اور چمکتے ہوئے تاروں اور آسمانوں کی بلندی تک کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اُس کی ہستی اور اُس کے کمالِ قدرت کی نشانی نہ ہو۔ یہ تو اس کے ظاہر ہونے کا مفہوم ہے اور مخفی اس حیثیت سے ہے کہ اُس کی ذات اور صفات کی حقیقت تک عقل کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ وہ ظاہر ہے یعنی ہر

چیز پر غالب ہے اور کوئی شئی اس کے قبضۂ قدرت سے باہر نہیں ہے اور باطن یوں کہ اُس کے علم سے اوجھل ہو کر کسی دوسرے مقام پر کوئی پناہ نہیں لے سکتا۔ اسی بات کی طرف ایک دوسری آیت کے یہ الفاظ بھی اشارہ کر رہے ہیں "هُوَ مَعَكُمْ أَيْنَمَا كُنتُمْ" تم جہاں کہیں بھی ہو اس کا یقین رکھو کہ خدا تمہارے ساتھ ساتھ ہے اور تم اُس سے چھپنے پر قدرت نہیں رکھتے۔

(درس کلی) سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ لَهُ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۷ کی ابتدائی چند آیات سورۃ الحدید)

ترجمہ: ہر وہ چیز جو سارے آسمانوں اور زمین میں ہے اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور وہی غالب حکمت والا ہے، تمام آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اُسی کی ہے وہی زندہ کرتا ہے۔ وہی موت دیتا ہے اور وہی ہر چیز پر قادر ہے وہی سب سے پہلے اور سب سے آخر ہے۔ وہی ظاہر ہے اور وہی مخفی ہے اور وہ سب چیزوں کو جانتا ہے۔

گذشتہ درس میں "تسبیح" کے معنی اور مفہوم کی کچھ تشریح کی گئی تھی آج ان آیات مبارکہ کے باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

"سَبَّحَ لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ" جو چیزیں تمام آسمانوں اور زمین میں ہیں سب اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔ "سماوات" "سماء" کی جمع ہے یہ لفظ "سُمُوٌّ" سے بنا ہے جس کے معنی بلندی کے ہیں اس لئے ہر وہ چیز جو ہم پر سایہ کئے ہوئے ہو اور ہم سے اونچی ہو اُسے "سماء" کہتے ہیں اسی طرح "ارض" کے لفظی معنی ہر اُس چیز کے ہیں جس پر ہمارے قدم ٹکتے ہوں۔ اسی مفہوم کو علامہ طبرسیؒ نے تفسیر مجمع البیان میں ان الفاظ کیساتھ بیان فرمایا ہے: كُلُّ مَا عَلَاكَ وَأَظَلَّكَ فَهُوَ سَمَاءٌ وَكُلُّ مَا اسْتَقَرَّ عَلَيْهِ قَدَمُكَ فَهُوَ أَرْضٌ۔ عربی زبان میں ہر وہ چیز جس میں بلندی پائی جائے اُس کو اسی لحاظ سے "سماء" کہا گیا ہے۔ اسی بنا پر گھوڑے کی پشت اور اس کے پیٹ کو بھی "سماء" اور "ارض" کہتے ہیں۔ گھوڑے کی تعریف میں عربی کا ایک مشہور شعر ہے:

وَأَحْمَرُ كَالدِّيبَاجِ أَمَّا سَمَاؤُهُ
فَرَيًّا وَأَمَّا أَرْضُهُ فَمُحُولُ

وہ ریشم کی طرح سرخ ہے اس کا سمار یعنی اس کی پیٹھ نرم اور گوشت سے بھری ہوئی ہے اور اس کی "ارض" یعنی پیٹ کی طرف کا حصہ خشک اور سخت ہے۔ اس شعر میں طفیل غنوی۔ شاعر نے "ارض وسمار" کی لفظیں گھوڑے کی پشت اور اس کے پیٹ کے لئے بولی ہیں۔ اسی طرح مینہہ، ابر، فضا، بلند، مکان کی چھت وغیرہ کو بھی "سماء" کہا جاتا ہے۔ اسی مناسبت کی بنا پہ ہر چیز کو "سماء" اس کے نیچے کی چیزوں کے لحاظ سے کہا جاتا ہے بہر حال "سمار" کے معنی ہیں بلندی اور "ارض" کے معنی ہیں نیچے ہونے کا تصور ضروری ہے۔

یہ عربی زبان میں ان لفظوں کے عام استعمال کا ذکر تھا۔ اب رہی یہ بات کہ شریعت اسلام نے ان سے کیا مراد لیا ہے۔ اس سلسلہ میں تحقیق کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ شریعت کی زبان میں لفظ "سمار" تین معنوں میں بولا جاتا ہے۔ ایک وہ بلند فضا جو بھیر کے مادہ سے بھری ہوئی ہے۔ دوسرے خود وہ ستارے جو زمین کے گرد گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تیسرے وہ عظیم چھت اور کروی یعنی گول سطح جو ہماری زمین اور اس زمین کے اوپر کے بڑے بڑے ستاروں کو گھیرے ہوئے معلوم ہوتی ہے۔ اسی عظیم نیلی چھت کے متعلق جو ایک بڑے سمندر کی طرح چاروں طرف سے زمین کو گھیرے ہوئے ہے علم ہیئت کے جاننے والوں میں شدید اختلاف ہوا ہے کہ یہ اصل میں کیا ہے۔ پندرھویں صدی عیسوی تک مشہور ماہر علم ہیئت، بطلیموس کا یہ خیال لوگوں کے دماغوں پر چھایا رہا کہ آسمان ایک شفاف جسم ہے اور یہ ایک ہی طرح کے بڑے وسیع سات گول جسم ہیں جو اس ہماری زمین کے اوپر ہیں ان ساتوں آسمانوں میں ایک ایک سیارہ ہے آٹھواں آسمان ان سب کو گھیرے ہوئے ہے اور اسی میں چھوٹے تارے ہیں۔ ان سب کے اوپر نواں آسمان ہے جس کی چوڑائی کی کوئی حد نہیں بتائی جاسکتی اس پر کوئی ستارہ نہیں ہے اسی کو "فلک اطلس" کہتے ہیں۔ بطلیموس اور ان کے ہم خیال قدیم لوگوں کی تحقیق یہ تھی کہ زمین ساکن ہے اور تمام سیارے اس کے گرد گھومتے رہتے ہیں ان کا یہ بھی خیال تھا کہ زمین پر ہوا چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے ہے اور ہوا کو آگ گھیرے ہوئے ہے۔ اس کے بعد وہ آسمان ہے جس میں فقط چاند ہے۔ لیکن سولھویں صدی عیسوی میں مشہور ماہر فلکیات کوپرنک" کی تحقیقات کی شہرت ہوئی جس نے زمین کو ٹھہرا ہوا ماننے سے انکار کر دیا اور کہا کہ زمین خود بھی ایک ستارہ ہے جو سورج کے گرد گھومتا ہے اور خود بھی گھومتا رہتا ہے۔ کچھ عرصہ بعد یعنی سترہویں صدی عیسوی میں اٹلی کے ماہر علم ہیئت گیلیلیو Galileo

لے مختلف آلات، استعمال کر کے اس خیال کو بے حد ترقی دی جس کے سامنے پچھلے نظریات کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی۔ جدید تحقیقات کی بنا پر سورج زمین کے گرد نہیں گھومتا بلکہ وہ خود اپنے محور ہی پر گھومتا ہے اور اگر اس میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف حرکت ہے بھی تو اُس کے ساتھ اس کا پورا نظام شمسی اُسی سمت میں حرکت کرتا ہے جدھر خود سورج چلتا ہے۔ یہ مسائل بہت تفصیل چاہتے ہیں جن کو جدید تحقیقات کے مطابق بیان کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے۔

تمام سیارے جو سورج کے گرد گھومتے ہیں بخارات سے گھرے ہوئے ہیں۔ ان ہی بخارات کو زبانِ شریعت میں آسمان کہا گیا ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق آسمان کوئی جسم نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ہی قرآن وحدیث کے ارشادات سے زمین کی حرکت بھی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا بالکل گول ہونا بھی۔ ان میں سے بہت سی باتیں قدیم سائنسدانوں کے نظریات کے صاف طور پر خلاف اور جدید ترین تحقیقات کے موافق ہیں اور کچھ چیزیں ایسی بھی ہیں جن کی ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی ہے۔ ممکن ہے کہ آئندہ سائنس کی ترقی اُن باتوں کی بھی تصدیق کرنے کی عزت حاصل کرے جس کی اب سے تقریباً چودہ سو سال پہلے نبیؐ مدنی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بغیر کسی آلہ کی مدد کے خبر دی تھی۔

قدیم نظریات کے خلاف قرآن حکیم نے آسمان کو "دُخان" یعنی دھواں فرمایا ہے۔ ثُمَّ اسْتَوٰىٓ اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ۔ (حم السجدہ) پھر خدا آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا۔

اور حدیثوں میں اس کی تفصیل بھی بتا دی گئی ہے کہ اس دھوئیں سے مراد بخارات ہیں۔

نزول قرآن کریم سے سیکڑوں سال پیشتر آسمانوں کے متعلق یونان اور ممالک شرق اوسط کے محققوں نے جو نظریات پیش کئے تھے اور جنہیں اُس وقت کی دُنیا کے تمام لوگ حرف آخر سمجھ رہے تھے قرآن کریم نے اُن کے خلاف اس حقیقت کا اعلان فرمایا کہ آسمان اصل میں شیشے کی طرح کوئی شفاف جسم نہیں ہے بلکہ یہ نام اُن بخارات کے سمندر کا ہے جو زمین اور دوسرے سیاروں کے گرد پھیلا ہوا ہے اور اُن کو گھیرے ہوئے ہے۔ اسلام کے اس اعلان کے تقریباً ایک ہزار برس بعد بے شمار وقت اور دولت صرف کر کے اور عظیم ترین آلات کی مدد سے وہی بات معلوم کی گئی ہے جو قرآن کریم اور پیغمبر مدنیؐ نے ارشاد فرمائی تھی۔ اور ابھی بہت کچھ معلوم کرنا باقی ہے۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَی اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۰ کی ابتدائی چند آیات۔ سورۃ الحدید)

ترجمہ :- وہی ہے جس نے سارے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا پھر عرش پر قائم ہوا۔ جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو چیز آسمان سے اُترتی ہے اور جو اس کی طرف چڑھتی ہے وہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ رہتا ہے خواہ تم لوگ کہیں بھی رہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اُسی کے لئے ہے اور اللہ ہی کی طرف سب کام پلٹتے ہیں۔ یہ تو ان آیاتِ مبارکہ کا لفظی ترجمہ تھا لیکن ان کے بعض الفاظ کی تشریح کرنا ضروری ہے تاکہ ان کا مطلب واضح ہو سکے۔

"فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ" اللہ نے آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں خلق فرمایا۔ "یوم" جس کی جمع اَیّام ہے اُس پورے وقت کو کہتے ہیں جو سورج کے نکلنے اور اس کے غروب ہو جانے کے درمیان ہوتا ہے مگر چونکہ اُس وقت سورج کی بھی خلقت نہ ہوئی تھی اس لئے آیت میں ان دنوں سے مراد وہ دن تو ہو ہی نہیں سکتے جن کا مفہوم آفتاب کے طلوع غروب سے وابستہ ہے اس لئے یقینی طور پر ان سے مراد اتنا وقت ہے جو چھ دنوں کے برابر ہو سکتا ہے ایسی صورت میں جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے ان سے مراد ہمارے دنوں کی مقدار وقت ہے اور حضرت ابن عباس رضوان اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ ایک ایک دن سے ہمارے ایک ایک ہزار برس کی مدت مراد ہے۔

قرآن کریم کے سورۂ حج میں ارشاد ہوا ہے : وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ۔ بے شک تمہارے پروردگار کے نزدیک۔ ایک دن تمہاری گنتی کے اعتبار سے ایک ہزار برس ہے۔ اکثر و بیشتر علماء نے ان چھ دنوں سے اسی تفسیر کی بنا پر چھ ہزار سال مراد لئے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آسمان و زمین دفعتہً بنا کر نہیں کھڑے کئے گئے بلکہ رفتہ رفتہ بنائے گئے۔

اس میں بھی یہ مصلحت تھی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور تخلیق کا کمال پوری طرح ظاہر ہوسکے۔ کسی چیز کو آہستہ آہستہ بنتے ہوئے اور ایک حالت سے دوسری کیفیت اور حالت پر اس کو بدلتے ہوئے دیکھ کر اس چیز کے صفات پر ہم کو تفصیل کے ساتھ غور و فکر کرنے کا موقع حاصل ہوجاتا ہے اس کے برخلاف اگر وہی شئی دفعتہً اور ایک لمحہ میں بنکر ہمارے سامنے آکھڑی ہو تو ہم اس کی خلقت کے رازوں کو سمجھنے پر پوری قدرت حاصل نہ کرسکیں گے اور نہ اس کے کمالات کی تفصیل سے آگاہ ہوسکیں گے۔ اس لئے کبھی اُس نے درجہ بدرجہ اور رفتہ رفتہ چیزوں کو بنایا تاکہ ان کی خلقت کے کمالات پر غور و فکر کا موقع مل سکے اور کبھی یہ بتانے کے لئے کہ وہ آہستہ آہستہ خلق کرنے ہی کا پابند نہیں ہے بلکہ وہ ایک لمحہ میں بھی جس چیز کو چاہے پیدا کرسکتا ہے فرماتا ہے:

اِنَّمَآ اَمْرُهٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَيْئًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ (سورہ یٰسین)

اُس کا حکم اور یہ امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرے تو کہدیتا ہے کہ ہوجا اور وہ فوراً ہوجاتی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالمین کی چیزوں کی پیدائش دو طرح سے ہوتی ہے۔ کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی دفعتہً اسی کی طرف سورۂ اعراف میں اس جملہ سے اشارہ فرمایا گیا ہے:

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ

اس طرح امر اور خلق دونوں باتیں اُسی کے لئے ہیں۔ مخلوقات کے پیدا کرنے میں کبھی اللہ نے اپنی شان "کن فیکون" دکھائی اور جسے چاہا ایک لمحہ میں پیدا کردیا اور کسی مخلوق کو درجہ بدرجہ اور آہستہ آہستہ خلق فرمایا۔

"ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ" اس کے بعد وہ عرش پر قائم ہوا۔ "عرش" کے لفظی معنی جیسا کہ علامہ راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں تحریر کیا ہے ہر اُس چیز کے ہیں جو چھت کی طرح کوئی سطح رکھتی ہو اسی لئے تخت کو بھی عرش کہا جاتا ہے۔ اس معنی کے علاوہ اس لفظ کو دوسرے معانی میں بھی بولا گیا ہے۔ مثال کے طور پر کبھی عرش بول کر ایک ایسا عظیم کروی یعنی گول جسم مراد لیا جاتا ہے جو عالم کے سارے ہی جسموں کو گھیرے ہوئے ہو اور کبھی اس سے خود وہ عظیم جسم اور ساتھ ہی وہ تمام اجسام اور کل مخلوقات کا مجموعہ مراد لیا گیا ہے جو اس کے اندر گھری ہوئی ہے اور کبھی اس سے اللہ کی ذات کے سوا جو کچھ ہے تمام عالمین میں وہ سب مراد ہوتا ہے یعنی کل عالم ارواح اور سارا عالم اجسام عرش ہے

کبھی عرش بول کر اللہ جلّت قدرتہ کا علم مراد ہوتا ہے جو تمام کائنات پر محیط ہے اور کہیں "عرش" کی لفظ سے حکومت و اقتدار کو مراد لیا جاتا ہے۔ ان سب معانی کی طرف احادیث و قرآن میں اشارات موجود ہیں جن کی تفصیل بیان کرنے کے لئے کافی وقت کی ضرورت ہے۔ لیکن اس آیۂ کریمہ میں چھت رکھنے والا کوئی جسم یا کوئی تخت مراد نہیں ہے جو خدا کو اٹھائے ہوئے ہو۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں عرش الہٰی کی حقیقت انسان کے فہم سے بالاتر ہے اور وہ بادشاہوں کے عرش یعنی تخت کی طرح نہیں ہے جیسا کہ ناواقف لوگ خیال کرتے ہیں کیونکہ اس صورت میں تو عرش خدائے برتر و عظیم کو اٹھانے والا قرار پائے گا اور خدا کی ذات اس امر سے پاک ہے کہ کوئی چیز اُسے اُٹھا سکے خود قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے: اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِهٖ "خدا ہی آسمانوں اور زمین کو تھامے رکھتا ہے۔ کہ وہ اپنی جگہ سے ہٹ نہ جائیں اور اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو خدا کے سوا کوئی ایسا نہیں ہے جو انہیں روک سکے۔ عالم اسلام کے تمام اکابر مفسرین نے بالاتفاق اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ عرش الہٰی سے مراد کوئی مخصوص جسم نہیں ہو سکتا۔ جو اللہ کی ذات کو اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہو بلکہ اس سے مراد اُس کا اقتدار اعلیٰ ہے جو کائنات کی ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور کوئی شئی اُس کے اس اقتدار و حکومت سے باہر نہیں ہو سکتی۔

"استواء" کے معنی برابر ہونے کے بھی ہیں اور غلبہ کے بھی۔ یہاں پر دونوں ہی معنی مراد ہیں یعنی تمام کائنات پر اُس کی حکومت و سلطنت ہے اور ہر مخلوق خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی اُس کے زیر حکومت و اقتدار ہوتے ہیں برابر کی حیثیت رکھتی ہے اور وہ ان سب کا تنہا بادشاہ اور مالک و مختار ہے جسے چاہے پیدا کرے، جسے چاہے باقی رکھے اور جس کو چاہے فنا کر دے کوئی دوسرا اس کے اقتدار و حکومت میں شریک نہیں ہے۔

دنیاوی بادشاہوں کی تخت نشینی ہوتی ہے تو اس کا مطلب بھی یہ نہیں ہوتا کہ ایک سجے ہوئے تخت پر انہیں بٹھا دیا جائے اور بس بلکہ اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی حکومت و اقتدار کو ان کی مملکت پر ظاہر کر دیا جائے۔ "استواء علی العرش" میں یہ مفہوم اقتدار بدرجۂ کمال موجود ہے جسکی کوئی نسبت یا مشابہت مخلوقات سے کسی طرح نہیں دی جا سکتی اور اس کا واضح ترین مطلب یہی ہے کہ

اللہ کی حکومت وسلطنت سے کائنات عالم کی کوئی چیز باہر نہیں ہوسکتی اور اُسے عالم جسم و روح آسمانوں اور زمین بلند وپست غرض جو کچھ بھی اُسکی عظیم ذات کے سوا تمام عالمین میں ہے سب پر اُسی کو اقتدار کامل حاصل ہے اور ہر قسم کے مالکانہ اور شہنشاہانہ اختیارات کا حق صرف اُسی کی ذات کے لئے مخصوص ہے اور اس کی کوئی تشبیہ مخلوقات کے صفات سے نہیں دیجاسکتی لیس کمثلہ شیئٌ وھو السمیع البصیر۔

(درس ۱۴۹)

هُوَ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِىْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِى الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ○ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ○

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۷ کی ابتدائی چند آیات ۔سورۃ الحدید)

وہی اللہ ہے جس نے تمام آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں خلق کیا پھر عرش پر قائم ہوا۔ جو چیز زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اُس سے نکلتی ہے اور جو شئے آسمان سے اُترتی ہے اور جو اُس کی طرف چڑھتی ہے وہ سب کو جانتا ہے اور وہ تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ جہاں کہیں بھی تم رہو اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو خدا اُسے دیکھ رہا ہے۔ سارے آسمانوں اور زمین کی سلطنت اُسی کے لئے ہے اور خدا ہی کی طرف سب کام پلٹتے ہیں۔

ان چھ دنوں کی تشریح اور خدا کے عرش پر قائم ہونے کے معنی گذشتہ درس میں بیان کئے جاچکے ہیں۔ اب ان کے باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

"یلج" کا مصدر "وُلُوج" ہے جس کے معنی ہیں کسی تنگ جگہ میں داخل ہونا۔ قرآنِ کریم میں ہے:

"حتّٰی یَلِجَ الجَمَلُ فی سَمِّ الخیاط (۷-۴۰) جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا اور ان سے سرتابی کی نہ ان کے لئے آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے اور نہ وہ بہشت ہی میں داخل ہونے پائیں گے یہاں تک کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں داخل ہوکر نکل جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح اونٹ کا سوئی کے ناکے میں داخل ہونا محال ہے اسی طرح آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور ان سے سرکشی کرنے والوں کا بہشت میں جانا بھی محال ہے۔

اس بنا پر "یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ" سے مراد یہ ہے کہ اللہ ہر اُس چیز کو جانتا ہے جو زمین کے اندر کسی طرح بھی داخل ہوتی ہے خواہ وہ بارش کے قطرے ہوں یا درختوں اور جڑی بوٹیوں کے بیج ہوں یا جواہر کے خزانے ہوں، ستاروں کی شعاعوں کے اثرات ہوں یا زندہ اور مردہ حیوانی یا کسی اور طرح کے جسم ہوں" وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا" اور جو کچھ بھی زمین سے نکلتا ہے وہ سب کچھ خدا کے علم میں ہے۔ اس سے قبل کی آیات میں اور خود ان آیتوں میں بڑے خوبصورت اور دل نشین طریقہ پر تین باتوں پر بار بار زور دیا گیا ہے۔ ہر چیز کا حقیقی خالق صرف اللہ ہے۔ ہر چیز پر اُسی کی حکومت ہے اور ہر شئی کا اس کو علم ہے۔ اپنے علم کی وسعت کے لئے پہلی آیات میں "اَلظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ" اور " وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ" کے جملوں کو ارشاد فرما کر خدا نے انسان کو فکر و نظر کی دعوت دی ہے اور اب اُس عظیم علم کی کچھ تفصیل بیان فرمائی کہ وہ زمین کے اندر آنے والی اور اُس سے باہر نکلنے والی ہر چیز کو جانتا ہے" وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا" اور جو چیزیں آسمان سے اُترتی اور جو اُس کی طرف چڑھتی ہیں وہ سب کو جانتا ہے" وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ" اور وہ اپنے وسیع علم کے اعتبار سے تمہارے ساتھ ہے یعنی تمہارا نگہبان ہے اور تمہارے تمام اعمال و افعال کو گویا دیکھ رہا ہے۔ جو بھی ہوں اور جیسے بھی اور جہاں بھی ہوں۔ اور عمل کرنے والے بھی خواہ آبادیوں میں ہوں یا ویرانوں میں ہوں، دن کے اُجالے میں ہوں یا اندھیری راتوں میں۔ دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے ہوں یا خلوت کی تنہائیوں میں۔ کہیں بھی رہیں مگر اللہ کے علم سے باہر نہیں ہو سکتے اور وہ ان کے ہر عمل سے اس طرح واقف ہے کہ گویا اُن کے ساتھ ساتھ ہے۔ حضرت ابوذرؓ سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا تھا۔ "یَا اَبَاذَر اُعْبُدِ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ وَاِنْ كُنْتَ لَا تَرَاهُ فَاِنَّهٗ یَرَاكَ" اے ابوذر خدا کی اس طرح عبادت کیا کرو گویا تم اُس کو دیکھ رہے ہو یعنی تمہاری عبادت میں ایسا خلوص ہو اور ایسی شان بندگی پیدا ہو جائے جو صرف اُس وقت ہوتی جب تم خدا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ وہ تمہارے سامنے ہے اور تمہاری عبادت کو دیکھ رہا ہے۔ جن لوگوں کو اسکا یقین ہو کہ وہ حاکم وقت کی نگاہوں کے سامنے ہیں وہ اس کے احکام کی تعمیل میں کتنی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے فرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی کوتاہی، سستی اور غفلت نہیں کرتے کیونکہ وہ اپنے حاکم کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں اور پھر خدا تو ایسا بادشاہ اور

حاکم ہے جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے۔ تم بھی اپنے اعمال اور عبادتوں میں ایسی ہی سچائی اور خلوص کا جذبہ پیدا کرو گویا تم خدا کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہو پھر فرماتے ہیں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ سکتے (اور یہ حقیقت بھی ہے کہ اس کو دیکھا نہیں جا سکتا اس لئے کہ وہ جسم نہیں رکھتا جسے دیکھنا ممکن ہو) تو ایسی صورت میں اے ابوذر اس بات کا بہر حال یقین رکھو کہ وہ تو تمہیں ضرور دیکھ رہا ہے یعنی اُس کے علم سے تمہارا کوئی عمل چھپ نہیں سکتا۔

علامہ ابن کثیر نے بھی اس حدیث کو دوسرے عنوان سے تحریر فرمایا ہے اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی یا رسول اللہ مجھے حکمت وعقل کی کوئی ایسی بات تعلیم فرماتیے کہ میری زندگی سنور جائے آپ نے ارشاد فرمایا کہ اللہ کا لحاظ کرو اور اس سے شرم وحیا کرو جیسے تم کسی اپنے قریبی رشتہ دار اور صالح ترین عزیز کا لحاظ رکھتے ہو جو تم سے کسی لمحہ میں بھی الگ نہ رہتا ہو۔ مقصود رسالت یہ تھا کہ اگر تم خدا کے حاضر وناظر ہونے اور تمہارے اعمال سے باخبر ہونے پر کم از کم اتنا بھی یقین رکھو گے تو کبھی برائیوں کے قریب نہ جاؤ گے اور گناہ کا ارتکاب نہ کرو گے۔ حضرت عمرؓ ورانبیار سے کسی نے "تزکیۂ نفس" یعنی نفس کو پاک کرنے کے معنی دریافت کئے تو آپ نے فرمایا "یعلم ان اللہ معہ حیث کان" انسان اس بات پر یقین رکھے کہ خدا ہر جگہ اس کے ساتھ ہے۔ یہ امر پوری طرح ظاہر ہے کہ خدا کا اپنے بندوں کے ساتھ ہونا اس طرح تو ہو ہی نہیں سکتا جس طرح ایک جسم دوسرے جسم کے ساتھ رہتا ہے بلکہ اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اللہ اپنے وسیع علم کے اعتبار سے گویا ہمارے ساتھ ہے اور اُسے ہمارے اعمال کی پوری طرح اطلاع ہے۔ علم خدا کی وسعت کو قرآن کریم نے طرح طرح سے بیان فرمایا ہے تاکہ انسان ایک لمحہ کے لئے بھی اس کا تصور نہ کر سکے کہ وہ اپنے کسی عمل کو بھی اللہ سے مخفی رکھنے پر قدرت رکھتا ہے۔

سورۂ انعام میں خدا کا ارشاد ہے: وَعِندَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ وَمَا تَسْقُطُ مِن وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ ۝ اُس کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جن کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو کچھ زمین اور سمندروں اور دریاؤں میں ہے اس کو بھی وہی جانتا ہے۔ اور درخت سے کوئی پتا تک نہیں گرتا جسے وہ جانتا نہ ہو اور نہ زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ اور نہ کوئی ہری اور خشک چیز ہے مگر یہ کہ وہ خدا کی نورانی

کتاب میں موجود ہے۔ یعنی خدا کے علم میں ہے۔ پھر سورۂ قٓ میں فرماتا ہے۔ وَ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَ نَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ○ بے شک ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو خیالات اُس کے دل میں گذرتے ہم اُن کو جانتے ہیں اور ہم تو انسان کی رگِ گردن سے بھی زیادہ، اُس سے نزدیک ہیں۔

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ تمام اچھے اور بُرے اعمال کی ابتدا اُن کے تخیل سے ہوا کرتی ہے پہلے کسی چیز کا خیال پیدا ہوتا ہے پھر اُس میں قوت پیدا ہوتی ہے پھر وہ ارادہ اور نیت کی شکل اختیار کرتا ہے اور آخر میں وہ عمل کی صورت میں ظاہر ہو جاتا ہے۔ اگر تصور اور خیال ہی کی اصلاح کر دی جائے تو برائیوں کا وجود ہی نہ رہے۔ اسلام نے مادی سزاؤں پر بھی زور دیا ہے لیکن نیت و تخیّل کی اصلاح کی طرف بڑی شدت سے توجہ کی ہے اور اصلاحِ کردار کے اس طریقہ کو اختیار کرنے میں دُنیا کی دوسری اصلاحی تحریکوں کے مقابلہ میں اسلام کو بڑی برتری حاصل ہے۔ ان آیاتِ کریمہ میں بھی انسانی کردار کی اصلاح کے لئے اُن بنیادی اصول کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جن سے زیادہ موثر کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہو سکتا۔

ایک تو اس کا یقین رکھنا کہ انسان خود کسی چیز کا مالک نہیں ہے بلکہ ہر شئی کا حقیقی مالک صرف اللہ ہے دوسرے تمام کائنات کا اقتدارِ اعلیٰ صرف اُسی کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ اور اُسے جزا اور سزا دینے کا پورا اختیار حاصل ہے نہ اُس کے فیصلوں کو کوئی بدل سکتا ہے اور نہ اُن کے عمل میں آنے سے اُنہیں کوئی روک سکتا ہے اور آخر میں اس کا یقینِ کامل کہ وہ ہمارے ہر عمل سے واقف ہے بالکل اسی طرح جیسے کوئی ہمارے ہر وقت ساتھ ساتھ ہو بلکہ وہ دلوں میں گذرتے ہوئے خیالات سے بھی واقف ہے اور پھر اُس نے اس کا بھی پورا یقین دلایا ہے کہ اچھے اور بُرے اعمال کی جزا اور سزا دینے میں پورے عدل و انصاف سے کام لیا جائے گا:۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ○ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ○

جو شخص ذرّہ برابر بھی نیکی کرے گا وہ اُس کو دیکھ لے گا اور اسی طرح) جو ذرّہ برابر برائی کرے گا وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔ یعنی پورے انصاف کیساتھ نیکی اور بدی کے نتیجے عمل کرنے والوں کے سامنے آجائیں گے۔

اسلام نے کردارِ انسانی کی اصلاح کے یہ بنیادی اصول بتا دیئے ہیں اور یقیناً ان سے زیادہ موثر دوسرا کوئی طریقہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔

(درس ۱۵۰)

یُولِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُولِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ ؕ وَ ہُوَ عَلِیۡمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوۡرِ ○ اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَ اَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ ○ وَ مَا لَکُمۡ لَا تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ ۚ وَ الرَّسُوۡلُ یَدۡعُوۡکُمۡ لِتُؤۡمِنُوۡا بِرَبِّکُمۡ وَ قَدۡ اَخَذَ مِیۡثَاقَکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ ○

(پارہ ۲۷، رکوع ۱۷ کی درمیانی چند آیات۔ سورۃ الحدید)

ترجمہ: وہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور وہ دل کے بھیدوں تک سے خوب واقف ہے (لوگو) خدا اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور جس (مال) میں اُس نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے اُس میں سے خرچ کرو تو جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور (راہِ خدا میں) خرچ کرتے رہے اُن کے لئے بڑا اجر ہے اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم خدا پر ایمان نہیں لاتے ہو حالانکہ پیغمبر تم کو بلا رہا ہے کہ تم اپنے پروردگار پر ایمان لے آؤ، اور اگر تم اُس بات کو مانو اور باور کرو تو خدا تم سے اقرار لے چکا ہے۔

"یُولِجُ الَّیۡلَ فِی النَّہَارِ وَ یُولِجُ النَّہَارَ فِی الَّیۡلِ" مطلب یہ ہے کہ اللہ کبھی تو رات کے کچھ حصہ کو گھٹا کر اُسے دن میں داخل کر دیتا ہے جس کی وجہ سے دن کی مدت بڑھ جاتی ہے اور کبھی دن کا کچھ وقت کم کر کے رات میں ملا دیتا ہے اور رات بڑی ہو جاتی ہے۔

اس جملہ سے سیارہ زمین کی آٹھ قسم کی حرکت میں سے اُس مخصوص حرکت کی طرف اشارہ ہے جس کا سورج کے گرد سالانہ دورہ (۳۶۵) دن ۶ گھنٹہ ۸ منٹ اور ۳۸ سکنڈ میں پورا ہوتا ہے جس کی وجہ سے سال اور مہینے بنتے ہیں اور پھر زمین کی اسی حرکت سے اُس کی ایک دوسری حرکت بھی پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے ہر سال ہم سورج کو شمال سے جنوب کی طرف اور وہاں سے شمال کی طرف پلٹتا ہوا دیکھتے ہیں جس سے سردی، گرمی، بہار اور خزاں کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں اور اسکی وجہ سے کبھی راتیں گھٹ جاتی ہیں اور دن بڑھ جاتے ہیں اور کبھی دنوں کی مدت کم ہو جاتی ہے اور راتیں بڑی ہو جاتی ہیں۔ قرآنِ کریم نے ان الفاظ سے اُس پورے نظامِ کائنات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو دنوں اور راتوں کی تخلیق اور اُن کی کمی زیادتی سے وابستہ ہے۔

اس کے بعد فرماتا ہے: اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَ رَسُوۡلِہٖ وَ اَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ۔ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان اختیار کرو اور جس دولت اور مال

میں اُس نے تمہیں اپنا نائب بنایا ہے اُس میں سے خرچ کرو۔

قرآنِ کریم نے جہاں انسانی زندگی کی فلاح کے لئے ایک مکمل روحانی نظام کی تعلیم دی ہے اُس کے معاشی نظام کی اصلاح کے راستے بھی بتا دئے ہیں اور ایسے اصول مقرر کئے ہیں جن پر عمل کر کے ہر شخص بڑے امن و سکون کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام میں سب سے بڑی اہمیت اس نظریہ کی ہے کہ تمام سرمایہ کا اصلی مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے اور ہم اُس کے امین ہیں اس لئے جہاں اور جس طرح اُس کا حکم ہو ہم اُسی طرح اُس دولت کو صرف کریں۔ اس بات کو یوں بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ جن وسیلوں اور ذرائع سے ہم دولت حاصل کرتے ہیں وہ بھی سب خدا ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور اُسی کے اختیار میں ہیں۔ انسان کا کام تو صرف اتنا ہے کہ وہ اُن وسیلوں اور قدرتی ذرائع سے فائدہ اٹھاتا ہے اور طرح طرح سے اُنہیں اپنے مقصد کے لئے استعمال کرے۔ اسلامی معاشی نظام کے اس وسیع اور جامع نظریہ کے اندر دولت کے منصفانہ مصرف اور اُس کی تقسیم کے تمام پہلو شامل ہیں اور ساتھ ہی اُس کی ذخیرہ اندوزی اور اجارہ داری کے نقصانات کے پہلو بھی جس کے لئے قرآنِ کریم کی واضح ہدایات موجود ہیں۔ اس بنا پر دولت جمع کرنے، اُسے اپنی ذات پر صرف کرنے یا دوسروں پر تقسیم کرنے میں ہر مسلمان کے سامنے اسلام کا یہ بنیادی نظریہ ہر صورت میں رہنا ضروری ہے کہ وہ خدا کے مال میں اُس کا نائب اور امین ہے اور اُس کا اصلی مالک صرف اللہ ہے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؑ فرماتے ہیں: لو کان المالُ لی لسوّیتُ بینھم فکیف و انّما المالُ مالُ اللہ اگر یہ سب میرا اپنا مال ہوتا جب بھی میں اُسے لوگوں میں انصاف کے ساتھ برابر تقسیم کرتا۔ حالانکہ یہ تو خدا کا مال ہے۔

اس تفصیل کے ساتھ ہی ہمیں "مستخلفین" کے مفہوم کا یہ رخ بھی بھولنا نہ چاہیئے کہ یہ دولت پہلے دوسروں کے پاس تھی پھر بعد میں آنے والے اُن کے جانشین بنے اور یہ اُن کو ملی۔ پھر جب یہ بھی باقی نہ رہیں گے تو ان کا جانشین کوئی اور بنے گا اور جب یہ بات یقینی ہے کہ یہ دولت کسی کے پاس بھی ہمیشہ باقی نہیں رہا کرتی اور برابر آتی جاتی رہتی ہے تو ایسی بے وفا چیز سے دل لگانا عقل رکھنے والوں کا کام نہیں بلکہ ہمیں اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ جس طرح یہ دوسروں سے ہمارے ہاتھوں تک آئی ہے اسی طرح ہمارے پاس سے بھی دوسروں تک چلی جائے گی اور ہم پر خدا کے سامنے صرف اس کا حساب دینا اور اس کی ایک ایک پائی کے خرچ کے جواز کی

جوابدہی کا فرض باقی رہ جائے گا۔ اس لئے ہماری نجات تو اسی میں ہے کہ ہم دولت کو ان ہی راستوں پر خرچ کریں جو اللہ نے ہمیں بتا دیئے ہیں۔ ان آیات کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے۔

" وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۔ یعنی خدا پر ایمان لانے اور یقین و معرفت کے راستوں پر چلنے سے تم کو اب اس کے بعد کونسی چیز روک سکتی ہے جبکہ ساری حقیقت تمہارے سامنے آچکی ہے اور جبکہ خدا کا رسولؐ تم کو کسی اجنبی اور عقل میں نہ آنے والی چیز کی طرف نہیں بلکہ تمہارے حقیقی خالق اور اصلی پالنے والے کی طرف بلا رہا ہے جس کی ہستی کا اعتقاد تمہاری اصل فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور جس کی خدائی کا اقرار اور پکا عہد تمہارے دنیا میں آنے سے پہلے ہی لے لیا گیا تھا اور پھر پیغمبروںؑ کو بھیجکر اور معجزات دکھا کر اس ازلی عہد و قرار کی یاددہانی بھی کر دی گئی۔

ان روشن دلیلوں کے بعد اور پوری طرح حجت تمام ہو جانے کے بعد اب اس کی گنجائش کہاں باقی ہے کہ انسان عقل و فہم کے باوجود کوئی عذر پیش کر سکے اور حق و دیانت کے چمکتے ہوئے سورج کی روشنی کا انکار کر سکے۔

(درس) ۱۵۱

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِيُخْرِجَكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ○ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنْكُمْ مَنْ أَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِنَ الَّذِينَ أَنْفَقُوا مِنْ بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ○

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۷ کی آخری آیات۔ سورۃ الحدید)

ترجمہ:۔ وہی ہے جو اپنے بندہ پر واضح و روشن آیتیں اتارتا ہے تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے اور بیشک خدا تم پر بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے اور تم کو کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث کا تنہا مالک خدا ہی ہے۔ جن لوگوں نے فتح مکہ سے پہلے خدا کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا وہ (دوسروں کے) برابر نہیں ہیں ان کا درجہ ان لوگوں سے کہیں بڑھکر ہے جنھوں نے بعد میں خرچ کیا اور خدا کی راہ

ہیں) لڑے اور اللہ نے ثواب کا وعدہ تو سب سے کیا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو خدا اُس سے خوب واقف ہے۔

ترجمہ کے بعد بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

"ظُلُمَاتُ" "ظُلْمَۃٌ" کی جمع ہے یعنی تاریکی۔ مگر یہاں پر ان تاریکیوں سے مراد جہالت اور شرک و کفر کے اندھیرے ہیں اور "نور" سے مراد ایمان و علم اور ہدایت و یقین کی روشنی ہے۔ "میراث" اُس مال کو کہتے ہیں جو مرنے والا چھوڑ جاتا ہے۔

"الْفَتْحُ" سے مراد ان آیات میں فتح مکہ ہے اور کچھ مفسرین نے اس سے صلح حدیبیہ مراد لی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ خدا ہی کی ذات ہے جو اپنے بندہ حضرت محمد بن عبداللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر روشن حجتیں اور واضح اور کھلی ہوئی آیتیں اُتارتا ہے اور غرض صرف یہ ہے کہ جہالت اور ظلم و جور کی گھنگھور گھٹاؤں اور کفر و شرک کی تاریکیوں سے انسانوں کو باہر نکال کر حق و دیانت اور علم و معرفت کے اُجالے میں لے آئے اور ایمان و خداشناسی کے سیدھے راستے پر پہنچا دے اور یہ اُس کا کرم ہے کہ اُس نے صرف عقل و فہم دینے کو کافی نہ سمجھا بلکہ انسان کی ہدایت کے لئے اور اُس کی عقل کی مدد کے لئے انبیاءؑ بھی بھیجے اور اُنہیں معجزات بھی عطا کئے۔ کتابیں بھی نازل کیں اور طرح طرح کی آسانیاں مہیا کردیں تاکہ ہر صورت سے حجت تمام ہو جائے اور کسی صاحب ہوش کے لئے انکار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہ سکے۔

اپنی رحمت و کرم اور شانِ قدرت و سلطنت کو بیان فرما کر اور اپنی عطا و بخشش کا ذکر کر کے ارشاد فرماتا ہے کہ میری راہ میں مال کو خرچ کرو اور فقیر ہو جانے سے نہ ڈرو اس لئے کہ جس کی راہ میں اور جس کے نام پر تم خرچ کرو گے وہ زمین و آسمان کے خزانوں کا تنہا مالک ہے اور تم سے وہ اس عمل کا عوض دینے کا وعدہ بھی کر چکا ہے۔

"فی سبیل اللہ" یعنی راہِ خدا میں خرچ کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اللہ کو خود اس کی احتیاج ہے اور ہمارے خرچ کرنے سے اس کی ذات کو کوئی فائدہ پہنچے گا بلکہ اس کا فائدہ بھی خود ہم ہی کو حاصل ہوگا اور اس ذریعہ سے ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کو فلاح کے راستے ملیں گے۔

اگر اسلامی معاشرہ کا ہر فرد اپنی دولت کو خدا کے بتائے راستوں پر صرف کرتا رہے تو یقیناً ہر ایک شخص امن و سکون اور راحت و اطمینان کی زندگی گذارنے لگے اور سب پورے

اطمینان کے ساتھ زندہ رہیں۔ خدا کی راہ میں انفاق اور خرچ کرنے سے ایک وسیع مفہوم مراد ہے جس میں مستحق غریبوں کی امداد و اعانت اور دوسرے تمام نیک کام اور انسانی فلاح کے سارے امور شامل ہیں اور ان سب چیزوں کے لئے اللہ نے حدیں بھی مقرر فرما دی ہیں اور اس کے ساتھ ہی ہر فرد کو محنت کرنے اور کسب معاش میں کوشش جاری رکھنے اور حلال طریقوں سے کمائی کرنے کی طرف رغبت بھی دلائی ہے۔ ایک طرف انسان کی عملی صلاحیتوں کو اُبھارا گیا ہے تو دوسری جانب اُسے ایثار کرنے اور دوسرے انسانی افراد کے دُکھ درد کا احساس کرنے اور اُس میں شرکت کرنے کی تعلیم بھی دی گئی ہے اور اپنی واقعی ضرورتوں سے جو کچھ بچ رہے اُس سے دوسروں کی زندگی بنانے اور اُن کی مدد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ان سب امور میں اس ضروری پہلو کو بھی سامنے رکھا گیا ہے کہ یہ مال و دولت انسان کی اپنی ملکیت ہی نہیں ہے بلکہ وہ صرف ایک نائب اور امین کی حیثیت رکھتا ہے اور اُس کا اصلی مالک خدا ہے جیسا کہ اس سے قبل کی آیات میں اس کی وضاحت ہو چکی ہے۔

اس طرح اسلام کے اس معاشی اور اقتصادی نظام میں نہ کبھی افراد کی قوّت عمل میں کمزوری پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ نہ اُن کی فطری صلاحیتوں کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے اور نہ دولت اور سرمایہ کی ذخیرہ اندوزی اور اُس کی اجارہ داری کے مرض کی پرورش ہی ممکن ہے بلکہ اس میں افراد بھی خاطر خواہ ترقی کر سکتے ہیں اور پورا معاشرہ بھی خوش حال اور مطمئن بن سکتا ہے۔ پھر "وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ" فرما کر اس حقیقت کی اور زیادہ وضاحت کر دی گئی کہ جو کچھ زمین و آسمان میں ہے اُس کا اصلی مالک و وارث صرف اللہ ہے۔

پھر جب یہ سب خدا کا مال ہے تو اس کے بعد اس میں سے اُس کی راہ میں خرچ کرنا لوگوں کی طبیعت پر کیوں بھاری معلوم ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مال تو کسی صورت میں بھی ہمارے پاس باقی نہ رہے گا اور جس طرح ہمارے پاس آیا ہے اُسی طرح ہمارے ہاتھوں سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں پہنچ جائے گا اور صرف اپنے اثرات چھوڑ جائے گا۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اثرات اچھے ہوں اور ہمارے لئے نجات و فلاح کا سبب بنیں۔

آخر میں اس کا بیان ہے کہ عمل کرنے والوں میں بھی وقت اور زمانہ کے لحاظ سے فرق ہوا کرتا ہے اس لئے جن لوگوں نے فتح مکّہ سے پہلے اپنے اموال خدا کی راہ میں خرچ کئے اور جہاد کیا اُن کا اجر و ثواب اُن سے زیادہ ہے جنہوں نے اس فتح کے بعد اس میں حصّہ لیا تھا کیونکہ فتح مکّہ

سے قبل مسلمانوں کی طاقت کم تھی اور حالات ناساز گار تھے اس وجہ سے اُس شدت کے زمانہ میں عمل کا اجر بھی زیادہ تھا اور فتح مکہ کے بعد مسلمانوں کی تعداد بھی زیادہ ہوگئی تھی اور ہر طرف اُن کا اقتدار پھیل چکا تھا اسی بنا پر جس طرح ان دو زمانوں کے حالات میں فرق تھا اسی طرح ان میں عمل کرنے والوں کے مرتبہ اور ثواب میں بھی امتیاز تھا اگرچہ دونوں زمانوں کے لوگ اصل نیکی اور اصل اجر و ثواب میں شریک تھے۔

---

۱۵۲ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ۝ یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ ۝ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ؕ ۝ یُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ۝ فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۸ کی ابتدائی آیات۔ سورۂ الحدید)

ترجمہ:۔ کون ہے ایسا جو اللہ کو خالص نیت کے ساتھ قرض دے پھر خدا اُسے اس شخص کے لئے دونا کر دے اور اس کے لئے بہت عزت کا ثواب ہے۔ جس دن تم مومن مردوں اور ایماندار عورتوں کو دیکھو گے کہ اُن (کے ایمان) کا نور اُن کے آگے آگے اور داہنی طرف چل رہا ہوگا۔ آج تم کو بشارت ہو اُن باغوں کی جن کے نیچے نہریں جاری ہیں۔ ان میں ہمیشہ رہو گے یہی تو بڑی کامیابی ہے جس روز منافق مرد ایمان والوں سے کہیں گے اور منافق عورتیں بھی کہیں گی کہ ہمارا انتظار کرو تاکہ ہم بھی تمہارے نور سے کچھ روشنی حاصل کر لیں۔ اُن سے کہا جائے گا کہ تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ اور روشنی تلاش کرو پھر اُن کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اُس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر کی طرف عذاب تو منافق لوگ ایمان والوں سے

پکار کر کہیں گے۔ کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے وہ جواب دینگے تھے تو ضرور مگر تم نے تو خود اپنے آپ کو بلا میں ڈالا اور ہمارے حق میں حوادث واقع ہونے کا انتظار کیا کرتے تھے اور شک و شبہہ ہی میں پڑے رہے اور تمہیں تمہاری تمناؤں نے دھوکے میں ڈال رکھا تھا یہاں تک کہ خدا کا حکم آپہنچا اور ایک بڑے دغاباز نے خدا کے بارے میں تم کو فریب دیا تو آج نہ تم سے کوئی فدیہ اور معاوضہ قبول کیا جائے گا اور نہ کافروں سے۔ تم سب کا ٹھکانا بس جہنّم ہے وہی تمہارے لئے سزاوار ہے اور بری جگہ ہے۔

"قرض" کے بہت سے معنی ہیں اور یہ اُس مال کو بھی کہتے ہیں جو کسی کو اس شرط پر دیا جائے کہ وہ واپس مل جائے گا مگر یہاں لفظ "قرض" سے مُراد "صَدَقَہ" ہے یعنی ہر وہ چیز جو انسان اپنے مال سے قربِ الٰہی حاصل کرنے کے لئے خدا کی راہ میں دیتا ہے۔ اس خیرات اور صدقہ کو "قرض" اس وجہ سے فرمایا گیا ہے کہ اُس کی طرح یہ بھی واپس ہوگا اور اللہ کی بارگاہ سے اس خیرات کا عوض ضرور عطا ہوگا۔

"حَسَن" اچھے کو کہتے ہیں اور یہاں وہ "صدقہ" مراد ہے جو خوش دلی اور خلوص کے ساتھ خدا کی راہ میں دیا جائے۔

"سُوْر" کے لفظی معنی شہر پناہ کے ہیں یعنی وہ دیوار جو شہر کی حفاظت کے لئے اُس کے چاروں طرف بنائی جاتی ہے۔ مگر یہاں مراد ایک ایسی حد ہے جو جنّت اور جہنّم کے درمیان ہوگی اور بعض مفسرین نے لفظ "سُور" سے مقام "اَعْراف" کو مُراد لیا ہے۔ "تربَّصْتم" میں "تَرَبُّص" کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔ یہاں پر برائیوں بلاؤں اور حادثوں کا انتظار مراد ہے۔

"غَرُوْر" دھوکا دینے والے کو کہتے ہیں جبکہ "غُرور" کے معنی ہیں دھوکا دینا اگر یہ مصدر ہو ورنہ اس کے معنی خود پسندی اور تکبّر کے ہوتے ہیں اور غلط اور باطل کے بھی۔ اکثر مفسرین نے "غَرُور" سے شیطان کو مُراد لیا ہے کیونکہ جو چیزیں انسان کو فریب میں مبتلا کرتی ہیں شیطان کی اُن سب سے زیادہ اہمیت ہے اور بعض نے اس کی تفسیر "دُنیا" کیساتھ کی ہے۔

ان آیات کی ابتدا خدا کی راہ میں خیرات و صدقات دینے کی طرف رغبت دلانے سے کی گئی ہے اور اس خیرات کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اسے ایسے قرضہ کی طرح قرار دیا گیا جو بندہ اپنے معبود کو دے۔ حالانکہ خدا کی ذات ہر طرح احتیاج سے بلند اور غنی ہے تو اس کا مطلب صرف یہی ہوگا کہ اس عمل کی جزا ضرور عطا ہوگی بلکہ اور بڑھ کر ملے گی۔ یہ "قرض" یعنی خیرات "حَسَن"

"اچھی" اس وقت کہی جائے گی جب اس میں چند صفتیں پائی جائیں گی۔ یہ مال جو خدا کی راہ میں دیا
جائے اُس کی دینے والے کو خود بھی ضرورت ہو مگر وہ اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت
کو مقدم رکھے اور ایثار کرے، اُس مال میں کوئی کھوٹ اور خرابی نہ ہو، بلکہ بہترین مال ہو،
پھر یہ خیرات اُس کو دی جائے جو اس کا سب سے زیادہ مستحق ہو، جہاں تک ممکن ہو خیرات
کو چھپا کے دیا جائے تاکہ خلوص کا امکان زیادہ پیدا ہو سکے۔ جسے خیرات دی جائے اُس پر
احسان نہ جتایا جائے اور نہ اُسے کسی طرح کی تکلیف پہنچائی جائے اور اس سے صرف اللہ کی خوشنودی
مقصود ہو دوسری کوئی غرض شامل نہ ہو، پھر جو کچھ خدا کی راہ میں دے اُسے کم سمجھے خواہ وہ
کتنا ہی کثیر مال ہو، ساتھ ہی یہ بھی شرط ہے کہ خیرات دینے والا جس غریب و مفلس انسان کو
وہ مال دے اس کی وجہ سے اُس سے اپنے آپ کو اونچا نہ سمجھے اور اس غریب کو کم حیثیت اور ذلیل
نہ خیال کرے۔ جب یہ تمام صفتیں کسی خیرات اور صدقہ میں جمع ہو جاتی ہیں تو وہ قرآن کریم کی
اصطلاح میں "قرضِ حَسَن" کہا جاتا ہے اور اُس کے عوض میں زمین و آسمان کے خزانوں
کا مالک خدا اُس اپنے عبد خاص کو بے حساب جزا عطا فرمائے گا جس کا اُس نے اپنے
اس ارشاد میں وعدہ فرمایا ہے۔ اس کے بعد اس کا بیان ہے کہ ایماندار مردوں اور عورتوں
کو اُن کے نیک اعمال کے مطابق ایک نور عطا کیا جائے گا جو قیامت میں اُن کے ساتھ رہے گا
پھر اُن کو جنتوں کی بشارت دی جائے گی اس کے بعد میدانِ قیامت کے ہولناک منظر کا ذکر
ہے اور اُس موقع پر منافقوں اور ایمان والوں کی گفتگو کا بیان ہے۔

ایمان والوں کو جو خبر دی جائے گی، اُسے قرآنِ کریم نے عظیم کامیابی فرمایا ہے اور جنہیں
دُنیا نے اپنے فریب میں مبتلا کر دیا اور شیطان نے اُن کے قدم حق کے راستہ سے ہٹا دیے
اور اس چند روزہ زندگی اور اس کے عیش و آرام میں مست ہو کر وہ خدا کو بھول گئے اُن
کے لئے اعلان کیا ہے کہ اُن کا ٹھکانا صرف جہنم کی آگ ہے اور اس سزا میں منافق و کافر
سب برابر ہیں۔

درس ۱۵۳
أَلَمْ يَأْنِ لِلَّذِينَ آمَنُوا أَن تَخْشَعَ قُلُوبُهُمْ لِذِكْرِ اللَّهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُونُوا
كَالَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِن قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْأَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوبُهُمْ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ
فَاسِقُونَ ۝ اعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يُحْيِي الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ

تَعْقِلُوْنَ ○ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَ الْمُصَّدِّقٰتِ وَ اَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ○ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ○

(پارہ ۲۷، رکوع ۱۸ کی آخری آیات ۔ سورۃ الحدید)

ترجمہ:- کیا ایمان والوں کے لئے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا کہ اُن کے دل خدا کی یاد اور اُس حق کے لئے جو نازل ہو چکا ہے نرم ہو جائیں اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جنہیں اِن سے پیشتر کتاب دی گئی تھی پھر جب اُن پر زمانہ دراز گذر گیا تو اُن کے دل سخت ہو گئے اور اُن میں اکثر فاسق ہیں۔ یہ بات جان لو کہ خدا ہی زمین کو اُس کی موت کے بعد زندہ کرتا ہے۔ ہم نے تم سے اپنی نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو۔ بیشک خیرات دینے والے مرد اور خیرات دینے والی عورتیں جو اللہ کو خلوص کیساتھ قرض دیتے ہیں اُن کے لئے یہ بڑھا دیا جائے گا اور اُن کے لئے بہت عزت کا ثواب ہے۔ جو لوگ خدا اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں وہی اپنے پروردگار کے نزدیک صدّیق اور شہید ہیں۔ اُن کے لئے اُنکا اجر اور اُن کا نور ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا اور ہماری آیتوں کو جھٹلایا یہی لوگ جہنمی ہیں۔

"ذِکر" انسان کے نفس کی اُس کیفیت کا نام ہے جس کے ذریعے وہ اپنے علم کو محفوظ رکھتا ہے اور کبھی "ذِکر" کا لفظ دل یا زبان پر کسی چیز کے حاضر ہونے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اسی بنا پر کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ "ذکر" دو قسم کا ہوتا ہے ایک ذِکرِ قلبی دل میں یاد کرنا دوسرے "ذِکرِ لسانی" یعنی زبان سے یاد کرنا۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ کئی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ زیرِ نظر آیت میں ذِکر سے مُراد یادِ الٰہی ہے خواہ وہ زبان سے ہو یا دل سے ہو اور کچھ مفسرین نے اس سے مراد قرآنِ کریم کو لیا ہے۔ "مَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ" سے بھی قرآن مجید مراد ہے اور کچھ لوگوں نے اس سے دینِ حق مراد لیا ہے۔ "اَمَدُ" کے معنی "مدت" کے ہیں جو محدود تو ہو مگر معین نہ ہو۔ "يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا" میں زمین کی زندگی سے اُس کا آباد اور سرسبز ہونا مراد ہے اور اُس کی موت سے مُراد اُس کا ویران ہونا ہے۔ یہاں پر مُراد یہ ہے کہ جس طرح اللہ اپنی قدرت کاملہ سے غیر آباد اور ویران زمینوں کو سرسبزی اور شادابی عطا فرماتا ہے اسی طرح دلوں سے قساوت اور سختی کو دور فرما کر اُن میں نرمی اور صلاحیت عطا

کرتا ہے یا کفر و گمراہی کی وجہ سے اُن کی موت کو ایمان و ہدایت کی حیات سے بدل دیتا ہے۔

"اَلْمُصَدِّقِیْنَ وَالْمُصَدِّقَاتِ" یہ الفاظ اصل میں "متصدقین" اور "متصدقات" تھے قواعد کے مطابق لفظوں میں تبدیلی ہوئی ہے معنی وہی ہیں جو بیان کئے گئے یعنی خیرات اور صدقہ دینے والے مرد اور عورتیں۔

اِن آیاتِ مبارکہ میں یادِ خدا اور قرآن کریم کی عظمت بتائی گئی ہے اور ساتھ ہی سچے دل سے ایمان اختیار کرنے، خدا کی راہ میں خیرات دینے اور احکام خداوندی پر عمل کرنے کی ہدایت ہے۔ ایک عجیب دل کش انداز ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کیا اسلام اختیار کرنے والوں کے لئے ابھی تک اس کا وقت نہیں آیا ہے کہ اُن کے دل یادِ خدا اور قرآن کریم کی آیتوں اور اُس کی نصیحت و وعظ کے لئے نرم ہو جائیں اور وہ ان باتوں کو سُن کر حکم الٰہی پر عمل کریں۔ اِس ارشاد کی غرض صرف یہ ہے کہ دِل کی گہرائیوں میں ایمان اور جذبۂ اطاعتِ خدا کی جڑوں کو مضبوط کیا جائے تاکہ مسلمانوں کا قول و عمل ایک دوسرے سے مختلف نہ ہونے پائے اور وہ پورے خلوص اور سچائی کیساتھ خدا و رسولؐ کے احکام پر عمل کریں۔ اور اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی تھی مگر وہ اپنی نفسانی خواہشوں اور گناہوں میں مبتلا ہو گئے اور اِسی حالت میں اُن پر زمانہ دراز گزر گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کے دِل سخت ہو گئے۔ پیغمبروں کی نصیحتوں کا اُن پر اثر نہ رہا آخر گناہوں کے عادی بن گئے، حق کو بھول گئے اور دینِ خدا کو چھوڑ بیٹھے۔ چھوٹی غلطیاں اور معمولی گناہ۔ اگر ابتدا ہی میں اُن کی اصلاح نہ کر دی جائے تو رفتہ رفتہ قوت حاصل کر لیتے ہیں اور پھر آخر میں اُن کی اصلاح بھی ناممکن ہو جاتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کو اُن کے ابتدائی دور ہی سے قرآنِ کریم نے بار بار تنبیہ کی ہے اور، یہ آیۂ کریمہ بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے تاکہ وہ اپنے اعمال کی طرف سے غافل نہ رہیں اور اللہ کی یاد اور اُس کے سچے دین کے سامنے سچے دل سے جھکے رہیں اور اپنی زبان، اعتقاد اور عمل سے یہ ثابت کر دیں کہ وہ سچے مسلمان ہیں۔ اصلاحِ کردار کا سب سے بہتر اور سب سے زیادہ موثر طریقہ یہی ہے جس کی تعلیم اسلام نے دی ہے یعنی دلوں کی اصلاح کرنا اور نیتوں کو دُرست کرنا اور اُن میں خضوع و خشوع اور خلوص پیدا کرنا۔ اس طرح ان آیات میں بھی اصلاحِ کردار کے اس اہم ترین بنیادی ذریعہ کی طرف اشارہ ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے پاس کچھ لوگ آئے اور کہنے لگے۔ "جو شخص بھلائی کا راستہ نہ دکھائے اور بُرائی سے نہ روکے وہ یقیناً ہلاک ہو گیا۔" آپ نے اس کے جواب میں کہا۔ "ہلاک وہ ہو گا جو اپنے دل سے اچھائی کو اچھائی نہ سمجھے اور بُرائی کو بُرائی نہ جانے اس کے بعد آپ نے بنی اسرائیل

کے واقعات کا ذکر کیا اور بتایا کہ اُن میں بھی جو بد عملی پیدا ہوئی۔ اُس کا سبب بھی اُن کے اعتقاد اور نیتوں کی خرابی تھی اس لئے مسلمانوں کو نصیحت فرمائی گئی ہے کہ وہ اپنی نیتوں کو صاف رکھیں اور دلوں میں خدا کا خوف پیدا کریں اور اپنے پروردگار کی عظمت کے سامنے اپنے سروں کے ساتھ دلوں کو بھی جھکا دیں۔

آخر میں ایک مرتبہ پھر خدا کی راہ میں خیرات و صدقات پیش کرنے کی فضیلت و ثواب پر زور دیا گیا ہے اور یہ ارشاد ہوتا ہے کہ جو لوگ محتاجوں اور غریبوں کو اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ اپنی حلال کمائی سے خیرات دیتے ہیں اس کے بدلہ میں خدا اُنہیں بہت بڑھا کر جزا عطا فرمائیگا۔ اُن کا اجر بہت بڑا اور اُن کا ثواب بے حساب ہے۔ "وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ" کی مختلف تفسیریں کی گئی ہیں جن میں زیادہ شہرت اسی مطلب کی ہے کہ جو لوگ صدقِ دل سے خدا اور اُسکے پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اُن کا مرتبہ خدا کے نزدیک اُن کے برابر ہوتا ہے جو "صدیق" ہوتے ہیں اور خدا کی راہ میں شہید ہونے کی عزت حاصل کرتے ہیں اور یہ کامل مرتبے اُسی وقت حاصل ہوتے ہیں۔ جب انسان کا ایمان بھی کمال کی منزل پر پہنچ جائے۔

(درس ۱۵۴) اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝

(پارہ ۲۷، رکوع ۱۹ کی ابتدائی آیات۔ سورۃ الحدید)

ترجمہ :- تم خوب جان لو کہ دُنیاوی زندگی محض کھیل، تماشا، زینت، آرائش اور آپس میں ایک کا دوسرے پر فخر کرنا اور مال و اولاد میں بڑھنے کی کوشش کرنا ہے۔ (اس زندگی کی مثال) بارش کی سی ہے کہ اُس کی پیداوار کسانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے پھر وہ سوکھ جاتی ہے تو

اُسے تو زرد دیکھتا ہے پھر وہ چور چور ہو جاتی ہے اور آخرت میں سخت عذاب ہے اور خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے اور دُنیا وی زندگی تو بس فریب کا ساز و سامان ہے۔ تم اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف دوڑو اور ایسی جنت کی طرف جس کی وسعت آسمان و زمین کی وسعت کے برابر ہے۔ وہ اُن لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اُس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اور خدا بڑے فضل والا ہے۔

اُلحیاۃُ الدُّنیا" ۔ لفظِ "دُنیا" ۔ "اَدْنیٰ" کا مؤنث ہے۔ دوسرے معانی کے علاوہ اس کو سب سے زیادہ حقیر کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ اور اسی میں اس کا استعمال بھی زیادہ ہے۔ مگر دینی اصطلاح میں 'دُنیا' 'آخرت' کے مقابلہ میں بولی جاتی ہے اور اس سے مُراد وہ حالات زندگی ہیں جو موت سے پہلے ہوتے ہیں اور آخرت سے مراد وہ حالات ہیں جن کا تعلق موت کے بعد کے امور سے ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس دینی اصطلاح میں بھی نزدیکی اور حقارت کا مفہوم شامل ہے یعنی موت سے پہلے کی زندگی ہم سے بے حد قریب بھی ہے اور بے حیثیت اور حقیر بھی۔

اب رہی یہ بات کہ اس دنیا کی ساری زندگی حقیر اور لپست ہے یا اس سے مراد اس زندگی کی کوئی خاص قسم ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ دنیاوی زندگی جس کی قرآن کریم نے مذمت کی ہے اور جسے بے حد حقیر اور قابل نفرت قرار دیا ہے اُس سے مراد وہ زندگی ہے جس کی غرض صرف جسمانی اور مادّی لذتیں حاصل کرنا ہو اور جو آخرت اور دینی قدروں سے غافل کر دے۔ جس میں انسان مبتلا ہو کر خدا کے احکام کو فراموش کر دے۔ اپنے فرائض کو بھول جائے اور صرف حرص و ہوس اور عیش و دولت کا بندہ بن کر رہ جائے اس کے برخلاف دُنیا کی وہ زندگی جس میں دینی قدریں باقی رہیں، حکمِ خدا پر عمل ہو۔ اپنے فرض کو پورا کیا جائے، آخرت فراموش نہ ہو اور دُنیا کی نعمتوں کو حصول آخرت کا ذریعہ قرار دیا جائے ایسی دینوی زندگی ہرگز قابل مذمت نہیں ہو سکتی بلکہ یہ انسان کی غرضِ خلقت کو پورا کرتی ہے اور اخروی زندگی کا جزو ہے۔

اس آیۂ کریمہ میں حیات دنیا سے مراد وہی زندگی ہے جو دین حق اور آخرت سے انسان کو غافل بنا دے۔ "کُفّار" کافر کی جمع ہے۔ یہ کُفْر اور کَفُر سے بنا ہے۔ اصل میں اس کے معنی کسی چیز کو چھپانے کے ہیں۔ رات کو بھی کافر کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ چیزوں کو چھپا لیتی ہے اسی طرح دینِ حق کا انکار کرنے والے کو بھی کافر کہتے ہیں کیونکہ وہ حق کو چھپاتا ہے۔ بالکل اسی صورت سے کسان کو بھی عربی زبان میں لفظی حیثیت سے کافر کہتے ہیں اسلئے کہ وہ زمین کے

اندر بیج چھپاتا ہے اسی بنا پر "اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ" میں کفار سے کاشتکار لوگ مراد ہیں۔ "مُصْفَرًّا" کے معنی زرد کے ہیں۔ "صُفْرَۃٌ" زردی کو کہتے ہیں۔ "حُطَام" اس چیز کو کہتے ہیں جو سوکھ کر ریزہ ریزہ اور چور چور ہو جائے۔

وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ۔ ایسی جنت کی طلب میں دوڑو جسکی وسعت آسمان و زمین کے برابر ہے۔ ایسے موقع پر سورۂ آل عمران میں بجائے "سمآء" کے اسکی جمع "سماوات" لائی گئی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ "اپنے پروردگار کی بخشش اور ایسی جنت کی طرف بڑھنے میں جلدی کرو جس کی وسعت تمام آسمانوں اور زمین کے برابر ہے اور وہ پرہیزگاروں کے لئے مہیا کی گئی ہے۔

"جَنَّۃٌ" کے لفظی معنی ہر اس باغ کے ہیں جس میں درختوں کی کثرت کی وجہ سے زمین دکھائی نہ دے۔ قرآنِ کریم میں یہ لفظ عام باغ کے معنی میں بھی آیا ہے مگر کثرت کے ساتھ جس معنی میں بولا گیا ہے وہ "بہشت" ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے ایک قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ بہشت سات ہیں: جنت فردوس[۱]، جنت عدن[۲]، جنت نعیم[۳]، دار الخلد[۴]، جنۃ الماوٰی[۵]۔ دار السلام[۶] اور علّیین[۷]۔ یہ جنتیں عمل کرنے والوں کے مرتبوں کے لحاظ سے خلق کی گئی ہیں۔ اہلبیت کرام علیہم السلام کی احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جنتیں بھی کچھ تو وہ ہیں جو عالم برزخ میں یعنی موت اور قیامت کے درمیانی زمانہ میں نیک عمل کرنے والوں کے لئے خلق ہوئی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو قیامت کے آخری فیصلۂ جزا و سزا کے بعد عطا کی جائیں گی

اسی طرح آتشِ جہنم کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالم برزخ کی آگ اور دوسری قیامت کے آخری فیصلے کے بعد کی آگ ہے۔

ان آیاتِ کریمہ میں دنیاوی اور اخروی زندگیوں کا فرق تعلیم دیا گیا ہے اور ان کی حقیقتوں سے ہمیں آگاہ فرمایا گیا ہے کہ دنیاوی زندگی کھیل اور تماشا ہے وہ فنا ہو جانے والی اور مٹ جانے والی ہے۔ اس کی نعمتیں باقی نہیں رہتیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک لہلہاتی ہوئی کھیتی ہو جو کسان کی آنکھوں میں بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔ مگر کچھ ہی زمانہ میں وہ سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے مگر آخرت کی ہر نعمت لازوال ہے، وہاں کی زندگی کو دوام و بقا ہے اور اسے اللہ کے سوا عالمین کی کوئی طاقت فنا نہیں کر سکتی۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں اس حقیقت کو فراموش نہ کرنا چاہئیے جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا تھا کہ دنیاوی زندگی جس کی ان آیتوں میں مذمت کی گئی ہے اُس سے مراد صرف وہی زندگی ہے جو انسان کو خدا سے دور کردے اور وہ صرف دنیوی مقاصد کے لئے اُسے وقف کردے ورنہ دنیا کی وہ زندگی جو مرضی خدا کے مطابق ہو۔ وہ ہر طرح قابلِ تعریف ہے اور نہ صرف اُخروی حیات کے وسیع مفہوم میں داخل ہے بلکہ اس کے بغیر انسان کے لئے تحصیلِ آخرت ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی لئے حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ "اَلدُّنْیَا مَزْرَعَۃُ الْاٰخِرَۃِ" دُنیا آخرت کی کھیتی ہے یعنی اس دُنیا میں جو کچھ بویا جائیگا اُسی کا پھل آخرت میں حاصل ہوگا۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۚ ۝ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ؕ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَیَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ یَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ ۝ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَھُمُ الْکِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝

(پارہ ۲۷ رکوع ۱۹ کی آخری آیات سورۃ الحدید)

ترجمہ: جو مصیبت روئے زمین پر اور خود تمہارے نفسوں پر نازل ہوتی ہے وہ سب ایک کتاب یعنی لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہے قبل اس کے کہ ہم اُن نفسوں کو پیدا کریں بیشک یہ خدا پر آسان ہے تاکہ جب کوئی چیز تم سے جاتی رہے تو تم اُس کا رنج نہ کیا کرو اور جو نعمت خدا تم کو عطا کرے اُس پر تم اترایا نہ کرو اور خدا کسی اترانے والے شیخی باز کو دوست نہیں رکھتا جو ایسے ہیں کہ خود بھی کنجوسی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی کنجوسی کرنے کی تعلیم دیتے ہیں اور جو شخص ان باتوں سے منہ موڑے گا تو خدا بھی بے نیاز اور سزاوارِ حمد و ثنا ہے۔

ہم نے بیشک اپنے پیغمبروں کو واضح اور روشن معجزے دیکر بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور انصاف کی ترازو نازل کی تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں اور ہم ہی نے لوہے کو نازل کیا جس میں سخت ہیبت ہے اور لوگوں کے لئے اور بھی بہت سے فائدے ہیں اور اس لئے بھی

کہ اللہ جان لے کہ اُس کی اور اُس کے پیغمبروں کی مدد بے دیکھے کون کرتا ہے۔ بے شک خدا بہت قوت والا اور غالب ہے۔

ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

"نَبْرَأَ" "بَرْءٌ" سے بنایا گیا ہے اس کے معنی ہیں خلق کرنا اور عدم سے وجود میں لانا۔ خداوند عالم کے اسماء مبارکہ میں "بارئُ" بھی ہے اس کے معنی بھی یہی ہیں کہ اُس نے کائناتِ عالم کو خلق فرمایا ہے اور اُسے عدم سے وجود میں لانے والا وہی ہے "تَأْسَوْا" کا مصدر "أَسًى" ہے اس کے معنی افسوس اور رنج کرنے کے آتے ہیں۔ "مُخْتَال" کے معنی متکبر اور مغرور کے ہیں بعض محققین نے "مختال" اور "فخور" میں یہ فرق بیان کیا ہے کہ "مختال" اُسے کہتے ہیں جس کی نظر اپنی ذات کی طرف ہو اور اُس پر اکڑتا ہو اور "فخور" وہ ہے جو اپنی ذات کے ساتھ دوسروں پر بھی نظر رکھے اور انہیں اپنے مقابلہ میں ذلیل و حقیر سمجھے۔

"وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَ الْمِيْزَانَ" میں "میزان" سے مراد عدل و انصاف ہے اور کتاب سے ہر وہ کتاب مراد ہے جو انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے لاتے رہے۔

"وَ اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ" میں "حدید" کے لفظی معنی لوہے کے ہیں اور بعض مفسرین نے اس سے عام لوہا ہی مراد لیا ہے لیکن اہلبیت کرام علیہم السلام کی کثیر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اس آیہ کریمہ میں "الحدید" سے مراد ایک خاص تلوار ہے یعنی ذوالفقار جو حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام کو جنگِ اُحد میں حضرت سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمائی تھی اور یہ تلوار نبی اکرم کے پاس آسمان سے حضرت جبرئیل امین لائے تھے۔

ان آیاتِ کریمہ میں اللہ نے اپنے وسیع علم و قدرت کو بیان فرمایا ہے کہ زمین کے جس حصہ میں بھی کوئی مصیبت اور آفت آتی ہے یا خود انسانوں پر جو مصیبتیں پڑتی ہیں اُن سب کا علم خدا کو کائناتِ عالم کی ہر چیز کی پیدائش سے پہلے ہی سے ہے اور وہ ان سب باتوں کو جانتا ہے اور اُس کے اس علم میں ذرہ برابر کبھی فرق نہیں آسکتا۔ زمین کی مصیبتوں سے مراد قحط، زلزلہ، بارش نہ ہونا، زراعتوں کا خراب ہو جانا ہے۔ اور انسانوں کی مصیبتیں یہ ہیں کہ وہ بیماریوں میں مبتلا ہو جائیں۔ جنگ اور قتل و غارت پھیل جائے گرانی پیدا ہو جائے اور اسی طرح کی دوسری آفتیں اور بلائیں آجائیں۔ یہ سب باتیں خدا کے علم میں پہلے سے ہیں اور وہ ہر بات کو جانتا ہے اور جو اُس کے علم میں ہے وہی ہو کر رہے گا۔ یہاں اس کا ضروری پہلو سمجھ لینا چاہئے کہ اللہ

کا علم بلاشبہ اتنا کامل ہے کہ اُس میں فرق ہو ہی نہیں سکتا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہمارے افعال کے وجود میں اُس کے علم کو دخل ہے یعنی ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں وہ اللہ ہی کی مشیت اور اُس کے حکم سے کرتے ہیں اور اُس کے کرنے یا نہ کرنے پر ہم مجبور ہیں اور ہمارا ان افعال واعمال میں کوئی اپنا اختیار نہیں ہے۔

اگر ایسا ہو کہ جو افعال ہم کرتے ہیں اُن کے کرنے پر ہم مجبور ہوں تو پھر سزا اور جزا کا نظریہ ہی ختم ہو جائے گا اور عقیدۂ معاد جو اسلام کی بنیادی تعلیمات میں اہم ترین حیثیت رکھتا ہے باطل ہو جائے گا حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ سزا اُسی جرم پر دی جاتی ہے جو اپنے اختیار سے کیا جائے اور جزا اُسی اچھے عمل پر ملتی ہے جس کے کرنے پر انسان مجبور نہ ہو اور اُس کی حیثیت ونوعیت ایک مشین کی سی نہ ہو۔ جس سے ظاہر میں تو کوئی کام ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وہ مشین کے چلانے والے کا کام ہے خود اُس مشین کا اختیاری کام نہیں ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ہم جو کچھ بھی کرتے ہیں اُن کاموں کو کرنے کے لئے اُن کے اسباب اور آلات خُدا ہی نے پیدا کئے ہیں جن سے اچھا یا برا کام لینے کا اختیار ہم کو عطا کیا گیا ہے اور ساتھ ہی ہر عمل کی بُرائی اور اچھائی بھی تعلیم دیدی گئی ہے اور اسے پوری طرح سمجھنے کے لئے عقل بھی عطا ہوئی ہے۔ خود ہمیں بھی خدا نے خلق فرمایا ہمارے اعضا کی تخلیق بھی کی، انھیں طرح طرح کی قوتیں اور طاقتیں بخشیں پھر ہوا، مٹی، پانی، آگ، بجلی، مٹی کے تیل اور پٹرول کے ذخیرے، لوہا، تانبا، سونا اور سیکڑوں قسم کے معدنیات اور قسم قسم کے مادّے۔ یہ سب کچھ اللہ ہی نے خلق فرمایا اور ہم کو عقل وفہم کے ساتھ ان چیزوں سے فائدہ اٹھانے اور کام لینے کی صلاحیت بھی دیدی ہے یہاں تک تو ہم مجبور ہیں کیونکہ ان مادّوں اور ان طاقتوں کی تخلیق ہمارے بس میں نہیں ہے صرف ہمیں اختیار اسقدر ہے کہ ہم ان چیزوں سے صحیح یا غلط فائدہ اُٹھائیں اور ان چیزوں کو تعمیری کاموں میں استعمال کریں یا تخریبی باتوں میں اور یہی جزا اور سزا کا معیار ہے۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام فرماتے ہیں:

لَاجَبْرَ وَلَاتَفْوِیْضَ بَلْ اَمْرٌ بَیْنَ الْاَمْرَیْنِ۔ انسان نہ تو بالکل مجبور ہی ہے اور نہ اُسے کامل اختیار حاصل ہے بلکہ اُس میں ان دونوں باتوں کی درمیانی حالت ہے یعنی کچھ مجبور ہے اور کچھ مختار ہے تاکہ اُسے جزا یا سزا دی جاسکے۔

ان آیاتِ کریمہ میں انسانی فلاح و بہبود کے اہم ترین اصول کی طرف اشارے ہیں اور اِن کے ہر ہر جملہ میں معانی و مطالب کے خزانے پوشیدہ ہیں جن کو سمجھنے اور بیان کرنے کے لئے بڑے دقت کی ضرورت ہے۔ اور بلاشبہ پورا قرآنِ کریم ہی حکمت و ہدایت کا ایک عظیم نسخہ ہے۔ خدا ہر انسان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ ان جواہر حکمت و ہدایت کو حاصل کرنے کی کوشش کرے اور انسانیت کی تعمیر و اصلاح کے عظیم کام میں قرآنی ہدایات پر عمل کرے۔

(درس ۱۵۶) سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝ وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ۖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

(پارہ ۲۸، رکوع ۹ سورۂ صف کی ابتدائی چند آیات)

ترجمہ: جو چیزیں آسمانوں میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں اور وہی غالب حکمت والا ہے۔ اے ایمان والو ایسی بات کیوں کہتے ہو۔ جو کرتے نہیں۔ خدا کے نزدیک یہ بات بڑی نفرت اور ناراضگی کی ہے کہ وہ بات کہو جو نہ کرو۔ بیشک اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح مل کر اور صف باندھ کر جہاد کرتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہیں۔ اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم تم لوگ مجھے کیوں اذیت دیتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں پھر جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو اللہ نے بھی اُن کے دلوں کو ٹیڑھا ہی رہنے دیا اور خدا بدکار لوگوں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔

ترجمہ کے بعد ان آیاتِ کریمہ کے بعض مشکل الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے:-

"مَقْتٌ" سخت ترین عناد، بغض اور نفرت کو کہتے ہیں۔ بنیانٌ دیوار اور عمارت کے لئے بولا جاتا ہے۔ "رَصٌّ" کے معنی دو یا زیادہ چیزوں کو باہم ملا کر جوڑ دینے کے ہیں اور "رَصَاصٌ" سیسہ کو کہتے ہیں۔ اس لئے "بنیانٌ مرصوصٌ" سے مراد ایک مضبوط دیوار یا عمارت ہے جو سیسہ کیساتھ بنائی گئی ہو۔ مقصود انتہائی مستحکم عمارت ہے۔

"زَاغُوْا" "زَیغ" سے بنایا گیا ہے اس کے معنی ہیں ٹیڑھا ہونا اور اعتدال و ثقاہت کی حالت سے ہٹ جانا۔

سَبَّحَ لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ آسمانوں کی ہر مخلوق اور زمین کی ہر چیز اللہ کی تسبیح اور حمد و ثنا کرتی ہے۔ اس تسبیح کے دو[2] معنی ہیں ایک یہ کہ ہر چیز زبان حال سے بحیثیت ایک مخلوق ہونے کے اس کی گواہی دیتی ہے کہ اُس کا کوئی خالق ضرور موجود ہے جو بڑی قدرت اور حکمت والا ہے اور ہر عیب اور نقص سے پاک ہے اور دوسرے معنی یہ ہیں کہ ہر چیز اس زبانِ حال کے علاوہ حقیقت میں بھی اپنی اپنی زبان میں خدا کی حمد و ثنا کرتی ہے جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے: تُسَبِّحُ لَہُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِیْھِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ (رکوع — ۵)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ بھی ان میں موجود ہیں یہ سب کے سب اللہ کی تسبیح کرتے ہیں اور سارے جہاں میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اُس کی حمد و ثنا کے ساتھ اُس کی تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ اُن کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اپنی قدرت اور عظمت و حکمت کو بیان فرما کر ارشاد ہوتا ہے۔

یٰۤاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ اے ایمان والو تم منھ سے وہ بات کیوں نکالتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے۔ یہ اس بات کا اعلان ہے اور اس کی تعلیم ہے کہ سچے مومن کی شان یہ ہے کہ جو زبان سے کہے اُسے پورا کرے۔ حدیث کی اکثر کتابوں میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد موجود ہے آپ فرماتے ہیں:

جس شخص میں چار باتیں ہوں وہ پکّا منافق ہے اور جس میں اُن میں سے ایک بات ہو تو اُس میں نفاق کی ایک نشانی پائی جاتی ہے پھر آپ نے اُن باتوں کو بیان فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ جو امانت اُس کے سپرد کی جائے اُس میں خیانت کرے دوسرے یہ کہ جب بات کرے تو جھوٹ بولے اقرار کرے تو اُس کو پورا نہ کرے اور چوتھی بات یہ کہ جب کسی سے جھگڑے تو حق کے خلاف کہے۔ صحیح مسلم میں اس کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں" اگرچہ وہ نمازی اور روزہ دار ہی کیوں نہ ہو اور اپنے کو مسلمان ہی کیوں نہ کہتا ہو"

ایک مرتبہ حضرت سرورِ کائنات نے ارشاد فرمایا کہ "تم تین باتوں کا ذمہ لے لو تو میں تمہارے لئے جنت کا ذمہ لیتا ہوں۔ جب بولو تو سچ بولو اور جب وعدہ کرو تو اسے پورا کرو۔ اور جب امین بنو تو خیانت نہ کرو۔

ایک سچے مسلمان کے لئے قول و فعل میں ہم آہنگی اور مطابقت ہونا اس کی دلیل ہے کہ اُس کا ایمان پورا ہے ورنہ کتنی ہی عبادتیں کرے اور کیسی ہی کوشش کرے اگر اُس میں زبان و عمل کی سچائی اور مطابقت نہیں ہے تو وہ کبھی سچا مومن نہیں کہا جاسکتا۔ اسی سچائی میں اسلام و ایمان کی اصلی شان پوشیدہ ہے اور اس صفت میں اتنی اہمیت اور شدت ہے کہ بعد کی آیت میں بھی ان الفاظ کے ساتھ اس کی مزید تاکید فرمائی گئی ہے۔ کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ خدا کے نزدیک یہ انتہائی نفرت، ناراضی اور ناپسندیدگی کی بات ہے کہ تم منہ سے وہ کہو جس پر عمل نہ کرو۔

اس کے بعد جہاد کی فضیلت اور اہمیت کا ذکر ہے اور مسلمانوں کو پوری صف بندی اور گہرے اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کے ساتھ اسلام کے دشمنوں سے اُسے بچانے کے لئے اور اس کی حفاظت کے لئے جہاد کرنے کی ہدایت ہے۔ اس اتحاد و اتفاق اور یکجہتی کی تعلیم کے لئے یہاں پر یہ الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔

"کَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ" جو لوگ حق اور اسلام و دیانت کے بچاؤ کے لئے اسلام کے دشمنوں سے ایسی یکجہتی اور اتحاد و یگانگت کے ساتھ مل جل کر جہاد کرتے ہیں کہ گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی مضبوط اور مستحکم دیوار ہیں۔ بیشک اللہ اُن لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے باہمی اتحاد و اتفاق کی مثال ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار سے دی گئی ہے۔ بلا شبہ یہی اتحاد اور یکجہتی اسلام و ایمان کی ایک بڑی نشانی ہے اور اسی باہمی اتحاد پر مسلمانوں کی زندگی اور ہر ترقی کا پورا انحصار ہے۔

خدائے برتر و عظیم تمام فرزندانِ توحید کو اس کی توفیق عطا فرمائے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے سامنے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہو جائیں۔ اور اتفاق کے رشتہ میں جکڑ جائیں اور ایک دل اور ایک جان ہو کر ناموس اسلام کی حفاظت کے لئے اپنی زندگی وقف کر دیں۔

(درس ۱۵۷)

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُونَنِي وَقَد تَّعْلَمُونَ أَنِّي رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُمْ ۖ فَلَمَّا زَاغُوٓا۟ أَزَاغَ ٱللَّهُ قُلُوبَهُمْ ۚ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ○ وَإِذْ قَالَ عِيسَى ٱبْنُ مَرْيَمَ يَٰبَنِىٓ إِسْرَٰٓءِيلَ إِنِّى رَسُولُ ٱللَّهِ إِلَيْكُم مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَىَّ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَمُبَشِّرًۢا بِرَسُولٍ يَأْتِى مِنۢ بَعْدِى ٱسْمُهُۥٓ أَحْمَدُ ۖ فَلَمَّا جَآءَهُم بِٱلْبَيِّنَٰتِ قَالُوا۟ هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ ○

(پارہ ۲۸ رکوع ۹ کی درمیانی آیات ۔ سورۃ صف)

ترجمہ: اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم تم لوگ مجھے کیوں اذیت دیتے ہو حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے بھی اُن کے دِلوں کو ٹیڑھا ہی رہنے دیا اور اللہ بدکار لوگوں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔ اور جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے کہا اے بنی اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ جو کتاب توراۃ مجھ سے پہلے آچکی ہے اُس کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسول کی میں تمہیں خوشخبری سُنانے والا ہوں جن کا نام احمدؐ ہے۔ پھر جب وہ یعنی عیسیٰ یا وہ رسولؐ جنکی انہوں نے بشارت دی تھی۔ اُن کے پاس روشن اور واضح معجزے لیکر آئے تو وہ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

ترجمہ کے بعد اب ان آیاتِ کریمہ کے بعض مشکل الفاظ کی تشریح سنیئے:۔

"زَاغُوْا" ماضی کا صیغہ ہے اور "زیغ" سے بنا ہے اس کے معنی ہیں ٹیڑھا ہونا اور اعتدال کی حالت سے ہٹ جانا۔

"اسرائیل" حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ "اسرا" سُریانی زبان میں بندہ کو کہتے ہیں اور "ایل" سے مراد اللہ کی ذات ہے۔

اس طرح "اسرائیل" کے معنی ہیں "خدا کا بندہ" "بنی اسرائیل" سے مراد وہ قوم ہے جس کا نسب حضرت یعقوبؑ سے ملتا ہے۔

اس قوم کا ذکر قرآن مجید میں بار بار آیا ہے۔ بنی اسرائیل کے سب سے پہلے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام اور آخری نبی حضرت عیسیٰ علیہ السلام تھے۔

حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے درمیان سترہ سَو سال کا زمانہ گذرا تھا۔ اس طویل

وقفہ میں بنی اسرائیل کی ہدایت کے لئے کثرت کے ساتھ پیغمبر آتے رہے اور اُن کی اصلاح کی کوشش کرتے رہے۔

اس قوم "بنی اسرائیل" کا ایک نام "یہود" اور دوسرا "عبرانیئین" بھی ہے۔ ان کی سرکشی اور نافرمانی اور پیغمبروں پر ان کے ظلم وستم کے واقعات تمام تاریخوں میں پائے جاتے ہیں اور قرآن حکیم میں بھی ان کے بہت سے واقعات کا ذکر موجود ہے۔

سورۃ البقرۃ میں ایک مقام پر بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰؑ کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے " وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ط ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ط ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ۔ اور بنی اسرائیل پر رسوائی اور محتاجی کی مار پڑی۔ اور وہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ یہ سب اس وجہ سے ہوا کہ یہ لوگ خدا کی نشانیوں کا انکار اور پیغمبروں کو شہید کرتے تھے اور اس وجہ سے کہ وہ نافرمان اور سرکش تھے۔ پارہ ا رکوع ۷)

پھر سورۂ مائدہ میں اس طرح اُن کا ذکر کیا گیا ہے " قَالَ رَبِّ اِنِّیْ لَاۤ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِیْ وَاَخِیْ فَافْرُقْ بَیْنَنَا وَبَیْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ ط فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِیْنَ۔ (پارہ ۶ رکوع ۸) حضرت موسیٰؑ نے بنی اسرائیل کو قوم "عمالقہ" سے جہاد کرنے کا حکم دیا تھا مگر انہوں نے نبی کی بات کو نہ مانا اور صاف انکار کر دیا اور جواب دیا کہ آپ اپنے خدا کو اپنے ساتھ لیجائیے اور اُن سے جنگ کیجئے ہم تو ہرگز نہیں لڑیں گے اسی موقع پر حضرت موسیٰؑ نے خدا کی بارگاہ میں عرض کیا تھا۔ پروردگار تو خوب جانتا ہے کہ مجھکو اپنی ذات اور اپنے بھائی کے سوا کسی دوسرے پر قابو نہیں ہے اس لئے اب ان نافرمان لوگوں کے اور ہمارے درمیان جدائی ڈالدے۔ ہمارا اور ان کا اب ساتھ نہیں ہو سکتا۔ خدا نے فرمایا کہ اچھا تو ان کی سزا یہ ہے کہ اب ان کو چالیس سال تک اس سرزمین عمالقہ کی حکومت نصیب نہ ہوگی اور یہ اس لمبی مدت تک صحرا میں بھٹکتے پھریں گے تو پھر اے موسیٰؑ تم ان بدچلن لوگوں پر افسوس نہ کرنا۔ غرض ان آیات کریمہ میں ان ہی واقعات کی طرف اشارہ ہے کہ بنی اسرائیل نے کس طرح حضرت موسیٰؑ کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں پہونچائیں اور اُن کی نافرمانی کرتے رہے۔

حضرت موسیٰ کے واقعات کی طرف اشارہ کر کے گویا ایک طرح پر نبی اکرمؐ کو تسلی دی جا رہی ہے۔ اور ساتھ ہی مسلمانوں کو ادب سکھایا جا رہا ہے کہ وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کریں جس سے پیغمبرؐ کا دل میلا ہو جیسے سورۂ احزاب میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ "یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَکُوْنُوْا کَالَّذِیْنَ اٰذَوْا مُوْسٰی۔ اے ایمان والو! تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰ کو اذیت پہونچائی تھی۔

ان آیات میں اس کے بعد حضرت عیسیٰ بن مریم کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ جبکہ انہوں نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں اپنے سے پہلے آنے والی کتاب کی تصدیق کرتا ہوں اور اپنے بعد آنے والے ایک رسولؐ کی پیشین گوئی کرتا ہوں اور ان کی خوشخبری دیتا ہوں جن کا نام "احمد" ہے۔ توراۃ اور انجیل اپنی اصلی حالت پر باقی نہ رہ سکیں لیکن اس عظیم تبدیلی کے باوجود جو ان کتابوں میں ہوئی ہے۔

اب بھی یوحنا کی انجیل کے عربی ترجمہ کے چودھویں باب میں حضرت عیسیٰ کا یہ قول موجود ہے کہ تمہارے لئے میرا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤنگا تو "فار قلیط" تمہارے پاس نہیں آئیگا۔ عبرانی زبان میں۔ فارقلیط کے وہی معنی ہیں جو عربی میں "احمد" کے ہیں۔ پھر انجیل یوحنا میں " فارقلیط " کی جو صفتیں بیان کی گئی ہیں وہ سرور انبیاء صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے سوا کسی دوسری شخصیت پر پوری نہیں اترتیں مثلاً یہ کہ وہ تمہیں ہر چیز کی تعلیم دے گا، وہ سارے جہان کا سردار ہے، وہ دنیا والوں کو گناہوں پر سزا دے گا اور وہ سچائی کی روح ہے جو تمہارے ساتھ ابد تک رہے گا۔ اسی طرح کی اور صفتیں بھی ان کتابوں میں موجود ہیں جو سوائے ذات نبی کے کسی اور پر منطبق نہیں ہوتیں۔ بلا شبہ آپ ہی کی ذات اقدس والور ہے جس کی تصدیق ہر نبی نے کی اور ہر پیغمبر سے خدا نے آپ کی نبوت کا اقرار اور عہد لیا اور ہر آسمانی کتاب نے آپ کے آنے کی بشارت دی تھی۔ آپ نے خود بھی اکثر فرمایا ہے کہ میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا ہوں اور حضرت عیسیٰ کی بشارت ہوں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ نے آپ کے نور اطہر کو اس وقت پیدا کیا تھا جب عالم کی کوئی مخلوق بھی پیدا نہ ہوئی تھی آپ کا ارشاد ہے۔ "اَوَّلُ مَا خَلَقَ اللہُ نُوْرِیْ" اللہ نے سب سے پہلے میرے نور کو خلق فرمایا اور دوسرے "کُنْتُ نَبِیًّا وَّاٰدَمُ بَیْنَ الرُّوْحِ وَالْجَسَدِ" میں اس وقت نبی تھا جب آدمؑ جسم و روح کے درمیان تھے یعنی خلق ہو رہے تھے۔ مشکوٰۃ اور مسند احمد میں آپ کا یہ ارشاد گرامی بھی درج

ہے کہ "میں اللہ کے نزدیک اُس وقت خاتم النبیین تھا جب حضرت آدمؑ کی خلقت مٹی اور پانی کی منزل میں تھی۔ یہ تمام روایتیں علماء و محدثین اسلام نے اپنی کتابوں میں درج کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انورؐ اپنی ابتدائے خلقت سے صفت نبوت و خاتمیت کے حامل تھے۔ مگر یہ اللہ کی مصلحت تھی کہ اس نبوت کے ظاہر کرنے اور اعلان کرنے کا حکم آپ کی ولادت باسعادت کے چالیسؐ برس بعد ہوا۔ حضرت عیسٰی بن مریم نے ماں کی گود میں آکر یہ آواز دی تھی "اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتَانِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا" میں خدا کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور نبوت کا مرتبہ اور شرف دیا ہے تو ہمارے رسولؐ نے یہ اعلان فرمایا کہ میں اُس وقت خدا کے نزدیک خاتم النبیین تھا جب آدمؑ پیدا بھی نہ ہوئے تھے۔

(درس ۱۵۸)

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰہِ الْکَذِبَ وَھُوَ یُدْعٰۤی اِلَی الْاِسْلَامِ ؕ وَاللّٰہُ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○ یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ بِاَفْوَاھِھِمْ وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ○ ھُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ ○

(پارہ ۲۸، رکوع ۹ کی آخری آیات۔ سورۃ الصفؑ)

ترجمہ: اور اُس شخص سے زیادہ کون ظالم ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے حالانکہ وہ اسلام کی طرف بلایا جاتا ہو اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت کی توفیق نہیں دیتا۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو اپنے منہ سے بجھا دیں اور اللہ اپنے نور کو پورا کر کے رہیگا اگرچہ کفار کیسے ہی ناخوش ہوں۔ وہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ اُس کو اور تمام دینوں پر غالب کر دے اگرچہ مشرکوں کو یہ بات کتنی ہی بری کیوں نہ معلوم ہو۔

ترجمہ کے بعد ان آیات کریمہ کے بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے :-

"یُطْفِئُوْا" مضارع کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر "اِطْفَاءٌ" ہے جس کے معنی ہیں شعلہ کا بجھانا۔ قرآن حکیم میں دو مقامات پر اس جملہ کو کچھ مناسب تبدیلی کے ساتھ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ابھی جس آیہ کریمہ کی تلاوت کی گئی تھی اُس میں "یُرِیْدُوْنَ لِیُطْفِئُوْا" کے الفاظ ہیں اور سورۂ توبہ میں بغیر لام کے یعنی "یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰہِ" ارشاد ہوا ہے۔ مقصود دونوں جگہ تقریباً ایک ہی ہے لیکن جیسا کہ علامہ راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن"

میں تحریر کیا ہے۔ ان دونوں جملوں میں معنوی طور پر یہ فرق پایا جاتا ہے کہ "یُرِیدُونَ اَنْ یُّطْفِئُوا" کے معنی نورِ الٰہی کو بجھانے کا قصد کرنے کے ہیں مگر جہاں "لِیُطْفِئُوا" ہے اُس کے معنی ایسے امر کا قصد کرنے کے ہیں جو نورِ خدا بجھانے کا سبب بن سکے۔

"اَفْوَاہ" جمع ہے۔ "فُوْہ" کی۔ یہ آدمی کے منہ کے لئے بولا جاتا ہے۔ کچھ اسی مناسبت سے اردو زبان میں بھی "اَفْوَاہ" کا لفظ "شہرت" کے لئے اور ایسی بات کے لئے بولتے ہیں جو ایک منہ سے دوسرے منہ تک پھیل جائے اور ہر طرف اُس کا چرچا ہو جائے پھر عربی زبان کے قاعدوں کے مطابق "فوہ" کے لفظ میں کچھ تبدیلی کر کے اس کو "فم" کہا جانے لگا اور منہ کے معنی میں اسی لفظ کی زیادہ شہرت ہو گئی۔

"نُوْرُ اللّٰہ" سے مراد دین اسلام اور خدا کی ساری نشانیاں اور حجتیں ہیں۔ اس نورِ الٰہی کو منہ سے بجھانے کی کوشش کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین و کفار اپنی دوسری سازشوں کے علاوہ اسلام کے خلاف بے بنیاد اور جھوٹی باتیں مشہور کیا کرتے ہیں اور لوگوں میں طرح طرح کی غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دینِ حق کو مٹا ڈالیں اور اُس کا دنیا میں نام و نشان تک باقی نہ رہے مگر وہ اپنی اس کوشش میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے کیونکہ اللہ اپنے نور کو تمام کر کے رہیگا۔

اس طرح یہ الفاظ یعنی "وہ منہ سے نورِ خدا بجھانے کا قصد کرتے ہیں"۔ یہ تفصیل ہے اس سے پیشتر کی آیت کی جس میں ارشاد ہوا ہے کہ "اُس شخص سے زیادہ کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے اور افترا کرے" اور پھر اس کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مشیتِ الٰہی اور ارادۂ خداوندی کے خلاف کوشش کرنا، معجزات اور قرآن حکیم کو باطل کرنا یا خدا کے رسولؐ کو مغلوب کرنا اور آپ کی تبلیغ و ہدایت کی سعی کو برباد کرنے کا قصد کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی اپنے منہ سے پھونک مار کر سورج کی روشنی کو بجھا دینے کی کوشش کرے۔

ان آیات میں خدا پر افترا کرنے اور جھوٹ باندھنے کا بھی مطلب یہی ہے کہ نبوت و رسالت اور ان تمام چیزوں کو جھٹلایا جائے جو اللہ کی جانب سے ہیں۔ پھر اس کے بعد یہ جملہ یعنی "وَهُوَ يُدْعَىٰ إِلَى الْإِسْلَامِ" اس وجہ سے ارشاد ہوا تاکہ صورت حال کی اہمیت اور زیادہ ظاہر ہو جائے یعنی بغیر تنبیہ کئے اور بغیر توجہ دلائے انسان کا فرض تھا کہ وہ خود ہی ان باتوں کو سمجھتا چہ جائے کہ

آگاہ بھی کیا جارہا ہے مگر پھر بھی وہ ہوشیار نہیں ہوتا اور آنکھ نہیں کھولتا بلکہ اس سے آگے بڑھکر وہ خدا کی نشانیوں کو جھٹلاتا بھی ہے اور اُس کے رسولؐ اور اُس کی کتاب کی تکذیب کرتا ہے غرض انسان کو عقل اسی لئے دی گئی ہے کہ وہ اُس سے کام لے اور کائنات کے رازوں کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ اگر وہ تھوڑا سا بھی غور کرے گا تو اُس کی عقل اُسے بتادے گی کہ یہ تمام زمین و آسمان اور ان کے اندر کی مخلوق جو بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں سے بھری ہوئی ہے بغیر کسی عظیم حکمت و قدرت رکھنے والے خالق کے نہیں بن سکتی تھی اور اُسے اس بات کو بھی ماننا پڑے گا کہ ایسے صاحبِ حکمت خالق کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ اپنی مخلوق کی زندگی باقی رکھنے کے لئے اور اس کی حفاظت و ہدایت و ترقی کے لئے ایسا نظام بنادے اور ایسے وسائل و اسباب بھی پیدا کردے جو اُس کی مخلوق کی زندگی، بقا اور امن و سکون کے لئے ضروری ہوں۔ عقل انسانی کا یہ کام تھا کہ وہ خالق کائنات کی عظمت اور تخلیق کے رازوں کو خود ہی سمجھتی اور ان سب حقیقتوں کا اقرار کرتی چہ جائیکہ اُس کو مدد دینے کے لئے انبیاء و مرسلین کو بھیجا گیا، کتابیں نازل ہوئیں اور معجزے ظاہر کئے گئے پھر بھی اگر انسان کی باطنی آنکھوں سے غفلت کے پردے نہیں اُٹھتے تو وہ اس کا مستحق ہے کہ اُس سے ہدایت کی توفیق کو سلب کرلیا جائے اور اُسے اس غفلت کی پوری پوری سزا ملے۔

اسی نتیجہ کی طرف " وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ " کے جملہ سے اشارہ فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے انسانوں سے جو اپنی عقل سے کام نہیں لیتے اور اللہ کی نشانیوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ اللہ اپنی ساری توفیقوں کو سلب کرلیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی " لَا يَهْدِي " کے فقرہ سے ممکن ہے کہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہو کہ یہ کافر و مشرک کتنا ہی آیاتِ خداوندی کی تکذیب کریں اور دینِ حق اور پیغامِ الٰہی کو فنا کرنے کی سعی میں لگے رہیں مگر کبھی خدا اُن کے اس بدترین مقصد میں اُنہیں کامیاب نہیں ہونے دیگا۔ اور یہی وجہ تھی کہ تحریف اور کمی و زیادتی کی بھرپور کوششوں کے باوجود آج بھی انجیل و توراۃ کے نسخوں میں حضرت خاتم النبیینؐ کے متعلق بشارتوں کا کثیر ذخیرہ موجود ہے جس کو کسی طرح بھی چھپایا نہ جاسکا۔ اسی طرح خود اسلام کو مٹانے کی بھی کوئی تدبیر کبھی کارگر نہ ہوسکی حالانکہ ظہورِ اسلام کے وقت مسلمانوں کی جو حالت تھی اُسے ساری دُنیا جانتی ہے۔ نہ اُن کے پاس دولت و ثروت کے خزانے تھے نہ اسلحہ کا انبار تھا اور نہ لشکروں کی کثرت تھی غرض اقتصادی، معاشی، سیاسی اور فوجی یا

علمی اور فنی حیثیت سے، اسلامی نظام زندگی کے اندر داخل ہونے سے پہلے اُن کا کوئی مقام ہی نہ تھا۔ اگر وہ ایک طرف یہودی سرمایہ داروں کے غلام تھے جنہوں نے ان کی رگوں سے آخری قطرۂ خون بھی چوس لیا تھا تو دوسری طرف قریش کے قبائلی اقتدار کی زبردست گرفت نے اُن کو ہر طرح بےبس اور مجبور بنا رکھا تھا لیکن اس بےبسی کے باوجود ہجرت کے بعد مدینہ کی صرف دس برس کی مختصر تاریخ میں یہی بے سروسامان قوم رسولؐ اسلام کی عظیم قیادت میں اتنی منظم اور مستحکم ہو گئی اور اس بلندی پر پہونچ گئی جس کا اسلام کے مخالفوں کو تصور بھی نہ تھا اور اس طرح وہ نور جسے تمام اور کامل کرنے کا اللہ ارادہ فرما چکا تھا اُسے کفر و شرک کی آندھیاں بجھانے میں کامیاب نہ ہو سکیں اور وہ کوہ فاران کی چوٹیوں سے ابھر کر کائنات کی آخری پہنائیوں تک پھیل گیا اور اب ابد تک باقی رہے گا۔

(درس ۱۵۹)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ تِجَارَةٍ تُنجِيكُم مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ ۝ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنفُسِكُمْ ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنَّاتِ عَدْنٍ ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ۝ وَأُخْرَىٰ تُحِبُّونَهَا ۖ نَصْرٌ مِّنَ اللَّهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ۝

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۰ کی ابتدائی آیات۔ سورۃ الصف)

ترجمہ: اے ایمان والو کیا میں تم کو ایسی تجارت بتا دوں جو تمہیں (آخرت کے) دردناک عذاب سے نجات دے (وہ یہ ہے کہ) تم خدا اور اُس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور اپنے مال اور جان سے خدا کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لئے بہت ہی بہتر ہے اگر تم کچھ سمجھ رکھتے ہو۔ خدا تمہارے گناہ معاف کرے گا اور تمہیں ایسے باغوں میں پہونچا ئیگا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی اور پاکیزہ مکانات میں جگہ عطا کرے گا جو ہمیشہ رہنے اور قیام کرنے کی جنتوں میں ہوں گے۔ یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور ایک دوسری چیز بھی ہے جسے تم پسند کرتے ہو۔ اللہ کی طرف سے مدد اور جلدی فتح یابی اور (اے رسول) تم صاحبانِ ایمان کو اس کی خوشخبری دیدو۔

ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے:-

"اَدُلُّ" کا مصدر "دَلَالَۃٌ" ہے۔ اس کے معنی ہیں راہ دکھانا اور پتہ نشان بتانا۔

"دلیل" راہ دکھانے والے کو کہتے ہیں اور کسی بات کے ثابت ہونے کے سبب کو بھی۔

"عَدْنٌ" کے معنی کسی جگہ پر ٹھہرنے کے ہیں۔

"جَنّٰتُ عَدْنٍ" یعنی وہ جنتیں اور باغ جو ہمیشہ قیام کرنے اور رہنے کے لئے ہیں۔

ایک مرتبہ حضور سرور کائنات صلّی اللہ علیہ والہ وسلم سے صحابہ کرام نے دریافت کرنا چاہا کہ اللہ کو سب سے زیادہ کونسا عمل پسند ہے۔ ابھی آپس میں مشورہ ہی ہو رہا تھا اور یہ طے نہ ہوا تھا کہ کون شخص خدمت رسولؐ میں حاضر ہو کر یہ سوال کرے اسی اثنار میں آنحضرتؐ کا قاصد آگیا اور اصحاب کرام میں سے ایک ایک کو بلا کر نبی کریمؐ کے پاس لے گیا۔

جب سب جمع ہو گئے تو آپ نے اسی سورۂ صف کی تلاوت فرمائی جس میں اُن تمام باتوں کا جواب موجود ہے جنہیں صحابہ کرام دریافت کرنا چاہتے تھے۔

اس میں خدا نے ارشاد فرمایا ہے کہ آؤ میں تمہیں ایک ایسی نفع والی تجارت اور فائدہ پہونچانے والا کاروبار بتا دوں جس میں گھاٹے کی کوئی صورت ہی نہیں ہے اور یہی خدا کے نزدیک سب سے زیادہ محبوب چیز ہے جسے تم معلوم کرنا چاہتے ہو اور وہ یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت اور اُس کے رسولؐ کی رسالت پر ایمان لاؤ اور اس کا سچے دِل سے اقرار کرو اور اپنی جان و مال کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے پر تُل جاؤ اور اس کا پورا یقین رکھو کہ یہی چیز تمہارے لئے سب سے بہتر ہے۔ پھر فرماتا ہے کہ اگر تم میری بتائی ہوئی اس تجارت کو اختیار کرلو گے تو میں تمہاری لغزشوں اور گناہوں سے درگذر کروں گا اور جنتوں کے پاک و پاکیزہ گھروں میں تم کو جگہ دوں گا اور آخرت کے ثواب کے علاوہ دنیا میں بھی تم کو اس کا اجر یہ ملے گا کہ تمہیں اپنے دشمنوں پر فتح مبین حاصل ہو گی اور اللہ کی نصرت و مدد تمہارے شامل حال ہو گی۔

یہ فتح و نصرت اور آخرت کی ابدی نعمتیں صرف اُن لوگوں کو ملیں گی جو خدا اور رسولؐ کی خلوص کے ساتھ اطاعت کریں گے اور دین کی خدمت میں اپنی جان و مال اور کسی چیز سے بھی دریغ نہ کریں گے۔

ان آیات کریمہ میں ایک عجیب فصیح و بلیغ طریقہ پر اور دل میں بیٹھ جانے والے موثر ترین انداز میں ایمان و تقویٰ اور راہِ خدا میں مال و جان سے جہاد کرنے اور قربانیاں پیش کرنے کے لئے دعوت دی گئی ہے اور یہ سمجھایا گیا ہے کہ دُنیا کی تمام تجارتوں اور ہر قسم کے کاروبار میں گھاٹے اور فائدے کے دونوں پہلو ہوا کرتے ہیں مگر ایسا کاروبار اور ایسا سودا جس میں نفع ہی نفع ہو اور نقصان کا کوئی پہلو ممکن ہی نہ ہو وہ صرف سچا ایمان اور تقویٰ ہے اور خدا کی راہ میں جان و مال کی قربانیاں پیش کرنے کا نام ہے۔ اس مقام پر ایمان و اطاعتِ خدا و رسول کے لئے تجارت کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے اور قرآن حکیم میں ایک دوسرے مقام پر بھی اس لفظ کو ایسے ہی موقع پر بولا گیا ہے اور غرض یہی ہے کہ جس طرح تجارت میں سرمایہ لگانے کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ اس کے عوض میں اللہ کی خوشنودی حاصل ہو اور اُخروی نعمتیں ملیں اس بنا پر یہ بھی ایک طرح کی تجارت ہے مگر فرق صرف اتنا ہے کہ اس تجارت میں دنیاوی کاروبار کی طرح گھاٹے اور خسارے کا کوئی پہلو ممکن نہیں ہے۔ بشرطیکہ اس میں جو سرمایہ لگایا جائے یعنی ایمان و تقویٰ اور جذبۂ اطاعتِ خدا و رسول۔ اس میں ذرا سا بھی عیب اور نقص اور کھوٹ موجود نہ ہو اور خوشنودیٔ خدا کے سوا کوئی دوسرا مقصد اس میں شامل نہ کیا جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ خود ایمان کسے کہتے ہیں اور "سبیل خدا" سے کیا مراد ہے یا جہاد کا مفہوم کیا ہے تو اس کی تشریح اس کے بعد کی آیات کی تفسیر کے ساتھ بیان ہوگی۔

(درس ۱۶۰) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ ۚ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ ۝

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۰ کی آخری آیات۔ سورۃ الصف)

ترجمہ: اے ایمان والو تم اللہ کے مددگار بن جاؤ جس طرح مریم کے بیٹے عیسیٰ نے حواریوں سے کہا تھا۔ کون ہے جو اللہ کی طرف بلانے میں میرا مددگار رہے۔

وہ حواری کہنے لگے ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ تو بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا

اور ایک جماعت کافر رہی پس ہم نے ایمان والوں کی اُن کے دشمنوں کے مقابلہ میں تائید کی تو آخروہی غالب ہو گئے۔

ان آیاتِ کریمہ کے بعض الفاظ کی تشریح یہ ہے :-

"انصارُ اللّٰہ" کے معنی ہیں۔ وہ لوگ جو اللہ کی مدد اور نصرت کرنے والے ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ اپنے بندوں اور اپنی مخلوق سے مدد لیتا ہے اور اُن کی نصرت حاصل کرنے کا محتاج ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ بندے اُس کے دین اور اُس کے پیغام کی تبلیغ کرتے ہیں اور اُس کے احکام کو بجالاتے ہیں۔ اُس کے رسولوں کی پیروی کرتے ہیں اور اُن کی لائی ہوئی شریعت کی حفاظت کا فرض انجام دیتے ہیں۔ اُن کا یہ عمل خدا کے نزدیک اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ وہ اس کو اپنے بندوں کی جانب سے خود اپنی ذات کے لئے مدد اور نصرت کے لفظ سے یاد فرماتا ہے اور بلاشبہ یہ اُس کی رحمت اور اُس کا کرم ہے ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تمام جہان کا پروردگار اور ہر چیز کا مالک و مختار ہے۔ مخلوقات کی کیا مجال ہے کہ وہ اپنے پیدا کرنے والے کی مدد کر سکے۔ بندوں کی کیا طاقت ہے کہ وہ اپنے مالک اور آقا اور معبود کی اعانت کر سکیں جو اُن کی زندگی اور موت، بقا و فنا، راحت و آرام اور ہر شئے کا مالک ہے اور اُس کی قدرت و سلطنت زمین و آسمان کی ہر مخلوق کو گھیرے ہوئے ہے۔

"حَوَارِیُّوْنَ" حواری کی جمع ہے۔ یہ لفظ "حَوْر" سے بنا ہے جس کے معنی کپڑے کو دھو کر صاف اور اُجلا کرنے کے آتے ہیں اور اسی بنا پر "حَوَارِیّ" اُس شخص کو کہا جاتا ہے جو کپڑوں کو دھوتا اور انہیں کثافت اور گندگی سے پاک کرتا ہو۔ پھر یہ لفظ انبیاءؑ و مرسلین کے خاص اصحاب کے لئے بولا جانے لگا اور مناسبت یہ تھی کہ وہ لوگ اپنی نصیحتوں اور تعلیموں اور اقوال و سیرت سے لوگوں کے دلوں کو گمراہی اور گناہ کی گندگی سے پاک و صاف کیا کرتے تھے اور دینِ خدا کی تبلیغ کرتے تھے۔ خود حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے اصحابِ کرامؓ کے لئے اس لفظ کا استعمال فرمایا ہے اور اہلبیت اطہار علیہم السلام کی روایات میں بھی اصحابِ رسولؐ رضوان اللہ علیہم اور خود اہلبیتؑ اطہار کے خاص اصحاب کے لئے "حَوَارِی" کا لفظ بولا گیا ہے۔ مگر زیر بحث آیاتِ کریمہ میں "حَوَارِیُّوْن" سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام کے وہ خاص بارہ صحابی ہیں جو آپ پر سب سے پیشتر ایمان لائے تھے۔ اس سے پہلے جن آیات کی تفسیر بیان ہوئی تھی اُن میں بھی اللہ کے

اور رسول پر سچے دل سے ایمان لانے اور مال و جان کے ساتھ راہ خدا میں جہاد کرنے کی تعلیم دی گئی ہے اور اس کے نتیجہ میں دنیا و آخرت کی جو عظیم نعمتیں اور کامیابیاں حاصل ہوں گی اُن کو بھی بتا دیا گیا ہے۔ اب ان آیاتِ کریمہ میں بھی دوسرے عنوان سے پھر اس حقیقت کو واضح کیا جا رہا ہے اور خطاب پہلے کی طرح ان آیتوں میں بھی اُن ہی لوگوں کی جانب ہے جو زبان سے ایمان لانے کا اظہار کرتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو زبانی اقرار کے ساتھ دل سے اس ایمان کی تصدیق کرنے کے خواہشمند ہیں۔ اُن ہی سے ان آیاتِ کریمہ میں بھی خطاب ہو رہا ہے "کُونُوٓا اَنصَارَ اللّٰہِ" اگر تم کو سچا مومن بننا ہے تو خدا کے مددگار ہو جاؤ اور اس کے دین کی اپنی جان اور اپنے مال سے نصرت کرو۔ خدا کا مددگار اور ناصر بننے کا مطلب ابھی واضح کر دیا گیا، اس لئے انصارُ اللہ وہی لوگ کہے جا سکتے ہیں جو احکامِ خداوندی پر عمل کرنے والے اور دینِ حق اور شریعت الٰہیہ کی دل، زبان اور قول و عمل سے حفاظت کرنے والے ہوں اور ظاہر ہے کہ یہ وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو سچے مومن ہوں اور سچے مومن وہی ہوں گے جو اپنی ہر چیز یہاں تک کہ اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں قربان کرنے سے کبھی دریغ نہ کریں۔ گذشتہ درس اور آج کے درس میں جو آیات زیر بحث ہیں اُن سب میں تین لفظیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ ایمان، سبیلُ اللہ اور جہاد، اور ان تینوں لفظوں میں بھی "ایمان" خود ہی ایک ایسا لفظ ہے جس کے مفہوم میں جہاد فی سبیل اللہ ...... کا ہر پہلو موجود ہے کیونکہ اگر خدا کے مقابلہ میں جان و مال کو ترجیح دی جائے اور اُسے عزیز رکھا جائے تو ایمان پھر کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ ایمان کا اصلی مقصد اور حقیقی غرض یہی ہے کہ اللہ اور رسول کے احکام کے سامنے نہ جان عزیز رکھی جائے اور نہ مال۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰٓی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ" یعنی تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں بن سکتا جب تک وہ مجھکو اپنے باپ، اولاد اور سارے ہی انسانوں سے زیادہ محبوب نہ رکھے۔

غرض ایمان کی بنیاد ہی یہ ہے کہ انسان اللہ اور رسول کے سامنے اپنی ذات اور اُن کے حکم و مشیت کے مقابلہ میں اپنی تمام خواہشات کو بالکل بھول جائے اور وہی کرے جیسے خدا اور رسول چاہتے ہوں

زبان سے اُن کی اطاعت و فرماں برداری کا اقرار کرے اور دل سے اس اقرار کی تصدیق کرے اور پھر یہ ظاہر بات ہے کہ جب وہ دل سے تصدیق کرے گا تو اُس کا اثر اُس کے کردار اور عمل پر پڑنا ضروری ہے اور وہ اس کی پوری سعی کرے گا کہ ہر ممکن صورت سے خدا کی خوشنودی حاصل کرے۔ اسی کوشش کا نام جہاد ہے۔ یہ جہاد کبھی میدانِ جنگ میں تلوار سے ہوتا ہے اور کبھی زندگی کے دوسرے میدانوں میں ایمان و تقویٰ اور عمل صالح کے اسلحہ سے کبھی یہ جان کے ساتھ کیا جاتا ہے اور کبھی مال و دولت اور خواہشاتِ نفس کی قربانی کے ذریعے سے کبھی یہ مادّی قوتوں کے مقابلہ میں ہوتا ہے تو کبھی شیطانی طاقتوں اور طاغوتی لشکروں کے مقابلہ میں سچا اور صحیح ایمان حاصل کرنے کے لئے خدا و رسولؐ اور دینِ حق کی سچائی پہ اعتقاد رکھنا ہر حال میں ضروری ہے اگر یہ اعتقاد نہ ہوگا تو ایمان کا وجود ہی نہیں ہو سکتا اور ایمان نہ ہوگا تو ہمارے اعمال کی اصلاح ممکن ہی نہیں ہو سکتی اس لئے کہ انسان کے تمام اعمال کی اصلاح اُس کے نفس ہی کی اصلاح پر موقوف ہے اور ایمان کا سب سے بڑا مقصد انسان کے نفس ہی کی اصلاح ہے۔ پھر اگر یہ مقصد حاصل نہ ہوگا۔ کیونکہ اس پورے سلسلہ کا مقصد نہ صرف اعتقاد اور نہ صرف عمل پر بلکہ اعتقاد اور عملِ صالح دونوں کے مجموعہ پر موقوف ہے۔ جس کی طرف قرآنِ حکیم کا یہ ارشاد اشارہ کر رہا ہے " الذین آمنوا و عملوا الصالحات" (پارہ یکم رکوع ۳)

جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے (اے رسول) انہیں جنتّوں کی بشارت دیدو۔ اور چونکہ ایمان کی اصلی غرض کردار ہی کی اصلاح ہے اس لئے قرآن حکیم ہر نیکی اور ہر خوبی کو ایمان ہی کا خاصہ بتاتا ہے اور صاحبان ایمان صرف اُن ہی لوگوں کو کہتا ہے جو خدا کے نزدیک نیک عمل ہوں اس گفتگو سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ جتنی بھی بھلائیاں اور خوبیاں ممکن ہو سکتی ہیں وہ جس جڑ سے نکلتی ہیں وہ صرف ایمان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام نیکیوں کی عمارت بغیر کسی بنیاد کے ہوگی اور یہ بنیاد بھی اُس وقت تک بے معنی اور بیکار ہے جبتک اس کے ساتھ عملِ صالح موجود نہ ہو۔ اور جب یہ دونوں یعنی صحیح اعتقاد اور عمل صالح ایک جگہ پر جمع ہوتے ہیں تو ایمان کے حقیقی مقصد اور اصلی غرض کی تکمیل ہوتی ہے۔

اس طرح سچے اعتقاد اور خالص جذبۂ اطاعتِ خدا و رسولؐ کا نام ایمان ہے اور وہ راستہ اور وہ طریقہ جس سے اللہ کی خوشنودی کا حصول ہو سبیل اللہ ہے اور اس رضائے الٰہی کے حصول کی سعیِ کامل کو جہاد کہتے ہیں۔

(۳۸) يُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ○ هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۙ وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ ۗ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ○ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ○ ۱۶۱

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۱ کی ابتدائی آیات - سورۃ الجمعۃ)

ترجمہ: سب چیزیں جو آسمان اور زمین میں ہیں اللہ کی تسبیح کرتی ہیں جو بادشاہ ہے، بے حد پاک ہے، غالب ہے، حکمت والا ہے۔ وہی ہے جس نے اُمیّوں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان کو اُس کی آیتیں پڑھکر سُناتا ہے اور انہیں پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور عقل کی باتیں سکھاتا ہے اگرچہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے اور ان میں سے اُن دوسرے لوگوں کی طرف بھی بھیجا جو ابھی تک اِن میں شامل نہیں ہوئے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم کا مالک ہے۔

اس ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔ "یُسَبِّحُ" کا مصدر تسبیح ہے اور تسبیح کا لفظ "سَبْحٌ" سے بنا ہے جس کے اصل معنی پانی یا ہوا میں تیز رفتار کے ساتھ گذرنے کے آتے ہیں اسی مناسبت سے اس لفظ کو آسمان میں ستاروں کی گردش کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآنِ حکیم میں ارشاد ہوا ہے "كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ" (پارہ ۱۰ رکوع ۲)، سورج اور چاند ایک آسمان میں تیرتے ہیں یعنی گردش کرتے ہیں۔ اس کا یہی مفہوم لفظِ تسبیح میں بھی پایا جاتا ہے یعنی عبادت الٰہی میں تیزی کرنا مگر پھر اس لفظ "تسبیح" کا استعمال خدا کی عظمت کے اقرار، اُس کی ذات کو ہر نقص و عیب سے پاک قرار دینے اور ہر قسم کی عبادت الٰہی کے لئے ہونے لگا۔ یہ تسبیح کبھی زبان سے بول کر کی جاتی ہے اور کبھی زبانِ حال سے۔ زبان سے بول کر تسبیح کرنا تو سب کو معلوم ہے اور زبانِ حال کی تسبیح سے مراد یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز اپنی خلقت اور اُن حالات کی وجہ سے جو اُس میں پیدا ہوتے ہیں ہر صاحبِ عقل کو یہ بتاتی ہے کہ وہ خود بخود نہیں پیدا ہوئی بلکہ کسی دوسری ذات نے اُسے خلق کیا ہے۔ اسی طرح اُس کی فطرت خدا کے وجود اور اُس کے صفات و کمالات کی طرف اشارہ کرتی ہے اور یہی خاموش طریقہ پر اللہ کی عظمت و قدرت کا طرح طرح سے اظہار کرنا زبانِ حال کی تسبیح

کہلاتا ہے۔ تسبیح کی یہ قسم اُس مخلوق میں بھی پائی جاتی ہے جو ناطق یعنی سمجھ رکھنے اور بولنے والی ہے کیونکہ اُس کو بھی خدا ہی نے بنایا ہے اور اُس میں بھی وہی فطری حالات موجود ہیں جو دوسری مخلوقات میں پائے جاتے ہیں۔ زیر نظر آیات کریمہ میں یہی ارشاد ہوا ہے کہ جو چیزیں آسمانوں اور زمینوں میں موجود ہیں وہ سب خدا کی تسبیح کرتی ہیں مقصود یہ ہے کہ کچھ تو اُن میں سے زبانِ حال سے تسبیح کرتی ہیں اور کچھ اپنی زبان سے بول کر سورہ بنی اسرائیل میں مخلوقات کی اس تسبیح کا تذکرہ اس طرح فرمایا گیا ہے۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط (پارہ ۱۵ رکوع ۵)

ساتوں آسمان اور زمین اور جو لوگ بھی اُن میں ہیں سب اُس کی تسبیح کرتے ہیں اور سارے جہان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اُس کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح نہ کرتی ہو مگر تم لوگ اُن کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ کچھ علماء تو یہی کہتے ہیں کہ اس آیت میں اور اسی طرح کی دوسری آیات میں نہ بولنے والی مخلوق کی تسبیح سے زبانِ حال کی تسبیح مراد ہے۔ یعنی اُن کی حالت اور کیفیت اللہ کی قدرت کاملہ اور اُس کی عظمت و بزرگی کا اظہار کرتی ہے لیکن علماء و مفسّرین کی اکثریت اس کی قائل ہے کہ زبانِ حال کی تسبیح کی طرح ہر ایک مخلوق خود اپنی اپنی زبان سے بھی بول کر خدا کی تسبیح کرتی ہے چاہے وہ جاندار اور زبان رکھنے والی مخلوق ہو یا نہ ہو۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے حقیقی خالق اور مالک کو پہچاننے کی صلاحیت اللہ نے ہر مخلوق کو عطا فرما دی ہے اور اُس کی خلقت و فطرت کے مطابق ویسی ہی زبان بھی اُسے دے دی ہے تاکہ وہ خدا کی تسبیح کر سکے خواہ وہ مخلوق ناطق اور بولنے والی ہو یا صامت اور نہ بولنے والی ہو یہ اور بات ہے کہ ہم اُس کی تسبیح اور اُس کی زبان اپنی کم علمی کی وجہ سے نہ سمجھ سکیں۔ اس پر دلیل یہ دی گئی ہے کہ اگر بے جان اور نہ بولنے والی مخلوق کی تسبیح سے مراد حقیقی تسبیح نہ ہوتی تو خدا اس آیہ کریمہ میں جیسے ابھی تلاوت کیا گیا یہ نہ فرماتا " وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ " لیکن تم ان کی تسبیح کو نہیں سمجھتے۔ اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ سب چیزیں واقعی طور پر تسبیح خدا کرتی ہیں مگر ہم اُسے سمجھ نہیں سکتے کیونکہ ہم اُن کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ کائنات کے رازوں کو سوائے اللہ اور اُس کے برگزیدہ بندوں کے کون جان سکتا ہے! اور کسے معلوم ہے کہ اُس نے کس مخلوق کو کونسی زبان عطا کر دی ہے! لیکن اگر دنیا کی خاموشی

مخلوق کوئی نہ کوئی زبان نہ رکھتی یا نہ رکھ سکتی تو پھر قیامت کے دن اعضاء بدن کی گواہی سے کیا مراد ہوگی جس کے لئے خدا نے فرمایا ہے "یَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ" (رکوع ۹ پارہ ۱۸) قیامت کے روز بداعمال لوگوں کے خلاف انکی زبانیں اور ان کے ہاتھ پیر گواہی دیں گے اور خدا کی بارگاہ میں اس کا اعلان کریں گے کہ انہوں نے دنیا کی زندگی میں کیا کیا عمل کئے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ نے ان سب چیزوں کو ان کی فطرت کے مطابق زبان بھی عطا کردی ہے اور احساس بھی دے دیا ہے اس لئے جس طرح ان میں گواہی دینے کی صلاحیت و قابلیت موجود ہے اسی طرح یہ خدا کی تسبیح بھی کرسکتی ہیں۔

غرض کائنات کی ہر چیز خدا کی تسبیح کرتی ہے پھر اگر ایک سرکش انسان عقل و فہم رکھنے کے باوجود خدا کی عبادت اور اس کی حمد و ثنا و تسبیح سے غفلت کرتا ہے تو اس کو یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اس کے جسم کا ہر ہر ذرہ اللہ کی تسبیح میں ہر وقت مشغول ہے جس کی اسے خبر تک نہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ تمام اجزاء بدن قیامت کے روز خدا کے حضور میں اس ناشکرے اور بدعمل انسان کے گناہوں اور نافرمانیوں کی گواہی بھی دیں گے۔ اسی کے ساتھ خدا کی بارگاہ میں اس کے اطاعت شعار بندوں کو کبھی وہ تقرب بھی حاصل ہو جاتا ہے جس سے ان کے غیر اختیاری افعال تسبیح اختیاری کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں جیسا کہ حضور نبی کریمؐ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے۔ "انفاسکم فیه تسبیح و نومکم فیه عبادة" ماہ رمضان المبارک میں صاحبان ایمان کے روزہ رکھنے کی فضیلت کا تذکرہ فرما رہے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"اس مبارک مہینے میں تمہارا سانس لینا بھی تسبیح ہے اور تمہارا سوجانا بھی عبادت ہے۔"

اس بات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب مومن کے غیر اختیاری عمل کی خدا کے نزدیک یہ منزلت ہے تو اس کی ان عبادتوں اور تسبیحوں کا کیا مرتبہ ہوگا جنہیں وہ اپنے اختیار سے اور سمجھ کے کرتا ہے مگر شرط تو یہی ہے کہ جو کچھ عمل کیا جائے وہ صرف اللہ کی خوشنودی کے لئے ہو اور اس کی آڑ میں دنیا طلبی کا کوئی بھی جذبہ شامل نہ کیا جائے ورنہ کوئی بھی عبادت کبھی نفع نہ دے گی اور زندگی بھر کی عبادتیں اور محنتیں خاک میں مل کر رہ جائیں۔ اللہ جل شانہٗ ہمیں توفیق کرامت فرمائے کہ ہم اپنی نماز، روزہ اور تمام عبادتوں میں ہمیشہ خدا کی خوشنودی ہی

کا خیال رکھا کریں اور دنیاوی خواہشات کی آمیزش سے انہیں برباد نہ کریں۔

درس ۱۶۲

یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ الْمَلِكِ الْقُدُّوْسِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ○ هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ق وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ○ وَّاٰخَرِیْنَ مِنْهُمْ لَمَّا یَلْحَقُوْا بِهِمْ ط وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ○ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ○

ابتدائی آیات (سورہ جمعہ) کا بقیہ ترجمہ۔ تفسیر۔

ترجمہ: سب چیزیں جو آسمان میں ہیں اور جو چیزیں زمین میں ہیں خدا کی تسبیح کرتی ہیں جو بادشاہ ہے۔ بے حد پاک ہے = غالب ہے۔ حکمت والا ہے۔

وہی ہے جس نے اُمیّین میں اُن ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو انہیں اُسکی آیتیں پڑھ کر سُناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور اُنہیں کتاب و حکمت کی باتیں تعلیم دیتا ہے اگرچہ یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے اور ان میں سے دوسرے لوگوں کی طرف بھی بھیجا جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے اور وہ غالب حکمت والا ہے۔

یہ اللہ کا فضل ہے جسے وہ چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اللہ بڑے فضل و کرم کا مالک ہے۔

ترجمہ کے بعد اب کچھ الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

تسبیح کے معنی گذشتہ درس میں بیان ہو چکے۔ اس لفظ کے مفہوم میں چونکہ برائیوں اور ہر نقص و عیب سے پاک ہونا موجود ہے اسی مناسبت سے اللہ جل شانہٗ کا ایک نام سُبُّوح بھی ہے جس کے معنی ہیں وہ ذات جس کی تسبیح کی جائے اور وہ ذات جو بے حد پاک ہو اور بے انتہا دور ہو ہر برائی اور ہر عیب سے، سُبُّوح مبالغہ کا صیغہ ہے جیسے ان آیات میں "قُدُّوس" کا لفظ ہے۔ یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں بے حد برکت والا اور بے حد پاک۔ علامہ راغب اصفہانی نے "مفردات القرآن" میں تحریر کیا ہے کہ عربی زبان میں اس وزن پر یہی دو لفظ یعنی سُبُّوح اور قُدُّوس جو خدا کے مُبارک اسماء ہیں ملتے ہیں کوئی دوسرا لفظ ان کے علاوہ اس طرح کا جو فُعُّول کے وزن پر ہو، نہیں ملتا۔

"هو الذی بعث فی الامیین" اللہ کی ذات وہی ہے جس نے اُمّی لوگوں میں

ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ "امیّین" اُمّی کی جمع ہے۔
اس سے مُراد وہ شخص لیا جاتا ہے جو نہ لکھتا ہو اور نہ پڑھتا ہو۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ عرب قوم چونکہ اَن پڑھ تھی اور وہاں تعلیم بالکل نہ تھی اس لئے اس کو اس لقب کیساتھ ذکر کیا گیا ہے۔ علامہ نسفیؒ نے بھی لفظ اُمّی کی یہی تشریح فرمائی ہے۔ اور علامہ فضل بن حسن طبرسیؒ نے نیز بہت سے دوسرے مفسروں نے یہی معنی لکھے ہیں۔ غرض سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سچے رسول ہونے کی یہ کتنی واضح اور صاف دلیل ہے کہ ایک ایسا شخص جو ان پڑھ قوم میں پیدا ہوتا ہے جہاں اس وقت نہ کوئی لائبریری اور کتبخانہ تھا اور نہ کوئی پڑھنے پڑھانے کا مرکز موجود تھا بلکہ حالت یہ تھی کہ کوئی لکھنا پڑھنا جانتا ہی نہ تھا اور علم و فن کا کوئی چرچا ہی نہ تھا ایسے وقت میں اُمّی قوم کا ایک فرد اٹھتا ہے جس نے کسی شخص سے تعلیم حاصل نہیں کی اور وہ سارے جہان کو علم و فن کی تعلیم دیتا ہے اور صرف تیئیس ۲۳ سال کی تھوڑی ہی سی مدت میں انسانی ذہن اور بشری فکر کو علم و تحقیق اور دیانت و پرہیزگاری کے ایسے دھارے پر لگا دیتا ہے جس میں انسانوں کی ابدی فلاح اور دُنیا و آخرت کی تمام کامیابیوں کی ضمانت موجود ہے۔

حضور سرورِ دو عالم کے نبی برحق ہونے کے لئے یہی دلیل کیا کم ہے کہ آپ نے کسی سے پڑھا نہیں کسی سے لکھنا نہیں سیکھا اور اس کا شبہہ تو اُس وقت کر سکتی تھی دُنیا جبکہ عرب قوم میں کوئی اُس دور میں پڑھا لکھا ہوتا لیکن اس کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک ایسی کتاب یعنی قرآنِ حکیم دُنیا والوں کے سامنے لائے جو انسانی تاریخ کے ہر دور کے لئے معجزہ ہے۔ انسان جس قدر علم میں ترقی کرے گا اتنا ہی وہ قرآن حکیم کی عظمت کے سامنے جھکتا جائے گا۔

اس لفظ کے دوسرے معنی یعنی اُمّ القریٰ کا رہنے والا:۔
اہلبیت کرام علیہم السلام کی روایتوں میں مذکور ہیں۔ ان میں سے ایک وہ روایت ہے جو فرزند حضرت امام رضاؑ یعنی امام محمد تقی علیہ السلام سے کتاب بصائر الدرجات میں علامہ محمد بن حسن صفارؒ قمیؒ نے نقل کی ہے۔
اس معنی کا یہاں پر مطلب یہ ہوگا کہ "اللہ ہی کی ذات ہے جس نے "اُمّ القریٰ"

یعنی مکہ کے رہنے والوں میں ان ہی میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔

اس مقام پر اس کا خیال کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ "ام القریٰ" کے فقرہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت صرف مکہ ہی میں محدود ہو جائے گی کیونکہ خود قرآن کریم ہی میں مکہ کو "اُمّ القریٰ" بھی فرمایا گیا ہے پھر رسالتِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیں بھی سمجھا دی گئی ہیں جس کے لئے چند آیات کو زیر نظر رکھنا ضروری ہے۔

"وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰی وَمَنْ حَوْلَهَا" اے رسول، یہ قرآن ہم نے اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم مکہ کے رہنے والوں کو اور جو مکہ کے گرد و پیش کے رہنے والے ہیں انہیں اللہ کا خوف دلاؤ، اور ڈراؤ" (انعام رکوع ۱۱)

اور سورۂ "السبا" میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا (رکوع ۳) ہم نے اے رسول تم کو سارے انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے۔

اور تیسری حد رسالتِ محمدیہ کی وہ ہے جیسے سورۂ فرقان کی پہلی آیت میں بتادیا گیا ہے، تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا" اللہ کی ذات بڑی برکت والی ہے جس نے اپنے بندہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر قرآن اُتارا تاکہ وہ ساری کائنات اور کل عالم کے لئے خدا کا خوف دلانے والے ہوں۔ اس لئے جہاں جہاں اللہ کی خدائی ہے وہاں اُس کے حکم سے اُس کے حبیب کی رسالت بھی موجود ہے۔ وہ ربّ العالمین ہے آپ رحمۃٌ للعالمین ہیں۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ۔ یہ اللہ کی عطا کی ہوئی فضیلت ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اس کا فضل و کرم بے حد عظیم ہے۔

(درس)
۱۶۳

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ط بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًا ۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ ۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝۔

ترجمہ: جن لوگوں پر توریت کا بوجھ رکھا گیا تھا پھر انہوں نے اُس کے بار کو نہ اٹھایا اور اس پر عمل نہ کیا اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جو بہت سی کتابیں اپنے اوپر لادے ہوئے ہو۔ جن لوگوں نے خدا کی نشانیوں کو جھٹلایا اُن کی بھی کیا بری مثال ہے اور خدا ظالموں کو منزل مقصود تک نہیں پہونچاتا۔ (اے رسول) کہدو کہ اے یہودیو! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی خدا کے دوست ہو دوسرے لوگ نہیں۔ تو اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر موت کی تمنا کرو اور یہ لوگ اُن اعمال کے سبب جو یہ پہلے کر چکے ہیں کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے:-

"اَسْفَار" سفر کی جمع ہے۔ یہ لفظ بڑی سی کتاب کے لئے بولا جاتا ہے اور عام طور پر اُس کتاب کو کہتے ہیں جس میں حقائق کا بیان ہو گویا وہ حقائق کو بے نقاب کرتی اور ظاہر کرتی ہے۔ توراۃ کے اجزاء کو بھی اسفار کہتے ہیں۔ یہ لفظ "سَفر" سے بنا ہے جس کے معنی پردہ اٹھانے کے ہیں۔ "توراۃ" وہ کتاب آسمانی ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اُس کو "عہد قدیم" کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ یہ اصل میں عبرانی لفظ ہے اس لئے اس کا اصلی مادۂ معلوم نہیں البتہ جب اس کو عربی بنایا گیا تو اسے "وَرْیٌ" کی طرف منسوب کیا گیا جس کے معنی شعلہ نکلنے کے آتے ہیں اور اسی مناسبت سے توراۃ کے معنی نور اور چمک کے کہے جاتے ہیں۔ اس کو پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا ہے۔

تکوین، خروج، احبار، العدد، تثنیۃ الاشتراع یہ سب اُن اسفار اور اُن حصوں کے نام ہیں۔ جن پر توراۃ مشتمل ہے۔

"حُمِّلُوا التوراۃ" وہ لوگ جن پر توراۃ کا بوجھ رکھا گیا۔ اس بوجھ سے مراد ذمہ داری کا بوجھ ہے یعنی اُن کو اُس کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ توراۃ کی نصیحتوں اور اُس کے احکام کی تعمیل کریں "ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا" پھر انھوں نے توراۃ کو نہیں اُٹھایا یعنی اس کے باوجود کہ وہ اُس کی تعلیمات اور ہدایات پر عمل کرنے کے ذمہ دار بنائے گئے تھے مگر انھوں نے اس کی کچھ پروا نہ کی۔ نہ اس کو محفوظ رکھا اور نہ اُسے اپنے دلوں میں جگہ دی۔ ان لوگوں سے مراد قوم یہود ہے جنکی ہدایت کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی مگر اس قوم نے اُسکی

طرف مطلق توجہ نہ کی اور اس کی تمام تعلیمات کو پسِ پشت ڈال دیا۔ حضرت موسیٰؑ کی تکذیب کرتے رہے اور اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاءؑ کو بیدردی کے ساتھ قتل کرتے رہے۔ قرآنِ کریم نے اس قوم کی مثال حمار سے دی ہے جس پر علم و حکمت کی پچاسوں کتابیں لادی جائیں مگر اُس کو اُن کتابوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ وہ تو بس ہری بھری گھاس کی فکر میں سرگرداں رہے گا اور خوبصورت چمنوں کو چبا کر مسمار کردے گا وہ اس بات سے کچھ سروکار نہیں رکھتا کہ اسکی پیٹھ پر لعل و جواہر لدے ہوئے ہیں یا سنگریزے اور پتھر بھرے ہوئے ہیں۔ بالکل یہی مثال اُن تمام لوگوں کی بھی ہے جو کسی حق بات کا علم تو رکھتے ہوں لیکن اُس علم پر عمل نہ کریں کیونکہ علم حاصل کرنے کا فائدہ صرف یہی ہے کہ اُس پر عمل بھی کیا جائے اور اگر اُس علم سے فائدہ حاصل نہ کیا جائے تو پھر ایسے انسان کی مثال یقیناً اُس جانور کی سی ہوگی جو کتابوں کا ایک انبار اپنی پیٹھ پر لادے ہوئے ہو اور اُس کا حاصل اُس کے لئے سوائے اُن کے بوجھ میں دب جانے کے اور کچھ نہ ہو۔ غرض وہ لوگ بڑے برے اور لائق نفرت و حقارت ہیں جو خدا کی نشانیوں کو جھٹلاتے ہیں۔ جیسے قوم یہود جس نے حضرت موسیٰؑ اور آپ کی کتاب "توراۃ" کی کھلم کھلا تکذیب کی اور اُس کی ہدایتوں پر عمل نہ کیا۔

یہ لوگ اگر "توراۃ" کی ہدایتوں پر عمل کرتے تو کبھی یہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کا انکار نہ کرتے کیونکہ "توراۃ" آپ کے آنے کی خبر دے چکی ہے اور اُس میں حضور نبی اکرم پر ایمان لانے کا بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا ہے اس بنا پر حضرت نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لانا اس کا بہت بڑا ثبوت ہے کہ یہودیوں نے حضرت موسیٰؑ کی بھی تکذیب کی اور "توراۃ" کو بھی جھٹلایا اور اس کتابِ مقدس کے نام پر دنیا بھر کو فریب میں مبتلا کرنے کی کوشش کرتے رہے اور اسلام کے خلاف سازشیں کرنے کے بہانے تلاش کرتے رہے۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔ اس جملہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ ظلم کرنے والی قوموں کو توفیقِ ہدایت نہیں عطا کرتا۔ یعنی وہ عنایت اور فضلِ خداوندی سے محروم رہتی ہیں۔ انسان کو خدا نے چار طرح سے ہدایت فرمائی ہے۔

پہلی وہ ہدایت ہے جو عقل اور فہم کے عطا کرنے سے کی ہے اور اس معنی کے لحاظ سے یہ ہدایت کی قسم تمام انسانوں کے لئے عام ہے بلکہ ہر جاندار کو اس میں سے حسب ضرورت حصہ ملا ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے "رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى" (۲۰-۵۰)

ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر مخلوق کو اُس کی خاص طرح کی بناوٹ اور صورت عطا فرمائی پھر اُسے زندگی بسر کرنے کی راہ دکھائی اور سمجھ عطا کی۔

دوسری قسم ہدایت کی وہ ہے جو پیغمبروں کے آنے اور کتابوں کے نازل ہونے کی اصلی غرض ہے یعنی حق کی راہ دکھانا اور نجات کا راستہ بتانا۔

ہدایت کی تیسری قسم وہ اللہ کی توفیق خاص ہے جو ہدایت یافتہ لوگوں ہی کو عطا کی جاتی ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر کیا گیا ہے۔

مثلاً ارشاد ہوتا ہے " اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَھْدِیْھِمْ رَبُّھُمْ بِاِیْمَانِھِمْ (۱۰ - ۹) جو لوگ ایمان لا چکے ہیں اور انہوں نے نیک عمل بھی کئے ہیں اللہ انہیں اپنی توفیق خاص عطا فرماتا ہے اُن کے ایمان لانے کی وجہ سے۔ دوسرے مقام پر اس طرح فرمایا گیا ہے " وَیَزِیْدُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اھْتَدَوْا ھُدًی " (۱۹ - ۷۶) یعنی جو لوگ ہدایت کا راستہ اختیار کر چکے ہیں اور ایمان لا چکے ہیں اللہ انہیں اور زیادہ توفیق دیتا ہے اور اپنا فضل و کرم اُن کے شامل حال فرماتا ہے۔ ہدایت کے چوتھے معنی ہیں۔ آخرت میں جنت کی طرف رہنمائی کرنا چنانچہ " سَیَھْدِیْھِمْ ...... وَیُصْلِحُ بَالَھُمْ " (۴۷ - ۵) میں یہی معنی مراد ہیں یعنی اللہ شہدا راہ حق کو اُن کی منزل مقصود یعنی جنت تک پہونچا دیگا اور انہیں خوشحال کر دے گا۔ مختصر یہ کہ ہدایت کی یہ چاروں قسمیں جنکا قرآن کریم میں بار بار ذکر آیا ہے ترتیبی درجات کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی جسے پہلے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہوگی۔ یعنی اُس کے پاس عقل ہی نہ ہوگی اُسے کسی قسم کی بھی ہدایت نہیں مل سکتی اسی طرح جسے دوسرے درجہ کی ہدایت حاصل نہ ہو اور وہ پیغمبروں کی دعوت پر لبیک نہ کہے اور راہ حق اختیار نہ کرے وہ تیسرے اور چوتھے درجہ کی ہدایت یعنی توفیق الٰہی اور ثواب آخرت سے بھی محروم رہے گا۔ اب جہاں پر قرآن کریم میں ظالموں اور کافروں کے ہدایت الٰہی سے محروم رہنے کا ذکر ہے وہاں ہدایت کے تیسرے اور چوتھے معنی مراد ہوتے ہیں اور ظاہر ہے کہ یہ محرومی اُنہیں اسی وجہ سے حاصل ہوگی کہ انہوں نے پیغمبروں کی دعوت پر راہ حق اختیار نہ کی اور اپنی گمراہی پر اڑے رہے اس لئے اُن کو تمام توفیقات خداوندی اور آخرت کے ثواب سے بالکل محروم کر دیا گیا۔ بہر حال ان آیات کریمہ میں اس کا صاف طریقہ پر اعلان موجود ہے کہ بنی اسرائیل نے چونکہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کی تھی اور کتاب مقدس کو جھٹلایا تھا اس لئے وہ ہر قسم کی توفیقِ خداوندی اور عنایتِ الٰہی سے قطعی طور پر محروم کر دئے گئے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا ؕ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ هَادُوْٓا اِنْ زَعَمْتُمْ اَنَّكُمْ اَوْلِيَآءُ لِلّٰهِ مِنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَا يَتَمَنَّوْنَهٗٓ اَبَدًاۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝ (سورۂ جمعہ بحوالۂ سابقہ)

ترجمہ: جن لوگوں پر توراۃ کا بوجھ لادا گیا پھر انھوں نے اُس کے بوجھ کو نہ اُٹھایا اور اُس کے ہدایات پر عمل نہ کیا اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جو بہت سی بڑی بڑی کتابیں اپنے اوپر لادے ہوئے ہو۔ جن لوگوں نے خدا کی آیتوں کو جھٹلایا اُن کی بھی بُری مثال ہے اور خدا ظالموں کو منزلِ مقصود تک نہیں پہونچاتا (اے رسول) کہدو کہ اے یہودیو! اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ہی بس خدا کے دوست ہو اور لوگ نہیں۔

تو تم اگر اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر موت کی تمنا کرو۔ اور یہ لوگ اُن بداعمالیوں کی وجہ سے جو یہ پہلے کر چکے ہیں کبھی اس کی آرزو نہ کریں گے اور خدا تو ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

پچھلے درس میں عرض کیا جا چکا ہے کہ ان آیاتِ کریمہ میں توراۃ کا بوجھ اُٹھانے سے مُراد اُس کے احکام اور تعلیمات پر عمل اور اُس کی بشارتوں پر ایمان لانا ہے جس کی بنی اسرائیل نے ہمیشہ خلاف ورزی کی۔ اُنھوں نے جہاں توراۃ کی بہت سی ہدایات پر عمل نہیں کیا وہاں اُس کی بشارتوں کو بھی خاص طور پر جھٹلایا اور اگر وہ ایسا نہ کرتے تو انہیں لازمی طور پر حضرت سرورِ انبیا کی نبوت پر ایمان لانا پڑتا کیونکہ توراۃ میں جابجا آپ کی بعثت اور آپ کے دُنیا میں تشریف لانے کے متعلق واضح الفاظ میں خبر دی گئی تھی۔

قرآن کریم نے اسی امر کو ایک دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے " اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ

جو لوگ رسُول اُمّی کی پیروی کرتے ہیں جن کے آنے کی بشارت کو وہ اپنے یہاں توراۃ و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، ایسے ہی لوگ کامیاب اور فلاح پانے والے ہیں۔" (۷ - ۱۵۷)

کسی نبی یا اُس کی شریعت اور کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ کبھی ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اُس کی صرف بعض ہدایتوں کو جو اپنے مطلب کی ہوں مان لیا جائے اور باقی باتوں کو جو اپنی مرضی اور اپنی خواہش کے خلاف ہوں تسلیم نہ کیا جائے۔ سچا ایمان تو صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا

ہے جب نبی کی ہر ہدایت اور ہر حکم کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا جائے اور اس کی کسی تعلیم کے متعلق ذرا سا بھی شک و شبہہ دل میں نہ لایا جائے۔ اس بنا پر انجیل و توراۃ پر بھی اسی وقت ایمان صحیح ہو سکتا ہے جبکہ اُن کی تمام تعلیموں پر جن میں اُن کی بشارتیں بھی شامل ہیں یقین حاصل ہو ورنہ ان کتابوں کی پیروی کا نام لینا ہی فضول ہوگا۔

یہ تمام بشارتیں جو حضرت سرور انبیاء کی آمد کے متعلق ہیں ان کتابوں میں آج بھی صاف اور کھلے ہوئے الفاظ میں موجود ہیں حالانکہ ابتک ان کے اندر بے انتہا تحریف اور تبدیلی کی جا چکی ہے۔ انجیل یوحنا کی "فارقلیط" کے متعلق بشارت کا ذکر اس سے قبل کے کسی درس میں کیا جا چکا ہے۔ آج توراۃ کی بشارت کا تذکرہ کیا جاتا ہے جس کے "سفر بشارات" میں اس کا اعلان کیا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "احمد تبسم کرنے والا یعنی نہایت خوش مزاج اور جہاد کرنے والا اونٹ پر سوار ہوگا اور اپنے شملہ کو یعنی اپنے عمامہ کے سرے کو لٹکائے گا اور میں اس کو ایک عظیم الشان اُمّت کے لئے تاخیر کے ساتھ لاؤنگا" یہ اور اسی طرح کی اور بھی بشارتیں توراۃ میں صاف طریقہ پر پائی جاتی ہیں اور اگر انصاف و دیانت کے ساتھ دیکھا جائے تو سوائے رسول عربی صلی اللہ علیہ واٰلہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے کسی دوسری شخصیت پر یہ پوری نہیں اُترتیں۔

اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص بھی توراۃ و انجیل پر پوری طرح ایمان اختیار کریگا تو اُس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تمام بشارتوں کی بھی تصدیق کرے جن میں حضرت خاتم الانبیاء کی بعثت و نبوت کی بشارت بنیادی اور مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ ورنہ اُس کا یہ دعویٰ قطعی طور پر غلط ہو گا کہ وہ ان کتابوں کو مانتا ہے اور ان پر ایمان رکھتا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اے رسولؐ ان یہودیوں سے کہدو کہ اگر تم اس خیال میں ہو کہ فقط تم ہی خدا کے دوست ہو اور تم ہی حق پر ہو تو آؤ موت کی دُعا مانگو۔ لیکن وہ کبھی مرنے کی تمنا نہ کریں گے اپنے کفر و ظلم و گناہ کی وجہ سے جو وہ ابتک کر چکے ہیں اور خدا اُن ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

اس سے پہلے سورہ بقرہ میں بھی یہودیوں کے لئے اسی پیشین گوئی کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ کبھی ہرگز اپنی موت کی دُعا نہیں کریں گے کیونکہ اُن کی بداعمالیاں اُن کے سامنے ہیں اور وہ خدا کے حضور میں جانے اور آخرت کے احتساب سے ڈرتے ہیں اور اس لئے موت کی تمنا نہیں کرتے یہ اور بات ہے کہ موت تو نہیں ایک نہ ایک روز آنا ہی ہے اور وہ کتنا ہی موت سے بچنے کی کوشش کریں مگر نہیں بچ سکتے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ إِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْآخِرَةُ عِنْدَ اللَّهِ خَالِصَةً مِنْ

دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ ط وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ (سورۂ بقرہ)

اے رسول کہدو کہ اے بنی اسرائیل اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ آخرت کا گھر صرف تمہارے ہی لئے ہے اور کسی کے لئے نہیں ہے تو آؤ اپنی سچائی کے ثبوت میں موت کو طلب کرو لیکن وہ اپنے گناہوں اور برے اعمال کی وجہ سے اس کی آرزو نہ کریں گے۔

بنی اسرائیل کا یہ دعویٰ تھا کہ " نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ " ہم تو اللہ کی اولاد ہیں اور ہم ہی اُس کے پیارے ہیں اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى " (بقرہ)

جنت میں تو صرف یہودی اور نصرانی ہی جائیں گے کوئی دوسرا نہیں جا سکتا۔ اس لئے ان لوگوں سے رسول کریم نے فرمایا کہ آؤ اس بات کا فیصلہ اس طرح کرلیں کہ ہم اور تم دونوں فریق میدان میں نکل کر خدا سے دُعا کریں کہ ہم میں سے جو جھوٹا ہو وہ ہلاک ہو جائے مگر چونکہ یہودیوں کو اپنے جھوٹ کا خود علم تھا اور وہ خوب جانتے تھے کہ رسول اسلام حق پر ہیں اور توراۃ کی بشارتیں آپ ہی کے لئے ہیں مگر محض ہٹ دھرمی اور تعصب کی وجہ سے آپکی تکذیب کرتے رہتے تھے اس لئے جب بددعا کا موقع آیا تو ہلاک ہو جانے کا خوف پیدا ہوا اور رسول عربی سے مباہلہ کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہو سکے کیونکہ اُنہیں یقین کامل تھا کہ وہ خاتم الانبیاء کی بددعا کے بعد ایک لمحہ کے لئے بھی زندہ رہ سکیں گے اور اس طرح ساری دُنیا پر یہودیوں کا جھوٹ کھُل گیا اور اُن کی شرارت ظاہر ہو گئی۔

علامہ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اسی طرح جب شہر نجران کے نصاریٰ حضورؐ کے پاس آئے اور کافی بحث مباحثہ ہو چکا تو اُن سے بھی اسی طرح کا مباہلہ کیا گیا تھا جس کا ذکر سورۂ آل عمران میں موجود ہے۔ " فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ "

یعنی اے پیغمبر ان نصرانیوں سے کہدو کہ اگر اب بھی تم حق کے قبول کرنے میں جھگڑتے ہو تو صرف آخری صورت اس کی رہ گئی ہے کہ ہم اور تم دونوں اپنی اپنی اولاد، اپنی عورتوں اور اپنے نفسوں کو ساتھ لیکر میدان میں نکل آئیں اور خدائے ذوالجلال کی بارگاہ میں التجا کریں کہ وہ جھوٹوں پر اپنی لعنت نازل فرمائے۔ حافظ ابن کثیر، زمخشری، ترمذی، مسلم، نسائی، امام حاکم، امام احمد اور انکے علاوہ تمام علماء حدیث و تفسیر نے بالاتفاق لکھا ہے کہ اس مباہلہ کے دن نصرانیوں نے دیکھا تو رسول

کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم اپنے نواسوں حسنؑ و حسینؑ اپنی بیٹی فاطمہؑ زہرا اور اپنے بھائی علی بن ابی طالب علیہم السلام کو ساتھ لے کر میدان مباہلہ کی طرف تشریف لا رہے تھے اور اللہ ان سے فرما رہے تھے کہ دیکھو! جب میں بد دعا کروں تو تم سب مل کر آمین کہنا اور جب نصاریٰ کے سب سے بڑے عالم اور سردار ابو الحارثہ بن علقمہ کی نظر اس نورانی جماعت پر پڑی تو وہ گھبرا گیا اور اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا کہ اس وقت میں ایسی پاک اور نورانی صورتیں دیکھ رہا ہوں جو اگر دعا کر دیں تو پہاڑ بھی اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔ تمہاری کیا ہستی ہے کہ تم ان کا مقابلہ کر سکو اس لئے خیریت اسی میں ہے کہ ان سے مباہلہ نہ کرو اور فوراً واپس چلے جاؤ۔ ورنہ اگر انہوں نے بد دعا کر دی تو تمام روئے زمین پر ایک نصرانی بھی زندہ نہیں رہ سکے گا۔ آخر تمام نصاریٰ نے سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور پیغمبر اسلام سے صلح کر لی۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ مجھ سے مباہلہ کرتے اور میں بد دعا کر دیتا تو یہ تمام وادی ان پر آگ برساتی اور ان میں سے کوئی ایک بھی زندہ نہ بچتا اسی طرح یہودیوں کے لئے ارشاد فرمایا کہ اگر یہود میرے مقابلہ میں آ کر موت کی دعا مانگتے تو یقیناً اسی وقت وہ سب کے سب ہلاک ہو جاتے اور اپنا مقام جہنم میں دیکھ لیتے۔

(درس ۱۹۵)

قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْہُ فَاِنَّہٗ مُلٰقِیْکُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰی عٰلِمِ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ فَیُنَبِّئُکُمْ بِمَا کُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ ؕ ذٰلِکُمْ خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝

(پارہ ۲۸، رکوع ۱۱ کی آخری اور رکوع ۱۲ کی ابتدائی آیات۔) سورۃ جمعہ

ترجمہ: اے رسول کہدو کہ موت جس سے تم بھاگتے ہو وہ ضرور تم سے ملنے والی ہے پھر تم پوشیدہ اور ظاہر کے جاننے والے خدا کی طرف پلٹائے جاؤ گے۔ پھر جو کچھ بھی تم کرتے تھے وہ تم کو بتا دیگا۔ اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کے لئے اذان دیجائے تو خدا کی یاد کی طرف دوڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ یہی تمہارے لئے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔

ترجمہ کے بعد اب کچھ الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے:

"عَالِمُ الْغَیْبِ وَالشَّہَادَۃِ" یعنی وہ تمام چھپی ہوئی اور تمام ظاہر چیزوں کا

جاننے والا ہے۔

"غیب" کے لفظی معنی تو اُس چیز کے ہیں جو ننگا ہوں سے اوجھل ہو یا ننگا ہوں سے اوجھل ہو جانا لیکن قرآنی اصطلاح میں جہاں اس لفظ کی نسبت اللہ کی طرف دیکھی ہے وہاں اس سے مُراد وہ چیزیں ہیں جو مخلوق کے علم اور حواس سے پوشیدہ ہوں اور جن چیزوں کو مخلوقات اپنے ظاہری حاسّوں سے محسوس کرتی ہو اُن پر لفظ "شہادۃ" کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ کسی چیز کو غیب "مخلوق ہی کے لحاظ سے کہا جاتا ہے۔ ورنہ اللہ جل شانہ سے تو کوئی چیز بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ قرآن کریم کا اعلان ہے"

لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمٰوٰتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ" (۳۴-۳) اللہ سے ذرہ برابر کوئی چیز نہ آسمانوں میں چھپی ہوئی ہے اور نہ زمین میں۔ غرض "غیب" کا لفظ غیر اللہ کے لحاظ سے بولا جاتا ہے نہ کہ اللہ کی نسبت سے۔ اب جہاں ایمان بالغیب کا جملہ بولا جاتا ہے وہاں غیب سے مُراد وہ تمام اشیاء اور حقائق ہیں جو انسانی حواس سے پوشیدہ ہوں اور انبیاء علیہم السلام کے خبر دینے ہی سے اُن کا علم حاصل ہو۔

قرآنی آیات میں اس کا صاف طور پر بیان ہے کہ غیب کا علم اللہ ہی کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا غیب کو نہیں جانتا اور اگر جانتا ہے تو صرف اللہ کے بتا دینے سے۔ اس طرح انبیاء و مرسلین کو خدا کی بارگاہ ہی سے علم غیب حاصل ہوتا ہے اور دوسرے انسانوں کو انبیاء کے ذریعہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ ذاتی طور پر بغیر کسی ذریعہ اور بغیر واسطہ کے علم غیب خدا کے علاوہ کسی کے لئے بھی ممکن نہیں ہے۔

قرآن کریم میں خدا فرماتا ہے "قُلْ لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِنْدِي خَزَائِنُ اللّٰهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ (۶-۵) اے رسول کہدو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کو جانتا ہوں۔ یہاں پر بھی یہی مراد ہے کہ میں بلا واسطہ علم غیب نہیں رکھتا ہاں اللہ نے جسقدر تعلیم دیدی ہے اُتنا علم غیب رکھتا ہوں۔

ایک دوسرے مقام پر یہ الفاظ ہیں "قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ الْغَيْبَ إِلَّا اللّٰهُ" (۲۷-۲۰) اے رسول کہدو کہ تمام آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب کو نہیں جانتا اور اگر اُسے جانتا ہے تو صرف اللہ۔ ایک مقام پر اس کی مزید توضیح فرمائی گئی ہے۔"

ارشاد ہوتا ہے:- عٰلِمُ الْغَیْبِ فَلَا یُظْهِرُ عَلٰی غَیْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ ارْتَضٰی مِنْ رَّسُوْلٍ ۲۶،۲۷ اللہ ہی غیب کا جاننے والا ہے اور اپنے غیب کی بات کو ظاہر نہیں کرتا مگر اپنے کسی برگزیدہ پیغمبر پر۔ خلاصہ یہ ہے کہ بلا واسطہ علم غیب صرف اللہ کی صفت ہے اور اسی کی ذات کے لئے مخصوص ہے۔ بندوں کو جو کچھ بھی علم غیب ملا ہے وہ اللہ کی تعلیم کی وجہ سے۔ اللہ کے اسماء حسنیٰ میں ایک اسم معظم الشہید بھی ہے اور اس کے بھی معنی یہی ہیں کہ وہ تمام کائنات کے ظاہر و باطن کو جانتا ہے اور کوئی امر اُس کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ہر نبی اور رسول کو اُس نے غیب کے امور پر مطلع فرمایا ہے اور اُس نبی کے مرتبہ اور درجہ کے لحاظ سے اُسے علم عطا کیا ہے اور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہر نبی سے زیادہ علم دیا۔ یہاں تک کہ یہ فرما دیا کہ "عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ" اے رسول جو کچھ بھی تمہیں معلوم نہ تھا سب کا سب اللہ نے تمہیں بتا دیا اور اُس کی تعلیم دے دی۔

"یوم الجمعۃ"، اس لفظ "جُمُعَہ" کو میم کے سکون، زبر اور پیش کیساتھ تینوں طرح پڑھا گیا ہے لیکن مفسرین و محدثین کی اکثریت میم پر پیش کے ساتھ پڑھنے ہی کو زیادہ فصیح قرار دیتی ہے۔ یعنی "جُمُعَہ"۔ چونکہ اس روز عبادت کے لئے لوگ خاص مقامات پر جمع ہوتے ہیں اس لئے اس دن کا نام ہی جمعہ رکھ دیا گیا۔ یہی جمعہ کا دن تھا جب حضرت آدم علیہ السلام کی خلقت ہوئی تھی اور جمعہ ہی کا روز تھا جب اُن کو جنت میں جگہ دی گئی تھی۔ حدیثوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جمعہ کے روز آخری ساعتوں میں ایک وقت ایسا بھی ہے جو قبولیت دعا کے لئے بڑی خصوصیت رکھتا ہے اور اسی لئے بہت سی مخصوص دعائیں ہیں جو جمعہ کے آخری وقت پڑھی جاتی ہیں۔

ان آیات کریمہ میں "فَاسْعَوْا اِلٰی ذِكْرِ اللّٰهِ" کے جملہ میں سعی سے مراد بھاگنا اور دوڑنا نہیں ہے بلکہ اس سے مراد اہتمام کرنا اور کوشش کرنا ہے۔ "ذِكْرُ اللّٰهِ" سے مراد نماز جمعہ ہے۔ احادیث میں حکم ہے کہ جب لوگ جمعہ کی اذان سُنیں تو انتہائی وقار اور خضوع و خشوع کے ساتھ نماز کے لئے حاضر ہوں نہ کہ بھاگ کر اور دوڑ کر کیونکہ اس طرح پر آنے کو ممنوع کیا گیا ہے۔ یوں تو ہر روز نماز اور عبادت کے لئے صاف ستھرا رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اور کثیر موقعوں پر غسل کرنا بھی سنت ہے یا کبھی واجب ہے لیکن جمعہ کے دن نماز جمعہ سے قبل غسل کرنے کا خاص طور پر حکم ہے۔ اسی طرح نماز جمعہ کے لئے صاف اور پاک کپڑوں کو علیحدہ رکھنے کی بھی ہدایت کی گئی ہے۔ غرض جمعہ کے دن کی بڑی خصوصیات ہیں اور اس دن اور اس کی شب کی فضیلت میں

بے شمار حدیثیں موجود ہیں۔
اسلام میں سب سے پہلی نماز جمعہ حضرت نبی کریمؐ نے ہجرت کے بعد مدینہ میں پہونچکر
پڑھائی تھی۔ یہ نماز قبیلہ بنی سالم بن عوف کے یہاں منعقد ہوئی تھی اور اسی نماز جمعہ کے
موقع پر حضورؐ نے سب سے پہلا تاریخی خطبہ ارشاد فرمایا تھا۔ مدینہ میں تشریف لانے سے
قبل آنحضرتؐ مقام قُبا میں ٹھہر گئے تھے جو مدینہ کی جنوبی سمت میں تقریباً دو۲ میل کے فاصلہ پر ہے
بعض کے نزدیک آپ پیر روز وہاں مکہ سے ہجرت کرکے پہونچے تھے اور جمعرات تک وہیں مقیم رہے پھر
جمعہ کو مدینہ میں تشریف لائے۔ قبیلہ بنی سالم بن عوف تک پہونچتے پہونچتے نماز کا وقت آگیا
تو آپ نے وہیں نماز پڑھائی تھی جو اسلام کی سب سے پہلی نماز جمعہ تھی۔ اس عظیم تاریخی
خطبہ میں رسول اکرمؐ نے فرمایا تھا جس کا مفہوم یہ ہے کہ میری رسالت کی اصلی غرض یہی ہے
کہ میں ساری انسانیت کو نور اور ہدایت کے راستہ پر لگادوں اور دُنیا بھر کو علم و دانش سے
بھردوں پھر آپ نے ارشاد فرمایا کہ انسان کے لئے فلاح اور نجات کا راز صرف اسی بات میں ہے
کہ وہ اللہ اور اُس کے رسُول کے احکام کے سامنے جُھک جائے اور دل میں خدا کا خوف اور
ایمان و تقویٰ پیدا کرے اور اُس فرض کو پورا کرے جو اللہ نے خود اُس کی ذات اور پوری دُنیا
کی طرف سے اُس پر لازم کیا ہے اور اس فرض کو پورا کرنے میں وہ اپنے ظاہر و باطن میں یک رنگی و
وحدت پیدا کرے اور آخر میں آپ نے فرمایا کہ اللہ نے اپنی حجّت تمام کردی ہے اور دین حق کو
ظاہر کردیا ہے۔ اس لئے اب انسان کے لئے صرف دو۲ ہی راستے رہ گئے ہیں یا تو وہ اللہ کی
اطاعت کرکے ابدی زندگی حاصل کرلے یا دینِ حق کو چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے ہلاک ہوجائے۔

---

(۲۲) فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاذْكُرُوا
اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوَا انْفَضُّوْٓا
اِلَيْهَا وَتَرَكُوْكَ قَآئِمًا ۭ قُلْ مَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ مِّنَ اللَّهْوِ وَمِنَ
التِّجَارَةِ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ۝

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۲ کی آخری آیات۔ سورۂ جمعہ)

ترجمہ:۔ پس جب نماز جمعہ تمام کی جاچکے تو تم زمین میں پھرو چلو اور اللہ کا فضل (یعنی
روزی) تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرتے رہو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

اور جب ان لوگوں نے کسی تجارت یا کھیل تماشے کو دیکھا تو یہ اسکی طرف ٹوٹ پڑے۔ اور تم کو کھڑا ہوا چھوڑ دیا۔ اے رسول کہدو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ سب سے بہتر روزی دینے والا ہے۔

"فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوۃُ" جب نماز پوری ہو چکے۔ اس جگہ "قُضِيَتْ" صیغۂ مجہول ہے۔ یہ لفظ "قَضَاءٌ" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی یہاں تمام کرنے اور پورا کرنے کے ہیں۔ "فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ" کے جملہ میں انتشار سے مراد ادھر ادھر پھیل جانا اور کاروبار اور طرح طرح کی مصروفیتوں اور ضرورتوں کے لئے جابجا منتشر ہو جانا اور چلنے پھرنے لگنا۔ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ یعنی فضل خداوندی کو طلب کرو۔

اس جگہ فضلِ خدا سے مراد رزق ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے۔ اور بعض لوگوں نے اس سے اجر و ثواب مراد لیا ہے جو خدا کی بارگاہ سے اطاعت گذار لوگوں کو عطا کیا جائے گا۔

"اِذَا رَاَوْا تِجَارَةً اَوْ لَهْوًا نِ انْفَضُّوْٓا اِلَيْهَا" جب انھوں نے کوئی سودا بکتا ہوا اور خرید و فروخت دیکھی یا کوئی کھیل تماشا دیکھا تو اُس کی طرف دوڑ جاتے ہیں۔ "اِنْفَضُّوْا" ماضی جمع غائب کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر "انفضاض" ہے جس کے ..... معنی ہیں۔ برس پڑنا یا ٹوٹ پڑنا اور یہ "فَضٌّ" سے بنا ہے۔

"تِجَارَةً" کے اصل معنی ہیں "نفع کمانے کی غرض سے سرمایہ کو کاروبار میں لگانا دوسرے الفاظ میں "تجارۃ" بیوپار، سوداگری اور خرید و فروخت کے کاروبار کا نام ہے "لَهْوٌ" ہر اُس باطل چیز کو کہتے ہیں جو انسان کو ذکر خدا اور امر حق سے باز رکھے اور اپنی طرف اُس کی توجہ کو موڑ لے۔ اسی معنی کے لحاظ سے دنیاوی زندگی کو بھی "لھو" کہا گیا ہے چنانچہ قرآن کریم میں ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے "وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ (۲۹ - ۶۴) یہ دُنیا کی زندگی تو صرف کھیل اور تماشا ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ وہ دنیاوی زندگی جس میں آخرت کا کوئی تصور نہ ہو اور دینی قدریں محفوظ نہ رہیں اور احکام خداوندی کو فراموش کر دیا جائے وہ باطل اور صرف کھیل تماشا ہے ورنہ وہ دنیاوی زندگی جو ایسی نہ ہو اور اس میں

آخرت کا پہلو نظر انداز نہ کیا جائے اور روحانی ذمہ داریوں اور دینی اقدار سے غفلت نہ کی جائے یقیناً اُخروی حیات کا ایک حصہ ہے اور وہ ہر طرح قابل تعریف ہے بلکہ اُس کا ترک کرنا گناہ اور معصیت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں: وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو دُنیا کو آخرت کے لئے چھوڑ دے اور نہ وہ شخص جو آخرت کو دنیا کے لئے ترک کر دے یہ بھی مشہور ارشاد ہے۔ کہ "الدُّنیا مزرعةُ الاٰخرة" دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یعنی دُنیا کی زندگی میں احکام خداوندی پر عمل کرنے ہی سے آخرت میں نجات حاصل ہو سکتی ہے اور یہاں کی صالح زندگی ہی آخرت کا وسیلہ بن سکتی ہے۔ حدیث میں ہے:

اِعمل عَمَلَ امرِئٍ یَظُنُّ اَنْ لَنْ یَمُوتَ اَبَداً وَاحْذَرْ حَذَرَ امرِئٍ یَخْشیٰ اَنْ یَمُوتَ غَداً۔ اپنے کام کو تو اُس آدمی کی طرح کیا کرو جو سمجھتا ہو کہ میں کبھی نہیں مروں گا اور خدا سے اُس شخص کی طرح خوف کیا کرو جو یہ یقین رکھتا ہو کہ وہ کل مر جائے گا۔ دوسری جگہ اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ "اَعْظَمُ النَّاسِ هَمّاً اَلْمُؤمِنُ یَهْتَمُّ بِاَمْرِ دُنْیَاهُ وَاٰخِرَتِهٖ" مقصد اور ارادہ کے لحاظ سے عظیم ترین انسان وہ ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کو اہم سمجھے۔

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں: اِنَّ حُبَّ الدُّنیا یُعْمِی وَیُصِمُّ وَیُبْکِمُ دنیا کی محبت اور صرف اُسی کا ہو رہنا انسان کو اندھا، بہرا اور گونگا بنا دیتا ہے۔ پھر فرماتے ہیں: "مَنْ اَبْصَرَ بِهَا بَصَّرَتْهُ وَمَنْ اَبْصَرَ اِلَیْهَا اَعْمَتْهُ" یعنی دنیا ایسی چیز ہے کہ اگر کسی کی نگاہ خود اُسی کے اندر الجھ کر نہ رہ جائے بلکہ اُسے آگے کی حقیقتوں کو دیکھنے کا ذریعہ اور وسیلہ قرار دے تو یہی اُس کے لئے صحیح اور مستقیم راہ دیکھنے کا باعث بن جاتی ہے اور اُسے اصلی بینائی بخشتی ہے جو اُس کی ابدی حیات دائمی فلاح و نجات کی ضامن ہے۔ لیکن جو شخص دُنیا کو وسیلہ اور ذریعہ بنانے کے بجائے خود اُسی کے حسن و جمال اور اُس کی ہی لذتوں میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اُسے وہ بینائی اور مشاہدہ کی طاقت دینے کے بجائے اندھا کر دیتی ہے۔ غرض ایک سچے مومن کی دُنیا اُس کی آخرت سے کسی طرح الگ نہیں ہوتی اور نہ اُس کی آخرت اُس کی دُنیا سے جُدا ہوا کرتی ہے۔

رسُول اکرمؐ کے کسی صحابی کے فرزند کا انتقال ہو گیا تھا تو انہوں نے اُس کے غم میں تمام کاروبا

چھوڑ دیا اور اپنے گھر کے ایک گوشہ میں دن رات عبادت کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر سرورِ کائنات نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی لَمْ یَکْتُبْ عَلَیْنَا الرَّھْبَانِیَّۃَ۔ اِنَّمَا رَھْبَانِیَّۃُ اُمَّتِیْ اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اللہ نے ہم کو ترکِ دُنیا کا حکم نہیں دیا ہے۔ میری اُمّت کے لئے ترکِ دُنیا کے بجائے خدا کی راہ میں جدوجہد کرنے کا حکم ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک پکّے مسلمان اور سچّے مومن کی حیات خدا کی راہ میں جہدِ مسلسل اور سعی پیہم کا نام ہے اور ترکِ دُنیا، مایوسی، قنوطیت اور نا امیدی کا اسلام سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے۔ ان آیاتِ کریمہ میں غور و فکر کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ تجارت کو کھیل تماشے کا درجہ کیوں دیا گیا ہے اور اس سے مراد کیا ہے۔ اس سلسلہ میں بھی ہمارے سامنے وہی بنیادی نظریہ ہے جس کی طرف "لھو" کی تشریح میں اشارہ کیا گیا۔ حقیقتِ امر یہ ہے کہ آیت میں جس تجارت کی مذمت کی گئی ہے اور جسے کھیل کا درجہ دیا گیا ہے اس سے مراد وہی تجارت ہے جو انسان کو ذکرِ الٰہی اور اطاعتِ رسولؐ سے غافل بنا دے ورنہ ظاہر ہے کہ وہ تجارت جو دین سے غفلت پیدا نہ کرے اور جس میں سچائی اور دیانت کی قدریں پوری طرح محفوظ ہوں وہ ہر طرح مستحسن ہے اور رسولِ کریمؐ نے اس کو فائدہ مند اور "فضلِ الٰہی" سے تعبیر کیا ہے۔

اِن آیات کی شانِ نزول کے سلسلہ میں مفسّرین نے لکھا ہے کہ پیغمبرِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک مرتبہ نمازِ جمعہ کا خطبہ ارشاد فرما رہے تھے۔ عین اسی وقت دحیہؓ بن خلیفہ کلبی کی قیادت میں مدینہ کی طرف شام سے ایک تجارتی قافلہ آیا۔ حضرت دحیہؓ جن کا شمار اکابر صحابہؓ کرام میں ہوتا ہے اُس وقت تک اسلام سے مشرف نہ ہوئے تھے۔

شہر میں قحط کی سی حالت تھی اور تمام لوگ فقر و فاقہ میں مبتلا تھے۔ قافلہ کی آمد کا اعلان سنتے ہی کچھ لوگ مسجد سے قافلہ کے استقبال کے لئے چلے گئے اور بظاہر اس خیال سے کہ خطبہ کا حکم بھی عام وعظوں کی طرح ہے جن میں ضرورت کے وقت اُٹھ سکتے ہیں۔ نماز پھر واپس آکر پڑھ لیں گے۔ یا نمازِ جمعہ ہو چکی ہوگی جیسا کہ بعض لوگوں کا قول مراسیل ابی داؤد وغیرہ میں لکھا ہوا ہے کہ ابتدائے اسلام میں نمازِ جمعہ بھی نمازِ عید کی طرح خطبہ سے پہلے پڑھی جاتی تھی بہرحال جو صورت بھی ہو نتیجہ میں آنحضرتؐ کی خدمت میں صرف

بارہ آدمی باقی رہ گئے جن میں اکابر صحابہؓ کرام شامل تھے۔ اس بنا پر یہ آیت اتری کہ تجارت اور کھیل تماشا کیا چیز ہے! تم تو وہ ابدی دولت حاصل کرو جو اللہ کے پاس ہے اور جو پیغمبرؐ کے وعظ و نصیحت اور مجالس ذکر و عبادت میں ملتی ہے۔ باقی رہا قحط کی وجہ سے روزی کا کھٹکا جس کی بنا پر کچھ لوگ صبر نہ کر سکے اور مسجد سے اُٹھ کر چلے گئے تو یاد رکھو کہ روزی صرف اللہ کے اختیار میں ہے اور وہی سب کو رزق عطا فرماتا ہے۔

اس ارشاد سے مسلمانوں کے ذوقِ عبادت اور جذبہ اطاعت الٰہی میں ایک نئی روح پھونک دی گئی اور اُن میں جہادِ نفس، بلندیِ فکر، صالح شعور، نظم و ضبط اور صبر و قربانی کے بے مثال ولولہ کی تخلیق فرمائی گئی تاکہ وہ کبھی اس حقیقت کو پھر فراموش نہ کر سکیں کہ دُنیا کی تمام دولت و ثروت کے خزانوں اور زر و جواہر کے انبار اور بڑی سے بڑی حکومت و سلطنت بھی اللہ کی یاد اور اُس کی عبادت و اطاعت کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں رکھتی اور سچا مسلمان صرف وہی ہے جو ذکرِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کے سامنے کسی دوسری چیز کو کبھی ترجیح نہ دے۔

(درس ۱۶۷)

إِذَا جَاءَكَ الْمُنَافِقُونَ قَالُوا نَشْهَدُ إِنَّكَ لَرَسُولُ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ إِنَّكَ لَرَسُولُهُ ط وَاللَّهُ يَشْهَدُ إِنَّ الْمُنَافِقِينَ لَكَاذِبُونَ ۝ اتَّخَذُوا أَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ط إِنَّهُمْ سَاءَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ آمَنُوا ثُمَّ كَفَرُوا فَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ۝ وَإِذَا رَأَيْتَهُمْ تُعْجِبُكَ أَجْسَامُهُمْ ۖ وَإِن يَقُولُوا تَسْمَعْ لِقَوْلِهِمْ ط كَأَنَّهُمْ خُشُبٌ مُّسَنَّدَةٌ ۖ يَحْسَبُونَ كُلَّ صَيْحَةٍ عَلَيْهِمْ ط هُمُ الْعَدُوُّ فَاحْذَرْهُمْ ط قَاتَلَهُمُ اللَّهُ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۳ کی ابتدائی آیات - سورۂ منافقون)

ترجمہ :- (اے رسول) جب تمہارے پاس منافق لوگ آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ بیشک اللہ کے رسول ہیں اور یہ تو اللہ جانتا ہی ہے کہ تم یقیناً اُس کے رسول ہو اور اللہ اس کی گواہی دیتا ہے کہ منافقین ضرور جھوٹے ہیں۔

ان لوگوں نے اپنی قسموں کو سپر بنا رکھا ہے تو یہ لوگ اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ بیشک یہ لوگ جو عمل کرتے ہیں وہ بہت برے ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ لوگ ایمان لائے پھر کافر ہو گئے تو ان کے دلوں پر مہر لگادی گئی پس یہ سمجھتے ہی نہیں اور جب تم انہیں دیکھو تو اُن کے جسم تم کو خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور اور اگر یہ باتیں کرنے لگیں تو تم ان کی باتیں سننے لگو گویا یہ لکڑیاں ہیں جو دیواروں سے لگائی ہوئی ہیں۔ ہر چیخ کی آواز کو یہ سمجھتے ہیں کہ ان ہی پر آ پڑی۔ یہی لوگ دشمن ہیں۔ تم ان سے ہوشیار رہو۔ خدا انہیں قتل کرے یہ کہاں بہکے پھرتے ہیں۔ ترجمہ کے بعد اب ان آیات کریمہ کے بعض الفاظ اور جملوں کی تشریح کیجاتی ہے۔

شریعت میں "نِفاق" کے معنی ہیں دو رخی اختیار کرنا یعنی دل میں کچھ ہو اور ظاہر کچھ کیا جائے۔ نفاق کی حیثیت قرآنِ کریم کی نظر میں جو کچھ ہے وہ اس آیۂ کریمہ سے ظاہر ہے "اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ (۴-۱۴۵) منافق لوگ دوزخ کے سب سے نیچے کے درجہ میں ہوں گے۔ اس بنا پر زیر بحث آیات میں معنی یہ ہوں گے کہ منافقین یعنی وہ لوگ جو دل میں کفر اور زبان پر دعوائے ایمان رکھتے ہیں اے رسولؐ تمہارے پاس آکر تمہاری رسالت کی گواہی دیا کرتے ہیں۔ اس میں تو کوئی شبہہ نہیں کہ تم خدا کے رسول ہو لیکن یہ لوگ اپنے اس اقرار میں جھوٹ بول رہے ہیں مراد یہ ہے کہ یہ دل سے تمہاری رسالت کے ہرگز قائل نہیں ہیں۔ اور یہ غلط کہتے ہیں کہ یہ تم کو خدا کا رسول سمجھتے ہیں۔

"اَیْمَان" "یَمِیْنٌ" کی جمع ہے عربی زبان میں اس لفظ کا استعمال بہت سے معنوں میں ہوتا ہے مگر یہاں پر اس کے معنی قسم کے ہیں۔

"جُنَّۃٌ" کی جمع "جُنَنٌ" آتی ہے۔ اس کے معنی سپر یعنی ڈھال کے ہیں۔ "فَطُبِعَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُوْنَ" "طَبْعٌ" کے بھی کئی معنی آتے ہیں لیکن جب یہ "علیٰ" کے ساتھ بولا جائے جس طرح یہاں ہے تو اس کے معنی مہر لگانے کے ہوتے ہیں اسی قسم کا ارشاد قرآن کریم میں دوسری جگہوں پر بھی ہے۔ چنانچہ اس آیت میں بھی فرمایا گیا ہے۔

"كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (۳۰-۵۹)
یعنی اسی طرح اللہ اُن کے دلوں پر جو سمجھ نہیں رکھتے مہر لگا دیتا ہے۔ یا یہ آیت۔
كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ (۱۰-۴-۷) اسی طرح ہم زیادتی کرنیوالوں
کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح مہر لگا دینے کے بعد اُس چیز میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی جس پر مہر لگی ہوئی ہو اسی طرح جب انسان اپنے کفر و الحاد اور حق سے سرکشی اور گناہوں میں حد کو پہنچ جاتا ہے تو پھر اُس میں حق کو قبول کرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی اور اس طرح گویا اُس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور اللہ کی تمام توفیقات اُس سے الگ ہو جاتی ہیں اور الطافِ خداوندی سے وہ ہمیشہ کے لئے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اعاذنا اللہ من ذٰلک۔

انسان کی اسی حالت کو کبھی "ختم" اور "طبع" یعنی مہر لگا دینے سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کبھی "دلوں کو غافل کرنے" "اُن پر" پردہ ڈالنے" یا اُن میں" قساوت اور سختی پیدا کرنے" کے الفاظ سے اس کو ظاہر فرمایا گیا ہے۔ اسی طرح جہاں "اضلال" یعنی گمراہ کرنے کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں بھی یہی مُراد ہے کہ اللہ ایسے سرکشوں کو جو اپنی گمراہی میں حد سے گذر جاتے ہیں اور حق کی طرف رُخ ہی نہیں کرتے اُن سے اپنے تمام الطاف اور توفیقات کو سلب کر لیتا ہے۔ غرض بیان یہ کیا جا رہا ہے کہ یہ منافق لوگ دل سے تو حق کا انکار کرتے رہے اور صرف زبان سے ایمان ظاہر کرتے رہے تو اس بے ایمانی اور فریب و دغا کا یہ اثر ہوا کہ ان سے اللہ کی ساری توفیقات سلب ہو گئیں اور گویا ان کے دلوں پر مُہر لگ گئی کہ اب ان کے اندر ایمان اور نیکی کے داخل ہونے کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہی اور ظاہر ہے کہ جب آدمی کا دِل اُس کی بدکاریوں اور گناہوں کی وجہ سے بالکل مسخ ہو جائے اور نیکی اختیار کرنے کی تمام صلاحیتیں فنا ہو جائیں تو پھر اُس سے خیر اور ایمان کی اُمید کہاں کی جا سکتی ہے۔ مرض کا علاج تو صرف اُسی وقت تک کیا جا سکتا ہے جبتک مریض میں علاج قبول کرنے کی صلاحیت کچھ نہ کچھ باقی رہے لیکن جب مریض میں دوا کا ذرہ برابر اثر حاصل کرنے کی قابلیت باقی نہ ہو اور مرض نے اُس کی تمام صلاحیتوں کو فنا کر دیا ہو تو پھر

اُس پر کوئی علاج اثر نہیں کر سکتا۔ یہی حالت گناہوں کی ہے کہ جب یہ کسی انسان کی طبیعت میں گھر کر لیتے ہیں تو پھر اُس سے ہر قسم کی نیکی کی صلاحیت اور حق کو اور ہدایت کو قبول کرنے کی قابلیت فنا ہو جاتی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ اُن کے دل تو بالکل مسخ ہو ہی چکے ہیں لیکن جب اُن کے جسموں کو دیکھو تو قد و قامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے بہت اچھے معلوم ہوتے ہیں اور گفتگو ایسی کرتے ہیں کہ سننے والا خواہ مخواہ ان کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور ان کی گمراہی میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اس کلام کی تہہ میں سوائے باطل کے اور کچھ نہیں ہے۔ پھر ان منافقوں کی مثال ایسی بیکار لکڑیوں سے دی گئی ہے جو دیوار سے لگا کر کھڑی کر دی جائیں اور مراد یہ ہے کہ جس طرح دیکھنے میں تو وہ بہت مضبوط ہوا کرتی ہیں مگر نہ اُن میں کوئی شعور ہوتا ہے اور نہ وہ ایک لمحہ بھر بغیر سہارے کے کھڑی رہ سکتی ہیں۔ بس یہی حال اُن لوگوں کا ہے جن کے دِل نیک عمل اور سچے ایمان سے خالی ہیں کہ اکثر اُن کا ظاہر تو بڑا خوشنما ہوتا ہے مگر اُن کی اس ظاہری خوشنمائی اور قد و قامت میں کوئی روح نہیں ہوتی اور ان کی زندگی کی پوری عمارت گویا ریت پر کھڑی ہوتی ہے اور چونکہ ان میں ایمان اور سچائی کی کوئی جھلک نہیں ہوتی اور ہر وقت وہ سنگین گناہوں اور ہر طرح کے جرموں اور کفر و الحاد میں مبتلا رہا کرتے ہیں اس لئے اُن میں ذرہ برابر جرأت و ہمت بھی باقی نہیں رہتی اور بزدلی اُن کے دِلوں میں جگہ کر لیتی ہے اس بنا پر جب بھی وہ کوئی چیخ اور شور کی آواز سُنتے ہیں تو اُن کے دل دہل جاتے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہ عذاب الہٰی ہے اور بس یہ اُن ہی کی تباہی کا سامان ہے۔ کیونکہ ان منافقین کے ضمیر مجرم ہیں اور یہ اپنے سینوں میں سچے مومن کا دل ہی نہیں رکھتے جو یقینِ محکم کی روح سے سرشار ہوتا ہے اور دُنیا کی کوئی طاقت اُسے کبھی متزلزل نہیں کر سکتی۔

وَاِذَا قِیْلَ لَھُمْ تَعَالَوْا یَسْتَغْفِرْ لَکُمْ رَسُوْلُ اللّٰہِ لَوَّوْا رُءُوْسَھُمْ وَرَاَیْتَھُمْ یَصُدُّوْنَ وَھُمْ مُّسْتَکْبِرُوْنَ ○ سَوَآءٌ عَلَیْھِمْ اَسْتَغْفَرْتَ لَھُمْ اَمْ لَمْ تَسْتَغْفِرْ لَھُمْ ط لَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ ○ ھُمُ الَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰی مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ حَتّٰی یَنْفَضُّوْا ط وَلِلّٰہِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَفْقَھُوْنَ ○ یَقُوْلُوْنَ لَئِنْ رَّجَعْنَآ اِلَی الْمَدِیْنَۃِ لَیُخْرِجَنَّ الْاَعَزُّ مِنْھَا الْاَذَلَّ ط وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَلٰکِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ ○ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْھِکُمْ اَمْوَالُکُمْ وَلَآ اَوْلَادُکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ○ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰکُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ فَیَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِیْٓ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَکُنْ مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ○ وَلَنْ یُّؤَخِّرَ اللّٰہُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُھَا ط وَاللّٰہُ خَبِیْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ ○

(پارہ ۲۸ رکوع ۱۳ کی آخری اور رکوع ۱۴ کی آیات کا ترجمہ و تفسیر۔ سورۃ منافقون)

ترجمہ:۔ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تمہارے لئے رسول اللہ استغفار کریں تو وہ اپنے سر پھیر لیتے ہیں اور تم اُنہیں دیکھو گے کہ وہ تکبّر کرتے ہوئے روگردانی کرتے ہیں۔ تم اُن کی بخشش کی دُعا مانگو یا نہ مانگو اُن کے حق میں برابر ہے۔ اللہ اُن کو ہرگز نہیں بخشے گا۔ بیشک اللہ ایسے نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔ یہ وہی لوگ تو ہیں جو کہتے ہیں کہ جو لوگ رسول اللہ کے پاس ہیں اُن پر کچھ خرچ نہ کرو یہاں تک کہ یہ آپ ہی منتشر ہو جائیں۔ اور اللہ ہی کے ہیں آسمان اور زمین کے تمام خزانے لیکن منافقین نہیں سمجھتے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر ہم لوٹ کر مدینہ پہونچے تو عزت دار شخص ذلت والے کو وہاں سے باہر نکال دے گا۔ حالانکہ عزت تو خاص خدا اور اُس کے رسول اور ایمان والوں کے لئے ہے مگر منافقین نہیں جانتے۔ اے ایمان والو تمہارے مال اور تمہاری اولاد تمہیں خدا کی یاد سے غافل نہ کرے اور جو ایسا کریگا تو ایسے ہی لوگ گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

اور ہم نے جو کچھ تم کو دیا ہے اُس میں سے قبل اس کے (خدا کی راہ میں) خرچ کر ڈالو کہ تم میں سے کسی کی موت آجائے پھر وہ کہنے لگے کہ اے میرے پروردگار مجھکو تونے اور تھوڑے دنوں کی مہلت کیوں نہ دی کہ میں خیرات دیتا اور نیک لوگوں میں سے ہو جاتا اور اللہ کسی شخص کو ہرگز مہلت نہیں دیتا جب اُس کی مدت پوری ہو جاتی ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اُس سے اچھی طرح باخبر ہے۔

ترجمہ کے بعد اب بعض الفاظ اور جملوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

"لَوَّوْا رُءُوْسَهُمْ" "لَوَّوْا" ماضی جمع غائب کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر تَلْوِیَۃٌ ہے۔ اس سے یہاں پر مراد سر کا پھیر لینا اور موڑ لینا ہے۔ لَوّیٰ یُلَوِّیْ اور لَوٰی یَلْوِیْ دونوں کے ایک ہی معنی ہیں۔ "لَوّیٰ" میں واو پر تشدید یعنی اُس کو دُہرا پڑھنے کی علامت صرف معنی کی شدت اور مبالغہ کے لحاظ سے ہے۔ اس لفظ کی اصل دریافت کرنے میں اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ اس کے اصلی مادّہ میں آخری حرف "ی" ہے "واو" نہیں ہے۔

"یَصُدُّوْنَ" صَدٌّ اور صُدُوْدٌ سے بنا ہے جس کے معنی اس مقام پر روگردانی کے ہیں۔

"وَهُمْ مُّسْتَكْبِرُوْنَ"۔ کبر اور تکبّر سب کے معنی تقریباً ایک ہی ہیں یعنی آدمی کی یہ حالت کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا خیال کرے۔ سب سے بڑا تکبّر یہ ہے کہ وہ حق کو قبول کرنے سے انکار کر دے اور عبادت و اطاعت الٰہی سے اعراض اور روگردانی کرے یہ اتنی بدترین صفت ہے کہ شیطان کی مذمت کے موقع پر قرآن کریم میں اللہ نے اس کا خاص طور پر ذکر فرمایا ہے "اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ" شیطان نے اللہ کی اطاعت سے انکار کیا اور غرور و تکبّر کرنے لگا۔ اور اس کے نتیجہ میں اُس کو یہ سزا ملی کہ قیامت تک کے لئے اللہ کی لعنت کا مستحق بن کر رہ گیا۔ "لَا تُلْهِكُمْ"۔ میں اِلْهَاءٌ کے معنی ہیں غافل کر دینا اور توجہ کو ہٹا دینا۔ یہ بھی "لَهْوٌ" ہی سے بنا ہے۔ "اَصَّدَّقُ" دراصل اَتَصَدَّقُ تھا علم صرف کے قواعد کے مطابق "ت" کو "صاد" سے بدل دیا گیا۔ تَصَدُّق کے معنی ہیں صدقہ اور خیرات کرنا۔ اور یہ ہر اُس چیز کو کہتے ہیں جو انسان اپنے مال سے قرب الٰہی حاصل کرنے کے لئے دیتا ہے اور کبھی اسی مناسبت سے لفظ "صدقہ" زکوٰۃ کے لئے بھی

بولا جاتا ہے۔

غرض بعض موقعوں پر جب ان منافقوں کی کوئی شرارت کھل جاتی تھی اور ان کی سازش اور مکاری کا پردہ فاش ہو جاتا تھا تو صاحبان ایمان میں سے کوئی شخص اُن سے کہتا تھا کہ اب بھی وقت نہیں گیا ہے چلو نبی کریم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنا قصور معاف کرا لو تو وہ اس پر انتہائی تکبر و غرور کے انداز سے انکار کیا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں رسُول اللہ کے استغفار کی (العیاذ باللہ) ضرورت نہیں ہے۔ اُن کی اسی شیخی اور گھمنڈ کا ذکر کر کے فرمایا گیا ہے کہ اُن کے لئے استغفار کرنا اور نہ کرنا سب برابر ہے کیونکہ اُن کی سرکشی نے اُن کو اب اس قابل نہیں رکھا ہے کہ اللہ انہیں بخشے اور نہ ایسے گناہگاروں کو اُس کی بارگاہ سے ہدایت کی توفیق ملتی ہے۔ اکثر مفسرین کے نزدیک ان آیات سے ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

چشمۂ مُریسیع پر قبیلۂ بنی مُصطلق سے جب ۵ھ میں مسلمانوں کی جنگ ہوئی تو اُس موقع پر مشہور منافق عبداللہ بن اُبیّ نے مہاجرین اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے متعلق کچھ نازیبا الفاظ کہے تھے۔ اور جب حضرت زیدؓ بن ارقم صحابی نے وہ الفاظ خدمت رسالت میں عرض کر دئے اور عبداللہ بن اُبیّ بن سلُولؓ سے پوچھ گچھ ہوئی تو صاف مکرُ گیا کہ میں نے کچھ نہیں کہا تھا لیکن وحی نے آکر اس کی تصدیق کر دی کہ یہ خبر درست ہے اور ابن اُبیّ اپنی منافقت اور سازش کو چھپا رہا ہے اُس نے جہاں اور باتیں کہی تھیں وہاں یہ بھی کہا تھا کہ جب ہم لوگ مدینہ واپس پہونچیں گے تو جو لوگ عزّت دار ہیں وہ پست اور ذلیل لوگوں کو وہاں سے نکال باہر کر دینگے۔ عزّت دار لوگوں سے اُس نے اپنی جماعت مراد لی تھی اور سچّے مسلمانوں کو اپنے خیال میں پست و ذلیل ظاہر کیا تھا۔ یہ عبداللہ بن اُبیّ مدینہ والوں کو اس پر اُبھارا کرتا تھا کہ مکّہ سے آئے ہوئے مسلمانوں کی مدد نہ کرو اور اُن سے بالکل قطع تعلق کر لو۔ جب ان لوگوں کی ساری امدادیں بند ہو جائیں گی اور تمام سہارے ٹوٹ جائیں گے تو یہ خود ہی اِدھر اُدھر منتشر ہو جائیں گے اور رسُول اللہ کے پاس پھر کوئی شخص بھی باقی نہ رہے گا۔ ان آیات میں اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ یہ بے عقل اتنا بھی نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کے تمام خزانوں کا مالک تو صرف اللہ ہے پھر کیا جو لوگ اُس پر ایمان اختیار

کرکے اُس کے رسُول کی خدمت میں رہتے ہیں وہ انہیں بھوک سے ہلاک کر دیگا ؟
اور اگر یہ منافق اُن کی امداد بند کر دیں گے تو کیا اللہ بھی اپنی روزی کے دروازے اُن کے لئے بند کردے گا ؟ ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اللہ اُن کی ہر طرح نصرت اور مدد فرمائے گا اس کے بعد یہ بتایا گیا ہے کہ تم عزت اور ذلت کی اپنے دنیاوی معیار پر تقسیم کرتے ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ عزت تو صرف خدا اور اُس کے رسُول اور سچے مسلمانوں ہی کے لئے ہے اور خدا کے نزدیک ذلیل اور پست صرف وہ ہے جو اُس کے حکم کو نہ مانے اور اُس کی اطاعت و فرماں برداری سے انکار کردے۔ آخر میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ آدمی کے لئے سب سے زیادہ خسارہ اور گھاٹے کی بات یہ ہے کہ وہ یادِ الٰہی سے غفلت کرے اور صرف دُنیا ہی کا ہو کر رہ جائے۔ اچھی اولاد اور اچھا مال صرف وہی ہے جو خدا کی اطاعت و عبادت سے غفلت نہ پیدا کرے ورنہ دُنیا اور آخرت دونوں ہی میں سوائے گھاٹے اور تباہی کے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس سورہ میں بڑے اہم بنیادی امور کو بیان فرمایا گیا ہے جن میں چند یہ ہیں :-

نفاق اتنا بڑا گناہ ہے جو انسان کو ہمیشہ کے لئے بخشش الٰہی سے محروم کر دیتا ہے۔

رزق صرف اللہ کے قبضہ میں ہے۔ کائنات کی کوئی طاقت کسی کو بھی اُس کی عطا سے محروم کر دینے پر قدرت نہیں رکھتی۔

حقیقی عزّت اور اصلی بزرگی صرف اللہ کے لئے ہے اور اُس کے بعد اُس کے رسُول کیلئے اور پھر اطاعتِ خدا و رسُول کی بدولت صاحبانِ ایمان کے لئے عزت ہے۔ اس لئے جس میں ایمان اور تقویٰ نہیں ہے وہ اللہ کی بارگاہ میں کسی عزّت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔

انسان کے لئے سب سے بڑا گھاٹا اور بے پناہ تباہی و بربادی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کی یاد سے غفلت کرے اور اُس کی عظمت اور بڑائی کو دل سے بھلا دے۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ ۝ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝
وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُوْنٍ ۝ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۝
فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ ۝ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۝ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ
بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۝ فَلَا تُطِعِ
الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

(پارہ ۲۹، رکوع ۳ کی ابتدائی آیات - سورہ القلم)

ترجمہ: نٓون اور قسم ہے قلم کی اور اُس کی جو وہ لکھتے ہیں۔ تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو اور بے شک تمہارے لئے بے انتہا ثواب ہے اور یقیناً تم بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر ہو تو عنقریب ہی تم بھی دیکھ لو گے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے دیوانہ کون ہے۔ بے شک تمہارا رب اپنی راہ سے بھٹکنے والے کو خوب جانتا ہے اور وہی سیدھی راہ پر چلنے والوں کو بھی اچھی طرح جانتا ہے تو جھٹلانے والوں کا تم کہنا نہ ماننا۔

ترجمہ کے اب بعض الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

یَسْطُرُوْنَ۔ "سَطْر" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی لکھنے کے ہیں۔ "مَمْنُوْن" کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ مگر یہاں اس سے مراد وہ چیز ہے جو ختم ہو جائے، تمام ہو جائے اور کٹ جائے اس لئے "غَیْرَ مَمْنُوْن" کے معنی "بے انتہا" کے ہیں جو کبھی ختم نہ ہو۔

خُلق اور خُلُق کے معنی سیرت، عادت، خصلت اور کردار کے ہیں اس کی جمع "اَخلاق" ہے۔

"مَفْتُوْن" یا تو مصدر میمی ہے یا اسم مفعول ہے پہلی صورت میں اس کے معنی "جنون" کے ہوں گے اور دوسری صورت میں "مجنون" کے۔ یہ لفظ "فِتْنَۃٌ" سے بنا ہے۔ اس کے کئی معنی ہیں، مگر یہاں جنون ہی مراد ہے۔

مفسرین میں شہرت اسی قول کی ہے کہ یہ سورہ مکہ میں نازل ہوا تھا۔ سب سے پہلے سورۂ اقراء نازل ہوا۔

پھر اسی سورہ کا نزول ہوا۔ اس میں ۵۲ آیات ہیں۔ اس میں قلم اور کتابت کے فائدوں کی طرف اشارہ ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اطاعت کرنے والا اور نافرمان

برابر نہیں ہیں۔ قیامت کا ذکر ہے اور اس کا اعلان ہے کہ قرآن حکیم نصیحت و ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ اس میں مسئلہ نبوت پر بھی دلچسپ بحث ہے اور اسلام کے دشمن اپنے جو بُرے خیالات سرکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ظاہر کیا کرتے تھے اور اپنی دشمنی اور جلن یا حسد کی بنا پر آپ کی ذات اقدس میں جو عیب نکالا کرتے تھے ان باتوں کو مضبوط دلیلوں کے ساتھ باطل کیا گیا ہے۔ دشمنان اسلام کی یہ حرکت اور کوشش کوئی انوکھی اور عجیب بات نہ تھی اس لئے کہ مکہ اور سارا ملک عرب ہی اُس وقت گمراہی اور جہالت میں پڑا ہوا تھا اور ہر آدمی اپنی زندگی کا مقصد صرف یہ سمجھتا تھا کہ دوسروں کو اپنا غلام بنائے اور بے انتہا دولت و طاقت حاصل کر کے بس ساری زندگی عیش کرتا رہے۔ زندگی کے اس غلط تصور کی وجہ سے پورے انسانی معاشرے میں تباہی اور بربادی پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف فساد، لڑائیاں، ذرا سی بات پر خونریزی اور جنگ و جدال، حقداروں کے حقوق کی پامالی، بدامنی اور بے اطمینانی غرض پوری دنیا اور خاص طور پر عربستان اخلاقی اور روحانی برائیوں سے بھرا ہوا تھا ایسے وقت میں اللہ نے انسانوں کی اصلاح کے لئے اور ان بُرائیوں سے انہیں بچانے اور نجات دینے کے لئے آنحضرتؐ کو بھیجا تھا۔ آپ نے اُن کو سمجھایا کہ وہ کتنی گمراہی میں مبتلا ہیں، اُن کے سامنے اللہ کی بزرگی اور عظمت بیان کی۔ انہیں اچھے اچھے اخلاق اور نیک باتوں کی ہدایت فرمائی اور بری باتوں سے روکا۔ اُنہیں ہدایت کی کہ وہ اللہ کے بتائے ہوئے قانون کے اندر زندگی گذاریں اور نیک انسانوں کی طرح زندگی بسر کریں۔ اتحاد و اتفاق کا سبق دیا، محبت کی تعلیم دی، رحم و کرم کا حکم دیا، فضول خرچی سے روکا، زناکاری، چوری، لوٹ مار، ظلم و ستم، ناانصافی، دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا۔ ان تمام باتوں کو منع کیا۔ بتوں اور دوسروں کی پرستش کو روکا اور انہیں واحد اللہ پر عقیدہ رکھنے کی تعلیم دی اور انہیں سمجھایا کہ انسان کا مقام کسقدر بلند ہے اور اللہ نے اُسے تمام کائنات پر کیسی فضیلت عطا فرمائی ہے۔ یقیناً سرکار نبی کریم کے یہ ارشادات اُن لوگوں کے اُن عقیدوں، عادتوں اور خصلتوں کے بالکل خلاف تھے جو صدیوں سے ان کے دلوں میں گھر کر چکے تھے اور جو انہیں اپنے باپ دادا سے میراث میں ملے تھے اور اب حضورؐ کی زبانِ اقدس سے وہ ایسی باتیں سُن رہے تھے جو اُن کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں اور انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ انسانی تہذیب اور اخلاقی اصلاح کے اس نئے رُخ کی طرف

ساری دُنیا اُمنڈتی چلی آرہی ہے اور جسے انھوں نے ایک بے اثر اور کمزور آواز سمجھ رکھا تھا وہ آندھی اور طوفان کی طرح ساری دُنیا پر پھیلتی جارہی ہے تو اُن کے دلوں میں حسد کی آگ بھڑکنے لگی اور اپنی حکومت و اقتدار اور عیش و عشرت کے سنہرے سورج بھیانک اندھیرے میں ڈوبتے ہوئے نظر آنے لگے۔

اپنے اقتدار کو مٹتے ہوئے دیکھکر اور اپنے بتوں کے جلال و عظمت کو خاک میں ملتے ہوئے پاکر دشمنی کے جوش میں کچھ نہ بن پڑا تو فرزند عبداللہؑ محمد عربی صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی ذاتِ اقدس میں عیب نکالنے لگے اور آپ پر انتہائی اوچھے اور گھٹیا اور ذلیل قسم کے حملے کرنے لگے اور کہتے تھے کہ یہ (العیاذ باللہ) دیوانے ہیں اور ان پر شیطان کا سایہ ہے جو یہ ایسی باتیں کہتے ہیں جنکو ہمارے باپ دادا نے بھی کبھی نہ سنا تھا۔ ان تمام باتوں کا منہ توڑ جواب ان آیات کریمہ میں دیا گیا ہے۔ عرب میں دستور تھا کہ جس بات کو وہ سچا سمجھتے تھے اُسی کے لئے قسم کھایا کرتے تھے اس لئے خدائے پاک نے بھی اپنے کلام کو قسم سے شروع فرمایا ہے اور فرماتا ہے۔ کہ نوٓن قلم کی قسم اور قلم سے لکھی ہوئی چیزوں کی قسم اے محمد (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) تم ہرگز دیوانے نہیں ہو بلکہ جو کچھ کہتے ہو وہ بڑی عقلمندی اور ہوش کی باتیں ہیں۔

"نوٓن" کی تفسیر میں مفسّروں نے بہت سی باتیں بیان کی ہیں لیکن اس کی اصلی تفسیر اور مطلب خدا جانتا ہے یا رسولؐ اور خاصان الٰہی جانتے ہیں۔

وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُوْنَ سے قسم شروع ہوئی ہے۔ اس میں دو چیزوں کی قسم ہے ...... ایک قلم کی اور دوسرے اُن باتوں کی جو قلم سے لکھی جاتی ہیں۔ قلم کی تفسیر میں بھی بہت سے اقوال ہیں۔ بعض لوگوں نے قلم سے مراد عقل کُلّی کو لیا ہے اور "مَا يَسْطُرُوْنَ" سے کائنات کی چیزوں کی صورتیں اور اُن کی ماہیتیں اور اصلیتیں۔ اور اس عقل کلّی کو کام میں لانے والی ارواح مقدسہ یا دوسرے الفاظ میں فرشتے ہیں اگرچہ کاتب ازلی خود ذاتِ خداوندی ہے لیکن کتابت کے عمل کو ان ارواح مقدسہ کی طرف مجازاً اس لئے منسوب کیا گیا کہ وہ واسطہ اور ذریعہ ہیں۔

خواہ قلم سے یہ مراد ہو یا وہ تقدیر الٰہی جس نے ازل میں ہر چیز کو لوح محفوظ پر ثبت کردیا ہو۔ سے مراد وہ قلم اور وہ لکھنا ہو جو ہر انسان کے نیک و بد افعال کے تحریر کرنے

میں ملائکہ کی طرف منسوب ہے یا دنیا کے عام قلم اور اُن کی عام تحریریں مراد ہوں کیونکہ وہ بھی ایک عظیم الانعام خداوندی ہے جس پر انسانوں کی پوری زندگی منحصر ہے۔ یہ قلم ہی تو ہے جس سے انسانی زندگی کا قافلہ چل رہا ہے، جس سے گذشتہ امتوں کی تاریخ ہم تک پہونچی ہے، جس سے الہامی کتابوں کے مضامین کا ہمیں علم ہوتا ہے، جس سے ایک ضمیر کی آواز دوسرے ضمیر تک پہونچتی ہے اور ایک دوسرے کے خیالات سے آگاہ ہوتا ہے۔

اسی قلم نے گذشتہ قوموں کی تاریخ لکھی اور بتایا کہ انہوں نے بھی اپنے زمانے کے مصلحین کو جھٹلایا تھا اور اُن کو دیوانہ کہا کرتے تھے جسکی وجہ سے وہ عتاب الہیٰ میں گرفتار ہو گئے اور تباہیوں اور بربادیوں نے اُن کا نام ونشان بھی باقی نہ رکھا۔ یہ بھی ایک اشارہ ہے کہ قلم کی لکھی ہوئی تاریخی تحریریں پڑھو اور عبرت حاصل کرو اور محمد بن عبد اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے نازیبا الفاظ کا استعمال نہ کرو اور اُن کی نصیحتوں پر عمل کر کے ہدایت حاصل کرو اور اپنے مقام کو سمجھو جو اللہ نے اپنے کرم سے تمہارے لئے مقرر فرمایا ہے۔

مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ۔ کے جملہ نے صاف بتایا کہ رسولؐ کو دنیا والوں کی اصلاح کے لئے بھیجا گیا ہے وہ مجنون نہیں ہے بلکہ وہ اپنے پروردگار کے انعام واکرام کا سب سے زیادہ مستحق ہے کیونکہ وہ انسانوں کو سیدھے راستے پر لگانے والا ہے اور نجات دلانے والا ہے۔

بلکہ ایسے انسان کو جو ایسی حکمت ودانائی اور عقل وشعور کی باتیں کرتا ہو دیوانہ کہنا خود یہ کہنے والوں کی دیوانگی ہے۔ اس ارشاد ربانی کا مطلب یہ ہے کہ اے میرے رسولؐ تم کو مجنون کے لفظ سے خطاب کرنا ایسا ہی ہے جس طرح دنیا میں تمام جلیل القدر اور اولوالعزم اور عظیم ترین مصلحین کو ہر عہد کے شریروں اور جاہلوں اور بے عقل لوگوں نے خطاب کیا تھا لیکن جس طرح تاریخ نے اُن مصلحین انسانیت کے اعلیٰ کارناموں پر بقاء اور دوام کی مہر ثبت کر دی اور اُن کو دیوانہ کہنے والوں کا نام ونشان بھی باقی نہ چھوڑا اسی طرح قلم اور اُس کی لکھی ہوئی تاریخی تحریریں تمہارے ذکر اور تمہارے بے مثال کارناموں اور تمہارے پھیلاتے ہوئے علوم ومعارف کو ہمیشہ روشن اور باقی رکھیں گی اور جو لوگ تم کو مجنون کہا کرتے ہیں وہ صفحۂ ہستی سے حرف غلط کی طرح مٹ جائیں گے اور ایک وقت آئے گا جب تمام دنیا تمہاری برتری، تمہاری حکمت ودانائی، تمہاری عقل وشعور اور تمہاری عظمت کا اقرار کرے گی۔

نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ ۞ مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُونٍ ۞ وَاِنَّ لَكَ لَاَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ ۞ وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ ۞ فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُوْنَ بِاَيِّكُمُ الْمَفْتُوْنُ ۞ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ ۞ فَلَا تُطِعِ الْمُكَذِّبِيْنَ ۞

(پارہ ۲۹ رکوع ۳ کی ابتدائی آیات - سورہ القلم)

نون اور قسم ہے قلم کی اور اُس کی قسم جو وہ لکھتے ہیں۔ تم اپنے پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں ہو اور بے شک تمہارے لئے بے انتہا ثواب ہے اور یقیناً تم بڑے اعلیٰ درجہ کے اخلاق پر ہو تو عنقریب تم دیکھ لوگے اور یہ لوگ بھی دیکھ لیں گے کہ تم میں سے دیوانہ کون ہے۔ بے شک تمہارا پروردگار اپنی راہ سے بھٹکنے والے کو خوب جانتا ہے اور وہی ہدایت کی راہ پر چلنے والوں کو بھی سب سے زیادہ جانتا ہے پس جھٹلانے والوں کا تم کہنا نہ ماننا۔

جس طرح اس سورہ مبارکہ میں "نون" سے ابتدا کی گئی ہے قرآن کریم کے بعض دوسرے سوروں کو بھی اسی قسم کے کچھ حروف سے شروع فرمایا گیا ہے۔ ان حروف کو "مقطّعات" کہتے ہیں۔ یوں تو جیسا کہ اس سے قبل کے درس میں عرض کیا گیا تھا۔
کہ "نون" یا دوسرے "حروف مقطعات" کی اصلی تفسیر سے خدا ورسولؐ اور خاصانِ خدا ہی واقف ہیں۔ لیکن پھر بھی مفسروں نے ان الفاظ اور حروف کی کچھ تفسیریں کی ہیں۔ مثال کے طور پر اسی سورہ میں "نون" کے متعلق لکھا ہے کہ یہ کسی خاص لفظ کا ابتدائی یا آخری حرف ہے اور وہ لفظ "ناصر" یا "نصرہ" ہے۔ جس کے معنی مددگار کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے رسولؐ تم کافروں کی کثرت اور مُسلمانوں کی تعداد اور سرمایہ وغیرہ کی کمی کا کچھ خیال نہ کرنا ہم اس دین کی اور اس کو اختیار کرنے والوں کی مدد کرنے والے ہیں بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ "نور" کا پہلا حرف ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے نبیؐ ساری دُنیا اندھیرے سے بھر گئی ہے اب خدا نے اپنے دین کا نور ظاہر کیا ہے اور تم کو رسالت دے کر بھیجا ہے تاکہ تم دُنیا سے گمراہی کے اندھیرے کو اپنی ہدایت کے نور سے دور کر دو۔ اور اس کے آخری حرف کی صورت میں کچھ مفسروں کا خیال ہے کہ اس سے الرحمٰن کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہ بھی قول ہے کہ "نون" سے مراد وہ مچھلی ہے جو حضرت یونس علیہ السلام کو نگل گئی تھی اور آپ اُس کے پیٹ میں زندہ اور

محفوظ رہے اور اسی بنا پر حضرت یونسؑ کو "ذا النون" کہا جاتا ہے۔ اس واقعہ کی طرف اشارہ کر کے نبی کریم کو تسکین اور تسلی دی گئی ہے اسکے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں بیان کی گئی ہیں۔

نزول کے اعتبار سے سب سے پیشتر سورۂ اقرأ اترا تھا اُس میں بھی پڑھنے لکھنے علم حاصل کرنے اور قلم کے ذریعہ تعلیم دینے کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ اِقْرَأْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ۔ اے رسول پڑھو اور تمہارا رب تو بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو اُن باتوں کا علم دیا جن کو وہ جانتا ہی نہ تھا۔

اور سورۂ "والقلم" میں بھی جو سورۂ اقرأ کے بعد نازل ہوا تھا قلم ہی کے ذکر سے ابتدا کی گئی ہے اور سب سے پہلے تحریر و کتابت ہی کا بیان ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک علم حاصل کرنے کا کیا درجہ ہے اور یہ اس کی طرف اشارہ ہے کہ اسلام کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ وہ دُنیا میں علم پھیلائے اور جہالت کو دور کرے۔

قرآن کے علاوہ رسولؐ اسلام نے خود اپنے ارشادات میں بھی جا بجا اسلام کے اس عظیم مقصد پر زور دیا ہے۔ ایک حدیث میں فرماتے ہیں۔

العلم حَیٰوۃُ الْاِسْلَامِ وَعِمَادُ الدِّیْنِ" علم اسلام کی زندگی اور دین کا ستون ہے۔ یعنی اگر علم نہیں ہے تو اسلام ایک مردہ جسم کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاریخ دیکھنے والے جانتے ہیں کہ دوسری قوموں نے پچھلے زمانہ میں علم و فن کو ہمیشہ خاص حلقوں میں محدود رکھنے کی کوشش کی تھی اور اُسکو چند شخصیتوں سے کبھی آگے بڑھنے نہ دیا اور اب بھی ہمارے سامنے ایسی مثالیں موجود ہیں۔ شاید اُن کے رہنماؤں کو خوف تھا کہ اُن کے پیرو اگر پڑھ لکھ جائیں گے تو اُن کی کمزوریاں سمجھنے لگیں گے جس کی وجہ سے اُن کی قیادت خطرہ میں پڑ جائے گی اس لئے انہوں نے اپنی قوموں کو پوری کوشش کے ساتھ جاہل رکھا اور علوم و فنون کے قریب بھی جانے نہ دیا کیونکہ وہ خوب سمجھتے تھے کہ اُن کی رہنمائی اور قیادت کی بنیاد کھوکھلی ہے اور قوموں کی ذہنی ترقی کے ساتھ یہ قیادت کسی طرح باقی رہ نہ سکے گی مگر اسلام کی صورتِ حال اس سے بالکل مختلف تھی، اُس کی بنیادیں مضبوط تھیں، اُس کے اصول اور اُس کا قانون مستحکم تھا اور وہ اُن تقاضوں کو پورا کرتا رہا تھا جو انسانی معاشرہ کی ترقی و بہبود کے لئے ضروری تھے۔ اس لئے نبیؐ مدنی کو اس کا ڈر نہ تھا کہ مسلمان

کے بیدار ہونے اور علم حاصل کرنے سے اُن کی آواز بے اثر اور اُن کی قیادت ختم ہو کر رہ جائیگی بلکہ وہ جانتے تھے کہ جسقدر لوگ علم حاصل کریں گے اتنا ہی اسلام کو بہتر طریقہ پر سمجھ سکیں گے اور اتنا ہی اُن کے عقیدوں میں زیادہ مضبوطی اور اُن کے خیالات اور فکر و نظر میں زیادہ روشنی پیدا ہوگی اس طرح اسلام کا وہ مقصد پورا ہو جائے گا جس کے لئے وہ آیا ہے اور اس کے برخلاف جتنی جہالت بڑھے گی اتنا ہی لوگ اسلام کی حقیقت سے بے خبر رہیں گے اسی بنا پر آپ نے دنیا والوں کو اسلام کی طرف دعوت دیتے ہی انہیں علم حاصل کرنے کی طرف بھی پوری کوشش کے ساتھ توجہ دلائی اور اس کا اعلان فرما دیا کہ اسلام کی زندگی اسی میں ہے کہ مسلمان علم حاصل کریں اور بغیر علم حاصل کئے وہ کسی طرح سچے مسلمان نہیں بن سکتے۔ قرآن و حدیث میں ہزاروں جگہ علم کی اہمیت بتائی گئی ہے لیکن یہ بات بھی ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اس سے مراد وہی علم ہے جو انسانی معاشرہ کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے مفید ہو اور خود انسان کو اُس کے اصلی فرائض سے آگاہ کر سکے اور اُسے اُس کے صحیح مقام تک پہونچا سکے اور ایسی زندگی کی طرف رہنمائی کرے جو اللہ کی خوشنودی کے حصول کا ذریعہ ہو خواہ وہ شریعت کے احکام کا علم ہو اور اُس کا تعلق فقہ اور حدیث و تفسیر سے ہو یا اُس کا تعلق صنعت و حرفت، تجارت، زراعت اور انسان کی اس مادّی زندگی کے دوسرے شعبوں سے ہو جو اس کی ترقی اور خوشحالی کے لئے ضروری ہیں۔

اس طرح اس نے انسانوں کے لئے علم و فن کے وہ تمام دروازے کھول دئے جو دوسری قوموں نے ان پر بند کر رکھے تھے اور اسی وجہ سے مسلمانوں نے علمی میدان میں ایسی ترقیاں حاصل کیں جن سے ساری دنیا حیرت میں رہ گئی۔ یہ مصلح اعظم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوششوں کا نتیجہ تھا جنہیں اُس وقت کے تنگ نظر اور جاہل و حاسد لوگ معاذ اللہ مجنون کہا کرتے تھے مگر اللہ نے اعلان فرمایا کہ مآ انت بنعمۃ ربک بمجنون۔ وان لک لاجراً غیر ممنون۔ اے رسول تم پر اللہ کی رحمت ہے اور اُس کا کرم ہے تم ہرگز مجنون نہیں ہو اور تمہاری عظیم اصلاحی کوششوں کا اثر ابد تک باقی رہے گا اور کبھی ختم نہ ہوگا۔

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ ۝ وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِينٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّاءٍ بِنَمِيمٍ ۝ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ عُتُلٍّ بَعْدَ ذَٰلِكَ زَنِيمٍ ۝ أَن كَانَ ذَا مَالٍ وَبَنِينَ ۝ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ سَنَسِمُهُ عَلَى الْخُرْطُومِ ۝ (سورۃ القلم)

ترجمہ: وہ لوگ چاہتے ہیں کہ اگر تم نرمی اختیار کرو تو وہ بھی نرم ہو جائیں اور تم ایسے شخص کے کہنے میں نہ آنا جو بہت قسمیں کھاتا ہو، بے وقعت ہو، طعنے دے، چغلی کھاتا پھرے، نیک کام سے روکنے والا ہو، حد سے گذرنے والا، بڑا گنہگار۔ سخت مزاج ہو۔ اس کے علاوہ بداصل بھی ہو چونکہ وہ مال اور بہت سے بیٹے رکھتا ہے۔ جب اُس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو پچھلی قوموں کی کہانیاں ہیں۔ ہم عنقریب اُس کی ناک پر داغ لگا دینگے۔

ترجمہ کے بعد اب ان آیات کے بعض مشکل الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے۔

"وَدُّوا" ماضی کا صیغہ ہے جو "وُدٌّ" سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں محبت کرنا، چاہنا اور تمنا یا خواہش کرنا۔

تُدْهِنُ مضارع کا صیغہ ہے اور "اِدْهَان" سے بنایا گیا ہے، جس کے معنی نرمی کرنے اور ڈھیل دینے کے آتے ہیں۔ "حلّاف۔ حَلف" سے بنا ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بات بات پر قسم کھانے والا اور زیادہ تر یہی لوگ کرتے ہیں جو دوسروں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں اور در اصل جھوٹے ہوتے ہیں مَهِيْنٌ "مَهَانَةٌ" سے بنا ہے۔ مہین۔ فسق و فجور کرنے والے اور ذلیل و حقیر کو کہتے ہیں۔

"همّاز" کا اصلی مادہ "هَمْزٌ" ہے یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے۔ هَمْز کے معنی ہیں کسی کو بُرا کہنا، اُس میں عیب نکالنا، طعن کرنا اور غیبت کرنا۔ مَشَّاءٌ مَشْيٌ سے بنا ہے۔ اور یہ بھی مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت چلنے پھرنے اور دوڑ دھوپ کرنے والا۔ نَمِیْم اور نمیمۃ چغلی کھانے اور ادھر کی بات اُدھر لگانے کو کہتے ہیں اس لئے مَشَّاءٍ بِنَمِيم "کے معنی ہونگے بڑا چغلی کھانے والا اور اِدھر کی بات اُدھر لگا کر آپس میں بڑا فساد اور جھگڑا کرانیوالا۔

"مُعْتَدٍ اَثِيْم" میں پہلے لفظ کے معنی حق کو چھوڑنے والا اور دوسرے لفظ سے مراد ہے بڑا گنہگار اور بدکار۔ عُتُلٌّ" کے بہت سے معنی آتے ہیں۔ مثلاً بہت کھانے والا، مال کو

روک رکھنے والا، بداخلاق، اور بدمزاج اور ظالم وشریر اور بداعمال۔ "زَنِیمٌ" بدنام کمینہ، ذلیل اور بداصل کو کہتے ہیں اور اُس آدمی کو کہتے ہیں جو کسی قوم کی طرف منسوب ہو اور حقیقت میں اُس سے کوئی تعلق نہ رکھتا ہو یا کسی کو اپنا باپ کہتا ہو اور وہ اُس کا اصلی باپ نہ ہو۔ "اَساطِیْرُ" "اُسْطُورَہ" کی جمع ہے اس کے معنی قصہ اور کہانی کے ہیں جو بے اصل ہو۔ "نَسِمُہٗ" "وَسَمٌ" سے بنا ہے جس کے معنی داغ لگانے کے ہیں "خُرْطُوم" ناک کو کہتے ہیں اور عام طور پر اُسے ہاتھی کی سونڈ کے لئے بولا جاتا ہے۔

اس سے قبل کی آیات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولؐ سے فرمایا تھا کہ تم اُن لوگوں کی بات کبھی نہ ماننا جو تم کو جھٹلاتے ہیں۔ اب ان آیات میں اسی حکم خداوندی کی اور تفصیل فرمائی جا رہی ہے۔ کہ یہ لوگ کوشش کرتے اور کہتے ہیں کہ تم اُن کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرو اور اُن کی گمراہیوں پر اُنہیں سختی کے ساتھ نہ ٹوکو تو پھر اس کے جواب میں وہ لوگ بھی تم پر کوئی سختی نہ کریں گے اس لئے ارشاد ہوا کہ یہ دراصل تم کو دھوکا دینے کی ایک ترکیب ہے تاکہ اُن کی گمراہیوں پر پردہ پڑا رہے اور ساتھ ہی دینِ اسلام پھیلنے نہ پائے اس بنا پر پیغمبرؐ سے فرمایا گیا کہ تم اس دھوکے میں ہرگز نہ آنا اور بدستور اپنے اصلاحی فرض کو انجام دیتے رہنا۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ ابوجہل اور اسود بن عبدیغوث اور اخنس بن شریق اور دوسرے عرب سرکار نبیؐ کریم کی خدمت میں آئے اور عرض کرنے لگے اگر اس نئی تحریک سے اور اس نئے دین کو پیش کرنے سے آپ کی یہ غرض ہے کہ آپ اس ذریعہ سے مال و دولت حاصل کریں اور اپنے لئے عیش و عشرت کا سامان مہیا کریں تو ہم سب کے سب اس کے لئے تیار ہیں کہ آپ جو کچھ بھی ہم سے طلب کریں گے خواہ دولت ہو یا تعیش کی زندگی بسر کرنے کے لئے جتنی چیزیں ضروری ہیں اُن میں سے کوئی بھی تو ہم لوگ اُس سامان عیش کو فوراً آپ کے لئے مہیا کردیں گے۔ لیکن آپ ہمیں ہماری حالت پر چھوڑ دیں اور ہماری بُت پرستی اور دوسری باتوں کے متعلق اپنا سخت رویہ ترک کردیں آپ نے جواب دیا کہ مجھے ان چیزوں کی کوئی خواہش نہیں ہے میں تو صرف حق کی آواز تم کو سُنانا چاہتا ہوں اور تمہاری بھلائی کے لئے تمہاری اصلاح کرنا چاہتا ہوں تاکہ تم گمراہی سے نجات پا جاؤ۔ ان تمام کفار میں ولید بن مغیرہ بے حد شر پسند اور فسادی تھا۔ بے حد مغرور اور سرکش، جھوٹا اور اپنے مال و دولت اور کثرت اولاد پر گھمنڈ رکھتا تھا اور سب سے زیادہ کوشش کرتا تھا کہ کسی طرح

سرورِ کائنات اس کی باتوں میں آکر تبلیغ اسلام کے کام کو بند کر دیں۔

اِن آیات میں جو اخلاقی بُرائیاں بیان کی گئی ہیں اُن کا اشارہ اسی بدذات انسان کی طرف ہے لیکن اس کا نام شاید اس وجہ سے نہیں لیا گیا کہ دوسرے لوگوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ یہ باتیں انتہا درجہ کی بُری ہیں، خواہ کسی میں بھی پائی جائیں اور یہ اُن ہی لوگوں میں پائی جاتی ہیں جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اس لئے سچّا مومن اور حقیقی مسلمان درحقیقت وہی ہے جو ان بُرائیوں سے پاک ہو۔

ان میں جن اخلاقی برائیوں کو گنوایا گیا ہے اُن میں سے ایک چُغلی کھانا ہے یعنی ادھر کی بات اُدھر لگا کر لوگوں میں جھگڑے پیدا کرنا۔ یقیناً چغلخوری ایک عظیم فتنہ ہے جس سے نہ صرف چند افراد کو نقصان پہونچتا ہے بلکہ اس سے کبھی پورے ملک اور قومیں بھی تباہ ہو جاتی ہیں اور یہ صرف ایک گناہ نہیں ہے بلکہ گناہوں کا مجموعہ ہے۔ اس چغلخوری کے گناہِ عظیم میں غیبت بہتان اور جھوٹا الزام لگانا، دھوکا دینا، منافقت، فساد پھیلانا اور معاشرہ کے امن وامان میں خلل ڈالنا۔ سب ہی بُرائیاں جمع ہو جاتی ہیں۔ چغلخور کے سامنے صرف اپنی ذات کا فائدہ اور اپنا رسوخ اور اعتبار کسی کے دل میں پیدا کرنا مقصود ہوا کرتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ اُس کا یہ عملِ بد کتنی تباہیوں اور بربادیوں کی بنیاد ہے۔ ایک حدیث میں سرورِ عالم فرماتے ہیں۔ لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ۔ چغلخور جنّت میں نہیں جائے گا۔

دوسری حدیث میں ارشاد ہوا ہے۔ سب سے بدتر وہ آدمی ہے جو چغلی کھاتا ہو اور لوگوں میں فساد پیدا کرتا ہو۔ اسی طرح ان آیات میں دوسری اخلاقی برائیوں کا ذکر فرما کر آخر میں کہا گیا ہے کہ ہم ایسے شخص کی ناک پر داغ لگا دینگے جس میں یہ بداخلاقیاں اور بُرائیاں پائی جاتی ہیں۔ یعنی ہم اُسے ایسا رسوا اور ذلیل کریں گے کہ اُس کی بُرائی دُنیا اور آخرت میں سب پر ظاہر ہو جائے گی، اور اُس کا یہ ناپاک داغ چھپائے نہ چھپ سکے گا۔

إِنَّا بَلَوْنٰهُمْ كَمَا بَلَوْنَآ أَصْحٰبَ الْجَنَّةِ ۚ إِذْ أَقْسَمُوا لَيَصْرِمُنَّهَا مُصْبِحِينَ ۙ
وَلَا يَسْتَثْنُونَ ○ فَطَافَ عَلَيْهَا طَآئِفٌ مِّنْ رَّبِّكَ وَهُمْ نَآئِمُونَ ○
فَأَصْبَحَتْ كَالصَّرِيمِ ۙ ○ فَتَنَادَوْا مُصْبِحِينَ ۙ ○ أَنِ اغْدُوا عَلٰى حَرْثِكُمْ
إِنْ كُنْتُمْ صٰرِمِينَ ○ فَانْطَلَقُوا وَهُمْ يَتَخَافَتُونَ ۙ ○ أَنْ لَّا يَدْخُلَنَّهَا
الْيَوْمَ عَلَيْكُمْ مِّسْكِينٌ ۙ ○ وَّغَدَوْا عَلٰى حَرْدٍ قٰدِرِينَ ○ فَلَمَّا رَأَوْهَا قَالُوٓا
إِنَّا لَضَآلُّونَ ۙ ○ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ○ قَالَ أَوْسَطُهُمْ أَلَمْ أَقُلْ
لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُونَ ○ قَالُوا سُبْحٰنَ رَبِّنَآ إِنَّا كُنَّا ظٰلِمِينَ ○ فَأَقْبَلَ بَعْضُهُمْ
عَلٰى بَعْضٍ يَّتَلَاوَمُونَ ○ قَالُوا يٰوَيْلَنَآ إِنَّا كُنَّا طٰغِينَ ○ عَسٰى رَبُّنَآ أَنْ
يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ إِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُونَ ○ كَذٰلِكَ الْعَذَابُ ؕ
وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ أَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ○

(پارہ ۲۹ رکوع ۲ کی آخری آیات - سورۃ القلم)

ترجمہ: بیشک ہم نے انھیں اسی طرح آزما لیا ہے جس طرح ہم نے باغ والوں کو آزمایا تھا۔ جب اُن لوگوں نے قسم کھائی کہ صبح ہوتے ہی اس باغ کے پھل توڑیں گے اور انہوں نے انشاء اللہ نہ کہا تو اس باغ پر تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک چکر لگانے والا چکر لگا گیا اور وہ سوتے رہے تھے۔ پھر صبح کو وہ ایسا رہ گیا جیسے کٹی ہوئی کھیتی - اب صبح ہوتے ہی اُن لوگوں نے ایک دوسرے کو آوازیں دیں کہ اپنے کھیت پر سویرے ہی سویرے چلو اگر تم کو پھل توڑنا ہیں۔ پھر وہ لوگ آپس میں چپکے چپکے باتیں کرتے ہوئے چلے کہ آج تمہارے پاس باغ میں کوئی محتاج نہ آنے پائے اور وہ صبح ہی صبح لپکتے ہوئے جا پہونچے یہ سمجھتے ہوئے کہ وہ قدرت رکھتے ہیں۔ پھر جب اس باغ کو دیکھا تو کہنے لگے کہ بیشک ہم راستہ بھول گئے بلکہ ہماری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ان سب میں جو سب سے اچھا تھا اس نے کہا کہ میں نے تم سے نہ کہا تھا کہ تم خدا کی تسبیح کیوں نہیں کرتے! تو سب نے کہا ہمارا رب پاک ہے بیشک ہم ہی ظالم تھے پھر وہ ایک دوسرے کی طرف منھ کر کے آپس میں الزام دینے لگے۔ کہنے لگے ہائے افسوس ہم ہی تھے حد سے بڑھنے والے۔ شاید ہمارا پروردگار اس کے عوض میں ہم کو اس سے اچھا باغ دے دے ہم اپنے رب سے آرزو کرتے ہیں۔ یوں عذاب آتا ہے اور آخرت کا عذاب اس سے بھی بڑھکر ہے کاش وہ سمجھتے!

ترجمہ کے بعد اب ان آیاتِ کریمہ کی بعض مشکل لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

"بَلَوْنَا" جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ "بَلْوٌ" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں آزمانا اور امتحان
لینا۔ لَیَصْرِمُنَّھَا "صَرْمٌ" سے بنایا گیا ہے۔ یہ پھل توڑنے اور کھیتی کاٹنے کو کہتے ہیں
"اَلصَّرِیْم" سے مراد وہ باغ ہے جس کے پھل توڑ لئے گئے ہوں یا وہ کھیتی جو کاٹ
ڈالی گئی ہو۔ اس کے معنی اندھیری رات کے بھی آتے ہیں۔ بعض لوگوں نے یہی معنی مراد لئے
ہیں۔ کچھ مفسروں نے اس سے کالی راکھ اور بعض نے ریت مراد لی ہے۔ "تَنَادِیْ" ایک
دوسرے کو پکارنا۔ انطلاق۔ چلنا اور جانا۔ "تَخَافُتْ" دھیمی آواز سے اور بہت چپکے چپکے
بات کرنا۔ اس کا اصلی مادہ "خَفْتٌ" ہے۔ "حَرْدٌ" کے کئی معنی آتے ہیں۔ مضبوط ارادہ،
کسی چیز کو روک دینا یا غصہ اور غیظ و غضب۔ قتادہؒ، مقاتلؒ اور کلبیؒ جیسے مشہور لوگوں
نے اس کے معنی قصد و ارادہ کے بتائے ہیں۔ ابو عبیدہؒ اور مبردؒ وغیرہ اس سے مراد منع کرنا
لیتے ہیں۔ یعنی وہ لوگ فقیروں کو کچھ نہ دینے اور انہیں باغ میں آنے سے روکنے کے ارادہ کے
ساتھ روانہ ہوئے۔ بعض مفسر جیسے سُدّیؒ، سفیانؒ اور شعبیؒ اس کے معنی غضب اور غصہ
کے بیان کرتے ہیں۔ ازہریؒ نے کہا ہے کہ "حَرْدٌ" اُن لوگوں کی بستی کا نام تھا اور بعض
لوگوں نے کہا ہے کہ یہ اُس باغ کا نام تھا جس کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ
وہ بڑی کوشش اور مضبوط ارادہ کے ساتھ بہت تیز تیز اُس باغ کی طرف روانہ ہوئے اور
یہ طے کر چکے تھے کہ اُس کے پھلوں میں سے غریبوں اور فقیروں کو کچھ نہ دینگے۔ قریش کے سرداروں
کو اپنی دولت اور اپنے باغوں، کھیتوں اور دوسرے سامانِ عیش و عشرت پر بڑا ناز تھا۔ وہ
غریبوں اور فقیروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اس لئے ارشاد فرمایا کہ ہم نے جو کچھ
اُنہیں عیش و آرام عطا کر دیا ہے۔ یہ صرف اُن کی آزمائش کے لئے ہے۔ اس پر اُن کو گھمنڈ نہ کرنا
چاہیئے اور اُنہیں یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح خدا کی نعمتوں پر ناشکری کی وجہ سے یمن کے
اُس باغ والوں کا حشر ہوا ان کافروں کا بھی ہوگا۔ یہ باغ جس کا ان آیات میں ذکر ہے۔
یمن کے شہر صنعاء سے تقریباً چھ میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ اس کا مالک بڑا نیک اور خدا سے
ڈرنے والا شخص تھا۔ باغ کی آمدنی میں سے وہ غریبوں کی بڑی مدد کرتا تھا اور جو اُس کی زمین پر
کھیتی ہوتی تھی وہ بھی فقیروں اور غریبوں پر تقسیم کیا کرتا تھا۔ یہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بعد
کا ذکر ہے۔ جب یہ نیک آدمی مرگیا اور اس کے بیٹے وارث ہوئے اور اُن کی نیت خراب ہوگئی
اور آپس میں یہ طے کر لیا کہ اُس کی آمدنی اور پیداوار سے غریبوں کو کچھ نہ دینگے۔ ان میں سے

صرف ایک شخص ایسا تھا جو اپنے بھائیوں کو اس حرکت سے منع کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تم فقیروں اور غریبوں کے حق کو نہ بھولو۔ اُن کی مدد کرنے سے اللہ خوش ہوتا ہے اور مال میں برکت ہوتی ہے۔ اپنی دولت اور جائیداد پر غرور نہ کرو کیونکہ سب کچھ اللہ کے اختیار میں ہے وہ جب چاہے یہ ساری دولت تم سے واپس بھی لے سکتا ہے مگر اُن لوگوں نے کچھ نہ سُنا۔ اُنھیں اپنی قوت و دولت پر غرور تھا۔ وہ خدا کو بالکل بھولے ہوئے تھے۔ ادھر اس غرور کا نتیجہ یہ ہوا کہ رات ہی رات میں اُن کے وہاں پہونچنے سے پہلے ہی گرم ہوا کا ایک طوفان آیا اور وہ باغ جل کر ایسا ہو گیا جیسے کالی رات یا کٹی ہوئی کھیتی۔ تمام باغ میووں سمیت جل کر راکھ ہو گیا۔ اس واقعہ کو بیان کر کے قریش کے مغرور اور سرکش لوگوں کو غیرت دلائی گئی ہے کہ خدا کی آیتوں کو جھٹلانا چھوڑ دیں اور اس پر مطمئن نہ رہیں کہ ان کی یہ دولت کبھی اُن سے چھن نہیں سکتی اور اسی طرح یہ اُن تمام لوگوں کو بھی تنبیہ اور نصیحت ہے جو دُنیا میں پڑ کر خدا کو بھول جاتے ہیں، اُسکی نعمتوں میں بخل کرتے ہیں، اُس کا شکر ادا نہیں کرتے اور غریبوں اور محتاجوں کو اُن کا حق نہیں دیتے۔

(درس ۱۷۳)

إِنَّ لِلْمُتَّقِينَ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّٰتِ ٱلنَّعِيمِ ○ أَفَنَجْعَلُ ٱلْمُسْلِمِينَ كَٱلْمُجْرِمِينَ ○ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُونَ ○ أَمْ لَكُمْ كِتَٰبٌ فِيهِ تَدْرُسُونَ ○ إِنَّ لَكُمْ فِيهِ لَمَا تَخَيَّرُونَ ○ أَمْ لَكُمْ أَيْمَٰنٌ عَلَيْنَا بَٰلِغَةٌ إِلَىٰ يَوْمِ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّ لَكُمْ لَمَا تَحْكُمُونَ ○ سَلْهُمْ أَيُّهُم بِذَٰلِكَ زَعِيمٌ ○ أَمْ لَهُمْ شُرَكَآءُ فَلْيَأْتُوا۟ بِشُرَكَآئِهِمْ إِن كَانُوا۟ صَٰدِقِينَ ○ يَوْمَ يُكْشَفُ عَن سَاقٍ وَيُدْعَوْنَ إِلَى ٱلسُّجُودِ فَلَا يَسْتَطِيعُونَ ○ خَٰشِعَةً أَبْصَٰرُهُمْ تَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ وَقَدْ كَانُوا۟ يُدْعَوْنَ إِلَى ٱلسُّجُودِ وَهُمْ سَٰلِمُونَ ○ فَذَرْنِى وَمَن يُكَذِّبُ بِهَٰذَا ٱلْحَدِيثِ سَنَسْتَدْرِجُهُم مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُونَ ○ وَأُمْلِى لَهُمْ إِنَّ كَيْدِى مَتِينٌ ○

(پارہ ۲۹ رکوع ۴ کی ابتدائی آیات ۔ سورۂ والقلم)

بیشک پرہیزگاروں کے لیے اُن کے رب کے نزدیک آرام کی جنتیں ہیں ۔ کیا ہم فرماں برداروں کو نافرمانوں کے برابر کر دیں گے ۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسا حکم لگاتے ہو کیا تمہارے پاس کوئی کتاب ہے جس میں تم پڑھتے ہو کہ اس میں تمہارے لیے وہ چیز ہو جس کو تم پسند کرتے ہو ۔ یا تم نے ہم سے قسمیں لے رکھی ہیں جو روز قیامت تک چلی جائیں گی کہ جو کچھ تم فیصلہ کرتے ہو وہ چیز تم کو ضرور ملے گی ۔ اُن سے پوچھو کہ ان میں سے کون اس کا ذمہ دار ہے ۔ کیا اُن کے اور لوگ شریک ہیں پس اگر یہ لوگ سچے ہیں تو اپنے شریکوں کو پیش کریں ۔ جس دن ساق کھول دی جائے گی اور وہ لوگ سجدہ کے لیے بلائے جائیں گے تو وہ سجدہ نہ کر سکیں گے ۔ اُن کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی ۔ اُن پر رسوائی چھائی ہوئی ہو گی ۔ حالانکہ یہ لوگ سجدہ کے لیے اس وقت بھی بلائے جاتے تھے جب بالکل تندرست تھے تو مجھ کو اور اس کلام کے جھٹلانے والوں کو چھوڑ دو ۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ اس طرح پکڑ لیں گے کہ ان کو خبر بھی نہ ہو گی ۔

تشریح و تفسیر :۔ "ایمان" یمین کی جمع ہے یمین بائیں کے مقابلہ میں داہنے کو کہتے ہیں اس کے دوسرے معنی قسم کے ہیں اور یہی اس جگہ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اُن لوگوں نے کیا خدا سے کچھ ایسے عہد کر لیے ہیں جو قسمیں کھا کر مضبوط کیے جاتے ہیں ؟
"زَعِیْمٌ" سے مراد کفیل ہے یعنی ذمہ داری لینے والا اور ضمانت کرنے والا ۔ "یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ" کے جملہ میں کشف کے معنی کھولنا اور ظاہر کرنا اور "ساق" کے معنی پنڈلی کے ہیں ۔ اس مقام پر "کشف ساق" کے متعلق مفسروں نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے کیا مراد ہے ۔ علامہ عماد الدین اسمٰعیل بن عمر بن کثیر نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس دن سے مراد قیامت کا دن ہے جو بڑی ہولناکیوں اور زلزلوں والا اور بڑے بڑے اہم امور کے ظاہر ہونے کا دن ہو گا ۔ پھر انہوں نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا اس کی تفسیر میں قول نقل کیا ہے جس میں آپ نے فرمایا ہے کہ "کشف ساق" سے مراد یہ ہے کہ وہ دن تکلیف، دکھ درد اور شدت کا ہو گا جیسے

یہاں عرب کے محاورہ کے طریقہ پر بیان فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ جملہ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جہاں شدت ظاہر کرنا ہوتی ہے چنانچہ مجاہد، ابوعبیدہ، نسفی، ابوالحسن الواحدی، زمخشری، ابن قتیبہ، ابوجعفر ابن جریر طبری اور دوسرے بڑے بڑے مفسروں نے "کشف ساق" سے شدت اور ہولناکی ہی کو مراد لیا ہے۔ اس سلسلہ میں عرب کے محاورہ اور اشعار کا بھی حوالہ دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جب جنگ میں شدت پیدا ہو جاتی ہے تو عرب کہتے ہیں "کشفت الحرب عن ساقھا" یعنی گھمسان کی لڑائی ہونے لگی اور اس میں بڑی شدت پیدا ہوگئی۔ ابوجعفر طبری نے اس موقع پر ایک اور حدیث بھی ذکر کی ہے جس میں یہ ہے کہ "کشف ساق" سے مراد ایک عظیم نور کا ظہور ہے۔ اس روایت کو ابویعلیٰ نے بھی لکھا ہے۔ بعض مفسروں نے "ساق" کے معنی اصل اور بنیاد کے بتائے ہیں جس پر کوئی چیز قائم ہوتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس روز تمام چیزوں کی اصلی حقیقت اور اُن کی ساری بنیادیں ظاہر ہو جائیں گی اور اُن پر سے پردہ ہٹا دیا جائے گا۔ علامہ بیضاوی نے انوار التنزیل میں شدت اور اظہار حقیقت دونوں معنی لکھے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کچھ لوگوں نے "کشف ساق" کے لفظی اور ظاہری معنی ہی کو مراد لیا ہے جس کی تفصیل اور اس پر جو کچھ بحث ہے وہ تفسیر کی کتابوں میں لکھی ہوئی ہے۔ غرض ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہوا کہ قیامت کے دن تمام چیزوں کی اصلی حقیقت پر سے پردہ ہٹا دیا جائے گا، وہ بڑا ہولناک دن ہوگا اور اس روز ایک عظیم تجلی کا ظہور ہوگا جس کے سامنے تمام کفار و مشرکین کی نگاہیں جھک جائیں گی اور اُن پر ذلت و رسوائی چھا جائے گی۔

ان آیات کریمہ میں اس کا اعلان کیا گیا ہے کہ نیک اعمال لوگوں کا اور جو متقی اور پرہیزگار ہیں ان کا اللہ کے نزدیک بڑا درجہ ہے اور یہ کہ سچے مسلمان اور کفار کسی طرح برابر نہیں ہو سکتے۔ مجرموں اور کافروں کو قیامت میں ان کے کفر کی سزا دی جائے گی اور ایمانداروں پر خدا کی رحمت ہوگی اور انہیں اُن کے ایمان و تقویٰ کی جزا عطا ہوگی۔ پھر ارشاد ہوا ہے کہ اس روز کافروں کو سزا کے طریقہ پر سجدہ کا حکم دیا جائے گا مگر ان کی کمر تختہ ہو جائے گی، بدن سخت

پڑ جائے گا اور وہ سجدہ نہ کر سکیں گے یہ اس کی سزا ہوگی کہ جب وہ دنیا میں سجدہ کر سکتے تھے اور صحیح و سالم تھے اس وقت انہوں نے خدا کو سجدہ نہ کیا تھا۔ پھر فرمایا گیا ہے کہ مجھے اور قرآن کو جھٹلانے والوں کو چھوڑ دو یعنی میں اُن سے خود ہی نبٹ لوں گا۔ حقیقت میں اس ارشاد خداوندی میں آیات الٰہی کی تکذیب کرنے والوں کے لیئے عذاب کی بہت سخت دھمکی ہے (العیاذ باللہ من ذلک)

پھر فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی سرکشی اور غرور میں بڑھتے جائیں گے اور ہم اُن کو مہلت دیتے رہیں گے مگر وہ اس مہلت اور ڈھیل کے راز کو نہیں سمجھیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنی سرکشی میں اللہ کو بھولے ہوئے مست پڑے رہیں گے اور ایک دم عذاب الٰہی اُن کو آ کر گھیر لیگا۔ اور پھر وہ اس کی گرفت سے نہ بچ سکیں گے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کے مال و دولت میں پڑ کر انسان کو اپنے اصلی فرائض کو ہرگز بھولنا نہ چاہیئے اور ہر حال میں اسے اللہ کی عظمت کو یاد رکھنا چاہیئے، کیونکہ اس کی بارگاہ میں سوائے عمل صالح کے اور کوئی چیز کام نہ آئے گی۔

(درس ۱۴۱) أَمْ تَسْأَلُهُمْ أَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُونَ ○ أَمْ عِندَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُونَ ○ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُن كَصَاحِبِ الْحُوتِ إِذْ نَادَىٰ وَهُوَ مَكْظُومٌ ○ لَّوْلَا أَن تَدَارَكَهُ نِعْمَةٌ مِّن رَّبِّهِ لَنُبِذَ بِالْعَرَاءِ وَهُوَ مَذْمُومٌ ○ فَاجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَجَعَلَهُ مِنَ الصَّالِحِينَ ○ وَإِن يَكَادُ الَّذِينَ كَفَرُوا لَيُزْلِقُونَكَ بِأَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّكْرَ وَيَقُولُونَ إِنَّهُ لَمَجْنُونٌ ○ وَمَا هُوَ إِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعَالَمِينَ ○

(پارہ ۲۹ رکوع ۴ کی آخری آیات ۔ سورۃ والقلم)

کیا تم اُن سے کچھ اجرت مانگتے ہو کہ وہ اس کے تاوان کے بوجھ سے دبے جا رہے ہیں یا اُن کے پاس علم غیب ہے جسے وہ لکھ لیا کرتے ہیں۔ تو تم اپنے پروردگار کے حکم کے

انتظار میں صبر کرو اور مچھلی (کے پیٹ میں چلے جانے) والے کی طرح نہ ہو جاؤ کہ انہوں
نے خدا کو پکارا اور وہ غمگین تھے۔ اگر تمہارے پروردگار کا احسان ان کی دستگیری
نہ کرتا تو وہ چٹیل میدان میں ڈال دیئے جاتے اور ان کا بُرا حال ہوتا۔ تو اُن کے
رب نے اُن کو نوازا اور انہیں نیک بندوں میں قرار دیا۔ اور کفار جب قرآن
سُنتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں سے (گھور کر) تم کو ضرور اپنی جگہ
سے پھسلا دیں گے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ تو دیوانہ ہے۔ حالانکہ قرآن تو سارے
جہان کے لیے نصیحت ہے۔

تشریح و تفسیر:۔ "مَغْرَمٌ" کا اصلی مادّہ "غُرْمٌ" ہے۔ یہ لفظ (مغرم)
مصدر میمی ہے اور اسم کی حیثیت سے بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں پر اسم مراد ہے
"مَغْرَمٌ" اور "غَرَامَةٌ" مفت کے تاوان یا جرمانہ کو کہتے ہیں یعنی وہ مالی نقصان
جو کسی قسم کی خیانت یا جرم کیئے بغیر انسان کو برداشت کرنا پڑے۔ "ثِقْلٌ" بوجھ
کو کہتے ہیں۔ اسی سے "مُثْقَلٌ" بنا ہے یعنی وہ چیز یا وہ شخص جس پر کوئی بوجھ
ڈالا گیا ہو "صَاحِبُ الْحُوْتِ" کے لفظی معنی تو "مچھلی والے" کے ہیں "حُوْتٌ"
عام طور پر بڑی مچھلی کو کہا جاتا ہے اس کی جمع "حیتان" آتی ہے۔ اس آیۂ کریمہ
میں "صَاحِبُ الْحُوْتِ" سے مراد حضرت یونس علیہ السلام ہیں جن کے واقعہ کی
طرف اشارہ فرما کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسکین دی گئی ہے "مَكْظُوْم"
كَظْمٌ سے بنایا گیا ہے۔ كَظْم کسی چیز کے روکنے اور بند کرنے کو کہتے ہیں اور جب یہ
غم اور غصہ کے لیئے بولا جائے تو اس کے معنی اُسے ضبط کرنے کے ہوتے ہیں کاظم اُس
شخص کو کہتے ہیں جو غم یا غصہ سے اندر اندر گھٹ رہا ہو اور اسے ضبط کیئے ہوئے ہو۔
"عَرَاءٌ" چٹیل میدان کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع "اَعْرَاءٌ" آتی ہے "مَذْمُوْمٌ"
ذَم سے بنا ہے اس کے معنی مذمت کرنے، ملامت کرنے اور عتاب کرنے کے آتے ہیں۔
اس لئے "مَذْمُوْم" وہ شخص ہو گا جس کی مذمت یا ملامت کی جائے یا اس پر عتاب ہو
لیکن اس جگہ "لَوْلَآ اَنْ تَدٰرَكَهٗ نِعْمَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ" کا جملہ فرما کر خدا نے یہ ظاہر
کر دیا کہ اس کی رحمت و کرم سے حضرت یونسؑ "مذموم" ہونے سے محفوظ رہے۔

اس طرح کے ارشاد کی مثالیں قرآن کریم میں اور بھی ہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ یوسُفؑ میں فرمایا گیا ہے "وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَا اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ" یعنی زُلیخا نے یوسُفؑ کا ارادہ کیا اور یوسُفؑ بھی اس کا ارادہ کرتے اگر وہ اپنے پروردگار کی قدرت اور حجّت کو نہ دیکھ چکے ہوتے۔ جبکہ "هَمَّ بِهَا" کو آگے کی عبارت سے ملاکر پڑھا جائے اور اگر نہ بھی ملایا جائے جیسا کہ بعض مفسروں کی رائے ہے جب بھی مطلب تقریباً یہی ہوگا اور اس کلام سے حضرت یوسف علیہ السّلام کی عصمت کے خلاف کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی بس اسی طرح یہاں بھی حضرت یونس علیہ السّلام کے متعلق اس طرح کی کوئی بات ظاہر نہیں ہوتی کہ اُن سے نبوت الگ کرلی گئی ہو یا اُن سے کوئی گناہ ہوا ہو یا اُن کی عصمت میں کوئی فرق آیا ہو۔ حضرت یونسؑ کا ایک نام "ذوالنون" بھی ہے جس کا قرآن کریم میں ذکر ہے "نون" بھی بڑی مچھلی کو کہتے ہیں اور اس نام سے بھی آپ کے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے "لَيُزْلِقُوْنَكَ" "اِزْلَاق" سے بنا ہے جو مصدر ہے بعض لوگوں نے اسے "يَزْلِقُوْنَ" پڑھا ہے۔ دونوں صورتوں میں اس کا اصلی مادّہ "زَلَقَ" ہے ازلاق یا زلق کے مشہور معنی کسی کو کسی جگہ سے ہٹا دینے، دور کردینے یا پھسلا دینے کے آتے ہیں لیکن اس کے ساتھ جب "آنکھوں" کا ذکر آتا ہے جیسے اس مقام پر ہے تو اس کے معنی غصّہ بھری نگاہوں سے گھورنے کے ہو جاتے ہیں۔ کلام عرب میں اس قسم کی غصّہ بھری تیز نگاہ کو قتل کرنے والی، کھا لینے والی، اور گرا دینے والی کہا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے رسُولؐ جب تمہیں یہ کفار قرآن کی تلاوت کرتے ہوئے سنتے ہیں تو غصّہ کے مارے گھور گھور کر تمہیں دیکھنے لگتے ہیں اور اُن کی یہ بھی غرض ہوتی ہے کہ اُن کی اس حرکت سے تم کو بھی غصّہ آجائے اور تم اپنے مقامِ صبر و تحمل سے ہٹ جاؤ اور ساتھ ہی یہ لوگ زبان سے بھی آوازے کستے رہتے ہیں کہ یہ شخص (معاذ اللہ) مجنون ہوگیا ہے اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اس طرح پر تمہیں گھبرا کر صبر و استقلال کی راہ سے ہٹا دیں مگر تم اُن کی حرکتوں کی پروا نہ کرنا اور اپنے مسلک پر جمے رہنا۔ بعض مفسروں نے اس سے مراد نظر بد لگانے کو لیا ہے اور اس سلسلہ میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم کے واقعات اور اُن کے اقوال لکھے ہیں اور کثرت کے ساتھ حدیثیں بھی نقل کی ہیں جن سے پوری

طرح ثابت ہوتا ہے کہ نظر بد میں بڑا شدید اثر ہوتا ہے جسے نظر لگنا کہتے ہیں اور اس کے بڑے اور خطرناک اثرات کو دور کرنے کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ جہاں تک نظر کی تاثیر اور اس کی قوت پر بحث کا تعلق ہے اب اس میں زیادہ الجھنے کی ضرورت معلوم نہیں ہوتی جبکہ "مسمریزم" ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ان آیاتِ کریمہ میں کفّار و مشرکین کی حالت کا ذکر کر کے اللہ جل شانہٗ نے نبی کریم کو صبر و استقلال کی تاکید فرمائی ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو حضرت یونسؑ کا واقعہ یاد دلایا ہے جنھوں نے نافرمانوں کے لیئے اُن کی سرکشی سے تنگدل ہو کر عذاب کی دعا کی تھی اور جب عذاب آنے کا دن مقرر ہوا اور انہوں نے اس کا قوم میں اعلان کر دیا تو قوم نے توبہ و استغفار کیا اور شہر سے باہر میدان میں نکل کر تمام چھوٹے اور بڑے، عورتیں اور مرد خدا کی بارگاہ میں رو رو کر عذاب کے ٹل جانے کی دعا مانگتے رہے آخر عذاب ٹل گیا حضرت یونسؑ عذاب نہ آنے سے اور اپنے اس اعلان کے پورا نہ ہونے کی وجہ سے کچھ غمگین تھے اسی حالت میں دریا کی طرف گئے، ایک کشتی پر بیٹھے پھر کشتی طوفان میں پھنس گئی اور آخر آپ کو ایک بڑی مچھلی نگل گئی۔ مچھلی کے شکم میں جا کر آپ نے خدا کی تسبیح کی پھر اس مچھلی نے حکم الٰہی سے آپ کو کنارے جا کر ایک چٹیل میدان میں ڈال دیا وہاں کدو کے پتوں سے آپ پر سایہ کیا گیا اور خدا نے حضرت یونسؑ سے فرمایا کہ ہم اپنی مخلوق پر رحیم ہیں اور اس وقت تک اس پر عذاب نہیں کرتے جب تک پوری طرح حجت تمام نہ ہو جائے اس لیئے عذاب نہ آنے کا غم نہ کرو ہم نے ان کی توبہ کو قبول کر لیا ہے آخر حکم خدا سے پھر آپ اپنی قوم میں آئے اور اُن کی ہدایت کرتے رہے حضرت یونسؑ قریۂ نینوا میں رہنے والی قوم کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے تھے یہ بستی عراق کے شہر موصل کے نزدیک تھی علامہ یاقوت حموی نے معجم البلدان میں لکھا ہے کہ یہ بستی وہ خطۂ نینوا نہیں ہے جو کوفہ کے قریب کربلا سے متصل تھا بلکہ یہ ایک دوسری بستی کا نام ہے۔ ان آیات میں آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ کفار خدا کے پیغمبرؐ کو مجنون کہتے ہیں حالانکہ جو کتاب وہ لائے ہیں وہ کسی چھوٹی سی بستی کے لیئے نہیں بلکہ سارے جہان کے لیئے

نصیحت اور ہدایت ہے اور یہ کام کوئی مجنون کبھی نہیں کر سکتا۔ مگر چونکہ یہ لوگ کتاب خدا کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور خاتم المرسلین کی شخصیت اور کردار میں کوئی عیب بھی لگانے پر قدرت نہیں رکھتے اس لیئے یہ اپنی بے بسی میں حسد اور کینہ کی آگ میں جلتے ہیں اور پیغمبرؐ کی شان میں گستاخیاں کرنے لگتے ہیں۔

(درس ۱۲۵)

اَلْحَآقَّةُ ۝ مَا الْحَآقَّةُ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ۝ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ۝ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ۝ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ حُسُوْمًا فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۝ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝

(پارہ ۲۹ رکوع ۵ کی ابتدائی آیات سورۃ الحاقۃ)

سچ مچ ہونے والی، وہ سچ مچ ہونے والی چیز کیا ہے، اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ سچ مچ ہونے والی چیز کیا ہے۔ قوم عاد و ثمود نے اس کھڑکھڑانے والی چیز کو جھٹلایا پھر ثمود تو کڑک کی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے۔ رہے عاد تو وہ بڑی تیز آندھی سے ہلاک کئے گئے جس کو اللہ نے اُن پر سات راتوں اور آٹھ دنوں تک لگاتار مسلّط کر دیا تھا پس (اے مخاطب) تو اس قوم کو دیکھتا کہ وہ لوگ اس طرح زمین پڑے تھے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں تو کیا تجھے اُن میں سے کوئی بھی بچا ہوا نظر آتا ہے۔

"تشریح وتفسیر:۔ "الحاقّة" سچ مچ ہونے والی چیز یا سچے واقعہ کو کہتے ہیں اس جگہ قیامت مراد ہے۔ آگے کے سب جملے اس آنے والی گھڑی کی ہولناکی ظاہر کرنے کے لیئے ارشاد ہوئے ہیں اور پھر کوئی شخص کتنا ہی سوچے لیکن قیامت کے ہولناک مناظر اور واقعات کو پوری طرح نہیں سمجھ سکتا اس لیئے مثال کے طور پر قیامت کی شدت بتانے کے لیئے اس دنیا کے چند اور "حاقے" یعنی چھوٹے چھوٹے ہولناک واقعات کو بیان کیا گیا ہے جو اُس قیامت کبریٰ کی ہولناکی کا بہت معمولی سا نمونہ تھے۔

"قارعة" "قرع" سے بنا ہے جس کے معنی کھڑکھڑانے کے ہیں۔ "طاغية"

طغیان سے مشتق ہے جسکے معنی کفر، سرکشی اور حد سے گذر جانے کے ہیں حضرت ابن عباسؓ اور مجاہدؒ نے یہی معنی مراد لیئے ہیں۔ زجاج نے زلزلہ اور بعض لوگوں نے سخت چنگھاڑ کو مراد لیا ہے "صرصر" بے حد ٹھنڈی ہوا کو کہتے ہیں مجاہدؒ کے نزدیک اس سے مراد زہریلی سخت گرم ہوا ہے۔ "حسوم" کے معنی حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابنؓ مسعود نے پے در پے اور لگاتار کے بتائے ہیں۔ اس لفظ کی تشریح میں اور بھی قول ہیں۔ "اعجاز" عجُز یا عجز کی جمع ہے جس کے معنی پچھلے اور آخری حصہ کے آتے ہیں۔ "اعجاز نخل" سے مراد کھجور کے ٹھنٹھ اور تنے ہیں۔ "خاویۃ" سے مراد خالی اور کھوکھلے۔ چونکہ قوم عاد کے لوگ بڑے لمبے قد کے ہوا کرتے تھے اس لیئے ان کو کھجور کے اونچے اونچے تنوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔

علامہ ابوالعباس القرطبیؒ نے اس کی تصریح کی ہے کہ یہ سورۂ مبارکہ بھی مکی ہے۔ اس سے قبل سورۂ "نون" میں کفار مکہ کو عذاب الٰہی سے ڈرانے کا ذکر تھا اور یمن کے باغ والوں کی بدنیتی کی سزا کو بیان کیا گیا تھا مگر مکہ کے مشرک و کافر پھر بھی اپنی سرکشی سے باز نہ آئے اس لیئے اس سورۂ مبارکہ میں قیامت کے ہولناک مناظر کا ذکر کیا گیا ہے اور ضمنی طور پر کچھ چھوٹے "حاقوں" یعنی وقتی عذابوں اور سزاؤں کا بھی تذکرہ کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی یاد کافروں کے دلوں میں تازہ ہوتی رہے اور وہ آسانی سے سمجھ سکیں کہ جب یہ دنیاوی عذاب اس قدر سخت ہیں تو قیامت کا دن کتنا شدید ہوگا۔ ان آیات میں دو مشہور قوموں کا ذکر آیا ہے۔ قوم عاد و ثمود۔ عاد کی طرف حضرت ھودؑ علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے اور ثمود کے لیئے حضرت صالح علیہ السلام۔

حضرت ھودؑ حضرت نوحؑ کی آٹھویں پشت میں تھے۔ آپ نے قوم عاد کی ہدایت کی بڑی کوشش کی مگر اس کی سرکشی کم نہ ہوئی۔ یہ قوم مغربی یمن میں خطۂ عمان اور حضرموت کے درمیانی صحرا جو "ربع خالی" کے نام سے مشہور ہے وہاں رہتی تھی اور اس وسیع ریگستان کے اطراف میں آباد تھی۔ جہاں ان لوگوں کی آبادی تھی اس رقبہ کو "بلاد احقاف" کہا جاتا تھا۔ اس کی سرکشی کی وجہ سے ان پر آٹھ دن اور سات راتوں تک لگاتار شدید طوفانی ہوا چلتی رہی جسکے سامنے عمارتوں، درختوں، انسانوں اور جانوروں کی حقیقت تنکوں سے زیادہ نہ تھی۔

آخر ذرا دیر میں ساری آبادی کھنڈر بن گئی اور زندگی کا نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ دوسرا واقعہ قوم ثمود کا بیان ہوا ہے۔ اس قوم کی ہدایت کے لیے حضرت صالح علیہ السلام آئے تھے۔ آپ حضرت نوحؑ کی نویں پشت میں تھے۔ قوم ثمود نے اپنے نبی حضرت صالحؑ کی اونٹنی کے پیر کاٹ کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے اور آپ کو بھی قتل کرنے کی بھرپور کوشش کی اور آپ کی توہین اور جھٹلانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اس لیئے عذاب آیا اور ایک رات کو سخت چنگھاڑ کی آواز سنائی دی کہ سب کے کان پھٹ گئے پھر بے حد شدید زلزلہ آیا جسکی وجہ سے ساری قوم کے دل اور جگر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے پھر آسمان سے آگ کے شعلے ظاہر ہوئے اور سب جل کر راکھ ہو گئے۔ قوم ثمود مدینہ اور شام کے درمیان "وادی قریٰ" کے نزدیک ایک پہاڑی خطہ میں آباد تھی جو ریگستان سے گھرا ہوا تھا۔ یہ لوگ پہاڑوں کو کاٹ کر ان ہی کے اندر خوبصورت گھر بنا کر رہتے تھے اور پتھر تراشنے کے فن میں بڑی مہارت اور شہرت رکھتے تھے ان کی بستی کا نام حجر تھا ان واقعات کو ذکر کرنے کی غرض یہی ہے کہ لوگ ان سے عبرت حاصل کریں اور خدا کا گناہ کرنے سے ڈریں۔

قوم عاد اور حضرت ھود علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں دوسری جگہوں پر بھی آیا ہے۔

چنانچہ سورۂ قمر میں ارشاد ہوا ہے "اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ" یعنی ہم نے قوم عاد پر ایک سخت آندھی کو بھیجا ایک دائمی شدید منحوس دن میں۔ اور سورۂ حم السجدہ میں اس طرح فرمایا گیا ہے "فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ" ہم نے ان پر منحوس دنوں میں ایک طوفانی ہوا کو بھیجا۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ان آیات کے الفاظ سے یہ سمجھنا کہ بعض دنوں کو خدا نے منحوس ہی پیدا کیا ہے قطعاً غلط ہے۔ یہاں منحوس دنوں سے مراد صرف اس قوم کے لیئے مصیبت اور عذاب کے دن ہیں نہ کہ ساری دنیا کے لیئے اور جس جگہ "ایام" کے بجائے "یوم" یعنی ایک روز کہا گیا ہے وہاں مراد وقت اور زمانہ ہے۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ سورۂ الحاقہ میں جس کی تفسیر کی جا رہی ہے اس کا صاف طریقہ پر ذکر ہے کہ یہ عذاب آٹھ دن اور سات راتوں تک

رگاتار جاری رہا اور اکثر صحیح روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس عذاب کی ابتدا بدھ کے دن سے ہوئی تھی اور یہ دوسرے بدھ تک باقی رہا تھا تو اگر اسے دنوں کی ذاتی اور پیدائشی نحوست کی دلیل سمجھا جائے تو پھر ہفتہ بھر کے سارے ہی دن منحوس ہو جائیں گے حالانکہ یہ بات بالکل غلط ہے۔

حدیثوں اور روایتوں میں جہاں کہیں دنوں کی نحوست کا ذکر ہے وہاں بھی ان کی خلقی اور ذاتی نحوست مراد نہیں ہے۔ صرف اس حد تک کہا جا سکتا ہے کہ انسان سے بعض افعال اور کام کچھ دنوں اور وقتوں کے ساتھ زیادہ مناسبت اور موزونیت نہیں رکھتے۔ اسے نحوست کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ ایک عارضی امر ہے جس کا تعلق دنوں کی اصلی خلقت سے نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے بندوں کے واسطے ہر دن عمل کے لئے بنایا ہے اور نہ اسلام کی یہ تعلیم ہو سکتی ہے کہ دنوں کی نحوست بتا کر انسان کے جذبۂ سعی و عمل کو نقصان پہنچایا جائے۔ علامہ باقر مجلسیؒ نے بحار الانوار کی انیسویں[۱۹] جلد کے دوسرے حصہ کے صفحہ ۱۸۴ پر اس سلسلہ میں سہل بن یعقوب سے ایک روایت بھی نقل کی ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت امام حسن عسکریؑ سے عرض کی کہ دنوں کی نحوست کا اگر ہم خیال کریں تو پھر دنیا کے سارے کام کیسے چلیں گے تو امام عالی مقام نے فرمایا کہ "ثِقْ بِاللّٰہِ" اللہ پر پورا بھروسا رکھو اور اپنے ایمان میں کمزوری نہ آنے دو، "وَتَوَجَّہْ حَیْثُ شِئْتَ وَاقْصُدْ مَا شِئْتَ" اور پھر جس کام کا تم نے ارادہ کیا ہے اسے خدا کا نام لیکر پختہ یقین اور ایمانداری سے کرو۔ تم کو کبھی کوئی ضرر نہیں پہنچ سکتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مومن کو خدا پر پورا توکل اور اپنے ایمان کو درست رکھنا چاہیئے اور ہر کام میں خدا کی خوشنودی کا خیال رکھنا چاہیئے۔ اللہ نے کوئی دن بھی منحوس نہیں بنایا ہے۔ البتہ جہاں تک فضیلت کا تعلق ہے، بعض وقتوں اور دنوں کو بعض پر ضرور فضیلت دی گئی ہے جیسے جمعہ یا ماہ رمضان کے دن یا بعض مبارک راتیں جن کا حدیثوں میں تفصیل سے بیان ہے۔

(ورہیں ۱۲)

وَجَاۗءَ فِرْعَوْنُ وَمَنْ قَبْلَهٗ وَالْمُؤْتَفِكٰتُ بِالْخَاطِئَةِ ۝ فَعَصَوْا رَسُوْلَ رَبِّهِمْ فَاَخَذَهُمْ اَخْذَةً رَّابِيَةً ۝ اِنَّا لَمَّا طَغَا الْمَاۗءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝ لِنَجْعَلَهَا لَكُمْ تَذْكِرَةً

وَّتَعِيَهَآ اُذُنٌ وَّاعِيَةٌ ○ فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ ○
وَّحُمِلَتِ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ فَدُكَّتَا دَكَّةً وَّاحِدَةً ○ فَيَوْمَئِذٍ
وَّقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ○ وَانْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَهِیَ يَوْمَئِذٍ وَّاهِيَةٌ ○
وَّالْمَلَكُ عَلٰٓی اَرْجَآئِهَا ؕ وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ
ثَمٰنِيَةٌ ؕ ○ يَوْمَئِذٍ تُعْرَضُوْنَ لَا تَخْفٰی مِنْكُمْ خَافِيَةٌ ○

(پارہ ۲۹ رکوع ۵ کی درمیانی آیات - سورۃ الحاقہ)

اور فرعون اور جو لوگ اس سے پہلے تھے اور الٹی ہوئی بستیاں (یعنی ان کے رہنے والے) سب گناہ کے کام کرتے تھے۔ تو ان لوگوں نے اپنے پروردگار کے رسول کی نافرمانی کی تو خدا نے اُن کو سخت گرفت میں لے لیا۔ جب پانی اُبلا تو ہم نے تم کو اُس وقت کشتی میں سوار کیا تاکہ ہم اسے تمہارے لیئے یادگار بنائیں اور یاد رکھنے والا کان اس کو یاد رکھے۔ پھر جب صور میں ایک بار پھونک ماری جائے گی اور زمین اور پہاڑ اٹھائے جائیں گے اور ایک ہی چوٹ میں دونوں ریزہ ریزہ کر دیئے جائیں گے تو اس وقت وہ ہونے والی چیز ہو پڑے گی اور آسمان پھٹ جائے گا۔ اور وہ اس روز بالکل بودا ہوگا اور فرشتے اس کے کناروں پر ہوں گے اور تمہارے پروردگار کا عرش اس دن آٹھ فرشتے اپنے اوپر اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اُس دن تم سب سامنے پیش کیئے جاؤ گے۔ تمہارا کوئی بھید پوشیدہ نہ رہے گا۔

تشریح و تفسیر:۔ "المؤتفکات" اَفْكٌ سے مشتق ہے۔ اس کے معنی ہیں کسی چیز کو اپنے صحیح مقام یا رُخ سے پھیر دینا یا پلٹ دینا۔

یہاں مراد وہ پانچ بستیاں ہیں جن میں حضرت لوط علیہ السلام کی قوم آباد تھی اور ان کے گناہوں کی وجہ سے ان بستیوں پر عذاب آیا تھا اور وہ سب کی سب الٹ دی گئی تھیں۔ ان میں سے جو بستی سب سے بڑی تھی اس کا نام "سدوم" تھا "الخاطئہ" یا تو بطور صفت کے ہے یعنی خطا اور گناہ کے کام یا یہ مصدر ہے یعنی خطا کرنا اور گناہ کرنا "رَابِيَةً" رباءٌ اور رُبُوٌّ سے مشتق ہے اس کے معنی زیادہ ہونے کے ہیں۔ یہاں پر رابیۃ سے مراد زیادہ شدید اور زیادہ سخت اور ہولناک کے ہیں۔
"جاریۃ" سے مراد کشتی ہے "حملنا کم" یعنی ہم نے تم کو کشتی پر سوار کیا۔ اس جگہ

خطاب اُن لوگوں سے ہے جو حضرت نوحؑ کے زمانہ میں نہ تھے اس لیئے یا تو مراد یہ ہے کہ تمہارے بزرگوں اور آباؤاجداد کو کشتی پر سوار کیا گیا یا یہ مراد ہے کہ جب انھیں سوار کیا تو گویا تم کو بھی سوار کیا اس لیئے کہ تم اُن کے صلب میں تھے "تذکرہ" سے مراد نصیحت اور عبرت ہے "اُذُنٌ" کے لفظی معنی کان کے ہیں "وَعیٰ" سن کر یاد رکھنا۔ مراد وہ لوگ ہیں جو کسی بات کو غور سے سن کر اسے خوب یاد رکھیں۔ اس جملہ کی تفسیر میں سعید ابن منصور ابن جریر طبری، ابن منذر، ابن ابی حاتم، ابن مردویہ، ابن عساکر، ابولغیم، واحدی، ابن کثیر اور دوسرے ائمہ حدیث وتفسیر نے فقیہ شام مکحول اور حضرت بریدہ اسلمیؓ اور حضرت عکرمہؓ کی روایتوں کا ذکر کیا ہے جن کا حاصل یہ ہے کہ "اُذُنٌ وَّاعِیَۃٌ" سے مراد حضرت علیؑ کی ذات گرامی ہے۔ لیکن بہر صورت اس جملہ کا مفہوم اور اس کی مراد عام ہے قرآن کریم میں بیشتر مقامات پر خطاب کسی خاص شخص یا کسی خاص محل اور موقع کے لیئے ہوتا ہے مگر اس سے مراد عام ہوتی ہے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے جیسے بعض جگہ پر خطاب خود آنحضرتؐ سے ہے مگر اس کا مفہوم اور مطلب تمام مسلمانوں کے لیئے عام ہے۔

"صُوْرٌ" اصل میں جانور کے سینگ کو کہتے ہیں جو اندر سے خالی کر کے آواز کو دور تک پھیلانے کے لیئے کام میں لایا جاتا ہے۔ یہاں مراد کوئی خاص قدرتی چیز ہے جسے آواز دینے کے لیئے قیامت میں حضرت اسرافیل علیہ السلام استعمال کریں گے "دَکٌّ" کے معنی توڑنا، کوٹنا اور ریزہ ریزہ کر دینا۔ "اَلْوَاقِعَۃُ" قرآن پاک میں اس مادہ سے جس قدر لفظیں آئی ہیں وہ زیادہ تر عذاب اور اسی قسم کی باتوں کے لیئے ہیں جیسے سَاَلَ سَآئِلٌ م بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ (۷۰-۱) یا اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَۃُ (۵۶-۱) یا وَوَقَعَ الْقَوْلُ عَلَیْھِمْ (۲۷-۸۵) زیر بحث آیت میں "الواقعۃ" سے مراد قیامت ہے "وَاھِیَۃٌ"، "وَھْیٌ" سے بنایا گیا ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کے بندھن اور گرہوں کا ڈھیلا پڑ جانا کہ اُس کا کوئی حصہ اور کوئی جزو اپنی جگہ پر تھم نہ سکے "وَّالْمَلَکُ عَلٰٓی اَرْجَآئِھَا" میں "مَلَکٌ" کا لفظ واحد اور جمع دونوں کے لیئے لایا جاتا ہے۔ یہاں پر اسم جنس کے طور پر بولا گیا ہے جس سے مراد فرشتوں کا گروہ ہے "مَلَکٌ" کا لفظ "اُلُوْکَۃٌ" سے بنا ہے جس کے معنی پیغام پہنچانے کے ہیں یہ اصل میں "مَاْلَکٌ" تھا پھر اس کو مَلْاَکٌ بولا جانے لگا اور بعد میں کثرت استعمال سے "مَلَکٌ" ہو گیا اسی وجہ سے اس

کی جمع یعنی "ملائکہ" میں ہمزہ پایا جاتا ہے۔ غرض ارشاد ہوتا ہے کہ عاد و ثمود کے بعد اور بہت سی قومیں آئیں جیسے حضرت شعیبؑ کی قوم، حضرت لوطؑ کی قوم اور فرعون والے جن پر طرح طرح کے عذاب نازل ہوتا رہا اور ان کی نافرمانیوں کی انہیں سزا ملتی رہی۔ ان واقعات کے سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے طوفان کا بھی ذکر ہے جو عاد و ثمود سے بہت پیشتر آیا تھا اور ارشاد ہو رہا ہے کہ اس عظیم طوفان میں صرف ایک کشتی بچالی گئی تھی جس پر حضرت نوحؑ اور آپ پر ایمان لانے والے سوار تھے۔ اس سے اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ مخلوقاتِ عالم میں کسی کی بھی مجال اور طاقت نہیں ہے کہ وہ اقتدارِ خداوندی کا مقابلہ کر سکے اور خدا کے قہر اور عذاب سے بچ سکے۔ صرف وہی لوگ بچ سکتے ہیں جنہیں وہ خود بچانا چاہے۔ یہ واقعات اس لیے بیان ہوئے ہیں کہ بصیرت رکھنے والے لوگ رہتی دنیا تک ان کو یاد رکھیں اور دنیا والوں کو ان کی یاد دلاتے رہیں تاکہ وہ گناہ سے بچیں اور خدا کی اطاعت کی طرف مائل ہوں۔ ان دنیاوی عذابوں کے ذکر کے بعد قیامت کے ہولناک مناظر کا بیان ہے۔ روایتوں اور تفسیروں میں زیادہ تر دو بار صور پھونکے جانے کا ذکر آیا ہے۔ پہلی بار جب صور پھونکا جائے گا تو سارا عالم تباہ اور برباد ہو جائے گا اور جب دوسری مرتبہ اُسے پھونکا جائے گا تو ہر چیز کو دوسری بار زندگی ملے گی اس کے بعد تمام لوگ بارگاہ خداوندی میں پیش ہوں گے اور انہیں جزا یا سزا کا آخری حکم ملے گا اور تمام اعمال سامنے لائے جائیں گے اور کسی کا کوئی عمل اور کوئی کام پوشیدہ نہ رہ سکے گا۔ ان آیات میں "نَفْخَةٌ وَّاحِدَةٌ" سے مراد عطاءؒ کے نزدیک پہلی بار کا صور پھونکنا ہے اور کلبیؒ اور مقاتلؒ کے نزدیک دوسری بار کا۔ "وَيَحْمِلُ عَرْشَ رَبِّكَ فَوْقَهُمْ يَوْمَئِذٍ ثَمَانِيَةٌ" سے مراد یہ ہے کہ اس ہولناک دن میں عرش الٰہی کو آٹھ فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اس میں بعض لوگوں نے جن میں حضرت ابن عباسؓ بھی شامل ہیں فرشتوں کی آٹھ صفیں مراد لی ہیں جن کی تعداد کا علم خدا کو ہوگا۔ اس مقام پر "عرش" کی تفسیر میں بہت سے قول ہیں علامہ بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ خدا کی عظمت و جلالت اور شان کبریائی لوگوں کو سمجھانے کے لیے تخت وغیرہ کے الفاظ محض تمثیل کے طور پر بولے گئے ہیں۔ صاحب تفسیر

حقانی لکھتے ہیں کہ علامہ بیضاوی کی یہ تشریح فہم سے زیادہ قریب ہے اس لیئے کہ انسان اس مادّی عالم میں کسی معنی کو صورت اور شکل سے الگ کر کے بہت ہی مشکل سے سمجھ سکتا ہے اس بنا پر اس کو سمجھانے کے لیئے ایسی مثالیں اور تشبیہیں دی جاتی ہیں جن سے وہ آسانی کے ساتھ اُن گہری باتوں کو سمجھ سکے اور اُن کا اندازہ کر سکے ۔

فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ فَيَقُولُ هَاؤُمُ اقْرَءُوا كِتَابِيَهْ ۝ إِنِّي ظَنَنتُ أَنِّي مُلَاقٍ حِسَابِيَهْ ۝ فَهُوَ فِي عِيشَةٍ رَّاضِيَةٍ ۝ فِي جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ۝ قُطُوفُهَا دَانِيَةٌ ۝ كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا أَسْلَفْتُمْ فِي الْأَيَّامِ الْخَالِيَةِ ۝ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِشِمَالِهِ فَيَقُولُ يَا لَيْتَنِي لَمْ أُوتَ كِتَابِيَهْ ۝ وَلَمْ أَدْرِ مَا حِسَابِيَهْ ۝ يَا لَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ ۝ مَا أَغْنَىٰ عَنِّي مَالِيَهْ ۝ هَلَكَ عَنِّي سُلْطَانِيَهْ ۝ خُذُوهُ فَغُلُّوهُ ۝ ثُمَّ الْجَحِيمَ صَلُّوهُ ۝ ثُمَّ فِي سِلْسِلَةٍ ذَرْعُهَا سَبْعُونَ ذِرَاعًا فَاسْلُكُوهُ ۝ إِنَّهُ كَانَ لَا يُؤْمِنُ بِاللَّهِ الْعَظِيمِ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلَىٰ طَعَامِ الْمِسْكِينِ ۝ فَلَيْسَ لَهُ الْيَوْمَ هَاهُنَا حَمِيمٌ ۝ وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ ۝ لَّا يَأْكُلُهُ إِلَّا الْخَاطِئُونَ ۝

(درس ۱۷۷)

پارہ ۲۹ رکوع ۵ کی آخری آیات ۔ سورۃ الحاقّہ ۱

پھر جس شخص کا نامہ عمل اس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ لوگوں سے کہے گا کہ لو میرا نامہ عمل پڑھ لو میں تو جانتا تھا کہ مجھے میرا حساب ضرور ملے گا غرض وہ دلپسند عیش میں ہوگا، بڑے عالیشان باغ میں، جس کے میوے جھکے ہوئے ہوں گے کھاؤ اور پیو مزہ کے ساتھ ان اعمال کے بدلے میں جو تم نے پچھلے دنوں میں کیئے ہیں ۔ اور جس کا نامہ عمل اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا تو وہ کہے گا، کہ کاش مجھے میرا نامہ عمل دیا ہی نہ جاتا اور مجھ کو خبر ہی نہ ہوتی کہ میرا حساب کیا ہے ۔ کیا اچھا ہوتا کہ موت میرا کام تمام کر چکتی ۔ میرا مال میرے کچھ کام نہ آیا ۔

میری حکومت مجھ سے جاتی رہی ۔۔ اسے گرفتار کر لو پھر اس کو طوق پہنا دو پھر اسے دوزخ میں ڈال دو پھر ایک زنجیر میں جس کی ناپ ستر گز کی ہے اسے خوب جکڑ دو۔ بے شک یہ تو نہ بزرگ خدا ہی پر ایمان رکھتا تھا اور نہ محتاج کے کھلانے پر رغبت دلاتا تھا تو آج اس کا یہاں نہ کوئی دوست ہے اور نہ اس کو کوئی کھانے کی چیز نصیب ہے سوائے زخموں کے دھوون کے جسے گنہگاروں کے سوا کوئی نہ کھائیگا۔

تشریح و تفسیر:۔ "هَاؤُمُ اقْرَءُوْا كِتَابِيَهْ" اس مقام پر پہلا لفظ "هَاؤُمُ" آیا ہے اس کی اصل "هَا" ہے جس کے معنی ہیں "لو" لیکن ابن زید اور مقاتل وغیرہ نے اس کے معنی یہ بتائے ہیں کہ "آؤ" جبکہ یہ ایسے موقع پر بولا جائے جہاں کسی کو کسی چیز یا کسی بات کی طرف دعوت دینا اور بلانا مقصود ہو۔ یہ اسم فعل ہے اور مخاطب کی جنس اور تعداد کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔ مثلاً ایک مرد کے لیئے "هَاءَ" اور ایک عورت کے لیئے "هَاءِ" دو مردوں یا دو عورتوں کے لیے "هَاؤُمَا" اسی طرح بہت سے مردوں کے لیئے "هَاؤُمُ" اور بہت سی عورتوں کے لیئے "هَاؤُنَّ" یہاں پر صیغہ جمع ہے اور مراد یہ ہے کہ جس کے داہنے ہاتھ میں اُس کا نامہ عمل دیا جائیگا وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کو اسے دکھائے گا اور کہے گا کہ اسے پڑھو کیونکہ اُس میں صرف اطاعت کے کاموں کا ذکر ہوگا اور گناہوں کا تذکرہ نہ ہوگا تو وہ خوشی کے مارے اس کو دوسروں کو دکھائے گا۔ "كِتَابِيَهْ" کے معنی ہیں۔ میری کتاب اور میرا نامۂ عمل اس لفظ اور دوسری لفظوں میں "ہ" کو آیتوں کے باہمی نظم کے مطابق اور ہم آہنگ کرنے کے لیئے لایا گیا ہے۔ اس کو "ہاء سکت" کہتے ہیں جسے یہاں پر اس قسم کی لفظوں میں عام علماء نے حالت وقف اور وصل دونوں میں باقی رکھا ہے۔ "عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ" سے آرام و راحت کی زندگی مراد ہے "قُطُوْفُ" "قِطْفٌ" کی جمع ہے جس کے معنی توڑے ہوئے پھل کے آتے ہیں "دَانِيَةٌ" نزدیک اور بہت قریب جسے کوئی ہاتھ بڑھا کر حاصل کر لے۔ "هَنِيْٓـًٔا" "هَنْءٌ" سے مشتق ہے۔ یہ اس چیز کے لیئے کہا جاتا ہے جو لپسند کے مطابق ہو، جس سے لذت ملے اور خوشی حاصل ہو "اَلْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ" گذرے ہوئے دن "يمين" داہنا "شمال" بایاں "غُلٌّ" طوق کو کہتے ہیں اسی سے "غُلُّوْهُ" بنا ہے یعنی اس کو طوق پہنا دو "صَلُّوْهُ" کی اصل

"صُلِّیٌّ" ہے اس کے معنی ہیں آگ میں جلانا "جحیم" کے معنی بہت بڑی آگ یعنی دوزخ "ذَرْعٌ" سے مراد لمبائی اور پیمائش ہے "ذِرَاعٌ" اصل میں کہنی سے لے کر ہاتھ کی درمیانی انگلی کے آخر تک کے لیئے بولا جاتا ہے۔ اس جگہ اس کے معنی گز کے ہیں اس لفظ کی تفسیر میں بعض علماء نے لکھا ہے کہ ستّر گز کہنے سے تعداد مقصود نہیں ہے بلکہ لمبائی کی زیادتی مراد ہے۔ قرآن کریم میں اور کلام عرب میں "سَتّر" کا لفظ اکثر ایسے ہی موقع پر بولا گیا ہے جہاں زیادتی اور کثرت ظاہر کرنا ہوتی ہے۔ اور اگر اس سے تعداد ہی مراد ہے تو اس "ذراع" کی لمبائی خدا کو معلوم ہے "حَضٌّ" ابھارنا اور ترغیب دینا۔ "طَعَامٌ" کے معنی کھانے کی چیز مگر یہاں کھلانا مراد ہے "حمیم" کے لفظ کی تشریح میں علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ اس کے معنی سخت گرم پانی کے ہیں پھر مجازاً قریبی رشتہ دار اور دوست کو بھی "حمیم" کہا جاتا ہے اس لیئے کہ وہ اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کی حمایت میں سرگرم رہتا ہے، یہاں پر یہی مراد ہے۔ "غِسْلِیْن" سے مراد، دوزخ والوں کے زخموں کا غسالہ یعنی دھوون ہے، یا خون ملی ہوئی پیپ۔ ان آیات میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جن نیک اعمال لوگوں کو قیامت کے روز ان کے نامۂ عمل اُن کے داہنے ہاتھ میں دیئے جائیں گے وہ اُنہیں دیکھ کر بہت خوش ہوں گے اور اسی خوشی میں ہر ایک کو اپنے نامۂ عمل دکھائیں گے اور یہ خوشی اس لیئے زیادہ ہوگی کہ وہ دیکھیں گے کہ جو معمولی لغزشیں دنیا میں اُن سے ہوگئی تھیں وہ بھی ان کی ندامت اور توبہ کی وجہ سے نیکیوں سے بدل دی گئیں اور انھیں ان کے نامۂ اعمال سے مٹا دیا گیا اس لیئے ان کی مسرت اور خوشی کی کوئی حد نہ رہے گی۔ پھر فرماتا ہے کہ ایسے نیک لوگ اپنی نیکیوں کا یہ عوض پائیں گے کہ انہیں آرام کی زندگی ملے گی اور عیش و راحت کے ساتھ فردوس بریں میں جگہ دی جائے گی۔ اُن کو وہ نعمتیں عطا کی جائیں گی جو نہ کبھی ختم ہوں گی اور نہ کبھی اُن میں کمی اور نقص پیدا ہونے کا امکان ہوگا۔ اس کے بعد پھر ان لوگوں کا حال بیان کیا گیا ہے جن کے نامۂ عمل اُن کے بائیں ہاتھ میں دیئے جائیں گے۔ یہ گناہگار لوگ ہوں گے۔ جب یہ اپنے نامۂ عمل کو دیکھیں گے تو حسرت و افسوس سے کہیں گے کہ کاش ہمیں ہمارا نامہ نہ ملتا اور کاش ہم اس سزا سے واقف نہ ہوتے اور جو موت ایک مرتبہ ہمیں آچکی تھی وہی ہمارا کام ہمیشہ کے لیئے ختم کر دیتی اور دوبارہ ہمیں

زندہ نہ کیا جاتا۔ یہ لوگ اس شدید مصیبت اور ہولناک منظر کو دیکھ کر اُس موت کی تمنا کرنے لگیں گے جس کے نام سے دنیا کی زندگی میں کانپ اٹھا کرتے تھے اور پھر اُس وقت بڑی مایوسی کے ساتھ کہیں گے کہ افسوس آج ہر چیز نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ نہ ہمارا مال کام آیا نہ حکومت نے ساتھ دیا نہ جاہ و جلال نے نفع بخشا اور نہ رشتہ دار اور حمایتی مدد کر سکے اب تنہا ہم ہیں اور ہمارے وہ اعمال جو دنیا میں ہم نے کئے تھے۔ اُس وقت ان سیاہ کار لوگوں کے لئے سزا کا حکم ہوگا کہ انہیں زنجیروں میں جکڑ کر جہنم میں ڈال دیا جائے اور آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ سزا اس کی ہوگی کہ یہ بدنصیب اور بدکار لوگ خدائے عظیم پر ایمان نہ رکھتے تھے اور نہ محتاجوں کو کھلانے کی دوسروں کو ترغیب دلاتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اُن غریبوں کو خود کیا کھلاتے جبکہ وہ دوسروں کو بھی ان کی خدمت کرنے اور انہیں کھانا دینے کی طرف رغبت دلانے سے بچتے تھے۔ غرض نہ تو وہ خدا کی اطاعت اور عبادت کرتے تھے اور نہ مخلوق خدا کے حق ادا کر کے اسے فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ خدا کا حق تو اُس کی مخلوق پر یہ ہے کہ یہ اس کی عبادت اور اطاعت کرے اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائے اور بندوں کا آپس میں ایک دوسرے پر یہ حق ہے کہ وہ ایک دوسرے کی مدد کریں حقوق کا پاس و لحاظ کریں اور نیک برتاؤ اور اچھے سلوک کریں۔ ان ہی دونوں کی تفصیل کا مجموعہ شریعت کہلاتا ہے اور دین کے سارے احکام ان ہی دونوں باتوں سے تعلق رکھتے ہیں اسی بنا پر ان دونوں حقوق کو عموماً ہر جگہ ایک ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

(درس ۱۷۸)

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَا تُبْصِرُوْنَ ۝ وَمَا لَا تُبْصِرُوْنَ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ؕ قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ۝ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۝ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۝ ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۝ فَمَا مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَتَذْكِرَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

وَإِنَّا لَنَعْلَمُ أَنَّ مِنْكُمْ مُّكَذِّبِيْنَ ○ وَإِنَّهُ لَحَسْرَةٌ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ○ وَإِنَّهُ لَحَقُّ الْيَقِيْنِ ○ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ○

(پارہ ۲۹ رکوع ۶ - سورۃ الحاقہ)

پس میں قسم کھاتا ہوں ان چیزوں کی جنہیں تم دیکھتے ہو اور ان چیزوں کی جن کو تم نہیں دیکھتے۔ یہ (قرآن) ایک معزز رسول کا لایا ہوا کلام ہے اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے تم بہت کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ یہ کسی کاہن کا قول ہے۔ تم بہت کم غور کرتے ہو۔ سارے جہان کے پروردگار کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔ اگر رسول ہماری نسبت کوئی جھوٹ بات بنا لاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے پھر ہم اُن کی رگِ دل کاٹ دیتے پھر کوئی تم میں اُن کو اس سزا سے بچانے والا بھی نہ ہوتا۔ یہ تو پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے اور ہم خوب جانتے ہیں کہ تم میں سے کچھ لوگ جھٹلانے والے ہیں اور اس میں شک نہیں کہ یہ (قرآن) کافروں کے حق میں حسرت کا باعث ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہ برحق ہے۔ پس تم اپنے پروردگار کی تسبیح کرو۔

تشریح و تفسیر "فَلَآ اُقْسِمُ" کے معنی اس جگہ یہ ہیں کہ "میں قسم کھاتا ہوں" اس میں "لا" کا لفظ جس کے معنی انکار اور نفی کے ہیں یہاں زیادہ ہے اور حرف قسم کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ یہی طریقۂ قسم زیادہ فصیح سمجھا جاتا ہے جیسے ہم اس طرح کہا کرتے ہیں کہ "لا واللہ" میں فلاں کام ضرور کروں گا۔ اس میں "لا" کے معنی نفی کے نہیں ہوتے بلکہ اس سے قسم کی تاکید اور شدت مراد ہوتی ہے اسی طرح یہاں بھی ہے اس جگہ پر مفسروں کے اور بھی قول ہیں "کاھن" "کھانۃ" سے مشتق ہے کہانت اور سحر دونوں کی قریب قریب ایک ہی بنیاد ہے یعنی ان دونوں باتوں میں شیاطین اور خبیث روحوں سے ربط قائم کیا جاتا ہے اور ان سے اپنے مطلب کو حاصل کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ مگر زیادہ تر سحر کی غرض یہ ہوا کرتی ہے کہ کسی کے بدن یا اس کی روح اور عقل پر برا اثر ڈالا جائے اور کہانت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ غیب کی خبریں معلوم کی جائیں اور دونوں باتیں اسلامی تعلیم کے خلاف اور قطعی طور پر حرام ہیں۔ "تقوّل" افترا کرنا کسی پر جھوٹ بات لگانا۔ "اقاویل" "اقوال"

کی جمع ہے جو خود "قول" کی جمع ہے "وَتِین" حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک
اس سے مراد دل کی رگ ہے جس کے کٹنے سے انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور بعض نے
اس سے مراد گردن کی شہ رگ لی ہے۔ اب تک دنیا اور آخرت کے عذابوں کا ذکر تھا
اور قیامت کے ہولناک منظر کا بیان تھا اور پھر نیک اور بد لوگوں کی جزا اور سزا کا مفصّل
تذکرہ کیا گیا تھا۔ اس پوری تفصیل سے دو خاص اور بنیادی باتوں کی اہمیت بتائی گئی
ایک توحید باری تعالیٰ اور دوسرے معاد کا عقیدہ، توحید یعنی خدا کا ایک ہونا
تو اس طرح صاف ہو گیا کہ اگر خدائی میں اس کا کوئی شریک ہوتا تو گذشتہ قوموں
عاد و ثمود وغیرہ پر اس کا بھیجا ہوا عذاب روک دیتا لیکن ایسا نہ ہو سکا بلکہ جب کبھی
کسی قوم پر اس کی نافرمانی کی وجہ سے عذاب بھیجا گیا تو کوئی طاقت اس کو نہ روک
سکی اور نہ ان قوموں کی مدد کر سکی اور آخر وہ دنیا سے فنا ہو گئیں۔ یہ بات خدا کے
وحدہٗ لاشریک ہونے پر کھلی ہوئی دلیل ہے جسے دنیا والوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا
ان واقعات کو ذکر کرنے کے بعد روز قیامت کے حالات سے لوگوں کو باخبر کیا گیا تاکہ
انہیں یہ معلوم ہو سکے کہ وہ اس دنیا میں بلا مقصد اور بیکار نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ ان کی
زندگی با مقصد ہے اور ایک الٰہی قانون کے تحت رہ کر انہیں اپنی زندگی کے دن گذارنا
ہیں اور خدا کے سامنے ان کو اپنے ہر عمل کا جواب دہ ہونا پڑے گا۔

اس کے ساتھ ہی ان دونوں بنیادی باتوں یعنی توحید اور معاد پر پورا یقین حاصل
کرنے کے لئے اس کی ضرورت تھی کہ نبوت اور رسالت کے مرتبہ کی اہمیت بھی بتا دی جائے
اس لئے اب ارشاد ہوتا ہے کہ میں ان تمام چیزوں کی قسم کھاتا ہوں جنہیں تم دیکھتے ہو
اور ان کی بھی جنہیں تم نہیں دیکھتے کہ یہ قرآن باعزت رسول کا لایا ہوا الٰہی پیغام ہے
یہاں اکثر مفسرین کے نزدیک "رسول" سے مراد سرورِ دو عالم ہی کی ذات اقدس
ہے کیونکہ کفار آپ ہی کی شان میں شاعر و کاہن وغیرہ کے گستاخانہ کلمات کہا کرتے
تھے جس کی طرف ان آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے۔ "وما ھو بقولِ شاعر" یہ خدا کا
مقدس کلام ہے جو ہدایت و ارشاد سے بھرا ہوا ہے یہ کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ اس لئے
کہ شاعر کا کلام یعنی شعر وزن اور بحر وغیرہ کا پابند ہوتا ہے اور اس میں اکثر ایسی تخئیل
ہوتی ہے جس کا حقیقت میں کہیں وجود نہیں ہوتا اور زیادہ تر اس میں صرف وہمی اور خیالی

باتوں ہی کا اظہار کیا جاتا ہے جن کا حقائق و معارف سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اس کے برعکس قرآن کریم تمام تر یقینی باتوں اور ثابت حقیقتوں سے بھرا ہوا ہے اور نہ یہ وزن کا پابند ہے اور نہ قافیہ کا پھر اس کے باوجود جو تاثیر دلوں پر نظم کرتی ہے اس سے بہت زیادہ اس نثر میں پائی جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم میں جس قسم کے شعر اور جن شعرا کی مذمت کی گئی ہے وہ وہی ہیں جو محض فرضی تخیل اور گمراہ کرنے والے مضامین کے پابند ہوں اور ان کا دیانت، حقیقت، سچائی اور اچھے کردار کی تخلیق سے کوئی تعلق نہ ہو لیکن اگر اشعار میں اصول و دیانت کا پورا لحاظ ہو، اُن کے اندر معارف و حقائق موجود ہوں اور انسانی ذہن اور کردار کی تعمیر کا پہلو پوری طرح محفوظ ہو تو پھر یقیناً ایسے اشعار اسلام اور قرآن کریم کی نظر میں ہر طرح قابل تعریف ہوں گے۔ سورۂ شعرا میں عام شعرا کے ذکر میں اس پہلو کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ اور ایسے تعمیری اشعار اور حقیقت و دیانت پسند شعرا کو عام حکم سے مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ایسے ہی اشعار ہیں جنہوں نے حق کی تبلیغ و حفاظت میں تلواروں سے زیادہ کام کیا ہے اور جنکی تعریف حضرت نبیؐ مدنی کی زبان مبارک پر آئی ہے اور آپ نے انہیں حکمت کا لقب عطا فرمایا ہے اور اہلبیتؑ اطہار اور اصحابِ رضؓ کرام کے اقوال میں ایسے اشعار اور شعرا کی مدح و ثنا موجود ہے۔

ان آیات کریمہ میں اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ یہ قرآن کسی کاہن کا کلام بھی نہیں ہے۔ کاہن لوگ اکثر قافیہ اور سجع کے ساتھ کلام کیا کرتے تھے اور لوگوں کو گمراہ کرتے تھے اور کہتے تھے ہم غیب کی باتوں کے جاننے والے ہیں اس لئے انہیں بتایا گیا کہ یہ کسی کاہن کا کلام نہیں ہے کیونکہ کاہنوں کو وہ حکمت و عقل کی باتیں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں جو اللہ کے کلام میں موجود ہیں "تنزیلٌ مّن رّبّ العٰلمین" یہ تو ربّ العالمین کا اتارا ہوا کلام ہے اور جس طرح یہ نازل کیا گیا ہے اسی طرح رسولؐ اکرم نے اسے دنیا والوں تک پہنچا دیا۔ آخر میں اپنی تسبیح و تقدیس کرنے کے حکم پر اس سورۂ مبارکہ کو ختم فرمایا گیا ہے "فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ" تو پھر تم اپنے عظیم پروردگار کی تسبیح کرو جس نے یہ قرآن اپنے بندوں کی ہدایت اور بہتری کے لیئے نازل فرمایا ہے۔

سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۝ لِّلْكٰفِرِيْنَ لَيْسَ لَهٗ
دَافِعٌ ۝ مِّنَ اللّٰهِ ذِى الْمَعَارِجِ ۝ تَعْرُجُ الْمَلٰٓئِكَةُ
وَالرُّوْحُ اِلَيْهِ فِىْ يَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِيْنَ
اَلْفَ سَنَةٍ ۝ فَاصْبِرْ صَبْرًا جَمِيْلًا ۝ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ
بَعِيْدًا ۝ وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا ۝ يَوْمَ تَكُوْنُ السَّمَآءُ
كَالْمُهْلِ ۝ وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ ۝ وَلَا يَسْـَٔلُ
حَمِيْمٌ حَمِيْمًا ۝ يُّبَصَّرُوْنَهُمْ ؕ يَوَدُّ الْمُجْرِمُ لَوْ يَفْتَدِىْ
مِنْ عَذَابِ يَوْمِئِذٍۭ بِبَنِيْهِ ۝ وَصَاحِبَتِهٖ وَاَخِيْهِ ۝
وَفَصِيْلَتِهِ الَّتِىْ تُـْٔوِيْهِ ۝ وَمَنْ فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ
ثُمَّ يُنْجِيْهِ ۝ كَلَّا ؕ اِنَّهَا لَظٰى ۝ نَزَّاعَةً لِّلشَّوٰى ۝ تَدْعُوْا
مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى ۝ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ۝

(پارہ ۲۹ رکوع ۷ کی ابتدائی چند آیات ۔ سورۃ المعارج)

ایک طلب کرنے والے نے اس عذاب کی خواہش کی جو کافروں پر واقع ہونے
والا ہے جس کا کوئی ہٹانے والا نہیں جو اس خدا کی طرف سے ہوگا جو بلندیوں کا
مالک ہے جس کی طرف فرشتے اور روح سب کے سب چڑھتے ہیں اس دن میں
جس کا اندازہ پچاس ہزار سال کا ہے تو تم اچھی طرح صبر کرتے رہو۔ بیشک یہ لوگ اس
کو دور دیکھتے ہیں اور ہم اسے قریب دیکھتے ہیں جس دن آسمان تیل کی تلچھٹ کی طرح
ہو جائے گا اور پہاڑ مثل رنگین اون کے ہوں گے اور کوئی دوست کسی دوست کو
نہ پوچھے گا حالانکہ وہ ایک دوسرے کو دکھا بھی دیئے جائیں گے، مجرم تو اس بات
کی تمنا کرے گا کہ اس روز کے عذاب سے چھوٹنے کے لئے اپنے بیٹوں اور بیوی اور بھائی
اور کنبہ کو جس میں وہ رہتا تھا اور تمام اہل زمین کو اپنے فدیہ میں دیدے تاکہ اسے نجات
مل جائے۔ یہ ہرگز نہ ہوگا۔ وہ ایسی بھڑکتی ہوئی آگ ہے جو کھال ادھیڑ دے گی۔ وہ
ہر اس شخص کو پکارے گی جس نے (دین سے) پیٹھ پھیری اور منہ موڑا اور مال جمع کیا
اور اسے سینت کر رکھا۔

"تشریح و تفسیر" "سَأَلَ سَائِلٌ" جملہ اکثر مفسروں کے نزدیک "سؤال" سے بنا ہے۔ اس کے معنی طلب کرنے کے ہیں۔ اور کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ یہ "سیلان" سے بنایا گیا ہے جس کے معنی جاری ہونے اور بہنے کے ہیں۔ پھر جبکہ یہ "سؤال" سے بنا ہو تو اس جگہ "سائِلٌ" سے مراد کون ہے؟ اس میں مفسرین کے کئی قول ہیں لیکن علامہ ابن کثیرؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے اور علامہ فضل بن حسن طبرسیؒ نے مجاہد سے روایت کی ہے کہ اس "سائل" سے مراد نضر بن حارث ہے جو آں حضرتؐ کا بے انتہا دشمن تھا۔ یہی نضر جنگ بدر میں کفّار کی فوج کا علمدار تھا مگر مسلمانوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر قتل کر دیا گیا۔ یہ کہتا تھا کہ اگر یہ سب باتیں حق ہیں جو رسول اسلام بیان کرتے ہیں تو پھر وہ عذاب نازل ہو جائے جس کی وہ خبر دیتے ہیں۔ "المعارج" "عروج" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں بلند ہونا اور چڑھنا۔ "معارج" "مَعْرَج" کی جمع ہے جس سے مراد زینہ، درجہ اور سیڑھی ہوتی ہے۔ مگر یہاں پر حضرت ابن عباسؓ کی تفسیر کے مطابق "معارج" سے مراد بزرگیاں اور بلندیاں ہیں۔

"المھل" حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک اس سے مراد تیل کی تلچھٹ ہے اور بعض لوگوں نے اس کے معنی پگھلے ہوئے تانبے یا پیتل کے لئے ہیں "العِھن" سے مراد رنگا ہوا اون ہے اور بعض نے اس کے معنی دھنکے ہوئے اون کے بتائے ہیں۔

"فَصِيلَةِ" خاندان اور کنبہ۔ "کَلَّا" اسے علم نحو میں "حرف زجر" کہا جاتا ہے یعنی جھڑکنے کا حرف۔ یہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں کسی بات کرنے والے کو ڈانٹ کر کلام کرنے سے منع کر دیا جائے "لَظیٰ" آگ کے شعلہ کو کہتے ہیں جس میں دھواں نہ ہو اور بعض علماء نے کہا ہے کہ یہ دوزخ کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ "الشَّویٰ" سے مراد بدن کے وہ جوڑ بند اور عضو ہوا کرتے ہیں جن پر زخم لگنے سے فوراً موت واقع نہ ہوتی ہو۔ بعض لوگوں نے "شَویٰ" کو "شَوَاۃ" کی جمع بتایا ہے جس کے معنی سر کی اس اندرونی کھال کے ہیں جس کے اندر دماغ ہوا کرتا ہے اسکو "اُمُّ الراس" بھی کہتے ہیں۔

نضر بن حارث بن علقمہ بن کلدۃ اور دوسرے مشرکین نے سورۃ الحاقّہ کو سن کر اس کا مذاق اڑایا تھا اور اس کی آیتوں کو سن کر ہنسا کرتے تھے۔ اس پر یہ سورۂ معارج نازل ہوا [illegible] قیامت کے ہولناک منظر کا تفصیل کے ساتھ دوبارہ ذکر کیا گیا

ہے اور اس عذاب سے پھیر دیا گیا ہے جسے ٹال دینا کسی شخص کے بس میں نہ ہوگا
من اللہِ ذی المعارج" وہ عذاب اُس خدا کے حکم سے ہوگا جو بڑی عظمت اور بزرگی کا
کا مالک ہے۔ "تعرج الملائکۃُ والرّوحُ الیہ وہ خدائے عظیم جس کی طرف فرشتے اور روح سب
کے سب کے رب بلند ہوں گے اور چڑھیں گے۔ یہاں روح سے مراد حضرت جبرئیلؑ
ہیں جن کا الگ ذکر اُن کی خاص عزّت و شان کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں
"روح" کا لفظ اُن کے لئے اور جگہ بھی آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی لفظ "روح"
کی تفسیر میں اور بھی قول ہیں۔ یہاں "والیہ" میں جو ضمیر غائب ہے اُس سے غرض خود ذات
خداوندی نہیں ہے بلکہ وہ بلند ترین مقام مراد ہے جو خدا نے فرشتوں اور روح کے عروج
کے لیئے مقرر فرما دیا ہے۔ جیسے دوسری جگہ حضرت ابراہیمؑ کے ذکر میں فرمایا گیا ہے۔
"وقال انّی ذاھبٌ الٰی ربّی" (پارہ ۲۳ رکوع ۷ سورۃ الصّٰفّٰت) ابراہیمؑ نے کہا کہ میں
اپنے پروردگار کے پاس جاتا ہوں۔ اس سے بھی یہی مراد ہے کہ میں اس طرف جاتا
ہوں جدھر جانے کا خدا نے مجھے حکم دیا ہے۔ خود اللہ کی ذات مراد نہیں ہے اس لیئے
کہ وہ جہت، جگہ اور زمان و مکان کی حد بندیوں سے پاک ہے "یوم" سے مراد
قیامت کا دن ہے جو اصل میں بے حد طویل ہوگا اور جس کی لمبائی کے لیئے فرمایا گیا
ہے کہ اس کا اندازہ پچاس ہزار سال کے برابر ہوگا۔ مگر اہل ایمان اور نیک اعمال لوگوں
کے لیئے اس کو بے انتہا آسان بنا دیا جائیگا کہ وہ ایسا محسوس کریں گے جیسے وہ چند
لمحوں میں گذر گیا۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد اپنے نبیؐ کریم کو تکلیفوں اور مصیبتوں پر صبر
کرتے رہنے کا حکم ہوتا ہے۔ اور ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ سب لوگ تو اسی خیال خام
میں ہیں کہ وہ دن بہت دور ہے یا آنے والا ہی نہیں ہے مگر ہم خوب جانتے ہیں کہ وہ
ضرور آئے گا اور بہت نزدیک ہے۔ پھر اس ہولناک دن کی حالت بیان کی گئی ہے
کہ اس روز آسمان پگھلے ہوئے تانبے یا تیل کی تلچھٹ کی طرح ہو جائے گا اور پہاڑ
اس طرح ریزہ ریزہ ہو کر اڑیں گے جیسے دھنکا ہوا اون ہوتا ہے۔ غرض وہ دن اتنا
ہولناک ہوگا کہ کسی کو کسی کی خبر نہ رہے گی اور اس عذاب سے بچنے کے لیئے گنہگار لوگ
اس کی تمنا کریں گے کہ اپنی اولاد، گھر کے لوگوں، کنبہ والوں اور جو کچھ بھی ممکن ہو اس سب
کو اپنے گناہوں کے کفارہ میں دے کر اپنی جان بچا لیں مگر اس روز کوئی چیز بھی ان میں
سے انھیں نہ بچا سکے گی۔ بس وہ ہوں گے اور ان کے گناہوں اور نافرمانیوں کی سزا کیلیئے

دوزخ کی آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے ہوں گے۔

وہ آگ چن چن کر ان سرکشوں کو اپنی طرف "تَدْعُوا مَنْ اَدْبَرَ وَتَوَلّٰى وَجَمَعَ فَاَوْعٰى" بلائے گی جو دنیا کی زندگی میں حق کی طرف سے اپنا منہ موڑے رہے اور اس کے پیغام کو ٹھکرایا کئے۔ جنہوں نے مال و دولت کے ڈھیر جمع کئے اور کبھی اس کی پروانہ کی کہ اس مال و زر کے لیئے اللہ کا کیا حکم ہے اور اس میں کس کس حقدار کا حق ہے اور ان کی اس میں کیا کیا ذمہ داریاں ہیں۔

(درس ۱۸۰)

اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۝ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ۝ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ۝ اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ وَالَّذِيْنَ يُصَدِّقُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ مِّنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُّشْفِقُوْنَ ۝ اِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَاْمُوْنٍ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ فِيْ جَنّٰتٍ مُّكْرَمُوْنَ ۝

(پارہ ۲۹ رکوع ۷ کی آخری آیات۔ سورۃ المعارج)

بیشک انسان بڑا کم ہمت لالچی بنایا گیا ہے۔ جب اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو بے صبر ہے اور جب اسے کوئی بھلائی حاصل ہوتی ہے تو کنجوس ہو جاتا ہے مگر وہ نمازی لوگ جو ہمیشہ اپنی نماز کی پابندی کرتے ہیں اور جن کے مال میں مانگنے والے اور مانگنے سے بچنے والے کے لیئے ایک مقرر حصہ ہے اور جو انصاف کے دن پر یقین رکھتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کے عذاب سے ڈرتے ہیں بیشک اُن کے رب کا عذاب بے خوف ہونے کی چیز نہیں ہے۔ اور وہ لوگ جو اپنی پاک دامنی کی حفاظت کرنے والے ہیں

ہاں ان کی بیویوں اور کنیزوں کے بارے میں جنکے وہ مالک ہیں اُن پر کوئی الزام نہیں ہے پھر جس نے اس کے سوا کچھ اور چاہا تو ایسے ہی لوگ حد سے آگے بڑھنے والے ہیں اور وہ لوگ جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا لحاظ رکھتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر قائم رہتے ہیں اور جو اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنتوں میں عزت سے رہیں گے۔

"تشریح وتفسیر" "الانسان" اکثر مفسروں کے نزدیک اس جگہ انسان کے لفظ سے کافر نہیں بلکہ عام نوع بشر مراد ہے۔ "خُلِق" ماضی غائب مجہول کا صیغہ ہے، یہ "خلق" سے بنا ہے جو کئی معنوں میں بولا جاتا ہے۔ کسی چیز کو ایجاد کرنا یعنی بغیر مادہ، صورت اور مثال کے اس کو عدم سے وجود میں لانا۔ اس معنی کے لحاظ سے خدا کے سوا کسی دوسرے کو خالق نہیں کہا جاسکتا۔ قرآن کریم میں یہ لفظ اس مفہوم میں کثرت سے آیا ہے۔

اس کے دوسرے معنی ہیں شکل وصورت اور حالت کو بدل دینا جیسے حضرت عیسیٰؑ کے قول کو سورہ آل عمران میں بیان فرمایا گیا ہے "اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَهَیْئَةِ الطَّیْرِ" میں گندھی ہوئی مٹی سے پرندہ کی صورت کی ایک چیز خلق کروں گا اور اس پر کچھ دم کروں گا تو وہ خدا کے حکم سے پرندہ ہو جائے گا۔

یہاں مادہ پہلے سے موجود تھا اس لئے خلق، سے صرف صورت، کیفیت اور حالت کا بدل دینا مراد ہے۔ کبھی خلق کے معنی اندازہ کرنے کے بھی آتے ہیں۔ قرآن مجید میں بھی اس کی مثال موجود ہے چنانچہ "فَتَبَارَکَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ (المومنون) میں مفسروں نے اسی معنی کو مراد لیا ہے۔ کلام عرب میں بھی اس کی کثرت کے ساتھ مثالیں پائی جاتی ہیں زمانۂ جاہلیت کے ایک بڑے مشہور شاعر زہیر بن ابی سُلمیٰ کا شعر ہے۔

ولانت تفری ما خلقت وبعـ ض القوم یخلق ثم لا یفری" جو تم خلق کرتے ہو یعنی سوچتے ہو اور اندازہ کر لیتے ہو اسے کر گذرتے ہو اور کچھ لوگ تو صرف تجویزیں کیا کرتے ہیں مگر ان کو عمل میں نہیں لاتے۔ "خلق" کے یہ دونوں آخری معنی غیر خدا کے لیے بھی محل اور موقع کی مناسبت سے مراد لیے جاسکتے ہیں۔

اب جہاں تک انسان کی اصل خلقت کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ اس کا خالق صرف

خدا ہے جو اسے عدم سے وجود میں لایا، اسے بہترین صلاحیتیں عطا کیں اور جس نے اس کی فطرت کو ہر عیب اور برائی سے پاک رکھا۔ انسان تو اشرف مخلوقات ہے خدا نے تو کائنات کی ہر چیز کو بے عیب ہی پیدا کیا ہے اس کا ارشاد ہے "اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ (سورۂ سجدہ) اس نے تو جو چیز بھی بنائی اسے ہر طرح کامل اور درست بنایا۔ کہیں اس طرح فرمایا ہے "وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ وَرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبَاتِ" (سورۂ المومن آیت ۶۴ پ ۲۴) "وَصَوَّرَکُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَکُمْ" (سورۂ التغابن پ ۲۸ آیت ۳) "قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَہٗ ثُمَّ ھَدٰی (سورۂ طٰہٰ پ ۱۶ آیت ۵۰) موسیٰؑ نے کہا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب خلقت عطا کی اور اسے ہر طرح ہدایت بھی کر دی پھر انسان کی خلقت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے۔ "وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ اٰدَمَ" ہم نے اولاد آدمؑ کو عزت دی ہے۔ اسی آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے وَفَضَّلْنٰھُمْ عَلٰی کَثِیْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِیْلًا" (سورۂ بنی اسرائیل) اور ہم نے آدمؑ کی اولاد کو اپنی بہت سی مخلوق پر فضیلت دی ہے۔ اور پھر جہاں تک اصل خلقت کا تعلق ہے انسان کو عقل و فہم دے کر تمام اچھی اور بری باتوں کا فرق بھی سمجھا دیا گیا اور پوری طرح اس کی ہدایت کا سامان بھی کر دیا گیا۔ "وَھَدَیْنٰہُ النَّجْدَیْنِ" (سورۂ البلد) اور ہم نے انسان کو (اچھی اور بری) دونوں راہیں بھی بتا دیں۔ اور پھر سورۂ دہر میں یوں ارشاد ہوا۔ "اِنَّا ھَدَیْنٰہُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاکِرًا وَّ اِمَّا کَفُوْرًا۔" ہم نے انسان کو سیدھا راستہ بتا دیا ہے اب وہ چاہے تو اس (احسان) پر ہماری شکر گذاری کرے اور چاہے ناشکری کرے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مشہور حدیث ہے: "مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلَّا یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ" اس کا حاصل یہ ہے کہ کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جو دین فطرت پر نہ پیدا ہوتا ہو مگر تربیت دینے والے اس کو سیدھی راہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ غرض خدا نے انسان کی خلقت کو ہر عیب اور برائی سے پاک رکھا ہے اور ساتھ ہی اسے عقل و فہم دے کر اس کی ہدایت کا بھی پوری طرح سامان کر دیا ہے، لیکن اس کے باوجود اگر وہ اپنی عقل سے کام نہ لے اور سیدھے راستے سے ہٹ جائے تو جو برائیاں اس کی فطرت میں نہ تھیں وہ سب اس میں آجائیں گی۔ اس وضاحت سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ "خُلِقَ الْاِنْسَانُ ھَلُوْعًا" اور اسی طرح کے دوسرے

جملوں میں خلق ۔ کے لفظ سے انسان کی اصلی خلقت اور پیدائش مراد نہیں ہو سکتی
بلکہ اس کی بہترین صلاحیتوں اور اچھی صفتوں کا برائیوں اور گمراہیوں میں بدل جانا مراد
ہے جس کا سبب خود انسان ہی کی ذات ہے کیونکہ اُس نے خدا کے عطا کیے ہوئے
سامانِ ہدایت سے فائدہ نہ اٹھایا اور اُس کی بخشی ہوئی عقل اور سمجھ سے پوری طرح
کام نہ لیا تو نتیجہ میں اس کی ساری اچھائیاں برائیوں میں بدل گئیں اور وہ ایسا بن
گیا کہ اس میں یہ بُری صفتیں پیدا ہو گئیں ۔ اس کے بعد " اِلَّا الْمُصَلِّيْنَ " اور بعد
کی آیتوں میں اُن لوگوں کو اس سے مستثنیٰ اور الگ کر دیا گیا جنہوں نے عقل سے صحیح
طریقہ پر کام لے کر حق اور باطل کا فرق سمجھ لیا اور حق کے راستہ پر قائم ہو گئے اور اُن نعمتوں
اور صلاحیتوں سے پورا فائدہ اٹھایا جو خدا نے انھیں عطا کی تھیں ۔ پھر جن اہل حق کو
مستثنیٰ کیا گیا ہے اُن کی صفتوں کا بیان ہے کہ وہ نیک بندے ہمیشہ نماز کو پابندی
کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور اپنے مال میں سے حقداروں کے حق نکالتے ہیں ، روز قیامت
پر پورا یقین رکھتے ہیں اور عذاب الٰہی سے ہر وقت ڈرتے رہتے ہیں ، پاک دامن رہتے ہیں اور
ان حدوں سے کبھی آگے نہیں بڑھتے جو خدا نے اُن کے لیے متعین کر دی ہیں ۔ کبھی
امانت میں خیانت نہیں کرتے چاہے وہ مخلوق کی امانت ہو یا خدا کی اور چاہے وہ کسی قسم
کی بھی ہو ، وہ ہمیشہ سچّی گواہی دیا کرتے ہیں اور اس میں کسی کی رعایت اور طرفداری
نہیں کرتے بلکہ جو حق بات ہوتی ہے وہی کہتے ہیں ۔ خدا کی پیدا کی ہوئی جنتیں ایسے
ہی ایمان و یقین رکھنے والوں اور نیک اعمال لوگوں کے لیے ہیں جہاں وہ ہمیشہ عزت
کے ساتھ رہیں گے ۔

(درس ۱۸۱)

فَمَالِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا قِبَلَكَ مُهْطِعِيْنَ ۝ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ
الشِّمَالِ عِزِيْنَ ۝ اَيَطْمَعُ كُلُّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ اَنْ يُّدْخَلَ
جَنَّةَ نَعِيْمٍ ۝ كَلَّا ۭ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّمَّا يَعْلَمُوْنَ ۝ فَلَآ
اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ۝ عَلٰٓي
اَنْ نُّبَدِّلَ خَيْرًا مِّنْهُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ ۝ فَذَرْهُمْ
يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا حَتّٰي يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ ۝
يَوْمَ يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ سِرَاعًا كَاَنَّهُمْ اِلٰى

نُصُبٍ یُّوۡفِضُوۡنَ ۙ﴿۴۳﴾ خَاشِعَةً اَبۡصَارُهُمۡ تَرۡهَقُهُمۡ ذِلَّةٌ ؕ ذٰلِكَ الۡيَوۡمُ الَّذِىۡ كَانُوۡا يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۴۴﴾

(پارہ ۲۹ رکوع ۸ کی آیات - سورۃ المعارج)

پھر کافروں کو کیا ہو گیا ہے کہ وہ تمہاری طرف داہنے سے بائیں سے گروہ گروہ دوڑے چلے آ رہے ہیں۔ کیا ان میں سے ہر شخص اس کی ہوس رکھتا ہے کہ وہ آرام کی جنت میں داخل کر لیا جائے گا۔ ہرگز نہیں، ہم نے انہیں ایسی چیز سے خلق کیا ہے جس کو وہ جانتے ہیں۔ تو میں قسم کھاتا ہوں مشرقوں اور مغربوں کے پروردگار کی کہ ہم ضرور اس پر قدرت رکھتے ہیں کہ ان کی جگہ ان سے بہتر لوگ لے آئیں اور ہم عاجز نہیں ہیں پس تم انھیں چھوڑ دو کہ وہ باتیں بناتے اور کھیلتے رہیں یہاں تک کہ وہ اپنے اس دن سے جا ملیں جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے۔ جس دن وہ قبروں سے دوڑتے ہوئے نکلیں گے گویا وہ کسی نشان کی طرف تیز تیز جا رہے ہیں۔ اُن کی آنکھیں جھکی ہوئی ہوں گی۔ اُن پر رسوائی چھائی ہوئی ہو گی۔ یہ وہی دن ہے جس کا اُن سے وعدہ کیا جاتا تھا۔

تشریح و تفسیر:۔ "مُهۡطِعِيۡنَ" "هطع" سے بنا ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کو نگاہ میں لیے اُس کی طرف تیزی سے جانا "عِزِيۡنَ" "عِزَةٌ" کی جمع ہے اس کے معنی گروہ اور جماعت کے ہیں۔ "مَسۡبُوۡقِ" کے معنی مغلوب اور عاجز کے ہیں۔ "اَلۡخَوۡض" پانی میں اتر جانے یا کسی گفتگو یا کسی کام میں مشغول ہو جانے کو کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں یہ لفظ زیادہ تر ایسے مقامات پر آیا ہے جہاں فضول باتوں اور لاحاصل کاموں میں لگے رہنا مراد ہے "اَلۡاَجۡدَاث" "جَدَث" کی جمع ہے جس کے معنی قبر کے ہیں "نُصُب" عبداللہ بن عامر اور حفص کی قراءت کے مطابق اس لفظ کو "نُصُب" پڑھا جاتا ہے یعنی نون اور صاد پر پیش کے ساتھ۔ اور باقی دوسری قراءتوں کے مطابق "نَصۡب" پڑھا گیا ہے۔ نون پر زبر اور صاد پر سکون کے ساتھ۔ کچھ لوگوں نے اس سے مراد نشان اور علامت کو لیا ہے۔

حضرت ابن عباس کے نزدیک اس سے مراد علم اور جھنڈا ہے حسن بصری اور قتادہ وغیرہ بتوں کو مراد لیتے ہیں "یُوۡفِضُوۡنَ" "اِيۡفَاض" سے بنا ہے مادّہ "وَفۡض" اور "وَفَض" ہے اس کے معنی جلدی کرنے اور دوڑنے کے آتے ہیں۔

"ترْهَقُهُمْ" "رَهَق" سے بنا ہے اس کے معنی غالب ہوجانے اور چھا جانے کے ہیں
"مشارق" "مَشْرِق" کی جمع ہے اور "مغارب" "مغرب" کی سورج کے نکلنے
کی جگہ کو مشرق اور غروب ہونے کے مقام کو مغرب کہتے ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی
لکھتے ہیں کہ جب مشرق اور مغرب مفرد یعنی ایک ایک بولے جائیں تو ان سے مشرقی
اور غربی سمت مراد ہوا کرتی ہے اور جب تثنیہ یعنی دو کہے جائیں تو جاڑے اور گرمی
کے دو مشرق اور دو مغرب مراد لیے جاتے ہیں اور جب جمع کا صیغہ ہو یعنی مشارق اور
مغارب کہا جائے تو اس سے مراد ہر روز کا مشرق اور مغرب ہوتا ہے۔

راغب اصفہانی کی اس تشریح کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ہر خطۂ زمین
کے لحاظ سے افق یعنی آسمان کے کنارہ کی ذرا سی تبدیلی کی وجہ سے سورج کے نکلنے
اور غروب ہونے کی جگہ بھی بدل جایا کرتی ہے اس بنا پر جتنے افق بدلتے جائیں گے
اتنے ہی مشرق اور مغرب بھی کہے جا سکتے ہیں۔ بعض مفسروں نے مشارق اور مغارب
سے صرف سورج ہی کے نہیں بلکہ تمام ستاروں کے مشرق و مغرب مراد لیے ہیں۔

جنت میں جانے والوں کے بلند مرتبہ کا ذکر سن کر کفار مکہ آنحضرت صلی اللہ
علیہ وآلہ وسلم کے پاس ٹولیاں بنا کر آتے رہتے تھے اور پھر آیات الٰہیہ کا مذاق
اڑاتے تھے اور کہتے تھے کہ اگر یہ ساری باتیں حق ہیں اور آخرت میں ایسی نعمتیں ملیں
گی تو ان مفلس اور غریب لوگوں سے جو آپ کے ساتھ ہیں ہم اشراف قریش ان نعمتوں
کے زیادہ حقدار ہیں۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی یہ لوگ ہماری برابری نہیں کر سکتے اور
ہم ان سے عزت اور مرتبہ میں بہت بلند ہیں تو پھر آخرت میں بھی یہ ہمارا کیا مقابلہ کر سکیں
گے وہاں بھی ہمیں کو کامیابی اور عزت ملیگی اور یہ سب کے سب محروم رہیں گے۔ ان
آیات کریمہ میں اُن کو تنبیہ کی جا رہی ہے اور ارشاد ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے
کہ یہ پیرا باندھ کر اور ٹولیاں بنا کر تمہارے پاس دوڑ دوڑ کر آتے ہیں اور کلام خدا سن کر
اس کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آخرت کی نعمتوں کے وہی حقدار ہیں۔ وہ خوب
جانتے ہیں کہ ان کی خلقت کتنی حقیر چیز سے ہوئی ہے پھر اس ناپاکی اور پستی کے باوجود
اس عالم تدس میں اور اس فردوس بریں میں ان کو کیسے جگہ مل سکتی ہے جب تک
وہ ایمان اور نیک اعمال کے ذریعہ تقرب خداوندی کی عزت نہ حاصل کر لیں اور اپنے

کفر و شرک کی نجاست کو دور نہ کر دیں۔ دنیا کی دولت و عزت اور جاہ و حشم سے آخرت کی کامیابی نہیں ملا کرتی۔ وہ تو صرف انہیں کو ملتی ہے جو خدا کی اطاعت کرتے ہیں اور اُس کے حکم پر چلتے ہیں۔ بعض مفسروں نے ان آیات کا یہ مطلب لیا ہے کہ ان کافروں کو کیا ہوا ہے کہ یہ قرآن سُن سُن کر تمہارے پاس نہیں آتے اور بھاگ جاتے ہیں اور جو باتیں تم بیان کرتے ہو اُن کی تکذیب کیا کرتے ہیں اور اس کے باوجود نجات کی تمنا بھی رکھتے ہیں۔ غرض انہیں بتایا جا رہا ہے کہ جب تک وہ ایمان نہ لائیں گے اور نیک عمل نہ کریں گے انھیں جنت میں جانے کا اور آخرت کی نعمتوں کے پانے کا حق ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا چاہے وہ کتنے ہی دولت مند ہوں، کیسے ہی اس دنیا میں مرتبہ اور عزت والے ہوں، کیسے ہی خاندان نسل اور قبیلہ یا قوم سے تعلق رکھتے ہوں کیونکہ خدا کی بارگاہ میں جس چیز کی وجہ سے عزت ملتی ہے وہ صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ اگر اس کے ساتھ کچھ نسلی برتری بھی ہو تو وہ سونے پر سہاگہ کا کام دے سکتی ہے ورنہ اصل میں جو کچھ بھی ہے وہ محض سچا ایمان اور خالص عمل ہی ہے جس کی وجہ سے انسان خدا کی بارگاہ میں عزت کا مستحق بنتا ہے اور داخلہ جنت کا حقدار ہوتا ہے۔

آخر میں ارشاد ہوتا ہے کہ "فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا وَيَلْعَبُوا" مطلب یہ ہے کہ اے رسُول تم نے انہیں حق کا راستہ دکھا دیا اور وہ ایمان نہ لائے تو اب تم ان کو اسی حالت میں چھوڑ دو کہ وہ اپنی گمراہی اور باطل میں ڈوبے رہیں اور دنیا کی فانی لذتوں سے کھیلتے رہیں یہاں تک کہ وہ دن آجائے جس کا اُن سے وعدہ کیا گیا ہے یعنی قیامت کا دن آجائے اور اس سے پہلے موت کا دن آئے جو اُن کے غرور اور اُن کی حسرتوں کو خاک میں ملا دے۔ پھر قیامت میں جب انہیں قبروں سے اٹھایا جائے گا تو وہ میدان حشر کی طرف اس طرح دوڑیں گے جیسے وہ کسی جھنڈے کی طرف بے تحاشا دوڑتے ہیں مگر شرم کے مارے ان کی نگاہیں زمین میں گڑی ہوئی ہوں گی اور چہروں پر پھٹکار برس رہی ہوگی۔ یہ ہے دنیا میں خدا کی اطاعت سے سرکشی کرنے کا نتیجہ! اور یہ ہے وہ دن! وہ یقینی آنے والا دن! جس کا لوگ مذاق اڑاتے تھے اور اُس کا انکار کیا کرتے تھے۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِالْخُنَّسِ ۙ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ ۙ وَالَّيْلِ اِذَا عَسْعَسَ ۙ وَالصُّبْحِ اِذَا تَنَفَّسَ ۙ اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۙ ذِيْ قُوَّةٍ عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِيْنٍ ۙ مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ ؕ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ ۚ وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِيْنِ ۚ وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ ۚ وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ۙ فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ ؕ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۙ لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ ؕ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۟

(۱۵۲)

(پارہ ۳۰ رکوع ۶ کی آخری آیات سورۃ التکویر)

تو میں قسم کھاتا ہوں ان ستاروں کی جو پیچھے کو ہٹنے لگتے ہیں۔ چلتے رہتے ہیں چھپ جاتے ہیں اور قسم ہے رات کی جب وہ جانے لگے اور صبح کی جب وہ روشن ہو جائے یقیناً یہ قرآن ایک صاحبِ عزت پیغام لانے والے کا لایا ہوا کلام ہے جو قوت والا ہے مالک عرش کے نزدیک ذی عزت ہے۔ وہاں اس کی اطاعت کی جاتی ہے۔ امانتدار ہے اور تمہارا رفیق دیوانہ نہیں ہے۔ اس نے اُس کو آسمان کے کھلے کنارہ پر دیکھا ہے۔ اور یہ پیغمبر غیب کی بات بتانے میں بخل کرنے والے بھی نہیں ہیں۔ اور یہ قرآن کسی شیطانِ مردود کی کہی ہوئی بات نہیں۔ تو تم لوگ کدھر جا رہے ہو۔ یہ تو سارے جہان والوں کے لیئے نصیحت ہے۔ ایسے شخص کے لیئے جو تم میں سے سیدھا چلنا چاہے۔ اور تم بغیر رب العالمین اللہ کے چاہے ہوئے کچھ بھی نہیں چاہ سکتے۔

تشریح و تفسیر: "خُنَّسْ۔ خانِسْ" کی جمع ہے اور یہ لفظ "خُنُسْ" سے بنا ہے جس کے معنی پیچھے ہٹنے کے ہیں اس سے مراد وہ ستارے ہیں جو سیدھے چلتے چلتے پیچھے کی طرف ہٹنے لگتے ہیں کُنَّسْ۔ "کُنُوس" سے بنایا گیا ہے اور "کانِسْ" کی جمع ہے "کُنُوس" کے معنی ہیں ہرن کا جھاڑی میں چھپ جانا۔ یہاں مراد ستارے ہیں جو اپنے اپنے غروب کے وقت چھپ جاتے ہیں۔ وَالَّیْلِ اِذَا عَسْعَسَ "میں "عَسْعَسَۃٌ"

کو رات کی تاریکی پھیلنے اور دور ہونے دونوں معنی میں بولا جاتا ہے۔ یہاں رات کے اندھیرے کا کم ہونا اور دور ہونا مراد ہے۔ "تَنَفَّسَ" سانس لینے کو کہتے ہیں مگر جب صبح کے لیئے بولا جائے تو اس سے مراد اُس کا چمکنا اور روشن ہونا ہوتا ہے۔ "ضَنَّ" اور "ضِنَّۃ" کنجوسی کرنے کو کہتے ہیں اسی سے "ضَنِین" بنا ہے یعنی بخیل مطلب یہ ہے کہ پیغمبر پر جو وحی نازل ہوتی ہے اُس کو بتانے میں وہ کبھی بخل سے کام نہیں لیا کرتے۔

ان قسموں کے بعد خدا فرماتا ہے کہ یہ قرآن حکیم ایک باعزت اور قوت دار فرشتہ یعنی جبرئیل علیہ السلام کا لایا ہوا کلام ہے جو اللہ کی جانب سے انہوں نے حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پہنچایا ہے پھر جبرئیل علیہ السلام کی تعریف میں یہ فرمایا گیا ہے کہ وہ فرشتوں کے سردار ہیں اور دوسرے فرشتے ان کی اطاعت کرتے ہیں یہ تمام صفتیں اس لیئے بیان کر دی گئیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ کلام الٰہی میں فرشتہ نے کوئی کمی اور زیادتی نہیں کی ہے اور جو کچھ خدا کا کلام تھا اسے پوری امانداری کے ساتھ اس کے پیغمبرؐ تک انہوں نے پہنچا دیا اس سے معلوم ہوا کہ کلام خدا میں نہ کسی انسان نے کوئی تغیر پیدا کیا ہے اور نہ کسی فرشتہ نے اور یہ اوّل سے آخر تک خدا کا کلام ہے۔

اس کے بعد یہ فرمایا گیا کہ تمہارے رفیق یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجنون نہیں ہیں۔ وہ جبرئیلؑ کو اصلی حالت میں دیکھ بھی چکے ہیں۔ ان تمام باتوں سے یہ امر پوری طرح صاف اور واضح ہو جاتا ہے کہ قرآن کریم میں نہ ملک نے کوئی ترمیم اور تبدیلی کی اور نہ پیغمبر اکرمؐ نے اور یہ کلام ربانی ہر مخلوق کے تصرف سے پاک ہے۔

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد اب ارشاد ہوتا ہے کہ تو پھر قرآن کو چھوڑ کر اب کہاں جا رہے ہو کیونکہ قرآن حکیم کا حق ہونا اور کلام خدا ہونا پوری طرح سمجھایا جا چکا ہے اس لیئے جو کچھ اس میں ہے وہ سب سچ اور حق ہے اور جو کچھ اس کے خلاف ہے وہ سب کا سب باطل اور گمراہی ہے۔

دوسرے الفاظ میں مراد یہ ہے کہ یہ کتاب اللہ جو سرگروہ انبیاء کے وسیلے سے دنیا والوں تک پہنچی ہے اس میں دو واسطے ہیں ایک جبرئیل علیہ السلام دوسرے خود

سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبرئیلؑ بھی امین ہیں اور ہمارے حضورؐ بھی امین ہیں۔ اور ایسے امین کہ آپ کے بدترین دشمن بھی آپ کو امین کہتے اور سمجھتے تھے تو پھر قرآن کے کلامِ خدا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد ہمساتھی اور رفیق "کہکر یہ بھی سمجھا دیا گیا کہ بعثت سے قبل چالیس برس تک سب نے رسول اللہؐ کی زندگی کا ہر دور اچھی طرح دیکھا ہے، جوانی اور جوانی کے بعد کا زمانہ خوب اچھی طرح دیکھا ہے اور ان کی کونسی بات ایسی ممکن تھی جو لوگوں کے سامنے نہ آسکتی ہو مگر کبھی کسی شخص نے ان میں کوئی عیب نہیں دیکھا اور دوست دشمن سب ہی آپ کی امانت، دیانت، عقل و دانش اور سچائی کو مانتے تھے تو اب چالیس سال کی بے داغ اور پاک و پاکیزہ زندگی کے تجربہ کے بعد آپ کی ذات اقدس والا کی طرف جھوٹ یا دیوانگی کی نسبت دینا خود آپ کے دشمنوں کے حسد، عداوت، گمراہی اور جنون کی سب سے بڑی دلیل اور واضح ثبوت ہے۔

(درس ۱۸۳) اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ۝ وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ۝ وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ۝ وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ۝ عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ ۝ يٰٓاَيُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ فَعَدَلَكَ ۝ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۷ کی ابتدائی ۸ آیات سورۂ الانفطار)

جب آسمان پھٹ جائیگا اور جب تارے جھڑ پڑیں گے اور جب دریا بہہ نکلیں گے اور جب قبریں اکھاڑ دی جائیں گی اس وقت ہر شخص اپنے ان اعمال کو جان لیگا جنہیں اس نے اپنے آگے بھیجا ہے اور اپنے پیچھے چھوڑا ہے اے انسان تجھے اپنے کریم پروردگار کے بارے میں کس چیز نے بہکایا جس نے تجھے بنایا پھر تجھے درست کیا پس تجھے اعتدال پر بنایا جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دیا۔

تشریح و تفسیر: "انفطرت" کا اصلی مادّہ "فطر" ہے اس کے معنی پھاڑنے کے ہیں "انفطار" پھٹ جانے کو کہتے ہیں "انتثرت" نثر سے بنا ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کو بکھرا دینا اسی سے انتشار بنا ہے جس کے معنی بکھر جانے

کے ہیں "فُجِّرَتْ" اس کا مصدر تفجیر ہے جب یہ لفظ پانی کے لیے بولا جاتا ہے تو اس کے معنی اس کو بہانے اور جاری کرنے کے ہوتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ اس وقت سارے دریا بہا دیئے جائیں گے اور وہ ابل کر ایک دوسرے سے مل جائیں گے۔ "بحار - بحر" کی جمع ہے۔ یہ لفظ سمندر کے لیے بولا جاتا ہے اور بڑے دریا کو بھی کہتے ہیں "وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ" اس کا مصدر "بَعْثَرَةٌ" ہے۔ یہ چیزوں کے الٹ پلٹ کرنے اور اکھاڑ دینے کے لیئے بولتے ہیں۔ جن لوگوں کے نزدیک رباعی اور خماسی فعل دو ثلاثی مادوں سے ملکر بنتے ہیں ان کا قول ہے کہ بُعْثِرَ۔ بُعِثَ اور اُثِیْرَ سے ملکر بنا ہے مراد یہ ہے کہ جو چیز زمین کی تہہ میں ہے وہ اوپر آجائے گی اور قبریں اکھاڑ دی جائیں گی اور مردے قبروں سے نکالے جائیں گے۔

غرض قیامت کے ہولناک دن کا ذکر ہے۔ جب ہیبت و جلالِ خداوندی سے آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے اور ستارے بکھر جائیں گے۔ عالم کا نظام زیر و زبر ہو گا۔ سارے سمندر اور دریا باہم مل کر ایک ہو جائیں گے۔ مردے جس جگہ اور جس صورت میں بھی ہوں گے وہ اٹھائے جائیں گے۔ زمین کا ذرہ ذرہ تہہ بالا ہو جائے گا۔ اس ہیبتناک وقت میں نہ دنیا کی دولت کام آئے گی نہ یہاں کا اقتدار نفع دے گا نہ دوست اور رشتہ دار مدد کر سکیں گے اور نہ خوشامد سے کام نکلے گا۔ وہاں اعمال کی پرسش ہو گی، ایمان و اطاعتِ خدا کا سہارا ہو گا اور جو کچھ بھی کسی شخص نے اپنی دنیاوی زندگی میں کیا ہے سب اس کے سامنے آجائے گا چاہے اس نے اپنی عمر کے کسی حصہ میں کیا ہو اور ان اچھے اور برے اثرات کو بھی اس کے حساب میں شمار کیا جائے گا جو اس نے اپنے پیچھے چھوڑے ہیں اور جب تک وہ اثرات دنیا میں باقی رہیں گے ان کا ثواب یا عذاب اس شخص کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ سورۃ القیامۃ میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے "یَقُوْلُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ کَلَّا لَا وَزَرَ اِلٰی رَبِّكَ یَوْمَئِذِ الْمُسْتَقَرُّ۔ یُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ" قیامت کے دن انسان کہے گا آج کہاں بھاگ کر جاؤں ہرگز نہیں کہیں پناہ کی جگہ نہیں اس دن تو صرف

تمہارے پروردگار ہی کے پاس ٹھکانا ہے اس روز انسان کو اس کا اگلا پچھلا کیا ہوا بتا دیا جائے گا۔ اسی طرح سورۂ یٰسین میں خدا کا ارشاد ہے "اِنَّا نَحْنُ نُحْیِ الْمَوْتٰی وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَاٰثَارَھُمْ" بیشک ہم مردوں کو زندہ کریں گے اور ہم ان کے وہ اعمال بھی لکھتے ہیں جن کو وہ لوگ آگے بھیجتے جاتے ہیں اور ان کے وہ اعمال بھی جنہیں وہ پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے "عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ" کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے پیچھے کوئی اچھا اثر اور نشان چھوڑ جائے تو اس کو اپنے عمل کا ثواب تو ملے ہی گا ساتھ ہی اس کو ان تمام لوگوں کے اعمال کا بھی ثواب ملتا رہے گا جو اس کے چھوڑے ہوئے طریقہ اور اثر کو اختیار کریں گے اس سے فائدہ اٹھائیں گے یا اس پر عمل کریں گے مثلاً کوئی شخص مسجد بنوائے، کنواں تعمیر کرے، مدرسہ بنائے یا کتاب تصنیف کرے جس سے لوگوں کو ہدایت حاصل ہو یا اسی طرح کی کوئی اور اچھی بنیاد قائم کرے تو خود بھی باعثِ ثواب ہے اور اس کے ساتھ ہی جب تک لوگ اس مسجد میں عبادت کرتے رہیں گے۔ کنویں سے پیاس بجھاتے رہیں گے۔ کھیتوں کو سیراب کرتے رہیں گے اور جہاں تک بھی اس پانی کے فائدہ کا سلسلہ چلتا رہے گا اور اسی طرح علمی درس گاہ سے لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں گے اور اس مفید علم کا اثر اور سلسلہ خطوں اور ملکوں اور نسل در نسل جہاں تک بھی باقی رہے گا وہ سب اس کے عمل خیر کی بنیاد قائم کرنے والے کی فرد عمل میں لکھا جائیگا اور اس کے باوجود ان دوسرے عمل کرنے والوں کے بھی ثواب میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور یہی صورت برے اعمال کی بھی ہے اور برے اثرات کی بھی۔ ہے جو انسان اپنے بعد چھوڑ جائے جب تک وہ بری بنیاد بھی قائم رہیں گی اور لوگ ان کی وجہ سے گناہوں اور برائیوں میں مبتلا رہیں گے تو ان تمام گناہوں کا عذاب بھی اس کی فرد عمل میں تحریر ہوتا جائے گا علاوہ اس گناہ کے جو اس کے ذاتی عمل بد کی وجہ سے اس کے لئے مقرر ہے۔ حضرت حذیفہؓ بن الیمان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ زمانہ حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ایک سائل آیا اور اس نے اپنی پریشانیاں بیان کر کے لوگوں سے کچھ سوال کیا مگر کسی نے اس کا جواب نہ دیا اس کے بعد ان لوگوں میں سے

ایک آدمی نے اس کو کچھ دیا یہ دیکھ کر پھر سب اس کو دینے لگے اور سب نے اس کی امداد
کی تو سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سن کر فرمایا مَنِ اسْتَنَّ خَیْرًا فَاسْتُنَّ
بِہٖ فلہ اجرہ ومثل اجور من اتبعہ غیر منتقص من اجورھم ومن اسْتَنَّ شَرًّا
فَاسْتُنَّ بِہٖ فعلیہ وزرہ ومثل اوزار من اتبعہ غیر منتقص من اوزارھم۔
یعنی جو شخص کوئی (اچھی بات جاری) کرے اور نیک بنیاد قائم کرے اور اس پر دوسرے لوگ عمل کریں اور
اس کو اختیار کریں تو اس کام کے بانی کو اس کے ذاتی عمل کا بھی ثواب ملے گا اور ان
تمام لوگوں کے ثواب کے برابر ثواب بھی ملیگا جو اس کی قائم کی ہوئی نیک بنیاد اور نیک
طریقہ کو اختیار کریں گے۔ اس کے ساتھ ہی اُن دوسرے عمل کرنے والوں کے ثواب میں بھی
کوئی کمی نہ ہوگی اسی طرح بُری بنیادیں قائم کرنے اور بُرے طریقے جاری کرنے والوں کا
بھی حال ہوگا اور ان کی فردِ عمل ان کی زندگی میں اور اُن کے مرنے کے بعد بھی سیاہ سے
سیاہ تر ہوتی چلی جائے گی۔ خدائے بزرگ و برتر ہم سب کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنی
زندگی کو نیک اعمال میں صرف کریں اور جب دنیا سے جائیں تو اپنے اچھے اور نیک اثرات
اور نشانات چھوڑ جائیں جسکی وجہ سے مرنے کے بعد بھی ہمارا نامۂ عمل روشن سے روشن تر
ہوتا جائے۔

(درس ۱۸۴) كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّينِ ۝ وَإِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِينَ ۝
كِرَامًا كَاتِبِينَ ۝ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ۝ إِنَّ الْأَبْرَارَ
لَفِي نَعِيمٍ ۝ وَإِنَّ الْفُجَّارَ لَفِي جَحِيمٍ ۝ يَصْلَوْنَهَا
يَوْمَ الدِّينِ ۝ وَمَا هُمْ عَنْهَا بِغَائِبِينَ ۝ وَمَا أَدْرٰكَ
مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ ثُمَّ مَا أَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّينِ ۝ يَوْمَ
لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِنَفْسٍ شَيْئًا وَالْأَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِلّٰهِ ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۷ کی آخری ۱۱ آیات سورۃ الانفطار)

ہرگز نہیں بلکہ تم انصاف کے دن کو جھٹلاتے ہو اور یقیناً تم پر نگہبان بزرگ
لکھنے والے مقرر ہیں، جو کچھ تم کرتے ہو وہ جانتے ہیں بے شک نیک لوگ بہشت
کی نعمتوں میں ہوں گے اور بدکار جہنم میں ہوں گے جزا کے روز اسی میں جائیں گے
اور وہ اس سے باہر نہ ہوں گے اور تمکو کیا معلوم کہ جزا کا دن کیا ہے پھر تمہیں کیا خبر کہ وہ

جزا کا دن کیا ہے اس دن کوئی شخص کسی کی بھلائی نہ کر سکے گا اور اس دن حکم صرف خدا ہی کا ہوگا۔

تشریح وتفسیر "کَلَّا" اُس جگہ پر بولا جاتا ہے جہاں اپنے مخاطب کو خبردار کیا جائے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے یا سمجھتا ہے وہ غلط اور باطل ہے "الدین" جزا و بدلہ کو کہتے ہیں اور ملت و مشرب کے لیے بھی بولتے ہیں یہاں پر اکثر مفسروں کے نزدیک پہلے معنی مراد ہیں "نعیم" سے مراد جنت ہے۔ "اَدْرَاکَ" دَرْیٌ اور دِرَایَۃٌ سے بنایا گیا ہے جس کے معنی معلوم کرنے اور جاننے کے ہیں مَا اَدْرَاکَ بول کر مَا تَدْرِیْ مراد ہوتا ہے یعنی تم کو کیا معلوم ہے، تم کیا جانو۔

"یَصْلَوْنَهَا کا مصدر صَلیً یا صُلِیٌّ" ہے یعنی آگ یا کسی اور چیز کی تکلیف اٹھانا اُس میں داخل ہونا یا مبتلا ہونا۔

کَلَّا بَلْ تُکَذِّبُوْنَ بِالدِّیْنِ" یعنی بہکنے اور گمراہ ہونے کی کوئی اور وجہ نہیں ہے دراصل تم روز جزا پر ایمان ہی نہیں رکھتے اور سمجھتے ہو کہ ہم اس دنیا میں جو کچھ چاہیں کرتے رہیں نہ ہم کو کہیں حساب دینا ہے اور نہ کوئی ہم سے ان اعمال کی پوچھ گچھ کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا ہے کہ ان اعمال کو لکھنے والے اور محفوظ کرنے والے فرشتے بھی مقرر ہیں جو انسان کے ہر نیک و بد عمل کو لکھتے رہتے ہیں خواہ وہ ظاہر بظاہر کرے یا اسے چھپا کر کرے۔ وہ لکھنے والے ایسے ہیں جو اپنے کام میں ذرا بھی خیانت اور غفلت نہیں کرتے اور کوئی عمل بغیر لکھے ہوئے نہیں چھوڑتے۔ ایک طرف خدا نے اُن لکھنے والوں کی یہ صفت بیان فرمائی کہ وہ حفاظت کرنے والے ہیں یعنی ان کی نگرانی اور حفاظت سے کوئی عمل انسان کا باہر نہیں رہتا اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ جو کچھ بھی لوگ کرتے ہیں وہ فرشتے سب جانتے ہیں اور اُن کے اعمال سے کسی وقت بھی بے خبر نہیں رہتے۔

انسانی اعمال کی اس حفاظت اور کتابت کو قرآن حکیم نے بار بار مختلف الفاظ اور مختلف طریقوں سے سمجھایا ہے تاکہ انسان اپنے تمام اعمال میں اس بات سے کبھی بے خوف نہ رہنے پائے کہ اُس کو کوئی دیکھنے اور سننے والا موجود نہیں ہے۔ سورۂ قٓ پ ۲۶ میں خدا کا ارشاد ہے۔ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَ

عَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ۝ مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ۝ جب انسان کوئی کام کرتا ہے تو دو لکھنے والے (کراماً کاتبین) جو اس کے داہنے بائیں بیٹھے ہیں لکھتے ہیں۔ کوئی بات اس کی زبان پر نہیں آتی مگر ایک نگہبان اس کے پاس تیار رہتا ہے سورۂ الانبیاء پ ۱۷ میں ہے "فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ وَاِنَّا لَهٗ كَاتِبُوْنَ" یعنی جو ایمان رکھنے والا نیک عمل کرتا ہے اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے اعمال لکھ رہے ہیں۔ سورۂ الزخرف پ ۲۵ میں ہے "اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَ نَجْوٰهُمْ ؕ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ" کیا وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے بھید اور ان کی سرگوشیوں یعنی راز کی باتوں کو نہیں سنتے ہاں (ضرور سنتے ہیں) اور ہمارے فرشتے ان کے پاس ہیں اور اُن کی باتیں لکھتے جاتے ہیں۔

اس نامۂ عمل کا ذکر سورۂ بنی اسرائیل میں اس طرح ہے۔ "وَنُخْرِجُ لَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ كِتٰبًا يَّلْقٰهُ مَنْشُوْرًا ۝ اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا ؕ" یعنی قیامت کے دن ہم ہر انسان کا نامۂ عمل اس کے سامنے نکال کر رکھ دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا۔ اپنا نامۂ عمل پڑھ لے! اور آج اپنا حساب لینے کے لیے تو خود ہی کافی ہے۔

سورۂ کہف میں اس طرح ارشاد ہوا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ قیامت میں لوگوں کے اعمال کی کتاب ان کے سامنے رکھی جائے گی جسے دیکھ کر گناہگاروں کی حالت یہ ہوگی کہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر سہمے ہوئے ہوں گے۔ اور کہیں گے کہ ہائے ہماری شامت! یہ کیسی کتاب ہے کہ نہ کسی چھوٹے گناہ کو بغیر لکھے ہوئے چھوڑتی ہے اور نہ بڑے گناہ کو اور جو کچھ بھی لوگوں نے دنیا کی زندگی میں کیا تھا وہ سب لکھا ہوا اُس وقت موجود پائیں گے۔ کسی مقام پر اعمال کے اس سخت محاسبہ کے ذکر میں خدا نے اپنے ذاتی علم و شہادت یعنی گواہی کا بھی ذکر فرمایا ہے اور کسی جگہ انسان کے اعضائے بدن کی گواہی کا تذکرہ فرمایا گیا ہے اور نہ صرف ظاہری افعال اور اعمال بلکہ اس محاسبہ میں ذرہ وسوسے اور خیالات بھی داخل ہیں جو انسانی ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم نے ہمیں پوری طرح بتا دیا اور خبردار کر دیا ہے۔ کہ ہماری زندگی خدا کی طرف سے ایک سخت اور شدید محاسبہ کے

اندر ہے۔ ہمارا ہر عمل اور ہر قول اُس کے علم میں ہے، اس کے علاوہ اس پر فرشتے بھی گواہ ہیں، خود ہمارے اعضا بھی شاہد ہیں اور وہ پورا ماحول گواہ ہے جس میں وہ اعمال ہم سے ظہور میں آتے ہیں اور یہ ساری گواہیاں قیامت میں جمع ہوں گی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم تنہا ہیں، ہمیں اس کا خیال ہوتا ہے کہ ہمارے گناہوں کی کسی کو خبر نہیں ہوتی۔ انہیں کوئی دیکھنے والا نہیں ہے، انکو کوئی جاننے والا اور پرکھنے والا موجود نہیں ہے ہم آزاد ہیں جو چاہیں کرتے رہیں۔

قرآن حکیم نے ہمیں آگاہ کیا ہے کہ اگر ہم ایسا سمجھتے ہیں تو ہم بڑی غلطی پر ہیں اور بڑی غفلت میں ہیں بلاشبہ ہر لمحہ ہمارے اعمال پر خدا کی طرف سے محاسبہ ہوتا رہتا ہے اور ہماری نیتوں اور ارادوں کا جائزہ لیا جاتا ہے اور ہماری پوری زندگی اس سمیع و بصیر اللہ کے علم میں ہے جو ہمارے ظاہر و باطن سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسا سچا اور پکا مسلمان جس کو اس کا یقین ہو کہ اللہ اس کے ہر عمل اور اس کی ہر نیت سے واقف ہے اور علیم و خبیر اور سمیع و بصیر ہے وہ مخلص مسلمان کبھی جان بوجھ کر گناہ کی جراءت نہیں کر سکتا اور اگر کرے گا تو یہ خود اس حقیقت کا ثبوت ہوگا کہ اُس کے اس یقین اور ایمان میں نقص اور کمزوری ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس قدر ہمارے اس اعتماد اور یقین میں پختگی آئیگی کہ خدا ہمارے ہر فعل اور ہر عمل ہر خیال و تصور سے پوری طرح باخبر ہے اور کوئی معمولی سے معمولی بات بھی ہم اس سے نہیں چھپا سکتے اسیقدر ہمارے ایمان اور یقین میں بلندی اور پختگی پیدا ہوگی اور ہم گناہوں سے دور ہوتے جائیں گے۔ درحقیقت ہمارے کردار کی ساری کمزوریاں محض اس بنا پر ہوتی ہیں کہ ہمیں اللہ کی طرف سے اس محاسبہ اور اس کڑی نگرانی کا یقین پوری طرح نہیں حاصل ہوتا حالانکہ اسلامی تعلیم کی ساری بنیاد ہی اسی اعتقاد اور اسی یقین پر ہے اور یہی وہ تنہا وسیلہ ہے جس سے ہم اپنے نفس کی اصلاح اور ضمیر کی تطہیر کر سکتے ہیں اور اپنے عمل میں ایک سچے مسلمان کا کردار پیدا کرنے کے قابل بن سکتے ہیں۔

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ إِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ يَسْتَوْفُوْنَ ۝
وَإِذَا كَالُوْهُمْ أَوْ وَّزَنُوْهُمْ يُخْسِرُوْنَ ۝ أَلَا يَظُنُّ
أُولٰٓئِكَ أَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ ۝ لِيَوْمٍ عَظِيْمٍ ۝ يَّوْمَ
يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ كَلَّآ إِنَّ كِتٰبَ الْفُجَّارِ
لَفِيْ سِجِّيْنٍ ۝ وَمَآ أَدْرٰىكَ مَا سِجِّيْنٌ ۝ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ۝
وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ
بِيَوْمِ الدِّيْنِ ۝ وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖٓ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ
أَثِيْمٍ ۝ إِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ أَسَاطِيْرُ الْأَوَّلِيْنَ ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۸ کی ابتدائی ۱۳ آیات سورۃ المطففین۔)

بڑی خرابی ہے ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی کہ جب لوگوں سے ناپ کر لیں تو پورا لیں اور جب اُن کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں کیا انھیں اس کا یقین نہیں ہے کہ وہ ایک بڑے سخت دن میں زندہ کر کے اٹھائے جائیں گے جس دن تمام لوگ ربّ العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔ ہرگز نہیں۔ بدکار لوگوں کا نامۂ عمل سجّین میں ہے۔ اور تم کو کیا معلوم کہ سجّین کیا ہے۔ ایک دفتر ہے لکھا ہوا اس دن جھٹلانے والوں کی خرابی ہے جو روزِ جزا کو جھٹلاتے ہیں اور اس کو حد سے گزر جانے والے گنہگار کے سوا کوئی نہیں جھٹلاتا جب اس کے سامنے ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے کہ یہ تو اگلوں کے افسانے ہیں۔

تشریح وتفسیر: "مُطَفِّفِيْنَ" کا مصدر "تَطْفِيْف" ہے اس کے معنی ہیں ناپ تول میں کمی کرنا "طفیف" تھوڑی سی چیز کے لئے بولتے ہیں "اِكْتَالُوْا" "كَيْلٌ" سے بنایا گیا ہے۔ اس کے معنی ناپنے کے ہیں۔ "اکتیال" اس کا مصدر ہے یعنی ناپ کر لینا "يَسْتَوْفُوْنَ" "وَفَاءٌ" سے بنا ہے "استیفاءٌ" اس کا مصدر ہے اور معنی ہیں کسی چیز کو پورا لے لینا "كَالُوْهُمْ" بھی "كَيْل" ہی سے بنا ہے جس کے معنی ابھی بیان کئے گئے "سِجِّيْنٌ" "سَجْنٌ" سے بنا ہے جس کے معنی قید کرنے کے ہیں اور "سِجْنٌ" قید خانہ کو کہتے ہیں سجّین دوزخ کا نام ہے کیونکہ وہ بھی خدا کا مقرر کیا ہوا قید خانہ ہے جہاں اس کے مستحق ہمیشہ رکھے جائیں گے یہ مبالغہ کا صیغہ ہے جس سے

اس کی شدت کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔
پھر خود نامۂ اعمال کو سجین یعنی قید خانہ اس وجہ سے فرمایا گیا کہ وہی اس قید اور اس سزا کا سبب ہے۔
بعض مفسروں نے کہا ہے کہ "کِتَابٌ مَّرْقُوْمٌ" کا جملہ "سجین" کی شرح نہیں ہے بلکہ پچھلے فقرہ "اِنَّ کِتَابَ الْفُجَّارِ" کی تفصیل ہے اس کے علاوہ مفسروں کے اور بھی قول ہیں۔
غرض "سِجِّیْن" سے مراد وہ دفتر ہے جس میں ہر دوزخی کا نام لکھا ہوا ہوگا اور لوگوں کے اعمال لکھنے والے فرشتے بدکاروں کے عمل علیحدہ علیحدہ فردوں میں لکھ کر اس دفتر میں شامل کر دیتے ہیں۔
"معتد" اصل میں "معتدی" تھا، عَدْوٌ سے بنایا گیا ہے۔ اپنی جائز حد سے گذر جانے والے کو کہتے ہیں۔ "اثم" گناہ اور "اَثِیْمٌ" گناہگار کو کہتے ہیں۔ "اَسَاطِیْر" اُسطورۃ کی جمع ہے جس کے معنی من گھڑت کہانی اور افسانے کے ہیں۔
ان آیات کریمہ میں دو باتوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا گیا ہے ان میں سے ایک اسلام کی بنیادی تعلیم روزِ حساب کی اہمیت ہے جس کا یقین کیئے بغیر اسلام کے روحانی نظام کا کوئی تصور ہی باقی نہیں رہ سکتا اور دوسری بات جو یہاں کہی گئی ہے اس کا تعلق انسانوں کے باہمی حقوق سے ہے یعنی لین دین کے معاملوں میں پوری سچائی، انصاف اور دیانت سے کام لیا جانا بے حد ضروری ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے الگ نہیں ہیں یعنی جس کا یومِ حساب پر ایمان ہوگا وہ کبھی ناپ تول میں بے ایمانی نہیں کرے گا۔ اور اسی طرح وہ شخص جو ایسا کرے گا اس کا یہ فعل اس کا ثبوت ہوگا کہ حساب کے دن پر اس کا ایمان نہیں ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ قیامت کے دن صرف اُن ہی باتوں کی پوچھ گچھ نہیں ہوگی جن کا تعلق خدا کے حقوق سے ہے بلکہ ان تمام اعمال کے متعلق بھی باز پرس ہوگی جن کا تعلق مخلوقات کے حقوق سے ہے یعنی جس طرح نماز، روزہ وغیرہ کے متعلق محاسبہ ہوگا اسی طرح آپس کے معاملات میں انسان کا دنیاوی زندگی میں کیا حال رہا ہے۔ اس کا بھی جائزہ لیا جائے گا اور اس پر بھی جزا یا سزا دی جائے گی۔ اسی بنا پر

لین دین اور ناپ تول میں زیادتی اور ناانصافی کا ذکر کر کے دریافت فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگ کیا روز حساب پر ایمان ولیقین نہیں رکھتے ؟ ان آیاتِ کریمہ میں اگرچہ صرف ناپ تول ہی کا ذکر ہے اس لئے کہ یہ چیزیں انسان کی ممتدنی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں لیکن ضمنی طور پر اس سے سارے ہی حقوق عباد کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے اس لئے کہ ناپ تول میں جو بات گناہ اور لائق سزا ہے وہ یہی تو ہے کہ انسان ناجائز طریقہ سے نفع حاصل کرے اور دوسرے کے حق پر بغیر استحقاق خود قبضہ کرلے یعنی خدا نے انسانوں کو باہمی معاملوں میں ہر ایک کے جو حقوق اور حدیں مقرر کر دی ہیں ان حقوق اور حدوں سے تجاوز کیا جائے اور ان کی خلاف ورزی کیجائے تو پھر آپس کے سارے ہی معاملات میں یہی صورت ہوگی اور باہمی تمام حقوق کی خلاف ورزی جرم ، گناہ اور قیامت میں قابل سزا ہوگی چاہے وہ انسانی زندگی کے کسی شعبہ سے تعلق رکھتی ہو۔

حقوق عباد کی اسی عام بنیادی خلاف ورزی کی طرف آخری آیات میں اشارہ موجود ہے "وَمَا يُكَذِّبُ بِهِ إِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ أَثِيمٍ ۝ إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِ آيَاتُنَا قَالَ أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ۝ روز جزا کو وہی شخص جھٹلاتا ہے جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے گذر جاتا ہے اور اُن کی خلاف ورزی کرتا ہے اور آیاتِ الٰہیہ کو سن کر کہتا ہے کہ یہ سب من گھڑت قصے اور کہانیاں ہیں - قرآن حکیم میں اکثر مقامات پر اسی طرح خطاب ہوا ہے یعنی بظاہر اس کا رخ کسی خاص واقعہ یا کسی خاص شخص کی طرف ہوتا ہے مگر درحقیقت اس کا مفاد پورے عالم انسانیت کے لیئے عام ہوتا ہے جیسا کہ یہاں ہے۔

اکثر مفسرین کے نزدیک یہ سورہ مبارکہ مدینہ میں نازل ہوا تھا اور اس کی شانِ نزول اس طرح بیان کی جاتی ہے کہ جب سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم مدینہ میں تشریف لائے تو ملاحظہ فرمایا کہ وہاں کے لوگ ناپ تول میں بددیانتی کرتے ہیں تو اُن کی تنبیہہ کے لیئے یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

یوں تو اسلام نے معمولی سے معمولی ناجائز معاملہ کی بھی تشریح کر دی ہے اور کوئی ایسا معاملہ نہیں ہے جس کی قانونی اور اخلاقی حیثیت سمجھنے کے لیئے قرآن اور

حدیث اور سیرت طیبہ سرورِ انبیاء میں کوئی نہ کوئی بنیاد نہ ملتی ہو مگران تمام امور میں ناپ تول کے معاملات نسبتاً کافی اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لیئے کہ ان سے ہر شخص ہی کو کام پڑتا رہتا ہے اور ان میں بدمعاملگی اور بددیانتی کرنا یقیناً حقوق عباد پر بہت بڑا ظلم ہے اور اس قانونِ عدل وانصاف کے منافی ہے جس کا پرچم بلند کرنے کے لیئے اسلام دنیا میں آیا ہے۔

قرآن حکیم نے اس سے بچنے کی بڑی شدت سے تاکید کی ہے سورۂ رحمٰن میں خدا کا ارشاد ہے "وَاَقِیْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِیْزَانَ" انصاف کے ساتھ سیدھی ترازو تولو اور تول مت گھٹاؤ۔

سورۂ ھود میں خدا نے حضرت شعیبؑ کے قول کو بیان فرمایا ہے۔ ناپ اور تول میں کمی نہ کرو۔ اس وقت تو میں تمہیں اطمینان کی حالت میں دیکھتا ہوں مگر ساتھ ہی تمہارے لیئے ایک گھیر لینے والے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ اے میری قوم انصاف کے ساتھ پوری ناپ تول کیا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں گھٹا کر نہ دو اور زمین میں فساد پھیلاتے نہ پھرو۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ناپ تول میں بددیانتی کرکے خود فائدہ اٹھانے اور مخلوق خدا کو نقصان پہنچانے سے برکت جاتی رہتی ہے اور یہ بدترین گناہ عذاب خداوندی کا پیش خیمہ بن جاتا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشاد ہوا ہے:

"وَاَوْفُوا الْکَیْلَ اِذَا کِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِیْمِ ذٰلِکَ خَیْرٌ وَّاَحْسَنُ تَاْوِیْلًا"

جب تم ناپو تو ناپ پوری کیا کرو اور سیدھی ترازو سے تولو انجام کے لحاظ سے یہی طریقہ اچھا ہے۔ آیت کا آخری جملہ بتاتا ہے کہ ناپ تول میں بے ایمانی اور بددیانتی ابتدا میں کیسا ہی فائدہ پہنچائے مگر وہ صرف وقتی فائدہ ہوگا اور نتیجہ میں تباہی اور بربادی کے سوا کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔

ناپ تول میں بے ایمانی اور خیانت کے مفہوم میں وہ بے ایمانی اور بددیانتی بھی یقیناً داخل ہے جہاں پیمانہ اور وزن تو بظاہر پورا ہو لیکن اصلی مال میں کسی دوسری چیز کی ملاوٹ کر دی جائے اور اس طرح دوسرے کو دھوکا دے کر اس کے حق سے اسے محروم کیا جائے۔ اور اصلی مال کی تول اور ناپ کم ہو۔ یہ تمام باتیں حقوقِ

عباد پر ظلم ہیں، بدترین گناہ، اور خدا کی ناراضی اور اس کے قہر و غضب کا باعث ہیں۔ درحقیقت اسلامی تعلیم کی تمام تر بنیاد جس قانون پر ہے وہ قانونِ عدل و انصاف ہے اور اس کی غرض یہ ہے کہ جس کا جو حق ہو وہ اسے دیا جائے اور ناجائز طریقہ پر اپنی حد سے کبھی آگے نہ بڑھا جائے اسی بنا پر جس عمل میں انصاف اور عدل نہ ہوگا وہ قطعاً اسلام کے منافی ہوگا۔ وَمَا یُکَذِّبُ بِهٖۤ اِلَّا کُلُّ مُعْتَدٍ اَثِیْمٍ! بلاشبہ الٰہی حدوں کی خلاف ورزی، دھوکا اور فریب، ظلم و ستم مکر و دغا، چوری اور خیانت اور اسی طرح کے دوسرے گناہ اسی وجہ سے ہوتے ہیں کہ انسان کو اس کا یقین نہیں ہوتا کہ اس کے اعمال کی دیکھنے والی آنکھیں ہر وقت کھلی رہتی ہیں۔ اس کا ہر قول و فعل الٰہی عدل و انصاف کی ترازو میں تولا جاتا ہے اور ایک ایسا دن آنے والا ہے جب خدا کے سامنے حاضر ہو کر اس کو اپنے اعمال کا پورا پورا حساب دینا ہوگا۔

(درس ۱۸۶)

کَلَّا بَلْ سکتہ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ ○ کَلَّاۤ اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ یَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ ○ ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْمِ ○ ثُمَّ یُقَالُ هٰذَا الَّذِیْ کُنْتُمْ بِهٖ تُکَذِّبُوْنَ ○ کَلَّاۤ اِنَّ کِتٰبَ الْاَبْرَارِ لَفِیْ عِلِّیِّیْنَ ○ وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّیُّوْنَ ○ کِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ○ یَّشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ ○

(پارہ ۳۰ رکوع ۸ کی درمیانی ۸ آیات، سورۃ المطففین)

ترجمہ: ہرگز ایسا نہیں بلکہ ان کے دلوں پر ان کے اعمال کا زنگ بیٹھ گیا ہے۔ ہرگز ایسا نہیں یہ لوگ اُس دن اپنے پروردگار سے روک دیے جائیں گے پھر یقیناً وہ دوزخ میں داخل ہوں گے پھر کہا جائے گا کہ یہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔ ہرگز ایسا نہیں۔ نیک لوگوں کا نامۂ عمل علیین میں رہے گا اور تم کو کیا معلوم کہ علیین کیا ہے وہ ایک لکھا ہوا دفتر ہے جس کو خدا کے مقرب فرشتے دیکھتے ہیں۔

ترجمہ کے بعد اب بعض لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے:۔

"بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ" میں "رَانَ" کا لفظ "رَیْن" سے بنایا گیا ہے جب مصدر کے طور پر بولا جائے تو اس کے معنی غالب ہو جانے کے ہوتے ہیں اور جب اسم کے

تو اس کے معنی میل یا زنگ کے ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے دلوں پر بداعمالی اور گناہوں کا زنگ چڑھ گیا ہے اور اب وہ نیکی و بدی میں تمیز نہیں کر سکتے۔ "محجوب" حجاب سے اسم مفعول ہے۔ اُس کے لئے بولا جاتا ہے جسے چھپا دیا جائے یا کسی بات سے روک دیا جائے۔

"اِنَّھُمْ لَصَالُوا الْجَحِیْم" میں "صَالُوا" اسم فاعل جمع کا صیغہ ہے۔ "نون" جحیم کی طرف اضافت کی وجہ سے گر گیا۔ اس کا مصدر صِلاء، صَلْیٌ اور صُلِیٌّ آتا ہے اس کے معنی ہیں آگ یا کسی چیز کی شدت اور سختی برداشت کرنا۔ مُراد یہ ہے کہ ایسے بداعمال اور گناہگار لوگ یقیناً دوزخ میں ڈالے جائیں گے اور اُس کی آگ کے شعلوں کا مزہ چکھیں گے۔

"جحیم" دوزخ کا ایک نام ہے۔ یہ لفظ جَحْمٌ سے بنا ہے۔ معنی ہیں آگ جلنا۔ جحمۃ النار آگ بھڑکنے کو کہتے ہیں۔ عِلِّیُّون میں بھی سجّین کی طرح مفسرین کے کئی قول ہیں۔ بعض کے نزدیک یہ جنّت کے سب سے بلند اور اعلیٰ مقام کا نام ہے جس طرح سجّین دوزخ کی سب سے زیادہ تکلیف دہ جگہ کا نام ہے اور اس صورت میں علیّون کو "کتاب" اس مناسبت سے کہا جائیگا کہ وہ جنّت کے اس اعلیٰ مقام کے ملنے کا سبب ہے۔ غرض وہ کتاب مرقوم ہے یعنی ایک ایسا دفتر ہے جس میں نیک لوگوں کے اعمال لکھے ہوتے ہوں گے اور وہ اپنے مرتبوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے ہوں گے۔

كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ کفار جو کچھ کہتے اور سمجھتے ہیں وہ سب بے اصل اور باطل ہے۔ وہ دینِ خدا اور آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرتے ہیں، کتاب اللہ کو جھٹلاتے ہیں، رسول اللہ کے حکم سے سرکشی کرتے ہیں، جنّت و دوزخ اور روزِ جزا کا مذاق اُڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سب باتیں بنائی ہوئی کہانیاں ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ گناہوں اور بداعمالیوں کا زنگ اُن کے دلوں پر چڑھ چکا ہے اور اب وہ اس قابل ہی نہ رہے کہ حق اور سچائی کی باتوں کو سمجھ سکیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو اُس کے دل میں ایک سیاہ نقطہ سا پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اگر وہ توبہ اور استغفار سچے دل سے کر لیتا ہے تو وہ مٹ جاتا ہے اور اُس کا دل پاک اور صاف ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ توبہ نہیں کرتا اور بار بار گناہ کرتا رہتا ہے تو وہ نقطہ بھی پھیلتا رہتا ہے اور آخر میں اُس کے پورے قلب کو گھیر لیتا ہے اور اُس کو سیاہ کر دیتا ہے جس کے بعد اُس میں حق و

باطل کے درمیان تمیز کرنے اور حق بات کو سمجھنے کی صلاحیت بالکل ہی ختم ہو جاتی ہے۔

غرض دل کی صفائی اور پاکیزگی نیک اعمال اور خدا کی اطاعت اور عبادت سے حاصل ہوتی ہے اور برے عمل اس کی اس صفائی اور پاکیزگی کو ختم کر کے اسے گندہ، ناپاک اور سیاہ کر دیتے ہیں اور وہ اس آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے جس پر گرد و غبار کی موٹی تہیں جم گئی ہوں اور کسی چیز کا عکس اس میں ظاہر نہ ہو سکتا ہو۔

اسی حالت کو دوسرے لفظوں میں "قلب کی موت" بھی کہا جاتا ہے اور ایسے لوگ جنکے دلوں میں حق کی معرفت نہ ہو اور جو اپنی عقل اور اپنے فہم و شعور سے صحیح طریقہ پر فائدہ نہ اٹھائیں انھیں بھی مردہ کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں خدا کا ارشاد ہے۔

وَمَا يَسْتَوِي الْأَحْيَاءُ وَلَا الْأَمْوَاتُ (سورۂ فاطر) زندہ لوگ یعنی صاحبان ایمان اور مردے یعنی کافر و مشرک اور جاہل آپس میں برابر نہیں ہوا کرتے۔

ابھی جس حدیث کا ذکر کیا گیا اس پر غور کرنے سے یہ بات بھی صاف طریقہ پر سمجھ میں آتی ہے کہ کسی معمولی سے معمولی اور چھوٹے سے چھوٹے گناہ کی بھی بڑی اہمیت ہے اور اگر اس کی طرف سے لاپروائی اور غفلت برتی جاتی ہے اور توبہ و استغفار کے ذریعہ اس کا اثر مٹانے کی سعی نہیں کی جاتی تو پھر وہ بڑھ کر شدت اختیار کر لیتا ہے اور بڑا گناہ بن جاتا ہے اور نتیجہ میں نفس کی ہلاکت اور بربادی کے سوا اور کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا اس لئے ضروری ہے کہ ہر شخص کسی گناہ کو بھی کبھی چھوٹا اور معمولی نہ سمجھے اور خدا کی بارگاہ میں توبہ اور استغفار کے ذریعہ اس کے اثر کو جلدی سے مٹا دے ورنہ غفلت اس گناہ کی آگ کو اندر ہی اندر تیز کرتی جائے گی اور پھر کچھ ہی عرصہ میں اس کی اصلاح اور علاج ممکن نہ رہے گا اور بدنصیبی اور تباہی اسے ہر طرف سے گھیر لیگی۔ پھر توبہ بھی اس کا نام تو نہیں ہے کہ انسان گناہ بھی کرتا جائے اور ساتھ ساتھ توبہ بھی کرتا جائے یا گناہ اطمینان سے کرتا ہے اور سمجھ لے کہ جب مرنے لگوں گا تو توبہ کر لوں گا۔ یہ عمل درحقیقت توبہ سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں رکھتا بلکہ یہ تو احکام خداوندی اور رب العالمین کی ذات اقدس کی تضحیک اور توہین ہے اور ایسے سرکش انسانوں کا جو بھی حشر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ سورۂ نساء میں خدا کا ارشاد ہے: إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوبُونَ مِنْ قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ یعنی

توبہ تو صرف اُن ہی لوگوں کی ٹھیک ہے جو نادانی اور جہالت میں گناہ کر بیٹھیں اور پھر جلدی سے نادم ہو کر سچے دل سے توبہ کریں تو اللہ خدا بھی ایسے ہی لوگوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔ غرض گناہ کا زنگ اُسی استغفار اور اُسی توبہ سے دُور کیا جا سکتا ہے جو خلوص دل کے ساتھ ہو اور جس کے ساتھ یہ پکا عہد و پیمان ہو کہ اب ہم خدا کی نافرمانی کبھی نہیں کرینگے۔

(درس ۱۸۷)

إِنَّ الْأَبْرَارَ لَفِي نَعِيمٍ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ تَعْرِفُ فِي وُجُوهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيمِ ۝ يُسْقَوْنَ مِن رَّحِيقٍ مَّخْتُومٍ ۝ خِتَامُهُ مِسْكٌ ۚ وَفِي ذَٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُونَ ۝ وَمِزَاجُهُ مِن تَسْنِيمٍ ۝ عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُونَ ۝ إِنَّ الَّذِينَ أَجْرَمُوا كَانُوا مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا يَضْحَكُونَ ۝ وَإِذَا مَرُّوا بِهِمْ يَتَغَامَزُونَ ۝ وَإِذَا انقَلَبُوا إِلَىٰ أَهْلِهِمُ انقَلَبُوا فَكِهِينَ ۝ وَإِذَا رَأَوْهُمْ قَالُوا إِنَّ هَٰؤُلَاءِ لَضَالُّونَ ۝ وَمَا أُرْسِلُوا عَلَيْهِمْ حَافِظِينَ ۝ فَالْيَوْمَ الَّذِينَ آمَنُوا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُونَ ۝ عَلَى الْأَرَائِكِ يَنظُرُونَ ۝ هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۸ کی آخری ۱۵ آیات۔ سورۃ المطففین)

ترجمہ:- بیشک نیک لوگ بڑے آرام میں ہوں گے مسہریوں پر بیٹھے دیکھ رہے ہوں گے تم ان کے چہروں سے آرام کی تازگی پہچان لو گے اُن کو مہر لگی ہوئی رحیق پلائی جائے گی جس کی مہر مشک کی ہوگی رغبت کرنے والوں کو ایسی ہی چیز کی طرف رغبت کرنا چاہئے اور اُس میں تسنیم کے پانی کی آمیزش ہوگی وہ ایک چشمہ ہے جس کا پانی (خدا کے) مقرب بندے پیئیں گے بلاشبہ جو لوگ مجرم تھے وہ ایمان والوں کی ہنسی اڑایا کرتے تھے اور جب اُن کے سامنے سے ہو کر گزرتے تھے تو آپس میں آنکھوں سے اشارے کرتے تھے اور جب اپنے گھروں کی طرف پلٹ کر جاتے تھے تو دل لگیاں کرتے تھے اور جب اُن ایمان والوں کو دیکھتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ لوگ یقیناً گمراہ ہیں حالانکہ یہ اُن پر نگہبان بنا کر تو نہیں بھیجے گئے تھے تو آج ایمان والے کافروں پر ہنستے ہیں مسہریوں پر بیٹھے نظارہ کر رہے ہیں کہ اب تو کافروں کو انکے اعمال کا خوب بدلہ مل گیا۔

ترجمہ کے بعد اب کچھ لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

"ارائک" اریکہ کی جمع ہے۔ یہ لفظ سجے ہوئے تخت یا مسہری وغیرہ کے لئے بولا جاتا ہے

جس پر چھت اور پردہ ہو اس کا نام "حَجَلَہ" بھی ہے جسے شادی کے موقع پر عروس کے لئے سجاتے ہیں "نعیم" سے نعمت و آرام کی زیادتی مراد ہے۔ نَضْرَۃٌ تازگی اور رونق کو کہتے ہیں۔
"رحیق" انگور اور کھجور وغیرہ کے خاص رس کو کہتے ہیں جو خالص ہو اور ہر قسم کی آمیزش سے پاک وصاف ہو۔ "مختوم" ختمٌ سے بنایا گیا ہے اس کے معنی تمام کرنے یا مہر لگانے کے ہیں۔ مختوم سے مراد وہ چیز ہے جس پر مُہر لگی ہوئی ہو۔ حضرت ابن مسعودؓ نے یہاں پر اس لفظ سے مخلوط یعنی "ملے ہوئے" کے معنی مراد لئے ہیں۔ "ختام" مصدر بھی ہے یعنی تمام کرنا یا مُہر لگانا اور اسم بھی ہے یعنی خاتمہ، یا وہ چیز جس پر مُہر جمائی جاتی ہے جیسے موم یا لاکھ۔ بعض کے نزدیک اس کے معنی آمیزش کے ہیں۔ "یَتَنَافَسُ" نَفْسٌ اور نَفَاسَۃٌ سے بنا ہے۔ معنی ہیں کسی شی کا خود نفیس اور مرغوب ہونا یا کسی نفیس شی کی طرف شدت سے رغبت کرنا۔ "تَنَافُسٌ" میں اس رغبت کیساتھ باہم مقابلہ بھی مراد ہوتا ہے۔
"یَتَغَامَزُوْنَ" "غَمْزٌ" سے بنا ہے اس کے معنی ہیں کسی چیز کو ہاتھ سے دبانا یا کسی کا عیب ظاہر کرنے کے لئے آنکھ یا ابرو سے اشارہ کرنا۔ "تَغَامُزٌ" آپس میں ایک دوسرے کی طرف کسی کی بُرائی ظاہر کرنے کے لئے اشارے کرنا۔ مزاج "مَزْجٌ" کی طرح مصدر بھی ہے۔ اس کے معنی ہیں آمیزش کرنا، اور کبھی یہ اسم بھی ہوتا ہے یعنی وہ چیز جس کی آمیزش کی جائے۔ اس کے معنی علم طب کی اصطلاح میں طبیعت یا اُس خاص کیفیت کے ہوتے ہیں جو چند چیزوں کے باہم ملنے سے پیدا ہوتی ہے مگر یہاں یہ مراد نہیں ہے۔
"فَکِھِیْنَ" فَکِہٌ کی جمع ہے۔ اس کا اسم فُکَاھَۃٌ ہے اور معنی ہیں خوش طبعی، ہنسی مذاق اور مسخرہ پن اور کبھی اترانے کے لئے بھی بولتے ہیں۔ "ثُوِّبَ" کا مصدر "تثویب" ہے۔ یہ "ثواب" سے بنا ہے۔ ثواب۔ عمل کے بدلہ کو کہتے ہیں خواہ وہ بدلہ اچھا ہو یا برا ہو۔ دوسرے لفظوں میں "ثوابٌ" کے معنی جزا اور سزا دونوں ہی کے ہیں مگر عام طور پر اسکو جزا یعنی اچھے بدلہ ہی کے لئے بولتے ہیں البتہ اس آیت میں اس لفظ کو سزا دینے ہی کے معنی میں بولا گیا ہے۔
گناہگاروں کا حشر بیان کرنے کے بعد اب نیک عمل کرنے والوں کے مرتبہ کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ وہ جنّت کے بلند ترین مقام پر ہوں گے جو سجّین کے برعکس ہے کیونکہ وہ جہنّم کی پست ترین جگہ ہے۔ پھر اس مقام کی بزرگی اور بلندی زیادہ واضح کرنے کے لئے فرمایا گیا ہے: اے رسُول

تم کو کیا معلوم کہ علیین کیا ہے۔ یہ بھی اُس جگہ کی عظمت اور بلندی کے بیان کرنے کا ایک خوبصورت انداز ہے کہ اپنے حبیب خاص سے اس طرح خطاب کیا گیا تاکہ سننے والے اس مقام کی جلالت کا کسی حد تک اندازہ کر سکیں ورنہ ظاہر ہے کہ حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس مقام کی بلندی اور اُس کی شان و شوکت سے واقف تھے۔ اس طرح کا خطاب سرور کائنات سے اور مقامات پر بھی فرمایا گیا ہے۔ جیسے سورۂ انفطار میں ہے: وَمَا اَدْرٰىكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ تم کو کیا معلوم کہ روزِ جزا کیا ہے یا دوسری جگہ ان الفاظ میں: وَمَا اَدْرٰىكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ۔ تمہیں کیا خبر کہ شبِ قدر کیا چیز ہے۔ اس قسم کے خطاب کرنے سے مقصود یہی ہے کہ خود اُس چیز کی بڑائی اور عظمت ظاہر کی جائے ورنہ آنحضرتؐ ہر بات سے واقف تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ نیک عمل کرنے والے ایسی نعمتوں میں ہوں گے جو بے شمار ہوں گی اور ہمیشہ رہیں گی اور خدا کے نیک اور صالح بندے اپنی انتہائی حسین و جمیل آرامگاہوں میں بیٹھے ہوئے اس فضل و کرم اور بخشش و عطا کا نظارہ کریں گے اور خوش ہوں گے۔ اُن کے چہرے ایسے ترو تازہ اور پرنور ہوں گے کہ اگر کوئی دیکھے تو بس ایک ہی نظر میں سمجھ لے کہ یہ لوگ بڑے آرام و راحت میں ہیں یہ سب کچھ اُس نیک عمل کی جزا ہوگی جو دنیا کی زندگی میں وہ کرتے رہے اور یہ تمام نعمتیں اور راحتیں ان تکلیفوں کے بدلہ میں عطا کی جائیں گی جنہیں وہ خدا کی راہ میں برداشت کرتے رہے۔ پھر کچھ نعمتوں کی تفصیل بھی بتائی گئی ہے کہ اور نعمتوں کا کیا ذکر ہے۔ اُن کے پینے کے لئے جو مشروب ہوگا اُس پر جنتی مشک کی مہر اور اس کی آمیزش ہوگی، وہ چاندی کی طرح جھلکتا ہوا سفید ہوگا اور اُس کی خوشبو کا یہ عالم ہوگا کہ اگر اُس کا بہت معمولی سا حصّہ دنیا میں آجائے تو ساری دُنیا اُس سے مہک اُٹھے اور اس رحیقِ جنت میں چشمۂ تسنیم کے پانی کی آمیزش بھی ہوگی یہ وہ بہترین چشمۂ خلد بریں ہے جس کا پانی صرف وہی خاصانِ خدا پئیں گے جو اُس کی بارگاہ میں مقرّب ہوں گے۔ آخر میں اُن کافروں اور دینِ حق کے منکروں کا حال بیان ہوا ہے جو دنیا میں اہلِ حق کی ہمیشہ توہین و تذلیل کرتے رہے اور آیاتِ الٰہیہ کا مذاق اُڑاتے اور یہ سمجھتے رہے کہ دُنیا کی یہ فانی دولت و عزت ہی سب کچھ ہے۔ اور ہم اپنے اعمال میں ہر طرح آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ جس پر چاہیں ظلم کریں، جسے چاہیں ذلیل کریں جس کا چاہیں حق چھین لیں نہ کوئی پوچھنے والا ہے اور نہ ہمیں کہیں اپنے ان اعمال کا جواب دینا ہے اور نہ ان گناہوں کی سزا بھگتنا ہے۔ اُن لوگوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم اس خیالِ خام میں نہ رہو اور اس کا

یقین رکھو کہ یوم حساب ضرور آنے والا ہے اور اس دن رب العالمین اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والوں کو اُن کے عمل کا پورا بدلہ دے دیا جائے گا۔

(درس ۱۸۸)

إِذَا السَّمَاءُ انشَقَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ وَإِذَا الْأَرْضُ مُدَّتْ ۝ وَأَلْقَتْ مَا فِيهَا وَتَخَلَّتْ ۝ وَأَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ ۝ يَا أَيُّهَا الْإِنسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ ۝ فَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ بِيَمِينِهِ ۝ فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَسِيرًا ۝ وَيَنقَلِبُ إِلَىٰ أَهْلِهِ مَسْرُورًا ۝ وَأَمَّا مَنْ أُوتِيَ كِتَابَهُ وَرَاءَ ظَهْرِهِ ۝ فَسَوْفَ يَدْعُو ثُبُورًا ۝ وَيَصْلَىٰ سَعِيرًا ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۹ کی ابتدائی ۱۲ آیات۔ سورۂ انشقاق)

ترجمہ:- جب آسمان پھٹ جائے گا اور اپنے پروردگار کا حکم اچھی طرح سُن لیگا اور اس کے لئے یہی سزاوار ہے اور جب زمین کھینچ کر پھیلا دی جائے گی اور جو کچھ اس کے اندر ہے اُس کو وہ اُگل دے گی اور خالی ہو جائے گی اور اپنے پروردگار کا حکم اچھی طرح سُن لے گی اور اس کے لئے یہی سزاوار ہے۔

اے انسان تو اپنے پروردگار کے پاس پہنچنے تک کام میں مشغول ہے پھر اس سے ملنے والا ہے تو جس شخص کا نامۂ عمل اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائے گا اُس سے تو حساب آسانی کے ساتھ کیا جائے گا اور وہ اپنے لوگوں کی طرف خوش خوش پلٹ آئے گا اور جس شخص کا نامۂ عمل اُس کی پیٹھ کے پیچھے سے دیا جائے گا تو وہ موت کو پکارنے لگے گا اور جہنم میں داخل ہوگا۔

ترجمہ کے بعد اب بعض لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

"اِنْشَقَّتْ" کا اصلی مادہ "شَقٌّ" ہے معنی ہیں کسی چیز کو پھاڑنا "انشقاق" پھٹ جانے کو کہتے ہیں۔ اس مصدر سے اور بہت سی لفظیں بنتی ہیں جو محلِ استعمال اور معنی کے لحاظ سے الگ الگ ہیں "اَذِنَتْ" اَذْنٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی کان لگا کر سُننے کے ہیں جب اسے "لام" یا "الیٰ" کے ساتھ ملاکر بولا جائے۔ حُقَّتْ۔ حَقٌّ سے بنا ہے۔ اس کے مصدری معنی ہیں سزاوار ہونا، لائق ہونا، ضروری اور لازم ہونا۔ جب یہ اسم ہو تو بہت سے

معنی ہو جاتے ہیں جن میں سے ایک معنی ہیں "صحیح اور درست"۔ "مُدَّتْ" کا مصدر "مَدّ" ہے۔ معنی ہیں کھینچنا اور پھیلانا۔ مطلب یہ ہے کہ محشر میں زمین پھیلا دی جائے گی اور ساری بلندیاں اور پہاڑ برابر کر دئے جائیں گے۔

"تَخَلَّتْ" کی بنا "خُلُوّ" سے ہوئی ہے۔ "تخلّی" کے معنی ہیں پوری طرح خالی ہو جانا۔ "کَادِحٌ" کا مصدر "کَدْح" ہے۔ اس کے معنی ہیں سخت کوشش کرنا خواہ یہ کوشش اچھے مقصد کے لئے ہو یا بُری غرض کے لئے۔ مُراد یہ ہے کہ بارگاہِ خداوندی تک پہنچنے سے پہلے ہر شخص زندگی کی جدوجہد میں مشغول رہا کرتا ہے۔ کوئی خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے کاموں میں سعی اور کوشش کرتا ہے اور کوئی معصیت اور اس کی نافرمانی میں اپنی جان کھپاتا رہتا ہے مگر آخر میں اپنے خالق کے حضور میں سب ہی کو جانا ہے اور جیسا جس کا عمل ہو گا اس کا نتیجہ اس وقت اس کے سامنے آجائے گا۔ "یمین" کے کئی معنی ہیں۔ داہنے رخ کو بھی کہتے ہیں اور داہنے ہاتھ کو بھی۔ خیر و برکت اور قسم یا عہد و پیمان جو بذریعہ قسم ہو اس کو بھی کہتے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں "یَسار" بائیں کو کہا جاتا ہے۔ یہاں "یمین" سے مراد داہنا ہاتھ ہے۔ "ثبُور" مصدر بھی ہے اور معنی ہیں ہلاک یا تباہ ہو جانا۔ اور اسم بھی ہے جس کے معنی ہیں: نقصان، بربادی اور ہلاکت۔ "سَعِیْر" "سَعْر" سے بنا ہے جس کے معنی آگ بھڑکانے کے ہیں۔ "سعیر" آگ کے شعلہ کو اور بھڑکتی ہوئی آگ کو کہا جاتا ہے۔ یہاں مراد جہنّم ہے۔

غرض ارشاد خداوندی ہے کہ جب قیامت کا دن ہو گا تو آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیگا اور اس طرح وہ مشیت الٰہی کی تعمیل کرے گا اور زمین کو پھیلا کر بڑا کر دیا جائے گا اور پہاڑ وغیرہ سب برابر کر دئے جائیں گے تاکہ اوّلین و آخرین سب ایک جگہ اور ایک وقت میں جمع کئے جاسکیں۔ اس وقت زمین اپنے سارے خزانے اور تمام مُردے اگل دے گی اور اس طرح جو کچھ خدا کا حکم ہو گا اس کی فوراً تعمیل کرے گی۔ اس کے بعد ان آیات میں انسان کو سمجھایا گیا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کے حضور میں پہنچنے تک زندگی بھر اچھے اور بُرے اعمال کرتا رہتا ہے اور اسی دوڑ دھوپ میں زندگی کے دن پورے کر دیتا ہے بالآخر وہ گھڑی آہی جاتی ہے جس کو وہ کسی طاقت اور قوت سے ٹال نہیں سکتا یعنی موت کا وقت اور فرشتۂ مرگ کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دینے اور اس کے حکم اور ارادہ پر عمل کرنے کے سوا اس کے لئے کوئی اور

راستہ باقی نہیں رہتا۔ پھر اُس دن کو بھی ضرور آنا ہے جب انسان کے اچھے اور بُرے تمام
اعمال کا نتیجہ سامنے آجائے گا جو اُس نے دُنیا کی حیات میں کیئے تھے۔ اُس دن جس شخص کا
نامۂ عمل اُس کے داہنے ہاتھ میں دیا جائیگا اُس سے بہت آسان طریقہ پر حساب لیا جائے گا
اور جب وہ اپنے حساب سے فارغ ہو جائے گا تو بڑے اطمینان اور خوشی کے ساتھ اپنے
متعلقین اور اہلِ ایمان کی طرف پلٹ آئے گا۔ محاسبہ کی یہ آسانی اور نرمی جس کی طرف
آیۂ کریمہ میں اشارہ ہے کئی طریقوں سے ممکن ہوگی۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی
شخص پر عذاب بالکل ہی نہ کیا جائے اور اُس کا نامۂ عمل دیکھ کر ہی اُسے چھوڑ دیا جائے اور ایک
یہ بھی ہے کہ اُسے بہت معمولی سی تنبیہہ کر دی جائے اور سزا میں نہ تو شدّت ہو اور نہ ہمیشگی اور
دوام پایا جائے۔ محاسبۂ اُخروی میں سہولت اور نرمی کے یہ درجے ہر شخص کے نیک
اعمال اور ایمانی مرتبہ کے مطابق ہوں گے۔

یہ تو اُن خوش نصیب لوگوں کا ذکر تھا جو دُنیا میں اپنی عقل اور شعور سے درست طریقہ
پر کام لیں گے اور زبان سے بھی حق کا اقرار کریں گے، دل سے بھی اس کی تصدیق کریں گے
اور اسی کے مطابق اُن کا عمل بھی ہوگا۔ اقرار، اعتقاد اور عمل کی باہمی یکسانیت اور ان سب
باتوں کا درست، صحیح اور حکمِ خدا کے موافق ہونا ہی کسی شخص کے ایمان کا ثبوت اور آخرت کے حساب
اور پرسش اعمال میں نجات اور کامیابی کا وسیلہ ثابت ہوگا ورنہ ظاہر ہے کہ "کتاب" یعنی
نامۂ عمل سے اس جگہ صرف کتابِ تخیلات و افکار اور محض نامۂ اعتقادات و نظریات مراد نہیں
ہے بلکہ اعمال اور افعال کی تفصیل کا دفتر مقصود ہے ایسے اعمال جو حق یا باطل عقیدہ اور
بری یا اچھی نیت و ارادہ کے ساتھ وجود میں آئے ہوں اور ان ہی اعمال کی بنیاد پر جزا یا سزا
کا فیصلہ ہوگا اور یہی نامۂ عمل ہوگا جو کسی شخص کے ایمان یا کفر کا معیار اور کسوٹی
بن سکے گا۔ اس تذکرہ کے بعد پھر ان لوگوں کا ذکر فرمایا گیا ہے جن کا نامۂ عمل اُنکی پیٹھ کے
پیچھے سے اُنکے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا۔ اس کے ملنے کا یہ عنوان اس بات کی علامت
ہوگا کہ اب اُن کی سزا اور عذاب مقرر ہو چکا ہے اور عنقریب وہ آتشِ جہنم کے سپرد کر دیئے
جائیں گے۔ اُس مایوسی اور نا اُمیدی کے عالم میں یہ گمراہ لوگ گھبرا گھبرا کر موت کو پکارنے لگیں گے
تاکہ وہ کسی طرح بھی اس عذاب سے بچ جائیں مگر اُن کی حسرت پوری نہ ہو گی اس لئے کہ محشر

اس دُنیا کی طرح نہیں ہے جہاں ظالموں اور مجرموں کو پناہ اور بچاؤ کے راستے مل جایا کرتے ہیں۔ وہ الٰہی عدل و انصاف کا وقت ہو گا اور فرمانِ خداوندی سے کسی مخلوق کے لئے بھی گریز اور مفر ممکن نہ ہو سکے گا۔

(درس ۱۸۹)

۲۲ اِنَّهٗ كَانَ فِیْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ۝ اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ یَّحُوْرَ ۝ بَلٰۤى ۚۛ اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِیْرًا ۝ فَلَاۤ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ ۝ وَ الَّیْلِ وَ مَا وَسَقَ ۝ وَ الْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ ۝ لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝ فَمَا لَهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ اِذَا قُرِئَ عَلَیْهِمُ الْقُرْاٰنُ لَا یَسْجُدُوْنَ ۝ؕ۩ بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُكَذِّبُوْنَ ۝ؗۖ وَ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ ۝ؗۖ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۹ کی آخری ۱۳ آیات۔ (سورۃ الانشقاق)

ترجمہ: یہ انسان اپنے اہل و عیال میں خوش رہتا تھا اس کا خیال تھا کہ خدا کی طرف لوٹ کر ہی نہ جائے گا ہاں۔ اِس کا پروردگار اسے خوب دیکھ رہا تھا۔ تو میں شفق کی قسم کھاتا ہوں اور رات، کی اور اُن چیزوں کی جن کو وہ سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی قسم جب وہ پورا ہو جائے کہ تم لوگ ضرور ایک حالت کے بعد دوسری حالت پر پہنچو گے۔ تو اُنہیں کیا ہو گیا کہ وہ ایمان نہیں لاتے اور جب اُن کے پاس قرآن پڑھا جاتا ہے تو وہ سجدہ نہیں کرتے بلکہ کافر اُس کی تکذیب کرتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے جو کچھ یہ لوگ دلوں میں رکھتے ہیں۔ تو اُن کو دردناک عذاب کی بشارت سُنا دو لیکن جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل کئے اُن کے لئے کبھی نہ ختم ہونے والا ثواب ہے۔

ترجمہ کے بعد کچھ لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے:۔

"یَحُوْرُ" کا مصدر "حَوْرٌ" ہے اس کے ایک معنی پلٹنے کے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ "لَاۤ اُقْسِمُ" میں "لَا" زیادہ ہے۔ اس جگہ پر اس کے معنی نفی اور انکار کے نہیں ہیں بلکہ یہ قسم کی تاکید کے لئے بولا گیا ہے تاکہ کلام میں زیادہ زور اور زیادہ حسن

پیدا ہو جائے۔ کلام عرب میں نثر اور نظم میں "لا" کا اس طرح استعمال کافی شہرت رکھتا ہے اور بہت فصیح و بلیغ سمجھا جاتا ہے۔

قرآنِ حکیم میں جا بجا اور بھی اس کی مثالیں موجود ہیں۔ "شَفَق" اُس سرخی کو کہتے ہیں جو سورج کے غروب ہو جانے کے بعد مغرب میں ظاہر ہوتی ہے۔ "وَسَقَ" کا مصدر "وَسْقٌ" ہے معنی ہیں سمیٹنا اور جمع کر لینا۔ مراد یہ ہے کہ روشنی میں جو چیزیں منتشر اور الگ الگ ہو جاتی ہیں وہ رات آنے پر اپنے مرکز کی طرف سمٹ آتی ہیں اور جمع ہو جاتی ہیں۔ بعض مفسرین نے اس کے معنی ڈھانکنے اور چھپانے کے لئے ہیں۔ "اِتَّسَقَ" بھی "وَسْقٌ" ہی سے بنا ہے اس کا مصدر "اِتِّسَاقٌ" ہے۔ معنی ہیں پورا اور کامل ہو جانا۔ یہ حالت چاند میں تقریباً تیرھویں رات سے سولھویں شب تک رہا کرتی ہے۔ "طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ" یہاں پر "طَبَقٌ" کے معنی حالت کے ہیں بعض لوگوں نے اور بھی معنی مراد لئے ہیں۔ "یُوْعُوْنَ" "وَعْیٌ" سے بنایا گیا ہے۔ معنی ہیں کسی بات کو سُن کر اُسے یاد رکھنا اور دل میں لے لینا یا کسی چیز کو جمع کرنا۔

"مَمْنُوْنٌ" کا مصدر "مَنٌّ" ہے اس کے ایک معنی قطع کرنے اور کاٹ ڈالنے کے ہیں اور یہاں یہی معنی مراد ہیں یعنی وہ ثواب ہمیشہ کے لئے ہو گا اور کبھی ختم نہ ہو گا۔ "ممنون" کا لفظ احسانمند کے لئے بھی بولتے ہیں جس کی اصل بھی "مَنٌّ" ہے مگر وہاں اس کے معنی احسان کرنے کے ہوتے ہیں اور کبھی اس کا مصدر اسی معنی میں "مِنَّۃٌ" بھی آتا ہے۔ ان آیات میں آیۂ سجدہ بھی ہے جسے پڑھکر یا سُنکر سجدہ کرنا چاہیئے۔ غرض قیامت کے دن وہ لوگ جن کے اعمال اچھے ہوں گے بہت آسان پوچھ گچھ کے بعد اور اُس سے فراغت پا کر خوش خوش پلٹ کر اپنے ساتھیوں سے جا ملیں گے، لیکن جن لوگوں کے اعمال بُرے ہوں گے انہیں عذابِ خداوندی گھیر لیگا اور وہ جہنم کے شعلوں میں جھونک دئیے جائیں گے۔ یہ بد اعمال لوگ دُنیا میں اپنے گھر والوں کے ساتھ خوشی اور مسرت میں مدہوش رہا کرتے تھے، عذابِ الہٰی سے بے خوف تھے، آخرت سے بے خبر تھے، سمجھ رہے تھے کہ موت کے بعد کوئی زندگی ہی ممکن نہیں، کوئی باز پرس اور پوچھ گچھ ہی نہ ہو گی، یہ زندگی کی لذّتوں میں مست رہا کرتے تھے۔ یہی لوگ ہیں جن کا نامۂ عمل اُن کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور یہ عذابِ قیامت کی ہولناکیوں سے ڈر کر موت کو پکارنے لگیں گے تاکہ کسی طرح انہیں اس عذاب سے چھٹکارا مل سکے۔

ان آیاتِ کریمہ میں سمجھایا گیا ہے کہ انسان کا کوئی عمل بھی خدا کے علم سے کبھی مخفی نہیں رہ سکتا

پھر ان بداعمالیوں کے بدلہ میں قیامت کے دن جو سزا ملے گی اس سے بچنا بھی کسی کے لئے ممکن نہ ہوگا اور سابقہ بھی جو کچھ سزا یا جزا دی جائے گی وہ سب الٰہی عدل و انصاف کے مطابق ہوگی جس میں ظلم و زیادتی اور کسی قسم کی غلطی ممکن نہ ہوگی۔ ان تمام باتوں کے سمجھا دینے کے بعد خدائے پاک نے **شفق** کی قسم کھائی ہے پھر رات کی قسم کھائی اور اُن تمام چیزوں کی جنہیں رات اپنے اندھیرے میں چھپاتی اور سمیٹ لیتی ہے اس کے بعد پورے چاند کی قسم کھائی اور فرمایا کہ تم سب بھی اسی طرح ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف پلٹتے رہو گے۔ اس دُنیا کی زندگی میں بھی اور موت آنے کے بعد قیامت کے آنے تک۔ یہاں تک کہ آخر میں تم سب کے سب خدا کے سامنے حاضر کئے جاؤ گے۔

کائنات کی ان چند خاص چیزوں کی قسم کھا کر اُن بدلتے ہوئے حالات اور اُن تغیرات اور انقلابات کی طرف انسان کو توجہ دلائی گئی ہے جو ان چیزوں میں نمایاں طور پر پائے جاتے ہیں۔ شام کے وقت دن کی روشنی ختم ہوتے ہی آسمان کے مغربی کنارہ پر شفق کی سرخی کا ظاہر ہونا، سورج کے نور کا نگاہوں سے اوجھل ہو جانا، رات کے اندھیرے کا فضا میں پھیلنا اور تھوڑے زمانہ کے لئے ساری خلقت پر خاموشی اور نیند کا چھا جانا۔ پھر کبھی کچھ راتوں میں چاندنی کا اُجالا اور کبھی بغیر چاند کی اندھیری راتیں۔ نور کے بعد تاریکی اور اندھیرے کے بعد روشنی۔ زندگی کی چہل پہل کے بعد نیند کے متوالوں کا چُپ ہو جانا اور رات کا بھیانک سناٹا پھر کچھ دیر کے بعد اندھیرے کا دُور ہو جانا، سوتی ہوئی مخلوق کا پھر سے جاگ اُٹھنا اور ڈوبے ہوئے سورج کا پھر سے طلوع کرنا۔ غرض یہ سب ایسے انقلابات ہیں جن سے انسان کی فکر و نظر کے سامنے بہت سی حقیقتیں آ جاتی ہیں۔ اُس کی زندگی بھی سورج اور دن کی روشنی کی طرح ہے اور اسی طرح اس میں بھی کمال و زوال ہے۔

اس زندگی کے سورج کا چھپ جانا موت ہے اور جس طرح شفق دن کے ختم ہو جانے کی علامت ہے اسی طرح انسان کی زندگی اور موت کی بھی کچھ نشانیاں ہیں۔ رات کا وقفہ گویا عالمِ برزخ کی مثال ہے اور بغیر چاند کی۔ اندھیری رات۔ بداعمال لوگوں کے لئے اُن کے اپنے زمانۂ برزخ کا نمونہ ہے اسی طرح شبِ ماہ یعنی چاندنی رات اُن لوگوں کے زمانۂ برزخ کی تصویر ہے جو اپنے ساتھ نیک اعمال کے چراغ لے گئے ہیں۔ پھر جب سورج صبح کو دوبارہ مشرق سے نکلتا ہے اور سوئی ہوئی دُنیا جاگ اُٹھتی تو یہ گویا مرنے کے بعد دوبارہ جلائے جانے کا نقشہ ہے۔ اس طرح خالقِ کائنات نے ان خاص چیزوں کی قسم کھا کر اپنی عظیم قدرت کی طرف توجہ دلائی ہے اور سمجھایا ہے کہ جو قدرت والا خدا ان **چیزوں**

پر اختیار اور اقتدار رکھتا ہے اور جس کے حکم اور مشیت سے یہ ساری باتیں ظہور میں آتی ہیں اُس کے لئے قیامت میں مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کرنا کیا مشکل ہے۔

(درس ۱۹۰)۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ ۙ﴿۱﴾ وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ ۙ﴿۲﴾ وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ ۭ﴿۳﴾ قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۙ﴿۴﴾ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۙ﴿۵﴾ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۙ﴿۶﴾ وَّهُمْ عَلٰي مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۭ﴿۷﴾ وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ ۙ﴿۸﴾ الَّذِيْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۭ﴿۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِيْقِ ۭ﴿۱۰﴾

(پارہ ۳۰۔ رکوع ۱۰ کی ابتدائی ۱۰ آیات۔ سورۃ البروج)

ترجمہ:۔ برجوں والے آسمان کی قسم اور اُس دن کی جس کا وعدہ کیا گیا ہے اور حاضر ہونے والے کی قسم اور اُس کی جس میں حاضری ہوتی ہے خندق کے کھودنے والے ہلاک کر دئے گئے۔ وہ ایندھن والی آگ تھی جس وقت وہ لوگ اُس کے آس پاس بیٹھے ہوئے تھے اور وہ جو کچھ مومنوں کے ساتھ کر رہے تھے اُس کو دیکھ رہے تھے۔ یہ لوگ ان مومنوں کی کسی اور بات کا بدلہ نہیں لے رہے تھے سوائے اس کے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے تھے جو غالب سزا وار حمد ہے جس کے لئے آسمانوں اور زمین کی سلطنت ہے اور اللہ ہر چیز سے خوب واقف ہے بیشک جن لوگوں نے مومن مردوں اور ایماندار عورتوں کو تکلیف پہنچائی پھر توبہ بھی نہ کی ان کیلئے جہنّم کا عذاب ہے اور اُن کے لئے جلنے کا عذاب ہے۔

ترجمہ۔ کے بعد اب بعض لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے:۔

"بُرُوْج" بُرج کی جمع ہے یہ لفظ قلعہ۔ قصر اور گنبد کے لئے بولتے ہیں۔ بُرج آسمان کے بارہ[۱۲] حصّوں میں سے ہر ایک حصّہ کو بھی کہتے ہیں۔ کچھ مفسروں نے اس مقام پر یہی معنے مراد لئے ہیں۔ اور بعض لوگوں نے بروج سے بڑے بڑے ستاروں کو مراد لیا ہے۔ "اَلْاُخْدُوْد" لمبے اور گہرے گڑھے کو کہتے ہیں۔ "اَخَادِیْد" اِسکی جمع ہے۔ "وَقُوْد" ایندھن کو کہتے ہیں جو آگ جلانے کے کام میں استعمال ہوتا ہے۔ "نَقَمُوْا" کا مصدر "نقم"

ہے۔ جب اس کے ساتھ "مِنۡ" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس کے معنی بدلہ اور قصاص لینے کے ہوتے ہیں۔ یہاں یہی مراد ہے۔ "فَتَنُوا" کا مصدر "فَتْنٌ" ہے اس کے ایک معنی ہیں مصیبت اور تکلیف میں مبتلا کرنا اور یہی یہاں مراد لئے گئے ہیں۔ "حَرِیق" آگ

اور اس کے شعلہ کو اور آگ بھڑکنے کو کہتے ہیں۔ "شاھد و مشھود" میں "شاھد" کے معنی ہیں گواہی دینے والا یا حاضری دینے والا اور "مشھود" وہ جس کی گواہی دی جائے یا جہاں حاضری دی جائے۔ یہاں "شاھد" سے مراد سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس ہے اور "مشھود" سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اس کی تائید دوسری آیتوں سے بھی ہوتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ يَآ اَيُّهَا النَّبِيُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّ مُبَشِّرًا وَّ نَذِيْرًا وَّ دَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا (سورۂ احزاب) اس آیت میں خدا نے سرورِ کائنات کو شاھد کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ اسی طرح روزِ قیامت کے لئے سورۂ ھود میں فرمایا گیا ہے: ذٰلِكَ يَوْمٌ مَّجْمُوْعٌ لَّهُ النَّاسُ وَذٰلِكَ يَوْمٌ مَّشْهُوْدٌ۔ اس آیت میں یوم مشھود سے روزِ قیامت مراد ہے۔

مگر بعض مفسروں نے "وَشَاهِدٍ وَّمَشْهُوْدٍ" میں شاھد سے جمعہ کا دن اور مشھود سے عرفہ کا دن مراد لیا ہے۔

یہ سورۂ بروج کی ابتدائی چند آیات ہیں۔ اس سورہ کو بھی خدا نے بعض دوسرے سوروں کی طرح قسموں سے شروع فرمایا ہے۔

یہ چار قسمیں ہیں: برجوں والے آسمان کی قسم اور یومِ موعود اور شاھد و مشھود کی قسم ان قسموں سے بنیادی طور پر خالق کی ہستی اور اس کے کمالِ قدرت و اختیار کی طرف اشارہ ہے اور ساتھ ہی عقیدۂ رسالت اور عقیدۂ قیامت کی اہمیت بھی ظاہر کی گئی ہے۔ کیونکہ برجوں سے مراد بڑے بڑے ستارے ہوں یا سورج اور چاند کی خاص منزلیں یا آسمان کے بارہ حصے ہوں۔ وہ عظیم آسمان جس کے اندر عقل کو حیرت میں ڈال دینے والی ایسی عجیب چیزیں موجود ہوں اور جس کے بڑے اور چھوٹے بے شمار ستاروں کے نظم و ضبط میں کبھی خلل نہ آسکے ضرور اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ اس کا کوئی صاحبِ حکمت خالق موجود ہے جس کے اشارۂ قدرت پر اس کا پورا نظام چل رہا ہے اور ان سب چیزوں کی خلقت کا کمال خود اس کے پیدا کرنے والے کے کمال اور اس کی اعلیٰ صفات کی دلیل ہے۔ پھر یوم موعود

"اور شاھد و مشہود" کہکر رسالت اور قیامت کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ اس طرح یہ قسمیں اُن پورے
بنیادی نظریات اور اصول پر شامل ہیں جن پر دینِ حق کی عمارت قائم ہے اور اس سورہ مبارکہ
کو شروع کرتے ہی ان باتوں کی قسم کھانا' ظاہر کرتا ہے۔
کہ خدا کے نزدیک ان پر غور کرنے اور انھیں سمجھنے کا کیا مرتبہ اور کیا قدر و قیمت ہے۔ ان قسموں کے
بعد "اُخدود" والوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ قدیم زمانہ میں بت پرستوں کی ایک قوم تھی جس نے
اُس وقت کے ایمانداروں اور توحید پرستوں کو تکلیفیں پہنچا کر اور اُن پر ظلم و ستم ڈھا کر انھیں
دینِ حق اور خدا کے راستہ سے ہٹانا چاہا تھا اور جب وہ حق کو ترک کرنے اور باطل کو اختیار
کرنے پر کسی طرح بھی تیار نہ ہوئے تو ان ظالموں نے زمین میں گہرے اور لمبے گڑھے کھود کر
انھیں لکڑیوں سے پاٹ دیا اور ان میں آگ لگا دی۔ جب آگ بھڑکنے لگی تو اُن سے کہنے لگے کہ اب بھی
وقت ہے کہ تم لوگ بتوں کو پوجنا شروع کر دو اور اپنے دین کو چھوڑ دو ورنہ ہم تم کو زندہ جلا ڈالیں
گے لیکن خدا کے اُن نیک بندوں نے کسی دھمکی کی پروانہ کی اور حق کے راستہ سے نہ ہٹے آخر اُن
سنگدلوں نے بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلوں میں اُن مظلوم اور بے جرم و خطا ایمانداروں کو جھونک
دیا۔ ان بیگناہوں کی تعداد تقریباً بیس ہزار تھی جنہیں آگ میں ڈالا گیا تھا۔ یہ لوگ شوقِ شہادت
میں خوشی خوشی آگ میں گر رہے تھے۔ اِسی اثناء میں ایک عورت لائی گئی جسکی گود میں اُس کا
دودھ پیتا بچہ تھا۔ آگ دیکھکر اُسے اپنے بچہ کا خیال آیا اور آگ میں گرنے سے گھبرانے لگی اُسی
وقت قدرتِ خدا سے اُس بچہ کی زبان کھل گئی اور وہ کہنے لگا: اے میری پیاری ماں! خدا کی راہ
میں جان دینے سے اور آگ میں جلنے سے نہ گھبرا جیسے ہی اس عورت نے بچہ کا یہ کلام سنا تو فوراً اُس نے بھی اپنے آپ کو مع بچہ کے
آگ میں گرا دیا اور یہ دونوں بھی دینِ خدا پر قربان ہو گئے۔ جب یہ لوگ آگ میں جل رہے تھے
تو وہ سنگدل خندقوں کے گرد بیٹھے ہوئے ان کی موت کا تماشا دیکھ رہے تھے اور ان کی مصیبت
پر خوشیاں منا رہے تھے یکایک وہ آگ اُن خندقوں کے باہر آکر پھیل گئی اور چند ہی لمحوں میں ان تمام
سرکش ظالموں کو اُس نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور سب کو جلا کر خاک کر دیا۔ کچھ مورخین نے لکھا ہے
کہ یہ واقعہ یہودی بادشاہ یوسف ذونواس حمیری کا ہے جس نے نجران کے حق پرستوں کو اس طرح آگ
میں جلوایا تھا اس مقام پر اس قصّہ کو بیان کرنے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان میں
پکے اور کامل ہوا کرتے ہیں اور انھیں خدا پر پورا یقین ہوتا ہے اُن کے قدم کسی حال میں بھی حق
کے راستہ سے نہیں ڈگمگاتے بلکہ جسقدر مصیبتیں بڑھتی جاتی ہیں ان کے ایمان اور یقین میں بھی

زیادہ پختگی، مضبوطی اور استحکام پیدا ہوتا ہے اور وہ حق کے خلاف ہر حملہ اور ہر طوفان کا انتہائی بہادری اور ہمت سے مقابلہ کرتے ہیں اور اپنے صبر و استقامت میں ذرہ برابر کبھی کمزوری نہیں آنے دیتے۔

(۱۹۱)

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۬ؕ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِيْرُ ؕ﴿﴾ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ؕ﴿﴾ اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَيُعِيْدُ ۚ﴿﴾ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ ۙ﴿﴾ ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدُ ۙ﴿﴾ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ ؕ﴿﴾ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْجُنُوْدِ ۙ﴿﴾ فِرْعَوْنَ وَثَمُوْدَ ؕ﴿﴾ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ ۙ﴿﴾ وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ ۚ﴿﴾ بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ۙ﴿﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿﴾

(پارہ ۳۰ رکوع ۱۰ کی آخری ۱۲ آیات ۔ سورۃ البروج)

ترجمہ: بے شک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کئے اُن کے لئے باغ ہیں جنکے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ یقیناً تمہارے پروردگار کی گرفت بڑی سخت ہے۔ بیشک وہی پہلی مرتبہ پیدا کرتا ہے اور دوبارہ بھی پیدا کریگا اور وہی بڑا بخشنے والا بڑی محبت کرنے والا ہے۔ مالک عرش بڑی شان والا۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کیا تمہارے پاس لشکروں کی خبر پہونچی ہے۔ فرعون اور ثمود کی۔ بلکہ جو لوگ کافر ہوگئے وہ تو جھٹلانے ہی کے درپے ہیں اور اللہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ قرآن جھٹلانے کے قابل نہیں بلکہ وہ باعظمت قرآن ہے۔ لوحِ محفوظ میں ہے۔

ان آیاتِ کریمہ کے ترجمہ کے بعد اب بعض لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے:۔

"بَطْشٌ" سختی سے گرفت کرنے یا چھین لینے کو کہتے ہیں اور حملہ کرنے کے معنی میں بھی بولتے ہیں۔ یہ مصدر بھی ہے اور اسم بھی۔ یہاں پر گرفت ہی کے معنی مراد ہیں۔

اس لفظ کے معنی میں خود ہی شدت اور سختی موجود ہے پھر اس کے بعد "لَشَدِيْدٌ" فرما کر اس سخت گیری میں شدت کا زیادہ اظہار ہے اور اس پر زور دیا گیا ہے۔

"العرش" کے معنی تخت، چھت، سلطنت و ملک اور عزت و اقبال کے ہیں۔ عرشِ خدا سے مراد اقتدار و حکومت خداوندی ہے اور کسی مقام پر اس سے مراد ایک وسیع اور عظیم چیز ہوتی ہے جو تمام آسمانوں پر محیط ہے اور اُس کی وسعت اور پھیلاؤ کے مقابلہ میں کرسی اور

آسمانوں کی وسعت کسی شمار میں نہیں ہے۔ مگر ہر موقع پر خدا کو صاحبِ عرش یا مالک عرش کہنے کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ خدا جس طرح کائنات کی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے عرش کا بھی وہی خالق اور مالک ہے یا یہ بتانا مقصود ہوتا ہے کہ عرش پر ساری بلندیوں کی حد ختم ہو جاتی ہے اور خدا کی شان اس سے زیادہ بلند ہے یعنی اس کی رفعت اور بلندی کی کوئی انتہا ہی نہیں۔ اس کے معنی ہرگز نہیں ہوتے کہ جس طرح بادشاہوں کو ان کا تخت اٹھاتا ہے العیاذ باللہ خدا کا عرش بھی اسے اٹھائے ہوئے ہے کیونکہ خدا نہ تو محدود ہے جس کو حدیں گھیر سکیں اور نہ وہ جسم رکھتا ہے اور نہ کسی چیز کا محتاج یا عاجز و مجبور ہے۔ اس کی ذاتِ اقدس اس سے بے نیاز، منزّہ اور پاک ہے کہ کوئی چیز اس کو سہارا دے یا اٹھا سکے۔ "المجید" کی اصل "مَجْدٌ" ہے۔ اس کے معنی کرم و شرف اور بڑی بزرگی کے ہیں۔ یہ لفظ خدا کے اسماءِ حسنیٰ میں سے ہے اور مراد ہے وہ ذات جو بے حد فضل و شرف اور بزرگی والی ہو۔

مشہور قرارت میں "المجید" کی دال پر پیش پڑھا جاتا ہے اور اس کو الغَفُوْرُ الوَدُوْدُ کی صفت قرار دیا گیا ہے مگر بعض مفسروں کے نزدیک یہ عرش کی صفت ہے اس لفظ کی "دال" پر وہ زیر پڑھتے ہیں، جیسا کہ ان ہی آیات کے آخر میں لفظ مجید۔ قرآن کی صفت کے طور پر بولا گیا ہے یعنی "بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِیْدٌ"۔

"وَرَاءِ" کا اصلی مادّہ "وَرْءٌ" ہے نہ کہ "وَرْیٌ" اس کے معنی پیچھے، سامنے، دوسری طرف، بعد اور سوا کے آتے ہیں۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ خدا کی حکومت اور اقتدار انھیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔

"لوحِ محفوظ" کے لفظی معنی تو محفوظ تختی کے ہیں مگر شریعت کی اصطلاح میں یہ ایک خاص نورانی لوح کا نام ہے جو بے انتہا وسیع ہے اور ہر قسم کے تغیر اور تبدیلی سے پاک اور محفوظ ہے۔ قضا و قدر کے تمام امور اور کائنات کی ساری باتیں اس لوحِ خداوندی میں موجود ہیں۔ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونیوالا ہے وہ سب اس میں درج ہے مگر بعض مشہور مفسروں کے نزدیک اس "لوحِ محفوظ" سے مراد خدا کا "علم ازلی" ہے جو کائناتِ عالم کی ہر چیز پر محیط ہے اور یہی وہ "اُمُّ الکتاب" ہے جس کا ذکر خدا نے سورۂ رعد میں "وَعِنْدَهٗۤ اُمُّ الْكِتٰبِ" کے جملہ میں فرمایا ہے۔

غرض اس سورۂ بروج میں سب سے پہلے خدا نے قدیم زمانہ کے ایک انتہائی انسانیت سوز

اور عبرتناک واقعہ کی خبر دی ہے اور بتایا ہے کہ حق پرستوں اور مخلص ایمانداروں کو ظالم اور انسان دشمن یہودیوں نے اپنے جور و ستم، سنگدلی، وحشت اور بے رحمی، تشدد اور درندگی کا کس طرح نشانہ بنایا تھا اور پھر اُن کے اس ظلم و سرکشی کی سزا کا بھی اس طرح اعلان فرمایا۔

قُتِلَ اَصْحٰبُ الْاُخْدُوْدِ ۝ النَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ ۝ اِذْ هُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ ۝ وَّهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ ۝۔

مقصود یہ ہے کہ اُن ظالموں کو آخرت میں تو جہنم کی آگ میں جلنا ہی ہے اس سے پہلے اس دُنیا میں بھی وہ اُسی آگ سے جلا ڈالے گئے جو اُنھوں نے ایمانداروں کو جلانے کے لئے تیار کی تھی۔ اس تذکرہ کے بعد یہ بھی بتایا گیا کہ یہ بات کچھ اُن ہی ظالموں پر منحصر نہیں ہے بلکہ جو کوئی بھی خدا کے نیک اور سچے بندوں اور مخلص ایمانداروں کو اذیت اور تکلیف پہونچائے گا اس کو یہی سزا دی جائے گی۔ یہ سب کچھ فرمانے کے بعد اب زیر بحث آیات میں خود اہلِ ایمان و یقین کو سمجھایا جا رہا ہے کہ وہ ان تکلیفوں اور مصیبتوں اور ظلم و ستم سے کبھی دل شکستہ اور غمگین اور مایوس نہ ہوں کیونکہ بڑی اور آخری کامیابی اُن ہی کے لئے ہے جس کے مقابلہ میں اِس دنیا کا عیش کوئی بھی حیثیت نہیں رکھتا۔ پھر فرعون اور قوم ثمود کا ذکر ہے اور یہ سمجھانا مقصود ہے کہ اُن کی شان و شوکت اور جاہ و جلال کس طرح پلک جھپکتے ہی خاک میں مل گیا اور خدا کے عذاب کو وہ اپنی کسی طاقت اور اقتدار سے نہ روک سکے اس بیان کے ساتھ ہی یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اس صفتِ قہاری کے باوجود خدا کی بخشش و رحمت اور جود و کرم و عطا کی بھی کوئی حد نہیں ہے۔ وہ اپنے فرماں بردار بندوں کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے اور اُن کی سچے دل کی توبہ اور استغفار کو قبول فرماتا ہے۔

خدا ہر مسلمان کو گناہوں سے بچنے اور صدق دل سے توبہ کرنے کی توفیق عطا کرے خصوصاً ماہ رمضان المبارک میں جس میں خدا اپنے نیک اور صالح بندوں پر خصوصی نظر کرم رکھتا ہے اور جس کی برکتوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ ۝ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ ۝ النَّجْمُ الثَّاقِبُ ۝ اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ ۝ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ ۝ خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ ۝ يَّخْرُجُ مِنْۢ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ ۝ اِنَّهٗ عَلٰى رَجْعِهٖ لَقَادِرٌ ۝ يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ ۝ فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ وَّلَا نَاصِرٍ ۝ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ ۝ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝ اِنَّهٗ لَقَوْلٌ فَصْلٌ ۝ وَّمَا هُوَ بِالْهَزْلِ ۝ اِنَّهُمْ يَكِيْدُوْنَ كَيْدًا ۝ وَّاَكِيْدُ كَيْدًا ۝ فَمَهِّلِ الْكٰفِرِيْنَ اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا ۝

(پارہ ۳۰، رکوع ۱۱ کی ۱۷ آیات - سورۃ الطارق)

ترجمہ: قسم ہے آسمان کی اور رات کو نمودار ہونے والے کی اور تمہیں کیا معلوم کہ وہ رات کو ظاہر ہونے والی کیا چیز ہے وہ روشن ستارہ ہے۔ کوئی شخص بھی ایسا نہیں جس پر نگہبان فرشتہ مقرر نہ ہو۔ تو انسان کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے وہ تیزی سے اچھلتے ہوئے پانی سے پیدا کیا گیا ہے جو پیٹھ اور سینہ کی ہڈیوں کے درمیان سے خارج ہوتا ہے۔ بے شک وہ خدا اس کے دوبارہ پیدا کرنے پر ضرور قدرت رکھتا ہے جس روز بھیدوں کی جانچ کی جائے گی تو اس دن اس کا نہ کچھ زور چلیگا اور نہ اس کا کوئی مددگار ہوگا۔ آسمان کی قسم جس سے بارش ہوتی ہے اور پھٹنے والی زمین کی قسم بے شک یہ قرآن ایک فیصلہ کر دینے والا کلام ہے اور یہ کوئی لغو کلام نہیں ہے۔ بیشک وہ کفار اپنی تدبیریں کر رہے ہیں اور میں اپنی تدبیر کر رہا ہوں تو تم کافروں کو مہلت دے دو بس انھیں تھوڑی سی مہلت دو۔

ان آیات کریمہ کے ترجمہ کے بعد اب کچھ لفظوں کی تشریح سنئے:-

"طارق" رات میں آنے والے کو کہتے ہیں۔ یہ طُروق سے بنا ہے اور چونکہ ستارہ بھی رات کے وقت ظاہر ہوتا ہے اسی مناسبت سے اُس کو بھی "طارق" فرمایا گیا ہے۔ "اَلثَّاقِب" کا مصدر ثقوب ہے۔ یہاں مراد ہے روشن اور چمکنے والا۔ "دَافِق" "دَفق" اور "دُفوق" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں "پانی کا زور اور قوت کیساتھ اچھلنا" "صُلب" کے بہت سے معنی ہیں۔ یہاں مراد پیٹھ ہے۔ اس کے ایک معنی ریڑھ کی ہڈی کے بھی ہیں اور

پشت اور ریڑھ کی ہڈی کی مناسبت ہی سے اسے حسب و نسب کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ "ترائب" تَرِیبَۃٌ کی جمع ہے۔ سینہ کی ہڈیوں کو کہتے ہیں۔ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ، اس میں "رَجْعٌ" سے اکثر مفسروں نے بارش کو مراد لیا ہے اور بعض نے گھومنے اور چکّر کھانے کو۔ وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ۔ اس میں "صَدْعٌ" مصدر کے طور پر بولا گیا ہے۔ معنی ہیں شق کرنا، اور پھاڑ ڈالنا یعنی بیج جب اگتا ہے تو وہ زمین کو شق کر دیتا ہے۔ یہ بھی خدا کی قدرت کی ایک بڑی نشانی ہے کہ ایک بہت ہی نازک اور ننھا سا بیج زمین میں شگاف پیدا کر دیتا ہے۔ ھَزْلٌ" لاحاصل اور بے نتیجہ بات کو کہتے ہیں۔ رُوَیْدًا اس جگہ پر بطور مصدر کے بولا گیا ہے۔ جس سے نرمی کرنے اور مہلت دینے کے کام میں تاکید مقصود ہے۔

غرض خدائے پاک نے اس سورہ کو بھی قسم کے ساتھ شروع فرمایا ہے اور سب سے پہلے آسمان کی قسم کھائی ہے پھر ستارہ کی قسم کھائی اور اُس کو لفظ "طارق" کے ساتھ یاد کیا ہے اور پھر خود اسے بھی بتا دیا کہ "طارق" سے مراد روشن ستارہ ہے۔ اکثر مفسروں نے کہا ہے کہ اس سے مراد عام ستارہ ہے مگر بعض نے زحل کو اور کچھ نے چاند کو مراد لیا ہے۔ آسمان اور ستارہ کی اس طرح قسم کھانے سے اسی نظم وضبط اور کمالِ خلقت کی طرف اشارہ ہے جو آسمان اور ستاروں میں پایا جاتا ہے اور مقصود یہ بتانا ہے کہ جو خدا اپنی قدرت کاملہ سے آسمان اور ستاروں کا خلق کرنے والا ہے اور ان کے نظم وضبط میں کبھی ذرہ برابر فرق نہیں آنے دیتا وہی تو انسانوں کا بھی خالق ہے اور وہی اُن کی حفاظت بھی کرتا ہے تاکہ وہ زندہ اور باقی رہ سکیں ورنہ اگر اُن کی زندگی باقی رکھنے کا کام خود اُن ہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا جاتا اور خدا اُنکی حفاظت کا انتظام نہ فرماتا تو وہ چند ہی لمحوں میں ہلاک اور تباہ ہو جاتے۔ اسی حقیقت کی طرف اس آیت میں توجہ دلائی گئی ہے:

"اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ" کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس پر کوئی نگہبان فرشتہ خدا کی طرف سے مقرر نہ ہو جو اُس کی حفاظت کرتا ہے اور اس کو آفتوں سے بچاتا رہتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی "حافظ" فرما کر اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ فرشتہ اور اُس کے ساتھ دوسرے فرشتے انسان کے اعمال اور افعال، نیکی اور بدی اور سارے ہی کاموں پر کڑی نگرانی رکھتے ہیں اور اُس کا کوئی قول و فعل اُن سے چھپا نہیں رہتا

قرآنِ حکیم میں کئی جگہ اس حفاظت کا ذکر آیا ہے۔ سورۂ انفطار میں ہے۔ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحٰفِظِيْنَ كِرَامًا كَاتِبِيْنَ يَعْلَمُوْنَ مَا تَفْعَلُوْنَ۔ یعنی تم پر بزرگ لکھنے والے نگہبان فرشتے مقرر ہیں جو تمہارے ہر عمل سے واقف اور باخبر ہیں۔ اسی طرح عام حفاظت کے لئے فرمایا گیا ہے: لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ يَحْفَظُوْنَهٗ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ" (سورۂ رعد) انسان کیلئے اُس کے سامنے اور اُس کے پیچھے نگہبان فرشتے مقرر ہیں جو حکمِ خدا سے اُس کی حفاظت کرتے ہیں اس ذکر کے بعد انسان کو خود اُس کی پیدائش کی طرف توجہ دلائی گئی اور سمجھایا گیا ہے کہ پہلی مرتبہ جس ذات نے اسے خلق کیا ہے اُس کے لئے کیا مشکل ہے کہ وہ اسے قیامت میں دوبارہ زندگی عطا کر دے۔ پھر اس سے خبردار بھی کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کے سارے بھید اور راز ظاہر کر دئے جائیں گے اور عدل و انصاف کیساتھ اُن کے اعمال کی جانچ ہوگی پھر مناسب سزا یا جزا دی جائے گی۔ وہ بے شک بڑا کٹھن وقت ہوگا جب کوئی چیز بھی آدمی کی مدد نہ کرے گی اور حکمِ خدا پر اطاعت کرنے سے کسی شخص کے لئے گریز ممکن نہ ہو سکیگا۔ یہ سب کچھ بتانے کے بعد پھر دوبارہ آسمان کی قسم کھائی گئی مگر اُس کی اس صفت کیساتھ کہ اُس کی طرف سے بارش آتی ہے اور زمین کی قسم کھائی جو نباتات اور اُگنے والی چیزوں کے لئے پھٹ جاتی ہے یعنی جس طرح زمین خدا کی نعمتوں کا خزانہ ہے یا جس طرح فضا کی بلندی سے بارش کا پانی گرتا ہے اور ساری خلقت کے لئے وہ برکتوں اور آسائشوں کا وسیلہ بنتا ہے اسی طرح قرآن حکیم بھی ہدایت کا سرچشمہ ہے اور نور کی بارش بنکر عالمِ لاھوت سے نازل ہوا ہے۔ اُس کا ایک ایک لفظ زندگی کا ذریعہ اور نجات و فلاح کا وسیلہ ہے۔ اُس کا ہر حرف۔ حرفِ آخر، اور ہر بات قولِ فیصل ہے۔ آخر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آیاتِ خداوندی کا انکار کرنے والے اپنی مکاریوں میں جس طرح مشغول ہیں خدا اُس سے پوری طرح باخبر ہے مگر ان کو کچھ ڈھیل دے دی گئی ہے اور جب فیصلۂ خداوندی اور تدبیرِ الٰہی ظاہر ہوگی تو منکرین حق کی ساری تدبیریں اور تمام مکاریاں خاک میں مل کر رہ جائیں گی۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ الَّذِي خَلَقَ فَسَوّٰى ۝ وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدٰى ۝ وَالَّذِيْٓ اَخْرَجَ الْمَرْعٰى ۝ فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰى ۝ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى ۝

(پارہ ۳۰ رکوع ۱۲ ۔ سورۃ الاعلیٰ کی ۷ ابتدائی آیات)

ترجمہ: (اے رسول) اپنے بہت ہی بلند پروردگار کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا پھر ٹھیک کیا اور جس نے اندازہ مقرر کیا پھر راہ بتائی اور جس نے چارا اگایا پھر اُس نے اُس چارے کو سیاہ کوڑا بنا دیا۔ ہم تمہیں پڑھائیں گے پھر تم نہیں بھولو گے مگر جو کچھ خدا کی مشیت ہو۔ بیشک وہ ظاہر اور ہر مخفی کو جانتا ہے۔

"تسوّٰی" ماضی کا صیغہ ہے۔ اس کا مصدر "تسویہ" ہے جس کے معنی ہیں دُرست کرنا، برابر کرنا اور ٹھیک کرنا۔ اسی مادّہ سے "سَوِیّ" بھی بنا ہے۔ یہ اس چیز کو کہتے ہیں جو مقدار، بناوٹ اور کیفیت و حالت کے لحاظ سے ہر عیب یا کمی و زیادتی سے بالکل محفوظ ہو اور پوری طرح اعتدال کی حالت میں ہو۔ قرآنِ حکیم میں ہر مقام پر "تسویہ" یعنی خلقت کی تکمیل کی نسبت ذاتِ خداوندی ہی کی طرف دی گئی ہے اور اس جگہ بھی یہی ارشاد ہوا ہے:

"خَلَقَ فَسَوّٰی" خدا ہی نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اور اُسی نے اُس کو معتدل بنایا اور ہر طرح درست اور ٹھیک کر دیا ہے۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی۔ اس جگہ دو خاص لفظ بولے گئے ہیں ایک قَدَّرَ دوسرے فَهَدٰی۔ "قَدَّرَ" کا مصدر تقدیر ہے جس کے بہت سے معنی ہیں: اندازہ کرنا کسی چیز کی قدر و قیمت کرنا، قیاس کرنا، کسی کو قدرت دینا، فکر کرنا، فیصلہ کرنا، حکم دینا، اور کبھی اس کو روزی کے کم کرنے اور گھٹانے کے لئے بھی بولتے ہیں۔ اس کا اصلی مادّہ قَدْرٌ اور قَدَرٌ ہے اور یہ دونوں لفظ مصدر بھی ہیں اور اسم بھی۔ قرآن و حدیث میں زیادہ تر ان لفظوں کو بول کر خدائے پاک کا حکم، اندازہ اور فیصلہ مُراد لیا گیا ہے۔ یہاں بھی یہی مراد ہے۔ یعنی خدا نے ہر چیز کو ایک خاص اندازہ کے ساتھ پیدا کیا ہے جو اُس کی حکمت اور مصلحت کے مطابق ہے اور جس میں کسی طرح کی بے اعتدالی یا عیب و نقص اور کمزوری نہیں پائی جاتی اور یہ اندازہ ایسا ہے جو کائنات کے وجود، زندگی اور اُس کی بقا اور ہر قسم کی نشو و نما اور اُسکے سارے حالات اور تمام کیفیات سے پوری پوری مناسبت اور ہم آہنگی رکھتا ہے۔ اس تقدیرِ الٰہی کا

ذکر سورۂ فرقان میں اس طرح کیا گیا ہے:

وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَّرَهُ تَقْدِيرًا۔ خدا نے ہر چیز کو خلق فرمایا ہے اور اس کے لئے ایک خاص اندازہ مقرر کر دیا ہے۔ یہ وہ الٰہی اندازہ اور تقدیر ہے جس سے کوئی بھی مخلوق اور کائنات کی کوئی چیز کبھی باہر نہیں جا سکتی۔ زمین سے آسمان تک اور خاک کے ذروں سے فلک کے ستاروں تک کوئی موجود ایسا نہیں ہے جو اس نظامِ الٰہی اور تقدیرِ خداوندی سے الگ ہو سکے۔

زیرِ بحث آیتوں میں "قَدَّرَ" کے بعد دوسرا لفظ "فَهَدٰى" آیا ہے یعنی خدا نے جس طرح کائنات کی ہر چیز کو اس کی خلقت، ساخت اور حالت و کیفیت کی مناسبت سے سب کچھ عطا کر دیا ہے اسی طرح اس کے لئے ہر قسم کی ظاہری اور باطنی ہدایت اور رہنمائی کا سامان بھی کر دیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف سورۂ طٰہٰ میں اس طرح اشارہ فرمایا گیا ہے:

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهُ ثُمَّ هَدٰى "فرعون سے موسیٰ نے کہا ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کے مناسب خلقت عطا کی پھر اس کی ہدایت اور رہنمائی بھی کر دی۔ اس آیۂ کریمہ میں "ثُمَّ هَدٰى" کہنے سے پہلے پورے جملہ میں پیدائش تسویہ یعنی خلقت کی تکمیل اور اسی کے ساتھ تقدیرِ الٰہی کی طرف اجمالی طور پر اشارہ پایا جاتا ہے اور آخر میں اس ہدایت کا ذکر ہے جو ربوبیتِ خداوندی کا سب سے بڑا تقاضا ہے لیکن سورۂ اعلیٰ کی ان زیرِ نظر آیات میں ان تمام باتوں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا گیا ہے اور ابتدا اس طریقہ پر کی گئی: سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى" اس میں پہلے تو اس بات کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ سب سے اعلیٰ اور بلند ترین ہستی صرف خدا کی ہے اور اُسی کی ذاتِ پاک اس کی سزاوار ہے کہ اس کے نام کی تسبیح کی جائے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا کہ خدا تمام کائنات کا رب یعنی پرورش کرنے والا اور پالنے والا ہے۔ "ربوبیت" کی تعریف عربی زبان کے ماہروں نے اس طرح کی ہے:

"هُوَ اِنْشَاءُ الشَّيْءِ حَالًا فَحَالًا اِلٰى حَدِّ التَّمَامِ" کسی چیز کو اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق ایک حال سے دوسرے حال پر اس طرح نشو و نما دیتے رہنا کہ وہ چیز اپنے کمال کی انتہا تک پہنچ جائے اور اس کی ہر احتیاج اور ضرورت پوری ہوتی رہے اسلئے خدا کے رب ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ عالم کی ہر مخلوق کو اپنی زندگی، بقا، ترقی اور نشو و نما

کے لئے جو کچھ بھی مطلوب تھا اور جس جس چیز کی ضرورت تھی وہ سب اُس نے اُس مخلوق کے لئے مہیا کردی ہے اور اس بات میں اُس مخلوق کی ہر حالت اور کیفیت کی کامل رعایت اور اُس کی ہر احتیاج کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے اور خدا کی ربوبیت کا فیضان اور اس کا کرم مخلوقات کی زندگی کے ہر اُس گوشہ کو گھیرے ہوئے ہے جہاں پرورش اور تربیت کے لئے کسی طرح کی بھی ضرورت کا کوئی معمولی سا امکان بھی پایا جاسکتا ہو۔ اس ربوبیت کے قانونِ الٰہی میں نہ کسی شخصیت اور خاندان کا امتیاز ہے نہ کسی خطۂ زمین کی کوئی خصوصیت ہے نہ رنگ و نسل و زبان کا فرق ہے نہ عہدہ اور منصب کی تمیز ہے اور نہ جاندار اور بے جان کی تفریق ہے۔ وہ ہر اُس چیز کا رب اور پروردگار ہے جس کو فطرت وخلقت کی وسیع ترین پہنائیاں اپنے دامن میں لئے ہوئے ہیں اور اُس کی ہر مخلوق کو بلا امتیاز و تفریق پورے عدل و انصاف کے ساتھ ہر وہ چیز ملتی رہتی ہے جس کی اُسے ضرورت ہے۔

"رَبِّکَ الْاَعْلیٰ" کہکر خدائے برتر کی اس بلند ترین پروردگاری اور عظیم ربوبیت کے اعلانِ عام کے بعد اس کی کچھ تشریح بھی فرمائی گئی اور ارشاد ہوا۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَھَدٰی" وہ خدا جس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور اُس کی خلقت کو ہر طرح کی مناسبت، اعتدال حُسن اور موزونیت بخشی وہی خدا جس نے ہر مخلوق کے لئے ایک خاص اندازہ مقرر کر دیا ہے۔

یہ اندازہ کائنات کی خلقت اور پیدائش اور اُس کی ساخت کے اُن تمام تقاضوں اور اُس نظام تخلیق کا نام ہے جس کی مقررہ حدوں اور بندشوں سے کبھی کوئی چیز باہر نہیں نکل سکتی اس طرح "رَبِّکَ الاعلیٰ" کے جملہ میں جس عظیم ترین ربوبیت کا اعلان فرمایا گیا تھا اُس کے تین رخ اور ابتدائی مرتبے یعنی تخلیق، تسویہ اور تقدیر بیان کر کے آخر میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ صرف رب العالمین خدا ہی کی ذاتِ پاک ہے جس نے اپنی تمام مخلوقات پر زندگی اور بقا کے سامان تک پہنچنے اور اُس سے فائدہ حاصل کرنے کی راہیں کھول دی ہیں اور ہدایت فرمادی ہے اور اس سامانِ حیات و پرورش کو پہچاننے کے لئے پورا شعور بھی عطا کیا ہے۔ اگر یہ ربّانی ہدایت نہ ہوتی تو نعمتوں کے لامحدود ذخیروں کے باوجود عالم کی کوئی مخلوق بھی اپنے اسبابِ زندگی سے فائدہ نہ اٹھا سکتی اور نہ خود زندگی ہی کو بقا ہوتی اور نہ اُس سے یہ اُمنگیں اور یہ سرگرمیاں ظہور میں آسکتیں۔

(۱۹۲)

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى ۝ فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ۝ سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى ۝ وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى ۝ الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ۝ ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَلَا يَحْيٰى ۝ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّأَبْقٰى ۝ إِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْأُوْلٰى ۝ صُحُفِ إِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى ۝

(پارہ ۳۰، رکوع ۱۲۔ سورۃ الاعلیٰ کی ۱۲ آخری آیات)

ترجمہ: اے رسول، ہم تمہیں (ہر امر میں) آسان طریقہ کی توفیق دینگے تو تم نصیحت کرتے رہو۔ اگر نصیحت کرنا کچھ فائدہ دے۔ جو شخص خوف رکھتا ہے وہ تو نصیحت حاصل کرے گا اور جو بدنصیب ہے وہ اس سے گریز کرے گا۔ جو بڑی آگ میں داخل ہوگا۔ پھر اُس میں نہ تو وہ مرہی جائے گا اور نہ جیئے گا۔ بلاشبہ اُس شخص نے فلاح پائی جو پاک و پاکیزہ ہو گیا اور اپنے پروردگار کا نام لیتا اور نماز پڑھتا رہا مگر تم لوگ تو دنیاوی زندگی ہی کو ترجیح دیتے ہو حالانکہ آخرت کہیں بہتر اور بہت باقی رہنے والی ہے۔ یہ باتیں اگلے صحیفوں میں بھی ہیں۔ ابراہیم و موسیٰ کے صحیفوں میں۔

فَذَكِّرْ إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى۔ میں "ذِکریٰ" سے مراد وعظ و نصیحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نصیحت وہاں کی جائے جہاں اُس کا کچھ فائدہ بھی ظاہر ہو سکے اور وہ بیکار اور بے اثر نہ ہو جائے یا اُلٹا اثر نہ پیدا کر دے اور ایسے انداز اور ایسے لہجہ میں ہو جو مفید اور موثر ہو اور ایسے شخص کو نصیحت کی جائے جو اُسے سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت اور قابلیت بھی رکھتا ہو مگر یہ شرط اعلان و تبلیغ حق اور پیغام الٰہی کی طرف دعوتِ عام کے لئے نہیں ہے کیونکہ اُس کو تو سارے ہی بندگانِ خدا کے لئے عام ہونا ضروری ہے تاکہ ان سب پر حجت پوری ہو سکے اور کسی شخص کو بھی ناواقفیت اور بے خبری کا عذر نہ رہے۔

غرض ارشادِ ربانی "إِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى" سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وعظ و نصیحت کے لئے نفع بخش اور فائدہ مند ہونا ضروری ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا ہے: إِنَّا مَعَاشِرَ الْأَنْبِيَاءِ أُمِرْنَا أَنْ نُّكَلِّمَ النَّاسَ عَلٰى قَدْرِ عُقُوْلِهِمْ۔

ہم گروہ انبیاء کو خدا کی طرف سے اس کا حکم ہے کہ لوگوں سے ہم اُن کی عقل اور سمجھ کے

مطابق گفتگو کیا کریں۔ اس آیۂ کریمہ کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر نے حضرت علی بن ابیطالب کے ایک ارشادِ گرامی کو نقل کیا ہے اُس سے بھی اس مطلب پر روشنی پڑتی ہے۔ علامہ موصوف لکھتے ہیں:

کما قال امیرالمومنین علیؑ رضی اللہ عنہ۔ مَا اَنْتَ بِمُحَدِّثٍ قَوْمًا حَدِیْثًا لَا تَبْلُغُہٗ عُقُوْلُھُمْ اِلَّا کَانَ فِتْنَۃً لِبَعْضِھِمْ وَقَالَ حَدِّثِ النَّاسَ بِمَا یَعْرِفُوْنَ اَتُحِبُّوْنَ اَنْ یُکَذَّبَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ۔ حضرت امیرالمومنین علی المرتضیٰؑ فرماتے ہیں کہ اگر تم دوسروں سے اس طرح کلام کرو گے کہ اُن کی عقل میں نہ آسکے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری اچھی باتیں بھی اُن میں سے بعض کے لئے بُرائی اور خرابی و گمراہی کا سبب بن جائینگی اور باعثِ فتنہ وفساد ہونگی اس لئے لوگوں سے ہمیشہ اُن کی سمجھ کے مطابق گفتگو کیا کرو تاکہ وہ اپنی ناسمجھی کی وجہ سے غلط فہمی میں پڑکر کہیں خدا اور رسولؐ کی تکذیب نہ کرنے لگیں۔

"قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی" ۔ مراد یہ ہے کہ جس شخص نے اپنے نفس کو برائیوں اور گناہوں سے پاک وصاف کرلیا اور اُسے اچھے عمل اور صحیح ودرست عقیدہ سے آراستہ کیا، نماز اور دوسری عبادتوں کو پوری فرمانبرداری کے ساتھ بجالاتا رہا تو درحقیقت فلاح اور کامیابی اُسی کے لئے ہوگی۔ پھر فرمایا گیا: بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی" یعنی یہ بھلائی اور فلاح تمہیں کس طرح حاصل ہوسکتی ہے جبکہ تم آخرت کو بھولے ہوئے ہو اور سمجھتے ہو کہ جو کچھ بھی ہے سب اسی دنیا میں ہے اس کے بعد کچھ نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ دُنیا اور اُسکی ساری آرائشیں اور زیبائشیں آخرت کی نعمتوں کے سامنے کوئی بھی حقیقت اور قیمت نہیں رکھتیں حاصل یہ ہوا کہ دُنیا کی طرف کبھی اس طرح رغبت نہ کی جائے کہ آخرت لگاہوں سے اوجھل ہوجائے اور دنیا ہی اصلی غرض اور حقیقی مقصد بن کر رہ جائے۔ مگر اسی کے ساتھ اس ارشادِ خداوندی کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ دُنیا کو بالکل ہی ترک کردیا جائے اور رُہبانیت کی زندگی اختیار کرلی جائے اس لئے کہ اسلام نے اس طرح کی زندگی کی اجازت نہیں دی ہے۔ بلکہ وہ تو دُنیا کو آخرت کی کھیتی کہتا ہے بس شرط یہی ہے کہ یہ کھیتی آخرت ہی کے لئے تیار کی جائے۔ سورہ اعراف میں خدا کا ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ۔

(اے رسول) لوگوں سے پوچھو کہ خدا نے جو زینت کے سامان اور پاک رزق کی چیزیں اپنے

بندوں کے لئے پیدا کی ہیں کس نے حرام کر دیں! دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے۔ جس کا ترجمہ یہ ہے: جو کچھ تم کو خدا نے عطا کیا ہے اُس میں آخرت کے گھر کی بھی جستجو کیا کرو۔ اس کے بعد فرمایا گیا ہے۔ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَكَ مِنَ الدُّنْیَا۔ اور جو کچھ دُنیا میں تمہارا حصّہ ہے اُس کو نہ بھولو۔ (سورۂ قصص)

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَلزَّهَادَةُ فِی الدُّنْیَا لَیْسَتْ بِتَحْرِیْمِ الْحَلَالِ وَلَا اِضَاعَةِ الْمَالِ۔ زہد و پرہیزگاری یہ نہیں ہے کہ آدمی اُن چیزوں کو اپنے لئے حرام کرلے جو خدا نے اُس کے لئے جائز اور حلال کی ہیں۔ آپ کا مشہور فرمان ہے کہ اسلام رہبانیت کی اجازت نہیں دیتا۔

میری اُمت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ یعنی مشیت و خوشنودی خدا کے مطابق زندگی کی راہوں میں جہاد یعنی جہدِ مسلسل اور کوششِ پیہم سے کام لینا اور جذبۂ اطاعتِ الٰہی اور شعورِ بندگی کے ساتھ سرگرمِ عمل رہنا ہی اسلام کی تعلیم اور اُس کا بنیادی مقصد تھا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام کے نزدیک دنیا اور آخرت دونوں ہی اپنے اپنے مقام پر ضروری ہیں اور وہ کسی شخص کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کہ وہ دنیا کو آخرت کی وجہ سے بالکل ترک کردے یا آخرت کو دُنیا کے سبب سے چھوڑ بیٹھے۔ صرف وہ یہ چاہتا ہے کہ آخرت کو دُنیا کا تابع نہ بنایا جائے بلکہ دُنیا ہی آخرت کی تابع رہے یعنی جو کچھ اس دُنیا میں کیا جائے اُسکا اصلی مقصد اطاعتِ خدا اور تحصیلِ آخرت ہو اس طرح ایک سچّے مسلمان کی دُنیا بھی اس کی آخرت کا ایک حصّہ ہوا کرتی ہے اور وہ آخرت سے الگ نہیں ہوتی۔ اگر ترکِ دُنیا خدا کے نزدیک کوئی قابلِ تعریف بات ہوتی تو پھر وہ کس لئے دُنیاوی نعمتوں کو اپنی کتاب میں یاد دلاتا اور کس غرض کیلئے اس کا بار بار ذکر فرماتا کہ اُس نے اس دُنیا میں انسان کے لئے اتنی نعمتیں پیدا کی ہیں جن کو وہ شمار بھی نہیں کرسکتا اور یہ سب نعمتیں اسی لئے ہیں کہ وہ اُن سے فائدہ اٹھائے۔ مگر شرط یہی ہے کہ ان کا مصرف اور استعمال اُن ہی حدوں کے اندر ہو جنہیں خدا نے مقرر کر دیا ہے اور کبھی اُن سے انحراف اور روگردانی نہ کی جائے۔ اصلی غرض اور حقیقی مقصد فقط دُنیاوی نعمتوں کا حصول اور صرف یہاں کے مال و متاع اور ساز و سامان کی طلب نہ ہو۔ بلکہ اس سے رضائے خداوندی کی تحصیل مطلوب ہو یعنی دُنیا کو آخرت پر ترجیح نہ دی جائے بلکہ آخرت ہی کو دنیا پر مقدم رکھا جائے۔ اسی حقیقت کی طرف آیۂ کریمہ "بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةُ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی۔" میں اشارہ فرمایا گیا ہے اور یہ سمجھا گیا ہے کہ بقا اور دوام صرف آخرت کو ہے اور اس حیاتِ دنیا کا بھی اصلی مقصود وہی ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ الْغَاشِيَةِ ○ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ خَاشِعَةٌ ○ عَامِلَةٌ نَّاصِبَةٌ ○ تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً ○ تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ ○ لَيْسَ لَهُمْ طَعَامٌ اِلَّا مِنْ ضَرِيْعٍ ○ لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِيْ مِنْ جُوْعٍ ○ وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَةٌ ○ لِّسَعْيِهَا رَاضِيَةٌ ○ فِيْ جَنَّةٍ عَالِيَةٍ ○ لَّا تَسْمَعُ فِيْهَا لَاغِيَةً ○ فِيْهَا عَيْنٌ جَارِيَةٌ ○ فِيْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ ○ وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ○ وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ ○ وَّزَرَابِيُّ مَبْثُوْثَةٌ ○

(پارہ ۳۰ سورۃ الغاشیۃ - رکوع ۱۳ کی ۱۶ آیات)

ترجمہ: کیا چھپا لینے والی (قیامت) کی خبر تمہیں پہنچی ہے۔ اُس روز بہت سے چہرے ذلیل اور مصیبت کے مارے خستہ حال ہوں گے وہ دہکتی ہوئی آگ میں جائیں گے اُنھیں ایک کھولتے ہوئے چشمہ کا پانی پلایا جائے گا اُن کے لئے سوائے کانٹوں دار درختوں کے اور کچھ کھانا نہ ہوگا جو کھانا نہ بدن بڑھائے گا اور نہ بھوک مٹائے گا۔ بہت سے چہرے اُس دن تر و تازہ ہوں گے اپنے اعمال کے نتیجہ سے خوش ہوں گے عالیشان بہشت میں ہوں گے جہاں کوئی لغویات نہ سُنیں گے جہاں چشمے جاری ہوں گے اُس جنّت میں اونچے اونچے تخت ہوں گے۔

پیالے سامنے چنے ہوئے ہوں گے اور قطاریں لگے ہوئے تکیے ہوں گے اور مخملی مسندیں بچھی ہوئی ہوں گی۔

ترجمہ کے بعد اب کچھ لفظوں کی تشریح کی جاتی ہے۔

"اَلْغَاشِيَة" غَشْیٌ اور غِشَایَۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ڈھانپ لینا۔ غاشیۃ اُس چیز کو کہتے ہیں جو دوسری چیزوں کو ڈھانپ لے یہاں مراد قیامت ہے جو تمام کائنات کو گھیر لے گی۔ نَاصِبَۃٌ "نَصَبٌ" سے بنایا گیا ہے۔ جو مصدر بھی ہے اور اسم بھی جب مصدر ہو تو معنی ہوں گے تھک جانا، مشقّت اٹھانا اور جب اسم ہو تو تھکن اور مشقت مراد ہوگی۔ "نَاصِبَۃٌ" تھکے ہوئے اور خستہ حال۔

"حَامِیَۃٌ" کا مصدر حَمْیٌ ہے معنی ہیں آگ کا شدت سے بھڑکنا "نَارًا حَامِيَةً" شدت سے دہکتی ہوئی اور بھڑکتی ہوئی آگ۔ "اٰنِیَۃٌ" سے مراد بے حد کھولتا ہوا چشمہ "ضَرِیْعٌ" سے خاردار چھوٹے درخت مراد ہیں جنہیں جانور اُن کے کانٹوں اور زہر کی وجہ

سے نہیں کھاتے۔ نَاعِمَۃٌ ۔ تروتازہ اور بارونق ۔ لَاغِیَۃً "لغو" سے بنا ہے اور یہ دونوں لفظ خود مصدر بھی ہیں اور اسم بھی۔ مراد ہے ایسی بات اور ایسا کلام جو بے معنی اور فضول ہو۔ "اَکْوَابٌ" "کُوْبٌ" کی جمع ہے۔ کوب اُس پیالہ کو کہتے ہیں جس میں دستہ اور ٹونٹی نہ ہو۔ "نَمَارِقُ" "نُمْرُقَۃ" کی جمع ہے چھوٹے تکیہ کو کہتے ہیں "زَرَابِیُّ" زُرْبِیٌّ اور زُرْبِیَّۃٌ کی جمع ہے۔ تکیہ کو بھی کہتے ہیں اور قیمتی فرش اور مسند کو بھی۔ یہاں مخملی اور اعلیٰ درجہ کی مسندیں اور فرش مراد ہیں۔

بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سورۂ اعلیٰ اور سورۂ غاشیہ کو نماز عیدین میں پڑھا کرتے تھے اور اگر کبھی عید جمعہ کے دن پڑ جاتی تھی تو پھر جمعہ کی نماز میں بھی ان ہی سورتوں کو پڑھتے تھے۔

ابھی اس کا ذکر کیا جا چکا ہے کہ "غاشیہ" سے مراد قیامت ہے اور اُسے اس نام کے ساتھ اسی وجہ سے ذکر کیا گیا کہ وہ کائنات کی ہر چیز کو گھیر لے گی اور سب پر محیط ہو جائے گی۔ ان آیاتِ کریمہ میں قیامت کے دو منظروں کا ذکر فرمایا گیا ہے ایک جہنم کی آگ کا منظر اور اُس میں ڈالے جانے والوں کا تذکرہ اور دوسرا منظر جنت کا اور ساتھ ہی اُن لوگوں کا ذکر ہے، جو اپنے نیک اعمال کی جزا میں جنت کی نعمتوں کے مستحق سمجھے جائیں گے اور انھیں جنت میں جانے کی اجازت دی جائے گی۔

"غاشیہ" کا لفظ اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ قیامت کے گھیرے سے کوئی مخلوق باہر نکل نہ سکے گی اور ہر ایک کو جزا یا سزا کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اُس ہولناک وقت میں نہ اس دُنیا کا اقتدار کام آئے گا اور نہ یہاں کی دولت و عزت و جاہ و حشم سب کو بارگاہ خداوندی میں حاضر ہو کر اس دنیوی زندگی کا پورا پورا حساب دینا ہوگا۔ نہ وہاں سفارش سے کام چلے گا اور کچھ دے کر جان چھٹے گی۔ وہاں تو بس اعمال دیکھے جائیں گے۔

جس کی فردِ عمل سیاہ ہوگی وہ جہنم کے شعلوں میں جھونک دیا جائے گا اور جس کا نامۂ عمل نیک اعمال سے بھرا ہوا ہوگا اُسے جنت میں داخلہ کا حکم ہوگا۔

عذاب کے ذکر میں ارشاد ہوا ہے کہ بدکار لوگوں کی اُس وقت یہ حالت ہوگی کہ اُنکے چہروں پر ذلت اور رسوائی برس رہی ہوگی اور وہ بالکل خستہ حال ہوں گے اور مایوسی،

ناامیدی، خوف و دہشت کے سوا اُن کے حصّہ میں کوئی چیز نہ آئے گی اور آخر میں انھیں آتشِ جہنم میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ نہ مرینگے اور نہ جئیں گے بلکہ سکرات کے عالم میں ہمیشہ جلتے رہیں گے۔ پھر جب آگ کے شعلوں کی گرمی میں اُن کی پیاس بھڑک اُٹھے گی تو انھیں ایک کھولتے ہوئے چشمہ کا پانی دیا جائے گا جس کے پیتے ہی اُن کی زبان اور مُنہ اور باطنی حصّہ جل جائے گا اور آنتیں ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گی مگر پھر اس کے بعد اُن کو صحیح کر دیا جائے گا تاکہ اس عذابِ الٰہی کا سلسلہ جاری رہے اور وہ ہمیشہ یوں ہی اپنی بدکاریوں کی سزا اُٹھاتے رہیں۔ جہنم کے ہولناک مناظر کو بیان فرما کر پھر جنّتیوں کا حال ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اس دُنیا میں نیک عمل کرتے ہیں وہ قیامت کے روز اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھ کر بہت ہی خوش نظر آئیں گے۔ اُنکے چہرے تر و تازہ اور بارونق ہوں گے وہ نیک لوگ عالی شان جنّتوں میں بھیجے جائیں گے جہاں اُن کے لئے بارگاہِ خداوندی سے ہر قسم کی نعمتوں کو مہیا کیا گیا ہے۔ وہاں یہ لوگ کبھی کوئی بُری اور لغو بات نہ سُنیں گے۔ ہر طرف جنّتی چشمے جاری ہوں گے اور خدا کے اِن نیک عمل بندوں کے لئے ہر طرح کے آرام و راحت کا سامان موجود ہوگا۔ ایک حدیث میں سرورِ کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔

"کوئی ہے ایسا جو جنّت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور اپنی ذات کو اُس کا مستحق بنائے۔ اُس جنّت میں داخل ہونے کی تیاری کرے جس کی لمبائی اور چوڑائی بے حساب ہے۔ ربِّ کعبہ کی قسم وہ ایک چمکتا ہوا نور ہے، وہ ایک لہلہاتا ہوا سبزہ ہے، وہ عالی شان قصر ہیں، وہ بہتی ہوئی نہریں ہیں، وہ بے شمار ریشمی حُلّے ہیں، وہ خوش مزہ بے مثال میوے اور پھل ہیں، وہ ہمیشگی اور دوام اور بقا کی جگہ ہے کوئی ہے جو اُسے حاصل کرنے کی سعی کرے۔ سُننے والے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم نے عرض کی یا رسول اللہ ہم ضرور اس کی کوشش کریں گے۔ فرمایا اس کے ساتھ انشاء اللہ تعالیٰ بھی کہو سب نے تعمیلِ حکم کی۔ غرض قیامت کے دِن نجات اور جنّت کی راحتیں صرف اُن ہی صالح لوگوں کے لئے ہوں گی جن کے عمل اس دنیا میں اچھے ہوں گے کیونکہ اطاعتِ خدا اور نیک عمل ہی صرف اور تنہا ایسا وسیلہ ہے جس سے قیامت کے عذاب اور قہرِ خداوندی سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔

خطیب پاکستان حضرت علامہ سید محمد رضی مجتہد آلِ سرکارِ نجم العلماءؒ

کی نایاب تصانیف

مسلم معاشرہ :- ۳۶۸ صفحات۔ سائز ۳۰ × ۲۰/۱۶ بہترین کتابت وطباعت کاغذ اعلیٰ۔ جلد معیاری اور دیدہ زیب۔ ریڈیو قومی پروگرام میں علامہ کی چالیس لاجواب تقریروں کا مجموعہ۔

رعایتی قیمت ——— آٹھ روپے ——— علاوہ محصولڈاک

اسلام کا فکری نظام :- ۳۶۸ صفحات۔ سائز ۳۰ × ۲۰/۱۶ کتابت۔ طباعت۔ کاغذ۔ جلد بہترین اور معیاری۔ ریڈیو۔ قومی پروگرام میں علامہ کی اکیاون نایاب تقریروں کا مجموعہ۔

رعایتی قیمت ——— آٹھ روپے ——— علاوہ محصولڈاک

خطبات :- (دوسرا ایڈیشن) ۲۲۴ صفحات۔ سائز ۳۰ × ۲۰/۱۶ ریڈیو اسکول براڈکاسٹ کراچی کے سلسلہ میں علامہ کی مختصر مگر لاجواب ستر تقریروں کا مجموعہ کتابت وطباعت وکاغذ اعلیٰ۔ مجلّد۔

قیمت علاوہ خرچہ ڈاک ——— چار روپیہ

نجوم الافکار (عربی) دوسرا ایڈیشن۔ فقہ جعفری کے مطابق لاجواب اجتہادی تحقیقی شاہکار منتہی عربی طلبہ کے لئے بہترین علمی تحفہ۔ ۶۲ صفحات سائز ۳۰ + ۲۰/۱۶ ۔ قیمت علاوہ محصولڈاک ۔تین روپیہ

ادارۂ نشرِ علومِ دینیّہ ۔ سی۔ ۹۶ بلاک (۱۰) فیڈرل بی ایریا

کراچی۔ (فون نمبر۔ ۶۸۱۹۶۱)